

۷۷
حسب رابطہ رجسٹری ہو گئی ہے

مجموعہ لکچرز و ایچیر

حصہ اول

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سید مہدی علی خان صاحب بہادر

بھیر نواز جنگ

وکیل خوار سرکار نظام خلد اللہ ملکہ

حال آئیری سیکڑی

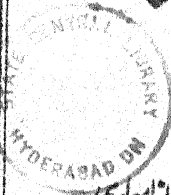
مدرسۃ العلوم مسلمانان

علی گڑھ

فارسہ فضل الدین کے زنی تاجرب قومی مالک اخبار اشاعت

بازار کشمیری لاہور

مطبوعہ نوکشتور گیسٹ ہاؤس پرنٹرز لاہور



LIBRARY BOOK
NOT TO BE ISSUED

CHECKED 1996

چند چیدہ اور نادر مسائل و اجواب کتابیں

تفسیر القرآن جلد اول

اس جلد میں سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی تفسیر ہے۔ اس میں نبی کریم کے مضامین نہایت محققانہ طریقہ سے لکھے گئے ہیں۔ وہ عا اور اس کے قبول ہونے کی حقیقت، حروف مقطعات کی تحقیق، مسئلہ جد و جہاد، وحی و الہام کی حقیقت، نبوت کی حقیقت، اعجاز القرآن، جنت اور دوزخ کی حقیقت، ملائکہ کی حقیقت، شیطان، قہقہہ آدم، قہقہہ موسیٰ، معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں، جبریل و میکائیل کی حقیقت، نسخ و منسوخ کی بحث، مسئلہ نبوت کی حقیقت، اندھنی حکام کی نہیں، قصاص پر بحث، مسئلہ وصیت، روزوں پر بحث، جہاد کی حقیقت، حج کی حقیقت، مسئلہ طلاق پر بحث، مسئلہ ربانیت کی تحقیق۔ از سرسید۔ قیمت

تفسیر القرآن جلد دوم

اس جلد میں سورہ آل عمران، سورہ نساء، سورہ مائدہ کی تفسیر ہے۔ اور اس میں نبی کریم کے مضامین نہایت پرکٹ کی گئی ہے۔ آیات حکمت و تشابہات پر بحث، کنہ کی روایت کا مسئلہ، حضرت مریم کی نسبت بعض محشیں، حضرت جبریل کے بن باب پیدا ہونے اور نبی کے ہاتھ اور زندہ ہو کر اسان جلیق کی تحقیق، برکی لڑائی میں دشمنوں کے اترنے کی حقیقت، اندر ادا رکھنے کی لڑائی میں ہیند کے نازل ہونے کی تحقیق، سہ تنہی قرآنی پر بحث، تاہل قابیل اور ان کے قرآنی اور کھ کے ہاتھ کے مسئلہ کی تحقیق، غیر مسلم کا کس شریعت سے فیصلہ کیا جائے، حضرت عیسیٰ کے حجرات پر تفصیلی اور محققانہ بحث۔ از سرسید۔ قیمت

تفسیر القرآن جلد سوم

اس جلد میں سورہ انفال، سورہ مدثر، سورہ اعراف کی تفسیر ہے۔ اور اس میں نبی کریم کے مضامین نہایت تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ آنحضرت کے پاس جو یہودیہ پر بحث، معجزہ کی حقیقت، انبیاء پر ایمان لانے یا نہ لانے کے مسئلہ، ملائکہ حفظہ و کراماتین کی تحقیق، لفظ کن فیکون کی تحقیق، نفع منو کی حقیقت، مسخر شہر اسم کے تاروں کو کوکب کر کہا، نبوتنا جلاہی ہے، جنات کے وجود اور ان میں انبیاء کے ہونے پر بحث، یزید اور زلیخا کی حقیقت، روح اور باطن یعنی قیامت پر تفصیل اور محققانہ بحث، چھ دیویں دنیا کے پیدا ہونے کی تحقیق، استواء علی الارض کے معنوں کی تحقیق، قوم عاد کے حالات کی تحقیق، آفات ارضی و سماوی کو انسان کے گناہوں سے منسوب کرنے کا سبب، قوم ثمود کے حالات کی تحقیق، قہقہہ حضرت شعیب، آنحضرت مونس، عواد و معجزہ پر بحث، حضرت موسیٰ کے حالات اور معجزات پر تفصیلی اور محققانہ بحث، توبہ دینا اور قبول میں آنحضرت کی نسبت بشارت کی کچھ پر بحث۔ از سرسید۔ قیمت

تفسیر القرآن جلد چہارم

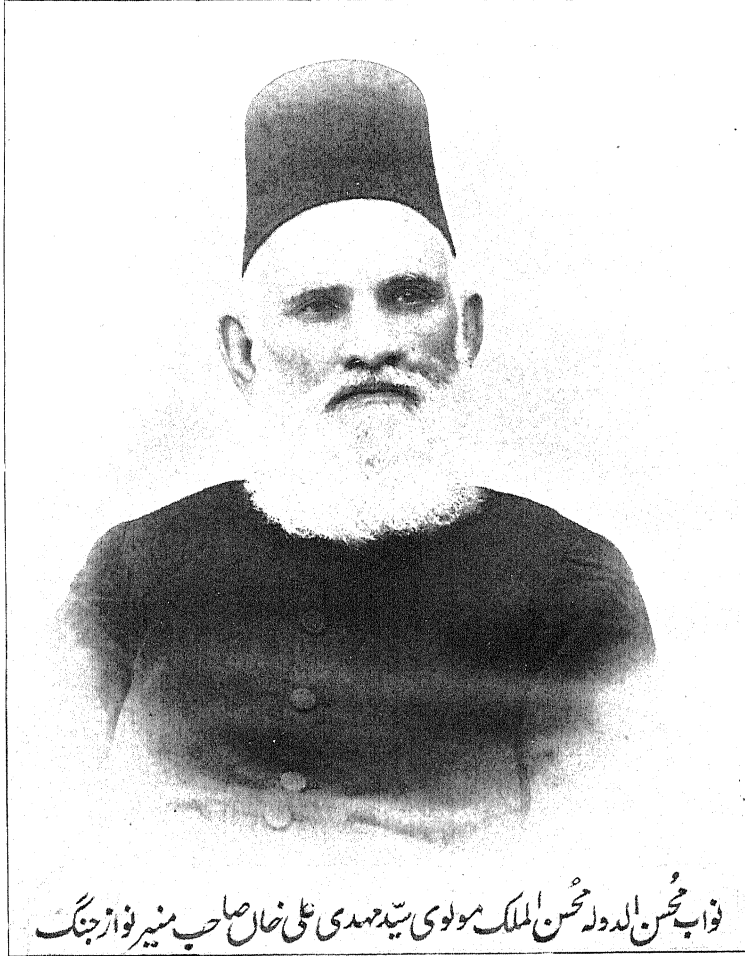
اس جلد میں سورہ انفال، سورہ مدثر، سورہ اعراف کی تفسیر ہے۔ اس میں آنحضرت کے ایک ایک غزوہ اور سریر پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور یہ بات نہایت مدلل طریقہ سے ثابت کی گئی ہے کہ یہ غزوے اور سریر تو تیزی و قتل و غارت کے لئے نہیں تھے جیسا کہ مخالفین مذہب اسلام کہتے ہیں۔ بلکہ بطور واقعیت کے تھے۔ از سرسید۔ قیمت

تفسیر القرآن جلد پنجم

اس جلد میں سورہ ہود، سورہ یوسف، سورہ زمر، سورہ ابراہیم، سورہ حجر، سورہ نمل کی تفسیر ہے۔ اس میں نبی کریم کی بحثیں نہایت تحقیق سے لکھی گئی ہیں۔ طوفان نوح پر بحث، قہقہہ حضرت ابراہیم، قہقہہ حضرت لوط، خواب کی حقیقت اور حضرت یوسف اور بادشاہ مصر اور دو تہیہ یوں کے خوابوں کی تحقیق، حضرت یوسف اور لیثا کے درمیان جو واقعات گذرے ان کی تحقیق، حضرت یعقوب کے نانا یا اور چچا پر بحث، آسمانی برجوں کی حقیقت، آسمان کو مشایطین سے محفوظ رکھنے پر بحث، مشایطین سے کیا مراد ہے، رجم شایطین اور شایطیات کی تفسیر، جنوں کے آگ سے پیدا ہونے پر بحث، پہاڑوں سے زمین کے تھانے پر بحث۔ از سرسید۔ قیمت

تفسیر القرآن جلد ششم

اس جلد میں سورہ بنی اسرائیل کی تفسیر ہے۔ اس میں مسیح کے قصے پر نہایت تفصیل اور استیعاب سے بحث کی گئی ہے۔ از سرسید۔ قیمت



نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی سید ممدی علی خاں صاحب منیر نواز جنگ

انڈکس

چچوچر سپر پچر نواب محسن الدولہ محسن الملک لوی میڈی علی صاحب دہا

منیر نواز جنگ

آزیری سیکڑی مدرستہ العلوم مسلمانان علیگڈہ

اول - دیباچہ تصویر نواب محسن الملک بہادر

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	اپریل ۲۳ - مئی ۱۸۹۲ء کو تقریر طبعی تقسیم انعام ہائی اسکول مرزا پور میں فرمائی	۱
۲	لکچر مسلمانوں کی تہذیب پر جو ۲۲ - اکتوبر ۱۸۹۲ء کو مرزا پور انسٹیٹیوٹ میں دیا گیا	۶
۳	اپریل ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۲ء کو بنقام الہ آباد تائیدرز و کمیشن برہم عثمان ایجوکیشنل کانفرنس میں فرمائی	۳۹
۴	لکچر مسلمانوں کی ملکی اور علمی ترقیوں کی تاریخ اور پھر اس کے تنزل کے اسباب پر جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۲ء کو الہ آباد میں دیا گیا	۴۲
۵	لکچر یونان کی ترقی اور یورپ کا تنزل اور پھر اس کی ترقی کی تاریخ و اسباب پر جو ۳۰ - دسمبر ۱۸۹۲ء کو الہ آباد میں دیا گیا	۹۳
۶	لکچر اشاعت اسلام پر جو ۲۷ - مئی ۱۸۹۲ء کو حیدر آباد دکن میں دیا گیا	۱۱۹
۷	افتتاحی اپریل ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۲ء کو اجلاس ششم عثمان ایجوکیشنل کانفرنس منعقد علیگڈہ میں بحیثیت پریزیڈنٹ کے فرمائی	۱۶۲
۸	اپریل ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۳ء کو علیگڈہ پریزیڈنٹ کانفرنس ہونے کی حیثیت سے مولوی محمد شبلی نعمانی کی دلفریب نظم کی نسبت بطور ریمارک کے کی	۱۷۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۹	ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۳ء کو اجلاس ہشتم محمدن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ میں بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کے مختلف اصحاب کی رپورٹوں کے ختم ہونے کے بعد بطور ریمارکس کے کی	۱۷۵
۱۰	ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۳ء کو علیگڈھ میں بحیثیت پریزیڈنٹ کانفرنس کے مولوی نعت علی صاحب کی وکسپ نظم کی نیت فرمائی	۱۸۱
۱۱	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۳ء کو اجلاس کانفرنس منعقد علیگڈھ میں رزلویشن نمبر ۱ کی تائید کرتے ہوئے کی	۱۸۳
۱۲	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۳ء کو پریزیڈنٹ کانفرنس ہونے کی حیثیت سے مسٹر سید محمد مود کے لکچر شروع ہونے سے پہلے کی	۱۸۶
۱۳	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۳ء کو بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کانفرنس کے مسٹر سید محمد مود کے لکچر کے اختتام پر کی	۱۸۶
۱۴	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۳ء کو رزلویشن نمبر ۵ - المعروف مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کی تائید کرتے ہوئے کی	۱۹۰
۱۵	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۳ء کو علیگڈھ میں رات کے وقت قبل از لکچر شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب - لکچر پریزیڈنٹ ہونے کی حیثیت سے بطور غیر مقدم کے فرمائی ..	۲۳۶
۱۶	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۳ء کو علیگڈھ میں بوقت شرب اختتام لکچر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب کے بطور ریمارکس کے کی	۲۳۸
۱۷	ایسیج جو ۳۰ - دسمبر ۱۸۹۳ء کو علیگڈھ میں اختتام کانفرنس پر بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کے کی	۲۳۹
۱۸	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۳ء کو اجلاس نہم محمدن ایجوکیشنل کانفرنس منعقد علیگڈھ میں بہ تحریک رزلویشن متعلقہ ندوۃ العلماء کانپور کے کی	۲۴۱
۱۹	ایسیج جو اجلاس دہم محمدن ایجوکیشنل کانفرنس منعقد شاہجہان پور میں ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کے بطور افتتاح جلسہ کے کی	۲۶۶
۲۰	ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو بحیثیت میرٹھس ہونے محمدن کانفرنس منعقد شاہجہان پور میں مولوی رضی الدین صاحب بسمل کی نظم کے نسبت بطور ریمارکس کے کی	۲۷۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۰	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کا نفرنس منعقدہ شاہجہانپور	
۲۱	کے بعد پڑھی جانے پر ورثہ تعلیمی مرد شماری کے (جو مسٹر تھیوڈور بک صاحب پرنسپل مدرسہ العلوم نے پڑھ کر سنائی تھی) بطور ریمارک کے فرمائی	۲۷۸
۲۲	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کا نفرنس منعقدہ شاہجہانپور مولوی نذیر احمد صاحب کے لکچر کے اختتام پر کی	۲۸۱
۲۳	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کا نفرنس منعقدہ شاہجہانپور رزلویشن نمبر ۴ کی تائید کرتے ہوئے کی	۲۸۱
۲۴	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو اجلاس کا نفرنس منعقدہ شاہجہانپور میں رزلویشن نمبر ۵ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی	۲۸۳
۲۵	ایسیج جو بحیثیت میر مجلس ہونے اجلاس ڈیم مٹھان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ شاہجہانپور میں ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو نسبت منشی امجد علی صاحب شہری کے بطور ریمارک کے کی ..	۲۸۶
۲۶	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو شاہجہانپور میں بحیثیت میر مجلس ہونے اجلاس کانفرنس کے رزلویشن نمبر ۶ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی	۲۸۶
۲۷	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو اجلاس مٹھان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ شاہجہانپور میں بحیثیت میر مجلس ہونے کے منشی محمود حسن خاں صاحب کی تقریر کے جواب میں کی ..	۲۸۹
۲۸	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو شاہجہانپور میں اجلاس کانفرنس میں بحیثیت میر مجلس ہونے کے منشی عطاء اللہ خاں صاحب کے ایک سو دو بیچہ پیپر جو انہوں نے علی گڑھ کالج کو عطا فرمایا تھا، بطور شکریہ کے فرمائی	۲۹۱
۲۹	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو اجلاس کانفرنس منعقدہ شاہجہانپور میں میر مجلس ہونے کی بحیثیت سے مسٹر محمد محمود بیرسٹرا ریٹ لا، و جناب مولوی نذیر احمد صاحب کی نظم اور لکچروں کی بابت فرمائی	۲۹۲
۳۰	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو شاہجہانپور کے اجلاس کانفرنس میں بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کے منشی تصدق حسین صاحب کی تقریر کے جواب میں جو انہوں نے مولوی نذیر احمد دیگر حضرات کی نظموں کے مؤثر ہونے کی نسبت فرمائی تھی، کی ..	۲۹۴
۳۱	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۵ء کو شاہجہانپور میں بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے مٹھان ایجوکیشنل کانفرنس کے منشی فضل علی صاحب کی تحریری تقریر کی نسبت فرمائی	۲۹۵

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۲	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو جرنیل پریڈیٹ ہونے محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کے اہل شاہ جہاں پور کے شکریہ میں فرمائی	۲۹۶
۳۳	ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس اجلاس یازدہم منعقدہ میرٹھ میں نواب غلام نواز جنگ کے پریڈیٹ منتخب کیے جانے پر فرمائی	۲۹۷
۳۴	ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو سالانہ رپورٹ کانفرنس کی نسبت بمقام میرٹھ فرمائی ..	۲۹۹
۳۵	ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو اجلاس یازدہم محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ میرٹھ میں نسبت پورٹ سکرٹری کے بطور ریکارڈس کے کی	۳۰۰
۳۶	ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ میرٹھ میں رزلوشن نمبر ۲ کی نسبت فرمائی	۳۰۵
۳۷	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ میرٹھ میں رزلوشن نمبر ۳ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی	۳۰۷
۳۸	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ میرٹھ میں رزلوشن نمبر ۴ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی	۳۰۹
۳۹	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس یازدہم منعقدہ میرٹھ میں رزلوشن نمبر ۵ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی	۳۱۰
۴۰	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو اجلاس میرٹھ میں رزلوشن نمبر ۱ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی ..	۳۱۰
۴۱	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو اجلاس میرٹھ میں نواب غلام نواز صاحب کے انگریزی پیکر کے شکریہ میں فرمائی	۳۱۱
۴۲	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو اجلاس محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ میرٹھ میں اخبار آبرور کی نسبت فرمائی	۳۱۲
۴۳	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو منتظمان کانفرنس میرٹھ کے شکریہ میں کی	۳۱۳
۴۴	ایسیج دوبارہ قائم کرنے یادگار سید احمد خاں بہادری کے سی ایس آئی ایل - ایل - ڈی مرحوم و معذور کے جو انہوں نے بمقام لاہور ۲۵ - جون ۱۸۹۸ء کو اس اجلاس میں کی جو سرسید میموریل فنڈ کے ڈیپوزیشن جانے پر منعقد ہوا تھا ..	۳۱۴
۴۵	ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ لاہور میں پریڈیٹ کی تقریر کے بعد بطور شکریہ کے فرمائی	۳۵۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۴۶	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۸ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور میں رزولوشن نمبر ۶ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی	۳۵۸
۴۷	ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۹ء کو اجلاس نیرم محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں پریزیڈنٹ صاحب کی افتتاحی تقریر سے پہلے فرمائی	۳۷۰
۴۸	ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۹ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں رزولوشن نمبر ۳ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی	۳۷۳
۴۹	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۹ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں رزولوشن نمبر ۱ کی تحریک کرتے ہوئے فرمائی	۳۷۴
۵۰	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۹ء کو بمقام کلکتہ رزولوشن نمبر ۲۰ پیش کرتے ہوئے کی ..	۳۷۷
۵۱	ایسیج جو ۳۱ - دسمبر ۱۸۹۹ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں پریزیڈنٹ صاحب کی آخری تقریر کے بعد فرمائی	۳۷۸
۵۲	ایسیج جو ۱۸ - اگست ۱۸۹۹ء کو سنٹرل اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے اجلاس منعقدہ لاہور میں بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کے رزولوشن نمبر ۱ کی تحریک کرتے ہوئے فرمائی	۳۷۹
۵۳	ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۹ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس چارم منعقدہ رام پور میں کانفرنس کے حساب کتاب کے متعلق اور ضمیمہ جات کلکتہ لاہور کے نہ چھپنے کی بابت فرمائی	۳۹۴
۵۴	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر ۱۸۹۹ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ رام پور میں سید محمد کی بریت کی بابت کی	۴۱۰
۵۵	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۹ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ رام پور میں رزولوشن نمبر ۱ کی تحریک کرتے ہوئے کی	۴۱۲
۵۶	دعا اور ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۹ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مدراس میں کارروائی اجلاس سے پہلے خیر مقدم کے جواب میں فرمائی	۴۱۶
۵۷	ایسیج جو ۲۷ - دسمبر ۱۸۹۹ء کو اجلاس محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مدراس میں رزولوشن نمبر ۴ کے پیش ہونے سے پہلے کانفرنس کے اغراض و مقاصد اور مسلمانوں کی خوفناک حالت پر کی	۴۲۳

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۵۸	ایسیج جو ۲۷ دسمبر ۱۹۰۸ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ مدراس میں طرالیس صاحب بہادر کی رائے کی تائید میں فرمائی	۴۳۲
۵۹	ایسیج جو ۲۸ دسمبر ۱۹۰۸ء کو اجلاس محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مدراس میں رزولوشن نمبر ۶ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی	۴۳۳
۶۰	ایسیج جو ۲۸ دسمبر ۱۹۰۸ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس مدراس میں توابع گورنر صاحب بہادر مدراس کے خیر مقدم میں فرمائی	۴۳۵
۶۱	ایسیج جو ۲۸ دسمبر ۱۹۰۸ء کو اجلاس کانفرنس منعقدہ مدراس میں رزولوشن نمبر ۶ کی تائید کرتے ہوئے بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے اجلاس کے فرمائی	۴۳۷
۶۲	ایسیج جو ۲۹ دسمبر ۱۹۰۸ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مدراس میں بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے بابت رزولوشن نمبر ۱۰ اصلاح تمدن کے فرمائی	۴۳۹
۶۳	ایسیج جو ۲۹ دسمبر ۱۹۰۸ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مدراس میں اصلاح تمدن کے متعلق بطور آخری ایسیج کے فرمائی	۴۴۱
۶۴	ایسیج جو ۲۹ دسمبر ۱۹۰۸ء کو بحیثیت ہونے پریزیڈنٹ محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مدراس میں مولوی محمد شبلی صاحب لعلی کے لکچر اسلام کے افتتاح پر بطور ریکارڈس کے فرمائی	۴۴۵
۶۵	ایسیج جو ۲۹ دسمبر ۱۹۰۸ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس مدراس میں بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کے رزولوشن نمبر ۱۳ کی تائید میں فرمائی	۴۴۶
۶۶	ایسیج جو ۳۰ دسمبر ۱۹۰۸ء کو مدراس میں سالانہ حساب کتاب تعلقہ کانفرنس میں کرتے ہوئے بحیثیت انچارجری سکٹری کے فرمائی	۴۴۸
۶۷	ایسیج جو ۳۰ دسمبر ۱۹۰۸ء کو حساب کتاب تعلقہ کانفرنس پڑھ چکنے کے بعد فرمائی	۴۴۸
۶۸	ایسیج جو ۳۰ دسمبر ۱۹۰۸ء کو اختتام اجلاس کانفرنس پریل مدراس کے شکریہ میں فرمائی	۴۵۲
۶۹	ایسیج جو ۳۱ دسمبر ۱۹۰۸ء میں یونیورسٹی کمیشن کے روبرو بطور شہادت کے فرمائی	۴۵۴
۷۰	ابتدائی ایسیج جو ۳۱ دسمبر ۱۹۰۸ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دہلی میں رزولوشن نمبر ۷ کی تائید میں فرمائی	۴۷۲
۷۱	ایسیج جو ۳۱ دسمبر ۱۹۰۸ء کو رزولوشن مذکورہ بالا کی نسبت فرمائی	۴۷۶
۷۲	ایسیج جو ۳۱ دسمبر ۱۹۰۸ء کو رزولوشن نمبر ۶ کی تائید میں بقیہ دہلی فرمائی	۴۸۰

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۴۸۱	ایسیج جو ۲ - جنوری سنہ ۱۹۴۷ء کو بمقام دہلی اجلاس محمدان ایجوکیشنل کانفرنس میں مولانا نذیر احمد صاحب کے لیکچر اور مولوی محمد شبلی نعمانی و ملک النور انیس العسما مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کی دلگداز نظموں کی نسبت بطور شکریہ کے فرمائی	۷۳
۴۸۲	ایسیج جو ۳ - جنوری سنہ ۱۹۴۷ء کو بمقام دہلی محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سیزدہم میں رزلوشن نمبر ۷ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی	۷۴
۴۸۵	ایسیج جو ۳ - جنوری سنہ ۱۹۴۷ء کو اجلاس کانفرنس منعقدہ دہلی میں رزلوشن نمبر ۷ کی تائید میں فرمائی	۷۵
۴۸۷	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء کو بوقت بارہ بجے دن محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ بمبئی میں پریزیڈنٹ صاحب کے انتخاب کی نسبت فرمائی	۷۶
۴۹۰	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ بمبئی میں رزلوشن نمبر ۳ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی	۷۷
۴۹۳	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء کو بمقام بمبئی رزلوشن نمبر ۳ کے مؤرخین کے جواب میں فرمائی	۷۸
۴۹۴	ایسیج جو ۲۸ - دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء کو بمقام بمبئی اجلاس محمدان ایجوکیشنل کانفرنس میں رزلوشن نمبر ۷ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی	۷۹
۴۹۵	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء کو بمقام بمبئی اجلاس محمدان ایجوکیشنل کانفرنس میں نواب صاحب جاورہ کی تقریر کے جواب میں بطور شکریہ کے فرمائی	۸۰
۴۹۷	ایسیج جو ۲۹ - دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء کو بمقام بمبئی جناب خان بہادر دارا شاہ صاحب وزیر ریاست جاورہ کی تقریر کے جواب میں بطور شکریہ کے فرمائی	۸۱
۴۹۹	ایسیج جو ۳۰ - دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ بمبئی میں رزلوشن نمبر ۷ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی	۸۲
۵۰۱	ایسیج جو یکم جنوری سنہ ۱۹۴۷ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ بمبئی میں حساب آمد و خرچ پڑھ کر سناتے ہوئے فرمائی	۸۳

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۵۰۲	ایسچ جو یکم جنوری ۱۹۰۴ء کو لندن ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی میں بطور اصراری ایسچ کے پریزیڈنٹ صاحب کی تقریر کے جواب میں فرمائی	۸۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مُصلّیاً

نصیحت گوش کن جانا کہ از جان دست تروا نہ

جو امان سعادت مند پسند پیر و انارا

یہ لکچر اور اسپچر جن کا ایک ایک لفظ دُرِ شاہوار اور ایک ایک حرف لولوے آبدار ہے
عالی جناب فیض آبِ حائے دین اسلام نواب محسن الملک سید محمد علی خاں دامِ اقبالہ کے ہیں۔
جو اپنے وقت فوقتہ، قومی ہی خواہی، اور ملکی و اسلامی بھلائی کے جوش میں دُٹے ہیں۔ ایسے فصیح و بلیغ،
ایسے معنی خیز و ردائیز، عبرت آمیز خطبات کا دیباچہ لکھنا بھی کسی ایسے ہی صاحب بصیرت، مکالمے صفت
عالی مانع آدمی کا کام تھا۔ اور یقین ہے کہ ہند اور پنجاب کے بڑے بڑے جادو رقم، اہل قلم، شہیدِ قلم کو قسطاں
کے میدان میں جولانی دیکر اپنے دل اور دماغ کے جوہر دکھا دینگے۔

مگر وہ لوگ جو مجھتا چہ: بیچ میر کی طرح گناہ اور عوام میں داخل ہیں، کیا وہ نواب کی خانی اتھوی او
اسلام پر جان نثاری، کی شکل گزاری اور حق شناسی کے دلولہ اور دلی جوش کو اپنے دل ہی دل میں رکھیں؟
ہرگز نہیں، بلکہ ایسا کرتا ہمارے لئے کفرانِ نعمتی، اور ناپاسی میں داخل ہے۔ گو آپ کے فیوضِ برکات اور آپ کے
کارنامے جنہوں نے ایک عالم کو مسخر کر لیا ہے۔ اور مسلمانوں کے ابدی روجوں کے ساتھ جاوینگے، اس امر کے
ہرگز متعلق نہیں ہیں، کہ کوئی شخص انہیں سبک سے متعارف کراے، اس لئے کہ وہ آفتابِ عالم کتاب کی طرح، تمام
جہان میں عموماً اور چاروں گہ ہند میں خصوصاً ظاہر ہوا ہر ہیں، اور ملک کا ہر ایک آدمی اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک
ان سے واقف ہے۔

ایک تجربہ اور شاہدہ کیا ہوا قدرتی قاعدہ ہے کہ جب نفوس قدسیہ میں سے کوئی فرد بشر اپنے
ملک کی بگڑی ہوئی حالت کے درست کرنے پر مضبوطی سے کمر بستہ ہوتا ہے۔ تو جہاں پر اس کے ہزاروں
مخالف، حشرات الارض کی طرح، اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ہر ایک فرد ان افراد میں کا یہی چاہتا ہے

کہ چیتی گاڑی میں روڑہ اٹکایا جاوے۔ وہاں بہت سی طبائع ایسی بھی موجود ہوتی ہیں۔ جو اپنی ہنری
 بیہودی اور اپنے آل کار کو سوچ سمجھ کر راستی اور حق باتوں کے قول کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اور اسی
 مصلح قوم کی مدد کے لئے کوئی نہ کوئی ایسا مضبوط دل، ایسا مستقل مزاج، ایسا عالی حوصلہ، بہت تنہا بہت
 بھی اُس فرد قدسی کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ جو اپنی جان و مال و غیرہ کو اُس پر تصدق کرتا ہے۔
 اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خداوند تعالیٰ نے حضرت ارون علیہ السلام کو پشت پناہ کیا۔ تو
 حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو گارینا دے، جنہوں نے باوازمند کہا "غن انصار اللہ" اور
 ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابابکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ ایسا ہی حال
 آپ کے متبعین کا ہے۔

اگر حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا اسماعیل شہید اور مولوی یحییٰ علی مہاجر
 جیسے فرشتہ خصال نصیب ہوئے، تو سرسید احمد ممدوح بریلوی کو سید مہدی علی (نواب حسن الملک)
 اور مولوی مشتاق حسین (دقار الملک) جیسے پندہ افعال قسمت میں آئے۔
 اگر قومی کارناموں خصوصاً ایم۔ او۔ اے۔ کلج کی خدمات کی حیثیت میں کوئی شخص سرسید
 اور نواب صاحب ممدوح کا آپس میں مقابلہ کرنا چاہیگا، تو مشکل ہی اس ارادہ میں کامیاب ہو سکیگا۔ کیونکہ
 سرسید ممدوح کی کوئی جانوری و عرق ریزی اس قسم کی نظر نہیں آئیگی۔ جس میں اول سے لے کر آخر تک ہمارے
 ممدوح کا حصہ نہ ہو، وذلک فضل اللہ یونینہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

سرسید ممدوح کی وفات حسرت آیات کے بعد جو کچھ نواب صاحب ممدوح فیض نے کر دکھایا اور
 کر رہے ہیں اگر اس کو معجزہ سے تشبیہ دیا جائے تو روا ہے، اور اگر اس کو حرق عادت سے تعبیر کی جاوے
 (جس کے سرسید ممدوح قائل نہ تھے) تو عینِ بیابا ہے۔ بھلا، جو نازک حالت اور پیچیدگیاں سرسید ممدوح
 کی وفات کے موقع پر کلج کو پیش آ رہی تھیں، اگر سبکیاں لے رہا اور ڈبکیاں کھارہ تھا۔ اور مارے
 قرضے کے اُس کی اینٹ سے اینٹ بجنے کا وقت آگیا تھا طالب علموں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی
 تھی۔ محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا ہمیشہ کے لئے بند ہونے کا خطرہ تھا۔ اگر خدا خواستہ نواب صاحب ممدوح
 مابین عالمِ پیری اور مختلف امراض میں مبتلا ہونے کی حالت میں بہادرانہ کوشش باندھ کر کھڑے نہ ہو جاتے
 تو کس کو امید تھی کہ کلج اس سرسیری اور ایسے عروج کو پہنچے گا۔ کہ ہندوستان بھر میں اپنا نظیر آپ ہی ہوگا
 محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کو کبھی ممالک مغربی و شمالی سے نکال کر، کلکتہ ملک بھجانا اور کبھی مدراس سے
 رکھنیکر مبنی وغیرہ تک وسعت دینا، قومی چندہ کے لئے سمندر پار ملکوں تک جانا، یہ ہمارے ممدوح
 کا کام تھا۔

مگر کہ موت اس وقت ہمارے موضوع سے غلط ہے۔ اس لئے کسی دوسرے موقع پر ان کو

رکھا جاتا ہے *

یہ ثابت کرنا کہ عالیجناب نواب صاحب مدوح قدرتا ہی فصیح و بلیغ پیدا ہوئے اور مہدی ہلاکتا
اور شاہ عبدالعزیز وقت میں کچھ ضرور نہیں ہے، بلکہ یہ تسلیم الثبوت اور بدلیع امورات ہیں، جو احباب ان کے چرچا
مطالعہ کرینگے۔ انہیں علاوہ دیگر ہزاروں فائدوں اور تیری تصالح کی باتیں بھی بخود یقین ہو جائیں گی *
الحال ہم سرسید مرحوم کے ان پاکیزہ اور قابل عزت خیالات میں سوچو انہوں نے نواب صاحب مدوح
کے بارہ میں مختلف اوقات میں ارشاد فرمائے۔ ان میں سے چند ایک کا اس مقام نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں *
چنانچہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :-

۱۔ مجی مہدی ! میں نے آپ کا مضمون، جس کا عنوان ”سوال و جواب“ ہے۔ دیکھا۔ اور اسی طرح مقصد
دل سے اٹھنے والے شوق سے وجد کیا جس طرح کرا دم نے انجان جانب کار خدا کی بات پر وجد کیا تھا۔
زندہ باشی و جان من باشی۔ الخ (تہذیب الاخلاق جلد سوم صفحہ ۷۸) *

جن دنوں سرسید مرحوم پر کفر کے فتاوے تیار ہو رہے تھے اور مخالفین کے زعم میں گئے تھے
تو اپنا اور اپنے دوستوں کا حال ایک موقع پر لکھتے وقت یوں فرماتے ہیں :-

۲۔ اب ہمارے محبوب مہدی علی اور ہمارے عزیز شتاق حسین کا حال سنو ! یہ ہمارے دونوں دوست
ایسے ہیں، جن کا حال کچھ چھپا نہیں ہے۔ مولوی مہدی علی کا علم۔ اس کی ذاتی خوبیاں اس کی پیاری پیاری
باتیں، اس کی سچی ایمانداری، اس کی فصیح تقریر اس قابل ہیں کہ اگر ہماری قوم کے دل کی آنکھیں ابھی نہیں
تو اس کے نام سے فخر کیا کرتے۔ الخ (تہذیب الاخلاق جلد پنجم صفحہ ۳) *

ایک اور آئینک میں جو اختتام سال تہذیب پر لکھا گیا ہے۔ عالیجناب نواب صاحب کے اس
مشہور و معروف نمونے کی شکل پر جو آئینوں نے مرزا پور میں دیا تھا۔ اور اس مجموعہ کے شروع میں ہے
تحریر فرماتے ہیں :-

۳۔ ہم نے اپنے مضامین، لکھنے اور قومی بھلائی کی کوشش میں کمی نہیں رکھی۔ اگرچہ پچھلے سال میں دہائی
مدرسہ العلوم کی اکثر چھپتی رہی۔ الا مضامین ان نشین سے بھی یہ پرچہ خالی نہیں رہا۔ پہلے غم زدہ
و دل شکستہ دوست مولوی سید مہدی علی کا لکچر مسلمانوں کی تہذیب پر جو اس سال کے پرچوں میں چھپا دیا
ایک ایسا کارنامہ ہے کہ جس کی قدر و ہی کو ت نہ سکتے ہیں۔ جو اس کی قدر جانتے ہیں۔ ہمارے ہمعصر پٹیر
اودھ اخبار نے اس کی ویسی ہی قدر دانی کی ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ ہم کو نہایت فخر ہے۔ کہ ایسا
عالی مضمون ہمارے اس ناپتیر پرچہ کے ذریعہ سے شہر ہڑواہ جو ہماری قوم کی اگلی حالت کو یاد دلانا ہے

۴۔ جناب نواب حسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں صاحب دہم اقبال *

۵۔ جناب وقار الملک مولوی شتاق حسین صاحب *

اور کچھلی حالت تا کر شرمندہ کرتا ہے اور پھر آئندہ کی بہتری کی توقع سے دل و جان کو تقویت دیتا ہے۔
(جلد پنجم تہذیب الاخلاق صفحہ ۲) *

پھر ایک مقام پر رقم فرماتے ہیں :-

۵۔ آپ کا ایک نہایت طولانی خط، نہایت دلچسپ، فصیح و زبردست، دلکش، مملو از قوت ایمانی و مزوج از فطرت ربانی ہنچا۔ خوبی تحریر و فصاحت بیان جیسا کہ آپ کا خاصہ تسلیم کیا گیا ہے۔ آپ کی ہر تحریر میں پایا جاتا ہے۔ خواہ میرے نام کا خط ہو۔ خواہ کچھ اشاعت اسلام پر خواہ اور کوئی کچھ اور۔
(تحریر فی ہول التفسیر صفحہ ۲۰) *

پس جس شخص کی بابت سید السادات رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی رائے ہو جس کا قدر قلیل حصہ اوپر عرض کیا گیا ہے تو کس کو شک ہو سکتا ہے اُس کے برگزیدہ عالم ہونے کا۔ مزید بے برائت اسلامی دنیا اس کو تجربہ اور شاہدہ میں بھی لاپچی ہو۔ سر سید مرحوم و مغفور نے جو آپ کو شاہد و عبید العزیز و وقت ہمدی ہذا الزمان وغیرہ خطاب دئے تھے۔ تو ایسے کلمات کا ایسے مدبر، ایسے پولیشیشن، ایسے ریفارمر کے قلم و زبان سے نکلتا کچھ بے معنی نہ تھا۔ کیونکہ آخر الامر انقلاب مانہ تجربہ اور مشاہدہ نے دکھا دیا اور دکھارہا ہے کہ جو مرقم اور خامیاں وغیرہ اُس وقت رہ گئی تھیں۔ وہ نواب صاحب کے زمانہ میں نہ صرف پوری ہی ہوئیں، بلکہ روز بروز ترقی روز افزوں اپنا مبارک چہرہ دکھا رہی ہے کاشکے اس وقت سر سید مرحوم زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ جس پودے کو اُنہوں نے اپنے مبارک ہاتھوں سے لگایا تھا، نواب صاحب مدوح نے اُس کو کس سعی اور جانفشانی کی آبیاری سے سرسبز اور تازہ کر دکھایا *

جس وقت سر سید مرحوم و مغفور پر عوام کا لانا عام کی بن آئی اور ایسے کریم النفس، نیک نوا، خیر خواہ قوم، سید آل رسول پر ناحق اور بے موجب کفر کے فتاوے لکھائے گئے۔ تو اُس وقت بجز ذات قدسی صفات نواب صاحب اور حضرت وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کے کوئی سر سید مرحوم کا دوست نہ تھا۔ اور چونکہ نواب صاحب مدوح کا مرحوم و مغفور کے ساتھ وہ تعلق تھا جس کو سر سید مرحوم محکم لہمی اور جبکہ جسمی سے ظاہر فرماتے ہیں۔ اس لئے نواب صاحب موصوف بھی ان کلمات کی بچہ نہ سکے اور یار لوگوں نے ان کو بھی اگر سلطان وغیرہ سے یاد کیا اور جناب مختتم الیہ نے وہ کلمات پڑھ کر مثل سر سید مرحوم کے صبر کیا۔ چنانچہ اُن آیام میں جو منشی ماجد علی صاحب کے خط کا جواب نواب مدوح نے تحریر کیا تھا وہ ایسا دردناک اور ایسا متاثر ہے۔ کہ پڑھتے وقت کوئی سنگدل آدمی ہو جواب دینے ہو لے گا کہ بعد اس کے بڑے بڑے ملکی ہمدرد، مثلاً مولانا حالی و مولوی نذیر احمد وغیرہ نے پرلے درجہ کی جانفشانیوں اور عرق ریزیاں دکھلائیں اور دکھلا رہے ہیں *

اور نیچر کا بلج ادا نہ کرے جس کو پچھپی کے لئے بجنہ نقل کیا جاتا ہے:-

مراسلہ مہدی

عزیز من ماجد علی سلسلہ تہذیب!

خط تہنارا آیا حال معلوم ہوا۔ میری کیفیت کیا پوچھتے ہو۔ عیاں راجہ بیاں ۵

یک سینہ و صد نہر اشعلہ یکنیدہ و صد نہر باراں

تم نے پوچھا ہے کہ تہذیب الاخلاق میں ضمون لکھنا کیوں ترک کیا، کیا سید صاحب کی مخالفت کی یا کفر کے فتوؤں سے ڈر گئے۔ عزیز من! نہیں سید صاحب سے مخالف ہونا کفر کے فتوؤں سے ڈرا بلکہ میری سکوت کا اصلی سبب تم کو معلوم ہے کہ قطع نظر روحانی صدیوں کے کئی مہینے سے ایسا بیمار ہوں کہ کھٹا پڑھنا دشوار ہے۔ روزمرہ کا کام بھی مشکل دوسروں کی مدد سے کرتا ہوں ۛ

عزیز من! سید صاحب سے مخالفت کا زمانہ گزر گیا، اب اس خیال کو جانے دو کہ پچھوہ زمانہ آویگا ۛ

انا احمد و احمد انا نحن برحان حللتنا بدانا

کفر کے فتوؤں کا ذکر عامیوں کو ہو گا جن کا ایمان برادری کے حقتہ پانی پر ہے۔ نہ ان مردوں کو جو اسلام کی حقیقت ان کفر کے فتوے دینے والوں سے بھی زیادہ جانتے ہوں۔ وہ تو ان بادی کا غندوں پر جو کبھی مشرق سے مغرب کو اور کبھی مغرب سے مشرق کو اڑتے پھرتے ہیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور پرگس کے برابر بھی اُس کی وقعت نہیں سمجھتے۔ اُن کے نزدیک خدا نے اپنی جنت و دوزخ ان کفر کے فتوے دینے والوں کو بہ نہیں کر دی کہ جس کو چاہیں جنت میں بھیج دیں جسے چاہیں کفرناکردہ فرخ میں ڈال دیں ۛ

عزیز من! تم تاریخ سے ناواقف ہو۔ اگلے لوگوں کا حال تم نے نہیں پڑھا۔ ورنہ تم ان کفر کے فتوؤں پر تعجب کرتے، یہ تو ایک پُرانی رسم ہے کہ ہندو ہب میں اُس پر عذر آدرنا ہے اور مذہبی سرداروں نے اُسے اپنی وقت و عزت کا ذریعہ ٹھہرا رکھا ہے تاکہ وہ پوجے جاویں اور خدا کے فرزند ٹھہریں۔ اور جو اُن کو آگے پیچھے سے منکھ وہ روح القدس کی آواز سمجھی جاوے۔ افسوس اُن ضعیف القلب و ضعیف الایمان لوگوں پر جو اپنی دلی تصدیق پر اطمینان نہ رکھیں اور اُن کے دل ان ہوائی کاغذوں کی طرح اُڑتے پھریں ۛ سنو میاں! دنیا میں جتنی نامور قومیں گزری ہیں یا جو اب موجود ہیں اُن کی تاریخ اس پر مشابہ ہے کہ جب کسی نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے اوسط درجہ کے خیالات سے بڑھ کر کوئی بات زبانی نکالی یا اُن کی معمولی سمجھ سے کچھ زیادہ کہا تو وہ مجنوں اور دیوانہ ٹھہرا۔ اور اگر مذہب سے کوئی ایسی بات نکلی جو مخالف اُس زمانہ کے دینی خیالات اور مذہبی رسوم کے ہوئی گو وہ خیال اور رسم بالکل مذہب کے مخالف ہی ہو یا اُس سے مذہبی سرداروں کی عزت و شان میں کچھ فرق آیا تو وہ لاندہب اور کافر ہی سمجھا گیا۔ پھر اجلا وطن کیا گیا

یاما را گیا یا زندہ جلایا گیا ؟

دیکھو یونان میں سقراط کو زہر کا پیالہ کیوں پلایا گیا۔ اسی جرم میں کہ اُس نے بُت پرستی کی بُرائی کی جسے اُس زمانہ کے لوگ اچھا جانتے تھے ۔

جربرٹ جیسے ماہرین کے مدرسہ سے محمولات سیکھ کر اپنے ملک میں گیا تو اپنی قوم کے نزدیک کیوں کافراؤ مرتد ٹھہرا۔ اسی قصور میں کہ وہ اُن علموں کو جاری کرنا چاہتا تھا جس کی خوبی سے اُس کی قوم ناواقف تھی ۔
کلبس کیوں پاگل ٹھہرا۔ اسی لئے کہ اُس نے وہ بات کہی جو کہ اُس زمانہ کے لوگوں کی عقل اور سمجھ سے باہر تھی ۔

ڈیوکس نے جب بھاپکے زور سے ہزاروں گاڑی چلانے کی نسبت اپنا خیال ظاہر کیا تو وہ کیوں پاگل خانہ میں بھیجا گیا۔ اسی قصور میں کہ اُس زمانہ کے اوسط درجہ کے خیال سے اُس نے بڑھکیر بات کہی ۔
روحانیوں کے کفر کا کیوں فتوے دیا گیا۔ اسی لئے کہ وہ اُن مسائل سے منکر تھا جس کو اُس زمانہ کے عالم حق اور سچ جانتے تھے ۔

کوپرنیکس نے کیوں ہیات کے صحیح مسائل کے اظہار پر جرأت نہ کی۔ اسی لئے کہ وہ پادریوں کی مخالفت سے خائف تھا ۔

بیرونون حکیم کو روم کے پوپ نے کیوں زندہ جلادیا۔ اسی جرم میں کہ اُس نے زمین کی گردش کا اقرار اور آسمان کے وجود جسمانی سے انکار کیا تھا جس کو اُس زمانہ کے پادری ہمارے وقت کے مولویوں کی طرح اپنی نادانی سے مخالف آسمانی کتاب کے جانتے تھے ۔

لوٹھو کیوں شہر نشہر بھاگنا پڑا۔ اسی گناہ میں کہ پوپ کو نجات کے فرمان نیچنے کا مجاز نہ سمجھتا تھا ۔
یہ چند نظریں تو غیر قوموں کے نامور لوگوں کی ہیں۔ اب ہم اپنی ہی قوم اور اپنے ہی مذہب کے نامور شخصوں کا حال بیان کرتے ہیں۔ جن میں سے اب کوئی تفسیر کا، اور کوئی حدیث کا، کوئی فقہ کا، کوئی اصول کا، کوئی کلام کا امام سمجھا جاتا ہے اور جن میں سے کسی کا خطاب ہے، امام الفسیرین، اور کسی کا امام الفقہاء، اور کسی کا حجت الاسلام، اور کسی کا کبریت احمر، اور کسی کا اکبر اعظم، تاکہ معلوم ہو کہ ان بزرگواروں نے اپنے زمانہ کے لوگوں سے کیسے صدمے اٹھائے ۔

عبدالمناہن عباس پر لوگوں نے طعنہ کیا کہ یہ بے سمجھے بوجھے قرآن کی تفسیر کیا کرتے ہیں ۔

عبدالمہدین زبیر کے زیادہ نماز پڑھنے پر لوگوں نے کہا کہ یہ مکار اور منافق ہیں ۔

سید برٹن قاسم کو فک کے جاہلوں نے شکوہ خلیفہ ملکہ کیا کہ اُن کو نماز پڑھنی بھی نہیں آتی ۔

حضرت علی کو تو خاریجیوں نے کافر ہی بنا دیا ۔

امام زین العابدین کی نسبت لوگوں نے کہا کہ یہ توبت پرستوں کی باتیں کرتے ہیں ۔

امام ابوحنیفہ کی نسبت وہ باتیں لوگوں نے کہیں کہ جن کا نقل کرنا بھی بے ادبی ہے بعضوں نے ان کا جالی ٹھہرایا، بعضوں نے بدعتی بنایا، بعضوں نے کفر کی نسبت کی +

امام شافعی سے پاک امام کو بدعاتوں نے اضر من ابلیس کا خطاب دیا اور ان کے مرنے کی دعائیں کیں +

علماء عراق اور مصر نے ان پر یہاں تک تمثیل لگائیں کہ من سے دارالسلام تک ایسی بے حرمتی اور بے عزتی سے قید کر کے بھیجے گئے کہ ہزاروں آدمی ملامت کرتے اور گالیاں دیتے جاتے تھے اور وہ ان کے حلقہ میں سر جھکائے ہوئے تھے +

امام مالک کی مصیبت ہمارے دل کی تسلی کے لئے کافی ہے کہ پچیس برس تک جمعہ و جماعت کے لئے باہر نہ نکلے اور ایسی ذلت سے قید کئے گئے کہ جس کے سننے سے بدن پر عرشہ ہوتا ہے۔ اس بے دردی ان کی شکلیں باندھی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گیا۔ پھر اونٹ پر سوار کر لے گئے اور کہا گیا کہ اُس مسئلہ کی صحت کا اقرار کر دیں جسے وہ دل سے غلط جانتے تھے۔ آخر امام نے اونٹ پر کھڑے ہو کر کہا کہ جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہ جانتا ہو وہ جان لے کہ مالک انس کا بیٹا ہوں۔ اور صاف کہتا ہوں، طلاق المسکرا لیس بلشی، اس پر ستر کوڑے مارے گئے اور قید رکھے گئے +

امام احمد جنبل کی مصیبت سنو! کہ ۴۸ جینے تک قید میں رہے اور بھاری بھاری زنجیریں ان کے پاؤں میں ڈالی گئیں اور یہ ذلت ان کو دیکھتی کہ مجلسوں میں بلائے جاتے اور لوگ ان کو کھانچے مارتے اور منہ پر پتھر کتے اور ہشام کو حیلانہ سے نکالے جلتے اور کوڑوں کی مار ان پر پڑتی۔ اور یہ سزا اُس قصور کے بدلے میں تھی کہ وہ ایک غلط مسئلہ میں موافقت اُس زمانہ کے لوگوں کی نہ کرتے تھے +

امام محمد بن اسماعیل بخاری وطن سے نکالے گئے +

نسائی مسجد میں شہید کئے گئے +

بایزید بطامی پر بھی جلا وطنی کا فتوے دیا گیا +

ذوالنون مصری مصر سے بغداد کو اس مصیبت سے بھیجے گئے کہ پابست و گرے، امت بدست و گر اور ایک جماعت مولویوں کی ان کے کفر و زندہ پر گواہی دینے کے لئے ہمراہ گئی +

سہیل بن عبد اللہ نیشری بایں امامت مرتد ٹھہرے +

ابو سعید خزاعی کفر کا فتوے دیا ہی گیا +

جنید بغدادی کو عالموں نے کافر کہا اس قدر تنگ کیا کہ وہ مسائل توحید علانیہ زبان پر نہ لاسکے +

محمد بن فضال بنی بایں جلالت اس طو پر نہ کالے گئے کہ ان کے گلے میں رسی تھی اور گلی کوچہ میں تشہیر کئے جاتے +

امام بن حسن مازنی کو لے کے زاہدوں نے تھکوا ہی دیا *
 ابوعثمان مغربی بھی در بدر مارے پھرے *
 حضرت ثعلبی پر کفر کا فتوے دیا گیا اور ان کے پاس کا بیٹھا بھی ایک گناہ قرار دیا گیا *
 امام ابو بکر نابلسی کی بایں علم و فضیلت مولویوں کے حکم سے کھال کھینچی گئی *
 ابن حنن یاس تبحر و امامت زندقہ قرار دئے گئے *
 شیخ ابو مدین بحرم زندہ جلا وطن کئے گئے *
 شیخ ابو الحسن شاذلی مغرب سے قید کر کے یہ گناہ زندہ مصر کو بھیجے گئے *
 شیخ عزالدین بن عبدالسلام بھی کفر کے فتوے سے نہ بچے *
 شیخ تاج الدین سبکی اباجیہ ٹھیرائے گئے *
 شیخ علی الدین ابن عربی اور شیخ نور الحسن اشعری اور امام حجت الاسلام غزالی کا کچھ بیان کرنا بے موقع نہ ہوگا :-

سب جانتے ہیں کہ شیخ علی الدین وہ شخص ہے جس کو امام الموحیدین اور کبریت احمد و اکبر اعظم اور شیخ الطائفہ کہتے ہیں۔ اُس کی نسبت نہ فقط کفر کا فتوے ہوا بلکہ حضرت عالموں نے یہ فتوے دیا کہ کفر اشد من کفر الیہود والنصارى کہ اُس کا کفر یہود اور نصاریٰ کے کفر سے بڑھ کر ہے۔ اور اس پر بھی اُن ظالموں کو صبر آیا بلکہ اُن کے تمام گروہ پر کفر کا فتوے جاری کیا اور اس پر اُن کے دل کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ بلکہ اُن کے کفر میں شک کرنے والوں پر بھی کفر کا فتوے دیدیا اور صاف یہ لکھ دیا کہ من لم یقرط لثقتنا بن عربی کان لم یقرط الیہود والنصارى ومن تشک فی کفرہ ومن هو مثله فهو کافر ومن تشک فی کفرہ فهو کافر *
 شیخ ابوالحسن اشعری کی کیفیت ظاہر ہے کہ وہ سنیوں کے امام ہیں، مگر اُن کو بھی یاروں نے الحاد کے الزام سے نہیں چھوڑا۔ اور کفر کی نسبت اُن کی طرف کر دی *

امام غزالی کا حال سب جانتے ہیں کہ آج لقب اُن کا حجت الاسلام ہے مگر حضرت بھی اپنے زمانہ میں کافر ٹھیرائے گئے اور اُن کی کتابوں کا جلا دینا بلکہ اُن پر لعنت کرنا تو اب سمجھا گیا تھا۔ اس نامور امام کو کسی اُن کے دوست نے لکھا کہ تمہاری کتابوں پر لوگ طعن کرتے ہیں اور خلاف سلف صالح کے عقاید کے جانتے ہیں اُس کا انہوں نے ایسا نہایت عمدہ جواب لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے بابر عزیز ان حاسدوں کی باپوں پر خیال نہ کر اور اُن جاہلوں کی طعن و لعن سے کچھ رنجیدہ نہ ہو۔ اُن کی باتوں پر صبر کر اور اُن کو کینے دے استخف من لا یحسد ولا یفقد واستنقص من بالکفر الضلال لا یعرف وسیل جان اُس آدمی کو جس کا لوگ حسد نہ کریں اور خیر سمجھیں اُس شخص کو جس کی طرف کفر اور گمراہی کی نسبت نہ کی جاوے

ایسے لوگوں کی صلاح کی امید نہ کر جو صرف جسد سے برا بھلا کہتے ہیں۔ اور ایسے جاہلوں کی بات نہ سُن جو تھوڑی سی مخالفت کو بھی انگلوں کی کفر جانتے ہیں۔ اور ان مفتیوں اور مولویوں کی باتوں پر کچھ خیال نہ کر، کہ جو ذری ذری بات پر قد کفر قد کفر کہنے لگتے ہیں۔ کیا وہ فقہ کے پڑھ لینے اور نجاست کے انالہ اور زعفران کے طلا کے مسئلے جان لینے سے کفر و ایمان کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی طرف توجہ نہ کر اور ان کی باتوں کے سننے میں اپنی اوقات ضائع نہ کر اور اپنے دھندے کو نہ چھوڑ۔

ان بزرگوں کو جانے دو۔ ہندوستان کے بعض نامور شخصوں کو خیال کرو کہ ان کو بھی مایروں نے نہ چھوڑا۔ حضرت شیخ احمد فاروقی نقشبندی کے کفر کا فتوے دیا گیا۔

مولانا دلی اللہ پر بھی بدعت و گمراہی کا الزام لگایا گیا۔

حضرت مولانا محمد طویل شہید فی سبیل اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تکفیر کا فتوے لکھ کے مفتیوں سے یا رنگ مکھواہی لائے۔ اور ایسے پاک شخص کے کا فر ٹھہرانے میں درج نہ کیا۔

غرض کہ کوئی زمانہ ایسا نظر نہیں آتا کہ جس میں کوئی نامور اور مصلح ایسا گذرا ہو جس کی مخالفت لوگوں نے نہ کی ہو بلکہ ہم تو ہر اکینہ مور کو ایسا ہی دیکھتے ہیں کہ یا ر لوگوں نے اُس کا حسد کیا۔ دشمنوں نے اُس پر طعن کئے۔ جاہلوں نے اُس کی منی اڑائی۔ حضرات مولویوں نے اُس کے کفر کے فتوے دئے۔ ایک بھی تو اُن کے پختہ ظلم سے نہیں بچا۔ اور کوئی بھی تو تکفیر کے فتوے سے محفوظ نہیں رہا۔ پھر اس زمانہ کے مولویوں کے کافر کہنے کی اگر کوئی شکایت کرے۔ تو وہ نادان ہے یہ تو اُن کی معمولی عادت اور پرانی سنت ہے ولا تجدد لسننہم تیدیل۔

ایک نام میں حضرت فقہانے تکفیر کی یہ کثرت کر دی کہ ذری ذری بات پر کفر کے فتوے دیئے اور ایک اور نام میں شیعہ کی مخالفت پر مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ صد مسلمان ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے پر کافر ٹھہرے اور بت سے ایمان دار گردن اور کان کے مسح نہ کرنے پر مارے گئے فلق قرآن کے مسند نے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ خلافت امارت کی بحث میں شہر کے شہر ویران کر دئے۔ پس ہمارے اند میں شیطان کے وجود خارجی اور آسمان کے وجود فرضی کے انکار پر اگر کفر کے فتوے ہوئے۔ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔

گھائل تیری نظر کا نبوع و گمراہ ایک زخمی کچھ ایک بندہ درگاہ نہیں
عزیزِ سنو! ایمان ایک نور ہے جو خدا دل میں پیدا کرتا ہے۔ وہ نور خود آدمی کو اپنے ایمان کی حقیقت سے واقف کر دیتا ہے۔ اُس کی تصدیق قلبی دوسروں کی شہادت کی محتاج نہیں رہتی۔ نہ کسی کی تکفیر سے
میں ظل و زل ہوتا ہے۔

ومن يك وجداً وجداً صحيحاً فلم يحقر الى قول المغنى
لهم ذاتہ طرب قد بد وسكر داثهم من غير دن

امام ابو حنیفہ سے یوسف ابن خالد نے وتر کا مسئلہ پوچھا۔ امام نے کہا کہ واجب ہے اس فقیدہ کہا کہ کفر یا ابا حنیفہ کہ اسے ابو حنیفہ تم کافر ہو گئے۔ یحیٰ اب اس کے امام نے فرمایا کہ اھولہ الفارک یا ای وانا اعرف الفرق بین الواجب والفرض کہ کیا تیرے کافر کہنے نے مجھے ڈرا دیا حالانکہ میں اجنبی قریب کا فرق جانتا ہوں۔ پس کیا کافر کہنا ہمارے زمانہ کے لوگوں کا ان کو ڈرا دیو لگا جو کفر و ایمان کی حقیقت جانتے اور حق و باطل میں تمیز کر سکتے ہیں *۔

غیرین: میں آج تک کفر کے فتوے کو نہیں سمجھتا کہ یہ کیا ہے۔ آیا کوئی نوشتہ خدا کا ہے جو جبریل امین لائے ہیں یا جہنم کے داروغہ کے نام کا وارنٹ ہے جو مولوی صاحبوں نے فرمایا ہے آخر یہ کیا بلا ہے غایۃ مافی الباب وہ ایک عالم یا چند عالموں کی رائے ہے۔ اس کی ہمارے نزدیک اسی قدر وقعت ہے جس قدر کہ حدیث موضوع اور بے سند کی شاہ عبدالعزیز صاحب کے نزدیک تھی یعنی گورنمنٹ میں نہیں خیال کر سکتا کہ کوئی شخص بیچھتا ہو کسی آدمی کے سینے سے گودہ لگا کر مفتی ہی ہو کوئی مسلمان کافر ہو جاوے گا یا خدا اس کے فتوے پر دوزخ میں بھیج دے گا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تقلیدی مسلمان جن کو انسان کہنا بھیجیا نہیں اور جن کی شان کا لکھا ہوا مل ہوا حاصل ہے وہ ان خوفناک کاغذوں کو دیکھ کر ڈرا دیں گے اور ایک کالے کاغذوں کو وحی آسمانی سمجھ کر کافر کہنے لگیں گے۔ اس سے زیادہ کوئی آفرین توحیدان فتووں کا نہیں ہے *۔

(تہذیب الاخلاق جلد اول ۳۷۳ تا ۳۸۰) *

انہیں ایام میں جب کہ آپ حیدر آباد میں تشریف فرما ہوئے، تو بعض مخالفین نے بہت سے اتہام اور افتراء آپ پر باندھے۔ چنانچہ نواب صاحب مدوح نے اپنی بریت کے لئے ان کے جواب میں جو ایک تحریر شائع کی وہ بھی اس مقام پر نقل کی جاتی ہے:-

لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ

اخبار فورالانوار میں میری نسبت ایک بزرگ نے پرستہ فرمایا ہے کہ وقت آنے حیدر آباد کے میں آج سے ملنے گیا اور انہوں نے پوچھا کہ حیدر آباد سے بھی مثل تحریر نچرتہ کار لکھا، یحیٰ اب اس کے میں نے کہا کہ برس و ز سے زیادہ ہو اکریں نے اس تحریر کو ترک کر دیا ہے اور یہ تحریر میری حسب اہل نظر کے تھی ورنہ باطن میرا وہ ہے جو اہل اسلام کا ہے *۔

یہ تحریر حضرت کی مراسر جھوٹ اور محض تمہت ہے سبحانک هذا بہتان عظیم چند روز پیشتر لوگوں نے ایسی ہی ہیروہ خبریں اڑائی تھیں اور میرے خاص دوستوں نے بھی مجھ سے استفسار کیا تھا میں نے جو خط عزیزِ ماجد علی کے سہلی کیفیت اپنی مشہور کر دی تھی۔ اب حیدر آباد آنے سے پھر منافق مسلمانوں کو یہ خیال شاید ہو ا ہو اور ان کو اپنے غلط خیال کے موافق گمان تبدیلی خیالات اور وضع کاری میری نسبت پیدا ہو ا ہو مگر میرے

مذہبی خیالات اور دلی دلولوں میں کچھ فرق نہیں ہوا۔ مسلمانوں کے مذہبی ادھام کی غلطیاں ظاہر کرنے
اور ان میں تہذیب شائستگی پھیلانے کا خیال صیانت تھا وہیابی ہے۔
انہیں خود دل آزاری جو آگے تھی وہ اب بھی وفا کی ہر کوئی یاری جو آگے تھی وہ اب بھی ہے
میں نے زمانے سے اعتقاد کو بدلا، نہ اپنے خیال کو، نہ اپنی وضع کو، نہ اپنے لباس کو، نہ اپنی طرز معاشرت کو، اور
انشاء اللہ العزیز ہے

تازہ میخانہ دے نام و نشان خواہد ہو سرما خاک رہ پیڑیاں خواہد بود
حلقہ پیر غمغماں زائل درگوش است ماہانیم کہ بودیم وہاں خواہد بود
مولوی محمد علی صاحب کی تحریروں کی تاثیر بھی میری توبہ کی ایک نیالی وجہ قرار دی گئی ہے۔ مگر بس سچ کہتا
ہوں اور سراسر سچ کہتا ہوں کہ ان کی اکثر تحریرات کا اثر اگر کسی کے دل پر ہو سکتا ہے تو اتنا ہی کہ اسلام
شہوت رانی اور ظلم اور فساد اور بداخلاقیوں کا ذریعہ اور جھوٹی کہاںوں اور بیوہ خبروں اور عقل حقیقت کی
مخالفت باتوں کا ایک مجموعہ ہے نہ اسلام سے دنیوی برکتیں نہیں نہ نبی نوع انسان کی معاشرت اور اخلاق میں اس
اصلاح ہوئی۔ حق یہ ہے کہ مولانا صاحب پادریوں پر احسان کر رہے ہیں اور ان کو اسلام کی غلط برائیوں کے
ظاہر کرنے اور اس کی اصلی خوبیوں کے چھپانے میں مدد دے رہے ہیں۔ جو سیاہی ہو جو وہ اسلام کے چہرہ سے دُور
کی جاتی ہے۔ مولوی صاحب کسے پھر گناہیتے ہیں۔ اور جو الزام مسلمانانہ مذہب سے دُور کیا جاتا ہے مولانا صاحب
اُسی کو چھ چھڑا دیتے ہیں۔ پس جب کہ میرے نزدیک مولانا صاحب کا دل دماغ ایسا ہوا اور میرے دل پر ان
کی تحریات کا ایسا اثر ہوتا ہو تو اُس سے مجھے کیا ہدایت ہو سکتی ہے۔ ہاں ان کی تحریات سے کبھی کبھی غلط اعمال
کی کج بکھیل کا فرہ آجاتا ہے یا حیرتی و مصلح پڑھنے والوں کے لفظی مباحثوں کی تفسیر انکھوں کے سامنے
پھر جاتی ہے مگر سچ۔ اس وقت مجھے ایک حکایت منقووم یاد آئی ہے کہ شائقین کے مذکر کرتا ہوں۔ سنو والے
اُسے میری زبان سے سنیں اور داد دیں

عارف از کوہ صحرانگشت دیدار زیل بامان وشت دل ز غم و سوہ پر داخست دیدہ ز نیرنگ تہی ساختہ
گفت بدو عارف صحرانورد کو چہ دریں بادئے ہرزہ گرد طبع تو آسودہ ز سوہ صیحت این قدرت کنیدی لباس صیحت
کار تو دوسوہ و مخالفت باز چہ اماندہ از کار گاہ تفرقہ بخش صف طاعت نہ رختہ گر سکتا جلالت نہ
دو صف اصحاب نسیب تو کو جادوے جبریل فریب تو کو شعبہ انگیزے خوبت کجائے غمے بد عہد ہجرت کجاست
رہن و دران بدل بدنگال طنز کنان داد جواب و ال کز رکات علمائے زماں فارغ از کشاکش این آں
داشت مرا باز این جد جہد حیدر گریہ فقیہان عہد یک تن از بس طائفہ لایوس از پشے گراہے کوئیں بس
اب میں اپنے دوستوں اور یاروں کی خدمت میں صاف صاف عرض کرتا ہوں کہ اگر کوئی میری نسبت ایسی لغو
اور بیہودہ اور جھوٹی خبریں اُڑائے اُسے غلط اور تمسک سمجھیں۔ اور نا محین دل سوز کی حضور میں بھی یہ التماس ہے کہ آئندہ

نصیحت سے صاف فرمادیں اور اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں۔

من ترک عشق بازی و ساغر نے کم
صد بار تو بہ کرم و دیگر نے کم
شیخ بظرف گفت حرام است سے مخور
گفتم گو کہ گوش یہ ہر جو نے کم
تقیہ میں پس است کہ چون اہل شر
ناز و کشمہ بر سر منبر نے کم

یہ ایسے درد انگیز حالات ہیں کہ لکھے نہیں جاسکتے اس لئے الحال ان کو یہیں چھوڑ کر ان بچروں کے جمع کرنے کا باعث عرض کیا جاتا ہے۔ یحیال اس بیچ میرے نکل میں اُسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب کہ ۱۹۳۷ء میں بندہ نے نواب صاحب مدوح کے مضامین متعلقہ تہذیب الاخلاق کو ترتیب یافتہ۔ مگر ہر ایک کام اپنے وقت پر انجام پاتا ہے۔ اس لئے کئی ایک بواعث سے وہ ارادہ ملتوی رہا۔

ابہ جان خواہات بہتہ کو خاکسار نے پرانہ اور ایک دوسرے سے الگ کیا، تو میں نے مجسم کر لیا۔ کہ مش سرتیہ موم و مخوروں کے پکھروں کے انہیں بھی ہر ایک جگہ سے تلاش کر کر ایک کتل مجموعہ کی صورت میں لاؤں تاکہ اسکا اندازہ ہو جو نسوں کے لئے ایک تیرہ دانش اور خواہات کا خزانہ کھل جائے پس جہاں تک سیکر حیلہ امکان میں تھا میں نے قسم قسم کی کوششوں سے کام لیا بہت سی کتابوں کو پڑھا اور پیشا اخباروں، رسالوں، اور کانفرنس کی رپورٹوں وغیرہ کی درق گردانی کی۔ بڑے بڑے اہل علم لوگوں سے بندہ بوجہ تشریف لیا۔ اور شاید یہی کوئی ایسا لکچر یا سیمینار ہو جو اس مجموعہ سے باہر گیا ہو۔ جہاں تک میری وسعت میں تھا میں نے خوشخط لکھوانے اپنا وقت اور زور کثیر خرچ کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔

اس موقع پر آگئیں اپنے قدیمی دوست حضرت حافظ مولوی امام الدین صاحب گجراتی کا شکریہ ادا نہ کروں تو بے انصافی میں داخل ہو گا جنہوں نے درق گردانی پکھروں کی تلاش۔ اپنی کتابیں دینے اور ہر ایک قسم کی امداد میں فرق نہیں کھا۔ پس میں ان کا تودل سے شکر گزار اور ممنون احسان ہوں۔

ناظرین باتیں گیں سے التجا کرتا ہوں کہ اگرچہ سے اس کام میں کوئی فروگزاشت ہو گئی ہو، تو اس کی اصلاح فرمادیں (مگر نہایت تہذیب اور متانت سے) تاکہ دوسرے اڈیشن میں اس کو درست کیا جاسکے۔ اس مجموعہ کا نام مجموعہ لکچر و سیمینار حصہ اول رکھتا ہوں۔ اگر حیات استخار باقی ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کا دوسرا حصہ بھی جلد ہی ریلک کے سامنے پیش کروں گا۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مسکین ملک فضل الدین گکے زئی

تاجر کتب قومی۔ لاہور

۱۵۔ دسمبر ۱۹۰۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نمبر ۱

اسپیج

بقام ڈاکٹر سکول مرزا پور تاریخ ۲۳۔ مئی ۱۸۷۸ء کو فیض عظیم سالانہ انعام کے جلسہ ہوا اور اکثر رئیس اور
حاکم تشریف لائے۔ اول بیڈ ماسٹر صاحب نے انگریزی میں پچھو دوسرے ماسٹر نے اردو میں پوٹ
سنائی۔ بعد اُس کے رابرٹن صاحب کلکٹر مرزا پور نے انگریزی زبان میں ایک مختصر اسپچ کر کے یہ فرمایا
کہ اب میرے دوست مولوی ہمدی علی ڈپٹی کلکٹر صاحب کچھ تقریر کرینگے۔ اور اردو زبان میں
آپ لوگوں سے کچھ کہینگے۔ بعد اُس کے مولوی ہمدی علی صاحب کھڑے ہو کر زبان پر یہ تقریر کی :-

اے حاضرین جلسہ! جو رپورٹ حالات مدرسہ کی ابھی بیڈ ماسٹر صاحب نے
انگریزی میں اور بابو صاحب نے اردو میں سنائی اُس سے آپ کو طلبہ کی تعداد اُن کی تعلیم کی وجہ
اور اُس کے نتیجے معلوم ہو گئے اب اُس کا اعادہ بیٹا ندہ ہے مگر میں اپنے اوپر ضروری سمجھتا ہوں
کہ جو فرق اُس مدرسہ کی حالت میں بہ نسبت سابق کے ہو اُسے اُس کچھ تھوڑا سا بیان کروں :-

۱۸۶۹ء میں میں نے اس مدرسہ کو دیکھا اور چند مرتبہ عربی۔ فارسی۔ اردو۔ درجوں کا امتحان
لیا اور انگریزی طلبہ کی استعداد و لیاقت کی کیفیت اور محنتیں سے سنی۔ اس زمانہ میں اس مدرسہ کی تعلیم
کی کیفیت کہ روستائے شہر اپنے لڑکوں کو مشن سکول میں بھیجنا پسند کرتے تھے اور بوجہ ناقص ہونے
تعلیم کے اور بے انتظامی مدرسہ کے یہاں داخل کرانا منظور نہ کرتے تھے۔ مگر جب سے گارڈن صاحب
ماسٹر مقرر ہوئے اُن کی لیاقت اور محنت و توجہ خصوصاً اُن کی خوش اخلاقی اور تہذیب کی وجہ سے
صوت مدرسہ کی بدگلی طلبہ بھی بڑھ گئے۔ استعداد میں بھی اُن کی ترقی ہوئی۔ اب ریمان شہر اپنے
دارثوں کو اسی مدرسہ میں بھیجتے ہیں اور یہاں کی تعلیم کو پسند کرتے ہیں اور گارڈن صاحب کے شکر گزار
ہیں۔ عربی درجہ میں بھی اچھی ترقی ہوئی۔ مولوی حسین الدین صاحب کی برکت سے چند طالب علموں کے
سر فیضیت کی کڑی بھی بندھ گئی۔ بلاشبہ مولانا صاحب بڑے مفسر بڑے محدث بڑے عالم اور

جامع معقول و منقول ہیں۔ دُور دُور سے لوگ اُن سے پڑھنے آتے ہیں جس قدر انہوں نے محنت کی ہے اُس قدر تنخواہ نہیں پائی۔ جس قدر انہوں نے علوم کی تعلیم کی گو اُن علوم کی نسبت میری رائے کسی ہی ہو اُن کی تعلیم میں ذرا شک نہیں۔

یہ چند فقرے کہہ کر ڈپٹی صاحب عربی کے طلبہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن سے مخاطب ہو کر یہ تقریر کی:-

اے میرے ہم قوم اور ہم مذہب طلب علموں! تم ذرا میری باتوں کو غور سے سنو اور انصاف اور دانشمندی سے اُسے سوچو کہ میں تمہاری بھلائی کے لئے کیا کہتا ہوں۔

اگرچہ میں نہایت خوش ہوں کہ تم اپنے قدیم علوم کی تعلیم پر توجہ ہو اور ایک نہایت دل پراثر کرنے والے شوق سے اُس کی تحصیل کرتے ہو اور تم میں سے چند طلبہ نے کامیابی بھی پائی اور فضیلت کے خطاب پالینے سے اپنی عزت حاصل کی۔ مگر حقیقت میں تعلیم ناکافی ہے اور جو نتیجہ علم کا ہے وہ اس سے حاصل نہیں کیونکہ تم نے دو قسم کے علم حاصل کئے۔ ایک منقول دوسرے معقول۔ پہلی تعلیم نے تم کو تقلید میں کامل کیا۔ دوسری نے چند غلط اور بے اہل او عام کو معقولات صحیح کی صورت میں تمہارے دل پر نقش کیا۔ نہ اُس سے جیسا کہ چاہئے تمہارے دین کو فائدہ ہوا۔ نہ اُس میں تمہاری عقل کو ترقی ہوئی۔ مذہب ہی تعلیم سے غرض صرف یہ ہے کہ وہ باتیں جو خدا نے اپنے سچے رسول کی معرفت بذریعہ وحی کے بتائیں اُس کی روشنی ہائے دل پر پڑے اور ہم اُن کی حقیقت سے واقف ہوں اور اُن کی حقیقت اور سچائی ہمارے دل پر اپنا ایسا اثر کرے کہ تقلید بلکہ تحقیقا ہم اُن کو تسلیم کریں۔ مگر جو تعلیم تم نے پائی اُس نے یہ فائدہ نہیں پہنچایا نہ تم اُس کی حقیقت سے واقف ہوئے نہ بیواسطہ اُس نور کی شمعیں تمہارے دل پر پہنچیں۔ تمہاری مذہبی تحقیقات اُن لوگوں کے قولوں پر ختم ہو گئی جو شل تمہارے بغیر معصوم اور جن کی رائے میں تمہاری طرح خطا و صواب دونوں کا احتمال تھا۔ افسوس کہ تم نے اہل حشر سے پانی نہیں پیا۔ جو نہایت شیریں اور صاف اور موتی کی طرح چمکتا ہے بلکہ اُس حوض کو اہل حشر خیال کیا جو یہ بضع کی طرح گندہ ہو رہا ہے۔ تم نے اپنے دینی عقائد اور مذہبی اقوال کو خدا کی کتاب سے خود تحقیق نہ کیا۔ بلکہ لوگوں کی رایوں اور قولوں اور خیالوں ہی پر اپنے مقدمات کی بنیاد قائم کی تم نے اپنے فقہی مسائل اور شرعی احکام کو سچی باتوں سے رسول کی خود دریافت نہیں کیا بلکہ جو لوگ کھ گئے اور کہ گئے اُسی کو منزلِ امن سمجھا اور پھر افسوس یہ ہے کہ اگر تم جاہل رہتے اور کچھ تعلیم نہ پاتے تو تم اس کو راہِ تقلید میں پڑنے سے معذور ہوتے۔ مگر افسوس اور ہزار افسوس اُس پر ہے کہ تعلیم نے تم کو نتیجہ دکھلایا اور علم کے حاصل کرنے سے یکاے تحقیق کے تم نے تقلید کو حق جانا۔

یہ تم خیال کرو کہ معاذ اللہ میں مذہبی تعلیم کو بُرا جانتا ہوں۔ میں کافر ہوں اگر ایسا خیال کروں بلکہ

میں ہر مسلمان پر فرض سمجھتا ہوں کہ وہ مذہبی تعلیم پاوے اور اپنے دنیاویات میں کامل واقفیت حاصل کرے لیکن اگر میں متانت ہوں تو صرف اُس کی طرز و طریق پر کیونکہ جو تعلیمی تعلیم تم حاصل کرتے ہو یہ حقائق دینی کے ادراک کے لئے اور مسائل شرعی کی حقیقت پر پہنچنے کے لئے ناکافی ہے بلکہ مزاحم ہے انصاف کرو کہ کیا حاصل ہوا تم کو تعلیم سے جب کہ تمہارے خیالات میں بلندی اور تمہاری عقل میں ترقی نہ ہوئی۔ اور تمہارے دل نے اصل مذہب کی روشنی نہ پائی۔ اور کیا فرق ہوا درمیان اُن عامیوں کے جو تمہاری تقلید کرتے ہیں اور درمیان تم عالموں فاضلوں کے جو تم ادروں کے پیچھے چلتے ہو۔ پس اُس تعلیم سے جس نے تم کو راد تقلید میں مبتلا کیا تمہارے مذہب کو کیا فائدہ ہوا ؟

مگر یہ حقیقت میں قصور تمہارا نہیں ہے۔ وہ سلسلہ تعلیم کا ایسا ہے کہ جب تک بڑی مضبوطی اور دشمنی اور ایمانی قوت کے اور اچھی سمجھتی ترقی سے اُس میں اصلاح نہ کریں اور اُس کے حسن وقوع سے بحث کر کے دوسری راہ نہ بتاویں تب تک تم سوائے اس کے کہ آنکھ بند کر کے اُس پر چلو کیا کر سکتے ہو ؟

خیر مذہبی تعلیم کو چھوڑو۔ اب اپنے معقولی سلسلہ پر نظر کرو اور سوچو کہ تقلید نے اُسے بھی کس اہم حالت پر پہنچا دیا ہے اور اُس سے کیا نتیجہ تم کو حاصل ہوتا ہے۔ تمہارا علم معقول چند یونانی سلسلوں کے جاننے پر منحصر ہے اور گئی ہوئی باتوں کی واقفیت پر اُس کا مدار ہے۔ حقیقت میں معمولی کتابوں کے چند روتوں کا الٹ پلٹ کر لینا اور طوطی کی طرح اُسے زبان کدینا تمہارے علم کی انتہا ہے اور چند فلسفی باتوں کا جس کی حقیقت پر بھی ہرگز تم نہیں پہنچتے یا دکر لینا تمہارا مبلغ علم ہے۔ حساب میں اگر تم نے خلاصۂ الحساب کی ضرب شکہ سیکھ لی تم محاسب ہو گئے۔ شرح چمنی کے دو جزو اگر پڑھ لئے تو تم رشک اطمینوس بن گئے۔ مجبلی کے لفظ یاد ہونے سے تم اپنے آپ کو افلاطون جاننے لگے۔ مگر اے میرے عزیزو۔ تم اپنے بھائیوں کو جو اسی مدرسہ میں ابتدائی تعلیم پاتے ہیں دیکھو اور اُن کی باتوں سے اپنے واقف حقائق کو مقابلہ کرو۔ تب تمہیں معلوم ہو کہ تم کس غلطی میں پڑے ہوئے ہو۔ اے طالب علمو۔ ذرا ان لوگوں سے عناصر کی حقیقت سنو تب اسطقتات اربعہ کی ماہیت جاننے پر خوش ہو۔ ذرا طبیعیات کے مسائل کا تجربہ کر کے دیکھو۔ تب میبذی اور صدرہ کی طبیعیات پڑھ لینے پر ناز کرو ذرا آسمان وزمین کا کردہ جو اس وقت تمہارے سامنے رکھا ہے ہاتھ میں اٹھا کر اُس کی کیفیت پوچھو پھر اپنے فلکیات پڑھ کر آسمان وزمین کے قلابے ملاؤ فرسوس ہے۔ کہ یہ سب چیزیں تمہارے سامنے ہیں اور تم اُن کی حقیقت دریافت کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرتے اور اُس کی غلطی و محنت پر آگاہ ہونے پر متوجہ نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ تم میں جو علوم سے فائز ہو چکے اور جنہوں نے پکڑ لی فضیلت کی سرور باندہ لی اور جن کو جناب سیدنا دنا نے معقول و معقول کی سند بھی دیدی ذرا میرے ساتھ اسٹیشن پر چلو اور ایک انجن کو دیکھ کر اُس کے چلنے کا سبب بتاؤ شاید تم ویسی ہی باتیں کرو گے جیسا کہ وہ دہقان جو اپنا بل بیل چھوڑ کر اُسے دیکھ کر حیرت زدہ ہو۔ اور عامیانہ باتیں کرے تم اُس کی دم

سے واقف ہو گئے نہ سر سے۔ پھر ذرا تا رکھ کر وہ میں تشریف لیچا اور اُس کمر بانی قوت کی حقیقت بتاؤ۔
وہاں بھی سوائے اخبار حیرت کے آپ لوگوں سے کچھ نہ ہو گا۔ پس افسوس کا مقام ہے یا نہیں کہ تمہارے
معقولات اور ہندسہ اور ہیئت اور ریاضی اور طبیعیات نے تم کو ایک عامی آدمی کے درجہ سے بھی نہیں
بڑھایا اور ذرا بھی کوئی مادہ تحقیق کا نہیں دیا۔ پس آپ کے علم و فضل سے کیا توقع قوم کی ترقی اور علم کی
روشنی پھیلنے کی کی جاوے؟

اے ہوشیار طالب علمو! کیا خدا نے تم کو اور قوموں کی طرح مادہ تحقیق کا نہیں دیا ہے یا تمہارے
دل و دماغ کو ان باتوں کے سمجھنے کے لائق نہیں بنایا۔ میرے نزدیک شاید ساری دنیا میں ہماری ہی
وہ قوم ہے کہ جس کے دل و دماغ کے برابر دوسرا نہیں۔ کیا یہ وہ قوم نہیں ہے جس نے یونانیوں کو چھ مسائل
سیکھ کر اُسے ایسی ترقی دی کہ اگر فلاطوں و ارسطوں زندہ ہوتے تو وہ بھی قدموں پر گر کر گیا ہم لوگ وہ
نہیں ہیں جن کے اجداد نے ساری دنیا کو معقولات کی روشنی سے منور کیا۔ یورپ کا ملک کیا ہماری
شاگردی پر کسی زمانہ میں فخر کرتا تھا۔ کیا اب یہ بڑے بڑے محقق ہمارے اسلاف کے علم و فضل سے فیضیابی
کا اقرار نہیں کرتے۔ پس رونے کا مقام ہے کہ ایک ایسی باہمت اور عالی دماغ اور بلند حوصلہ قوم ایسی
پست اور ذلیل اور اتر جائے کہ چاروں کے لڑکے لڑکیوں کے بچے اُن پر ہنسیں اور
اُن کے دل و دماغ کو علوم کی تحصیل کے لائق نہ جانیں۔ سچ ہے جو خدا نے فرمایا ہے تِلْكَ اَلْاٰیٰم
نُذٰرٌ لِّهَآبِیْنِ النَّاسِ کَیْسِی قَوْمٌ کَیْسِی ہوجاوے؟

لیکن اس ذلت و ادبار و جہالت کا سبب صرف تمہارا تعصب و تقلید ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ انگریزی
پڑھنا منع ہے۔ کوئی فرماتا ہے کہ علوم جدیدہ سیکھنا حرام ہے۔ کوئی اس خط میں مکتا ہے کہ انگریزی مدرسوں
میں تعلیم لینے سے مذہب جاتا رہیگا۔ کوئی اس فتنہ میں ہرست ہے کہ تحقیق کرنے اور پرانے خیالات کو
چھوڑنے سے خرق اجل کا لازم ہو گا۔ اگر حقیقت میں تمہارا مذہب ایسا ہی بودا اور تاپا مٹا رہے اور
وہ تمہارے نزدیک ایک طلسم کا رخا نہ ہے تو کب تک تم بچاؤ گے۔ آج ہمیں کل۔ کل نہیں پرسوں
وہ گرجا دیگا۔ اور ان نئے منترؤں سے جو بچے سیکھتے جاتے ہیں طلسم درہم درہم ہو جاوے گا۔ مگر ہمارے نزدیک
تو وہ ایسا مضبوط قلعہ ہے جس کی بنیاد ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر ہے کہ طوفان نوح سے بھی اُسے صدمہ نہ پہنچے گا
اور علوم کی تحصیل اور حقائق اشیا کی تحقیق سے اُس کا نور اور چمکے گا؟

اے میرے عزیزو! فرماؤ روں رشید اور خلفائے عباسیہ کے عہد دولت پر خیال کرو، ہر اکہ کی علمی
مجالسوں کو دیکھو کہ انہوں نے علم کی ترقی اور معقولات کی تحقیق میں کیا کیا کوششیں کیں اور انہوں نے اس
تحقیق کی بدولت اسلام کی کیسی عزت ظاہر کی۔ غزالی، رازی، ابن سینا، ابن خلدون اور فارابی اور حسن و کمالیہ کیسے
نامور ہوئے کہ جن کا نام اب بھی غیر قوم کا کوئی محقق بغیر تعظیم کے نہیں لیتا۔ مگر افسوس ہمارا افسوس کہ وہ لوگ

مر گئے۔ اُن کی جگہ ہم پیدا ہوئے ۵

حرفیاں بادِ ماخوردند و رفتند تھی نخمِ نہا کردند و رفتند

لیکن اگر تم کو کہ اب بھی تم اُن کی باتیں جانتے ہو اور انہیں کی تحقیقاتوں کو پڑھتے ہو تو غلطی بہت سی باتوں میں فرق ہو گیا۔ بہت سی چیزیں بدل گئیں تحقیقات اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی۔ اکثر چیزوں کی غلطیاں کھل گئیں۔ اس واسطے وہ اپنے زمانہ کے خیال کے لحاظ سے محقق تھے۔ مگر اب اُن کی تحقیقاتوں کے ماننے والے جاہل اور مقلد ٹھہر چکے۔ دیکھو بطلیموس کیسا بڑا حکیم تھا مگر ذرا اُس کا جغرافیہ دیکھو۔ اُس نے جو زنی دنیا کا نقشہ کھینچا تھا اُسے ملاحظہ کرو۔ اور اب کے جغرافیہ اور حال کی زمین کے کرہ سے ملاؤ تو کتنا فرق پاؤ گے کہ اگر اس زمانہ میں کوئی ایسے جغرافیہ کو لکھے تو وہ احمق ٹھہرے مگر سب اُس نامور حکیم کی اُس تحقیقات کو اُس کی عالی دماغی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ پس تم جو اس خیال میں مبتلا ہو کہ علم اگلوں پر تمام ہو گیا۔ ساری تحقیقاتیں پرانے لوگ کر گئے۔ اب اُن کا جانا ہی منہا ہے علم ہے یہ نادانی ہے۔ اس لئے ذرا تم ان عامیہ خیالات کو چھوڑو اور اپنی قوم کی جس کے ڈوبنے میں کچھ باقی نہیں رہا دستگیری کرو نہ کہ اُس کے غرق کرنے کی تدبیر کرو ۶

بھلا انصاف سے اس کا جواب دو کہ تم عالم بھی ہو گئے فقیہ بھی بن گئے۔ صدرہ شمس بازغہ پڑھ کر جامع معقول بھی ٹھہر چکے۔ مگر اب تم خود کیا کرو گے اور مدرسہ سے نکلنے کے بعد اپنی قوم کی کیا بھلائی کرو گے۔ میرے نزدیک تمہارا معقول تو اس کام کا بھی نہیں کہ کسی علمی جلسہ میں بیٹھ کر بات سمجھنے کی بھی لیاقت اُس سے حاصل ہو۔ چہ جائے کسی صنعت دہن کے ایجاد کرنے کی توقع ہو یا کسی نئی تحقیقات کرنے کی اُمید ہو۔ ہاں اُس کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ جب تم اپنے مشرب کے چند نو عمر آدمی بیٹھو تو اُن کی کتابوں کے حواشی اور شرحوں اور زوائد لفظوں سے بحث کر کے چند ساعت اپنی عمر عزیز ضائع کرو رہا تمہارا معقول اُس کا یہ نتیجہ ہو گا کہ کسی مسجد میں جا کر قصہ گوئی کرو گے۔ جھوٹی جھوٹی باتیں دین کی کسر نہایت ذلت اور بکر کے ساتھ روٹیاں کھاؤ گے۔ دنیا کی بُرائی دنیا داروں سے نفرت کا وعظ کہہ کر کوئی قصائیوں کے سامنے اپنا دامن پھیلاؤ گے۔ شاذ و نادر ایسے لوگ مچکینے جو سچا توکل کریں اور اپنے دل سے دنیا چھوڑ کر دین دار بنیں۔ پس یہ نتیجہ تو تمہاری ذات کے لئے ہوا۔ رہی قوم کی بھلائی۔ پس علم اور حکمت اور عقل کی ترقی کی تو تم سے کچھ اُمید نہیں۔ کیونکہ وہ آلہ ہی تمہارے پاس نہیں جس سے وہ کام ہو۔ ہاں دین کی ترقی کا تم خیال کر سکتے ہو۔ مگر میرے نزدیک سوائے اس کے کو نقص اور جہالت اور تقلید کی ترقی ہو تمہاری ذات سے اور کچھ اُمید نہیں۔ چند جہلا میں بیٹھ کر شیخی کی باتیں کرو گے۔ اُن کے دلوں میں جو تعصب اور تقلید کی آگ ہے اُسے اور مشتعل کرو گے۔ نہ اخلاق میں تہذیب۔ نہ عادات میں مصلح۔ نہ معاشرت کے طریقوں کی درستی۔ نہ چال چلن میں شائستگی کی تم سے توقع ہے نہ غلط

خیالات اور نہ بیودہ اودام کے دور کرنے کی تم سے امید ہے کیونکہ تم نے خود ہی ایسی تعلیم نہیں پائی ۲۰ سویرہ
کو تم کیا تعلیم کرو گے *

پس اے میرے بھائیو! جب تک کہ تم تعصب و تقلید نہ چھوڑو گے اور علوم جدیدہ کی تحصیل پر
توجہ نہ ہو گے تب تک تمہارا علم اور تمہارا جہل یکساں ہے *

میں نے تمہاری بہت سمیع خراشی کی اور شاید تم میں سے بعض کو نہایت غصہ دلایا۔ مگر الحق مر
حق کہنے نے مجھے اس کہنے پر آمادہ کیا اگر حیات تمہاری نہ ہوتی تو ہم سے ادنیٰ درجہ کے آدمیوں کو
ایسی بڑی باتوں کی زبان سے نکالنے پر کب جرأت ہوتی۔ خیر خدا رحم کرے اور ہماری قوم کو لے
بھی ترقی و علم و دولت کی راہ کھولے *

نمبر ۲

لکچر

جو رزپور انسٹیٹیوٹ میں ۲۲-اکتوبر ۱۸۷۸ء کو دیا

حضرات! اس رات کو میرا لکچر مسلمانوں کی تہذیب پر ہے کہ وہ پہلے کیسی تھی اور اب کیسی ہے
اور آئندہ کیسی ہوگی۔ تہذیب کا لفظ میں نے انگریزی لفظ سولائزیشن کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے۔
سولائزیشن ایک انگریزی لفظ ہے جو کہ قدیمی رومی زبان کے لفظ سوس سے جس کے معنی شہری اور
جماعت کے ہیں نکلا ہے اور اس کی نسبت اس جماعت یا شہر یا ملک کی طرف جاتی ہے جس میں لوگوں
کی آزادی اور حقوق کی حفاظت کے قانون۔ اور آپس میں ملنے جلنے کے قاعدے۔ اور زندگی بسر
کرنے کے طریقے۔ اور فرائض انسانی ادا کرنے کے قواعد عقلی اور اخلاقی اصول پر منضبط کئے گئے ہوں
اور جن میں موافق حالت زمانہ کے نوجوانی اور شائستگی پائی جاتی ہو۔ اس انگریزی لفظ کی اصل پراگیشیاں
کیا جاوے تو مجھ کو بجاے لفظ تہذیب کے لفظ تمدن کا استعمال کرنا مناسب ہوتا۔ کیونکہ اس کا
ماوہ مدینہ ہے جس کے معنی بستی کے ہیں اور اس لئے تمدن کے ٹھیک معنی بستی کے ہیں دینی آپس میں
ملکر رہنا، مگر میں اس لفظ کو سولائزیشن کے مقابلہ میں استعمال نہیں کرتا۔ اس لئے کہ جس مادی میں یہ
انگریزی لفظ استعمال کیا جاتا ہے تمدن کے لفظ سے وہ مراد پائی نہیں جاتی۔ تمدن کا لفظ آپس میں
ملکر بنتی پر دلالت کرتا ہے۔ اور سولائزیشن کا لفظ تمدن کی ترقی یافتہ حالت کو بتاتا ہے نہ صرف تمدن کو
بہت سے ملک اور بہت سی قومیں اب موجود ہیں جن میں تمدن ہے۔ پر سولائزیشن نہیں ہم ہندوئی

یعنی اپنی بدترستی سے سویلیزیشن کے درجہ کو نہیں پہنچے گو کہ مدت سے تمدن کے اعلیٰ درجہ پر ہیں اس لئے میں نے تہذیب کا لفظ اختیار کیا ہے جس کے معنی چھلانگ اور اصلاح کرنے اور درست کرنے اور خالص کرنے اور پاکیزہ کرنے کے ہیں۔ عرب بولتے ہیں۔ ”ہذا بہ ای اصلہ“ اصطلاح میں بھی تہذیب کا لفظ ہر چیز کی درستی پر بولا جاتا ہے۔ عادت کی درستی۔ رسم و رواج کی درستی۔ اخلاق کی درستی۔ علم و ہنر کی درستی۔ معاملات کی درستی۔ زبان کی درستی۔ انتظام ملک کی درستی۔ جذبات نفسانی کی درستی۔ سب پر تہذیب کا اطلاق ہوتا ہے اور یہی ٹھیک مادہ سویلیزیشن کی ہے۔

جن اصطلاحی معنوں میں لفظ تہذیب یا لفظ سویلیزیشن کا ہم استعمال کرتے ہیں اُس پر بہت سا مباحثہ ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ مگر جو مراد کہ اس لفظ سے میرے دوست پیدا احمد خاں بہاؤرنے بیان کی ہے وہ تمام خیالات کی جامع ہے اور میں اُسی کے بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ”سویلیزیشن سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریق تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہنر کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش سلوکی سے برتنا جس سے اہلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے۔ اور تمکین و وقار اور قدر منزلت حاصل کی جاتی ہے اور خوشیانیہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔“

مبارک ہو اُس شخص کو جس نے ان مختصر لفظوں میں ایسے مطالب بیان کر دئے جس سے ہمارے خیالات کو نہایت وسعت ہوتی ہے۔ اور وہ بیان ہی خود بخود ہمارے دل کو سویلیزیشن کی ترقی کے لئے براہِ گنجینہ کرتا ہے۔

جو مراد کہیں نے لفظ تہذیب یا سویلیزیشن کی بیان کی اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ تہذیب مذہب اور علم و ہنر۔ اخلاق و معاشرت۔ تمدن و تجارت۔ زراعت و سیاست سب متعلق ہے۔ اور جب تک یہ سب چیزیں اپنے درجہ کمال پر نہ ہوں پوری پوری تہذیب کا وجود نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں میں یہ سب چیزیں نہایت خراب حالت میں ہیں وہ وحشی کہلاتے ہیں اور جن میں کچھ کچھ درست ہو گئی ہیں وہ نصف وحشی پکارے جاتے ہیں۔ اور جن میں زمانہ کی ترقی کے موافق یہ سب چیزیں ترقی پا گئی ہیں وہ مہذب یا سویلیزڈ کہلاتی ہیں۔ زمانہ کی ترقی کے موافق کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ کچھ عجیب نہیں کہ آئندہ زمانہ میں انسان کو زمانہ موجودہ سے بھی ایسی زیادہ ترقی ہو کہ حال کی مہذب قومیں اُس زمانہ کے لوگوں کے سامنے وحشی یا نصف وحشی تصور ہونے لگیں۔

مذہب کو قوموں کی تہذیب پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کے مذہبی اہول تہذیب کے برخلاف ہوں تو ممکن نہیں ہے کہ وہ قوم اعلیٰ درجہ کی تہذیب میں پہنچے۔ جس قدر اہول مذہبی تہذیب کے برخلاف ہوتے ہیں اُسی اندازہ کے موافق تہذیب میں بھی نقصان رہتا ہے اور یہ بات

نہایت آسانی سے مختلف مذاہب کے اصول اور اُس کے پیروں کی حالت دیکھنے سے ثابت ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں نے مذہبِ اسلام کی پہلی صدیوں میں غلبہی تہذیب کو اعلیٰ درجہ پر پہنچایا تھا۔ اُس ریگستان کے ناخانے لات و منات و عزے کی پرستش کو چھوٹا دیا۔ اور ایک نہایت قوی ہستی مطلق کی پرستش کا بیج ہر ایک کے دل میں بویا۔ ہم کو ایک ایسی ہستی کا خیال دلایا جو ہمارے اور اک اور قول عقلی سے بہت بڑھ کر ہے۔ اور اُسی پر یقین کو نجات کا مدار ٹھیرایا۔ جو تمام مذہبی تہذیب کی اصل اصول ہے۔

تمام روحانی تہذیب کو ان چند لفظوں میں کہ ”قد افلم من زکاھا و قد خاب من ساھا“ پورا کر دیا یعنی اپنے دل کو بُرے خیالوں اور بد جذباتوں سے پاک کرنا مراد کو پہنچا ہے اور اُس کو بدی میں آلودہ کرنا گمراہی کے گڑھے میں گرنا ہے۔

مذہبی تعلیم کو نہایت تہذیب کے اصول پر یہ کہہ ختم کر دیا کہ ”ذکر انما انت مذکر“ یعنی لوگوں کو نصیحت کر کہ تو بجز نصیحت کرنے والے کے اور کچھ نہیں ہے۔

تمام مذہبوں کی ناگواری ان لفظوں سے منادی کہ ”لکھ دینکھ ولی دین“ یعنی تمہارا دین تمہارے لئے ہے اور تمہارا دین ہمارے لئے ہے۔ جہاد کا سبب مذہبی ناگواری نہیں ہے جیسا کہ اکثر لوگوں نے غلطی سے خیال کیا ہے۔ کیونکہ اگر جہاد کا سبب مذہبی ناگواری ہوتی تو صلح یا فتح یا اطاعت قبول کرنے کے بعد کیوں تمام مختلف مذاہب گوارا کئے جاتے اور ہر شخص کو کیوں احکام مذہبی ادا کرنے کی اجازت رہتی۔ عرب کے ہادی نے بلاشبہ غلطے واحد کے نام کی منادی کرنا فرض ٹھیرایا ہے۔ پس جو لوگ اُس منادی کی مذاحمت کریں اور منادی کرنے والوں کو اُن کے ہاتھ سے امن نہ ہو۔ انہیں سے لڑنا ضرر امن قائم رکھنے کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ زغیر مذہب کی ناگواری کے سبب۔ اور یہ وہ اصول ہے جس پر آج کل کی تمام شینیں یہاں تک کہ وہ شین بھی جس کا مذہبی یہ حکم ہے کہ اگر کوئی ایک گال پر تیرے طمانچہ مارے تو تو اُس کے سامنے دوسرا گال بھی کرے۔ چلتے ہیں۔

امامت کو یعنی کسی ایک کا کسی گروہ کے لئے پیشوا ہونا اور اُس گروہ کا اُسی کی راے پر چلنا جو اُس زمانہ کے تمام مذہبوں میں رائج تھا یہ کہہ کر بالکل نیت و نابود کر دیا کہ ”ولا تتبعوا من دونہ اولیاء“ یعنی خدا کے کلام کے سوا کسی دوسرے کو اپنا پیشوا مت بناؤ۔

اجتہاد کو یعنی دین کی باتوں کے سمجھنے کو جیسا کہ سب اگلی قوموں میں خاص خاص لوگوں سے مخصوص تھا ان مختصر لفظوں سے عام کر دیا کہ ”استفت قلبک“ یعنی ہر شخص کا دل اس کا مجتہد ہے۔ جو کئی پنپے اور تجرد کو جس کا رواج روے زمین کی ساری قوموں میں تھا بالکل معدوم کر دیا تھا۔ نیز ماکر کلامہ بانیۃ فی الاسلام۔ تبرکات اور رسم تیماروں کو جس سے لوگوں کے دلی خیالات

پست پرستوں کے سے ہو جاتے ہیں۔ ”لا تجعلوا قبری عیداً“۔ فرما کر بالکل منوع ٹھیکر دیا۔

• یہ وہ اصول ہیں جو مذہبی تہذیب میں اس سے اعلیٰ نہیں ہو سکتے۔

علوم کو اگلے مسلمانوں نے ایک اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر پہنچایا تھا۔ ادب و انشا میں عرب قدیم نامور ہیں۔ شاعری بھی اُن کی مشہور ہے۔ کیٹی لونیاء اور پروین اور اٹلی کے شاعروں نے انہیں کی روش پر شعر کہنا اختیار کیا۔ اور یورپ کی نظم میں بحر و وزن وغیرہ عرب ہی سے لیا گیا۔ فصاحت و بلاغت کی علمی پر ترقی کرنے کے ثبوت میں حریری اور یحییٰ اور متنبی کی کتابیں اب تک دنیا میں موجود ہیں۔ ساتویں صدی کی عورتوں کا کلام اب تک ہمارے پاس ہے جس کے ایک ایک فقرہ پر ہزاروں در شاہوار کی لاکھوں لڑیاں شمار ہوتی ہیں۔

عرب کے شاعر قدرتی کیفیتوں کے بیان کرنے کی طرف بھی مائل ہیں۔ مگر شکسید یا قدرتی جذبات کا بتانے والا کوئی نہیں ہوا۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعروں کی قسموں میں رزمیہ اور عشقیہ تو ترقی پر تھیں مگر جو اصل جان شاعری کی ہے اور جس میں فطرتی جذبات اور قدرتی حالات کے بیان سے انسان کے دل پر اثر ڈالا جاتا ہے اُس میں بڑی ترقی نہیں ہوئی۔

نادل یعنی قصہ کے پیرایہ میں علمی یا اخلاقی باتوں کے بیان کرنے سے بھی مسلمانوں نے چشم پوشی نہیں کی۔ بدیع ہمدانی اور ابوالقاسم حریری کے مقامات اسی فن میں ہیں۔ الف لیلئے اس فن کی ایک عمدہ کتاب ہے جس کا مسلسل بیان کسی جگہ سے نہیں ٹوٹتا اور جس سے اُس زمانہ کے مسلمانوں کے مختلف خیالات کا پورا پورا عکس سننے والے کے دل پر پڑتا ہے۔

ڈراما میں بعض کتابیں تالیف تو ہوئیں۔ مگر علمی رواج اُس کا مسلمانوں میں نہیں ہوا۔ فارسی زبان کو بھی جو دنیا کی سب سے بڑی زبانوں میں شیریں سمجھی جاتی ہے مسلمانوں نے بہت رونق دی۔ فردوسی رزمیہ نظم میں۔ خسرو قدرتی کیفیات کے اظہار میں۔ سعدی اخلاق و تمدن کے ادا کرنے میں۔ فارس اور ہندوستان میں ہوئے ہیں جیسے کہ ہومر یونان میں یا شکسید فرنگستان میں۔ ہمارے مذہب کے بانی نے تحصیل علم کی طرف متعدد طرح سے لوگوں کو رغبت دلائی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی دوسری صدی میں مسلمانوں نے علوم کی طرف توجہ کی اور جہاں سے اُن کو ملا انہوں نے علوم کو اخذ کیا۔ غیر قوموں اور غیر مذہب والوں کی کتابوں کو نہایت عزیز رکھا اور چند روز میں اور قوموں کیلئے استاد ہونے کی عزت حاصل کی۔

اسکندریہ کے کتب خانہ کے جلانے کا الزام جو بعض نادانوں یا متعصبوں نے مسلمانوں کو دیا ہے وہ غلط ہے۔ کیونکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ٹولمیر کے کتب خانہ کی چار لاکھ یا سات لاکھ کتابیں جو لیس ہزار کی لڑائی میں جل گئی تھیں اور سینٹ کرائی نے جس نے اسکندریہ کی کتب خانہ کی تحقیق میں بہت سی کتابیں

لکھی ہیں اس روایت کو جھوٹا ٹھہرایا ہے جن دو مؤرخوں نے یہ کہانی لکھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے لکھی
کا کتب خانہ جلا دیا جو چھ مہینے تک جلا کیا۔ محض غلط ہے۔ خود وہ دونوں مؤرخ ۸۰ھ بعد اس واقعہ کے
پیدا ہوئے تھے اور کوئی پہلی سند ان کے پاس نہ تھی۔

فلسفہ کی بنیاد منصوص خلیفہ نے ڈالی مگر اماموں رشید اُس کے پوتے نے اُن کی تکمیل کی۔ یہ
خلیفہ بڑا مرتبی علم کا تھا۔ اہل شام اور سٹورین فرقے کے عیسائی ترجمیں فلسفہ کے اُس کے حامی اور معاون
تھے۔ اس کے زمانہ میں بوسید اہل فارس اور اسپین اور علمائے یہود کے فلسفہ کو بے انتہار رونق ہوئی
اُس کے گشتہ بلاد ارمین اور شام اور مصر میں یونانی کتابوں کو ڈھونڈنے کے لئے مقرر تھے۔ اور
ہزاروں اونٹ قلمی کتابوں کے بھرے ہوئے اُس کے دربار میں آیا کرتے تھے۔ کتب فلسفہ کے ترجمہ کا
ایک جدا کارخانہ اُس نے مقرر کیا تھا۔ اور بغداد اور کوفہ اور بصرہ اور نیشاپور میں بڑے بڑے مدرسہ
اور کتب خانہ قائم کئے تھے۔ یہ خلیفہ بے تعصبی میں مشہور تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک عیسائی عالم کو دمشق کے
کلچ کا پرنسپل یعنی مدرس اعلیٰ مقرر کیا تھا۔

جس طرح خلفائے عباسیہ کی بدولت بغداد کی سلطنت میں فلسفہ نے ترقی پائی اس سے زیادہ اسپین
میں خلفائے بنی اُمیہ کے سب سے روشنی فلسفہ کی بھیلی۔ اس ملک میں بڑا حامی علم اور حکمت کا خلیفہ
عبدالرحمن ابن حکم تھا۔ جس نے ہجرت کی تیسری صدی میں وفات پائی۔ اس ملک میں علم کی اس قدر ترقی
ہوئی کہ ایک کتب خانہ میں چھ لاکھ کتابیں تھیں اور پُرانی کتابوں کے نقل کرنے کے لئے تین سو کتاب
مقرر تھے۔

اسپین اور اٹلی میں صدائے مدرسے ایسے جاری تھے جن میں صدائے عیسائی طبلہ اگر فلسفہ اور حکمت پڑھتے
اور بچہ اپنے یہاں اُسے جاری کرتے اُس وقت کے مسلمانوں اور فرنگستان کے عیسائیوں کے خیالات
کا فرق اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جربرٹ نامی ایک فرانسیسی عالم جب مسلمانوں کے مدرسہ میں فلسفہ اور حکمت
یکے کے اپنے ملک کو گیا تو لوگوں نے اُسے کافر ٹھہرایا اور جب مر گیا تو یہ کہا کہ شیطان نے علم کا پھل کھلا کر
اُسے مار ڈالا۔

خلفائے عبیدین نے بھی جن کو یورپ کے متوحہ خلفائے فاطمہ لکھتے ہیں مصر میں کچھ کم ترقی نہیں کی
اُن کے شاہی کتب خانہ میں بھی ایک لاکھ قلمی کتابیں موجود تھیں جو سنہری جلدوں سے آراستہ اور
نہایت خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔

ہندوستان کے فتح کرنے والے بادشاہوں نے بھی اس طرف سے غفلت نہیں کی۔ محمود غزنوی
نے جس کو بعض تربیت یافتہ نامور ہندوؤں نے اپنی تحریروں میں وحشی اور قزاق لکھا ہے باوجودیکہ وہ
لڑائیوں میں مصروف تھا ایک بڑے مدرسے کی بنیاد غزنی میں ڈالی اور مختلف زبانوں کی عجیب عجیب

کتابیں جمع کیں اور قدرتی عجائبات کا ایک عجائب خانہ بنایا اور اس مدرسے کے قیام کے لئے بہت سا روپیہ مقرر کیا۔ سلاطین غوریہ اور تیموریہ نے بھی منطق اور ریاضی اور طبیعیات اور ادب کے رونق دینے میں بڑی کوشش کی۔ اکر کارمانہ علم کی ترقی کے حق میں مشہور ہے *

اُس زمانہ میں جو کہ یونان کی تاریخ کا جو تھا زمانہ سمجھا جاتا ہے فلسفہ کے چھ مختلف طبقے تھے مگر مسلمانوں نے اُن میں سے عموماً ارسطو کی حکمت کو اختیار کیا کیونکہ اُس کے فلسفہ کو سبب کوشش علمائے اسکندریہ کے ہزار برس سے غلبہ تھا اور اُس کا رواج بھی بہت ہو گیا تھا اور یہی سبب ہوا۔ کہ اُس کی حکمت کی کتابوں کا زیادہ ترجمہ ہوا۔ مگر وہ افلاطون کی تصنیفات سے بھی محروم نہیں رہے بلکہ اُس کی کتابوں کا بھی ترجمہ عربی میں ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں میں ابو نصر فارابی اور بوعلی سینا حکمت مشائی میں بے ہی ہونے میں جیسے کہ یونانیوں میں ارسطو اور حکمت اشراق میں شیخ شہاب الدین مقنولؒ دیا ہی نامور ہوا ہے۔ جیسا کہ افلاطون یونانیوں میں۔ مگر ارسطو کی حکمت کا زیادہ تر رواج مسلمانوں میں نہیں ہوا۔ گو وہ اُس حکم کے مصل سے بے خبر نہیں رہے *

مسلمانوں نے ارسطو کی منطق کو زیادہ پسند کیا اور اُس کی ترجمہ بھی اُن کے وقت میں بہت ہوا اول ترجمہ ارسطو کے قیاسات کا حنین ابن اسحاق کے ذریعہ سے مسلمانوں میں پھیلا۔ پھر ابو بشر نے چند کتابوں کا سریانی سے ترجمہ کیا اور یحییٰ ابن عدی اور کنندی نے اُسے مرتب کیا اور آخر کو فارابی اور بوعلی سینا نے اُس کی تکمیل کی۔ مسلمان عالموں نے جس خوبی سے یونانی اور سریانی اہل طاعت کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا اس پر وہ بڑی تعریف کے مستحق ہیں۔ جارج ہنری لویس صاحب بھی اپنی تاریخ فلسفہ میں اُس پر بڑی حیرت ظاہر کرتے ہیں *

مسلمانوں نے اس علم میں ترجمہ اور تقلید ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ اس میں بہت کچھ ترقی کی چنانچہ تصور و تصدیق کے مباحث اور جزئیات و کلیات کے مصل اور استخراج نتائج کے ضابطے اور صفوے دیکرنے کی ترتیب اور صدا و سادہ کا بیان۔ اور قیاسات کی تقسیم جس خوبی سے اُنہوں نے کی ہیں اُس سے اُن کے دماغ کی قوت ظاہر ہے *

مسلمانوں نے ارسطو اور افلاطون کی الہیات سے بھی دانقیت حاصل کی اور واجب الوجود اور حقول عشرہ اور روح اور ناسخ اور دیگر مسائل کی خوبی تحقیق کی اور اُن کے مسائل کو اپنے مذہبی مسائل سے تطبیق یا تردید کرنے میں اپنی طبیعت کی چالاکیاں اچھی طرح دکھائیں اور اُس کے واسطے اُنہوں نے ایک خاص علم اپنے مذہبی علوم میں داخل کیا جس کا نام علم کلام ہے *

طبیعیات میں مسلمانوں نے پوری تقلید یونانیوں کی کی مگر چونکہ اُنہوں نے تجربہ اور مشاہدہ اور آلات کے ذریعہ سے کسی چیز کی ثبوت کرنے کی بجائے بار یک اور دقیق منطقی استدلال سے

کام لیا۔ اس لئے وہ اُس کی غلطیوں کو درست نہ کر سکے اس واسطے ہیوں لے اور جزئہ لایچرٹس اور صورت نو عبید و حبیبہ اور جبر طبعی اور خلا کی نازک بحثوں کو اور بھی دقیق کر دیا اور کائنات ایجواد اور اجرام فلکی اور عناصر ربوہ کی ماہیت کی تحقیق کرنے سے قاصر رہے۔ با اینہما انہوں نے اس علم میں بعض نہایت بکار آمد چیزوں کی تحقیق کی ہے۔ جیسا کہ محمد بن زکریا نے اسباب قوت جاذبہ نقطاطیسی پر نہایت عمدہ رسالہ لکھا ہے۔

علم ہیئت میں مسلمانوں نے بڑی ناموری پائی اور بہت زمانہ تک وہ اُس کی تحقیقات پر متوجہ رہے بطلمیوس کی عمدہ مشہور کتاب محیطی کا پورا ترجمہ جو چین ابن اسحاق نے کیا تھا اور جس کی ابن یوسف و ابن قرقہ نے تصحیح اور حکیم نصیر الدین طوسی نے تہذیب و تمہیل کی مسلمانوں کی ترقی علم پر شاہد ہے۔ وہ اس علم کے ایسے قدردان تھے کہ خالص بطلمیوس کا بنایا ہوا قرہ قاہرہ کے کتب خانہ میں ۳۳۰ ہجری تک موجود تھا۔

اس علم میں مسلمانوں نے تقلید ہی نہیں کی بلکہ اُس کو تحقیق بھی کیا اور اُسے کام میں بھی لائے خلیفہ ماموں رشید کے زمانہ میں اچھے اچھے آلات ایجاد ہوئے۔

سنجارد کو فہ کے میدانوں میں زمین کے دائرہ عظیمہ کی پیمائش ہوئی جس سے اُس کا صحیح دور جواب تک مانا جاتا ہے ثابت ہوا۔

پھر انہوں نے رصد خانے بھی کثرت سے بنوائے اور نیچے کو اکب بھی تیار کئے جس کا نشان کسمائے بغداد دمشق۔ اُندلس۔ سمرقند کے ڈٹے کھنڈروں سے اب بھی ظاہر ہے۔

مسلمانوں نے بطلمیوسی نظام کی غلطی کا کپڑا نکالنے سے پہلے خیال کر لیا تھا چنانچہ محمد بن عبد الملک طفیل جس کو انگریزی میں ابویا سر کہتے ہیں اور جو بارہویں صدی میں اُندلس میں پیدا ہوا اُس نے اس نظام سے انکار کیا جس کی تصدیق اپنی ریجس اپنے رسالہ علم ہیئت کے دیباچہ میں کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ کہ نامی گرامی ابویا سر نے کہا ہے کہ نظام شمسی اور حرکات اجرام فلکی میری تحقیقات میں اور ہی طرح ہیں جو نظام قدیمہ یونانیہ کے خلاف ہیں۔

علم مریا و مناظر میں بھی مسلمانوں نے بڑی ترقی کی چنانچہ ابو علی الحسن جو گیارہویں صدی میں ہوا اُس کا رسالہ علم مریا و مناظر کا یورپ کی مشہور کتابوں میں سے ہے جس کو دزنبہ نے ترجمہ کیا اور جو ۱۵۰۰ء میں بتمام ہل چھاپا گیا۔ اس محقق نے یونانیوں کی غلطی ثابت کی کہ شعاع نظر آنکھ سے نکل کر کسی چیز پر نہیں پڑتی ہے بلکہ اُس نے تشریح اور علم مثلث کی دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ تمام چیزوں کی شبیہ آنکھ میں آکر بنتی ہے جس کی تحقیقات کا تجربہ وہ ہے جو آج نوٹوگراف کی تصویروں سے دکھائی دیتا ہے ہیئت الفلک بن خنبن بغدادی نے جو کہ ستر شہد باللہ خلیفہ عباسی کے زمانہ میں تھا نور کی رفتار کا اندازہ

• نکالا اور اُس کو دلائل ہند سے ثابت کیا •

• علم ہوا میں ابوعلی الحسن ہی اس سلسلہ کا موجد ہے کہ جہاں رہو زمین کے طبقے سے اپنی ہوتی ہے اُسی قدر وہ سبک اور ہلکی ہوتی ہے •

علم ہند سے اور حساب میں مسلمانوں نے بہت توجہ کی اقلیدس کے مقالوں کا ترجمہ یونانی اور یونانی اور روحی زبان سے مختلف عالموں نے کیا۔ جن میں سے حجاج اور جنین اور ثابت اور ابو عثمان کے ترجمے مشہور ہیں۔ پھر اُس کی اصلاح و تہذیب صدائے عالموں نے کی۔ اُس پر سیکڑوں شرحیں لکھیں۔ آخر علامہ نصیر الدین طوسی نے اس کی تکمیل کی اور اُس کے بعد بھی بہت سے عالم ترتیب تہذیب اور شرح پر متوجہ رہے •

مسلمانوں نے اقلیدس حکیم کی کتاب اصول ہند سے کابھی ترجمہ کیا اور اُس کی شرحیں لکھیں چنانچہ ابو الحسن علی ابن احمد اور نصیر الدین طوسی اور ابوہریرہ قوشچی کی شرحیں اب تک مشہور ہیں۔ ایلینوس کی کتاب جو فخری خطوں اور خطوط منحنی کے بیان میں ہے اُس کے سات مقالے ترجمے کئے گئے جس میں سے چار مقالوں کا ترجمہ احمد بن موسیٰ حمصی نے اور باقی کا ثابت ابن قرہ نے کیا اور اُن کے سوا اور بھی چند نامی حکماء یونان کی کتابیں اس فن کی عربی میں ترجمہ ہوئیں •

حساب میں بھی مسلمانوں نے کم توجہ نہیں کی۔ انہوں نے ہندوؤں سے مراتب اعداد کا رکھنا سیکھا اور اسی لئے اُس کا نام انہوں نے اعداد ہندیہ رکھا۔ فن جیروم مقابلہ کی نسبت اختلاف ہے۔ بعض مسلمانوں کو اس کا موجد بیان کرتے ہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں نے یہ علم ہندوستان کے پینڈتوں اور یونان کے عالموں سے اخذ کیا تھا مگر پھر اُس میں بہت سی ترقی کی •

علم طب میں بھی مسلمانوں نے بہت ترقی کی تھی۔ انہوں نے ہندوستان میں سفر کیا۔ زبان سنسکرت کو سیکھا اور نہایت مشہور دو کتابیں سنسکرت زبان کی جن کا نام چرک اور ششرت تھا عربی زبان میں ترجمہ کیں۔ سب سے پہلے رشید بھری میں موسیٰ بن موسیٰ الفزاری نے سنسکرت کا ترجمہ شروع کیا۔ پھر محمد بن اسماعیل خود ہندوستان میں آیا اور اُس کے بعد دس عالم ہندوستان میں آئے اور ہندوؤں کے علوم کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کیا۔ بقراط اور جالینوس کی عمدہ کتابوں کو بھی انہوں نے نہیں چھوڑا۔ ابوعلی سینا کا قانون صدائے بریں تک یورپ کے مدرسوں میں پڑھایا جاتا تھا • اس نامی حکیم کی نسبت حاج بہری لوئیس صاحب لکھتے ہیں کہ ”وہ صرف مترجم اور شارح اسطو کی حکمت کا نہ تھا بلکہ اُس نے بوجہ اپنے علم کمال کے اپنی رائے کو بھی بہت کچھ دخل دیا اور مردوں کو چیر کر علم تشریح انسان کی غلطیاں درست کیں •“

• جو اس خمسہ ظاہری و باطنی کی تقسیم اسی کی تحقیق ہے جس کی پیروی اب تک سب کرتے ہیں

ہمیرٹ کاشش میں لکھا ہے کہ دو سازی کا علم عرب نے پیدا کیا تھا۔ چند دواؤں کے مرتب کرنے اور نسخہ لکھنے کا طریقہ ایجاد ہے اور پھر وہاں سے آدوں ملکوں میں پھیلا۔
 علم کیمیا یعنی حل و عقد کی ترقی کی نسبت قول گبن صاحب کا کافی ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ اس کی ایجاد عرب ہی سے ہے۔

علم نباتات و معدنیات میں ابو عثمان اور عبد الرحمن سرونی اور عباس ابن بطیار کی کتابیں اُن کی توجہ پر گواہی دیتی ہیں۔ طاہر بن محمد یوسف غزنوی نے دس جلدیں اس علم میں لکھی ہیں۔
 علم حیوانات میں اُن کو زیادہ ترقی نہیں ہوئی۔ انہوں نے صرف ارسطو اور گیلین کی کتابوں کے ترجمہ پر اکتفا کیا۔

علم جغرافیہ میں بھی انہوں نے بسبب اپنے دریائی سفروں اور خشکی کی سیاحت اور کثرت تجارت کے اور آخر کو بسبب اپنے فتوحات کے بہت عمدہ تہذیب حاصل کی اور یسی اور ابوالفدا اس فن میں مشہور ہیں۔

علم موسیقی میں فارابی نے وہ کمال حاصل کیا تھا جس کی اہل یورپ بھی تصدیق کرتے ہیں جارج ہنری لوئیس صاحب نے لکھا ہے کہ علم موسیقی میں اس کی تصنیف بہت کامل ہے اور اُس نے اگلے مصنفین کی غلطیوں کو بہت اچھی طرح درست کیا ہے۔

غرض کہ مسلمانوں کے تہذیب علوم میں نہایت اعلیٰ درجہ کی ترقی تھی۔ مٹراوٹ جرمن کے مورخ نے نہایت انصاف سے یہ بات لکھی ہے کہ ”مسلمانوں نے اور قوموں سے کتنا ہی کچھ کیوں دیکھا مگر انہوں نے اپنی قابلیت و لیاقت سے اُس کو بہت کچھ ترقی دی۔“

جارج ہنری لوئیس صاحب اپنی ہسٹری آف فلاسفی میں لکھتے ہیں کہ ”یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ عرب ہی نے تمام کتابوں اور تحریروں کو فلسفہ یونان کی تباہی سے محفوظ رکھا اور اُنہیں کی وجہ سے یورپ میں علم اور فلاسفہ پہنچا۔ اس امر خاص میں یورپ اُن کامنوں احسان ہے اور اس سے بڑا احسان عرب کا یورپ پر یہ ہے کہ اُن لوگوں نے علم ہندسہ اور ہسٹیت اور طب اور کیمیا میں بڑی کوشش کی اور انہیں کی بدولت اسپین سے فرانس ہو کر فرنگستان میں علم پھیلا۔“

ڈاکٹر دراپر صاحب لکھتے ہیں کہ ”علم کے سیکھنے میں اہل فرنگ ابو علی الحسن اور ابو موسیٰ اور ابو الوفا اور آؤر علمائے عرب کی زیادہ زاحسانتہ ہیں“ ابو الوالد جسے انگریز ”ادور ورس“ کہتے ہیں وہ شخص تھا کہ جس کی تصنیفات کی چار سو برس تک عیسائی۔ یہود و عظیم و تکریم کرتے رہے اور بہت سی کتابیں اُس کی جن کا نام ہی اب مسلمان نہیں جانتے زبان عربی اور لٹین میں موجود ہیں چنانچہ جرمن میں پچاس سے زیادہ اُس کی تصنیفات چھاپے ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر ہیلی صاحب بھی اپنی تاریخ اسپین میں اُس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس نامی ڈاکٹر نے جو مقابلہ اُس زمانہ کے مسلمانوں کی حکمت اور فلسفہ کا یورپ سے کیا ہے اُس کے دیکھنے سے اندازہ اُس ترقی کا ہو سکتا ہے جو مسلمانوں نے علوم میں کی تھی۔ سڈیو نامی فرانسیسی مدرس علوم تاریخ کا اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ ”جب علم طب اور طبیعیات اور کیمیا اور فلاحات عرب کے ہاتھ آیا تو انہوں نے اُس میں بہت کچھ ترقی کی یہاں تک کہ ان علوم میں اُن کی فضیلت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے گو یا وہ ایک شتم ہے اُس اصل فضیلت کا جو آج تک ہم کو معلوم ہی نہیں ہوئی۔ بہر کیف عرب کی قوم ہمارے جملہ فضل و کمال کا اب بھی سر شیمہ ہے اور جن کمالات کو ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ آذر قوم کا ایجاد ہو گا وہ اب ہم کو اُن کی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کے اصل موجد عرب ہی ہیں۔“ ایک دوسرا فرانسیسی عالم لکھتا ہے کہ ”عرب کی قوموں کو خدا نے دنیا میں اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ علوم و فنون اور اسباب تمدن کو اُن مختلف قوموں تک پہنچا دیں جو فرات کے کنارے سے بیکر ہسپانیہ کی دادی کیتیک پھیل رہی ہیں چنانچہ اُن تمام قوموں نے جملہ کمالات اسی قوم عرب سے حاصل کئے تھے۔“

فنون و دستکاری کو اہل عرب نے رومیوں کے بڑے بڑے شہروں میں جا کر نوبی حاصل کیا تھا اور پھر خود اُس کو ترقی دی تھی۔ ماروں رشید خلیفہ عباسی نے جو ایک گھڑی بطور تحفہ کے شالیمین بادشاہ فرنگستان کو جو اُس کا بڑا دوست تھا بھیجی تھی اور جس کا ذکر ایجن مارڈ صاحب نے کیا ہے مسلمانوں کے فنون و دستکاری میں ترقی کرنے کا بڑا ثبوت ہے۔

عرب و اسپین کے ہتیار و غنائم یعنی کرنیڈا کا حریر نہایت مشہور تھا۔

فن عمارت میں بھی انہوں نے بہت ترقی کی تھی۔ وہ حوض و نوارہ نہایت خوبی سے بناتے تھے۔ اور مختلف قسم کے پتھروں کے کُل بوٹے تراش کر مکانات کی عمارت کو آراستہ کرتے تھے۔ گنبد بنانے کی ترکیب انہوں نے یونانیوں سے اخذ کی مگر پھر اُس کو نہایت ہی خوبصورت کر دیا قرطبہ یعنی کارٹووا کی جامع مسجد اور اسپین کی دادی کیتیک میں عبدالرحمن ثالث کا قصر عالی۔ اور کارڈوہ کا محل۔ اور ہندوستان میں قطب کا مینار اور تاج کاروضہ اور علی مرداں کی نہر۔ اُن کی صناعی کے شاہد ہیں۔

تصویر بنانے میں مسلمانوں نے کچھ ترقی نہیں کی۔ کیونکہ بُت پرستی کی جڑ مٹانے کی غرض سے وہ ممنوع کی گئی تھی۔ مگر مکانات کی آراستگی کے لئے انہوں نے ایک قسم کے نقوش جدیدہ ایجاد کئے تھے۔ پہلے تو وہ کچھ نقوش وغیرہ تھے۔ پھر وہ ایسے خطوط رہ گئے جن کا آپس میں تقاطع ہوتا تھا اور وہ خطوط حروف عربی کے مشابہ تھے کہ جن سے طح طرح کی ظرافت آمیز عمدہ عمدہ خوش وضع شکلیں پیدا

ہو جاتی تھیں *

جہاز بنانے میں بھی انہوں نے ترقی کی تھی۔ چنانچہ ۹۷۴ء میں عبدالرحمن ضیفہ اسپین کے ایک ایسا بڑا جہاز بنایا کہ اب تک اُن ملکوں میں کسی نے نہ دیکھا تھا اور اسپین کے مسلمانوں کے جہاز بہت بڑے بڑے ہوتے تھے۔ غالباً اسپین والے جو بڑے بڑے جہازوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے جہاز اہل اسلام کے جہازوں کی نقل ہیں۔ ہندوستان میں بھی محمود بادشاہ گجرات نے ایسا ایک بڑا جنگی جہازوں کا طیار کیا تھا جس سے بڑھ کر ہندوستان میں کبھی نہیں ہوا۔ ضلع کبیر چا پر اس بادشاہ کے بہت سے جنگی جہاز جن پر توہینیں چڑھی رہتیں تیار رہتے *

اخلاق کو بھی مسلمانوں کے بانی مذہب نے نہایت عمدہ اصول پر قائم کیا۔ سچائی اور فداکاری اخلاص اور نیکی۔ ہمدردی و محبت و دشمنوں کو معافی اور برائی کا بدلہ بھلائی اصلی اصول نجات کے ہیں *

غیر مذہب والوں کے ساتھ جو اخلاق خود بانئے اسلام نے برتے وہ اس مثال سے ظاہر ہو سکتے ہیں کہ عیسائی پہلے جب مدینہ میں آئے تو خود اپنی ذات سے اُن کی مہانداری کی اور باوجودیکہ رومن کیتھولک تھے اور تثلیث کے قائل۔ مگر اُن کو اجازت دی کہ اپنی نماز اُسی مسجد میں پڑھیں جو ایک خدا سے واحد و الجلال کا نام پکارنے کو کچی مٹی اور کھجور کے درختوں کی ٹکڑی سے بنائی گئی تھی۔ اگرچہ بعد کو اس نہایت قابل تعظیم اخلاق کی پیروی کم ہوئی۔ مگر کچھ نہ کچھ اُس کا اثر ہر ایک زمانہ میں پایا جاتا تھا۔ جب کہ بیت المقدس فتح ہو گیا تو وہاں کے عیسائیوں نے اُن اصحاب رسول کی دعوت کی جو کہ بیت المقدس کی فتح کے لئے گئے تھے۔ چنانچہ اُن سب نے قبول کی اور گرجے میں اُن کو کھانا کھلایا گیا و سب کھانا کھاتے اور گرجے کی تصویروں کو توجیس دیکھتے جاتے تھے *

سلطان صلاح الدین بھی عیسائی بادشاہوں سے باوجودیکہ ہمیشہ اُن کا مقابلہ کرتا رہا نہایت حسن اخلاق سے پیش آتا اور اُن کی تعظیم کرتا تھا۔ امیر صیدا جو عیسائی مذہب رکھتا تھا۔ جب صلاح الدین کے پاس آیا تو اُس نے نہایت تعظیم و تکریم کی اور اُسے اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ اور شقیق کا امیر جو کہ فرنگیوں کے نامی امیروں میں سے تھا سلطان کے خیمے پر آیا تو اُس نے بڑی عزت کی اور اُس کے ساتھ کھانا کھلایا۔ اسپین کے حاکموں اور امیروں نے حبیباً برتاؤ غیر مذہب والوں سے کیا تھا۔ اُس کی نسبت جارج ہنری لوئیس صاحب یوں لکھتے ہیں کہ ”اسپین میں علم اور حکمت کے کمال نے تنصیب کو ایسا مٹا دیا تھا کہ زمانہ حال کے لوگ سُن کر تعجب کریں گے کہ یہودی اور عیسائی اور مسلمان ایک ہی زبان بولتے اور ایک ہی قسم کے گیت یا شعر پڑھ کر خوش ہوتے تھے۔ ایک ہی طرح کا خیال رکھتے تھے عرب۔ یہود۔ نصاریٰ کو اپنے فرائض مذہبی اور رسمیات کے ادا کرنے سے مطلقاً باج اور مانع نہ تھے بلکہ اُن کی دوستی و محبت و ربط و ضبط یہاں تک بڑھا کہ مسلمان اور عیسائی اور یہود میں شادی باہ

ہونے لگا۔

• باب کے ادب کی نہایت تاکید کی گئی جن لوگوں نے کسی نہایت متعصب مسلمان ترک کو اپنی بڑھی عیسائی ماں کو اتوار کے دن اپنی پیٹھ پر سوار کر کر گرجا نماز پڑھانے کو لیجاتے دیکھا ہو گا وہ نہایت تعجب کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کے مذہب کے بانی نے باب کی کس قدر تعظیم و ادب کی تعلیم کی ہے۔ عرب کے پیغمبر نے عورتوں کو روحانی زندگی میں بالکل مردوں کے برابر کر دیا۔ اتنا فرق بھی ان میں نہیں رکھا جیسا کہ دیس اور بائیس مائتھ یا سنولہ آندرو یہ میں ہے۔ وہ اسی طرح نیکی کر سکتی ہیں جس طرح کہ مرد۔ وہ اسی طرح روحانی ترقی پا سکتی ہیں جس طرح کہ مرد۔ کوئی مذہبی نیکی ایسی نہیں ہے۔ جو مرد پا سکتا ہو یا کر سکتا ہو۔ اور وہ نیکی عورت کے لئے نہ ہو۔ ان کے دنیاوی حقوق سے بھی غفلت نہیں کی۔ وہ اسی طرح اپنے مال کی مالک ہیں جیسا کہ مرد۔ وہ سب قسم کے معاہدہ کی مجاز ہیں۔ اپنی جائداد کی خواہ وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ وہ خود آپ مالک ہیں۔ ہمد کر سکتی ہیں۔ بیع کر سکتی ہیں۔ تمام تصرفات جو مرد کر سکتا ہے وہ بھی کر سکتی ہیں۔

پالیگی یعنی تعدد ازواج میں بانئے مذہب کا یہ قول ہے کہ ایک دو تین چار تک عورتیں صحیح ہیں لگتے ہو۔ لیکن اگر اندیشہ بھی عدل نہ کر سکے گا ہو تو پھر صرف ایک ہی چاہئے۔ پس اگر اس کے حکم منفی کا خیال ہو۔ تو پھر ایک کے سوا جائز نہیں رہتی۔ پس اجازت اور امتناع کو ایسی ٹھنکی سے ایک ساتھ بیان کیا ہے کہ بحر حالت خاص کے جس کا جائز رکھنا بلاشبہ عقل کے موافق ہے تعدد کو معدوم کر دیا ہے۔

اس سے بھی زیادہ عمدگی سے طلاق کے مسئلہ کو بتایا ہے۔ طلاق کی اجازت دی جس کی اجازت دنیا بلاشبہ نہایت ضروری تھی مگر اُس کو ایسا مباح فعل بتایا جس سے بے انتہا ناراضی خدا اور رسول کی پائی جاتی ہے یہاں تک کہ بعض صحابہ نے خیال کیا کہ طلاق دینے والا قتل ہونے کے لائق اور اس عہدہ نصیحت سے طلاق نہایت معتدل طور پر برتی جانے لگی۔ مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ایک بات جو اپنی عمر میں بانی اسلام نے فرمائی اور جو سب مقدم تہذیب انسانی کا مسئلہ تھا اور جس کو اس وقت تک کسی نے نہ کہا تھا اُس پر اس وجہ سے کہ رواج عام کے بالکل برخلاف تھا کسی کا خیال نہیں گیا اگر بانی اسلام چند روز اور دنیا میں رہتے تو وہ مسئلہ بھی مثل اور مسائل کے عام ہو جاتا اور وہ مسئلہ غلامی کو بالکل معدوم کر دینے کا تھا۔ بانئے اسلام نے ان چند لفظوں سے کہ ”فاما متا بعدا واما فداء“ یعنی لڑائی کے قیدی سب چھوڑ دئے جاویں خواہ کچھ لیکر خواہ احسان رکھ کر غلامی کو بالکل معدوم کر دیا ہے۔ اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ اس نص صریح سے مسلمانوں کے مذہب میں غلامی بالکل ممنوع ہے گو کہ کسی کو اس کا خیال نہ آیا ہو۔ دختر کشی کی رسم جس پر عرب کو اس ملک کے ہندوں سے بھی زیادہ فخر تھا کیسی کچھ مسلمانوں میں مٹ گئی جس کا نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا۔

مسلمانوں کی معاشرت کے طریقے: پہلے پہلے کے قاعدے بھی نہایت عدم تھے۔ بزرگوں کا ادب۔ بڑے بوڑھوں کی تعظیم۔ بات چیت میں نرمی و اعتدال۔ کسی کی طرف جھوٹ و عیب کی نسبت کرنے کا خیال۔ لعن و طعن کا لحاظ۔ محشر اور اخلاق و حیا کے خلاف باتوں سے نفرت۔ بی پوچھے کسی بات میں دخل نہ دینا۔ سرگوشی نہ کرنا۔ جاہلوں نادانوں سے نہ جھگڑنا۔ مذہبی گفتگو بے ضرورت نہ کرنا۔ یہودہ ہنسی اور جہل سے نفرت۔ وہ آداب مجلس تھے کہ جن کے لحاظ نہ رکھنے سے انسان بد مزیز اور سوسائٹی سے خارج کرنے کے لائق سمجھا جاتا۔

شادی بیاہ کے دستور بھی تہذیب کے خالی نہ تھے۔ قبل نکاح کے مرد و عورت کا ایک دوسرے کو دیکھ کر پسند کر لینا بیخوف اور بلا لحاظ کسی جاہلانہ خیال کے اور زن و شوہر کا اپنی رضامندی ظاہر کرنا ایک عام دستور تھا۔ نکاح کے وقت ایک مختصر مجلس عزیزوں اور خاص دوستوں کی مرتب ہوتی۔ اور ایک مختصر سبب حیثیت سامان ماں باپ کی طرف سے لڑکی کو دیا جاتا۔ اور بعد نکاح کے ایک مختصر سی دخت دوست آشناؤں کی کی جاتی۔ عورتیں بالکل اپنے گھر کی مالک اور منتظم سمجھی جاتیں۔ اور سب گھر کا کام کلج اُن کے تعلق ہوتا۔ نوکر چاکر بھی اُن کے تابع رہتے یہاں تک کہ مرد بھی بے رضامندی اُن کے کوئی کام نہ کرتا اگرچہ عورتوں کو باہر نکلنے کی عام اجازت نہ تھی مگر مسجدوں میں نماز کے لئے آنے اور بضرورت باہر نکلنے یا اپنے خاوند اور خاص عزیزوں کے ساتھ سفر کرنے سے ممنوع نہ تھیں اور رُتہ اور ماتھے کو تو شرع نے بھی ستر میں داخل نہیں کیا۔ اولاد کی تعلیم اور تربیت پہلے تو استادوں اور اہل حق کے ذریعہ سے خاص خاص طور پر دی جاتی۔ مگر تیسری صدی سے عام مدرسوں میں تعلیم دینے۔ اور دور دراز شہروں میں لڑکوں کو بھیج دینے کا عام رواج ہو گیا۔ فارس اور دیلم کے سلاطین امراء کا تو یہ ایک عام طریقہ تھا کہ اولاد کو باہر ہی بھیج کر تعلیم و تربیت دلاتے۔ اسی سبب سے اُس زمانہ کے اکثر شہزادے اور امیرزادے عالم اور ادیب اور غشی ہوتے۔ جس کی تصدیق رچرڈ سن صاحب نے کی ہے ابو نعیم جو ایک نامی بادشاہ تھا ایسا سونخ و جغرافیہ داں اور صفت ہوا ہے کہ اُس کی نظیر دوسری قوم میں کھائی گئی۔ کرخ کا مدرسہ جسے وزیر ابو نصر نے بنایا اور ناصر بن کلج جسے مستنصر بادشاہ نے وجہ کے کنارے پر تعمیر کیا۔ اور جس کے متعلق شفا خانہ اور حمام اور رہنے کے مکانات بھی تھے اور جس کے لئے لاکھوں روپیہ خریدا۔ وقت تھا۔ اور نظامیہ مدرسہ بغداد کا عام تعلیم و تربیت کے لئے عمدہ مدرسہ سے تھے۔

لڑکیوں کی بھی تعلیم گھر پر بذریعہ بڑھی لکھی عورتوں کے یا بڑھے نیک چلن استادوں کے ہی عمدہ ہوتی کہ صدہا مسلمان عورتیں ایسی گذری ہیں کہ اُن کا کلام اُن کی کتابیں اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اُس عمدہ تعلیم و تربیت کے سبب سے خیالات اُن کے ایسے روشن ہو جاتے تھے کہ یہودی اور قومی بھلائی کے جو ش میں اپنا سارا سرمایہ خرچ کر دیتیں۔ ناصر الدین بادشاہ محسن کی بی بی نذر نامی

نے جو ساتویں صدی میں ہوئی ہے اپنا کل مال و متاع ایک بڑے کوچ و مشق کے بنانے اور اُس کے آئینہ اخراجات میں صرف کر دیا *

لباس پوشاک کا حال یہ ہے کہ عرب کا اصلی لباس کُرّہ اور تہبند اور ایک خاص قسم کا عمامہ یا گول ٹوپی اور موزہ یا جوتہ کو بھی وہ ایک ضروری جزو لباس کا جانتے تھے جس کو شائع نے بھی زینت نماز فرمایا ہے۔ مگر پھر مسلمانوں نے کیا نیول اور عجیبوں کا لباس زیادہ پسند کیا اور ٹھوڑی سی تبدیلی سے اُسے اپنے یہاں رواج دیا۔ بعض بادشاہوں نے خود بھی لباس میں کچھ ایجاد کی جیسا کہ شہلہ بھری میں منصور خلیفہ نے ایک لمبی گول ٹوپی جو لکڑی کی پتلی تیلیوں سے بنائی جاتی جس پر سیاہ رنگ یا کالا لکڑا سٹھا جاتا اور غالباً دہی ٹوپی ہے جسے اب انگریز استعمال کرتے ہیں۔ پھر تاتار کے مسلمانوں نے وہ سرخ ٹوپی ایجاد کی جسے اب ترک پہنتے ہیں۔ اور ہندوستان کے بھی بعض ٹھٹھ مسلمانوں کے مبارک سروں پر دکھائی دیتی ہے۔ شاہ اسماعیل صفوی نے ایک خاص قسم کی لال ٹوپی ایجاد کی جس کے سبب سے ایرانی اپنے آپ کو قزلباش یعنی لال سروں والا کہتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ایک خاص قسم کا دھاری لباس تجویز کیا گیا۔ یعنی سفید سلس کا جامہ جسے آ یا کی کون کنا چاہئے اور کمر بند اور پگڑی جس کی بڑی زینت بازو بند اور مال سے سجھی جاتی تھی۔ یہ لباس شاید مصریوں کا تھا اس لئے اس کا نقشہ شہر خدیس کے قبرستان میں بعض بادشاہوں کی تصویروں میں پایا گیا ہے *

عورتوں کا لباس کو بہ نسبت ایک چادر اور تہ بند کے بہت درست کیا گیا۔ مگر درحقیقت اُس میں کوئی عمدہ ترقی نہیں ہوئی۔ کھانے پینے میں کیا نیول اور عجیبوں کی طرح و تترخوان کی رونق اور آرائشی حضرت معاویہ امیر شام کے وقت سے شروع ہوئی۔ پھر عباسیوں کے زمانہ میں چھوٹی میز پر کھانا رکھ کر کھانے کا رواج ہوا جسے بعض نادان مولویوں نے بدعت بتایا۔ اور چھٹیوں صدی تک اُس کا جھگڑا رہا جس کی نسبت امام غزالی نے یہ نصیحت کیا کہ نہ کنا ہے نہ بدعت ہے بلکہ اُس میں صرف تعظیم کھانے کی ہے غرض آٹھویں صدی سے لیکر تیرھویں صدی تک مسلمانوں کی طرز معاشرت کو ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ یورپ نے مسلمانوں ہی کی معاشرت و تمدن دیکھ کر اُس میں ترقی کی۔ گیارھویں صدی کے آخر سے تیرھویں صدی تک جو صلح لڑائیاں مسلمانوں اور عیسائیوں میں بیت المقدس میں ہوئیں اُس کی نسبت یورپ کے مؤرخوں کا قول ہے کہ ”گو ان لڑائیوں سے مشیار آدمی ضائع ہوئے اور بہت سائنسیں مال بھری فائدہ کے ضائع ہوا۔ لیکن انجام کار اُس سے فائدہ بھی بہت کچھ ہوئے۔ جس میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اُسی زمانہ سے اہل یورپ نے فوج کی ترتیب و صلاح شروع کی اور تجارت اور زراعت کے طریقے اُن مشرقی قوموں سے سیکھے اور شہریوں کی سی عادتیں اختیار کیں اور دنیا کے حالات کی تحقیق کے واسطے سفر کی عادت ڈالی۔ غلام یہ ہے کہ یورپ کی قوموں کو تمدن کے

طریقہ اُسی وقت سے معلوم ہوئے جب سے وہ مسلمانوں کی اُن قوموں سے ملے جو تمدن اور حسن معاشرت اور علوم و فنون اور ہند کمالات میں اُن سے فائق تھیں *

تجارت اور زراعت میں بھی مسلمانوں نے بہت ترقی کی تھی۔ اُن کو ہمیشہ سفر کی طرف رغبت رہی ہے جب اُن کی سلطنت فرانسس اور اسپین کے پہاڑوں کے بیچ سے گذر کر ہالیہ تک پہنچی تو اُس وقت وہ دنیا کے بڑے نامی تاجروں میں ہو گئے اور فن زراعت میں تو مثل اُن کے کوئی نہ تھا اس واسطے کہ جس قدر پانی کے خزانے بنائے اور اُس کو اپنی کھیتی کی کاریوں میں برابر پہنچانے میں یہ لوگ مضبوط تھے دوسرا نہیں ہوا۔ اہل عرب پہلے سے تجارت میں نامور ہیں۔ چنانچہ وہ جزیرہ بحر احمر کا جس جزیرہ بکازہ کہتے ہیں اور لنکا کا کنارہ اور ملیبار عہلوں کی بستی سے معمور تھے۔ اور جب مشہور جہاز راں واسکو ڈیگاما صاحب پندرہویں صدی کے اخیر میں ملیبار کے کنارہ پر پہنچے تو انہوں نے تمام تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں پائی۔ چنانچہ اب تک اُن کی نسل باقی ہے جو سوپلا کے نام سے مشہور ہیں۔ اور باوجودیکہ اب بالکل وحشی ہو رہے ہیں مگر ہر قسم کی تجارت کرتے ہیں *

مسلمانوں نے جب ایران کو فتح کیا اُس وقت دجلہ اور فرات کے مہمان پرانہوں نے بصرہ شہر کو اس ارادے سے بسایا کہ تجارت اور سندھ بھی جو دریائے سندھ کے پورے واقع ہے تجارت کر سکیں۔ انہوں نے دریائے فرات کے کناروں سے بحر ظلمات کے ساحل تک اپنی تجارت پھیلائی اور کاسیکہ اور سارڈینیا اور جنوبی اٹلی میں بہت سے شہر آباد کئے۔ ایک عرصہ دراز تک میڈیٹیرین میں اُن کے تجارتی جہاز اپنے بادیا توں سے سمندر کی لہروں کو رونق دیتے رہے *

سیاست مدن کا طریقہ جو اب امریکہ میں جاری ہے وہ مدت ہوئی کہ مسلمانوں نے قائم کیا تھا۔ معزز و ممتاز لوگوں کی رائے سے جو کہ رائے دینے کی لیاقت رکھتے تھے اور جن کو اہل صل و عقد کہتے ہیں ایک شخص کا بطور پریسیڈنٹ کے ہونا قرار پایا تھا۔ وہ پریسیڈنٹ جب تک کہ اپنے عہدہ کا کام انصاف سے کرے اپنے عہدہ پر بحال رہنے کے لائق تھا۔ بیت المال میں سے اُس کو شل ایک عام مسلمان کے اور کچھ زیادہ حق نہ تھا *

اس پریسیڈنٹ کو جسے ہم خلیفہ کہتے ہیں تمام امور میں معتبر لوگوں سے مشورہ کر کر کام کرنا واجب تھا غلطی سے روکنے کا ہر ایک مسلمان کا حق تھا۔ اور قصور کی حالت میں موقوف ہو سکتا تھا۔ پہلے خلیفہ نے لوگوں سے کہا کہ اچھی باتوں میں میری مدد کرو اور بُری باتوں میں روکنے کا تم کو حق ہے۔ وہ سرے خلیفہ نے رعایا کے دلوں کے امتحان لینے کے لئے ایک روز خطبہ میں پوچھا کہ اگر میں بائز حکم دوں تو تم لوگ کیا کرو۔ ایک عام جوان آدمی تلوار لیک کھڑا ہو گیا اور کہا کہ فوراً خلافت کی گدی سے تم کو اتار دیں اور دوسرے کو خلیفہ بنادیں *

• جو تھے خلیفہ کو ایک بیٹھی کے مقابلہ میں زرہ کے دعوے میں ایک عالم مسلمان کی طرح حج کے حکم میں حاضر ہونا پڑا اور حج نے اُس سچے نیک عادل خلیفہ کے برخلاف حکم دیا اس وجہ سے کہ قانون کے موافق ثبوت نہ تھا •

پانچویں خلیفہ برحق حسن ابن علی کے عہد میں بھی اصول سیاست اسی طرح قائم رہے مگر ان سوس ہے کہ بہت بے بسوں اور بے انتہا خوں ریزیوں کے بچانے کی غرض سے اس خلیفہ برحق نے اپنا عہدہ چھوڑ دیا اور سلطنت شخصیتہ قائم ہو گئی جس کو ہمارے پیغمبر نے ملکا عضو مٹا کہا تھا اور جس کو یونانی طیرٹ نیٹ یعنی ظالم کہا کرتے تھے۔ اُس دن سے اصول سیاست جو مسلمانوں کے بانی نے قائم کئے تھے خود مختاری کے پانوں کے نئے روئے گئے •

شخصیتہ سلطنت جاری ہونے کے بعد سلطنت موروثی اور خاندانی ہو گئی اور ولیعہدی اور جانشینی کی خراب رسم جاری ہوئی چنانچہ اکثر ظالم اور بے رحم سلطنت کے مانک ہو گئے جنہوں نے ظلم و ستم دنیا کو تاریک کر دیا۔ بہت سے لوگ ان واقعات میں مارے گئے اور اکثر اچھے نیک پاک لوگ جلا وطن ہو گئے مدتوں تک کشت و خون جاری رہا۔ رعایا کا مال اُن بے رحم بادشاہوں کا ترکہ اور اور لوگوں کی جانیں اُن کی قربانی اور فدیہ ٹھیکریں •

جب شخصیتہ سلطنت کے جاری ہونے سے حکومت کسی قانون عقلی اور نقلی کے تابع نہ رہی بلکہ سلطنت ایک شخص کی خواہشوں اور اُس کے غیظ و غضب کے تابع ہو گئی۔ نب اُس زمانہ کے دانا نیک آدمیوں نے اُس خود مختاری کے روکنے میں بڑی سعی کی۔ اُن کے لئے ایک مجموعہ قانون کا بنایا جو قرآن و حدیث کے صاف و صریح حکموں یا اُس کے اشاروں کنایوں اور اگلے پانچ وقتوں میں جو واقعات پیش آئے تھے اُن کی نظیروں سے مرکب تھا۔ اور اب جو ہماری فقہ کی کتابوں میں دن ہے اور جسے قانون شریعت یا محمدان لاکتے ہیں۔ مگر چونکہ اُس پر عمل کرنا ہمیشہ خود مختار بادشاہوں کے اختیار میں تھا۔ اور کوئی ایسی جماعت یا ایسی کونسل جو بادشاہ کو اُس کی تعمیل پر مجبور کرے موجود

نہ تھی۔ اس لئے اُس پر بہت کم عمل کیا گیا۔ اور خود مختاری کے روکنے میں یہ قانون کامیاب نہ ہوا • جیسا کہ سلطنت شخصیتہ کا عام قاعدہ ہے ویسا ہی مسلمانوں کی سلطنت شخصیتہ میں بھی ہوا۔ کبھی تخت پر ایسا ظالم قابض ہوا جس نے دنیا کو جوہر و ظلم سے بھر دیا اور کبھی ایسا نیک اور عادل جانشین ہوا جس نے نہایت عدل اور انصاف سے حکومت کی۔ اس وقت مجھے کو نہایت زیادہ ہے کہ میں اُس بڑے عادل خلیفہ عبدالعزیز کے نام کو یاد کروں جس نے اپنی حکومت میں نہایت عدل برتا۔ اُس کے عہد کے ایک صوبدار اسامہ نے عیسائی رعایا پر کچھ زیادتی کی تھی۔ خلیفہ نے پانچویں اُس کو طلب کیا۔ اور دو سرا حاکم اُس کی جگہ بھیجا جس کو ان احکام کی تعمیل کا حکم دیا تھا کہ تمام عہدہ پیمان جو خراج گزاروں سے کئے گئے ہیں۔

وہ باخیا طاقیم رکھے جاویں اور وہ لوگ اپنے خیالات خالوں اور گرجاؤں پر قابض رہیں۔ کوئی مسلمان ان سے پرخاش نہ کرے نہ اُن پر جھوٹی تہمت لگانے پاوے۔ انصاف کے وقت مسلمان اور غیر مسلمان برابر سمجھا جاوے۔ سلطان صلاح الدین بھی انہیں نیک اور عادل بادشاہوں میں ہوا ہے جس نے کہ مسلمان اور غیر مسلمان کو انصاف میں برابر جانا اور مرنے کے وقت اپنا مال جو وقت کیا اُس کی نسبت وصیت کی کہ بلا لحاظ مذہب کے محتاجوں کو تقسیم کیا جاوے مسلم ہو یا عیسائی یا یہودی۔ ابن ہم بھی جو ایک شہنشاہ مسلمان سردار ہوا ہے جب وہ قریب میں سند نشیں ہوا۔ اور مسلمانوں کو زمین تقسیم کرنی چاہی تو جتنی زمین مزرعہ عیسائیوں کے قبضہ میں تھی وہ بدستور اُن کے پاس رہنے دی صرف بنجر اور غیر مزرعہ زمین کے ٹکڑے جس کا کوئی مالک نہ تھا مسلمانوں کو دئے۔

عبدالرحمن جب اسپین کا امیر ہوا تو اُس نے سارے گرجے جو خلاف شرط عدد و سپان کے ضبط کر لئے گئے تھے واپس کر دئے۔

طارق نے جس کا نام جبر الطریق یعنی جیل الطارق کی اونچی چوٹی پر رکھا ہوا ہے جب دارالسلطنت سپین کا محاصرہ کیا اور شہر کے رہنے والوں نے صلح چاہی وہ اُن کے ساتھ نہایت منتقل مزاجی سے پیش آیا اور اُن کے قبضہ میں رہنے دیا۔ اُن مذہبی دستوروں میں کچھ مداخلت نہ کی بلکہ اُن کے باہمی حقوق و معاملات کے تصفیہ کے لئے اُن کو اپنے جوں سے فیصلہ کرانے کی اجازت دی۔

محمد بن حرم نے اول اول ہندوستان پر چڑھائی کی گونیکا اور نصف امیروں میں نہ تھا مگر جس وقت اُس نے مغلوب ہندوؤں کے حقوق کی ہدایت چاہی تو یہ جواب عرب سے اُس کو ملا کہ جب لوگوں نے اطاعت قبول کر لی تو حقوق رعایا کے مستحق ہو گئے اور اس لئے مذہبی رسومات کے اجرا کی اُن کو اجازت دینی چاہئے۔ اور جو جاگیریں کہ برہمنوں کی ضبط کی گئی ہوں وہ واگداشت کر دی جاویں بلکہ تین روپیہ سیکڑا مالک کے محاصل پر جو راجے اُن کو دیتے تھے وہ سرکاری خزانہ سے دینا چاہئے۔ کیا نظیر اس کی اور کسی تختہ قوم کی تاریخ میں پائی جاتی ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اسی بات میں ناموری نہیں پائی کہ وہ بحر عرب سے نکل کر سپانیکہ کی وادی کبیر میں جا پہنچے اور وہاں سے ہندوستان کے دریائے سندھ میں آنکے۔ یا عرب ریگستان اور گرم خشک پہاڑوں سے ہلکے اُنہوں نے اپنی فتح کی جھنڈی اسپین اور فرانس کے پہاڑوں پر گاڑ دی۔ اور تھوڑے زمانہ میں اپنی حکومت اٹھارہ سو فرسخ میں قائم کر لی۔ بلکہ وہ اس پاد میں بھی نامور ہیں کہ اُنہوں نے اپنے مفتوحہ اور قبضہ ملکوں پر اپنی راست بازی اور عدد و سپان میں ثابت قدمی ثابت کر دی اور اپنی تھوڑی اطاعت میں غیر قوموں کو ہر قسم کی آزادی بخشی۔ جیسا کہ ڈاکٹر جے اے کانڈلی اپنی تاریخ اسپین میں لکھتے ہیں کہ ”وہ شرطیں جو مفتوحہ قوم پر قائم کی گئی تھیں اسی ہیں کہ لوگوں کو

بجائے تھینکے اُن فتح کرنے والوں نے طینان ہو گیا اور ریب انہوں نے اپنی اُس تقدیر کا جو پہلے تھی اپنی ہوئی حالت سے مقابلہ کیا تو اُن کو یقین ہو گیا کہ اُن کی خوش قسمتی ہوگی۔ مذہبی رسموں کے بجالانے میں آزادی گر جا اور عبادت خانوں کی بخوبی حفاظت۔ مال۔ عزت۔ جان سے پورا اطمینان۔ یہ سب چیزیں اُس حالت کا معاوضہ نہ تھیں جو انہوں نے اُس فتح مند قوم کی کی تھی۔ محسوس ہو گیا تھا وہ بہت ہی ہلکا تھا۔ اور تمام لوگوں پر عرب کا یہ اعتبار بڑھا ہوا تھا کہ وہ اپنے عہد و بیان کو خوب قائم رکھتے ہیں۔ اُس عام انصاف نے جو وہ ہر درجہ کے لوگوں سے بلا تیز کسی قوم و مذہب کے کرتے تھے اُن لوگوں کا سب پر اعتبار کر دیا اور تمام قوموں کی آنکھوں میں اُن کی عزت ہو گئی اور نہ صرف اپنے معاملات بلکہ دل کی فیاضی اور عادات کی عمدگی اور اپنی جتنی خاطر داری سے عرب والے اپنے وقت کے عام لوگوں میں معزز و ممتاز تھے۔

ایک نامی مورخ انگلستان کا لکھتا ہے کہ جب سلطان صلاح الدین نے دوبارہ بیت المقدس کو فتح کیا تو وہ اُن سے اُسی طرح پیش آ یا جیسا کہ دسویں صدی کی آخر اڑائی میں فتح کرنے والے مسلمانوں سے پیش آئے تھے۔ اور جنہوں نے بیت المقدس کے قلعہ میں چالیس ہزار مسلمان مع زن و فرزند قتل کر ڈالے تھے۔ بلکہ اُس نے کچھ ظلم نہ کیا اور جب اہل قلعہ نے اپنے نہیں اُس کے سپرد کیا۔ سلطان نے اُن عیسائی قیدیوں پر نہایت مہربانی کی اور جو لوگ ایسے غریب تھے کہ اپنی رہائی کی قیمت نہ ادا کر سکے انہیں مفت آزاد کر دیا۔ اس بادشاہ کے تہذیب و اخلاق کے سامنے بادشاہ فرانس تو کیا بلکہ رچرڈ شیر دل کی بھی کچھ حقیقت نہ رہی۔

عالمک پہن کو جو ترقی اور آبادی اور رونق مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں ہوئی اُس کی نسبت ایک فرانسیسی عالم لکھتا ہے کہ "اُس کی ترقی اور آبادی کا قیاس اس پر کر لینا چاہئے کہ ایک مقام قرطبہ میں دو لاکھ گھر اور چھ سو مسجدیں اور پچاس شفا خانے اور اسی عام مدرسے اور نو سو حمام تھے اور مٹروں پر قندیلیں اس قدر روشن ہوتی تھیں کہ شہر میں چلنے والے اُس کی روشنی میں پھرا کرتے تھے۔

جن فتح مند مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان کو فتح کیا ان میں بھی اچھے اور بُرے عادل ظالم سب طرح کے ہوئے مگر انہیں کی بدولت ہندوؤں میں تہذیب و شناسائی بھیلی۔ جس وقت مسلمانوں نے اپنی فتح کا نشان اعلیٰ پہاڑ کی اونچی چوٹی پر اُڑایا اُس وقت دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان کی قوموں کا اُن کے لباس کا۔ اُن کی طرز و معاشرت کا کیا حال تھا۔ اور مسلمان فتح مندوں کی فتوحات نے ہندوؤں کے دلوں اور اُن کی خصلتوں پر کیا اثر کیا۔ اور اُن کے اخلاق و معاشرت و تمدن میں کیسی تبدیلی پیدا کی جو تا پہنچا انہوں نے سکھایا۔ کپڑا پہننا انہوں نے بتایا۔ فرش پر بیٹھنا۔ مختلف طرح کے کھانوں کا پکھانا مکانات کی آراستگی۔ علم مجلس۔ اور ہزاروں چیزیں تہذیب و شناسائی کی انہیں کی بدولت ہندوؤں میں پھیلیں۔ بڑے بڑے شہر اُن کی بدولت آباد ہوئے۔ عمدہ عمارتیں جو اب دنیا میں منظر کشی جاتی ہیں انہیں کی توجہ سے تعمیر ہوئیں۔ ماں یہ کوئی نہیں کہ سکتا کہ اُن کا زمانہ ایسی تہذیب اور سولیزیشن کا

تھا جیسا کہ اب کوئین وکٹوریا کا ہے۔ جن متعصب مورخوں نے مسلمان بادشاہوں کے پچھلے کچھ غلط حالات ایک تعصب کے جوش سے بیان کئے ہیں۔ اُن کو چاہئے کہ اُن کے وقت کا مقابلہ مارن لوگوں کے اس عہد سے کرتے جب کہ انہوں نے انیکلوکیشن پر فتح پائی تھی۔ نہ کوئین وکٹوریا کے عہد سے ❖

چند سال ہوئے کہ ایک ہندو نے وائسرائے کی دار الحکومت یعنی کلکتہ سے پورانی مغل کی دارالخلافہ یعنی دہلی تک سفر کیا اور اس مختصر سفر کا ایک سفر نامہ تیار کیا جس کی عبارت انہوں نے اپنی دانست میں لارڈ مکالی کو شہرمانے والی لکھی تھی اُس میں انہوں نے لکھا تھا کہ کوئی آفت اور کوئی مصیبت مسلمانوں کی عملداری سے زیادہ ہندوستان میں نہ تھی۔ انہوں نے تمام خوبیوں کو براب کر دیا تھا۔ اس کتاب پر ٹیبلر لندن کے اخبار میں ایک یو یو بھلا تھا۔ اُس ریویو میں یہ فقرہ مندرج ہے کہ ”مسلمانوں کو برا کہنا اُن کے عیبوں کو ڈھونڈنا کو وہ صحیح ہوں ایک ہندو کے مُنہ سے نہایت نازیبا معلوم ہوتا ہے“ ❖

ایک بڑا الزام مسلمانوں کی سیاست پر یہ دیا جاتا ہے کہ مذہب تلوار کے زور سے پھیلا یا گیا۔ اور لوگ زبردستی مسلمان کئے گئے۔ مگر یہ الزام حقیقت میں صحیح نہیں ہے سب صاحب لکھتے ہیں کہ ”وہ لوگ نہایت دھوکہ کھاتے ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ مذہب اسلام زبردستی پھیلا ہے“ پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ ”اُن لوگوں نے اسلام کیوں قبول کیا جن پر مسلمانوں نے کبھی فوج کشی نہ کی تھی۔ اور پھر اُن لوگوں نے جنہوں نے اہل عرب کے اُن کے فتوحات سے محروم کر دیا اور اُن کی سلطنت بلکہ خلیفوں کا خاتمہ کر دیا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بات اس سے بڑھ کر تھی جو ایک مذہب میں عموماً خیال کی جاتی ہے۔ اور جس سے ایسی عجیب ترقی ہوئی۔ وہ لوگ جو مسلمانوں کو یہ الزام دیتے ہیں کیا جواب دیکھتے ہیں اس بات کا کہ ترکی جنہوں نے حجازیوں پر آٹھویں صدی کے اخیر پر حملہ کیا مسلمان نہ تھے اور پھر پھوڑے ہی دونوں بعد اپنے مغلوب حجازیوں کے دین میں مسلمان ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اسلام کی خوبیوں نے اُن کو مسلمان کر دیا لیکن صاحب لکھتے ہیں۔ افریقہ اور ایشیا کے لکھو کہا تو مسلم جنہوں نے کہ عرب کے مسلمانوں کی تعداد بڑھا دی۔ ایک خدا اور اُس کے رسول پر ایمان لانے میں افریقہ ہو گئے تھے؟ افسس صاحب نے بھی ہندوؤں کا جبر مسلمان کرنا تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ”محمود غزنوی نے ایک ہندو کو بھی جبراً مسلمان نہیں کیا۔ نہ سوا لٹائی کے کسی ہندو کے خون سے تلوار کو آلودہ کیا۔“ ❖

یہ حال مسلمانوں کے پہلے زمانہ کی تہذیب کا تھا۔ مگر جب ہم اس کا بیان کرنا چاہتے ہیں کہ وہ آپ کیسی ہے تو نہایت درد و حسرت سے ہم کو یہ لکھنا پڑتا ہے کہ نسبت سابق کے ہر بات میں مسلمانوں کی تہذیب نہایت منزل پر ہے ❖

مذہب کا خیال ہے کہ جو مسئلہ اصل اصول اسلام کا تھا یعنی سوائے ایک خدا کے اور کسی کو نہ ماننا وہ اپنی اصلیت پر نہ رہا۔ ہزار ہا مسلمان ہیں جو سوائے خدا کے ظاہر یا باطناً زندوں یا مردوں۔ جاندار یا بیجان

چیزوں کو پوجتے ہیں۔ اور جن اور مجھوت و پلید کو مانتے ہیں۔ تو نیکو گنہگار بناتے ہیں۔ حضرات کا عمل کرتے ہیں۔ شگونوں پر چلتے ہیں۔ خدا کے سوا دوسروں کی نذر نیاز کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض کج نیت خدا کے سوا اوروں کی نماز بھی پڑھتے ہیں *

روحانی تہذیب جو جان اسلام کی تھی اُس کا لوگوں کے دلوں میں کچھ بھی اثر نہیں پایا جاتا صرف ظاہری بناؤ سنوار پر اصل اسلام رہ گیا ہے۔ صد ہا مسلمان ہیں کہ پہروں ہاتھ پاؤں دھوتے ہیں گھنٹوں دریا میں ڈرے رہتے ہیں۔ بے عراب دار جانا نماز کے نماز نہیں پڑھتے۔ بے زیتون کے دانوں کے خدا کا نام نہیں لیتے۔ دکھانے کے لئے جیب میں مٹی کے ڈھیلے۔ اور بندیں پیلو کی سداک۔ اور دوش پر سلتے اور رومال میں سرہ دانی لئے اور ہاتھ میں تسبیح لئے پھرتے ہیں۔ گرافٹس ہے کہ دل کو بُرے خیالوں اور بد جذلوں سے پاک کرنے سے مراد پرہیز کی کچھ ٹکڑیاں لگنے۔ *

مذہبی تعلیم بھی اپنی حالت پر باقی نہیں رہی۔ اچھے اچھے عالم بجائے وعظ و نصیحت کے جب کسی مخالفت سے بات کرتے ہیں تو اُن کا چہرہ سُرخ آنکھیں نیلی سیلی ہو جاتی ہیں۔ بُرا بھلا کتنے لگتے ہیں یہاں تک کہ اگر سیاست کا خوف مانع نہ ہو تو مار ڈالتے ہیں تا تل نہ کریں *

ایسے مغلوب انضیب لوگوں کے علاوہ جو نہایت نیک عالم ہیں اُن کا بھی وعظ اپنی ہی مسجد کے سایہ اور مریدوں کے حلقہ میں ہوتا ہے۔ اور انہیں باتوں پر جن کو ہر کوئی جانتا ہے۔ ہم نے آج تک نہیں سنا کہ کبھی مولوی صاحب نے مسجد سے نکل کر مذہبی منادی کرنے کے لئے کسی ریگستان کی گرم ہوا کا صدمہ اٹھایا ہو۔ کسی پہاڑ پر جنگلی لوگوں سے اسلام کے پھیلانے میں مصیبت سہی ہو یا سواے اُن معمولی باتوں کے جس سے سب کے کان بھرے ہوئے ہیں کسی نے کوئی تحقیق کی بات بھی زبان سے نکالی ہو *

امامت کی کیفیت ہے کہ ہر ایک فرقہ ہر ایک گروہ نے اپنا ایک جدا امام ٹھہرایا ہے اور اُن کو رم کے پوپ سے بھی بڑھ کر معصوم سمجھ رکھا ہے۔ اور قرآن تو صرف تعویذ بنا کر بازو پر باندھ لینے یا مردوں پر فاتحہ پڑھنے کے لئے رکھا ہے *

اتباع پر وہ اعتقاد ہے کہ ہر ایک نے اپنے جہند کو نبی سمجھ رکھا ہے۔ سرِ مو اُن کے قول یا فعل یا راے سے تجا و زکر ناجائز نہیں جانتے۔ اُن کے نزدیک اُس پاک اور معصوم نبی کے قول جس کی باتیں ریگستان اور عرب کے پھرنے والے سمجھ لیتے تھے اُن کے جہندوں کے سوا دوسرا کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا نہ بے واسطہ اُن کے جہندوں کے کسی کو اُس پر چلنا جائز ہے *

جوگی پنہ اور تجرد اور رہبانیت کا وہ حال ہے کہ صد ہا جوگی مسلمان خیالی دنیا چھوڑے ہوئے جزیرہ تحصیل کرتے اور اپنی جھولیوں کو گول گول ابیض نورانی سے بھرے ہوئے دنیا داروں کو بُرا بھلا

کہتے پھرتے ہیں۔ اور مسلمان جاہل بھی اُن کو دلی اور خدا رسیدہ سمجھ کر اُن کے ہاتھوں نما کو شروت سمجھتے ہیں۔

تبرکات اور رسوم اور تیواروں کا حال ظاہر ہے کہ ہر شہر میں قدم رسول اور ولایت کی درگاہ اور امام حسن کی کربلا اور حضرت عباس کا روضہ اور بی بی فاطمہ کی زیارت موجود ہے۔ اور صد ہارے ہوئے ولیوں کے مزاروں پر عید گاہوں سے زیادہ ہجوم ہوتا ہے اور اُن کے تبرکات کی زیارت نجات کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے اور اُن کے مٹی کے ڈھیروں سے مرادیں مانگی جاتی ہیں۔

علم کا یہ حال ہے کہ علم ادب کسی کو اس زمانہ میں آتا ہی نہیں۔ شاید بعض چند مسلمان عالم ہو جو ٹوٹی بھوٹی عربی لکھ سکتے یا بول سکتے ہوں۔

علوم مذہبی کا جاننے والا اور تحقیق کرنے والا ایک بھی نہیں رہا۔ بڑی عسیت اس میں رہ گئی ہے کہ فقہ و حدیث یا تفسیر کی کتابوں میں سے کسی مطلب کے لئے کوئی روایت ڈھونڈ کر نکال لیا دے خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔

فلسفہ تو اب ہماری قوم میں نام کو بھی نہیں سنا جاتا۔ چند طالب علم کہیں کہیں یونانی فلسفہ کی کتاب میں پڑھتے ہیں جس کی اصلیت سے پڑھانے والا پڑھنے والے سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہوتا۔ طبیعیات جانتے والا مسلمانوں میں کوئی نہیں رہا۔ ان چند مسائل کا بیان اس زمانہ کے عالم اس طرح پر کرتے ہیں۔ کہ عناصر چار ہیں۔ خاک۔ باد۔ آب۔ آتش۔ یہ چاروں بسیط ہیں خاک کے اوپر آب اور آب کو اوپر باد اور باد کے اوپر آگ ہے اور وہ بہت بڑا تاری کرہ ہے۔ آسمان کی حرکت سے مشتعل رہتا ہے۔ مگر جو کہ قطبین کی طرف حرکت کم ہے اس لئے وہاں مشتعل بھی کم ہے۔ اور اس سبب اس کی شکل ابلیسی ہو گئی ہے۔ جب شاگرد پوچھتا ہے کہ ابلیسی کیا شکل ہے تو استاد اپنی سرسہ دانی محال کر دکھا دیتے ہیں کہ ایسی بیچ میں سے موٹی۔ دونوں طرف سے پٹی۔ پس اس زمانہ میں عالموں کی یہ طبیعیات رہ گئی ہے جس پر ہر کوئی ہنستا ہے۔

علم ہیئت بڑے بڑے درس گاہوں میں شریح الافلاک اور ثنوی سے زیادہ نہیں پڑھایا جاتا۔ بڑے بڑے عالم اس زمانہ کے چیمینی سے زیادہ نہیں جانتے۔ اُس میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ آسمان پیاز کے پتروں کی مانند درتہ درتہ ہے۔ سب اوپر کے پتر کی حرکت سے تمام اندر دنی پتر سے حرکت کر جاتے ہیں اور اسی طرح سے دن رات اور رات دن ہو جاتا ہے۔ دُوم دار ستارے کو اب تک ہمارے مولوی صاحب یہی سمجھتے ہیں کہ وہ زمین کا دھواں ہے جو کہ آگ کے کرہ تک پہنچنے سے جلنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ بجھ جاتا ہے۔

ہندسہ و حساب کچھ باقی ہے۔ اقلیدس کا ایک مقالہ اور خلاصۃ الحساب کی تحصیل۔ اربعہ یا چند تک

فصیلت کی پکڑی بندھوا دیتی ہے۔ مگر طالب علم یہ سوچتے ہیں کہ تحریر اقلیدس کے پڑھنے اور ان ٹیڑھی سی سیدھی شکل کے بنانے میں کیا فائدہ ہے؟

علم طب میں عظیم شیک بڑی ترقی پر ہے جس کے عالم یعنی طبیب ابھی تک معدہ سے جڑ تک ماسارینا ہی کی تنگ آہ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ قطع نظر اس کے یہ علم جس قدر کہ مسلمانوں میں تھا اب اُس کا جاننے والا ہی نہیں رہا؟

علم نباتات کی تحقیقات اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی ہے۔ اچھے پڑھے لکھے مسلمانوں نے لکھا ہے کہ سرانیدپ میں ایک درخت ہے جس پر کلمہ لکھا ہوا ہے۔ نہ زمین پر اُس کا پتہ کرتا ہے نہ کوئی جانور اُسے کھا سکتا ہے۔ ہمیشہ نرودتا زہ رہتا ہے۔ بڑے بڑے عالموں کا اس پر یقین ہے کہ بعضی بوٹیاں ایسی ہیں۔ جن سے سونا چاندی بن سکتا ہے؟

علم حیوانات میں بلاشبہ بڑی ترقی ہے۔ کیونکہ ہم اپنے ماں کے بڑے بڑے عالموں کو تغیر کرتے سنتے ہیں کہ اگر بکری کتے سے بچ پیدا ہو تو اُس کا کھانا درست ہے یا نہیں؟

علم جغرافیہ کا بیان کرنا بیفائدہ ہے۔ بڑے بڑے عالم یہ یقین کھتے ہیں کہ عدن میں شدا د کی بہشت موجود ہے جس کی دیواریں سونے چاندی کی درختوں نرودیا قوت کے ہیں اور موتی و جواہر کنکر تھکر کی طرح پڑے ہیں۔ اگر کوئی بھولے سے پہنچ جاتا ہے۔ تو اونٹ اپنا جواہر دں سے بھر لاتا ہے؟

دشکاری و فنون بعض تو معدوم ہو گئے اور جو مفید تھے وہ اب تک ہیں اور میری دانست میں بہ نسبت زمانہ سابق کے زیادہ ترقی پر ہیں؟

اخلاق کا یہ حال ہے کہ سچائی اور وفاداری۔ اخلاص و محبت۔ نیکی و ہمدردی کا نام نہیں جھوٹ اور کر۔ ریا اور نفاق۔ کینہ اور عداوت سے گنتی ہی کے مسلمان محفوظ ہو گئے؟

دو آدمی جن سے کبھی کی جان پہچان نہ ہو اس اخلاص سے ملینگے کہ گویا ماں جائے بھائی ہیں مگر دو دوست ایسے کم نکلیں گے کہ بیٹھتے ہی سچے ایک دوسرے کی بدگوئی اور غیبت نہ کریں۔ منہ پر تعریف کرنا اور پیچھے گالیاں دینا ایک عام فحشلت ہے۔ اقرار کا پورا کرنا۔ وعدہ کا وفا کرنا کوئی جانتا ہی نہیں کرو یا کی مجسم صورت کسی نے نہ دیکھی ہو۔ وہ ہمارے زمانہ کے مولویوں اور درویشوں کو دیکھ لے۔ صورت میں فرشتے اور سیرت میں شیطان؟

حسد اور عداوت تو ہم لوگوں کا خمیر ہو رہا ہے۔ کسی کی عزت ہم لوگوں سے دیکھی ہی نہیں جاتی۔ ہمدردی اور عام محبت کا سایہ بھی کسی کے دل پر نہیں پڑا۔ ہمارے خیال ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ انسان اپنے ذاتی کاموں کے سوا عام بھلائی کے کام بھی کرتا ہے؟

غیر ذہبی لوں سے سچائی اور اخلاص و محبت سے پیش آنا تو مسلمان کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ ہاں جھوٹی خوشامد کرنا اور نہایت عاجزی اور ذلت سے کسی امید یا خوف کے سبب سر قلم ہونے پر رکھ دینا عام دستور ہے۔

آداب مجلس کے تو ایسے ہیں کہ جس نے جنگل میں بھیڑ بکریوں کا ریوڑ نہ دیکھا ہو وہ مسلمانوں کی مجلس کو دیکھ لے۔ بلا اطلاع بے اجازت کے بے ضرورت کسی کے ہاں جانا۔ بے وجہ پہروں بیٹھے رہنا۔ اور بیہودہ فضول لغو باتیں کرنا۔ اور فرخش اور اخلاق و حیا کے برخلاف مشکوں اور کھانوں اور شعروں کا زبان پر لانا۔ بات بات پر قسم کھانا۔ ایک کا دوسرے کو برا بھلا کہنا۔ حرکات و سکنات میں آدمیت کا لحاظ نہ رکھنا۔ بات کرتے کرتے تمقہ مار کر دوسرے کے ہاتھ کو زور سے جھٹک دینا یا اس کے زانو پر ہاتھ مارنا۔ کسی کی بات کو پوری ہونے سے پہلے نیچ میں بول اٹھنا۔ معمولی آداب ہمارے یہاں کی مجلسوں کے ہیں۔

شادی بیاہ کے دستورات نہایت ہی نامعقول ہیں۔ اول تو سب سے بڑا مقصود نکاح کا یعنی رضامندی طرفین کی حاصل ہی نہیں ہوتا۔ نہ مرد عورت کو دیکھنے پاتا ہے نہ عورت مرد کو۔ بیٹھون بالغیب پر نکاح کا مدار آتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مرد و عورت دونوں نکاح سے ناراض ہوتے ہیں مگر شرم و خوف سے کچھ بول نہیں سکتے۔ مرد تو دل سے انکار اور زباں سے اقرار کرتا ہے۔ اور عورت اپنی حالت زار پر آٹھ آٹھ آنسوؤں سے روتی ہے۔ عین نکاح کے وقت جو نامعقول رسمیں ادا کی جاتی ہیں وہ تو ذکر کرنے کے ہی لائق نہیں۔ اگر ہندوستان کا دو لکھا پھولوں کا سہرہ سر پر ڈالے۔ سُرخ جوڑا پہنے۔ آنکھوں میں کاجل لگائے۔ ہاتھ پاؤں میں ہندی ملے ہوئے ایک ٹیٹوپر سوار ولایت کے کسی تھینڈیس کھڑا کر دیا جائے تو غائبانہ سارا شہر اس عجیب تماشا کے دیکھنے کو جمع ہو جاوے پھر فضول اخراجات شادی کے اور کھانا بائٹا یا عام گردہ کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح اکٹھا کر کے کھانا کھانا کیسی نامعقول رسم ہے۔ اُس پر قصبات و دیہات کی حشیا نہ رسمیں تو دیال جان ہیں۔ شرم اس کا نام ہے کہ عورت مرد جاوے پر کسی کے سامنے خاوند سے تہ بولے۔ بوڑھی ہو جاوے۔ مگر ماں باپ کے سامنے گھر کا انتظام نہ کرے اور اگر بھولے سے نام خاوند کا لے لیتی ہے تو نکاح ہی ٹوٹ جاتا ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مسلمان عورتیں شریف خاندان کی اکثر بڑھی لکھی اور خوش سلیقہ باتیں صاحب عصمت و حیا ہوتی ہیں اور اپنے گھر کا انتظام نہایت خوبی سے کرتی ہیں۔ اور خاندانی عزت کا خیال تو ان کا غیر ہے۔ مگر مردوں کی نالائقی اور بد چلتی اور نکاح کے نامعقول دستوروں اور معاشرت کی بد رسموں کے سبب اکثر وہ اُس خوشی سے محروم رہتی ہیں جس کی وہ مستحق ہیں۔

• بیوہ عورتوں کے نکاح کا میوہ جاننا جو سراسر اسلام کے خلاف ہے عام دستور ہے۔ مگر
 یہ ساری خرابیاں ہمارے ملک ہندوستان ہی میں ہیں اور مسلمانوں میں یہ خرابیاں کم ہیں۔
 اولاد کی تعلیم و تربیت کا خیال ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک مدرسہ بھی ایسا نہیں ہے جو
 موافق اس ترقی یافتہ زمانہ کی حالت کے کافی ہو۔ بعض نیک مسلمانوں نے اپنے طور پر چند جگہ عربی
 فارسی کے مدرسے قائم کئے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی بھی مدد مسلمانوں نے نہ کی۔ روز بروز ان کی
 حالت پر تنزل پر ہے۔ لیکن اگر وہ ترقی بھی پاویں تب بھی ہماری حاجتوں کے لئے کافی نہیں ہیں
 اس لئے کہ جو علوم ان میں پڑھا جاتے ہیں ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ جن کے اصول ہی غلط ہیں
 اور بعض ایسے ہیں کہ زمانہ حال کی ترقی نے ان کا رنگ ڈھنگ بدل دیا۔ اور بعض بالکل غیر مفید اور
 فضول ہیں۔ ان علوم سے ہرگز یہ امید نہیں ہو سکتی کہ ہمارے خیالات کو ترقی ہو یا ہمارے دلوں
 میں آزادی اور تحقیق کا ولولہ پیدا ہو یا دنیا کے عجائبات اور موجودات کے حقائق کے دریافت کرنے
 میں ہم کو ان سے کچھ مدد ملے یا وہ ہمارے فنون کی ترقی اور تجارت اور زراعت اور مال و دولت کے
 بڑھانے میں کچھ کام آویں۔ پھر جس طور پر تعلیم ہوتی ہے وہ بھی ایسی نہیں ہے کہ جس قدر عرصہ اس میں
 صرف ہوتا ہے اس کا پورا معاوضہ ملتا ہو یا سوائے لفظوں اور عبارتوں کے علوم کی حقیقت کا اثر پڑھنے
 والے کے دل پر ہوتا ہو۔

تعلیم سے بڑھ کر ہماری اولاد کو تربیت کی حاجت ہے جس کا کچھ بھی سامان نہیں ہے۔ ہزار
 لڑکے ان فائدہ انوں کے جو کہ علم اور شرافت اور عزت میں نامور ہیں کینوں کی صحبت میں بیٹھ کر ان کی
 بدعاتیں اختیار کر لیتے ہیں اور بدچلن بازار آدھیوں کے ساتھ رہ کر آوارہ ہو جاتے ہیں۔ اور امیروں
 اور نوابوں کی اولاد کا بدچلن ہونا تو ایک ضروری امر ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کی امیری اور
 بدچلنی۔ نوابی اور جہالت لازم و ملزوم ہیں۔ ان آفتوں سے بچ کر اگر تربیت بھی ہوتی ہے تو ایسی
 کہ جس کا فائدہ تربیت نہ پانے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ مدرسوں کے طالب علم اگر صبح سے آدھی رات
 تک برابر کتاب دیکھتے رہیں تو بڑی تعریف کے مستحق ہوتے ہیں۔ اور کوئی ایسا کھیل جس سے ان
 کے قوائے جسمانی کو طاقت ہو اور قدرتی جذبات شگفتہ ہوں کھیلنے نہیں پاتے۔ نہ اس کا کچھ سامان ہے
 اس واسطے اکثر طالب علم ایسے ضعیف و کمزور دلاغر ہوتے ہیں کہ جب مدرسہ سے نکلنے میں توشہ ہوتا
 ہے کہ شاید کوئی مردہ قبر سے نکلا ہے۔ پھر اخلاق کے درست کرنے اور چال چلن میں شائستگی پیدا کرنے
 اور عمدہ طور سے زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالنے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ یہ مثال ٹھیک ٹھیک ہمارے
 مدرسے کے پڑھے ہوؤں پر صادق ہوتی ہے کہ مولویوں کی عقل اڑے۔ اور لڑکوں کی عقل کتاب لے لیتی
 ہے۔ یہ نقص تعلیم و تربیت کا زیادہ ہندوستان میں ہے۔ مگر ٹرکی اور مصر اور تونس میں انتظام ہوتا جلتا ہے

چنانچہ پندرہ ہزار مدرسے ترکی کی عملداری میں ہیں جس میں سے دس لاکھ سے زیادہ لڑکے پڑھتے ہیں اور خاص قسطنطنیہ میں ایک یونیورسٹی قائم ہے۔ اور دستور تعلیم کے مدرسے اور عورتوں کے اسکول انتہائی علوم کے کالج بائبل یورپ کے ڈھنگ پر جاری ہیں۔ مصروف بھی اسی طور کا انتظام ہے۔ خود خدیو مصر کے دونوں لڑکے لندن کے مدرسے میں تعلیم و تربیت پاتے ہیں۔

لباس و پوشاک ہم ہندوستانیوں اور سنٹرل ایشیا کے مسلمانوں کا کچھ عمدہ نہیں ہے نہ خاص خاص قوتوں اور طبسوں کے لئے کوئی مخصوص لباس ہے۔ مگر جو لباس ترکوں نے سلطان محمود کے وقت سے پسند کیا ہے اور جسے بعض نامہ مسلمانوں نے ہندوستان کے بھی اختیار کیا ہے وہ نہایت عمدہ ہے۔ عورتوں کا لباس تو ایسا ہے کہ خود مہذب مسلمان اُس سے شرماتے ہیں۔ ہم ہندوستان اور ایشیا کے مسلمانوں کے کھانے کا طریق بھی کچھ عمدہ نہیں۔ مگر ترکوں اور اکثر مصریوں نے بائبل یورپ کے طور پر یا قریب قریب اُس کے طرز کھانے پینے کا اختیار کیا ہے اور ہندوستان کے بھی تہذیب یافتہ مسلمانوں نے اُسے رواج دیا ہے۔

سیاستِ مدن میں ایشیا کے مسلمان نہایت ابتری کی حالت پر ہیں۔ بخارا اور خجند اور مسقط اور زنجبار میں جیسے شیعہ اور عقل اور انصاف اور اخلاق کے برخلاف سیاست کے قاعدے جاری ہیں اور جس میں بعض ظلموں کے دور کرنے کے لئے یورپ کی تربیت یافتہ گورنمنٹوں نے اپنا فرض بھی ادا کیا اُن سے مسلمانوں کی بہت کچھ بدنامی ہوتی ہے۔ ہاں یورپ کی دیکھا دیکھی ترکی اور مصر اور تونس میں کچھ ترقی شروع ہوئی ہے اور سیاستِ مدن کی اصلاح ہوتی جاتی ہے۔ اُن کے پورا تاریک خیالات بدلتے جلتے ہیں۔ چنانچہ ایک نامہ سے جو سلطان نے جنوری ۱۸۷۷ء میں بخارا کو لکھا تھا۔ جب کہ اُس نے سلطان سے بمقابلہ روس کے مدد مانگی تھی۔ شاہ بخارا اور سلطان کے خیالات کا تفاوت معلوم ہوتا ہے۔ سلطان لکھتا ہے کہ ”دایسلنٹ یہ ہے کہ اپنے دوست اور آشنا کو بچاؤ رہے اور سلاطین دور و نزدیک سے راہ و رسم جاری رکھے اور رشتہ محبت و الفت کو محکم و مضبوط رکھے مگر تم نے کسی سلطنت سے راہ و رسم ظاہری پیدا نہ کی اور وضعِ رتاؤ اپنا یہ کھا کہ کوئی سبیل یا کوئی وکیل کسی سلطنت کا تمہارے ملک میں وارد ہوا اگر وہ قوم انگریز یا روس ہوا تو اُس کو تم نے سزاوارتہ قتل کیا اور اگر اہل ایران تھا تو اس کو شیعہ ہونے کے سبب پھڑکے فروخت کیا اگر باستاندہ روم تھا تو اُس پر تہمت جاسوسی اور خفیہ نوپسی لگا کر چاہ سیاہ میں قید کر کے ہلاک کیا۔ اب انصاف کرنا چاہئے کہ یہ راہ و رسم کیسی ہے۔ تم نے وہ طریقہ رکھا ہے کہ کسی سلطنت کی تمہارے ساتھ دوستی نہیں تو اب کس واسطے اور کس رابطہ سے امداد چاہتے ہو۔ اور میں یا ظہار کو نسی راہ و رسم کے شاہ روس سے بگاڑوں۔ یہ فرق شاہ بخارا و سلطان کے خیالات میں ہوا صرف نتیجہ یورپ سے

تفرق اور اختلاف کا ہے۔ یہ کیفیت حال کے تنازلات کی جوئیں نے بیان کی ضرور ہے کہ اُس کے سببوں پر بھی کچھ غور کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ ہر نتیجہ ایک مناسب سبب سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر ایک سبب کا اُس کے مناسب نتیجہ ہوتا ہے۔ پس یہ ایک نہایت ضروری امر ہے۔ اُن سببوں کی چھان بین کیجا کہ جن سے یہ تنازلات پیدا ہوئے۔ چنانچہ میرے نزدیک اُس کے چند سبب ہیں:-

اول شخصیت سلطنت کا ہونا۔ تمام ایشیا میں ملکی اور قومی اور علمی ترقیاں یا تنازلات ایک بادشاہ کے خیال پر منحصر ہیں۔ جس طرف وہ متوجہ ہوتا ہے کل رعایا کی توجہ اُسی طرف ہوتی ہے چونکہ مسلمانوں میں سوائے ابتدائی زمانہ کے ہمیشہ شخصیت سلطنت رہی اور مختلف مزاج اور مختلف خیال کے بادشاہ تحت نشیمن تھے اس لئے پوری پوری ترقی کسی بات میں حاصل نہیں ہوئی اور اخیر میں جب بادشاہ رابرالائق اور جاہل اور کامل ہوتے گئے اور علوم و فنون کی طرف اُنہوں نے کچھ توجہ نہ کی۔ مسلمانوں کو بھی ہر بات میں تنزیل ہوتا گیا۔ اگر مسلمانوں میں بے خیال بادشاہ کے ہر چیز کی طرف وہ توجہ ہوتی جواب یورپ کی رعایا کہے تو ہرگز یہ قومی تنازلات نہ ہوتے۔

دوسرا سبب مذہبی ادھام میرے نزدیک یہاں کہ ایک سچا مذہب جو ادھام اور غلط خیالات سے پاک ہو تہذیب کی ترقی کا بڑا سبب ہوتا ہے اُسی طرح جھوٹا مذہب یا وہ مذہب جس میں لغو ادھام اور بیہودہ خیالات بل جل گئے ہوں ساری ترقیات کے روکنے کا بڑا قومی سبب ہے۔

مذہب اسلام فی نفسہ نہایت سچا اور صحیح مذہب ہے مگر خود ہم نے اپنے لغو خیالات سے اُس کو ایسا کر رکھا ہے کہ علوم میں۔ فنون میں۔ اختلاط میں۔ ہمدردی میں۔ عرض کہ ہر چیز میں بجائے ترقی کے ہم کو مذہبی مزاحمت ہوتی ہے۔ اور آزادی رائے جو ایک قدرتی حق اور ایک سچے مذہب کا پہلا اصول ہے وہ بالکل جاتی رہتی ہے۔ حالانکہ آزادی رائے کی مزاحمت ہی ساری خرابیوں اور تمام تنازلات کی جڑ ہے۔ کیا خوب کہا ہے صاحب نے کہ ”جب انسان کا دل قانون کے خوف یا کسی مذہب سے بڑی بڑی ضروری باتوں پر آزادانہ گفتگو نہیں کر سکتا تو اکثر سست اور ضعیف ہو جاتا ہے۔ اور جب کہ یہ سستی کسی قدر اور زیادہ ہوتی ہے تو روزمرہ کی باتوں اور معمولی معاملوں میں بھی کچھ ترقی نہیں کر سکتا۔ اور جب کہ اور بھی زیادہ سستی بڑھ جاتی ہے تو وہ اپنی پہلی مثال کی ہوئی باتیں بھی بھول جاتا ہے۔“

مسلمانوں میں مزاحمت آزادی رائے کی ہر زمانہ میں مذہبی ادھام کے حسبِ جاری رہی۔ کسی زمانہ میں کم کسی میں زیادہ۔ اور اسی وجہ سے عام ترقی مسلمانوں کی۔ جب یہ مزاحمت بڑھ گئی۔ تو پورا پورا تنزیل اُن کو نصیب ہوا۔ چنانچہ ہم اپنے زمانہ میں سارے تنازلات اس مزاحمت کی ترقی ہی کے سبب سے دیکھتے ہیں۔

تعصبات یعنی دوستی نہ رکھنا۔ سچائی اور صفائی سے غیر قوموں سے نہ ملنا غیر مذہبوں کی عمدہ باتوں کو اختیار نہ کرنا۔ غیر ملکوں کا سفر نہ کرنا جو تہذیب اور ساری ترقیوں کی بڑی روکنے والی چیز ہیں۔
ہیں صرف مذہبی ادنام کے نتیجے ہیں جس میں ہم مسلمان خصوصاً ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں۔

تیسرا سبب اشاعت علوم و فنون کے عام اور آسان وسیلوں کا نہ ہونا۔ بڑا عمدہ وسیلہ ترقی کا ملکی زبان ہے۔ کسی ملک اور کسی قوم نے کچھ بھی ترقی نہیں پائی جب تک اُسی ملک یا اُسی قوم کی عام زبان میں علوم کا رواج نہیں ہوا۔ مگر اس سے مسلمانوں نے عموماً غفلت کی۔ عام علوم انہوں نے عربی میں زبان میں رکھے اور دنیا کے سارے حصوں میں جہاں جہاں وہ گئے عربی ہی کو علوم کی کنج سمجھتے رہے اس واسطے مذہبی اور عقلی اور تمام قسم کے علوم اُس فرقہ سے مخصوص رہے جو کرا دلی زبان کی مشکل کو حل کرتے اور عالم کہلاتے اور عام لوگ ہیچینہ کاٹھ کے آکر رہے۔

ہمارے زمانہ میں جو چند مذہبی کتابوں کا ترجمہ ایسی زبان میں ہوا اسے اُس کا یہ اثر ہے کہ ہزاروں مسلمان اردو خوان ہیں کہ وہ حدیث تفسیر فقہ عقاید تاریخ سے ایسے واقف ہو گئے ہیں کہ تین برس پہلے شاید سوائے دہلی کے شہور مولویوں کے کوئی اُن سے واقفیت نہ رکھتا تھا۔ اور یہ تیسرا ملکی زبان میں علوم کے ترجمہ ہونے کا ہے۔

چھاپہ کار نہ ہونا بھی اگلے زمانہ میں ترقی نہ کرنے کا ایک بڑا سبب تھا چنانچہ اس زمانہ میں جو ترقی دکھائی دیتی ہے ہرگز نہ ہوتی اگر یہ عمدہ ہنر ظاہر نہ ہوتا۔ اسی ہنر کا نتیجہ ہے کہ ریویو اور جرنل اور دیگرین اور اخبار اور مختلف قسم کے کاغذات کے ذریعہ سے علوم و فنون کی وہ باتیں عوام میں پھیلی جاتی ہیں جن کو صرف عالم لوگ جانتے تھے اور جس کے سبب اب علوم و فنون کا منزل پامال خیال میں نہیں آتا۔ اور معدوم ہوتا تو ایک امر محال ہے۔

سفر کے ذریعوں کی آسانی بھی ملکی تہذیب کا بڑا سبب ہے انسان کا دل خدا نے ایسا بنایا ہے کہ عمدہ باتوں کے دیکھنے تربیت یافتہ قوم سے ملنے کا اثر ضرور اُس پر پڑتا ہے۔ اور کسی کو اچھا کام کرنے دیکھ کر لامحالہ اُسے پسند کرتا ہے یہاں تک کہ تعصب جاہل سا جاہل بھی اُس سے محروم نہیں رہتا اور یہ بات حاصل نہیں ہوتی جب تک دوسرے ملکوں میں جانے اور غیر قوموں کے ملنے کا اتفاق نہ ہو۔ چونکہ یہ آسانی اگلے زمانہ میں نہ تھی اس لئے ترقی جیسی کو چاہئے نہ ہوئی۔ اور اس زمانہ میں علوم و فنون کی جو کچھ ترقی ہے وہ صرف سفر کی آسانی سے ہے۔ اس مبارک زمانہ میں بل اور تار برقی وہ چیزیں ہیں جس نے دنیا کے مختلف ملکوں کو ایک کر دیا اور اُسی کا نتیجہ ہے کہ مختلف قوموں کے خیالات بھی ایک ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اُمید ہے کہ ایک ایسا وحدت کا زمانہ آجاوے جس میں کسی چیز میں بھی اختلاف نہ رہے یہاں تک کہ مذہب بھی سب کا ایک ہو جاوے اور غالباً وہ مذہب

مہر ہوگا جو بالکل منجھپ کے مطابق ہو جسے میرے دوست سید احمد خاں بہادر ٹھیکٹ اسلام
کہتے ہیں ۛ

چوتھا سبب جو خاص ہندوستان کے نصیب ہمانوں کے تفرقات کا سبب ہوا ہندوستان
کا وطن کر لینا اور اپنے اصلی وطن کو چھوڑ بیٹھنا ہے۔ مسلمان جب کہ ہندوستان میں آئے اُس وقت
نہایت تنومند اور سرخ و سفید اور قوی و تندرست تھے طبعیتیں بھی اُن کی آزاد تھیں۔ لڑائی بھی
اُن کے ایک جوش تھا۔ رسوم کی پابندی سے اُن کو خبر نہ تھی۔ مگر جب ہندوستان کو اپنا وطن
بنالیا اور اُن قوموں سے مل گئے جو کہ اُن سے قوت میں۔ دلیری میں۔ آزادی میں۔ علم میں۔
معاشرت میں کم تھیں اور چھوٹ اور پرہیز اور رسموں کی پابندی اور تنگ خیالات اُن کے رگ و ریشہ
میں بہا رہے تھے تو رفتہ رفتہ وہ بھی ویسے ہی ہو گئے۔ اُن کی اصلی حالتیں بالکل بدل گئیں۔ وہ
خون جو ابراہیم کی رگوں کا ہم میں تھا بدل گیا۔ وہ ہڈی جو اسماعیل کے خون سے بنی تھی بدل گئی۔ وہ
دل جس میں شمشیں جوش تھا بدل گیا۔ غرض کہ چڑا بدل گیا۔ رنگ بدل گیا۔ صورت بدل گئی۔ سیرت
بدل گئی۔ دل بدل گیا۔ خیال بدل گیا۔ یہاں تک کہ مذہب بھی بدل گیا۔ تمام وہ جوش جو اُنٹھے
تھے اُس ریتیہ جنگل عرب سے جس نے فارس اور تمام سنٹرل ایشیا کو سرسبز و شاداب کر دیا تھا
ہندوستان میں آکر بنی آت جنگل میں ڈوب گئے ۛ

اگر اب ہم آئندہ زمانہ کی پیشینگوئی کرنی چاہیں کہ آئندہ کو مسلمانوں کی تہذیب کیسی ہوگی تو ہم کو
کسی ترقی یافتہ ملک کے حال پر نظر ڈالنی چاہئے کہ اُس نے کیونکر ترقی کی۔ اگر وہی آثار ہماری قوم
میں بھی پائے جاویں تو ہم کو ضرور آئندہ کی ترقی کی امید کرنی چاہئے۔ ہم یورپ کا حال دیکھتے ہیں
کہ اگلے زمانہ میں ارسطو کا فلسفہ یورپ میں جاری تھا اور وہ دین مذہب سے ویسا ہی مل گیا تھا
جیسا کہ مسلمانوں کے مذہب سے مختلط ہو رہا ہے۔ اور جب تک وہ قایم رہا کسی طرح کی مذہبی یا
عقلی ترقی یورپ میں نہیں ہوئی۔ آخر تیرھویں صدی میں تقلید کے چھوڑنے کی راہ نکلی۔ چنانچہ
روح بیکن نے جو سائنس میں پیدا ہوا اور حقیقت میں شاگرد مسلمان فلسفیوں کا تھا اپنا پانوں تقلید سے
نکالا اور فلسفہ بحشیہ قیاسیہ کو چھوڑ کر فلسفہ شہودیتہ تجربیہ پر متوجہ ہوا۔ اُس نے بہت سی کتابیں لکھیں مگر
جب کہ ارسطو کے فلسفہ کو لوگوں نے غلط جانا تب وہ افلاطون کے فلسفہ پر متوجہ ہوئے۔ اور اس نے
ترقی فلسفہ کی رگ لگئی۔ مگر پندرھویں صدی کے شروع میں طلسمیں اور کمپلا اور ریس محققوں نے
اس فلسفہ کے اصول کے باطل کرنے پر کوشش کی اور تحقیق کی راہ نکالی۔ مگر جس طرح کہ اس زمانے مسلمان
ایسے امور میں تحقیق کو کفر بتاتے ہیں وہی مصیبت اُن بیچاروں پر بھی پڑی لیکن کی تکفیر کا فتوے دیا گیا
اور ریس قتل کیا گیا۔ پھر بڑا انقلاب یورپ میں سہیت قدیرہ کی غلطی بیان کرنے اور سہیت جدیدہ کے

ثابت کرنے پر ہوا۔ اگلے زمانہ میں یورپ کے لوگ آسمان و زمین کو دیکھا ہی جانتے تھے جیسا کہ اب مسلمان طبیبی ہیئت کے موافق مانتے ہیں اور یہ مسائل مذہب میں ایسے ہی داخل سمجھے جاتے تھے جیسا کہ اب مسلمان سمجھتے ہیں۔ مگر کوہنکس نے جو کہ پریشیہ کی اطراف کا رہنے والا تھا شہداء میں چاہا کہ اس ہیئت کی غلطی ظاہر کی جاوے مگر پادریوں اور مذہبی لوگوں کے سب سے اُسے جرأت نہ ہوتی تھی۔ آخر شہداء میں اُس نے ایک کتاب لکھی مگر اُس کے مشورہ کرنے میں بڑا تامل کیا۔ آخر شہداء میں کچھ خلاصہ اُس کا مشہور ہوا۔ مگر وہ اُسی زمانہ میں مر گیا اور بردلونا می حکیم نے اُسے مشہور کیا مگر وہ اُسی جرم میں نکالا گیا۔ اور دینی محکمہ میں اُس کی تحقیقات کی گئی اور اُس کو کفر و الحاد کے مسائل کا پھیلانے والا ٹھہرایا۔ آخر شہداء میں پھر وہ روم میں زندہ جلایا گیا۔ اس تصویر میں کہ اُس نے ایک صحیح مسئلہ ہیئت کا زبان سے نکالا تھا۔ شہداء میں گلیلونا می حکیم نے دو رہن ایکاد کی اور اس حکمت کی رونق دی۔ مگر متعصب پادریوں کو اس سے بڑی برہمی ہوئی۔ انہوں نے اس کو بدمذہب ٹھہرایا اور آخر ایک حجرہ تنگ تاریک میں بند کیا۔ مگر باوجود اس کے پھر اُن نامور حکیموں کی تحقیقات کو نہ مذہبی تعصب روک سکا۔ نہ جہلانہ خیالات اُس کے مزاحم ہوئے۔ اور اب اُس کو وہ رونق ہے کہ اگر اس کے برخلاف ہیئت قدیمہ کا سبک کسی کی زبان پر آوے تو کیا حکیم۔ کیا پادری سب اُس آدمی کو پاگل اور دیوانہ بنا دیں۔ پھر اسطو کا فلسفہ جو مذہب میں داخل ہو گیا تھا اور پلوپوں کو معصومیت کا درجہ دیا گیا تھا اور نجات کے فرمان نیچنے کا اُن کو اختیار تھا اور آسمانی کتابوں کے پڑھنے اور اُس پر عمل کرنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ اس غلط خیال کو نامور لوگوں نے کھویا مگر جو مصیبت اُس پر اور اُس کی پیروی کرنے والوں پر ہوئی اُس کے سننے سے بدن پر عیشہ ہوتا ہے۔ مگر آخر اُسے کامیابی ہوئی۔

یہی حال بجز اب ہم مسلمانوں میں پائے ہیں۔ ترکی میں۔ مصر میں۔ اور ہندوستان میں بھی بعض خدائزس آدمی اپنی قوم کی بھلائی کے لئے آمادہ ہوئے ہیں اور جس طرح کہ اُن یورپ کے عالموں نے مسائل حکمت کے بیان کرنے میں کوشش کی ہے اسی طرح یہ لوگ بھی کر رہے ہیں۔ جو کہ اس زمانہ میں انتظامِ سلطنت کا دوسرے قاعدہ پر ہے اس سب سے اُن حقیقات کہتے والوں کو کچھ مضرت نہیں پہنچی۔ صرف کفر و الحاد کے فتوے ہی پر خیر گذری ورنہ اُن پر اُس سے بھی زیادہ سخت مصیبت گذرتی جو انکوں پر گذر رہی ہے مگر ان تمام حالات سے آئندہ کی بہتری کی امید ہوتی ہے۔

ترکی یعنی روم کی سلطنت جو کسی زمانہ میں نہایت قوی تھی اسی صدی کے شروع میں نہایت متزلزل کی حالت پر پہنچ گئی تھی۔ مملوکوں کی خیانت اور قاضیوں کی بددیانتی اور لوگوں کی جھوٹی ایمانداری اور عوام کے مذہبی آدمی اور تعصبات کی یہ فیرت پہنچی تھی کہ قریب تھا کہ اسلام کا نشان سپین

کی طرح اُس مبارک زمین سے مل جاوے۔ مگر خدا نے سلطان محمود کے دل سے ان یہودہ توہمات کو نکال کر اُسے انتظام مملکت کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ اُس نے ایک تبدیلی معاشرت اور سیاست کے قاعدوں میں کرنی چاہی۔ مگر جیسا کہ نادان اور خود غرض مذہبی آدمی جن کا عوام پر بہت کچھ رعب اب ہوتا ہے۔ ہمیشہ اپنی عزت اور دولت کے خیال سے ایسے کاموں میں مارچ ہوتے ہیں اس فتنہ کو فرو کرنا چاہا۔ مگر آخر نبوت خوریزی کی پہنچی اور جب تک کہ بہت سے مولویوں اور قاضیوں اور اسلام کے بدنام کرنے والے مسلمانوں کے سلسلہ اسلام پر قربان نہ کئے گئے وہ انتظام پورا نہ ہوا۔ مگر آخر کار سلطان نے فوج کی دردی باطل بدل دی۔ اور یورپ کی سلطنتوں کا سا انتظام جاری کیا۔ پوشاک اور طریق خوراک اور طرز معاشرت بھی بدل دیا یا غلاموں کو بھی آزاد کر دیا۔ اور غلامی بھی قطعاً موقوف کر دی اور بلایا خاقوم وندہیک اپنی عام رعایا کے حقوق ایک کر دے۔ ٹیکا لگانے کا کارخانہ جاری کیا۔ علم تشریح کا مدرسہ بنوایا۔ دہائی سیاریوں کے لئے شفا خانے تیار کرائے۔ فرانس اور جرمن دار الحکومت کی علمی کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کرایا۔

بعد میں اس سلطان کے اُس کے جانشینوں نے بھی اُس میں ترقی کی چنانچہ سلطان عبدالعزیز جو اب تخت پر ہے ۱۲۸۷ھ میں فرانس اور لندن گیا اور وہاں کی شان و شوکت اور رعیت غریب کا حال کو اپنی آنکھ سے دیکھا۔ پھر شاہ آسٹریا اور ولی عہد انگلستان اُس کے یہاں آئے اور ہماں ہوئے اور رشتہ دوستی و محبت کا جو کہ ملک اور عزت کی ترقی کا بڑا قوی سبب ہے باہم ان بادشاہوں کے مضبوط ہوا۔

غرض ان تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ترکی کی سلطنت کسی طرح ضعیف نہیں سمجھی جاتی اور یورپ کی اور سلطنتیں بھی عزت کی نگاہ سے اُس کو دیکھتی ہیں۔ تعلیم و تربیت اور ترقی ملک کے دہی اصول و قواعد جاری ہیں اور ہوتے جاتے ہیں جو یورپ کی آؤر شاہت سلطنتوں میں جاری ہیں۔ یورپ کی حسد نفع بدائع پر بھی بڑی توجہ ہے۔ آہنی سڑکیں بھی تیار ہوتی جاتی ہیں۔ انتظام دربار اور عدالت اور پھریوں کا بھی یورپ کی اور سلطنتوں کے طور پر کیا گیا ہے۔

یہ ترقی جو کچھ سلطان حال نے کی وہ نتیجہ یورپ کی سیر اور فرانس اور لندن میں جا کر وہاں کے کارخانوں کے دیکھنے کا ہے جس سے اس کے خیالات میں ایک بڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔ چنانچہ سلطان یورپ کے سفر سے لوٹا تو اُس نے عام دربار میں ایک اسپچ کی جس میں یہ فقرہ بھی تھا کہ ”جن قوانین کی قباحتوں سے ہم آرزوئے تجربہ واقف ہو گئے ہیں اُن کی ترمیم و تکمیل اور جن قواعد کی خوبی ہم کو معلوم ہو گئی ہے اُن کے استحکام سے ہمارا ملک اور ہماری قوم بہت جلد دولت و اقبال کے اعلیٰ درجہ پر پہنچے گی۔“

مصر بھی ترقی پر ہے۔ اُس میں بھی تعلیم و تربیت اور انتظام مملکت یورپ کے ڈھنگ پر ہو جاتا ہے۔ خود خدیو مصر کئی مرتبہ فرانس اور لنڈن گیا اور اُس وقت اُس کے دو لڑکے لنڈن کے مدرسے میں تعلیم پاتے ہیں *

لونس جو ایک چھوٹی سی ریاست مسلمانوں کی ہے نہایت ترقی کرتی جاتی ہے۔ اس ریاست کا وزیر سید خیر الدین احمد جو دوسرا رشید پاشا اور ایک رشید فیضیہ اور لائق آدمی ہے اُس نے یورپ کے حالات بخوبی واقفیت پیدا کی بہت سے لوگوں کو اپنے ملک کے۔ فرانس اور لنڈن کے حالات دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ اور بہت سی علمی کتابوں کو عربی زبان میں کیا۔ خود اُس نے ایک ایسی عمدہ کتاب لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یورپ کے علوم و فنون اور وہاں کے تمدن و معاشرے کے مقابلہ میں مسلمانوں کی جہالت اور ذلیل حالت پر کس قدر متاسف ہے۔ اس وزیر نے اپنا پُرانا طریقہ چھوڑ دیا ہے اور تعلیم و تربیت کے لئے مدرسے بالکل یورپ کی طرز پر جاری کئے ہیں۔ اس وقت اُس کے چھاپہ خانہ میں بہت سی علمی کتابیں چھپ رہی ہیں ایک مسلمان عالم ابو العباس نامی جو چھپکسوں سے زیادہ عرصہ تک فرانس اور لنڈن اور آذربائیجان میں یورپ کے رہا ہے اور فرانسیسی اور انگریزی زبان سے بخوبی واقف ہے اُس کا مہتمم اعلیٰ ہے۔ اس مسلمان عالم نے بھی کئی کتابیں اس غرض سے تالیف کی ہیں کہ مسلمانوں کو جوش اور دلولہ پیدا ہو اور وہ علوم و فنون کو جو یورپ میں جاری ہیں اپنے علموں سے مقابلہ کریں۔ وہ اپنی ایک کتاب میں لکھتا ہے کہ ”پچھلے کا ڈیر یورپ کے علموں میں یہ فرق ہے کہ ہم مدرسے میں بیٹھ کر بیٹھ جہوں سے صفت مشبہ کی لفظی بحث کرتے ہیں۔ اور یورپ کے تعلیم یافتہ دو منٹ میں لیورپول سے آسٹریا کو خبر بھیجتے ہیں“ ان دونوں تعلیم کا جدا جدا اثر جو ملک اور قوم کی ترقی پر ہوتا ہے وہ اس سے ظاہر ہے۔ ایران میں بھی شاہ کے یورپ جانے سے اُمید ہے کہ آئندہ زمانہ میں کچھ ترقی ہو *

امیر کابل بھی جب ہوا نبالہ سے واپس گیا ہے اپنے تاریک خیالات کی پابندی چھوڑتا جاتا ہے۔ یہ ترقیاں جو کچھ ان ملکوں میں ہوئی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں اُن پر نظر کر کے نہایت افسوس ہوتا ہے کہ مسلمان ان ملکوں کے جو کہ ہمسایہ یورپ کے ہیں ایسی ترقی کرتے جاویں اور ہندوستان کے مسلمان جو ایک تربیت یافتہ گورنمنٹ کے زیر سایہ ہوں وہ جیسے تھے ویسے ہی ہوں *

جن لوگوں نے جناب نواب گورنر جنرل بہادر کی درود حسرت بھری ہوئی تقریر مسلمانوں کی تعلیم کی نسبت سنی ہوگی۔ اور جن شخصوں نے نواب لٹنٹ گورنر بہادر جلال کو عام جلسوں میں ہم لوگوں کی نسبت افسوس سے اسپیچ کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ اور جو لوگ گورنمنٹ بنگال و مدراس کی دلی توجہ سے جو مسلمانوں کی تعلیم کی طرف سے واقف ہونگے اُن کو کس قدر رنج ہوتا ہوگا اس خیال سے کہ اس کا اثر

جیتنا کر چاہئے اب تک نہیں ہوا۔

لیکن جب میں چند سال پہلے کا حال اس زمانہ سے ملتا ہوں تو کچھ اُمید اُن کی ترقی کی پائی جاتی ہے۔ اور اُن کے خیالات میں بھی ایک قسم کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے چند سال کا ذکر ہے کہ کلکتہ کے عربی مدرسہ کے لڑکے مدرسہ کے پرنسپل پڑھیلے پھینکتے تھے۔ اور اب خود انگریزی پڑھتے ہیں۔ دو تین برس ہوئے کہ انگریزوں کے چھوٹے ہوئے گلاس میں پانی پینے سے لوگ ڈرتے تھے اور اب اُن کے ساتھ عام جلسوں میں کھاتے پیتے ہیں۔ بلوہ سے پہلے سوسائٹی اور علمی جلسوں کا نام بھی تھا۔ اور اب ہر جگہ اُس کا چرچا ہوتا جاتا ہے۔ اخبارات میں سوائے دوسری بکری اور چھانکھ کے بیل کے کوئی عمدہ مضمون نہ ہوتا تھا۔ اور اب کے اخبار میں جن میں عمدہ آرٹیکل ہوتے ہیں۔ جن میں سے اودھ اخبار جس کا اڈیٹر نہایت ہی لائق اور ذی استعداد اور عالی دماغ ہے ہندوستان کا بڑا اخبار سمجھا جاتا ہے۔ اور علیگڑھ کا اخبار جس کا اڈیٹر ایک روشن ضمیر تعلیم یافتہ مسلمان ہے۔ اور کلکتہ کا اردو اخبار جس کا مالک ایک مشہور عالم ہے۔ اور پنجاب کا پنجابی اخبار۔ اور میٹھ کا اخبار عالم اور بعض اور اخبار عمدہ خیالات پیدا کرنے کے اچھے ذریعے ہیں۔ اور ان سب بڑھ کر وہ روشن ستارہ ہے جسے ہند کے آفتاب نے صرف مسلمانوں میں روشنی پھیلانے کے لئے نکالا ہے یعنی تہذیب الاخلاق جس کا اثر لوگوں کے دلوں پر بہت کچھ ہوا اور ہوتا ہے۔

ان سب سے بڑھ کر ہمارے دل کو قومی ترقی کی پوری امید دلانے والی وہ تجویز ہے جو ایک نامور گروہ نے مسلمانوں کی اپنی قوم کی تعلیم و تربیت کی نسبت کی ہے یعنی قایم کرنا ایک مدرسہ العلوم کا اس لئے کہ ہمارے موجودہ مدرسے گو اُن کی کتنی ہی ترقی کیجاوے قومی ترقی کا ذریعہ نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں اور ہماری گورنمنٹ کے موجودہ مدرسے بھی ہماری حاجتوں کے موافق نہیں ہیں۔ اس لئے کہ قطع نظر اس کے کہ جو حصہ عمر کا ان مدارس کی تعلیم میں ضائع ہوتا ہے اُس کا پورا معاوضہ نہیں ملتا اور نہ اُن علوم تک ہماری رسائی ہوتی ہے جس سے ہم ایک روشن ضمیر عالم سمجھے جاویں۔ یہ بہت بڑا نقص ہے کہ ہم اپنی مذہبی تعلیم اور تربیت سے محروم رہتے ہیں اور یہی بڑا جزو قومی ترقی کا ہے۔ اگر ہم مدرسہ میں پڑھ کر بیل گودام کے بوروں پر انگریزی حرفوں میں نام لکھنے لگے اور اپنے مذہبی عقاید سے ناواقف ہو کر لاندہ بھ ہو گئے۔ تو ہم ایک تربیت یافتہ مسلمان نہیں ہو سکتے۔ اس لئے جو تجویز مدرسہ العلوم کی کی گئی ہے وہ تحقیقت وہ ایک عمدہ بنیاد ہے جو مسلمانوں کی اصلی ترقی کے لئے ڈالی گئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم مسلمانوں ہی میں بعض ایسے ہیں کہ گورنمنٹ کی خوشامد سے تاکہ اس کے انتظام تعلیم کے مدد و معاون ٹھیکے کسی خطاب کا استحقاق پیدا کریں یا اپنے مذہبی اوٹام کے حبیب کی ذاتی طبیعت کی تاثیر سے اس

عمدہ تجویز سے مخالف ہیں اور اپنے اوقات کا بڑا حصہ اُس کی مخالفت میں ضائع کر رہے ہیں۔ سیلمان وہ ہیں جو نہیں چاہتے کہ مسلمان دوسروں کی زبان سیکھیں یا غیر مذہب والوں سے بھصائی بچائی ملیں۔ بڑی خوشامش اُن کی یہ ہے کہ وہ نفرت اور عداوت جو مسل اور مذہب اور ملک کی مغائرت سے پیدا ہو گئی ہے۔ قدرت اور عقل کی روشنی سے نیست و نابود نہ ہونے پاوے۔ اور وہ قدرتی رشتہ محبت کا جو سارے بنی آدم خصوصاً مسلمانوں اور اہل کتاب میں ہے کسی طرح مضبوط اور مستحکم نہ ہو۔ مسلمان اُن علوم و فنون کو سیکھنے نہ پاویں جن سے اُن کے دل روشن اور خیال وسیع ہوں یا موجودات کی اصلی حقیقت حاصل کریں۔ اُن کی منتہائے کوشش یہ ہے کہ وہ قوتیں جو اس وقت تک مسلمانوں میں کسی قدر باقی ہیں ایک جگہ جمع نہ ہوں۔ بلکہ متفرق متفرق بیجا طور پر ضائع ہوتی رہیں۔ اگر جمع بھی ہوں تو وہ اُن کاموں میں صرف کی جاویں جن سے بجائے بھلائی کے ضرر پیدا ہو۔ اگر یہ لوگ علم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تو یہ چاہتے ہیں کہ اس انیسویں صدی میں وہ علوم پڑھائے جاویں جو انیسویں صدی میں جاری تھے۔ اور اگر مذہب پر جھکتے ہیں تو اُن کی یہ رائے ہوتی ہے کہ سولھویں صدی کے روم کے عیسائیوں کا زمانہ پھر اسلام میں آجاوے۔ یہ لوگ جب انگریزی طور پر تعلیم و تربیت کا نام سنتے ہیں تو ایک بے اختیاری جو اُن کے دل سے اٹھتا ہے اور جب کہ کچھ آواز اُن سے نہیں ہو سکتا۔ تو کفر کا فتوے ہی دیکر اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔ وہ یا تو اپنی نادانی سے یا درحقیقت عوام مسلمانوں میں جن کا دل تعصبات کا خزانہ ہو رہا ہے ایک جھوٹی عزت پیدا کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ انگریز وحشی علم کی حقیقت کیا جانیں۔ وہ تو صرف لوہار اور بڑھئی اور موچی کے کاموں کو اچھا جانتے ہیں علوم کا خزانہ تو ہمارا صدرا د میں بندھی ہے۔ درحقیقت ایسے لوگوں سے سوائے اس کے کیا امید ہو سکتی ہے جو دے کر رہے ہیں لیکن یہ مخالفین اُن کی کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتیں۔ وہ جو ش جو اٹھا ہے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا اب اُن کے کفر کے فتوؤں سے رُک نہیں سکتا۔ صد ہا مسلمان ہیں جن کے دلوں میں یہ بات سا گئی ہے کہ جو زمانہ گزر گیا وہ گزر گیا۔ اب ہماری بھلائی اس میں نہیں کہ جو کچھ ہمارے بزرگوں نے پڑھا وہی ہم بھی پڑھیں۔ اور جو کام ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ ہم بھی کریں۔ بلکہ ہماری بھلائی اس میں ہے کہ ہم چاروں طرف آنکھ کھول کر دیکھیں اور اُن علوم و فنون کو جن کے عجیب و غریب نتیجے ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں حاصل کریں۔

اس موقع پر کہ میرے کلام کا سلسلہ مسلمانوں کی ترقی کی تدبیروں تک پہنچا بیٹھے انصافی ہو اگر میں اُس نامور خیر خواہ اسلام کا نام نہ لوں جو ان سارے جوشوں کا سر شہ ہے یعنی مولوی سید احمد خاں بہادر۔ اسی نامور شخص نے اوّل پانوں اپنا تعصبات اور تقلید اور رسم و رواج کی پابندی سے نکالا۔ اور اسے کی آزادی اور تحقیق کا شوق لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا اور اپنی تقریر سے اپنی تحریر سے۔

اپنے برتاؤ سے۔ اپنے عادات سے ایک نمود مسلمانوں کے لئے قائم کر دیا۔ اور وہ مزاحمتیں سچانوں کے دھوکے کو کپڑے ہوئے تھیں اپنے پُر زور ہاتھ سے توڑ دیں۔ ابتدائی کوشش اس نامور مسلمان کی غازی پور کا مدرسہ ہے اور علیگڑھ کی سینٹرل سکول سوسائٹی ہے اور اخیر کام اس کی مدرستہ العلوم ہے۔ وہ تعلق جو مسلمانوں کو انگلستان سے ہے اور وہ ضرورت جو اہل اسلام کو انگریزی طور پر تعلیم و تربیت پانڈی ہے اُسے بھی اسی شخص نے ظاہر اور ثابت کر دیا۔ خود لنڈن کا سفر اختیار کیا۔ اپنے صاحبزادہ کو کیمبرج کالج میں عمدہ تعلیم دلائی حالانکہ جن مانہ میں انہوں نے ولایت جانے کا قصد کیا۔ مسلمان ولایت جانے اور وٹاں کے مدرسوں میں پڑھنے کو کفر جانتے تھے یہاں تک کہ جو اسکالرشپ کا لٹرا لٹرا صاحب نے تجویز کی تھی اُس کا کوئی لینے والا مسلمان ممالک مغربی و شمالی میں نظر نہ آتا تھا اور کج چودہ مسلمان ہندوستان کے لنڈن میں موجود ہیں (علاوہ نواب شہزادہ کی) جن میں چند نوجوان لڑکے صرف تعلیم و تربیت کے لئے ہیں۔ چنانچہ ایک بمبئی کے امیر زادے نے اس سال میں سرائیوہی کے امتحان میں دوسرا سائرفیکٹ پایا ہے اور درحقیقت یہ سب بڑے عمدہ نشان مسلمانوں کی ترقیوں کے ہیں۔

اب میں اپنے اس لکچر کو دیا پر ختم کرتا ہوں کہ خدا مسلمانوں کے دلوں سے اُن خیالات کو دُور کرے جو ان کی ترقیوں کے روکنے والے ہیں اور جو اسباب اُن کی ترقی کے تجویز کئے گئے ہیں اُن کو پورا کرے اور جو شخص مسلمانوں کی ترقیوں کی تدبیر کرنے والا ہے اُس کی عمر و دولت میں ترقی ہو امین۔

نمبر ۳

ایسیج

یہ ایسیج ۲۸ دسمبر ۱۹۰۸ء کو بمقام الہ آباد تباہی دزلوشن نمبر ۱۱ (اس جلسہ کی یہ رائے ہے کہ جس قدر اسپیشل اور بلاتے نسبت الہ آباد یونیورسٹی کی نگلٹی آف آرٹ کے ووٹ آف تھنکس کی نسبت درباب بدستور قائم رکھنے زبان فارسی کی تعلیم یونیورسٹی میں ہوئی اُن سب کا انگریزی ترجمہ کو ان مسئلہ کی گورنٹ اور جیٹرال الہ آباد یونیورسٹی اور پریسیڈنٹ نگلٹی آف آرٹ اور یونیورسٹی کے تمام فیلو کی خدمت میں بھیجا جاوے) محض ایک کیشنل کانفرنس کے اجلاسِ پنجم میں فرمائی۔ چونکہ نواب محسن الملک بہادر صدر از کے بعد دکن سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور جناب ممدوح کو یہ پہلا موقع شمولیت کانفرنس کا تھا۔ اس لئے ان کی ایسیج سے پہلے جس سید محمد محمود نے

ایک اشتیاق فارسی غزل تصنیف خود نہایت پرورش لہجہ میں پڑھی۔ چونکہ اُس غزل کا دج کر خالی زبونی تھا
لہذا پہنچ سے پہلے وہ غزل بھی چھاپی جاتی ہے۔ جس سے یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ روم سید محمود
کو علوم مشرقی اور خصوصاً زبان فارسی سے کس قدر محبت تھی :-

مرا در دہست اندر دل اگر گویم زباں سوزد دگر دم و دگر دم ترسم کہ مہر آخوہاں سوزد
اگر دہستم از روز نازل داغ جدائی را نمی کردم بدل روشن چراغ آشنائی را

غزل

نہارم آرزو از دل کہ از دل آرزو دارم کہ از خویش نہانی بیش خوشتر آرم
ہر سہل است آسائے ہر چند تیرش ہی ساری دلم آئیں ہدائے آہد امان چہنیں خواہم
بہر خواہم کہ چیز سے خوب گویم بہر ہرستان کہ ہندستان نژاد و ہندستان ست ماہم
نمی خواہم کہ از گفتار خود آتش برافروزم کہ ہر چیز کہ در دل آید از فتنہ می توہم
چو قیدہ قافیہ بندی نہ باشد بر زبان من بل ہر گز نمی آید کہ ایں فن را نسید انم
مرا یا رست شیریں کار و نمی آرم کہ در گیتی نہار و نہ چکیں یارے چہنیں یاے کہ سن دارم
الایے جھلے ہندی کہ مشغول فکرتی مرا ہم باز پرس آفر کہ عشقت ہست در انم
دیر از گردش کرد کہ دو اوقاتہ ایاز تو کہ ہستی آتخاں باز مرہ احباب انم

از اں گفتم من اسے محمود و ایں اشعار رنگیں را

کہ محمدی انجی محمدی علی شد جان دایاںم

جناب صدر انجمن احباب حاضرین! جو روز و یکوشن ہمارے صدر انجمن نے تجویز فرمایا اُس کی
تائید کے لئے میں کھڑا ہوا ہوں۔ دل تو چاہتا ہے کہ تائید کرتے وقت کچھ میں بھی کہوں۔ مگر آج کے
جلد نے اور خصوصاً اس وقت کی تقریروں نے میرے دل پر عجیب تین حالتیں طاری کر دی ہیں۔ ایک حالت
فرد و مہمات کی ہے۔ دوسری تعجب و حیرت کی۔ تیسری تاسف و رنج کی۔ فرد و مہمات تو اس بات
پر ہے کہ تمام ہندوستانی اور تمام ہندوستان کے لوگ اور خصوصاً مسلمان تمام سویلرڈ لوگوں میں بدنام
ہیں کہ جو تجویز کرتے ہیں جو مجلس جو انجمن جو سوسائٹی کسی نام سے اور کسی غرض سے قائم کرتے ہیں۔ بجز
تائید اور دکھا دے کے کوئی مقصود نہیں ہوتا۔ لیکن اس دلع کو جو مسلمانوں پر تھا اس انجمن اس کا نفرت
نے مٹا دیا۔ آج ہی کی تجویز نسبت ایسے مسئلہ کے ہوئی ہے کہ جو شخص دنیا کے حالات سے بے خبر ہے
زمانہ کی رفتار سے ناواقف ہے وہ تو یہ کہیگا کہ ماں جی وہاں فارسی عربی کچھ گفتگو تھی۔ اور جو لوگ
نفسانیت اور تعصب میں بھرے ہوئے ہیں اور ہر ایک کام نیک کو بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں یہ کہیں گے کہ
ماں جی وہی مسرید جوہریت سے انقلاب پیدا کرنے والے ہیں وہی عربی کو مٹایا چاہتے ہیں۔

لیکن بلند نظر لوگ جو زما کی رفتار سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور مسلمان کس گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں وہ کہیں گے کہ یہ ایسا بڑا نازک اور دقیق مسئلہ ہے جو نہ آحاد اور عشرات و آرات سے متعلق ہے بلکہ پانچ کروڑ مسلمانوں سے علاوہ رکھتا ہے۔ اس لئے ایسی انجمن جو حقیقت میں اپنے پانچ کروڑ بھائیوں کی رہبر اور اُن کی سچی قائم مقام اور نہایت دور اندیشی سے پانچ کروڑ مسلمانوں کی مصرت کو روکتے والی ہو کسی قابلِ فخر و مباهات ہے۔

تعجب مجھے بالکل نہیں ہے کہ ہمارے پیر کون وہ پیر نہیں جس کے معنی جوانوں کے مقابل بوڑھے کے ہیں میرے پیر سرسید جو مرادف ہے مرشد کا ہادی کا اُس نے کس خوبی سے نہ صرف فصاحت و بلاغت سے بلکہ نہایت عمدہ دلائل سے جو دوسری قوموں کو لکپانے والی ہیں یونیورسٹی میں فارسی زبان کی ضرورت کو ثابت کر دیا ہے۔ گو کہ وہ ادکسی کو تعجب میں ڈالتے والی ہو۔ میں ہزاروں درجہ بڑھ کر اُن کو جانتا ہوں۔ میں نے سرسید کی زبان سے لفظ نئے نہیں سُنے کون ہے۔ سرسید ان کی کسی چیز کی تعریف حقاقت ہے اس لئے کہ

اللیل والخیل والبیداء تعرفه

والسيف والحنيف والقرطاس والقلم

اُن کی اسپج اور اُن کے بیان پر تو مجھے کیا تعجب ہو گا مجھے نہایت تعجب اس پر ہوا ہے کہ سترہ برس بعد میں نے مسلمانوں کی ایسی مجلس میں ایسے مسلمان بھائیوں کو اور اپنے مسلمان بچوں کو ایسا فصیح و بلیغ روشن و باغ پائا جیسے کہ مولوی شمس الدین جو قنوی دی رہوئی ابھی اسپج کر چکے ہیں۔ سرسید خدا اُن کو صدوسی سال زندہ رکھے اور وہ یقینی زندہ رہیں گے کبھی نہ مرینگے۔ مرنے کے بعد بھی زندہ رہیں گے جب تک ایک مسلمان بھی زندہ رہیگا وہ نہ مرینگے۔ ان کا اور جو شخص اُن کے ہم عمر اُن کے ساتھی ہیں اُن کی مثال ایسی ہے کہ جتنے دن جیسے جتنے دن اُن کے برکات سے استفادہ ہوں غنیمت ہے۔ ہم کو نئی پود کو دیکھنا چاہئے۔ اُس پر امیدیں قائم کرنی چاہئیں۔ ایک حکایت مجھ کو یاد آئی ہے کہ ایک باغ تھا اور دو آدمی تھے۔ وہ باغ نہایت خوب پھول لاپھلا ہوا تھا۔ اچھے اچھے درخت میوہ دار لگے ہوئے تھے۔ ایک اُس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا بہت تعریف کی۔ دوسرا دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوا رونے لگا۔ تیسرے آدمی نے دیکھا کہ دو آدمی ہیں ایک رستہ ہے اور دوسرا دبا ہے۔ دونوں سے سبب پوچھا۔ مننے والے نے کہا کہ کیسا تر و تازہ شاہد اب پھلا پھول باغ ہے کیسے اچھے میوہ دار درخت ہیں اس سے زیادہ اور کیا خوشی کی بات ہوگی۔ جو روتا تھا اُس نے کہا اچھی حضرت کہیں پود بھی نظر آتی ہے ہونہار و خنوں کے لئے کسی زمین میں زمین بھی تیار ہو رہی ہے۔ ہم پودوں کو دیکھ رہے ہیں اگر وہ بھی ہوں تو خوشی ہے درخت خوشی پر تعجب ہے۔ ہمارے سرسید کی محنت و کوشش کا یہاں

ہوئی یعنی پود لگی ہوئی ہے اُس کے پھل پھول بھی تھکے تھے ہیں۔ جیسے حشمت اللہ، عنایت اللہ۔ اور یہی باب النجب اور حیرت اور خوشی کی ہے *

برج و تاسف اس بات کا ہے کہ ایسے جلسہ میں ایک مجھ سا شخص بھی موجود ہے۔ کچھ سمجھیں نہیں سکتا کہ کس حق سے اُس کو اس جگہ آنے کی اجازت ملی ہے۔ اُس کو نہ کسی قسم کی لیاقت ہے نہ استعداد (آواز آئی)۔ نو نو نو (نو نو نو) دل ایسا قوی ہے طبیعت حاضر نہ مسلمانوں کے ساتھ سوائے زبانی ہمدردی کے کچھ کیا ہے (پھر آواز آئی)۔ نو نو نو (نو نو نو) ایسی تجویزوں پر کون حق ہے کہ تائید کو کھڑا ہو۔ مگر ایک خانقاہ میں دعائیں سکھائی جاتی تھیں۔ مجھ سا نادان بھی وہاں گیا جس کا نہ ذہن نہ حافظہ قوی وہاں پہنچا کہ درخواست کی کہ مجھے بھی دعائیں سکھائی یاد دیں۔ پیر بھی نے بہت کچھ سکھلایا پڑھایا مگر اُس کو ایک ٹوٹی پھوٹی بھی یاد نہ ہوئی۔ آخر کو یہ صاحب نے جیسے ہمارے سرسید اُس سے کہا کہ میں تم کو ایک لفظ بتا دیتا ہوں جس سے ثواب میں شریک ہو جایا کرو۔ جب کوئی دعا پڑھے تو تم صرف امین کہہ دیا کرو *

مجھ سے نہ دعا پڑھی جاتی ہے اور نہ عربی پر زبان اللہی ہے امین کہنے بتا ہوں (تفہیم) پس جو تحریک کہ پیش ہوئی ہے نہایت عمدہ اور مفید ہے اُس کی تائید کرتا ہوں (چیر چیر) *

نمبر

لکچر

مسلمانوں کی ملی اور علمی ترقیوں کی تاریخ اور پھر ان کے تنزل اور اُس کے اسباب پر جو ۲۹-۲۸ ذی قعدہ ۱۲۹۸ کو لندن ایگسکسٹیشن کانفرنس کے اجلاس خیم مقام الہ آباد میں دیا گیا :-
جس وقت نواب محسن الملک نے لکچر دینے کے لئے اپنی کرسی پر سے اٹھنے کا ارادہ کیا خان بہادر مولانا سید فیضان الدین احمد خاں صاحب اپنی کرسی پر سے اٹھے اور کہا :-

میں آج آپ کو بتاتا ہوں کہ آج کیا ہو گا آج وہ ہو گا جو یوں ہے اس کانفرنس کی آج وہ لکچر دیا جو دکھایا کہ مسلمان اس وقت بھی کتنی قابلیت رکھتے ہیں وہ کون ہے اگرچہ اُس کے نام کے ساتھ بہت سے خطاب ہیں لیکن میں اُس کو پیارا احمدی کہتا زیادہ پسند کرتا ہوں *

بعد اس کے نواب محسن الملک اپنی کرسی پر سے اٹھے بخود ان کے اٹھنے کے تمام لوگوں نے نہایت زور سے چیر زدی اور دیر تک چیر زدی تھیں وہ کہ مسلمان چیر زکی و داندوں سے گنج گیا اور تمام لوگ ہرگز نہ گوش ہو کر ان کے لکچر سننے کے مشتاق ہوئے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ لکچر دینا

شروع کریں انہوں نے حسب مندرجہ ذیل تہیدی گفتگو کی :

تہیدی گفتگو نواب محسن الملک

اے حاضرین ! اس وقت جو میرے دوست اور میرے بزرگ مولوی فرید الدین صاحب نے میری معرفی کی اور جس طور پر انہوں نے مجھے بتلایا ، اور جس حیثیت سے کہ آپ اول سے مجھے پہچانتے اور جانتے ہیں وہ حقیقت وہ اس وقت میری حالت پر صادق نہیں ہے میں اس امر کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ میں اس موقع پر اپنا آپ معرف بنوں اور آپ کو بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ صاحبو !

من قاش فروش دل صد پارہ خویشم
تختے بردار دل گذر دہر کہ ز پیشم

گر ذیل فروشی ان بوفاسنگدل لرباؤں کے لئے نہیں ہے جو دل لیکو دلداری نہیں کرتے نہ یہ دل ان قمر طلعت معینوں کے لئے ہے جو اس کی قیمت بلکہ دیت تک نہیں دیتے ، ایسا ستا اور کم قیمت دل اسی شاعر کا ہو گا جس کا یہ شعر میں نے پڑھا اسی کے دل کے ٹکڑے چاند کے ٹکڑے لیا کرتے ہوتے ، میرا دل تو اپنی قوم کے شکستہ دل مسلمانوں کے لئے ہے جن کی شکستہ حالی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہے اور جن پر قربان کرنے کے لئے میں اسے یہاں لایا ہوں۔ لیکن میں کس کے ہاتھ سے بچوں اور کس پر شاکر کروں اس مجلس میں تو تمام دل فروش ہی دکھلائی دیتے ہیں ، اور سب اپنے اپنے دلوں کو اپنی قوم پر فدا کرنے کے لئے دل بکت ہیں۔ اس وقت تو میں دل دینے والوں کا ایسا مجمع دیکھتا ہوں کہ یہاں جتنے دل فروش موجود ہیں غالباً سارے ملک میں اتنے گل فروش بھی نہ ہونگے ، ایسے اہل دل کے مجمع میں مجھے اپنے دل کا پیش کرنا یا اسے اس بازار میں لانا بوالہوسی اور نادانی نہیں کیا ہے :

صاحبو ! اس وقت اس مجلس میں آنے اور اس مجمع کے دیکھنے سے جو کیفیت مجھ پر طاری ہے اُسے میں کیونکر بیان کروں میرے دل کی یہ کیفیت نہ اس لئے ہے ، کہ یہ مال جس میں ہم لوگ جمع ہیں ، کچھ ایسا خوبصورت کچھ ایسا عالیشان کچھ ایسا آراستہ ہے کہ جسے دیکھ کر میں حیران و ششدر ہو گیا ہوں نہ میرے دل کی یہ حالت اس لئے ہے کہ یہ کوئی شاہی دربار ہے ، اور یہاں کوئی شانشا تخت سلطنت پر بیٹھا ہوا ہے جس کے جاہ و جلال سے میرا دل قابو بلکہ پہلو سے بھلا جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک با بھی نہیں ہے۔ مال کو دیکھتا ہوں تو مٹی کی کچی دیواریں ، بانس کی ٹیٹھی گزری کی چھت ، بورے کا فرش اور چند ٹوٹی بھوٹی کرسیاں۔ وہ بھی چنڈہ کی یا مانگے کی۔ مجمع پر نظر کرتا ہوں تو یہاں نہ کوئی بادشاہ ہے نہ امیر ، نہ کوئی رئیس ہے ، نہ وزیر ، چند شکستہ حال ، پریشان خاطر مسلمان اپنی قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے کے لئے جمع ہیں بلکہ بیوقوف کی ہری صلی ہے کہ یہاں آنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام زندہ ہے

اور اسلامی جوش باقی ہے۔ اسلام کا زندہ ہونا مسلمانوں کی جسمانی زندگی سے ثابت نہیں ہوتا، مردہ دل مسلمان تو اب بھی دنیا میں اتنے زندہ ہیں، کہ جن کی گنتی آسمان کے تاروں اور درخت کے پتوں سے بڑھ کر ہے۔ بلکہ اسلام کی زندگی معلوم ہوتی ہے مسلمانوں کی روحانی اور دلی زندگی سے۔ اور وہ اس وقت اتنے زندہ دل مسلمانوں میں جو اس وقت اس ہال میں جمع ہیں نظر آ رہی ہے یہ اسلامی جوش وہ نہیں ہے جو مسلمان ذاتی عزت، ذاتی دولت، ذاتی خروت، حاصل کرنے کے لئے دکھاتے ہیں، ایسا جوش تو ہر کینہ سے کینہ اور رذیل سے رذیل مسلمان میں سر جگہ پایا جاتا ہے۔ بلکہ وہ جوش ہے قومی محبت اور قومی ہمدردی کا جو اس وقت مسلمانوں کے دلوں میں بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

جب کہ میں دیکھتا ہوں کہ یہاں دور دور سے مسلمان جمع ہوئے ہیں نہ کسی بادشاہ کے حکم سے، نہ کسی دربار شاہی میں شریک ہونے کی غرض سے، نہ تجارت سے فائدہ اٹھانے زد دولت کمانے، نہ کسی قسم کے تشاؤ دیکھنے کے لئے۔ بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ اپنے بھائی مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کریں، اپنے بھائی مسلمانوں کی روز افزوں خراب حالت کی اصلاح کریں، اپنے بھائی مسلمانوں کی، غریب، مفلس، یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت کی تدبیر سوچیں، تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایسے زمانہ میں ایسا پاک مجمع، اور اس مجمع کا ایسا پاک ارادہ۔

ایکے نے نیم بہ بیداری است یارب یا نجواب

پھر اس پر بھی مجھے حیرت ہے کہ یہاں جو مسلمان جمع ہوئے ہیں نہ اس لئے کہ پولیٹیکل جوش دکھائیں، اور سلطنت پر بحث کریں، گورنمنٹ کو مشکلات میں ڈالیں، اس کے کاموں پر نکتہ چینی کریں، بے سوچے سمجھے غل و شور مچائیں، اور اپنے دل کے غبار نکالیں۔ اور نہ اس لئے کہ مذہبی چھیڑ چھاڑ کریں، دوسروں کے دلوں کو دکھائیں اور جو آگ سینوں میں چھپی اور دبی ہوئی ہے اُسے بھڑکائیں، بلکہ یہاں مجمع ہے انہیں لوگوں کا جو اپنی گورنمنٹ کے سچے دفا دار، اپنی گورنمنٹ کے احسانوں کے شاکر، اور اپنی گورنمنٹ کی کارروائیوں کے قدردان، جن کو اپنی گورنمنٹ کی فیاضی اور انصاف پر بھروسہ، جن کو اپنی گورنمنٹ کی اندیشی اور صلح ملکی سے ہمدردی، جن کو اپنی گورنمنٹ سے زمانہ اور حالت اور ضرورت کے موافق اپنی بھلائیوں کی امید، اور نیز یہ جلسہ ہے ان لوگوں کا جو مذہب میں سچے، دین میں سچے، اسلام میں کامل ہیں، مگر تھکے بری، نقسانیت سے خالی، دل کے دکھانے سے متنفر، مذہبی بحثوں سے محترز۔ پس حقیقت میں کیسا اچھا ہے یہ مجمع، اور کیسے اچھے ہیں اس کے ارادے، خدا برکت دے اس مجمع کو، اور قائم رکھے اس مجلس کو، اور بڑی حیات دے اس مجلس کے سردار کو، اور بہت دنوں تک زندہ رکھے اس کے بانی سر سید کو۔

صاحبو! ذرا آئیں کہتے میں صبر کرتا ہوں ایک بڑی دعا قبول ہی گیا جو اصلی دعا ہے اور جس پر ساری دعائیں منحصر ہیں۔ وہ دعا ہے اپنی قیصر ہند ملکہ معظمہ اور ان کی گورنمنٹ کی جس کے سایہ عاطفت میں

ہر قوم آزاد اور شخص اپنی فلاح کی تدبیروں میں مشغول ہے، کہیں جلسے ہو رہے ہیں ملت بڑھانے کے لئے، کہیں مجلسیں ہو رہی ہیں تجارت کی ترقی دینے کے واسطے، کہیں مجمع ہے مشعل اصلاح کے لئے، کہیں جلسہ ہے تہذیب شناسنگی پھیلانے کے واسطے، کسی جگہ بندہ راز قوموں کی نمائندگی کا کر رہا ہے، کہیں بیچا ہے غریب مسلمانوں کی ایکویشنل کانفرنس۔ یہ آزادیاں اور یہ آسانیاں جس گورنٹ کی بدولت ملک اور ملک کے سب باشندوں کو حاصل ہوں اُس کا شکر اور اُس کے لئے دل سے دعا کرنا ہر بشر پر فرض ہے۔ دوستو اب میں دعا کرتا ہوں اور کہیں آمین ہذا دعا کا لایرد فاں ہذا دعا بشمل البشر ۛ

اے میرے دوستو جب سرسید احمد خاں بہادر نے مجھے اس جلسہ میں شریک ہونے کیلئے بلایا، اور پھر دینے کی بھی فرمائش کی، اُس وقت گوئیں اُن کے حکم کی تعمیل پر مجبور ہوا، مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کونسا مضمون اختیار کروں اور آپ کے روبرو کیا کہوں۔ ایسے اکابر قوم اور علمائے ملت کے سامنے جہاں ہند کے سچان مولانا مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنے فصیح و بلیغ خطبوں سے مجلس میں جدو حال کی کیفیت طاری کر دی ہو اور جہاں ہمارے زمانہ کے ہومر اور شکسپیئر مولوی الطاف حسین حالی نے اپنی جادو جانی سے دلوں کو مسح کر لیا ہو، اور جہاں مسلمانوں کے گبن مولوی شبلی نعمانی، اور ہندوستان کے اقلیدس رشید سمن العلماء مولوی ذکار اللہ صاحب سے رشون فیض علی دماغ اپنی طبعیتوں کے جوہر دکھایچکے ہوں۔ مجھ سے نادان کج معیار، بیچا ہے اُمادہ کے ملکی بارہ کے سید کا کھڑا ہونا اور تقریر کرنا گستاخی اور بے شرمی نہیں تو نادانی اور حماقت تو ضرور ہے۔ پھر میں نے یہ بھی خیال کیا کہ اگر اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ کہتا بھی چاہتا ہوں تو کیا کہوں انوری اور خاقانی آکر مسلمانوں کی کچھ غلطی و شان کے قصیدے سنائے دیڑائیں بھی تشریف لاکر موجودہ حالت پر اپنی قوم کے مرثیہ پڑھ چکے ذہنیت کا مضمون رماز تعزیت کا ۵

حریفان باد ماخوردند و رفتند

تھی تختہ نہ ہاگردند و رفتند

باقی کیا رہا ہے جو میں کہوں۔ مگر چونکہ نوکر کو اپنے مالک کی، بندہ کو اپنے آقا کی، مرید کو اپنے مرشد کی، اطاعت سے چارہ نہیں مجھے بھی اپنے سرسید کے حکم کی تعمیل سے گریز نہ تھا اس لئے میں نے اپنی قوم کے حال پر ایک دکھا سوکھا مضمون لکھا یعنی اپنی قوم کا منزل اور اُس کے اسباب اب ایسے بد مزہ اور بے نمک مضمون کے سنانے اور آپ کے اوقات عزیز ضائع کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں ۛ

صاحبو میرا مضمون تین حصوں میں منقسم ہے اور ہر حصہ ایک جگہ پر پڑھنے دو کو تو میں آج اور کل دو دن میں سنا دوں گا مگر تیسرے کچھ کے لئے وقت نہیں ہے اُسے میں آپ کی مجلس کے سیکرٹری کو دے دیتا ہوں کہ آپ کی ہدایت اور حکم کے موافق جس طور پر چاہیں اُس کا استعمال کریں ۛ

پہلے کچھ میں مسلمانوں کی ملکی اور تمدنی اور تہذیبی و فنی و فنی کی مختصر تاریخ اور ترقی و منزل کے اسباب بیان

دوسرے لکچر میں یونان کی ترقی اور زوال اور یورپ کے تنزل اور ترقی کا ذکر ہے مع اُن کے اسباب کے۔
تیسرے لکچر میں اُن اسباب سے جو یورپ کی ترقی کے باعث ہوئے، مسلمانوں کے مستفید نہ ہونے کا
ذکر ہے۔

(اثنائے گفتگو میں سید احمد خاں کو مخاطب کر کے یہ شعر بھی پڑھے تھے) :- شعر

دبران ماہ پیکر دیدہ ام درجالت چیز دیگر دیدہ ام

ایں چہ نور است ایں چہ تاباں ضیاست

ہفت کوکب نور افشاں از نور است

تو کمال از کمال کیتی نظر نور جمال کیتی

ریشتر پیکر سید احمد خاں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ اس کا جواب دیجئے دیجئے

اور پھر کہا کہ میں ہی اس کا جواب دے دیتا ہوں اور جواب یہ دیا :-

از جمال محمدی و کمال احمدی

پھر انہوں نے پریسڈنٹ کو مخاطب کر کے یہ بھی کہا کہ :-

میں جانتا ہوں کہ آپ کی اس مجلس میں مباحثہ مذہبی کی اجازت نہیں ہے مگر شخص اس بات کو
جانتا ہے کہ مباحثہ مذہبی ایک چیز ہے اور تاریخانہ واقعات کا بیان دوسری چیز، تاریخانہ واقعات میں
اُن اسباب کا بلا کسی مباحثہ کے بیان ہونا ہے کہ کسی قوم پر جو واقعات ترقی و تنزل کے گزرے اُن کے
اسباب کیا تھے خواہ وہ اسباب تمدنی ہوں یا مذہبی یا پولیٹیکل، مگر وہ اسباب بلا کسی مذہبی یا پولیٹیکل بحث
کے یا اُن کے جائز و ناجائز ہونے کے مباحثہ کے محض بطور واقعات بیان ہوتے ہیں اور اُس کو مذہبی
بحث سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ میرے لکچروں میں مسلمان اور غیر مسلمان قوموں کی ترقی و تنزل کے اسباب کا بیان ہے تو جو واقعات
یا اسباب انکی ترقی کے ہوئے اور اسی طرح جو واقعات یا اسباب انکی تنزل کے ہوئے اُن کا بیان آوے گا۔ پس امید ہے کہ آپ
مجھ کو یہ الزام نہ لگاویں گے کہ میرے لکچروں میں پولیٹیکل یا مذہبی بحث ہے کیونکہ میں نے صاف بیان
کر دیا ہے کہ بحث مذہبی ایک جدا چیز ہے اور واقعات و اسباب کا تاریخانہ بیان دوسری چیز ہے جس کو
مذہبی بحث سے کچھ علاقہ نہیں۔

لکچر
مسلمانوں کی ملکی اور علمی قیوں کی تاریخ اور پھر اُن کے تنزل اور اُس کے اسباب

حضرات! روئے زمین پر مسلمانوں ہی کی قوم ایسی نہیں ہے جس کو ترقی کے بعد زوال ہوا ہو
اور بھی بہت سی قومیں ایسی گزر چکی ہیں جن کی ترقی شان و عظمت میں مسلمانوں سے کسی طرح کم نہ تھی، مگر جن کا زوال

مسلمانوں سے کہیں بہت زیادہ ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم اب تک فایم ہے، اور اسلام اس وقت تک کروڑوں انسانوں کے دلوں میں جوش زور ہے۔ لیکن بہت سی قومیں ایسی گزر چکی ہیں جو ایک مائتہ میں حکومت اور شان و شوکت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہی تھیں۔ اور گو اس وقت بھی ان کا نام و نشان بچ رہا ہے، مگر بہت ہی خفیف اور ضعیف یادگار ان کی باقی ہے۔ ایسی قوموں اور مذہبوں کی آئندہ ترقی کی کوئی امید نہیں ہے۔ مگر ایسی قوم کے لئے جس کی نسبت روئے زمین کی آبادی کے ساتھ ایک سدس کی ہوشیاری آئندہ کی ترقی کی امید کے لئے کافی وجہ موجود ہیں۔ اور جو متحج کہ ہم گزشتہ تواریخ اور حالات سے نکال سکتے ہیں وہ بیشک ہماری آئندہ کی رہنمائی کے لئے کافی ذریعہ ہو سکتے ہیں۔

زبردست قوم ایک بلند اور مضبوط چٹان سے مشابہ ہے، جس وقت ہم اس چٹان کی طرف نظر ڈالتے ہیں، تو اس کی عظمت، اس کے استحکام، اور اس کی جسامت دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے، کہ اس کو کبھی زوال نہیں ہو سکتا۔ لیکن اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے، کہ اگر ایک معتد بہ مدت کے بعد دیکھا جاوے تو اس چٹان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ کبھی تو یہ زمین کے فطری تشنج سے ہوتا ہے، جیسے زلزلہ، یا آتش فشاں مادہ، جس نے پچھلے زمانہ میں تمام روئے زمین کی ہیئت بدل دی تھی۔ اور جس سے اب بھی کبھی کبھی رضی تیز آرت پیدا ہوا کرتے ہیں۔ مگر اس زمانہ میں علم طبقات الارض کے باریک اور دقیق مسائل کے حل کرنے والوں نے نئی تحقیقات سے یہ ثابت کیا ہے، کہ بڑے سے بڑے اور مضبوط سے مضبوط پہاڑ قطع پانی، آفتاب اور ہوا کے عمل ہی سے برباد نہیں ہوتے، بلکہ لاکھوں کروڑوں نہایت چھوٹے چھوٹے کیڑے ان پہاڑوں کے ہر ذرہ کو کھا جاتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ (Switzerland) کے سب سے بلند پہاڑ اٹارن (Faulhorn) کی نسبت یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ وہ اسی قسم کے کیڑوں کے عمل سے گویا حالت تجزی میں ہے، اور ایک مدت معتد بہ میں ریگ ہو کر رہ جائیگا۔ اور نام و نشان بھی اس کا نہ رہیگا۔ قوموں کی یہی حالت ہے، نہایت ناچیز اسباب جن کی طرف کبھی خیال بھی نہیں گزرتا۔ اکٹھے ہوتے ہوتے وہی نتیجہ پیدا کر دیتے ہیں، اور پہاڑوں کی تباہی میں ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے مترتب ہوتا ہے، وہ پہاڑ کہ جس کو چند صدی پیشتر یہ بیان کیا جاتا تھا، کہ عظمت اور استحکام میں اپنا آپ ہی نظیر ہے، آخر کار ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں کا لقمہ بن کر نیست و نابود ہو جاتا ہے، اسی طرح وہ قوم جو اپنی قوت و سطوت، دولت و عظمت کے زمانہ میں، زمانہ کی دست تعدی کے پہنچنے سے بھی محفوظ سمجھی جاتی ہے، ان خفیف اسباب کے جمع ہو جانے سے جن کا کسی کو خیال نہیں ہوتا، ضعیف و کمزور ہوتے ہوئے آخر ایسی تباہ و برباد ہو جاتی ہے کہ کہیں اس کا پتہ بھی نہیں ملتا۔

ان قوموں میں سے جو گزشتہ زمانہ میں ترقی کرنے کے بعد تباہ ہو گئیں مشہور قومیں ایرانی، یونانی

رومی مصری اور یہودی ہیں، چونکہ بنی اسرائیل کی حالت ہم سے بہت مشابہ ہے، اس لئے ہمیں صرف اُس قوم کی اول مختصر کیفیت بیان کرتا ہوں۔

بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت سے مصر میں آباد ہوئے، اُن کی کئی نسلیں مرنے لگیں، غلامی میں گزریں، وہ طرح طرح کے عذاب اور مصائب میں گرفتار رہے، حضرت موسیٰ نے اُن کو مصر سے نکالا، اور اس عذاب سے چھڑوایا، اور اُن سے خدا کی سرسبز اور شاداب زمین شام کا وعدہ کیا، چونکہ فراعنہ کی غلامی کرتے کرتے عصبیت اور حسرت سب اُس قوم سے جاتی رہی تھی، اور اُن کے سارے چوش ٹھنڈے اور اُن کے سب دلوں سے سرد ہو گئے تھے، جرات اور بہادری کچھ اُن میں باقی نہ رہی تھی، جب حضرت موسیٰ نے مقابلہ کے لئے کہا تو کہنے لگے کہ ”یا مُوسٰی اِنَّ فِيْهَا كُوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاَتَاكُنْ نَدَّخِلْهَا حَتّٰی يُخْرِجُوْا مِنْهَا فَاَنْ يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاَنْ تَاْذَا خِلُوْنُ“ اے موسیٰ اُس میں تو زبردست قوم رہتی ہے ہم تو وہاں نہ جائیں گے جب تک کہ وہ نہ نکلیں اگر وہ محل جائیں تو البتہ ہم اُس میں داخل ہو گئے۔ ہزار ہزار طرح سے موسیٰ نے سمجھایا، ہمت دلائی، گمراہوں نے ایک نہ سنی، اور جب بولے تو یہی کہ ”اِنَّا لَكُنْ دَخَلْهَا اَبَدًا مَا دَا مُوْ فِيْهَا فَاَذْهَبْ اَنْتَ وَرَبِّكَ فَقَاتِلَا“ اِنَّا لَكُنْ دَخَلْهَا اَبَدًا مَا دَا مُوْ فِيْهَا فَاَذْهَبْ اَنْتَ وَرَبِّكَ فَقَاتِلَا ”اے موسیٰ اُن میں داخل نہ ہو گئے جب تک کہ وہ وہاں ہیں تم ہی جاؤ اپنے رب کو لیکر اور دونوں لڑو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔ آخر خدا نے اپنے قانون قدرت کے موافق اُن کو بسبب سالہا سال کی غلامی میں رہنے کے مقابلہ اور مقابلہ کے لائق نہ جانا، اور چالیس برس تک اُن کو جنگل میں حیران و پریشان رکھا، یہاں تک کہ وہ نسل جس کے رگ و پے میں لذت و سستی سمائی ہوئی تھی اُسی جنگل میں ہلاک ہوئی، اور میں برس کی عمر سے اوپر کوئی آدمی بھی زندہ نہ رہا، اور نئی نسل پیدا ہوئی، جس نے محنت اور مصیبت میں پرورش پائی تھی، اور جس کو عصبیت اور حسرت کا نیا جوش پیدا ہوا تھا اُن کو یوش نبی لیکر بڑھے۔ ”فَدَخَلُوْهَا وَهَزَمُوْا اَنْجَارِيْنَ“ پس اُن میں داخل ہوئے اور جباروں کو شکست دی۔

بنی اسرائیل اپنے آپ کو خدا کے خاص بندے سمجھتے تھے، اُن کو یقین تھا کہ خدا نے اُن کو اسی واسطے پیدا کیا ہے، اگر وہ خدا کی حکومت ساری دنیا میں قائم کریں، اور ساری زمین سے بت پرستی کو دور کر کے ایک خدا کی عبادت کی طرف لوگوں کو مائل کریں، کچھ مدت تک تو فلسطین اور مقدس زمین میں شام کے وہ اپنے بزرگوں اور قاضیوں کی اطاعت میں رہے، پھر ساری قوم ایک بادشاہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی، یہ بادشاہ اُن کی اعلیٰ درجہ کی ترقی کا تھا، اور اس نے مانہ میں حضرت سلیمان کی سلطنت اپنی عظمت اور سطوت میں حد کے درجہ پر پہنچائی تھی، اُن کے بادشاہی کے زمانہ میں صرف یہی نہ تھا، کہ گرد و نواح کے بادشاہ اور بادشاہوں کا بیت المقدس کے معصوم اور دانشمند بادشاہ کے روبرو تسلیم کر کے تھے، بلکہ ہندوستان کا سونا اور جواہرات اور مور بھی اُن کی نذر کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ چاروں طرف سے اُس ملک میں دولت پھٹی پڑتی تھی،

ساری قوم ایک بادشاہ کے زیر حکومت تھی۔ مگر یہودی قوم میں ہمیشہ فتنہ و فساد اور نافرمانی کا جوہر موجود رہا ہے۔ اُن سے فقط اپنے خدا اور مذہب کے خلاف ہی میں بغاوت سرزد نہیں ہوئی، بلکہ اپنے بادشاہوں کے مقابل میں بھی اُنہوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ یہی خاصیت پھیلتے پھیلتے عوام میں سرایت کر گئی، اور آخر کار قوم کی تباہی کا باعث ہوئی۔ سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے اختتام تک بارہ قومیں یہودیوں کی پانسو برس تک متفق رہیں، اگرچہ کبھی کبھی اس زمانہ میں بھی آپس میں لڑ بھڑائی تھیں، مگر سلیمان کے انتقال کے بعد تو دس قبیلوں نے بغاوت اختیار کر کے ایک نئی سلطنت قائم کر لی۔ یہ نفاق گویا دوسری قوموں کے لئے حملہ آوری کی دعوت کا خط تھا۔ فلسطین میں اُنیں بادشاہ باسن و امان حکومت کر چکے تھے، مگر اُن کے بعد جو نفاق پھیلایا، اُس نے اسیریا (Assyria) کے بادشاہ شامین سر (Shahmaneser) کو یہودیوں کے ملک پر حملہ آوری کی جرأت دلائی۔ اس حملہ کا انجام یہ ہوا کہ اکثر یہودیوں کو وہ قید کر لے گیا۔ اس کے بعد کسی کو نہیں معلوم کہ اُن دس قبیلوں پر کیا کڑی کیس نام و نشان تک باقی نہ رہا، دو قبیلے جو بیت المقدس میں باقی رہ گئے تھے اُن کا انجام بھی قریب قریب وہی ہوا، جو اُن دس کا ہوا تھا۔ کچھ کم سو برس کے زمانہ میں بابل کے بادشاہ نے اُن کے ملک کو فتح کر کے ستر برس تک اپنے شہر میں قید رکھا۔ اس زمانہ کے بعد یہودیوں کی ملکی تاریخ گویا معدوم ہو گئی، نہ سلطنت باقی رہی، نہ وطن رہا، قید سے نجات پانے کے بعد جب یہ لوگ اپنے ملک کو واپس آئے تو اُس کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے پس کے فسادات کی بنا قائم کر دی، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے کے سو برس پیشتر اُن کے ملک پر رومانیوں کا قبضہ ہو گیا، اور اُنہیں کی طرف سے ایک بادشاہ حکومت کرنے کے لئے مقرر کیا گیا، چالان بھی غنیمت تھی، مگر فتنہ و فساد کا وہ مادہ جو یہودیوں کی طبیعت میں موجود تھا، اس کو بھی کہاں قائم رہنے دیتا تھا، رومانیوں کے خلاف میں جب کھلم کھلا بغاوت کی، تو اس سختی سے اُن لوگوں کی سزائیں کی گئی کہ سو اُس کے کوئی چارہ نہ رہا، کہ تمام روئے زمین پر منتشر ہو جائیں، لیکن یہ لوگ جہاں گئے، اپنا مذہب سب اتھ لیتے گئے، اور اب تک اُن کوں کے دلوں میں یہ اسید باقی ہے کہ پھر وہ ایک نئے آنے والا ہے کہ اُن کا ملک مہودیان کو واپس ملیگا۔

اس مختصر تاریخی بیان سے اب آپ لوگ اُن اسباب پر غور فرمائے، جو اس قوم کی ترقی اور بچہ وال کے باعث ہوئے۔ غلامی کی زندگی نے اول اُن کو نڈل اور ڈرپوک بنایا، پھر تحلیف اور محنت اور محنت کی زندگی نے اُن میں دوبارہ جوش پیدا کیا، مذہب اور اتفاق، ہمت اور مردانگی، نے اُن کو اعلیٰ درجہ کی ترقی پر پہنچایا، پھر اُن میں نا اتفاقی پھیلی، اور جھگڑا پیدا ہوا، وہ مغرور، متکبر اور خود سر ہو گئے، ہر شخص اپنے آپ کو خدا کا خاص بندہ سمجھتا اور دوسری قوموں کے لوگوں کو نظر حقارت سے دیکھتا تھا، دولت اور جہاںشی حکومت کے ساتھ آئی، رہا باقی امداد کے بھر دوسرے پُرانوں نے اُنہوں نے اُنہوں کے ہاتھ پاؤں ہلانے اور اپنی فلاح کی کوشش کرنی

یہ کج خلق ترک کردی، اُن کے مذہبی پیشوا، علماء اور قاضی خود غرض اور متعصب ہو کر دین میں تخریب کرنے لگے، عوام اور جہاں اصلی مذہب چھوڑ کر اپنے مفتیوں اور مولویوں کو پوجنے اور اپنا پیغمبر سمجھنے لگے، درحقیقت سولہ ظاہری اور چھوٹی شیخی کے ذہن میں سلطنت کرنے کی لیاقت رہی، نہ مذہب کی خوبی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانے کے ہر مقدم نہ رہ سکے، اور جب دوسری قوموں نے اُن پر فوج کشی کی، تو منہ تانکتے رہ گئے۔ کوئی سامان ہی ایسا نہ تھا جس کے بھروسہ پر مقابلہ کا نام بھی لیتے۔ پس وہ قوم جو دنیا میں سب سے معزز تھی، وہ قوم جو دنیا میں خاص خدا کی پیاری قوم سمجھی جاتی تھی، وہ قوم جس میں خدا نے بڑے بڑے اولوالعزم انبیاء و مہدیین مبعوث کئے تھے، وہ قوم جس میں بڑے بڑے سلاطین اور بادشاہ ہوئے تھے، وہ قوم جس کے آگے روئے زمین کے سلاطین سر جھکاتے تھے، وہ قوم جس کو خدا نے تمام قوموں پر شرف بخشا تھا، اپنی غفلت، اپنے تمرد، اپنے غرور، اپنی نالائقی، اور اپنی نااہلی سے ایسی ذلیل و خوار ہو گئی کہ گویا خدا کی زمین میں کچھ کس کا حصہ نہ رہی تھا۔ نہ کہیں اُن کی سلطنت باقی رہی، نہ عزت، اکتوں کی طرح ہر جگہ سے ہانکے اور ہر حصہ زمین سے نکالے جاتے ہیں۔ ”خُذِرَتْ عَکِبَتُهُمُ الدِّلَّةُ وَلَمْسَ كُنَّةُ وَبَاؤُا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ“ اُن پر ذلت و مہکینی ڈالی گئی اور خدا کے غضب میں گرفتار ہوئے۔

اب ہم کو اپنی قوم کا حال دیکھنا چاہئے، بنی اسرائیل کی حالت اُس زمانہ میں جب کہ اسلام کی نشوونما اُن میں پھیلی، اپنے بھائیوں بنی اسرائیل سے مختلف تھی۔ یہودیوں کی طرح غلامی کی رسی اُن کی گردن میں نہ تھی، نہ مصر کے فرعون کی طرح کوئی جبار اور قہار اُن پر ظلم کرنے والا تھا، ساری قوم آزاد، اور خود مختار تھی۔ سکندر کی فوج نے اگرچہ تمام مشرقی سلطنتوں کو پایا مال کر دیا تھا، مگر صرف عرب پر اُس کا ہاتھ نہ پھینچا، اُس کے جھنڈے کے نیچے اگرچہ سب نے اپنا سو بچا کیا، مگر عرب نے اپنے ایلچی تک اُس کے پاس نہ بھیجے، نہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے زمانہ سے تین سو برس اول اُنہوں نے اپنے خشک پہاڑی جزیرہ نما میں آزادی اور خود مختاری قائم کی، اور ایک ہزار برس تک کسی کے تابع اور مطیع نہ ہوئے۔ اسلام کی دعوت کے وقت اگرچہ سب لوگ جہالت اور بت پرستی میں گرفتار تھے۔ مگر تھے تیز و چالاک، سواری میں حلاق، لڑنے بھڑنے میں مشتاق، محنت کے عادی، سفر کے شائق، بدن کے قوی، دل کے مضبوط، مصیبت کے مقابلہ کیلئے آمادہ، صرف رہنما کی کسر تھی کہ وہ اُن کی قوتوں کو جو حشیانہ کاموں اور خانگی لڑائیوں میں صرف ہوتی تھیں مذہبی اور ملکی ترقیات میں لگا دے، اور جو کل اُلٹی چل رہی تھی اُسے سیدھا کر دے۔ چنانچہ ہمارے ہادی ہمارے سردار نے یہی کیا، کہ ساری قوم کو سیدھے اور کام کے راستے پر لگا دیا، اور اُن کے اختلاف و تفریق اور خاندان جلیکوں کو، اتفاق اور مذہبی جوش سے بدل دیا۔ جب جمال نبوی کا پر تو اُن پر پڑا، اور نور محمدی نے اُن کے دلوں کو روشن کر دیا، تو وہ خدا کی خلافت کے مستحق ہوئے، اور پورا ہوا وہ وعدہ جو خدا نے اُن سے کیا تھا۔

مگر پرنسپل کی طرح مسلمانوں نے بھی خدا کی وحدانیت کے عقائد پھیلانے اپنے مذہب کو آغا کیا۔
 مگر یہودیوں نے کبھی غیر قوموں کو اپنے آپ میں نہ ملایا، بلکہ اپنے مذہب کو وہ اپنی خاص ملک سمجھتے رہے،
 مگر اسلام کی دعوت تھی کافرت لئاس، اُن کی ہی کوشش تھی کہ سارے ہندو خدا کی ایک اُمت اور ایک
 قوم ہو جائیں، اور ہر ایک خدا کی توحید کا معتقد، اور اسلام کا ماننے والا، ہو جائے۔ چنانچہ یہ سچا مذہب سچا
 غالب آیا، اور اس دین نے شرک اور بت پرستی کو نہ صرف عرب کی پاک زمین سے، بلکہ دنیا کے بڑے بڑے
 حصوں سے دور کر دیا۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں فتوحات کا سلسلہ برابر قائم رہا، ملک کے ملک فتح
 ہو گئے۔ خلفائے راشدین کے اخیر زمانہ میں اگرچہ بغاوت پھیلی، اور وہ تلوار جو خدا نے دشمنوں کے لئے
 مسلمانوں کے ہاتھ میں دی تھی، آپس میں چلنے لگی۔ اور مخالفت اور دشمنی اور مذہبی اختلاف کا نہر پلائی ج
 پڑ گیا، مگر زمانہ جلد گزر گیا، اور حضرت امام حسن علیہ السلام کی دشمنانہ اور بت پرستانہ پالیسی نے اُس آگ پر پانی
 ڈال دیا، اور پھر مسلمان فتوحات پر متوجہ ہو گئے۔ امیر شام کے بعد ایسے واقعات ہوئے جن کے دردناک
 نتیجے آج تک مسلمان اٹھاتے ہیں اور جس سے اسلامی تاریخ شرم سے بھری ہوئی ہے۔ آخر کرب بنی اُمیہ
 کی سلطنت مستقل طور پر قائم ہو گئی، پھر سلسلہ فتوحات کا شروع ہوا، اور دمشق سے لیکر پرتگال کی سرحد تک
 اسلامی سلطنت جو کہ صرف ایک خلیفہ کی حکومت میں تھی قائم ہو گئی۔ جب اندرونی سازشوں اور خفیہ بغاوتوں سے
 جو چھپکے چھپکے اپنا کام کر رہی تھیں، مردانیوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا، اور عباسی خلیفہ ہوئے، انہوں نے بھی
 فتوحات کا سلسلہ با بر جاری رکھا۔ ایشیا کو چاک اور سیریلکے فتح کرنے کے بعد اسلام کی فوجیں قسطنطنیہ تک
 پہنچ گئیں، اور دہاں سے تھوڑے دنوں میں ویانا پر حملہ کیا گیا، یورپ میں فرانس کے وسط تک اسلام کا
 پہرا اٹھنے لگا، اُنڈلس میں نہایت زبردست سلطنت قائم ہو گئی، مشرق کی طرف ایران میں ہوتے ہوئے
 ہندوستان اسلام کے جھنڈے پہنچ گئے، اور وہ عظیم الشان سلطنت قائم ہو گئی، جو گزشتہ صدی کے
 انتقام تک موجود تھی۔ لیکن جیسی یہ ترقی تھی، ویسا ہی حیرت انگیز زوال بھی ہوا، ایک خاص حد تک
 پہنچ کر ہماری ترقیاں رک گئیں اور پھر زوال آنے لگا۔

فتوحات کا سلسلہ تیسری صدی تک خوب جاری رہا، اُس کے بعد تنزل کے آثار شروع ہوئے۔
 اس سلسلہ کا تیسری صدی تک جاری رہنے کا سبب یہ تھا، کہ جو جوش فتوحات کا عرب میں پھیل گیا تھا،
 اُس سے ساری قوم بہادر اور سپاہی ہو گئی تھی، اور جو قواعد حضرت عثمان نے قائم کئے تھے، اُس سے ہر عرب
 گویا ایک سپاہی تھا، جو ہر وقت اپنے ملک اپنی قوم اپنے مذہب کے لئے جان دینے کو تیار تھا۔ بقول علامہ سیور
 کے اُن قواعد سے ساری قوم میں گویا ایک جنگی روح چل پڑی تھی، اور تمام عرب سو بھر ہو گئے تھے جن کا
 صرف یہی کام تھا کہ وہ سرے ملکوں اور دوسری قوموں کو فتح کریں، اور اُن میں اسلام پھیلائیں۔ وہ قواعد
 ایسے مستحکم اصول پر قائم کئے گئے تھے، کہ مذہبی دلوے کے جاتے رہنے پر بھی عربوں میں کامل اٹھائی سو برس

ملک جنگی جوش پورے طور پر قائم رہا۔ قوم کی قوم کو یا ایک فوج تھی جو ہر وقت حرکت میں رہا کرتی تھی، بچھاؤ لیا اُن کے گھر تھے، گھوڑوں کے پیٹ اُن کے بچھونے تھے، غرض کہ عرب ایسے تلخ اور مستعد قوم ہو گئے تھے، جو پستہا پشت ملک گیری کے لئے ایک لحظہ کے نوٹس دینے پر تیار اور جملہ کرنے کے لئے مستعد رہتے تھے۔

بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانہ میں گواندرونی خانہ جنگیاں اور باہمی فسادات ہوتے رہے، مگر فوجی قواعد اور عرب کی مستعدی نے چندے ترقی کا سلسلہ جاری رکھا، مگر جب وہ قواعد ٹوٹ گئے، اور خلفائے عباسی نے بجائے عرب کے دوسری قوموں کو خیل کیا، اور پھر عیاشی، فضولی، کاہلی، اور بزدلی مزاجوں میں آگئی، اُن کا زوال شروع ہوا۔

مقتصد باللہ درحقیقت اُس سدکا ٹوٹنے والا تھا، جو حضرت عمرؓ نے قائم کی تھی، اُس نے ترکی غلاموں کو فوجی کام پر مقرر کیا، انہیں کاباڈی گاڑ دیا، عرب کے بدلے اُن پر بھروسہ کرنے لگا، اُس نے اپنی قوم عرب کو ایسا تبدیل کر دیا کہ وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اور اُن کے خوف سے اُسے بعد اوجھڑ کر دوسرا شہر سمرقند نامی بسا نا پڑا۔ اس کے بیٹے متوکل علی اللہ نے تو ان ترکوں پر بیاں تک بھروسہ کیا کہ اپنی جان اُن کے سپرد کر دی، اُسے ترکوں پر اتنا بھروسہ تھا کہ اپنی خاص تلوار جو دس ہزار درم کو خریدی تھی، اپنی حفاظت کے لئے اپنے غلام ترک کو دیدی، جس نے اُسی تلوار سے اُس کا کام تمام کیا۔

جب اس طور سے اجمرتی سپاہی اور باہر کے لوگ فوج میں داخل ہوئے، اور عربوں کی قدر کم ہو گئی، اُن کی تنخواہوں اور وظیفوں میں بھی فرق آگیا، اور فوج کے کام سے بیکار ہو گئے۔ چونکہ وہ زراعت۔ تجارت وغیرہ تو جانتے ہی نہ تھے، اس لئے انہوں نے بھی خانہ بدوشی اختیار کی، اور پھر لہوئی بدویت کی حالت میں رجوع کرتے، اور گھوڑے بندوق اور نیزے سے کام لینے لگے۔ اس تغیر سے جو عرب کی فوجی حالت میں پیدا ہوا، خلفاء کی عظمت کا زمانہ جلد گزر گیا، صوبہ جات میں بغاوت پھیل گئی، سلاطین اور امارانے خود مختاری اختیار کی، باہمی نزاع اور بد نظمی نے دار الخلافت کو اپنا گھر بنایا۔ اور وہ اجمرتی فوجیں جو مدد کے لئے باہر بلا کر نوکر رکھی گئی تھیں، اپنے آقاؤں پر بگڑا بیٹھیں، اور بجائے نوکروں کے آقا بن گئیں، اور ترکی غلام، ترکی سپاہی، ترکی جنرل، اور ترکی امیر خلیفہ کے جان و مال کے مالک بن گئے، انہوں نے خلافت کو اپنا کھلونہ بنایا، کسی کو گدئی سے اتارا، کسی کو ٹھایا، کسی کو مارا، کسی کی آنکھیں نکالیں کسی کو اپنا پستخو بنایا، کیا خوب کہا ہے ایک نامور مورخ نے کہ ”وہ عصا جس پر خلفائے فاتحہ ٹیک کر سہارا لیا تھا وہی اُن کے حق میں اُتر دیا ہو گیا“۔

اگرچہ خلفائے عباسیہ کی خلافت تیسری صدی میں نہایت ضعیف ہو گئی تھی مگر نام باقی تھا، اسپین، ترکی، ایران وغیرہ میں امیر المومنین کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، خراج کو کوئی بھیجتا تھا، مگر نام کے لئے

خطبہ خلیفہ ہی کے نام کا پڑھا جاتا تھا۔ لیکن پانچویں صدی کی سلطنت کے بعد نام بھی باقی نہ رہا، اور چنگیز خاں کے چوتھے نے عباسیوں کی خلافت کا نام بھی زمین کے صفحہ سے مٹا دیا، اور اُن کے ساتھ عربوں کی ملکی تاریخ کا بھی گویا خاتمہ ہو گیا۔

عربوں کی سلطنت اگرچہ عرب شام میں اس طور پر تباہ ہوئی مگر اُس کی شاخیں جو دوسرے ملکوں میں پھیلی ہوئی تھیں کچھ دنوں تک تروتازہ رہیں، اُن میں سے بڑی سلطنت وہ تھی جو مسلمانوں نے اسپین میں قائم کی تھی۔

اس سلطنت کا حال سنئے، کہ ساتویں صدی کے اوائل میں خلیفہ عبدالملک کی عدم حکومت میں اسلام کی قومیں افریقہ سے بڑھ کر سینٹا Centa، ہنگ پونج کئی تھیں، یہاں سے تنگ آ کر آئینا جیل الطارق کے اُس پاس اسپین (Spain) کا ملک نظر آتا تھا، خلیفہ وقت کے گورنر موئے نے اُس ملک کے فتح کرنے کا ارادہ، اور اپنے سپہ سالار طارق کو پانچ ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ لوگ اُس مقام پر آتے جہاں آج کے دن جیرالڈر (Gibraltar) کا قلعہ واقع ہے، گویا اسی نام سے وہ اندلس کے فتح کرنے والے کی آج تک یاد دلانا ہے۔ اگرچہ یہ فوج اندلس کے صرف حالات دریافت کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی، مگر پہلے ہی مقابلہ میں وہاں کے باشندوں کو اپنی شکست ہوئی، کہ کل ملک حملہ آوروں کے تصرف میں آ گیا۔ مگر نے اپنے سپہ سالار پر شک کھا کر اُس کو یہ حکم بھیجا کہ میرے آنے تک انتظار کرو، مگر طارق فتح کے نشہ میں مرتزا آگے بڑھ گیا، اور جب گورنر وہاں پہنچا، تو اس کا میاب سپہ سالار طارق کو یہ انعام ملا، کہ اُسے تازیانے لگائے گئے، مگر گورنر کو بھی آخر یہی انعام ملا جس وقت خلیفہ نے موئے کو بلا بھیجا، اور وہ خلیفہ کے سامنے حاضر ہوا خلیفہ نے موئے پر بھی انہیں سزاؤں کا حکم صادر فرمایا، جو موئے نے اپنے ماتحت کو دی تھیں۔ لیکن قبل اس کے موئے نے اسپین کے تمام جزیرہ نما کو فتح کر لیا تھا، اور پرنیز (Pyrenees) کے پہاڑوں پر سے فرانس کو زیرِ میدان اُس کے قدموں کے لئے پھیلا ہوا نظر پڑتا تھا۔ اندلس میں مسلمانوں نے جو ترقی کی وہ اس قدر عظیم تھی کہ آج اُس کو باور کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے، اندلس کے فتح کرنے میں دوسریں بھی صرف ہوئے تھے کہ فرانس پر حملہ آوری کر دی گئی۔ پانچ ہزار بربر کے سپاہی جو پہلے اس مہم پہنچے گئے تھے، اُن کے ساتھ موئے نے اٹھارہ ہزار ادعوب شریک کر کے اپنی فوج کو ایسا بنایا، کہ کوئی اُس کو روک نہ سکے۔ ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں یہ معلوم ہوتا تھا، کہ تمام یورپ مسلمانوں کا مطیع ہو جائیگا، اور عیسائی مذہب کی دار الخلافہ ”روما“ میں اسلام کے خطبے پڑھے جانے کی جو ایک وقت میں دھکی دھکی تھی، پوری کر دکھا دی جائیگی۔ لیکن سلسلہ فتوحات کا سلسلہ میں ٹورن کے (Tours) مقام پر یکایک ختم ہو گیا، اس مقام پر مسلمانوں کو اپنی شکست ہوئی، کہ مسلمانوں کے قدم پر نیز پہاڑ کے اُس پار نہ بڑھ سکے۔ شکست اس وجہ سے ہوئی کہ اسلام کی فوج بے دیکھے بھاگے بڑھ گئی تھی، اور سپاہیوں میں آپس میں نفاق

پیدا ہو گیا تھا، آخر کار اسلام کا دور اندلس جیسے چھوٹے ٹکڑے میں محدود ہو گیا۔ سات سو برس تک مسلمانوں کی سلطنت اندلس میں تمام دنیا بھر کے لئے عظمت و جلال کا نمونہ تھی، کوئی نظیر اُس فیاضی اور دیادہلی کی قوم منفق کے ساتھ سلوک کرنے میں ایسی ہم نہیں پہنچ سکتی، جو مسلمانوں کی سلطنت اندلس کا مقابلہ کر سکے۔ اندلس بنی امیہ کے خلیفہ کے زمانہ میں فتح ہوا تھا، اس لئے اس ملک کی سلطنت اُن کی خلافت کے زوال کے بعد اُن کے ہاتھ سے نہ نکلی، جس وقت بنی امیہ کا خاندان تباہ ہوا، تو قتل عام سے ایک متنفس عبدالرحمن بنج کر اسپین پہنچا۔ یہاں پر لوگوں نے اُس کی بڑی آؤ بھگت کی، اور تخت پر بٹھلایا۔ لیکن اس کے ساتھ ظلم و تعدی کا کوئی لہ اسپین میں بھی شروع ہو گیا، جو ہمارے خاص وطن میں قائم تھا، اور یہی ظلم باعث ہوا اسپین میں بھی اُن نتائج کے پیدا کر دینے کا جس نے عربستان کو تباہ کیا تھا۔ ملک میں بغاوت پھیلی، اور اُس کے خاص نین سرداروں نے سازش کر کے فرانس کے بادشاہ شارلمین (Charlemagne) کو سلطنت اسپین پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ محض اتفاق تھا کہ اس قدر محنت سے قائم کی ہوئی سلطنت اُسی وقت برباد نہ ہو گئی۔ شارلمین کو اپنے باغی امرا کی سرزنش سے فرصت نہ ملی، کہ اسپین پر حملہ کرے۔ عبدالرحمن نے اس موقع کو فہمیت سمجھ کر ان ہی بداندیشوں سے بدلہ لینے کا خوب موقع پایا، یہ انتقام ایسی سختی اور شدت سے لیا گیا، کہ پھر کسی کو اس کے خلاف سازش کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بشرطین پول کا بیان ہے کہ ”بعد پول اور خوزریوں کی وجہ سے ایماندار آدمیوں نے اس کی خدمت سے انکار کیا، اور اُس کے پُرانے خیر خواہوں نے، جنہوں نے اُس کے اسپین آنے پر ایسی خوشی سے اُس کی آؤ بھگت کی تھی، اس کے ظلم و ستم دیکھ کر دیکھ کر وفاداری سے منہ موڑنا شروع کر دیا۔ اس کے رشتہ دار جو خلفائے عباسیہ کے در سے بھاگ کر اُس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے، اس کی جا براہ حکومت سے ایسے بیزار ہو گئے، کہ اس کو تخت سے اتارنے کی سازشوں میں شریک ہونے لگے، اور اپنی جائیں کھو بیٹھے، عبدالرحمن یکہ دہنار گیا۔ اُس کے پُرانے خیر خواہ اُسے چھوڑ کر چلے گئے، اُس کے رشتہ دار اور دو کو تک اُس کے دشمن بن گئے، کچھ تو اندرونی کھیر کی وجہ سے اُس کی تیز مزاجی مشتعل ہو گئی، اور کچھ فی نفسہ“ اُس کی طبیعت بے رحم تھی۔“ دعا بازی اور طاقت سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے عبدالرحمن نے بھی ہی طریقہ اختیار کیا، جو خلفائے بغداد کی بربادی کا باعث ہوا تھا۔ اس نے بھی خلفائے بغداد کی طرح غیر قوموں کی اجرتی فوج کو بھرتی کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ چالیس ہزار افریقہ کے سپاہی اُس کی حفاظت کے لئے مامور تھے۔ عبدالرحمن کے مرنے کے بعد چند روز تک اس کے ظلموں کی یاد سے لوگوں کے دلوں میں بغاوت کی جرأت پیدا نہ ہوئی۔ اس کا جانشین نہایت نرم مزاج اور پاک طینت تھا، اور لوگ اُسے ہر لعنہ زار و نصف کے خطابوں سے یاد کرتے تھے، مگر باوجود اس کے اس کی سلطنت کو آٹھ برس نہ گزرے تھے کہ بغاوت کا طوفان ٹوٹ پڑا۔ سازش کے بعد سازش اور قتل عام کے بعد قتل عام جاری ہو گیا، اور آپس میں جنگ بدل شروع ہو گئی۔ اس وقت تک ایک اور نئی

قوم نیچی ملک کے نو مسلم باشندے بھی میدان میں آچکے تھے، فیاض اندلس کے رہنے والوں کی اولاد میں تھے، جنہوں نے ابتدائی حکمرانوں کی فیاضی دیکھ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ کل مذہب تبدیل کرنے والوں کی طرح ان میں عربوں سے زیادہ تعصب تھا، اور اپنے دورہ کرنے والوں ملاؤں کے ذریعہ سے بے اطمینانی اور بغاوتوں کو بھیلایا کرتے تھے۔ بے انتظامی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ بہت سے صوبے خود مختار بن گئے، اور علحدہ علحدہ بادشاہ مقرر ہو گئے۔ سیول (Civil) یہ سپہیں کے ایک صوبہ کا نام ہے) کے بادشاہ ابو جراح کا دوبارہ تو شاہنشاہی شان و شکوہ سے ہوا کرتا تھا، غیر ملکوں کے بادشاہوں کے یہاں سفیر حاضر ہا کرتے تھے، اور مدینہ اور بغداد سے تحائف پیشکش جایا کرتے تھے، اس کی فیاضی کا وہ شہرہ پھیلا، کہ قرطبہ کے شراب جو جوق اس کے دربار میں جا کر حاضر ہو گئے۔ غرض کہ اس طوائف الملوک کی، اور چھوٹے چھوٹے سلاطین کے خود مختار، اور اپنی علحدہ علحدہ سلطنت قائم کرنے سے اہلی قوت اتنی کم ہو گئی تھی، اور ضعیف اتنا طاری ہو گیا تھا کہ جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مسلمان حکومت کا اختتام قریب آ رہا ہے، ڈاکوؤں کے گردہ ملک کو تباہ کئے دیتے تھے، اور اس قدر جرات اُن کی بڑھ گئی تھی کہ قرطبہ کے دروازہ تک لوٹا جا رہی تھی۔ اُس زمانہ کے ایک مصنف نے چشم دیدہ حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے ”ملک پر تباہی چھا رہی ہے، آفتوں کا سلسلہ ہے کہ ختم نہیں ہوتا“ لوٹ مار برابر جاری ہے، بی بیایاں اور بچے غلامی میں کچھ چلے جاتے ہیں، ایسی ردی حالت کے زمانہ میں عبدالرحمن ثالث قرطبہ کے تخت پر بیٹھا، میں یعنی قریب قریب پہلی فتح کے دوسو برس بعد جلوس فرما ہوا۔ اس بادشاہ کی جو انگریزی اور مستقل نے نتیجہ پیدا کر دیا، کہ آخر کار ملک کو امان ملی اور وہ کل بغاوتیں جو ایک مدت سے پھیلی ہوئی تھیں فرو ہو گئیں۔ یکے بعد دیگرے کل صوبجات فتح کر لئے گئے یہاں تک کہ آخر کار عبدالرحمن کا نام ملک سپہیں کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس بادشاہ نے آخر کار خلیفہ کا خطاب اختیار کیا، لیکن ان سب اغراض کے حاصل کرنے میں عبدالرحمن کو بھی اجرتی سپاہیوں سے کام لینا پڑا۔ اُن سب میں سربراہ درودہ وہ گردہ تھا، جو اُس کی حفاظت جان کے لئے ”ریبلڈز“ (Rebels) یعنی غیر ملک کے خریدے ہوئے غلاموں مرکب تھا۔ اندلس کی یہ حالت ہو گئی، کہ اجرتی سپاہیوں کے بغیر کام ہی نہ چل سکتا تھا، اس واسطے قرطبہ خلیفہ کے دشمن اُسی کی رعایا میں سے تھے، اور اُن میں سے منتخب کئے ہوئے سپاہیوں پر بھروسہ نہ کیا جاتا تھا۔ ملکی دشمنوں کے سوا عبدالرحمن کو بیرونی دشمنوں کا بھی خوف لگا ہوا تھا، شمالی افریقہ کے خلفاء ہمیشہ اُن سے بھڑنے پر تیار بیٹھے رہتے تھے۔ ادھر اسپین کے شمال میں ایک ایسے زبردست دشمن کی قوت بڑھتی چلی جاتی تھی جس سے مسلمانوں کے آفتاب سلطنت کے غروب ہونے، اور آخر کار اندلس سے نکالے جانے کا سامان تیار ہو رہا تھا، یہ عیسائی تھے۔ ان دشمنوں کا وجود مسلمانوں کی فطرت اور بے پروائی کا نتیجہ تھا۔ عیسائی جس وقت اندلس سے نکالے گئے، تو ان میں سے تھوڑے لوگوں نے (Austrian) اور لیان (Leon) کے پہاڑوں میں پناہ لی تھی، اُن کے سرغنہ پائیگو (Pelago) یا جیسا کہ مثنویوں

میں بیان کیا گیا ہے پہلی اُس (Pelagius) کے ساتھ تیس آدمی اور دس عورتوں کو ڈاکوؤں کے
 (Covadonga) کے غار میں پناہ ملی تھی۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے کے غاروں نے اپنے غرور
 سے کچھ پرواہ نہ کی، اور نہ ضرورت سمجھی کہ اُن کو دناں سے نکالیں۔ ایک ماہ کے بعد مغربیوں کے
 یہ چھوٹے سے ٹکڑے بڑھتے بڑھتے ایک جنگی گروہ ہو گئے، اور اُن کے دلوں میں نہایت جوش سے
 اپنے بزرگوں کی بربادی کا انتقام مسلمانوں سے لینے کی آرزو پیدا ہوئی۔ جس وقت عبدالرحمن ثالث
 تخت نشین ہوا، اس گروہ کی تعداد مسلمانوں کے لئے خطرناک ہو چکی تھی، ان کے بادشاہ ارڈنڈ
 (Ordond II) ثانی نے صوبہ اندلس پر حملہ کیا، اور شہر بیڈیجاز (Badajoz) سے جو قرطبہ
 سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے، خراج وصول کر کے لے لیا۔ ان کے خلاف میں خلیفہ نے بذات خود فوج کشی کی،
 اور ذیل آف ریڈس (Vale of Reeds) کے مقام پر شکست دی۔ عبدالرحمن نے اس فتح کے
 بعد خلیفہ کا خطاب اختیار کیا، اور اسی خطاب سے تیس سال اور حکومت کی، مگر قبل اس کے کہ پندرہ برس بھی
 گزریں وہ عیسائی گروہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، پھر لڑنے بھڑنے کو تیار ہو گیا، اور اُن کے بادشاہ رامیرؤ
 (Roemiro) نے ۹۳۹ء میں عبدالرحمن کو اُلتان ونا (Alhandega) کے مقام پر شکست
 دی۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس مقام پر پچاس ہزار مسلمان مارے گئے اور خلیفہ مع پچاس سواروں کے اپنی جان
 بچا کر بھاگ گئے۔ عیسائیوں میں جو اندرونی فتنہ و فساد تھا، اُس کی وجہ سے وہ اس فتح کو پورے پورے
 طور پر کام میں نہ لاسکے، خلیفہ نے اُس سے صلح کر لی اور پرتگال (Nauarre) کے بادشاہ کو اپنے یہاں
 مہمان ٹھہرایا، اور اپنی فوج سے کیا ان کے جلاوطن کئے گئے بادشاہ کو اپنا تخت واپس لینے میں مدد دی۔
 اس خلیفہ کے زمانہ میں مسلمانوں کی عظمت ملک اسپین میں اعلیٰ درجہ پر تھی۔ ملین پول (My Lane Pool)
 کا بیان ہے، کہ قرطبہ میں کبھی اتنی دولت اور ایسی سرسبز و شادیں نہیں دیکھی گئی تھی، صوبہ اندلس کی زراعت کبھی
 ایسی ترقی کی حالت میں نہ تھی، قدرتی زرخیزی زمین کو انسانی ہنر اور محنت نے کمال کو پہنچا دیا تھا، بے ہمتی کا
 نام و نشان باقی نہ تھا، قانون کی عزت اور عمل آوری پورے پورے طور پر کھجانی تھی، شاہنشہ قسطنطنیہ
 شاہ فرانس، جرمنی اور اطالیہ کے سفیر اس کے دربار میں حاضر ہا کرتے تھے۔ عبدالرحمن کا بیٹا بہت بڑا عالم
 تھا، مگر فن سپہ گری اور تدبیر مملکت سے بے بہرہ۔ اس میں کچھ شک نہیں، کہ علوم و فنون کو اس کے
 زمانہ میں بہت بڑی ترقی ہوئی، مگر فسادات کا اسنادا پورا پورا کبھی نہ کر سکا۔ اس کے مرنے کے بعد بعض
 واقعات ایسے پیش آئے، جن کی وجہ سے یہاں بھی بعینہ وہی حالت ہو گئی، جو خلفا سے بغداد کی تھی،
 چونکہ بادشاہ بہت ہی کم سن تھا، اس لئے کل انتظام مملکت اُس کے وزیر المتصور کے سپرد ہو گیا، اُس نے
 تھوڑے عرصہ میں اپنے آپ کو بادشاہ بنا کر خلیفہ کو بالائے طاق رکھ دیا۔

حضرت خلیفہ زمانہ میں مزا کیا کرتے تھے، اور وزیر بادشاہت بہت شان و شوکت کی حکومت کے

بعد ذریعہ فتنہ میں فساد پائی، اور اُس کے بعد سپین میں پھر وہی بد نظمی شروع ہوئی۔ سال تک مختلف سرداروں اور ظالم حاکم، ظلم اور فساد کرتے رہے، نت نئے خلیفہ، اور نت نئے بادشاہ پیدا ہوتے تھے۔ سلیکوز کی فوج جو شاہی تخت کی حفاظت کے لئے ابتداً مامور ہوئے تھے، اُس نے خلیفہ کو شطرنج کا عمرہ بنایا عبدالرحمن کا بیٹا مع اپنے ایک لڑکے کے مسجد کے ایک خلیفہ خانے میں قید کر دیا گیا تھا، یہاں ان دونوں کو بے آب و دانہ رکھا گیا، اُس وقت امیر المومنین کے دل میں جو کچھ خواہش تھی وہ پختی، کہ ایک ٹکڑا روٹی اور ایک چرخ میسر آسکے۔ اس بد نظمی سے عیسائیوں نے جن کی طاقت ہر روز بڑھتی جاتی تھی، بہت کچھ فائدہ اٹھایا

انگازو (Alfonso) اچو ریا (Asturia) اور لیون (Leon) اور کیٹیل (Castille) تینوں بادشاہوں کو اپنے تریکومت کر کے ایک فوج ہمراہ لیکر اسپین کے جنوب میں جبل الطارق جا پہنچا، اور یہاں سمندر میں نہانے کی منت پوری کی۔ یہ حالت دیکھ کر اسپین کے مسلمانوں نے اپنے افریقہ کے ہم مذہبوں سے استدعا کی۔ مدد تو آئی، مگر بربری ایک قوم کی قوم اگر اسپین میں آباد ہو گئی، اور اگرچہ اُن کی مدد سے ملک میں امن و امان قائم ہو گیا، مگر اُنہوں نے خود ملک ہی پر قبضہ کر لیا۔ اُس طرح میں جب یوسف کا انتقال ہوا، تو اسپین کا وہ حصہ جو مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، افریقہ کی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ اُس کے مرنے کے بعد بربر کے لوگ جو اسپین میں رہ گئے تھے، بالکل مطلق العنان ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے بادشاہوں، اور سرداروں نے سرکشی کر کے متحدہ ملحدہ سلطنتیں قرطبہ، قادش، غرناطہ، اور ولینشیا (Valencia) میں قائم کر لیں۔ مگر پھر ایک شخص ایسا پیدا ہوا، جس نے اسپین کے مسلمان صوبوں کو ایک سلطنت قرار دیکر اُن امان بخشا، اس شخص کا نام عبداللہ تھا۔ مگر اس وقت میں وہ عظیم الشان اور آخری جنگ مسلمانوں اور عیسائیوں میں شروع ہوئی، جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا، کہ اسپین کے مسلمانوں کی سلطنت کا نام و نشان مٹ گیا۔ بارہویں صدی کے آخر میں (۱۱۹۷ء) سینیڈا (Zenida) نے صوبہ ولینشیا کو فتح کر کے اپنے آپ کو بادشاہ قرار دیا، اس کے بعد تو مسلمانوں کی سلطنت اسپین کا زوال گویا بالکل قریب ہی آگیا۔ افریقہ کی سلطنت سے جو کچھ باقی بچا تھا اُس پر تو مہدیوں کا خاندان حکمران ہو گیا۔ اسپین میں جو مسلمان بادشاہ تھے اُن میں باہم سخت عداوت اور دشمنی تھی، کل شہر کے بعد دیگرے عیسائیوں نے فتح کر لئے اور مہدیوں کو اسپین سے محال باہر کیا۔ آخر ۱۲۳۸ء میں مسلمانوں کی زیر حکومت اسپین کے جزیرہ نما کا ایک صوبہ غرناطہ باقی رہ گیا تھا۔ اور اُس کا بھی انجام بہت ہی قریب تھا اس فرار سے صوبے میں بھی جھگڑے اور فساد پھیلے ہوئے تھے۔ آخر آپس کی نا اتفاقی کی وجہ سے یہ صوبہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا، اور ۱۴۹۲ء میں آٹھ سو برس کی اسلامی سلطنت کے بعد اخیر مسلمان بادشاہ ابو عبداللہ غرناطہ سے سدھارا، اور کُنچیاں فرڈینی نڈ (Ferdinand) کے حوالہ کر کے اپنے شہر پر ایک حسرت کی نگاہ ڈالی، اور جلا وطن ہوا، اس مقام کو اب تک آخر آہ مور کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ وہ آخر آہ تھی جس کے ساتھ مسلمانوں کی سلطنت کا اسپین میں خاتمہ ہو گیا۔

اُس وقت جب سلمان اسپین سے نکلے جا رہے تھے، اور جب بغداد کی سلطنت کو زوال آ گیا تھا،
 ترک میں مسلمانوں کی ایک سلطنت قائم ہوئی جو آج تک موجود ہے عثمانی ترکوں کی تاریخ، دنیا کی تاریخوں میں
 سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے، اور اس میں بھی وہ صفات موجود ہیں جو دوسری مسلمان سلطنتوں میں موجود ہیں
 شروع میں ان کی فتح چاروں طرف ہونے لگی، اُن کی فوجیں اپنے دشمنوں پر ایسی فتح پاتی تھیں کہ گویا خیال
 ہوتا تھا کہ تمام دنیا ان کے قدموں کے نیچے آجائے گی۔ ترکوں میں بہت سے اسباب تھے جن کے روکنے والے
 موجود تھے۔ وہ اپنی کامیابی کے گھنٹوں میں دوسروں سے کچھ سیکھتے نہ تھے، اور دوسرے ملکوں میں جو آثار
 و مانعی تریاں ہو رہی تھیں، اُن سے کچھ فائدہ اٹھانا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے تھے، اُن میں پُرانا
 جوش نافرمانی اور حسد کا قیام تھا، جس سے بہت سے خونخوار معاملات اہتمام کے واقع ہوئے۔ سولہویں صدی
 کے وسط میں سلطان سلیمان الشہرہ عالی شان کے عہد میں ترکی سلطنت عروج پر پہنچ گئی تھی، فرانس اور انگلستان
 ان سے دوستی کے خواہشمند رہا کرتے تھے، اُن کی عظمت عیسائی بادشاہوں کے دلوں میں یہاں تک
 ساٹی ہوئی تھی، کہ وہ شاہنشاہ جرمنی سلطان کے وزیر اعظم کے بھائی بننے کی آرزو رکھتا تھا، گویا وہ اپنا رتبہ
 سلطان کے وزیر کے برابر سمجھتا تھا۔ یورپ کی تمام قومیں ترکوں سے ڈرتی تھیں، اور ایک وقت میں معلوم
 ہوتا تھا، کہ اُن کی قوت کے پھیلنے کے لئے کوئی چیز مانع نہ ہوگی اور ہلال بدر ہوئے بغیر نہ ریگا لیکن سلیمان
 کے مرنے ہی سلطنت میں زوال شروع ہوا، جو آج تک چلا جا رہا ہے۔ اس قریب دو سو سال کے عرصہ میں
 کوئی ایسا دس سال کا زمانہ خالی نہ گیا ہوگا، جس میں ترکی فوج کو شکست پر شکست نہ ہوئی ہو، اور صوبے پر صوبے
 اُن کی حکومت سے نکل نہ گئے ہوں۔ قریب دو سو سال سے اس سلطنت کو سیکمینٹ (Sick man) کہتے
 ہیں۔ اور اُس کی نسبت یہ پیشین گوئیاں ہوئی ہیں کہ وہ جلد فنا ہو جائے گی۔ لیکن سیار آدمی ابھی تک نہیں مرا،
 اور اخیر رُخسائی لڑائی میں اُس نے دکھا دیا ہے، کہ ابھی تک اُس قوم میں ابھی جان موجود ہے۔ جو ترقی
 ہوئی ہے وہ اُس تہذیب کا نتیجہ ہے، جو اس صدی کے شروع میں سلطان محمود نے جاری کی تھی اُس
 نے دیکھا کہ ترکی سلطنت کا وجود ان ہمساحوں کے جاری کرنے پر منحصر ہے، جو اُن کی چاروں طرف ہو رہی
 ہیں۔ آخر کار فوج میں اصلاح ہوئی، فوجی تعلیم و تربیت کو ترقی دی گئی، اور نئے ایجاد کئے ہوئے ہتھیار کام میں لائے
 گئے اپنی عادتوں میں تبدیلی کرنا، بزرگ لوگ اس قدر کراہت کی نظر سے دیکھتے تھے کہ یہ بات اُن کی تاریخ میں مشہور
 ہو گئی ہے، یہاں تک کہ سلیم اول کے زمانہ میں، یعنی سولہویں صدی کے شروع میں مصر میں فوج نے توپوں کے
 استعمال کرنے سے انکار کیا، کیونکہ اُن کے غلط خیال میں ترشہ بالکھار تھا۔ اگرچہ آدھ توپوں نے ثابت کر دیا،
 کہ صرف تو اعدان فوج لڑائی میں زیادہ کارگر ہو سکتی ہے، لیکن ترک لوگوں نے ہر قسم کی تعلیم پانے سے انکار
 کیا۔ شوکر قوکرڈر (Chevauchee Farhad) مشہور فرانسیسی مورخ نے یہ بیان کیا ہے، کہ
 اٹھارویں صدی کے شروع میں جو ترکوں کی فوج کو شکست ہوئی، اُس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اُن

نئے تیاروں کو لڑائی میں استعمال نہیں کیا۔ ایڈورڈ کریسی (Sir Edward Creasy) کی رائے میں سنگینوں سے میسائیوں کو مسلمانوں پر فتح ہوئی جب صدی گزشتہ کے آخر میں سلطان نے نیا توپ خانہ فرانسیسی قاعدہ پر تیار کرنے کا ارادہ کیا (توجہ دینی زری) (Janissary) ایک فوج تھی جس کو ترکی میں نیک چری کہتے تھے۔ نے مطلقاً ان تیاروں کے اختیار کرنے اور فرانسیسی قواعد کو سیکھنے سے انکار کیا، مگر آخر کار جو صلاحیں محمود نے اس صدی کے پچھلے پچیس برس میں جاری کی تھیں، وہ بجز تمام رائج کی گئیں۔

ینگچری کی قوت توڑنے، اور پرانے قاعدوں اور خیالات کے مٹانے میں بہت بڑی وزیریاں ہوئی ہیں یہ حال آئندہ کے لئے غور طلب ہے کہ آیا جو صلاحیں اُس زمانہ سے جاری ہوئی ہیں وہ ترکی سلطنت کے پھر تازہ کرنے کے لئے کافی ہونگی یا نہیں، اکثر یورپین دانشمندیوں کی یہ رائے ہے کہ وہ صلاحیں کسی مردہ پر بجلی کا امتحان کرنے سے زیادہ موثر نہیں ہیں، اور بعضے یہ خیال کرتے ہیں، کہ محمود کی اور اُس کے جانشین سلطانوں کی جاری کی ہوئی صلاحوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو کچھ رقی باقی رہ گئے تھے اُس کو فرو کرنے سے سلطنت کو زوال پہنچا اور نئی زندگی نہ پڑی۔ اگرچہ میری یہ رائے نہیں ہے، مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ سیماں کے زمانہ سے اس صدی کے آغاز تک جس کو دو سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے، ترکوں کی سلطنت حالت سکون پر رہی، اور دوسری یورپین قومیں بڑی جلد جلد ترقی کرتی رہیں۔ جو قوم کہ حالت سکون پر بیگی، اُس کو ضرور زوال ہوگا۔ ترکی کی موجودہ زندگی کچھ اُس کی ذاتی قوت کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اُس مدد کی وجہ سے جو یورپ کی مغربی قومیں اُس کو دیتی ہیں، اور اُن کا باہمی حسد، ترکوں کے اُس پھول باغ کا، جو کیر پور میں رہ گیا ہے، محافظ ہے، ورنہ وہ بھی کب کا مٹ گیا ہوتا، اور یورپ میں اسلام کا نام کے سوا کچھ نشان نہ رہتا۔

چونکہ آج صابوں میں سے اکثر لوگ مسلمانوں کی ہندوستان کی سلطنت کی تاریخ سے بخوبی واقف ہیں، اس لئے میرا ارادہ نہیں کہ میں اُس کو تفصیل سے بیان کروں۔ سبند امیں مسلمانوں نے ہندوستان پر جو حملہ کئے اُن سے کوئی دوا می قائمہ حاصل نہ ہوا۔ نہ ایک منتقل سلطنت جس کی حکومت سارے ہندوستان پر ہوتی قائم ہوئی، البتہ خاندان تیموریہ کے زمانہ سے جیک منتقل سلطنت کے آثار نمایاں ہوئے، گو تیمور نے بھی محمود غزنوی کی طرح چڑھائی کر کے ملک کو فتح کیا، مگر اُس نے ہندوستان کو اپنا گھر نہ بنایا، اور یہاں اقامت اختیار نہ کی، جو کچھ پایا وہ لے دیکر چل دیا۔ بار کے زمانہ سے ہندوستان کی باضابطہ سلطنت اور شاہی خاندان قائم ہوا، مگر بار بھی ہمیشہ اپنا وطن مالوف چھوڑنے کا فسوس کرتا رہا۔ خاندان تیموریہ کے سلاطنت میں مسلمانوں نے بہت جلد ترقی کی، چاروں طرف حملے شروع ہو گئے، اور ہندو راجاؤں کو دکن کی طرف دباتے ہوئے چلے گئے، اور مناسب موقعوں پر اُن کی کشتیاں دکن کے کیلئے بھیجی چھوٹی تخت کوشٹیں

قائم کیں۔ مغلوں کی سلطنت اکیس کے زمانہ میں عروج پہنچ گئی، عقل و دانش، استقلال اور بے انتہائی میں
 اس بادشاہ کی کسی تاریخ میں نظیر نہیں پائی جاتی، ہندو راجاؤں سے اس قسم کی محبت پیدا کرنا، اگر اس کے
 بڑے اور بھیلے میں شریک ہیں، اُسی کا کام تھا، معزز سے معزز راجپوت راجاؤں نے اس بادشاہ کے ساتھ
 اپنی بیٹیاں بیاہ دی تھیں۔ اگر کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہندوؤں میں نظام کی بہت بڑی قابلیت ہے، اس لئے
 اُس نے ان لوگوں کو کشادہ پیشانی سلطنت کے اندرونی انتظام میں پورا دخل دیا، خزانہ اور مالگزاری کا
 کل انتظام انہیں لوگوں کے سپرد تھا، اور یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہے، کہ ان دونوں صیغوں کا انتظام کسی
 اور بادشاہ کے زمانہ میں اس سے بہتر نہ تھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہندوستان میں اگر کسی دربار سے
 زیادہ کسی بادشاہ کا دربار اس شان و شکوہ کا نہ تھا۔ تمام دنیا اور تمام مذہبوں کے علماء اُس کے دربار میں
 ٹوٹ پڑے تھے، اور ہندو مذہب اور ہر قوم کے لوگوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا برتاؤ ہوتا تھا۔ یہ کہنا کہ
 ہندوستان کی کیا حالت ہوتی، اگر اگر کے چند جانشین اُس کی پالیسی پر چلے ہوئے شکل ہے، مگر اس میں تو کچھ شک
 نہیں کہ سلطنت نہایت مستحکم بنیاد پر قائم ہو جاتی، اور یہ بھی بہت قریں قیاس ہے، کہ ایک عرصہ کے بعد،
 ہندوستان کی کل آبادی ہمالیہ سے لیکر اس کی ایک قوم ہو جاتی، اور ایک ہی مذہب اختیار کر لیتی،
 گو یہ کہنا دشوار ہے کہ کونسا مذہب اختیار کیا جاتا۔ مگر اگر کے جانشین اُس کے طریق اور اصول کے پابند نہ تھے،
 فساد کی قوتیں اپنا کام شروع کر چکیں تھیں۔ اور زوال کا عمل آغاز ہو چکا تھا، صوبہ جات میں رقابتوں کا زور
 قائم ہو چکا تھا، اور اُلپس ہی کے لڑائی جھگڑوں پر اکتفا نہ کی جاتی تھی، بلکہ اس بات میں بھی کوشش کی جاتی
 تھی، کہ شاہنشاہی حکومت کی اطاعت سے سبکدوشی حاصل کر لیا جائے۔ مگر سب سے زیادہ بھنبی کی بات
 یہ تھی کہ خود شاہی خاندان میں نفاق کے قدم آچکے تھے۔ شاہزادے ایک دوسرے کے خلاف میں
 سازشوں میں مصروف تھے اور حکومتوں کے حاصل کرنے میں براہد کشتی اور پد کشتی تک دیر نہ کیا گیا۔
 اورنگ زیب کی سلطنت کے زمانہ میں، جس کی مدت پچاس سال سے زیادہ تھی، اور جس نے اپنی بے نظیر
 لیاقت اور شہر قابلیت اور حیرت انگیز محنت اور بہادری سے اپنی سلطنت کو ایسی وسعت دی تھی، جو کسی
 پچھلے زمانہ میں کسی شاہنشاہ کو نصیب نہیں ہوئی، زوال کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ اورنگ زیب کی
 سختیوں اور تعصب کی بدولت، مرہٹے ڈاکٹوں سے بڑھتے بڑھتے ایک قوم بن گئے، اور اس سلطنت مغلیہ پر
 صدر پہنچانے کے لائق ہو گئے تھے۔ اگرچہ اُس کی دانتائی اور بہادری سے کل صوبہ جات یکے بعد دیگرے
 فتح کر لئے گئے، مگر جو صوبہ دار مقرر ہوتا وہ خود مختار ہو جانے کی کوشش کرتا، اور اُس کے بیٹے بغاوت کا علم
 بلند کرنے کے لئے ہمیشہ آمادہ، اور اُس کے لئے سازشیں کرتے رہتے۔ جس سے نہ صرف اُسے اپنی زمینوں
 کے ساتھ سختی کرنے، اور زنجیروں میں جکڑنے کی ضرورت ہوتی، بلکہ شاہزادوں پر بھی حکم کھلا غرض سلطان
 نازل کرنے پر مجبور ہوتا۔

”اُس کے جتنے جی اُس کی سلطنت تمام جزیرہ نما میں قائم رہی، مگر اورنگ زیب کے مرنے کو ساتھ ہی فتنہ و فساد کی آگ جس کو وہ خود بھگت کر سکا تھا، ایک دم سے بھڑک اٹھی۔ اُس کے بیٹے اور پوتے آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ یہاں تو یہ جھگڑے قصے ہو رہے تھے، اُدھر صوبہ جات کے صوبہ داروں، اور ہندو راجاؤں نے اپنے اپنے خود مختاری کے علم بلند کئے، سلطنت کے حاصل کرنے کے لئے جو جھگڑے پیدا ہوئے تھے، اُس کے رفع ہونے تک اُس سلطنت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا باقی رہ گیا جنوب میں ارکاٹ کے نواب نے خود مختاری اختیار کر لی، حیدرآباد میں آصف جاہ نے ایک خود مختار سلطنت قائم کی، جو آج تک خدا کی مہربانی سے موجود ہے، انھنوں کی بادشاہت خلیج بنگال تک پہنچ گئی، اور مغرب میں مرہٹوں کی سلطنت پورے سے جمیر تک قائم ہو گئی اور اُن کی فوجیں منجور سے بنگال تک پھیل گئیں اور کل صوبوں سے خراج لینا شروع کر دیا۔ ان سب شورشوں کے درمیان شہنشاہ دہلی کی چال تھی، کہ گویا ایک کاٹھ کا پتلا ہے، جس کی حکومت اُس کے محل کے چار دیواری کے اندر محدود تھی۔ مرہٹے، مغل، اور افغانوں نے اپنے سرداروں کی زیر حکومت مختلف اوقات پر دہلی پر قبضہ کر لیا، اور جو یا آخر لیا، اور چل دیا۔ آخر کار بیہ غلام قادر نے دہلی پر قبضہ کیا، اور شہزادیوں سے سخت بیرحمیوں اور شہزادوں کے برتاؤ کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہ لگا، تو اُس نے یہ کیا، کہ خزانے کے صندوق خالی دیکھ کر بوڑھے شاہنشاہ کو زمین پر دے مارا اور اپنے منہ پر سے اُس کی آنکھیں نکال لیں، عذر اور بناوت چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، اور اگر ایک جدید، غیر متوقع اور عجیب سبب نہ پیدا ہو جاتا، تو غالب ہے کہ مرہٹوں کی سلطنت دہلی میں قائم ہو جاتی، اور مسلمان شاہنشاہ کی جگہ ہندو مہاراجہ حکومت کرتا۔ ہندوستان میں جو ہمارا وجود قائم ہے، وہ انگریزی مداخلت کی وجہ سے ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کی تعداد میں سات اور ایک کی نسبت ہے، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں پر سخت ظلم ہوتا اور اُن کا مذہب توڑ دیا جاتا۔ جس طرح سے کہ سکھوں کے زیر حکومت پنجاب میں مسلمانوں پر سخت ظلم و تعدی ہوئی، اسی طرح تمام ہندوستان میں اُن پر جبر و ظلم ہوتا، اور آخر کار ہندوستان مسلمانوں اور اسلام کے نشانات ہی باقی رہ جاتے۔ مگر تقدیر نے تو اوپر ہی کچھ لکھ رکھا تھا، اس صدی کے اوائل میں انگریزوں نے مرہٹوں کو بالکل توڑ دیا، اور ہندوستان کی سلطنت اُن کے قبضہ میں چلی گئی، اور اگرچہ حکومت ہم لوگوں کے ہاتھ میں باقی نہ رہی، مگر ہمارا وجود اور ہمارا مذہب تو باقی رہ گیا۔

گزشتہ صدی کے آخر میں غلام شاہ دہلی کے تین اور چھوٹی ریاستیں مسلمانوں کی ہندوستان میں قائم تھیں۔ کرناٹک، حیدرآباد، اور اودھ۔ نواب کرناٹک تو تھوڑے عرصہ کے بعد سرکار انگریزی کے وظیفہ خوار بن گئے اور اُن کا صوبہ انگریزی ملک میں شریک ہو گیا، اور وہاں سے تمام آثار سلطنت اسلام کے ختم ہو گئے۔ اس حالت کو فقط نوے برس ہوئے ہیں، مگر مسلمانوں کی جو حالت بد اس میں ابتر ہے، وہ کسی قوم کی تمام دنیا میں نہ ہو گی میں اپنے ذاتی تجربہ سے، جو اس صوبہ مسلمانوں کی نسبت ہے، کہ سکتا ہوں، کہ بیچارے

مدرس کے مسلمان و تحقیق سخت افلاس میں گرفتار ہیں، خاندان کے خاندان تباہ اور برباد ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں، جو لوگ پچاس برس اٹل مدرس کی زینت، اور اُس کی عزت بڑھانے والے تھے، اُن کی اولاد آج ذلت و خواری سے در بدر ماری پھرتی ہے۔ اودھ کی سلطنت بھی نیست و نابود ہو چکی، اِس پُرانی سلطنت کی تباہی پر جتنا افسوس کیا جائے، بجا ہے، مگر اِس میں کچھ شک نہیں کہ آخری بادشاہوں کی بے عزتیاں، بد نظمیاں، اور ظلم اس قدر بڑھ گئے تھے، کہ انگریزی مداخلت لازمی اور ضروری ہو گئی تھی۔ اِس سلطنت کے جلتے رہنے سے پہلے سے مسلمان ہندوستان کے شمالی حصے کے تباہ اور مفلس ہو گئے، اور اُس کے آخری بادشاہ کی افسوسناک موت سے مسلمان بادشاہی کا نام بھی ہندوستان سے جاتا رہا، فَصْحَانِ تَحِیَ الْکَذِبِی لَا یَمُوتُ وَ یَبْدِلُ ۝ الْمُلْکُ وَالْمَلْکُوتُ، حیدر آباد کی ریاست خدا کے فضل و کرم سے باقی ہے، اور یہاں کے مسلمانوں کی حالت تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت سے بہتر ہے، دولت اور حکومت اُن کے ہاتھ میں ہے، امارت اور ثروت کے نشان ہر جگہ نظر آتے ہیں، یہی وہ مگر طے ہے جو اب سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا ملجا و ماوا ہے ❖

جس طرح مسلمانوں کی ملکی ترقیاں حیرت انگیز ہیں، اُن کی علمی اور تمدنی ترقیاں اُن سے کچھ کم العجب نہیں ہیں جو شہر نہ ہے اُن میں پیدا کر دیا تھا، قانون قدرت کے مطابق اُس کا یہی مقتضا تھا، جو وقوع میں آیا، یعنی تمام اُن کی اندرونی قوتیں ہیجان میں آگئیں، اور اُن کی ترقی کو خواہ پوشیل تھی یا علمی اور تمدنی، جس وقت تک وہ جوش قایم رہا، کوئی چیز نہ روک سکی۔ اول اول مسلمانوں نے قرآن کو جمع کیا، پھر اُس کے معانی حل کرنے اور سمجھنے پر متوجہ ہوئے، اور جس طرح سے ہندوستان میں عام علوم کی ابتدا وید کے معانی کی تشریح کی ضرورت سے ہوئی، اُسی ضرورت کے حرف و نحو، معنی و بیان و عروض و قافی، اور کل علوم جن کے اوپر زبان کا سمجھنا اور اُس کی باریکیوں کا جاننا، موقوف ہے، مسلمانوں نے ایجاد کئے۔ اُس کے بعد احادیث نبوی کے جمع کرنے، اور علوم دینی کی تدوین پر متوجہ ہوئے، اور اُن کو کمال کے درجے پر پہنچایا۔ خلفائے نبی اُمیہ کے وقت میں لڑنے لگے بہت ترقی ہوئی۔ علم موسیقی کی باریزید ثانی کے وقت میں پڑی، شاہزادہ خالد نے علم کیمیا میں نام حاصل کیا، تعمیر کے فن میں ترقی شروع ہوئی، دمشق میں مسجد اُتیبہ بنائی گئی، اور کئی ایک نئے شہر تیار ہوئے، اسلام کی پہلی صدی تمام ہوتے ہوئے نہ فقط علوم کی مضبوط بنیاد قائم ہو گئی، بلکہ پانچ بہت بڑے، اور متعدد چھوٹے چھوٹے شہر اور کئی عالیشان مسجدیں تعمیر ہو گئیں، خلفائے بنی عباس کے وقت میں فلسفہ اور حکمت میں بے انتہا ترقی ہوئی۔ تیسری صدی تک خلفائے عباسیہ کی حالت میں مسلمانوں کی علمی اور علمی ترقیاں کیں، کہ نہ فقط خود خلفاء علم دوست تھے، بلکہ اُن کے وزراء اور احرارے دولت میں سے ہر ایک عالم اور عالموں کی قدرو منزلت کرنے، اور علمی کتابوں کے جمع کرنے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتا تھا، اور تمام ممالک اسلام کے اہل کمال کا، خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہود

یہ نصائے، مروج و ماوادر اختلاف بغداد تھا۔ جس وقت تیسری صدی کے آخر میں خلافت کی قوت گھٹ گئی اور چھوٹی چھوٹی سلطنت جاز خراسان اور دوسری ممالک اسلام میں قائم ہوئیں، تو ایک مدت دراز تک ہر ایک یاست ان میں سے بجائے خود ایک منع فیض بن گئی۔ اور ان میں سے ہر ایک میں علماء و فضلاء و حکماء کے نام کثرت سے پیدا ہوئے، اور ان کی تصانیف تمام اسلامی ملکوں میں شائع ہوئیں۔ مسلمانوں کے ہر قسم کے علوم میں ترقی، اور ان کی کثرت تصانیف کا تھوڑا سا اندازہ کاغذ پر کمال کی تاریخ سے ہو سکتا ہے۔ یہ ایک نیا تہذیب نامور جرمن کا عالم ہے، اُس نے ایک کتاب مسلمانوں کے ذکر میں نہایت ضخیم جلدوں میں لکھی ہے، جن کے صفحوں کی تعداد سات ہزار سے زیادہ ہے، وہ بھی ابتدائے اسلام سے خلیفہ مکنی بامر اللہ کی خلافت کے دسویں سال یعنی ۱۵۰ ہجری تک۔ اس کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے ایک فہرست اُن عرب کی کتب تواریخ و رجال کی درج کی ہے جو اُس کا ماخذ ہیں۔ اس فہرست میں ۵۰۰ کتابیں ہیں، جن میں سے بہتروں کے نام تک ہم لوگوں نے نہیں سنے۔ ایک اور مؤرخ نے اسپین کے مسلمانوں کی علم و تہذیب کی ترقی کا حال لکھا ہے، جس میں یہ بیان کرتا ہے، کہ اسپین میں جو ترقی لڑیچر، علم اور شاعری میں مسلمانوں نے کی تھی اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے دماغ اور اُن کا ٹیسٹ (Taste) یعنی علمی ذوق، نہایت ہی نازک و پاکیزہ تھا، اُن میں تہذیب کا وہ جوش تھا اور جو صرف ہند اور شائستہ اور نہایت زہریت یافتہ قوم میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اُن کے ظالم سے ظالم اور خونی سے خونی بادشاہ میں بھی لڑیچر کا مادہ پایا جاتا تھا، جو شخص لطیفوں اور فصاحت اور بلاغت اور خوش تقریری اور خوش بیانی کے کم سے کم قدر کرنے کی لیاقت نہ رکھتا تھا۔ وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ علم موسیقی اور دیگر اعلیٰ درجہ کے علوم سے غائبی دماغ اور روشن ضمیر مسلمان گویا قدرتی طور پر مناسبت رکھتے تھے، اُن میں وہ دقیقہ بینی اور لڑیچر کی نزاکت پائی جاتی تھی، جو فی الحال فریج لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ بقول اس مؤرخ کے اسپین میں نہ صرف ردی حکیم اور ڈاکٹر ہوا کرتے بلکہ عورتیں بھی ایسی عالمہ ہوتیں، کہ قرطبہ میں لیڈی ڈاکٹر کا ہونا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ ہندوستان، ہیئت، تاریخ، فلسفہ، علم نباتات، علم حیوانات، غرض کہ علم کی ہر شاخ کی پوری پوری تعلیم اسپین میں ہوتی تھی۔ لڑیچر کی ترقی کی نسبت یہ کہنا کہ یورپ میں کسی زمانہ میں ایسی ترقی نہ ہوئی تھی، کچھ تعریف نہیں ہے۔ مسلمانوں نے اس قدر اس علم کو بڑھایا تھا کہ شاعری ہر شخص کی گویا زبان مادری ہو گئی تھی، اور ہر درجہ کے لوگ ایسے لطیف و پاکیزہ شعرا رکھتے، اور ایسی فصیح و بلیغ تقریریں کرتے کہ اِن مِنَ الْبَیِّنَاتِ لِحُجْرًا کی تصویر نظر آ جاتی۔ صنعت و حرفت کی یہ ترقی تھی، کہ ہر شہر میں اُس کے عمدہ آثار نظر آتے، عالیشان، بلند، مستحکم اور خوشنما عین چاروں طرف نظر آتیں۔ سنگ مرمر کے محل، خوب صورت باغ، خوشنما فوارے، عالیشان مسجدیں، شہر قرطبہ میں ایسی تھیں، کہ جن کے سامنے فرانس اور جرمن کے شاہی محل صیقل کے برابر تھے۔ محلات شاہی میں صرف ایک جھاڑا ایسا تھا جس میں ٹھارہ سوچا شمعیں روشن ہوتی تھیں، امیر عبدالرحمن سوم نے

ایک باغ بنایا تھا جس میں ایک ایسا مکان تھا جو بارہ سو ستون پر قائم تھا۔ امیر عبدالرحمن سوم نے ہنر کو بہت ترقی دی، چین سے کارگر بلائے، جو کہ ریشم اور سوئی کام مسلمانوں کو سکھاتے تھے، اور ہر ایک قسم کے صنایع و ہاں موجود تھے۔ ریشم اور حریر کے کارخانے اتنی کثرت سے تھے، کہ صرف قزلبغ میں ایک لاکھ تیس ہزار اُس کے بنانے والے تھے۔ المیریا کے ریشمی کپڑے اور قالین آج تک یورپ میں مشہور ہیں۔ مٹی کے برتنوں پر سونے اور چاندی کی چکدار رنگ میچور کا کے جزیرہ میں مسلمان ہی کیا کرتے تھے۔ جس پر سے ٹالی کے گلی برتنوں کا نام مہچو لیا گیا ہے۔ المیریا میں شیخے اور پتل اور لوہے کے ظروف ایسے خوشنما بنتے تھے جو سجاد و مکانوں کی آرائش میں کام میں لائے جاتے تھے، اب تک اُن تھے ان کے نازک نقش و نگار کے عمدہ نمونے موجود ہیں، جن پر قزلبغ کے دربار کے بڑے بڑے مسلمان امیروں کے نام کندہ ہیں۔ زیور وں کی تیاری میں نہایت نزاکت اور خوبصورتی اور ہنر برتا جاتا تھا، جیرونا کے کیتھڈریل کی قربان گاہ میں اب تک ایک دلچسپ یادگار اُس زمانہ کا محفوظ ہے، یعنی چاندی کا ایک ڈبہ جس پر سنہرا کام اور موتی جڑے ہوئے ہیں اور خلیفہ حکم کے حق میں دعائیں کندہ کی ہوئی ہیں۔ اسی محقق مورخ نے جن چیزوں کا تفصیلی بیان کیا ہے اُن سب کی چھو کر اُس کا یہ فقرہ میں آپ کو سناتا ہوں، وہ لکھتا ہے کہ ”صنعت و حرفت، علم و ہنر اور عموماً سب قسم کی سویلیزیشن“ میں قزلبغ مسلمانوں کے زمانہ میں دنیا کا سب سے زیادہ چکدار ستارہ تھا“ ایک دوسرا مورخ لکھتا ہے، کہ علوم و فنون کی ترقی نے وٹاں مذہبی تعصب کو اتنا دبا دیا تھا کہ اس زمانہ میں اُس پر یقین نہیں ہو سکتا۔ عیسائی یہودی اور مسلمان ایک ہی قسم کے خیالات رکھتے، ایک ہی زبان بولتے، ایک ہی راگ گاتے، ایک ہی طرح کے شعر و سخن سے اپنا دل خوش کرتے۔ ایسی دوستی، ایسا اتحاد اور علم کا ایسا شوق ہرگز نہ ہوتا، اگر مسلمانوں کے مذہبی تعصب کی نسبت جو عام رائے دی جاتی ہے وہ صحیح ہوتی۔ آئین کے شمال میں مسلمانوں کے علوم و فنون کی شہرت پھیلی ہوئی تھی، اور وٹاں شوق سے عربی کتابیں پڑھتی تھیں۔ فرانس، جرمن اور انگلستان کے لوگوں کو مسلمانوں ہی کے سبب سے سواری کا شوق پیدا ہوا، اور وہ عرب کے گھوڑوں کے شائق ہوئے، اس زمانہ سے پہلے یورپ میں گھوڑوں کا استعمال کم تھا، ان ملکوں میں شکار کا شوق بھی مسلمانوں سے پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں یورپ کے عالم و شاعر جب تک چند عرصہ کے لئے قزلبغ کی سیر نہ کر لیتے، وہ مسلم البتوت عالم یا شاعر نہ ٹھہرتے۔ ڈاکٹر جانسن کو اگرچہ انگریزی میں اول لغت لکھنے کی عزت حاصل ہے، مگر مسلمان مصنف لغت کے بہت پہلے اُس سے ہو چکے ہیں۔ اُن میں ایک لغت کی کتاب ساٹھ جلدوں میں ہے، جس کے ہر لفظ کے معنی اور محاورے، علما اور شعرا کے فقرات اور اشعار کی سند سے بیان کئے گئے ہیں۔ عربی میں پوری سلاکو چنڈیا بھی موجود تھی۔ غنیم کے حسن بن عبداللہ نے ہنسٹارنگل ڈکشنری آف سائنس بھی لکھی تھی۔ مسلمان شاعری کے موجدین انہوں نے نظم کی بحریں ایجاد کیں، اُس کا اثر عیسائیوں پر بھی ہوا، جو کہ اُس زمانہ کے پادریوں کے

مذہبی اشعار کے بجائے دلچسپ غزلیں اور عشقیہ کہانیاں نظم میں لکھنے لگے، فرانس اور اطالی اور سسلی میں شاعری کا شوق مسلمانوں ہی کے سبک پیدا ہوا، مورخین تو مسلمانوں میں اس کثرت سے ہوئے ہیں جس کثرت سے کہ شاعر، تاریخ کے ساتھ ہی اسٹیٹسکس (Statistics) بھی جاری تھی، مردم رسی اور آمدنی و خرچ کی تفصیل، تجارت کا حال اور اسی قسم کی چیزیں کتابوں میں درج کی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں مسافر و سیاح بھی بہت نظر آتے تھے، جو کہ صرف علم کی ترقی دینے کے لئے مختلف ملکوں کی سیر کرتے پھرتے تھے، اور ان ملکوں کے حالات قلمبند کرتے، اور سفر نامے لکھتے، اکثر یورپ سے لوگ آتے، اور مسلمانی مدرسوں سے علم حاصل کرتے۔ جرٹ نامی ایک شخص قبطہ سے علوم سیکھ کر جب اپنے ملک کو واپس گیا تو اس نے فرانس کے کنارے ایک اپنا مدرسہ قائم کیا۔ ڈار صاحب لکھتے ہیں کہ آج کل کے یورپ کے عالم اور حکیم اور ہیئت دان چاہتے ہیں کہ اپنی بزرگی قائم کریں، اور اصلی عالموں کو اندھیرے میں چھوڑ دیں، لیکن ان کی کوشش انصاف کی نظر میں بالکل حقیر ہوتی ہے۔ یورپ کے عیسائی عالموں کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ان کے علم کی بنیاد ان عربوں نے ڈالی، جن کو وہ وحشی اور نامذہب کہتے ہیں، عربوں نے اپنا نام آسمان کے ستاروں پر لکھ رکھا ہے، یعنی آج کل کے ہیئت دانوں کو اکثر عربی نام استعمال کرنا پڑتے ہیں، انہوں نے علوم ہی کی طرف توجہ نہیں کی، بلکہ وہ روزمرہ کی زندگی کے بکار آمد چیزوں پر بھی بہت کچھ منوج ہوئے، انہوں نے زراعت کو بہت بڑھایا، زراعت کے لئے قانون مقرر کئے، جانوروں کی نسل بڑھائی، گھوڑوں اور بھیلوں میں ترقی دینے کے ذریعے پیدا کئے، چاول، نشیکر، روٹی کا استعمال انہیں لوگوں نے ہم کو سکھایا، بالغ کے میوے ان کا استعمال، ان کی ترقی، ہم نے انہیں لوگوں سے سیکھی، دیشم کی پیدائش، اور اس سے عمدہ کپڑا بنانے کی ترکیب ہم کو پیشتر معلوم ہی نہ تھی، انہیں کی بدولت ہم کو اس کا علم ہوا، انہوں نے بارود اور بندوق بھی ایجاد کی، جو بندوق وہ استعمال کرتے تھے، ڈھلے ہوئے لوہے کی ہوتی تھی۔ تجارت کی ان کے زمانہ میں اتنی ترقی تھی کہ صرف عبدالرحمن سوم کے خزانہ میں ۵۰ لاکھ درم کی آمد تھی، اتنی بڑی رقم اس زمانہ میں کبھی زراعت یا رعایا سے نظم و وصول نہ ہو سکتی تھی، صرف اسپین کی آمدنی اس زمانہ کے تمام عیسائی بادشاہوں کی آمدنی سے زیادہ تھی۔ آج کل کے مصنف، عربوں کی تعلیم میں بہت غلطیاں نکالتے ہیں، لیکن ان کو خیال رکھنا چاہئے، کہ کسی قوم کی علمی ترقی اس زمانہ کی حالات اور دیگر قوموں کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے، کیا عجیب ہے، کہ ہمارے بعد ہمارے علوم میں جن کو ہم کامل سمجھتے ہیں، ہزاروں غلطیاں نکلیں۔ جس طرح کہ اہرام مصر کے دیکھنے سے اس زمانہ کے ہنر کا اندازہ مل سکتا ہے، ہم عربوں کی کتابوں اور عمارات کے دیکھنے سے ان کے علوم و فنون اور صنعت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ انفسوس ہے کہ ان کی تصنیفیں اور ان کی بنائی ہوئی چیزیں بہت کم موجود ہیں، کچھ تو زمانہ کے انقلاب نے ان کو ضائع کر دیا اور زیادہ حصہ ان کا عیسائیوں کی حسد کے نذر ہو گیا۔ جس کو

انہوں نے اس لئے ضائع کر دیا، کہ آئندہ ان کی حشریہ حالت ظاہر نہ ہو، اس پر بھی اب تک انہی تصنیفات ان کی موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل علوم کے دقیق اور نازک مسائل کی تحقیق اور حل کرنے میں انہوں نے اپنی دماغی قوت ظاہر کی ہے۔

مسلمانوں کے ملکی انتظام کی نسبت یہ بات دیکھنے کے لائق ہے کہ انہوں نے اسپین کو کس حالت میں پایا تھا اور اٹھ سو برس کی سلطنت اور حکومت کے بعد، انہوں نے اسے کس حالت میں چھوڑا۔ ایک یورپین مورخ لکھتا ہے، جس وقت مسلمان اسپین کی سرحد پر پہنچے، اسپین کی حالت یہ تھی، کہ ایک بڑی ہوئی ریاست نے کل زمین کو اپنے آپ میں تقسیم کر لیا تھا، بڑی بڑی جاگیروں کی کاشت مصیبت زدہ اور مظلوم غلاموں کے ذریعے سے ہوتی تھی، شہر کے باشندے تمام تباہ ہو گئے تھے جب عربی حکومت وہاں قائم ہوئی، اور انتظام ہوا، تو وہاں کی مغلوب قوموں نے اپنے آپ کو پہلے کی نسبت کچھ بڑی حالت میں نہ پایا، بلکہ چند روز میں ان پر ثابت ہو گیا، کہ سلطنت کی تبدیلی نے ان کو فائدہ ہی پہنچایا، ان کو اپنے ہی قانون جاری کرنے، اور بوجوں کے رکھنے کی اجازت دی گئی، انہیں قوم کے حاکم ان کے مصالح کے انتظام کے لئے مقرر ہوئے، شہر کے باشندوں کو بجائے اس کے کہ ریاست کے خرچ کا بار اٹھائیں، ایک خفیف سا محصول فی آدمی دینا پڑا۔ سب قدیم زمینداروں اور شہر کے رہنے والوں کا قبضہ اپنی اپنی ملکیتوں پر قائم رہا۔ بیشک گرجے اور ان لوگوں کی زمینیں ضبط کر لی گئیں جو شمال کی پہاڑیوں کی طرف بھاگ گئے تھے، مگر ان زمینوں کے متعلق جو غلام تھے، وہ وہیں کاشتکاروں کی حیثیت سے ان زمینوں پر قابض کر دیئے گئے، اور ان کے نئے مالک ان سے پیداوار کا صرف ایک معین حصہ جو ایک ثلث سے تین خست تک ہوتا تھا لینے رہے، ان کو وہ حقوق حق عطا ہوئے، جو درحقیقت ان کو اپنے گاتھک بادشاہوں کے زمانہ میں بھی حاصل نہ تھے، وہ حق انتقال اراضی کا تھا، کہ بہن، بیٹ، بہن، کرنے کا اختیار ان کو پورا دیا گیا۔ مذہبی تعصبات کی مانند یہی تکلیفات کی کبھی انہیں کسی قسم کی شکایت نہ تھی۔ بجائے اس کے کہ ان پر ظلم کیا جاتا یا وہ زبردستی مسلمان بنائے جاتے، جیسا کہ گاتھوں نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا، عربوں نے اپنی مفتوح رعایا کے مذہب کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ اور مذہبی عبادت، اور مذہبی رسوم کے ادا کرنے میں پوری آزادی بخشی۔ ان انتظاموں سے مفتوح قوم ادیبانہ رعایا کو پورا اطمینان ہوا، اور علانیہ وہ اقرا کرنے لگے، کہ وہ ان مسلمانوں کی حکومت کو فرمائے یا گاتھ کی حکومت سے بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس مسلمان حکومت سے گوسب کو فائدہ پہنچا، مگر درحقیقت اس تیسرے سلطنت سے ان غلاموں کے نصیب کھل گئے، جن کے ساتھ گاتھ اور دوسرے لوگ ظالمانہ برتاؤ کرتے تھے۔ اسپین میں جب کہ غلامی عیسائیوں کے قبضہ سے نکل کر مسلمانوں کے قبضہ میں منتقل ہوئی، تو سب غلام چھوٹے چھوٹے کاشتکار بن گئے، اور جو غلام عیسائیوں کے قبضہ میں تھے، ان کی آزادی کا آسان راستہ کھل گیا، یعنی کلمہ پڑھنا ان کو تمام غلاموں کی تکلیفوں سے نجات

دنیا، اور شل اور فاتح قوم مسلمانوں کے اُن کو آزاد کر دیتا۔ اسپین کے سارے زریز صوبے، مسلمانوں کی حکومت مسلمانوں کی محنت، مسلمانوں کے ہنر سے ایسے سرسبز اور شاداب ہو گئے کہ سارا ملک گویا باغ نظر آتا تھا۔

۱۷ اُس وقت کے مسلمانوں کی یہ تقصیری اور تذبذب اور انصاف اور فیاضی کا اندازہ اُس حالت سے ہو سکتا ہے جو کہ اسپین کے مسلمانوں کی حکومت سے نکل جانے کے بعد عیسائی گورنٹ اور عیسائیوں کے انتظام سے ہوئی جب پندرہویں صدی میں عیسائی مسلمانوں پر غالب آئے، اور مسلمانوں کی حکومت اُن سے باقی رہی، عیسائیوں نے جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ کیا اور اُن کی حکومت میں لے کر جو ملک حال ہوا وہ جگہ پر ٹیڑھی فیلڈ پریشن کی جگہ سے نقل کر کے اس آپ کو سنا ہوں۔ وہ موعظ کہتا ہے کہ ”اسپین کے آخری مسلمان بادشاہ کی تباہی کے بعد پندرہویں صدی کے اسپین کے لوگوں نے مغتورہ قوم یعنی مسلمانوں کو عیسائی کرنا شروع کیا، ان کا خیال یہ تھا کہ صرف اسی ترکیب سے اس ملک کی تباہی بچ سکتی ہے اور جب اُن مسلمانوں پر پادریوں کا اثر بہت کم ہوا، یا ایسے لوگ جنہوں نے عیسائی ہونے سے انکار کیا، تو پھر بجائے ترغیب دینے کے ظلم اور دیگر ذرائع سے کام لیا گیا اس ظلم کو انہوں نے انتہا کے درجہ تک پہنچایا، کسی کو دھکیلا، کسی کو حسانی سزا دی، کسی کو زندہ جلایا، شہداء کے بدن کو ایک ایک مسلمان نظر نہ آتا تھا۔ سب بے روستی عیسائی کئے گئے، ۱۵۷۱ء میں فلپ دوم نے ایک خاص احکام شاہی (اُن لوگوں پر جو پیشتر مسلمان تھے اور اب عیسائی کئے گئے تھے جن کو آئندہ نورنگو کے نام سے منسوب کرینگے جاری کیا، جس میں نورنگو لوگوں کو ایسی حرکت اور کام کرنے سے ممانعت کی گئی جس سے اپنے قدیم مذہب کی (دین اسلام) بالکل یاد آئے، اُن کو یکم دیا کہ اسپین کی زبان سیکھیں عربی کتابیں دیکھیں۔ اور عدول حکمی پر بھی سخت نرا فایم کی، اس کو اس درجہ تک پہنچایا کہ یہ جیسے اپنی مادری زبان یعنی عربی، میں اپنے گھر میں بھی گفتگو کرنے سے منع کئے گئے، اُن کے رسوم و کھیل کو بھی بند کر دئے گئے۔ نہ اُن کو اجازت اُن تماشاؤں خورد کے دیکھنے کی تھی اور نہ وہ پوشاک پہننے کی اجازت تھی جو اُن کے ابا و اجداد پہنتے چلاتے تھے، حتیٰ کہ عورتیں بھی نقاب ڈالنے سے منوع کی گئیں، حمام میں اُن کا نہانا بھی بند کیا گیا، چنانچہ جتنے حمام خانگی مکانوں میں بھی موجود تھے وہ سب تھوڑا لے گئے۔ ان سب ظلموں کا نتیجہ یہ ہوا کہ نا امید ہو کر نورنگو یعنی مسلمانوں نے آخری کوشش یہ کی کہ شہداء میں تمام باغی ہو گئے اگرچہ اُن کی تعداد اس قدر کم تھی اور غیر ملک میں اُن کا باغی ہو جانے کا جو کچھ نتیجہ ہوتا شخص سمجھ سکتا ہے، لیکن باپوسی نے اُن میں زور پیدا کیا، اور شہداء نہ دبائے نہ جاسکے، اس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی تعداد کم ہو گئی، لیکن چھوٹی چھوٹی بغاوتیں ادھر ادھر ہوتی رہیں، جمالت سے ہمیشہ دوسرے پیدا ہوتے ہیں اور جھوٹی باتوں پر اتفاق پیدا ہوتا ہے اسپین میں جمالت پھیلی ہوئی تھی اُس نے ان جیسے مظالموں کی پوری تباہی کر دی یعنی اسپین کے جہاز کا بیڑا اریٹا جو ملک الجزائر پر گھمستان پر پھیلا گیا تھا شہداء میں تباہ ہو گیا، اور اریٹا کی چڑھائی میں ناکامی ہوئی اُس وقت پادریوں نے بادشاہ اسپین یعنی فلپ دوم کے پاس یہ درخواست بھیجی کہ جب تک اس ملک میں یہ عقیدہ عیسائی یعنی نورنگو لوگ رہیں گے تب تک ملک میں امن اور چین نہ ہوگا اور نہ حکومت اور سلطنت کو برکت ہوگی

کے ساتھ ذکر نہیں کر سکتے۔ بغداد و مصر وغیرہ کی ابتدائی ترقی کو چھوڑ کر اگر دیکھا جاوے، تو کسی دوسری سلطنت میں مسلمانوں کی ایسی ترقی نہ ہوئی جو اسپین میں ہوئی تھی، اور اگر کسی حصہ ملک میں کسی بادشاہ کی وجہ سے کچھ ترقی ہوئی بھی، وہ تو محدود اور مخصوص تھی، اُس کا اثر سپک پر عیا کر چاہئے نہ ہوا، اور نہ بڑے لمبے زمانہ تک وہ ترقی قائم رہی۔ ہندوستان ہی کو لیجئے، سلطان محمود غزنوی کے زمانہ سے محمد شاہ کے وقت تک ہم مسلمانوں نے کیا کیا، باوجودیکہ پہلے سے اس ملک کی حالت ہمارے آنے سے بہت درست ہو گئی، اور تہذیب و شایستگی نے ترقی پائی، مگر سوائے اکبر کے زمانہ کے جس کا اثر شاہ جہاں کے وقت تک رہا، علمی یا تمدنی ترقی، جس کا ہم غرض کے ساتھ ذکر کر سکیں، پائی نہیں جاتی، اور جو کچھ ترقی اُس زمانہ میں ہوئی تھی، اُس کا بھی اندرونی فسادات اور مذہبی تعصبات کی وجہ سے جلد خاتمہ ہو گیا، جس کی بدولت نہ ہماری سلطنت رہی نہ تہذیب، البتہ ہم مسلمان اپنی قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے کے لئے زندہ اور ابھی موجود ہیں۔

اور ۱۶۹۱ء میں اس شہر کی آبادی پہلے سے چوتھائی رہ گئی۔ گو کہ کئی قویں سولہویں صدی میں یکجا سے زیادہ ادنیٰ کپڑے بنانے کے کارخانے تھے ۱۶۹۱ء میں صرف ۱۳ رہ گئے یہ شہر جو پہلے شہیم کے کام کے لئے مشہور تھا اب وہاں سے وہ ہنر بالکل جاتا رہا اور چالیس ہزار آدمی جو ان کارخانوں سے پرورش پاتے تھے اب دیوان اور تباہ حال ہو گئے۔ کیٹسل اور دوسرے شہروں میں ملے ہذا القیاس ہی حال تھا، خزانہ سرکاری خالی ہو گیا، نظم اور زبردستی سے رعایا کے پاس جو مال تھے وہ لوٹے جانے لگے، چنانچہ ان کے بچھڑنے کا سبب حتیٰ کہ گھر کی چھت بھی سرکار نے بیچ لی، جس سے ملک چھوڑ کر غایا بھاگ گئی۔ کاخ شکاری موقوف ہو گئی، انھوں آدمی فائدہ سے مر گئے اکثر شہروں میں قلت سے زیادہ گھر برباد اور دیوان ہو گئے، ان مصیبتوں کے سبب کئی ذاتی جو شاد و رقت بھی گھٹ گئی ہریجنس پھر دنگی کے آثار نظر آنے لگے، چنانچہ ۱۷۰۱ء میں جہازوں کا چھوٹا سا بیڑا تیار کرنے کی تجویز ہوئی مگر ملاح وغیرہ کی کافی تعداد نہ ہونے سے ناکامیابی ہوئی، دریا کے نقشیات جو بنائے گئے تھے وہ سب گم ہو گئے، اور اسپین کے جہاز رانوں کی جہالت اس درجہ پر پہنچی تھی کہ ان پر کوئی شخص بھروسہ نہ رکھتا تھا۔ اکثر فوج اپنے اپنے بھجنڈے چھوڑ کر بھاگ گئی اور جو لوگ ناداری اور ایمانداری سے رہ گئے تھے، ان کے پسنے کو کپڑا بنانے تھا تنخواہ تو کچھ ملتی ہی نہ تھی اور فتنہ پور ہے تھے، سرحدی شہروں میں حفاظت کے لئے لشکر نہ تھا، قلعے سمارا اور اندام کی حالت میں تھے، غزفوں میں سامان نہ رہا۔ اور جہاز بنانے کا ہنر بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ لوگ چھوٹے چھوٹے گروہ میں ہو کر خانگی مکانوں کو لوٹتے تھے اور دن کے وقت خون ہوتے تھے، بادشاہ کے خانگی خزانہ میں اس قدر تنگی تھی کہ وہ اپنے خانگی نوکرانوں کی تنخواہ بھی نہیں دے سکتے تھے اور ان کا روزانہ خرچ چلنا بھی دشوار تھا کوئی روزانہ ساز جاتا تھا کہ روٹی کے واسطے رستہ پر لڑائی نہ ہوتی ہو۔ اسپین سے مسلمانوں کے کالے جانے کے بعد کل ملک کی یہی حالت ہو گئی اور جب تک کہ دوسرے ملکوں سے مدد نہ آئی انتظام نہ ہو سکا۔

تاریخ ہندوستان

صاحبو! مسلمانوں کی ملکی اور تمدنی اور علمی حالتیں جو آپ نے نہیں، اُن سے تو کتنی رُئ کی ترقی اور زوال یا تنزل کی کیفیت معلوم ہوئی۔ مگر بڑی بات خود اور توجہ کے لائق ہے، وہ اُن اسباب کا دریافت کرنا ہے، جنہوں نے یہ نتیجہ پیدا کئے، غالباً بہت لوگ ترقی اور تنزل کے اسباب کا نام اُن کو متنبہ ہوئے، اس لئے کہ دنیاوی حوادث اور قومی یا شخصی عزت و ذلت، اقبال و ادبار کے نتیجے سمجھے جاتے ہیں جس کی تقدیر میں جیسا لکھ گیا، ویسا ہی اُس کا ظہور میں آنا لازمی ہے۔ جَعَفَ الْقَلَمُ عَمَّا هُوَ كَاتِبٌ کیسا سبب، اور کہاں کی علت، یہ سچ ہے، مگر صاحبو! دنیا کا نام ہم کو بتلایا گیا ہے، عالم اسباب، اور جس خدا نے اسے بنایا، اور جو ان حوادث کا پیدا کرنے والا ہے، وہ مانا گیا ہے سبب الاسباب، اُس نے ایک مستحکم قانون بنا دیا ہے کہ ہر سبب کے لئے کوئی نتیجہ اور ہر نتیجہ کے لئے کوئی سبب ہو۔ جیسا کہ ہم اس قانون کا عمل تمام موجودات اور محسوسات میں دیکھتے ہیں، مثلاً بیج سے درخت، اور خرت سے پھول، پھول سے پھل ہوا کرتا ہے، نہ ان میں بے ترتیبی ہوتی ہے، نہ قدرت کا قانون ٹوٹتا ہے، ہر چیز ایک عین قاعدے اور منظم سلسلے سے ہوتی ہے اسی طرح حوادث روزگار اور انسانی افعال میں بھی قدرت نے ایک ترتیب رکھی ہے، جس سے تمام حوادث گویا سبب اور نتیجے کے ایک غیر متناہی سلسلے ہوا کرتے ہیں۔ کوئی واقعہ پیدا نہیں ہوتا، جس کے اول اور واقعات نہ گزر گئے ہوں جو اُس کے ہونے کے باعث ہوئے ہوں۔ بلاشبہ قومی عزت اور قومی ذلت خدا کے اختیار میں ہے، اور ہمارا سچا اعتقاد ہے اس پر کہ تُو فِي الْمُلْكِ مِنْ نَشَاءٍ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِنْ نَشَاءٍ وَتُعْزِّزُ مَنْ نَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ نَشَاءُ، جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذیل کرتا ہے۔ مگر اُسی کے ساتھ یہ بھی اعتقاد ہے، کہ وہی خدا جو ملک دیتا ہے اور ملک چھین لیتا ہے، وہی خدا جو عزت بخشتا اور ذلت دیتا ہے، کبھی بے سبب کے ایسا نہیں کرتا خود ہی فرماتا ہے "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا" وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَرْنَاهَا تَدْمِيرًا "ہم عذاب نہیں دیتے جب تک پیغمبر نہیں بھیجتے اور جب ہم چاہتے ہیں کہ کسی گاؤں کو تباہ کریں تو دو تین آدمی کو حکم دیتے ہیں وہ فسق کرتے ہیں اُس گاؤں پر حکم پورا ہو جاتا ہے اور ہم اُس کو بالکل تباہ کر دیتے ہیں، سبب اور نتیجے کا سلسلہ ہم نے کسی دہریہ یا مجید سیالی یا ظالم سے نہیں سیکھا۔ بلکہ ہم کو ہمارے سچے خدا نے اپنے سچے کلام میں اور ہمارے سچے رسول نے اپنے سچے حکم اور سچے قول اور سچے عمل سے اس سلسلہ کو سکھایا ہے، آخرت جو نہ ہوتا ہے مقصود اسلام ہے، وہ خود کیا ہے سلسلہ انہیں اسباب اور نتائج کا "الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" کیا ہے جن اسی مومنوں کا جس کی جتنی بڑی شرح چاہو کرو، اور جتنے لمبے حاشئے چاہو لکھو۔ امید اور خوف جو دو بڑے لفظ قرآن مجید میں متعال کئے گئے ہیں وہ کیا ہیں؟ سبب اور سبب کے سلسلہ کے ثبوت۔ کیا خوب فرمایا ہے اَمَّا خَالِي رَحْمَةُ اللَّهِ

امید کی تعریف میں ”الرَّجَاءُ هُوَ مِمَّا يَنْتَظَرُ الْقَلْبُ لَا يَنْتَظَرُ مَا هُوَ مُحْتَمِلٌ عِنْدَهُ - وَلَكِنَّ ذَلِكَ الْمَحْبُوبُ الْمَتَوَقَّعُ لَا يَكُونُ وَأَنْ يَكُونَ لَهُ سَبَبٌ فَإِنْ كَانَ يَنْتَظَرُهُ لَا حَاجِلَ حُصُولِ أَكْثَرِ أَسْبَابِهِ فَإِسْمُ الرَّجَاءِ عَلَيْهِ صَادِقٌ - وَإِنْ كَانَ ذَلِكَ يَنْتَظَرًا مَعَ - اخْتِذَا مِاسْبَابِهِ وَاضْطَرَّابَهَا فَإِسْمُ الْغُرُودِ وَالْحُمُوقِ عَلَيْهِ أَصْدَقُ مِنْ إِسْمِ الرَّجَاءِ - یعنی امید خوش ہونا ہے دل کا اُس چیز کے انتظار میں جو وہ چاہتا ہے لیکن اس متوقع چیز کے ملنے کے اگر اسباب ہوتا ہیں تو اُس کے ملنے کے انتظار پر امید کا نام صادق ہے، لیکن بغیر نہ ہونے اُن اسباب کے اُس کے انتظار پر حماقت اور غور کا لفظ زیادہ صادق ہے بہ نسبت امید کے - مثلاً اگر کسی کا شکار نے اول ایسی زمین منتخب کی ہو جو کاشت کے لائق ہو، اور اُس میں عمدہ اور تازہ بیج ڈالا ہو، اور پانی سینچے اور غور و گھاس کے نکالنے اور دان پڑنے کے بعد چڑیوں وغیرہ سے اُس کی حفاظت کی ہو، اور تائیدی فصل کے ہر وقت اُس کی خبر رکھتا رہا ہو، ان تمام اسباب کے جمع کرنے اور ان مابج کے ملے کرنے پر جو اُس کے اختیاری تھے اگر وہ امید کرے اپنے کھیت سے پیداوار پانے کی، اور بھروسہ کرے خدا پر آفات ارضی و سماوی سے، جو اُس کے اختیاری نہیں ہیں، بچانیکا - تو بلاشبہ اُس کے انتظار کو ہم امید کہیں گے مگر جو کوئی زمین ہی نہ تلاش کرے، یا زمین اُس کی نہج ہو، جو کھیتی کے قابل نہ ہو، یا وہ بیج نہ ڈالے یا بڑھلا بیج ڈالے، یا بیج ڈالے جو کا اور امید کرے گیہوں کی، یا بیج ڈالنے کے بعد اُس کی خبر گیری نہ کرے، تو ایسے شخص کے انتظار کو حماقت اور غور کہنا چاہئے نہ امید شعر تَرْجُوُ الْجَنَّةَ وَلَكَمْ تَسْلُكُ مَسَالِكُهَا اِنَّ السَّيْفِيْنَ لَا تَجْرِي عَلَيِ الْيُسُ

تو نجات کی امید رکھتا ہے اور اُس کے رستوں پر چلا ہی نہیں - کشتی کہیں خشکی پر چلتی ہے -

یہ عمدہ تعریف امید کی اور یہ عمدہ مثال امید کی اور یہ فرق جو امید اور حماقت کی باہم امام صاحب نے بیان فرمایا ہے، گو یا سبب اور نتیجے کے سلسلہ کی تصویر ہے، اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ صرف محسوسات اور موجودات عالم میں ہی پایا نہیں جاتا، بلکہ تمام حوادث دنیاوی اسی سلسلہ کے پابند ہیں - اس لئے ہم کو قومی عروج اور زوال کے تاریخی واقعات ہی سے مطلع ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ اُس کے اسباب دریافت کرنے لازم ہیں - مگر افسوس ہے کہ ہماری تاریخیں اس سے خالی، اور ہمارے مورخین اس سے غافل رہے - اگرچہ پان سو برس ہوئے کہ ہمارے یہاں کے ایک عالم علامہ ابن غلدوں نے منجم اور باتوں کے تاریخ لکھنے والے کو محتاج اس بات کا قرار دیا ہے کہ ہر واقعہ کا سبب اور ہر حادثہ کی علت بتا دے سکتا ہو، مگر افسوس ہے کہ یہ خیال کتاب ہی میں تھا، اور اُس پر ہمارے مورخین نے لحاظ نہ کیا - اس واسطے ہم کو اپنی ترقی اور منزل کے اسباب تلاش کرنے میں اپنی طبیعت یا غیر قوموں کی رائے سے مدد لینی ہوگی

اور اسی واسطے وہ اسباب جو قومی منزل کے میں بنیان کرتا ہوں، بعد اختلافی مسائل کے رہینگے۔

اسباب منزل

صاحبو! جب ہم دنیا کی اور قوموں اور اپنی قوم پر نظر کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ جو سلسلہ قدرت نے قوموں کی ترقی اور منزل کا بنا رکھا ہے اُسی کے موافق ہمارا بھی عروج اور زوال ہوا۔ قوموں کا بڑھاؤ اور گھٹاؤ ہمیشہ ایک ہی طور پر ہوا کرتا ہے، محنت اور جفاکشی سلطنت کے آگے آگے چلتی ہے غدار اور انقلابی اطمینان اور عیش کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ جفاکش سپاہی سلطنت اور دولت حاصل کرتے ہیں۔ سلطنت اور دولت اول مذہب اور تربیت یافتہ بناتی، پھر عیش اور نفسانی لذتوں میں اُن کو مبتلا کرتی ہے۔ جس سے بادشاہ اور امیر آرام طلب، شست، کاہل، اور بزدل ہو کر سلطنت، امارت، حکومت، سب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ سلطنت اور دولت کے ساتھ علم و تہذیب یا تمدن و شائستگی، بلکہ قوم بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ ہم مسلمانوں کا بھی حال ہوا کہ اول تو اُن میں ایک جوش پیدا ہوا، جس سے وہ شرق سے غرب تک پھیل گئے، دنیا کے بڑے بڑے حصوں پر قابض ہوئے، بڑی وسیع سلطنت قائم کی علوم و فنون سیکھے، تہذیب و شائستگی پھیلائی، عیش و عشرت اور ثروت کی کوئی حد نہ رہی، پھر آرام طلب ہوئے، دماغوں میں سستی، مزاجوں میں کاہلی آئی، جس سے خلافت اور سلطنت کھو بیٹھے، علم و تہذیب بے نقیب ہو گئے، یعنی جن درجوں کو طے کرتے ہوئے اوپر چڑھے تھے، اُنہیں زینوں سے اُترتے ہوئے نیچے آ گئے۔

ہماری ترقی کا پہلا زینہ تھا مذہبی جوش، اور عربی حیثیت، اور عربی عصیت۔ تین صدیوں میں ہم نے ان زینوں کو طے کیا تھا اور تیسری میں ہم اپنے عروج، اور ترقی کے انتہا درجے کو پہنچ گئے۔ وہاں ٹھیک ہم ٹھیر گئے، اور ملکی اور مذہبی ترقیاں ختم ہو گئیں۔ بقول ایک یورپین مؤرخ کے وہ خیالات اور اسباب جو اسلام اور اُن ملکی قوتوں اور خاندانوں کے مخصوص تھے، جن میں اسلام کی ابتدا ہوئی تھی، امتداد زمانہ کی وجہ سے یا تو ضعیف اور کمزور ہو گئے، یا اُن معمولی اغراض میں دفن ہو گئے جن پر عموماً انسانی رویہ اور رفتار کا مدار ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، مسلمان دنیاوی تربیت اور عیش کے مطیع ہوتے گئے اور ہمارا سپاہی سے آرام طلب امیر بن گئے اور سلطنت کے کاروبار میں دوسرے لوگ خیل، اور رفتہ رفتہ خلیفہ اور خلافت دونوں پر حاوی ہو گئے۔ عرب کی وہ خاص اور متاثر جگہ حیثیت، جس کی بدولت وہ شاہی خاندانوں کے حکم اور مذہب اسلام کے پھیلائے کے بڑے ذریعہ تھے، تیسری صدی میں غارت ہو گئے۔ دنیا کی نعمتوں اور دولت کی لذت سے اُن کا ابتدائی جوش تو جا ہی چکا تھا، اُس پر جب غلامانہ لوگوں یعنی عرب کو رشک اور بے اعتنائی کی نظر سے دیکھنے لگے، اور اُن کا عمدہ فوجی انتظام مٹ گیا، اور عربوں کی

قوت ٹوٹ گئی، اور وہ اپنی بددیوبت پر رجوع کر گئے اور غیر قوم کے اُجرتی سپاہی، اور غلام اُن کے جانشین ہو گئے، اُس وقت سے اُن کا نشان پوپٹکل جماعت میں خود مختار قوت کی حیثیت سے کیس پایا نہیں جاتا۔ عربوں کی قوت ٹوٹ جانے سے خلافت کو بڑا صدمہ پہنچا، اور آخر کار قریشی خاندانوں کی خلافت کا خاتمہ ہی ہو گیا۔ تھوڑے دنوں میں نہ عربی فوج رہی نہ عربی حکومت، نہ عربی خلافت کا پتہ رہا۔ نہ عباسیوں کا نشان، ❖

اگرچہ چند صدیوں تک اُس کے بعد مسلمان سلطنت قائم رہی، اور بعض حصوں میں نئی قوموں نے کبھی کبھی اسلام پوش بھی ظاہر کیا، مگر وہ ایسا محدود اور مختلف رہا، کہ اُس کا اسلامی حکومت پر تمام دنیا کے یکساں اثر نہ پڑا، اور نہ کوئی ایک مسلسل زمانہ جھگڑے اور انقلاب، اندرونی فساد، خوزیروں اور سازشوں سے پاک، کسی اسلامی سلطنت پر گزرنے پایا ان ہی سبب سے تنزل ہوا جس کی تفصیل یہ ہے ❖

پہلا سبب

خلافت کا جمہوری شے شخصی سلطنت ہو جانا اور خلفاء اسلامین کا خود مختار ہونا اور شریعت کے احکام کا پابند نہ ہونا

شروع میں اسلامی خلافت کی صورت جمہوری سلطنت کی سی ہے۔ مسلمانوں کی جماعت گویا ایک ایسا گروہ تھا جن کے مقاصد اور اغراض ایک تھے، اور جن کی حریت اور آزادی کا کوئی مزاحم نہ تھا نہ خلیفہ شریعت کے احکام کا تابع، مسلمانوں کے حقوق کا محافظ، اور اُن کی آزادی کا حامی، اور بیت المال کا امین ہوتا، شرعی احکام اُس پر ویسے ہی نافذ ہو سکتے جیسے کہ عام رعایا پر، حقوق العباد کی حفاظت اُس پر ویسے ہی واجب ہوتی جیسے کہ حقوق اللہ کی کیسی صحیح تعریف کی ہے خلافت کی جس نے کی ہے کہ *هِيَ الرِّيَاسَةُ الْعَامَّةُ فِي الشَّيْءِ لَا قَامَةَ الدِّينِ بِأَحْيَاءِ الْعُلَمَاءِ الدِّينِيَّةِ وَقَامَةَ أَرْكَانِ الْإِسْلَامِ وَالْقِيَامُ بِالْأَمْرِ وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهِ مِنْ تَرْتِيبِ الْحَيُوشِ وَالْقَرَضِ لِلْقَاتِلَةِ وَإِعْطَاءِ ثَمَرِهِ مِنَ الْغَنَاءِ وَالْقِيَامُ بِالْقَضَاءِ وَقَامَةُ الْحُدُودِ وَدَفْعُ الْمَظَالِمِ وَالْأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ نِيَابَةً عَنِ الشَّيْءِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ* خلافت ریاست عامہ کو کہتے ہیں جس کا مقصد دین کو قائم کرنا ہو، علوم دینیہ کے زندہ کرنے سے اور ارکان اسلام کے قائم کرنے سے اور جہاد کی مستعدی سے اور جو کچھ اُس سے متعلق ہے مثلاً فوجوں کی ترتیب۔ لڑنے والوں کے روئینے، غنیمت کی تقسیم۔ عدالت کا قیام۔ حدود

کی اقامت۔ جرائم کا روکنا۔ اچھی باتوں کا حکم۔ بُری باتوں کی روک۔ اور یہ سب باتیں بحیثیت جانشین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں۔ مگر خلافت کی یہ تعریف صرف خلفائے راشدین پر صادق رہی جنہوں نے نہ کبھی خود بخوبی کا خیال کیا، نہ کبھی معصومیت اور خطا سے پاک ہونے کا دعویٰ کیا۔ وہ بلاشبہ ان فرائض کے پابند اور ان مشاغل کے جامع تھے، پڑھو وہ خطبہ حضرت صدیق اکبر کا جو جنہوں نے اپنی خلافت کی شروع فرمایا تھا، کہ اے مسلمانو! میں جیسا ہی آدمی ہوں جیسے کہ تم ہو، نہ خطاؤں سے معصوم ہوں نہ غلطیوں سے محفوظ، نہ تم سب سے بہتر اور اچھا ہوں اس لئے تم میری خبر داری رکھنا، جو باتیں میری خدا اور اس کے رسول کے احکام کے موافق ہوں ان میں میری تبعیت کرنا، اور جس میں مجھے لغزش کرنے ہوئے دیکھنا مجھے سنبھالنا۔ افسوس کہ تیس برس سے زیادہ یہ اسلامی خلافت نہ چلی نہ خلفائے راشدین کے بعد خلیفہ ہوئے وہ ان فرائض کے پابند رہے مگر عضو خدا کی پیشین گوئی صادق آئی، اور خلافت خود مختار سلطنت اور ڈیپٹیکل گورنمنٹ ہو گئی، سلاطین اور بادشاہ آزاد ہو گئے اور لذات نفسانی میں منہمک، نہ ان کو تو دم کا ڈر نہ شرع کا، نہ انہوں نے مذہب کا خیال رکھا، نہ انصاف کا۔ ایک خلیفہ تھے حضرت علیؑ کہ اپنے بھائی عقیل کو ایک درم حصہ معینہ سے زیادہ نہ دیا اور ایک خلیفہ وہ تھے کہ رکاب سے پانوں نکلنے کے اول ایک صوبہ کی آمدنی خوشامد کرنے والوں کو بخش دی۔ ایک خلیفہ تھے حضرت عمرؓ کہ جب ان کے پاس روم کا سفیر آیا تو زمین پر فرش تک نہ تھا۔ اور ایک تھے خلیفہ مقتدر راشد جن کی جلو میں سات ہزار خواجہ سرا، اور جن کی ڈیڑھ سو پر سات ہزار دربان، اور جن کے محل میں ۳۰ ہزار شجر زلفیت کے پردے پڑے تھے۔ اگر خلافت کا ابتدائی اصول قائم رہتا اور خود مختاری سلطنت کی بنیاد اسلام میں جلد نہ پڑ جاتی، تو یقیناً مسلمان گورنمنٹ دنیا کی مذہب زین گورنمنٹوں میں سب سے بڑی، اور بہت دنوں تک دنیا میں قائم رہتی۔ خود مختاری نے اسلامی سلطنت کو بہت نقصان پہنچایا اور بادشاہوں کی مطلق العنانی نے سلطنت کو بہت جلد تباہ کیا۔

تیس برس کا زمانہ چھوڑ کر اگر اسلامی خلافت اور اسلامی سلطنت پر مرقعہ نظر ڈالیں، تو اس خود مختار سلطنت کی مختلف حالتیں اور متناقض کیفیتیں نظر آئیں گی، کسی خلیفہ کو آپ نہایت سفاک، بے رحم، اور ظالم پائینگے، جو مقتولوں کی لاشوں پر خوجان نعمت بچھائے ہوئے خوشی سے کھانا کھا رہا ہے، مظلوم، بیگناہ یتیموں اور بیواؤں کی آہ و زاری کی دردناک صداؤں میں خوش الحان مطربوں کے گانے سن رہے ہیں، کسی ظل اللہ کو آپ دیکھیں گے، کہ مہرکت کی کرسی پر بیٹھا ہوا انصاف کر رہا ہے، عدل کی ترازو ہاتھ میں ہے، بیواؤں اور یتیموں کی فریاد کے لئے دروازہ کھلا ہوا ہے، عمری صولت، فاروقی ہیبت پیرے سے عیاں ہے، مفتی دفاضی، علما و فقہا کا پانا ناگرم ہے، بکری اور شیر گویا ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں، پھر کبھی زمانہ میں آپ سلطان وقت کو علم و ہنر کا شائق پائینگے، جس کی توجہ سے علم و کمال کی شعاعیں ملک میں پھیل رہی ہیں، علوم و فنون کے چرچے ہو رہے ہیں، مدرسے اور کالج بس رہے ہیں، فضلا

اور کھنکھاتے ہیں، اہل فن اور اہل کمال سے دربار بھرا ہوا ہے، بادشاہ اُن کے حلقہ میں بیٹھا ہوا علمی ساجشے
 کر رہا ہے۔ اُسی کے بعد آپ ایسا جاہل بادشاہ دیکھیں گے جس کے تعصب اور جہالت سے ملک تاریک
 ہو رہا ہے، مدرسے ویران، خانقاہیں اُجڑی پڑی ہیں، علما ذلیل، اہل کمال خوار ہیں۔ غرض کہ کسی ایک
 صدی اور کسی ایک ملک اور کسی ایک خاندان میں بھی کیساں حالت بُری یا اچھی آپ کو نظر نہ آئیگی، بلکہ ملک کی حالت
 بادشاہ وقت کے خیال کے مطابق ہمیشہ بدلتی ہوئی دکھائی دے گی۔ حقیقت میں خود مختاری اور کسی ہمول کی
 پابندی نہ ہونے سے اسلامی زمین ہزاروں رنگ بدلتی رہی، اور مختلف اور متناقض حالتیں بادشاہوں
 کی طبیعت اور مزاج اور حالت کے مطابق پیدا ہوتی رہیں۔ اگر سلطان وقت حبش و عشرت پر جھکا،
 مُنہنی و مطرب کا ہجوم ہوا، ساقی و ندیم جمع ہوئے، مراحمی و جام کے دُور چلنے لگے، قتل و بربادی کی حدیں
 ربط و حدود کے ترانے، آسمان تک پہنچے، اندر کا اکھاڑہ زمین پر اتر آیا، غزوہ کی ہشت کا نقشہ آنکھوں کے
 سامنے پیم گیا۔ اگر خلیفہ اشدنی الارض اشدنی طبیعت قوت و اور پرہیزگاری پر جھکی، قاضی کے فتوے
 محتسب کے دُترے جاری ہوئے، ملحد و ارب پر، بیدین صلیب پر چڑھے، خُم ٹوٹے، ساقی شہر بدر ہوئے،
 ربط و ارنخوں جلانے لگے، بیتخانے ویران، خرابات خراب ہوئے، زاہدوں کی بن آئی، میخان کی ٹٹی خراب
 ہوئی، غرض کہ جس طرف بادشاہ کی طبیعت آئی، سارے ملک میں اُسی کا اثر نظر آنے لگا، اور جدھر بادشاہ
 کا خیال آیا اُسی طرف ساری رعایا جھک پڑی۔ اِنْ خَيْرًا فَخَيْرُ دَانَ شَكَرًا فَخَيْرُ اس خود مختاری اور
 سلطنت کی تغیر و رجالت نے ہمیشہ اسلامی زمین پر اِذَا نَزَلَ لَكَ الْاَرْضُ نَزَلَ لَهَا اُكْا کی کیفیت طاری کی
 اور سلطنت کو کبھی کسی مستحکم اصول پر قائم نہ ہونے دیا، نہ کسی ایک حالت کو کبھی قیام ہوا، اُس پر جانشینی کے مسئلہ
 اصول کے نہ ہونے اور جانشینوں کے باہمی جھگڑوں اور دربار کی سازشوں اور فرقہ بندیوں نے کبھی دنیا کو
 چین نہ لینے دیا، نہ کسی ملک یا کسی زمانہ میں ایک پوری صدی اطمینان سے گزرنے پائی۔ نہ کوئی قوت
 بادشاہوں کی خود مختاری کی روکنے والی باقی رہی نہ اُن کی مصلوبی اور اسراف کی مزاحمت اور روک کسی
 قانون یا قاعدہ سے ہو سکی۔ خود مختاری نے اُن کو دولت و لذتوں کا شہید، اور اسراف اور مصلوبی نے عیاشی
 پر آمادہ کیا، اور دولت و ثروت نے اُن کو دنیاوی لذتوں کا شہید، اور اسراف اور مصلوبی نے عیاشی
 اور آرام طلبی کا عادی کر دیا، کیا خوب کہا ہے ایک مورخ نے مسلمان بادشاہوں کی نسبت، کہ بجائے اس کے
 کہ بلند چوٹوں سے روحانی خوشیاں حاصل کرتے، اور اعلیٰ درجے کے خیالات پیدا کرتے، وہ اپنے شوقِ اُو
 فرصت کو بہرہ و نشان و شوکت اور عیش و عشرت میں صرف کرنے لگے۔ بہادروں اور شجاعوں کے انعام عورتوں
 اور خواجہ سراؤں کو ملنے لگے۔ سپاہیوں اور بہادروں کے عوض شاہی لشکر میں حور و غلمان کی بھرتی ہونے لگی
 ایسے خلیفوں اور ایسے بادشاہوں کی رعایا کا مزاج بھی میا ہی ہو گیا، اُن کا مذہبی جوش و دلی دلولہ و دُ
 کی افراط سے سرد پڑ گیا، اور برخلاف اپنے بزرگوں کی نعت کے کاموں میں دولت کو خواہاں، اور علم کی طلب

بلکہ ہر گھمبیس ہونے لگا، اور نہایت قوت سے وہ اب تک موجود ہے۔ پھر یہ اختلاف اسی پر نہ ٹھہرا، بلکہ دوسری شکل اور دوسرے رنگ میں جلوہ دکھانے لگا، چھوٹی چھوٹی باتوں اور خفیف سے خفیف مسئلوں میں اتنا اختلاف ہو گیا، کہ سلامی جماعت کی صورت ہی کہیں نظر نہیں آتی، اور اختلاف اور جھگڑے کے سوائے اتحاد کا نام و نشان تک کہیں پایا نہیں جاتا۔ ساری اسلامی زمین میں کہیں مجموعی قوت کا سایہ تک نظر نہیں پڑتا۔ چونکہ دین ہی نے اتفاق پیدا کیا تھا، اور یہی وہ بڑی نعمت تھی جو خدا نے ہم کو دی تھی اور یہی وہ بڑا احسان ہے جو انہدائیں اُس نے ہم پر کیا تھا، جس کو اتنا خود فرماتا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ نَّكُوْنُ مِنَ الْاُمَمِ الَّتِيْ لَا رَحْمَۃَ لَهَا وَاَنَّ نَّكُوْنُ مِنَ الْاُمَمِ الَّتِيْ لَا رَحْمَۃَ لَهَا وَاَنَّ نَّكُوْنُ مِنَ الْاُمَمِ الَّتِيْ لَا رَحْمَۃَ لَهَا۔ اُن لوگوں کے دلوں میں الفت دی۔ اگر تو ساری زمین کی چیزیں خچ کرتا تو بھی اُن کے دلوں میں الفت نہ پیدا کر سکتا۔ لیکن یہ الفت اُن میں خدا نے پیدا کی۔ آخر دین ہی کے اختلاف سے اُس کی بنیاد شروع ہوئی، اور یہ نعمت خدا نے ہم سے لے لی، اور ہم کو اختلاف اور جھگڑوں اور فسادوں میں اُل کر دینا کا رکھا نہ دین کا۔ ملکوں کو جانے دیجئے، سلطنتوں کا ذکر نہ کیجئے، صوبوں اور شہروں پر خاک ڈالئے، کوئی دُعا نہ پڑھو، بلکہ دو دل مسلمانوں کے ایسے بنا دیجئے کہ اُن میں اتفاق ہو، اور ایک دوسرے سے عداوت اور دشمنی یا رشک و حسد نہ رکھتا ہو، اور کیا مذہبی اور کیا دنیاوی، کیا خانگی، کیا خیالی باتوں سے اس کینٹ نفاق اور اختلاف کے سبب دو مسلمان ایک دوسرے کے مخالف نظر نہ آتے ہوں۔ گین جو ایک بڑا نامی مورخ ہے۔ وہ اپنی تاریخ میں اول زمانہ کے مسلمانوں کی بے نظیر حب الوطنی کی شہادت میں لکھتا ہے کہ جب عقبہ بن ابی معیط اور افریقہ والوں کی بغاوت عام کی وجہ سے بجا وقتیانوس کے ساحل سے مراجعت کرنے پر مجبور ہوئے تو اُس وقت اُن کے لشکر میں ایک مسلمان قیدی تھا، جس نے خود بخوبی کی جگہ پر مقرر ہونے کی درخواست کی تھی، اور نہایت جانی دشمن اُس کا تھا، باغیوں نے اُس کی ناراضی اور انتقام لینے کے اعتماد پر اُس سے سازش کرنی چاہی، اُس نے نہایت حقارت سے اُن کی درخواستوں کو نامنظور کیا اور اُن کی سازش اور نشانہ کا افشا کر دیا۔ سردار نے عین خطرہ کے وقت میں جب کہ اُس کو اپنی جان کا خوف تھا اُس کی بیڑیاں کاٹ ڈالیں اور چلے جانے کا مشورہ دیا۔ اُس نے اپنے رقیب کے جھنڈے تلے مرنا پسند کیا، اور دوستوں کی طرح بغل گیر ہو کر اُس کے ساتھ شہادت کا خواں بنوا، دونوں نے اپنی تلواریں میان سے نکالیں، اور اُس وقت تک ڈٹ کر لڑتے رہے کہ اپنے ہولتوں کے آخری مقتولوں پر ایک دوسرے کے پہلو میں ہرگز گرے کیا حال کے زمانہ میں کوئی مثال اس کی بتا سکیگا، درحقیقت وہ تھے اعضاء یکدیگر، اور ہم لوگ ہیں اعضاء یکدیگر، اپنی ذاتی خواہشوں، ذاتی دعوؤں کے سبب قوم کا خیال، نہ اسلام کی پرواہ۔ کون ہی آفت مسلمانوں پر آتی ہے، جس کی بنا تو مسلمانوں کے نفاق پر نہیں ہوتی، کون سی ذلت مسلمانوں کو نصیب نہیں ہوتی ہے جس کا اصلی سبب خود مسلمانوں کا اختلاف نہیں ہوتا۔ دہلی کی سلطنت اسی صدی میں کس نے غارت کی

ناورشاہ کو پانی پت سے کس نے لوٹنے نہ دیا، اور کون ملی میں لایا، اور قتل عام کرایا، ترکوں کو اسی آخری جنگ میں روسیوں کے ہاتھ سے شکست کس نے دلائی، سلیمان کو عثمان پاشا سے کس نے نہ ملنے دیا، حال میں جو کوشش مسلمانوں کی قومی ترقی کے لئے کی جاتی ہے، کون اُسے چلنے نہیں دیتا، اور کون اُس کی بربادی کے سامان جمع کر رہا ہے، اس کے گزے زمانہ میں جو کوششیں ہمارا بہادر مسر سید کرتا ہے کون اُس کا ناکامیابی چاہتا ہے، کون اُس کی راہ میں روڑے ڈالتا ہے۔ خود اُسی کے بھائی مسلمان کس لئے وہ یہ کرتے ہیں، صرف اس اختلاف کی وجہ سے جس کا بیج عموماً مسلمانوں کے دلوں میں پڑا ہوا ہے۔ **قَالَ اللَّهُ يَخْلَكُ لَكُمُ الْيَوْمَ الْفَيْمَةَ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ**۔ پس خدا اُن چیزوں کا قیامت میں فیصلہ کرے گا جن میں اُن کو اختلاف ہے۔

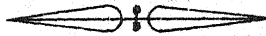
تیسرا سبب

مسلمانوں میں قومی آزادی کا نہ ہونا

یہ بات بھی کچھ کم مسلمانوں کی تباہی کی نہیں ہوئی، کہ کبھی مسلمان ایک قوم نہ ہوئے اور متحدہ انداز میں فرقوں نے بھی اپنے آپ کو متحدہ اور آزاد قوم نہ بنایا، و حقیقت ”نیشن“ کے لفظ کا اطلاق کسی ملک کے کسی فرقہ کے مسلمانوں پر کبھی ہوا نہ ہو سکتا ہے، انہوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کیا، اپنی قومی آزادی کی کڑی وہ متحد نہ ہوئے، جس سے خود مختار بادشاہوں کی غیر محدود اختیارات کی روک تھام ہوتی اور مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے ایک دوسرے کے شریک ہوتے۔

ذرا تاریخ ملاحظہ فرمائے کہ جتنی اندرونی جنگیں ہوئیں، کوئی بھی حقوق اور آزادی کے حاصل کرنے کیلئے ہوئیں جتنی لڑائیاں ہوئیں، وہ یا تو مذہبی تھیں، یا کسی ذاتی یا قومی عداوت کی وجہ سے پیدا ہوتی تھیں، مگر ہر حالت میں نتیجہ واحد تھا، کہ کسی ایک خاندان کے لئے حکومت حاصل کرنے کی غرض سے جنگ ہوئی، اور فاتح نے مفتوح کے ساتھ ہمیشہ انتقام میں ہی رہتا اور ظالمانہ کیا، جو خود اُس کے ساتھ مفتوح نے ایک زمانہ میں کیا تھا۔ کسی صورت میں بھی کہیں یہ بات پائی نہیں جاتی کہ قوم نے ایک لڑ ہو کر اپنے حقوق اور اپنی آزادیوں کے حاصل کرنے میں فکر کی ہو۔ اسلامی تاریخ میں کوئی بھی واقعہ اس قسم کا نہیں ہے، مگر کیا کہ رننیمڈ (Runnymede) کے چھوٹے جزیرے پر انگلستان میں پیش آیا تھا، آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ انگلستان کی رعایا نے اپنے امر کی سرپرستی میں اسی مقام پر بادشاہ سے اپنی آزادیوں کے زمان پر بحرِ کسخط لئے تھے۔

قومی اتحاد جیسا کہ ہم آج کل یورپ میں دیکھتے ہیں ہم لوگوں میں کبھی قائم نہ ہوا۔ ایک قبیلہ، ایک خاندان چند روز تک حکمران رہا۔ اور اُس کے بعد دوسرا اُس کا جانشین ہو گیا۔ اسپین اور انگلستان دونوں کی دوسو برس پیشہ جو حالت تھی، اُس کا مقابلہ کیجئے۔ اسپین کو پہلے افریقہ کے لوگوں نے فتح کیا، اور پھر عربوں نے، ان میں اکثریت سے نو مسلم خاصہ ہاں کے رہنے والے شریک ہو گئے، اسی طرح افریقہ سے بھی لوگ وقتہ فوقتہ وہاں آتے رہے اور بستے گئے، مگر ان سب لوگوں میں آپس میں رقابتیں اور نفاق اور مذہبی عداوتیں قائم رہیں۔ انگلستان میں بھی دوسو برس پیشہ یہی حالت تھی، کہ خاصہ ہاں کے باشندے جزیرہ اور سیکشنس آپس میں لڑتے پھرتے رہتے تھے، اس کے بعد نارمنڈی سے ولیم نے اس جزیرہ پر فوج کشی کر کے فتح کی۔ مکر و صدیاں بھی نہ گزریں تھیں کہ یہ سب لوگ غلط ملط ہو کر ایک ایسی قوم بن گئی، جن کے اغراض ایک، خواہشیں ایک، اور آزادی کے خیالات ایک، تھے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کی وجہ سے انگلستان کی ترجیح غیبت قائم ہے۔ وہاں کی رعایا ایک نسل ہے؛ مگر غالباً اس سے بھی بہتر مثال مختلف افراد کے اتفاق کی امریکہ میں ملتی ہے۔ مختلف ملکوں سے جلا وطن ہو کر لوگ یہاں آباد ہوئے ہیں۔ انگریز (English)، آئرش (Irish)، اسکاچ (Scotch)، جرمن (German)، ڈچ (Dutch)، سویس (Swiss)، اسٹریٹین (Austrian)، فرینچ (French)، سویڈ (Swede)، اور ڈین (Dane) ہر قوم کے شخص امریکہ میں موجود ہیں، اور اب بھی جانتے ہیں، مگر حالت یہ ہے، کہ امریکہ کی ہوا لگی نہیں، کہ خیال میں ان جو ہشتوں میں امریکہ کے باشندے بن گئے، گو مذہب مختلف ہوں، مگر یہ قومی خیال واحد ہے۔ آپس میں مختلف پولیٹیکل فرقوں میں گو کتنی ہی تفریق کیوں نہ ہو، مگر جہاں کسی دوسرے ملک کا نام آیا کہ سب کو سب مل کر ایک قوم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ جوش ہے جو ہماری قوم کے سینہ میں کبھی موجزن نہیں ہوا۔ مسلمانوں کی مختلف قوموں میں اگر کوئی خیال عام ہے تو وہ مذہب ہے۔ اگرچہ یہ سب مسلمان ہیں، اور باوجودیکہ ہزار برس گزر چکے مگر قومیت کے لحاظ سے عرب عرب ہیں، ترک ترک ہیں، تاتاری تاتاری ہیں، ایرانی ایرانی، افغان افغان، اور مغل مغل، ایک کے دوسرے کے ساتھ کچھ ہمدردی نہیں۔



چوتھا سبب

تعلیم اور تہذیب کی ترقی کا سلسلہ برابری نہ ہونا

باجوہ اس بے نظیر اور قابل تعریف ترقی کے، جو کہ ہم مسلمانوں نے علم و تہذیب میں کی، ہماری ترقی مہمانی اور محدود تھی؛ نہ ان کا سلسلہ برابری رہا، نہ وہ ایسے عام ہوئے، کہ نہ زمانہ اور ہر ملک اور ہر فرقہ کے مسلمان اس سے مستفید ہوتے؛ اور نہ وہ ترقی اس درجہ تک پہنچی کہ جس سے پیچھے ہٹنا اسلامی گروہ کو ناممکن ہوتا؛ اور وہ علمی خیال، اور طبیعت کی آزادی، اور وہ دل کا جوش، اور وہ عام انسانی ہمدردی، اور وہ تحقیق کا شوق، جو کہ خاص خاص زمانے، خاص خاص ملک، خاص خاص فرقوں، میں پیدا ہوا تھا، قومی طاقت قومی حوصلہ، ہو جاتا، اور جس کے اوٹام اور وسوسے، جو بھیل بھول جہالت کے زہریلے دخت کی ہیں، اسلام کی زمین میں پیدا نہ ہوتے، اور اس کے وہ برے نتیجے جو اسلام کو اٹھانا پڑے، نہ اٹھانے پڑتے۔ بلکہ بجائے اس کے ہماری علمی اور تمدنی ترقی محدود رہی۔ اگر کسی زمانہ، کسی ملک، کسی فرقہ، میں کسی خلیفہ، یا بادشاہ کی توجہ اور حمایت سے فلسفہ اور حکمت کا چرچا ہوا، حکیم اور فلسفی جمع ہونے لگے، کتابوں کی تصنیف اور علوم کی ترقی شروع ہوئی، لوگوں کے دلوں میں شوق پیدا ہوا، دماغی قوتوں کو تحریک ہوئی۔ چند دن نہ گزرنے پائے کہ اس کا جانشین دوسرے خیال کا سلطنت کے تخت پر بیٹھا، اور حضرات فقہا اس پر غالب آئے، اور اس کے خیالات بدل گئے۔ پھر کیا تھا وہ ساری کوششیں بند، ترقی سدد۔ اچھے سے اچھے زمانہ کو اشاعت علوم کے لیچھے اور تاریخ کے صفحے لٹنے شروع کیجئے، ایک صفحہ میں نظر آئیگا کہ موعز اسکندریہ اور ایران سے صد ہاؤنٹ کتابوں سے بھرے ہوئے چلو آ رہے ہیں، ترجمہ ہو رہا ہے، فلسفہ اور حکمت کا بازار گرم ہے، مدرسے بن رہے ہیں، طلبہ کا ہجوم ہے، انبیاء، طبیعیات، منطق، ہیئت، ہندسہ کی تعلیم جاری ہے، فلسفہ کی کتابوں سے کتب خانے بھرے ہوئے ہیں، حکمت کی کتابیں سنہری الماریوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ دوسرا ورق لوٹتے ہی یہاں دفتر لٹا نظر آئیگا، دوسرا ہی نقشہ دکھائی دئیگا، کوئی مفتی یا ملا صاحب میر پرستھے ہوئے فلسفہ کی حرمت کا وعظ کر رہے ہیں، تحصیل حکمت پر کفر و الحاد کے فتوے جاری ہیں، کتابیں جل رہی ہیں، فلسفہ کا دفتر لٹ رہا ہے، منطق، طبیعیات کی نایاب کتابوں کے ورق پھٹ پھٹ کر ہو میں اڑ رہے ہیں، فلسفی شہر سے نکالے جا رہے ہیں، میگنٹ پر کوڑے پڑ رہے ہیں۔ غرض کہ اب اتنی آزادی ملی، کہ دماغی ترقیوں کا سلسلہ مسلسل کسی لمبے زمانہ تک جاری رہا ہو، اور ادغام اور وسوسوں کی سخت اور مضبوط پٹریاں علم و تہذیب کے پائوں میں نہ ڈالی گئی ہوں۔

اگرچہ اس پر بھی کوششیں عالمی دماغ مسلمان جو علم کا ذائقہ کچھ بچھے تھے، علم کے قایم رکھنے میں کوشش کرتے رہے، اور ان غلطیوں کے درست کرنے میں، جو علوم و فنون کی ترقی کی مانع ہوئیں، نہایت سعی رہے، مگر زیادہ تر وہ ہم کو عقل پر، اور دوسرے کو علم پر، اور فقہاء کو علم پر غلبہ رکھا، اور فلسفہ اور حکمت کی ترقی نہ ہونے پائی۔ اس وقت میرے ہاتھ میں ایک رسالہ ہے جس میں ان کتابوں کے نام لکھے ہیں جو پچھلے زمانہ میں عرب کے مدرسوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بغداد، نیشاپور اور دمشق وغیرہ بڑے بڑے اسلامی کالجوں اور مدرسوں میں کس قسم کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ مجھے خصوصاً سے کتنا یاد ہے کہ ان درسی کتابوں میں فلسفہ کی کتابوں کے نام بہت ہی کم ہیں۔ بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں ۳۹ کتابوں کے نام ہیں، ان میں صرف دو کتابیں منطق اور معقولات کی ہیں، یہ بھی معمولی، نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں ۱۲ کتابوں کے نام ہیں جو سب مذہبی ہیں۔ اسی طرح، ۳ مختلف مدارس میں ۴۶ کتابوں کی تفصیل ہے جس میں ایک کتاب بھی حقیقت وہ نہیں ہے، جس فلسفہ اور حکمت کا اطلاق ہوا اور ایک دوسری بڑی ضخیم کتاب لندن کی چھپی ہوئی اس وقت میرے پاس موجود ہے، جس کے ہم صفحہ ہیں اور اس میں ان کتابوں کی فہرست ہے جو کہ اب مصر کے ۸ مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، اس میں ۹۱۰۰۰ کتابوں کے نام ہیں، ان میں صرف ۷۷ کتابیں منطق وغیرہ کی ہیں اور وہ بھی سب معمولی، جن کو ہمارے قطبی اور صدرہ کے پڑھنے والے بھی جانتے ہیں، کوئی کتاب عزیز الوجود ان میں وہ نہیں ہے جو نامی مسلمان فلسفیوں نے تصنیف کی تھیں اور جن میں سے بعض بعض اب جرمن لندن اور پیرس کے کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ ہمارے یہاں کی یونیورسٹیوں میں حکمت و فلسفہ کی تعلیم علم طو پر ہوئی اور نہ عموماً لوگوں کو ان علوم کا شوق تھا۔ ان کی تعلیم خانگی طور پر ہوا کرتی اور خاص خاص خاندان یا خاص خاص اشخاص ان علوم سے واقف ہوتے۔ ان علوم کی عام ترقی کچھ تو مذہبی عقاید میں خلل آنے کے خیال سے نہ ہونے پائی اور کچھ ان کے غیر مفید ہونے سے۔ اس لئے کہ جو علوم ایسے تھے کہ جن کا اثر مذہبی عقاید پر نہیں پڑتا تھا اور جو مفید بھی تھے وہ تمام سماجی ملکوں میں پھیل گئے جیسے کہ طب یا اس کے بعد حساب اور ہندسہ جو علوم مشکل اور دقیق اور نظری تھے، جو ذہن اور عقل کی جلا، اور صفائی کے لئے تو بہت مفید تھے مگر ان سے کچھ فائدہ نہ تھا، ان کی عام ترقی نہ ہوئی۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں اشاعت علوم کے سامان ہی ایسے جمع نہ تھے، کہ علوم کی عام ترقی کی امید ہو سکتی اصل اشاعت علوم کی تو چھاپے سے ہوئی، یہ سچ ہے کہ ایسی اشاعت جیسے کہ اس زمانہ میں ہے، ہونی ناممکن تھی، مگر وہ علوم جن کا مسلمانوں کو شوق تھا یا ضرورت، اسی زمانہ میں خوب پھیل گئے اور بڑی بڑی مبسوط اور موٹی کتابیں فقہ وغیرہ کی ہر کتاب خانہ بلکہ ہر معزز مسلمان کے گھر میں نظر آنے لگیں۔ اگر علوم حکمیہ کا بھی ویسا ہی شوق ہوتا، تو بلاشبہ اسی نسبت سے ان علوم کی بھی اشاعت ہوتی۔ ان علوم کی عام ترقی نہ پانے کے لئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مشکل اور دقیق علوم

کسی زمانہ میں ایسے عام نہیں ہوئے کہ اُس کا اثر عوام پر پہنچے، ہمیشہ خاص فرقوں اور خاص خاندانوں بلکہ خاص شخصوں سے مخصوص رہتے ہیں، یہ خود غلطی ہے کہ اُس کی ترقی کی، نقد یا تائید یا طلب کی طرح امید کی جائے یہ سچ ہے مگر اول تو جس نسبت سے دوسرے دقیق اور شکل مذہبی علوم پھیلے، اُس نسبت سے ان علوم کی اشاعت نہ ہوئی، دوسرے ہر زمانہ اور ہر وقت میں اُس کی روک ہوئی رہی، اور ہمیشہ چار ہڈا کہ سَبُونُ الشَّعْرِ قَائِمَةٌ عَلَى خَطْمِ رَهَامًا نَعْفَةً مِنْ اخْتِيَارِهَا۔ اور عام نہ ہونے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ یہ توقع کی جاتی کہ مسلمان اُس سے مستفید ہوتا، اور ہر شخص حکیم اور فلسفی ہو جاتا، مگر یہ علوم اگر روکے نہ جائے اور غیبی ہونے اور جو لوگ علوم حاصل کرنے والے تھے وہ مذہبی اور دینی علوم کی طرح اسے بھی حاصل کرتے اور اُسے اُسی نسبت سے پھیلاتے تو بلاشبہ ماضی قوتوں کی تحریک قائم رہتی، نظر بلند، دماغ عالی، خیال روشن رہتے، تحقیق کا شوق باقی رہتا، اور وہ کیڑا دوسروں کی پیروی کرنے کا جو مسلمانوں کے دماغ کو کھانے لگانے لگتا پاتا مگر جب اُس کی روک، اور شوق کے نہ ہونے سے اُس کی عام ترقی نہ ہوئی، اور ہمتوں کی پستی اور دماغوں کی صحت نے مذہبی علوم میں تقلید کا خیال پیدا کر دیا، اُس کا اثر عقلی علوم پر بھی پڑا، اور علوم حکمیہ کی تعلیم بھی تقلیدی طور پر ہونے لگی، اور جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا، رسم اور نام کے سوا، اُن علوم کی تعلیم سے جو اصلی غرض تھی فوت ہو گئی۔

آپ کچھ کئی صدیوں پر نظر ڈالئے۔ کیا آپ ایسے عالم بنا سکتے ہیں، کہ جو علوم حکمیہ کے عالم تھے، مگر انہوں نے اپنے مقتدین کی طرح کسی قسم کی ایجاد یا کوئی نئی بات دریافت کی۔ آپ کسی کا نام بنا سکتے ہیں۔ جس نے محمد بن موسیٰ کی طرح جبر و مقادیر اور علم شلث میں ترقی کی ہو، ابوعلی الحسن یا کوئی شخص ہو، اگر جس نے علم مایا و مناظر میں نہایت باریک اور دقیق تحقیقاتوں سے یورپ کے حکیموں کی سنہری نہرست میں جگہ پائی ہو، ہیبت ابدی کے مقابلہ میں آپ کسی کا نام لے سکتے ہیں جس نے نو کی رفتار کا انداز نکالا، اور اُسے دلائل سے ثابت کیا، عبدالرحمن صوفی کا نظیر بنائے جس نے سیاروں اور ستاروں کی تصویر کھینچنے میں ترقی کی ہو، ابو القاسم ساعق کون ہوا ہے جس نے تجارت کے اصول پر عمدہ کتابیں لکھی ہوں، ابو رشد اور ابن طفیل کی مانند ہونا تو ایک طرف، اُن کے نام جاننے والے، اور اُن کی تصنیفات سے فیض اُٹھانے والے کتنے ہوئے ہیں۔ لہذا انصاف کیجئے اور فرمائے کہ باوجود جاری رہنے تعلیم حکمت و فلسفہ کے، اور باوجود سیکھنے علوم معقول کے، اور باوجود کھلانے عالم علوم عقلی کے کیوں مسلمانوں سے ایجاد اور تحقیق کی قوت جاتی رہی، اور کیوں وہ اپنے بزرگوں کی طرح محقق اور موجد نہ ہوئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ تقلید کی عادت نے حکمت فلسفہ میں بھی اُن کو تحقیق کا شوق نہ دلایا، اور جو استعداد ایجاد اور نئی باتوں کی دریافت کی تھی، اُس سے کام نہ لیا، اور جس طرح دینی مسائل میں اجتہاد چھوڑ دیا، معقولات میں بھی چند باتوں کے پڑھنے اور چند مسائل کے سیکھنے اور گتے سے تنگ اور تاریک اثر میں گھومتے رہنے پر قناعت کر لی۔

هكذا اضعف العلم في القرون السابقة فكيف الظن بزمانك هذا وقد انتهى الامر الى ان مظهر الانكار سريته هدف لنسبته الجنون فالاولى ان ليشغل الانسان نفسه في بسكت يول هي اكله زمانه في علم ضعيف هو اسو آج كل كا كيا ذكر هه اور اب تو بيان تك نوبت پنهي هه كه ان كا ظاهر كرنه والا شخص جنون كي طرف منسوب كيا جاتا هه پس بهتر هه كه انسان اپنا كام كرے اور چپ ربه ۛ

پانچواں سبب

عسلط مذہبی خیالات

اس سبب کو میں مسلمانوں کے دین اور دنیا، علم و تہذیب، پولیٹیکل اور شل، غرضکہ تمام چیزوں کے زوال کا اصلی سبب سمجھتا ہوں؛ اور سبب بھی ایسا عام کہ جس سے کوئی ملک اور کوئی فرقہ نہیں بچا، اور جواب تک ہم کو اوبار اور افلاس کے تاریک غار سے ابھرنے نہیں دیتا ۛ

جب ہم دنیا کے مختلف حصوں کے مختلف فرقوں کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں، تو باوجود اختلاف کے جو ان میں پائے جاتے ہیں، ترقی نہ کرنے میں ہم سب کو متحد اور متفق پاتے ہیں، ذرا آنکھ کھول کر دنیا کے چاروں حصوں پر نظر ڈالئے، اور جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں، ان کی حالت دیکھئے، سب کو یکساں پائے گا سلطنت اور ریاست ان کے ہاتھ سے نکل گئی، اور جہاں برائے نام کچھ باقی ہے، اگر ماند شے ماند شے دیگر نئی ماند، کا نقشہ ہو رہا ہے، افلاس اور اوبار چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، دولت اور عزت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے، علوم و فنون میں دنیا کی سب قوموں سے ان کا درجہ گرا ہوا ہے، تہذیب و شائستگی میں مہذب قوموں کی فہرست سے گویا نام خارج ہو رہا ہے، زمانہ کی رفتار کے ساتھ کہیں چلتے ہوئے نظر نہیں آتے، دماغی دڈ میں دوسری قوموں کے ساتھ دکھائی نہیں دیتے، پھر یہ حالت ایسی عام ہے، کہ جہاں دیکھو اور جس حصہ کے مسلمانوں پر ڈالو کوئی اس سے خالی نہیں ملتا، عجمی ہو یا عربی، ترکی ہو یا مصری، ایرانی ہو یا ہندی۔ اس عام نتیجہ کا، جو ہم ہر جگہ یکساں پاتے ہیں، سبب بھی عام ہونا چاہئے؛ وہ سبب کیا ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی خیالات کا بگڑ جانا، پاکٹ ہب کی ان تعلیم میں جھوٹے توہمات اور رسوم اور انسانی خیالات کا مل ملا کر اصلی حالت پر نہ رہنا۔ یہ بحث اتنی بڑی اور وسیع ہے، کہ اگر آپ کا تھوڑا قیمتی وقت ذرا اس کی تفصیل سے بیان کرنے، اور آپ کو اس پر متوجہ کرانے کے لئے لوں، تو غالباً آپ معاف فرماؤ گئے، اور ذرا دل لگا کر میری بات سنیں گے ۛ

اسلامی سلطنتوں کو جانے دیجئے، اس صدی میں جو زوال مسلمانوں کا ہوا، اُسی کے اسباب میں سے سب سے بڑے سبب کی تلاش کیجئے، تو انہیں خیالات کو اصلی سبب پائیگا، بڑا زوال مسلمانوں کا انکی سلطنت کا پانا تھا، وہ جیسے کہ اس صدی میں ہوئے، ہزار برس کے گزشتہ زمانہ میں کبھی نہ ہوئے تھے، اس کا سبب صرف مذہبی غلط خیالات ہیں، ساری مسلمانی دنیا پر نظر ڈالئے اور تجار سے ٹونس تک خیال کیجئے، کوئی خطہ کوئی ناحہ مسلمانی آبادی کا ہے، جہاں علوم سے نفرت، فنون سے غفلت، نئی چیزوں کے جاری کرنے کا خوف، نئی باتوں کے سیکھنے کا ڈر نہ تھا یا اب نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا سبب کیں غفلت بھی ہو۔ مگر مسلمانوں کی چستی، تیزی اور چالاکی، جو کہ اب تک دوسری چیزوں میں پائی جاتی ہے، کیا ہمارے دل قبول کر سکتی ہے کہ صرف غفلت ہی اس کا سبب ہے؛ ہرگز نہیں، بلکہ دماغی قوتوں کا سکون اور تقلید کی قوت، اور صلت اور حرمت کی بخت، اور ملاؤں کے کفر کے فتوے اس کے اصلی سبب ہیں۔

زمانہ میں تو ایسی حیرت انگیز تبدیلی ہو گئی، کہ تلوار کے بدلے علم سلطنت کا مالک ہوا، شجاعت کی جگہ ہنر نے حکومت کو اپنے قبضہ میں کیا، انسانی قوتوں نے وہ چیزیں ایجاد کیں کہ قدرت کا حیرت انگیز متاثرہ نظر آ رہا ہے، ساری قوموں نے یورپ کے کچھ نہ کچھ اُس سے فائدہ اٹھایا، اور اس علمی دولت کا حصہ لیا، مگر مسلمان اپنی بہادری اور شجاعت پر نازاں رہے، اور زمانہ کی تبدیلی کا اندازہ نہ کر سکے، ہر نئی چیز کو حرام اور ہر نئی بات کو بدعت سمجھے، اور ملاؤں اور مفتیوں کے فتوے کے منتظر رہے۔ اور یہ خدا کے نیک بندے، دنیا کی چال سے بے خبر، زمانہ کی رفتار سے ناواقف، ہر نئی بات سے ڈرتے اور روکتے رہے۔

نہ علم کو سیکھنے دیا، نہ کسی ہنر کے جاری ہونے کے روادار ہوئے۔ ٹرکی کو دیکھئے وہ خود یورپ کا ایک ٹکڑا ہے، جہاں چاروں طرف علوم و فنون کی روشنی پھیل رہی تھی، جہاں کی چھوٹی سی چھوٹی ریاست اور وحشی سے وحشی سلطنت ترقی کر رہی تھی، اور پھر یہ زبردست اور قوی سلطنت باوجود تین پندرہ ہزار سال کے خدا و شجاعت کے روز بروز گرتی اور ڈوبتی گئی۔ یہاں تک کہ سوائے ایک پھول بلوغ کے کچھ بھلی اُس کے ہاتھ میں نہ رہا۔ روس جو سب سے زیادہ وحشی تھا وہ اُس سلطنت پر غالب آ گیا، جو ایک صدی پیشتر اُس سے ہر طرح پر زبردست اور قوی تھے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ روس نے ہر قسم کی اصلاح کی، ہر قسم کے فنون جاری کرنے میں کوشش کی، اور ٹرکی کو غلط مذہبی خیال اور علما کے فتوؤں نے کچھ کرنے نہ دیا، نئی وردی اور نئے ہتیار تک جاری نہ ہو سکے جب تک ہزاروں سپاہی اور سیکڑوں متعصب جو کہ اُس کے استعمال کو مذہب سے خلاف سمجھتے تھے۔ نہ اُسے کئے اگرشل ایک اس واقعہ کے اور چند واقعات اسی طرح کے پیش آتے اور روشن ضمیر سلطان اور عالی و باغ وزیر سلطان محمود کی پیروی کرتے اور کم سے کم روس ہی کے موافق ملکی اصلاحیں کرتے، اور علوم و فنون کو ترقی دیتے تو آج یہ روز سیاہ اُن کو کیوں نصیب ہوتا۔ اور ہم کو اُن پر مرثیہ پڑھنے کی فوج کیوں آتی۔ ٹرکی کو بھی جانے دیجئے، اپنے ملک ہندوستان کو دیکھئے،

اور اپنی قوم پر نظر کیجئے، کہ مسلمانوں کی تباہی کا روز بروز تباہ ہوتے جانے کا کیا سبب ہوا، سلطنت انگریزی میں وہ شل اور قوموں کے ہر طرح کی ترقی کر سکتے تھے، اور ان فتنوں سے جو اس سرکار کے سایہ عاطفت میں دوسری قوموں نے حاصل کیں، وہ بھی حاصل کر سکتے تھے، اُس سے محروم رہنے کا کیا سبب ہوا، پھر دہی کتا پڑ گیا کہ مذہبی غلط خیال، انگریزی پٹنسا حرام سمجھنے رہے، عیلموں کو عقاید میں خلل انداز کرتے رہے، اُن کو کاجوں اور مدرسوں میں کرکستان ہو جانے کے خوف سے جانے نہ دیا، نئے علوم و فنون کو کفر کے فتوے نے سیکھنے نہ دیا۔ کیا وہ زمانہ یاد سے جاتا رہا جب ہمارے دین کے فدائی، اور قوم کے عاشق، اُو اسلام کے شفیق، سرسید کا دل مسلمانوں کے حال پر پگھلا، اور اُن کی مصیبت اُس سے دیکھی نہ گئی، اور وہ اپنے ڈوبتے ہوئے بھائیوں کے بچانے کے لئے گھرے اور عتیق سمندر میں کود پڑا، اور مجنونا طو پر اُن کی تعلیم و تربیت کی دھن میں لگا، کس چیز نے اُس کی کوشش کو روکا، اور کس خیال نے اُس سے دست کو قوم کی نظر میں دشمن بنایا، صرف مذہبی غلط خیال نے، کیا جرم تھا اُس پاک بے گناہ سرسید کا جس کی سزائیں وہ کا فر ٹھہرا، کیا خطا کی تھی اس دل و جان کے خدا کرنے والے نے جس کے بدلے وہ قوم کی نظروں میں واجب القتل ٹھہرایا۔ یہی نہ کہ وہ اُن کی ترقی چاہتا تھا، اور جو چیزیں ترقی کی مانع تھیں اُن کو راہ سے ہٹانا چاہتا تھا، اور وہ ترقی قوم کی نظروں میں اور فقہاء کے خیالوں میں مذہب کے خلاف سمجھی جاتی تھی، اسی لئے اُس کے کفر و انحراف کے فتوے مکہ و مدینہ سے منگائے جاتے تھے، کیا میرا یہ کہنا غلط ہوگا اگر کہوں کہ بیچارے سرسید پر، اگر انگریزی حکومت نہ ہوتی، تو وہ فتوے ضرور جاری ہوتے، اور بغیر قتل کے صرف نفی بدل ایسے بڑے جرم کی سزا کبھی کافی نہ سمجھی جاتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جب تک سرسید نے اپنی خدا داد قوت، اور بے نظیر استقلال، اور لاثانی عالی و داعی، اور حیرت انگیز روشنفکری، اور سچی محبت اسلام، اور بیرو باہمدردی سے اُن غلط خیالات کی غلطی ثابت نہ کی، اور رسموں کے مضبوط بندوں کو جس میں ہم جکڑے ہوئے اور جس کو غلطی سے مذہبی بند سمجھے ہوئے تھے نہ توڑا، تعلیم اور تربیت اور معاشرت کی ترقی کے راستہ پر ہم نے قدم نہ رکھا۔ آج اس بڑے اور عظیم الشان جلسہ میں جو اتنی پاک صورتیں مسلمانوں کی دکھائی دیتی ہیں، اور جو اپنے بھائی مسلمانوں کے ساتھ بہمدردی کرنے اور اُن کی ترقی کی تدبیریں سوچنے اور اُن کی بھلائی کے راستے نکالنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کیا کبھی ہم کو نظر پڑیں کہ وہ غلط خیالات قائم رہتے، اور سرسید کے دل پر اثر کرنے والی بلکہ دل کے کپکپا دینے والی تحریروں سے قوم کی طبیعتیں بدل گئی ہوتیں۔ کیسے کیسے عالی دماغ اور روشنفکر عالم اور فاضل، ادیب اور شاعر، خوش تحریر اور خوش تقریر مسلمان یہاں جمع ہیں اور اُن کے توانی و داعی اور روشن خیالیوں سے کیسی کچھ قوم فائدہ اٹھا رہی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر سرسید نے غلط خیالات کی غلطی ثابت نہ کر دی ہوتی تو آج یہ قوتیں کچھ کام آتیں۔ میرے نزدیک تو وہ روشن خیالات جو آج قوم کے دلوں کو روشن کر رہے ہیں مانگوں ہی کے فانوس ہیں مجھ کر رہتے اور

اُن کی توراتی شعا میں دل و دماغ سے باہر ہی نہ جھٹکتے پاتیں *

غرض کہ اس سے کوئی اب انکار نہیں کر سکتا کہ مذہبی غلط خیالات ہماری ترقی کے مانع ہیں، اور انہی
 سمجھے جاتے ہیں۔ اب دیکھنا چاہئے کہ یہ خیالات اصلی مذہب کے سچے خیالات ہیں، اور اسلام نے ہم کو سکھلائی
 ہیں یا اسلام اُن سے پاک و منزہ ہے۔ میں کہتا ہوں اور پکار کر کہتا ہوں، بلکہ جو اُس سے انکار کرے اُس
 سے مباہلہ کرنے کو طیار ہوں، کہ اسلام ان خیالات سے پاک، اسلام ان لغویات سے منزہ، اسلام ان
 باتوں سے نیرا رہے۔ اور یہ نہ سمجھو کہ یہ میرا قول ہے، یہی قول ہے اُن تمام سچے اور پاک مسلمانوں کا جن
 کے دماغ خدا کے نور سے روشن تھے، یہی خیال ہے اُن اماموں اور بزرگوں کا جو کہ مقتداے اسلام اور
 پیشواے دین تھے۔ جو کہتا ہے کہ علوم عقلی علوم شرعی کے متناقض ہیں، وہ خود غلطی کرتا ہے جو سمجھتا
 ہے کہ تحقیق شرع کے خلاف ہے، وہ خود خدا کے کلام کو نہیں سمجھتا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ
 ”كَانَ مَنْ يَقْنُتُ إِنْ الْعُلُومَ الْعَقْلِيَّةَ مَنَافِعَهُ لِلْعُلُومِ الشَّرْعِيَّةِ وَإِنَّ الْجَمْعَ بَيْنَهُمَا عَزِيزٌ مُمَكِّنٌ
 هُوَ ظَنُّ حَادٍ عَنْ عَمَى نَبِيِّ عَيْنِ الْبَصِيرَةِ نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْهُ“ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ علوم
 علوم شرعی کے مخالف ہیں۔ اور یہ کہ دونوں میں جمع کرنا غیر ممکن ہے۔ لیکن یہ گمان اس لئے
 پیدا ہوا کہ اُن کی بصیرت کی آنکھیں اندھی ہیں خود بائبل منہ۔ امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔
 إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى آمَنَ بِالنَّظَرِ فَقَالَ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَكْنُوتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
 الْمِ قَوْلِهِ ذَلِكَ يَدُلُّ عَلَى وَجُوبِ النَّظَرِ وَلَا يَسْتَدِلُّونَ بِإِلَّا التَّفَكُّرَ وَذَمَّ التَّقْلِيدَ مَنْ دَعَى إِلَى
 النَّظَرِ وَلَا يَسْتَدِلُّونَ بِإِلَّا كَانِ عَلَى وَقْفِ الْقُرْآنِ دِينَ الْأَنْبِيَاءِ وَمَنْ دَعَى التَّقْلِيدَ كَانَ عَلَى خِلَافِ الْقُرْآنِ عَلَى
 وَفَاتِ دِينَ الْكُفَّارِ خَدَانِ عَوْدُهُمْ فَكُلُّهُمْ كَاذِبٌ۔ پس کہا ہے۔ کہ کیا وہ لوگ نہیں سوچتے۔ کیا وہ آسمان و
 زمین کی سلطنت کو نہیں دیکھتے۔ اور یہ سب باتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نظارہ استدلال اور فکر و اجتہاد
 اور تقلید مذموم ہے۔ پس جو شخص نظارہ استدلال کی طرف بلاتا ہے وہ قرآن اور طریقہ انبیاء کے موافق ہے
 اور جو شخص تقلید کی طرف بلاتا ہے وہ قرآن کے مخالف اور کافروں کے مذہب کے موافق ہے۔
 ابن قیم کا قول ہے کہ ”وَمَا عِنْدَ الْمُتَكَلِّمِينَ وَغَيْرِهِمْ فَهُوَ فِي الْقُرْآنِ أَحْسَنُ تَقْرِيرٍ وَأَحْسَنُ تَعْيِينًا
 جَوْجِيہً بَيِّنًا غَيْرَ مَيَّاسٍ كَتَبُوا فِيهِ قُرْآنَ مَنَ فِيهِ زِيَادَةٌ قَوِيَّةٌ وَفِيهِ وَضَاحَةٌ سَمِيحَةٌ۔ امام غزالی کی نصیحت ہے
 وَمِنْهَا أَنْ يَكُونَ اعْتِمَادُ لَفَظِي عُلُومِهِ عَلَى بَصِيرَتِهِمْ وَإِذْ رَأَوْا لِقَاءَ قُلُوبِهِمْ عَلَى الضَّعْفِ
 وَالْكَثْبِ وَلَا عَلَى التَّقْلِيدِ مَا كَلِمَةٌ مِنْ غَيْرِهِ۔ اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ علوم میں اُس کا
 اعتماد اپنی سمجھ اور ادراک پر ہو یعنی دل کی صفائی پر ہو نہ صحیفوں اور کتابوں پر اور نہ اُن باتوں کی تقلید پر
 جن کو وہ غیروں سے سنتا ہے۔

ان غلط خیالات نے ہم کو ترقی سے باز نہیں رکھا، بلکہ ہمارے پاک اور سچے ادیب و مبلغ مذہب کے بھی جو

دنیاوی ترقیوں کا بھی ایسا ہی ترغیب دینے والا ہے جیسا کہ روحانی خوشیوں کا تعلیم کرنے والا، بدنام کر دیا ہے؛ اور ہمارے مذہب کے مخالفوں کو اعتراض کرنے اور اُس پر ہنسنے کا موقع دیا ہے، چنانچہ ایک متعصب عیسائی کا قول ہے کہ عیسائیت اُس بڑی سے بڑی خوشی کی، جو قادرِ مطلق نے انسان کو دی ہے صرف موافق اور مطابق ہی نہیں ہے، بلکہ اُس کو ترقی دینے والی ہے، اور برخلاف اُس کے اسلام اُس کو خراب کرنے والا اور ذلت میں ڈالنے والا ہے۔ سرولیم میجرن سے آپ سب لوگ واقف ہیں اسی غلطی میں پڑنے کے سبب سے اسلام ہی کو مسلمانوں کے زوال کا باعث قرار دیتے اور یوں کہتے ہیں کہ ”اسلام میں جو قرآن کے سخت بندوں میں جکڑا ہوا ہے عیسائی مذہب کی طرح زمانہ اور موقع کے مختلف حالات کے لحاظ سے تغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا، اور دنیوی معاملات میں پیشوائی اور رہنمائی کرنا درکنار، اُس میں قابلیت ہی نہ تھی کہ سوسائٹی کی رفتار اور قوم کے عروج کا ہم قدم رہ سکے، کیسا جھوٹا ہے یہ قول جہاں تک نفسِ اسلام سے متعلق ہے، اور کیسا سچا ہے، جہاں تک مسلمانوں کے غلط خیالات اور خلافِ اسلام حالات سے متعلق ہے۔ تعجب ہے کہ باوجود قرآن پڑھے ہونے اور اُس کے معنی سمجھنے کے سرولیم نے ہمارے اعمال اور ہمارے غلط خیالات کے بُرے نتیجوں کو مذہبِ اسلام سے منسوب کیا، اور اس طور پر اسلام پر اعتراض کرتے وقت عیسائیوں کے اُن انحال کو بھول گئے جن کے سبب سے ایک ہزار برس تک یورپ میں تاریکی چھا رہی تھی، اور عیسائیت نے پوپ اور مذہبی لوگوں کی مذہبی ہدایت اور مذہبی حکم اور مذہبی خیال سے علم و تہذیب، انصاف، اخلاق، اور ہر قسم کی روحانی اور دماغی ترقی اور انسان کی آزادی اور خوشی کو روک دیا تھا۔ میرے دوسرے لکچر میں ان خرابیوں کا تفصیلی بیان ہے اُسے سنئے اور انصاف کیجئے کہ خراب سے خراب اور نہایت محدود زمانے میں بھی کبھی اسلام نے یعنی مسلمانوں کے اعمال نے دنیا کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا، جتنا کہ عیسائیت نے ایک ماٹہ دراز تک جس کی مدت ہزار برس سے کم نہیں تھا انسانوں کو مصیبت اور وبال اور ادبار اور ہر قسم کی آفتوں میں مبتلا رکھا۔ سرولیم میور اسلام کو قرآن کے سخت بندوں میں جکڑا ہوا، سوسائٹی کی رفتار اور قوموں کے عروج کا ہم قدم نہیں سمجھتے اور عیسائیت کو دنیوی معاملات میں رہنمائی اور پیشوائی کرنے والا خیال کرتے ہیں۔ ذرا قرآن کھولیں اور دیکھیں اُس نے اسلام کو کن بندوں میں جکڑا لیا ہے۔ بلاشبہ ایسے بندوں میں جکڑا لیا ہے، جس سے ہم شرک اور بت پرستی کی نجاست سے بچیں، ایک سچے خدا کو تین نہ سمجھیں، کسی کو خدا کا بیٹا، کسی کو اُس کا شریک یا جانیں، تبرکات اور تصویروں کی پرستش نہ کریں، ناقابلِ فہم باتوں اور رموز پر یقین نہ لادیں، راہبوں کی تجرید اور تعویذ نفس کی مصیبت میں نہ پڑیں، روحانی بڑائیاں، زنا، چوری، خیانت، ظلم، جبر، حقوقِ دالین نہ کرنے پادیں، مگر اُس میں کوئی ایسا بند اور ایسی قید نہیں ہے، جو انسان کی دماغی قوتوں اور روحانی خوشیوں و اخلاقی خوبیوں اور دنیاوی ترقیوں کو روکے۔

ذرا قرآن کھولئے اور دیکھئے کہ اول سے آخر تک اُس میں ہے کیا، کہیں حقائق موجودات اور محاکرات
 کا بیان ہے، کہیں مافوق قدرت اور نظام فطرت کا ذکر ہے، کہیں نظام عالم پر غور کرنے کی ہدایت ہے، کہیں عقل
 و سمجھ سے کام نہ لینے پر ملامت، کسی جگہ اسرارِ حقیقت اور معرفت کا بیان ہے کسی جگہ علم و حکمت اور کارِ ملامت
 کا ذکر ہے، کہیں پرانی قوموں کے حالات مذکور ہیں کہ ہم عبرت پڑیں، کہیں اصولِ عامہ سیاست کا بیان
 ہے کہ ہم اُس پر عمل کریں۔ لَھُمْ قُلُوبٌ لَا یَفْقَھُونَ بِھَا اَمَنَ کے دل ہیں جو سمجھ کے کام میں نہیں
 آتے، کیا ہے، تا زیادہ ہے اُن لوگوں پر جو دل و دماغ رکھتے ہیں مگر اُس سے کام نہیں لیتے۔ اُولَئِکَ
 کَا لَا نَعْمَ اٰیٰتٍ لِّہُمْ اَحْسَنُ یہ لوگ جانور کے سے ہیں بلکہ جانور سے بھی زیادہ گمراہ، کس کی شان
 میں ہے، اُن لوگوں کی جو کہ آنکھ، کان، ہوش، احساس، رکھتے ہیں مگر انہیں کام میں نہیں لاتے،
 مَنْ یُّؤْتِ الْحِکْمَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا جس کو حکمت دی گئی اُس کو بہت کچھ بھلائی دی گئی، کیا
 ہے حکمت کی فضیلت کا بیان۔ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٌ۔ وَھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ
 یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ جن کو علم دیا گیا وہ درجے والے ہیں۔ کیا عالم اور جاہل برابر
 ہو سکتے ہیں، کیا ہے تعلیم کی ترغیب۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ مذہبِ خدا کے نزدیک
 اسلام ہے، کیا ہے اسلام اور فطرت کے اتحاد کا بیان۔ قَالُوْا بَلْ نَنْبَغُ مَا اَلْفِیْنَا عَلَیْہِ اٰبَاءَنَا۔
 وہ بولے کہ ہم اُسی کے پیچھے چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، کیا ہے، نہ سوچنے اور
 نہ سمجھنے پر ملامت۔ اِتَّخَذُوْا اٰخِیَارَھُمْ وَّرَہْبًا لِّھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ ان لوگوں نے
 اپنے علماء اور ورثوں کو خدا کے علاوہ ارباب بنایا ہے، کیا ہے، اہل کتاب پر اپنے بزرگوں اور
 پیشواؤں کی عصمت کے اعتقاد پر ملامت۔ هُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ هُمْ لَا یَقُوْلُوْنَ۔ هُمْ لَا یَتَذَكَّرُوْنَ۔
 هُمْ لَا یَتَفَكَّرُوْنَ۔ وہ نہیں جانتے۔ نہیں عقل رکھتے۔ نہیں سوچتے۔
 نہیں فکر کرتے۔ نہیں غور کرتے، جس سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، کیا ہیں، کوڑے اور تازیانے
 ہیں جو کافروں پر لگائے گئے ہیں اس جرم میں کہ عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے۔

غرض کہ سارا قرآن اور ساری تعلیم ہمارے مادی کی یہی ہے، کہ وہ استعدادِ وجود و فطرت میں خدا
 نے رکھی ہے وہ کام میں لائی جاوے، اور دنیا و دین کی ساری نعمتیں حاصل کی جاویں۔ قرآن ہر دہم
 کی سمجھی ہوئی وہ ترغیب نہیں ہے جس میں ہم دنیاوی ترقیات کے لئے جکڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ برصاوت
 اُس کے وہ اُن بندوں کو توڑنے والے ہیں جو عیسائیت نے یا عیسائیوں نے انسانوں پر اُس سے
 روکنے کیلئے لگائے تھے۔ غور کرو خدا کی اُس جھڑکی پر جو رہبانیت اور جوگی بننے کے لئے ہے۔ مَنْ
 حَزَرَ مَرِیْثَةَ اللّٰہِ اَلَّتِیْ اُخْرِجَ لِیَعَادَہُ۔ کس نے خدا کی وہ نعمت حرام کی جو خدا نے بندوں کے لئے
 پیدا کی، پڑھو خدا کی یہ آیت جو دنیاوی لذتوں سے متمتع ہونے کے لئے ہے۔ کُلُوْا مِنْ حَبِیْبَاتِ

مَلِكٌ ذُنُوبًا كَثِيرًا وَاعْلُوا صَالِحًا۔ پچھی چیزیں جو ہم نے روزی دی ہیں کھاؤ اور اچھے کام کرو۔ خدا اپنے بندوں پر اپنی خدائی کے اقرار لینے میں کیا محبت پیش کرتا ہے، یہی کہ ہم نے طرح طرح کی نعمتیں دیں پھر بھی شکر نہیں کرتے۔ وَجَعَلْنَا فِيهَا مَعَآلِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ۔ اور ہم نے اُس میں معاش کی چیزیں پیدا کیں لیکن تم لوگ کم شکر کرتے ہو۔ دیکھو کیسا عام جارت نامہ ہے خدا کا دنیا کمانے کے لئے۔ فَاَنذَرْتُ اِنِّیْ الْاَرْضُ وَابْنَعُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ زمین میں بھیل جاؤ اور خدا کی روزی تلاش کرو۔ پھر خدا اپنے اچھے بندوں کو کیا دعا سکھاتا ہے۔ رَبَّنَا اِنَّا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةٌ۔ اے خدا ہم کو دنیا اور آخرت میں بھلائی دے۔ یعنی دنیا اور دین دونوں کی بھلائی، جبکہ قرآن کے ایسے کام ہوں اور طلبِ حیات اور تجارت اور کمال کے لئے صاف صاف ترغیبات بتا رہا ہے کہ ہمارے ہادی نے طلبِ حیات کے لئے فرمایا ہو۔ مِنَ الدُّنْیَا دُنُوْا لَا یَلْبِسُهَا اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ فِیْ طَلَبِ الْمَعِیْشَةِ۔ بعض ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ صرف یہ ہے کہ معاش کی فکر میں رنج اٹھایا جاوے اور تجارت کے لئے ارشاد کیا ہو کہ اِنَّا جَزَّ الصُّدُوقُ یُحْشَرُ یَوْمَ الْقِیَمَةِ مَعَ الصَّٰدِقِیْنَ وَالشَّہْدَآءِ۔ سچا سود اگر قیامت کے دن صدیقیوں اور شہیدوں کے ساتھ اٹھائے گا۔ اور طلبِ دنیا کے لئے صاف صاف نکتوں میں یہ خوشخبری سنائی ہو کہ مَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالَ تَعَفُّفًا عَنِ الْمُسْتَلْکَةِ وَسَعِیًّا عَلٰی عَمَلٍ وَتَعَفُّفًا عَنِ جَارٍ لَقِیَ اللّٰهُ وَجْهَهُ کَاَنْفَعًا لِّکَلِّهِ الْبَدْرِ۔ جو شخص دنیا کو بطریقِ حلال تلاش کرتا ہے اور جس کا مقصد سوال کرنے سے بچنا اور آلِ اولاد کے لئے کوشش کرنا اور ہر ماہ پر مہربانی کرنا ہوتا ہے اُن کا منہ خدا کی ملاقات کے وقت چودھویں رات کے چاند کا سا ہوگا۔ تو کیا ایسا مذہب دنیاوی خوشیوں کے حاصل کرنے کے لئے انسان کے پاؤں کی زنجیر ہے، ہرگز نہیں، بلکہ وہ اُن کے لئے خطِ آزادی ہے۔

مگر جس طرح کہ سچی تعلیم قرآن کی اور نفسِ اسلام انسانوں کے لئے خطِ آزادی ہے، اسی طرح ہمارے غلط خیالات اور خلافِ مذہب اعمال بلاشبہ ترقی کے پاؤں کی زنجیر ہیں، ہمارے خیالات ہمارے اعمال یقیناً اس سچی تعلیم کے خلاف اور اہل مقصد و اسلام کے متناقض ہیں جیسا کہ عالموں اور چند مسلمان عیسائیوں کو جانے دو جو کفر و الحاد کے فتوے سے نہیں بچے، بلکہ عام خیالات اور اقوال پر نظر کرو، تو کیا معلوم ہوتا ہے، عقلِ دین سے بے تعلق، فطرت، اسلام کے خلاف، فلسفہ سراسر الحاد، تشبیہ بالکفار و لوکان فی اموال الدنیا قطعاً حرام، کوئی فرماتا ہے۔ یَجُوزُ اِلَّا سَتَعْمَلُوْا بِاَوْرَاقِ الْمُنْطَقِ، منطق کے اوراق سے استنباط جائز ہے۔ کسی کا ارشاد ہے۔ اَلْفَتْوٰی عِمَادُ الشَّرْعِ۔ فتوے شریعت کا ستون ہیں۔ کسی کا قول ہے۔ اِنْفِطَحَ نَرَمَانٌ اِلَّا بِجَهَادٍ۔ اجنبی کا زمانہ جاتا رہا، کوئی کہتا ہے۔ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةُ جِهَاتَانِ لَا یُجْتَمِعَانِ۔ دنیا اور دین دونوں ہندو چیزیں ہیں جو جمع نہیں ہو سکتیں۔ کیسے تعجب کی ہے یہ بات کہ اسلام جو فی نفسہ علم کا حامی، اور فطرت کے مطابق، اور علمِ بحقائقِ الٰہیہ کا مآرِف،

اور ہر طرح کی دماغی قوتوں کا محرک، اور دنیاوی ترقیوں کا ذریعہ، ہو، وہ ہم مسلمانوں کے غلط خیالات، بیہودا کام،
بھوتانہ زہاد و ترصیبات، افعال سے علم کا مزاج، تہذیب کا مانع، ترقی کا روکنے والا سمجھا جاوے۔ اور مذہب
عیسائی جس نے رہبانیت کی تعلیم دی ہو، جس نے قدرتی جذبات کے شگفتہ کرنے کا کوئی سبب نہ دیا ہو جس
نے دنیاوی ترقیوں کے لئے کوئی راہ نہ کھولی ہو، جو مذہب فی نفسہ رجز اور پسیلیوں کا مجموعہ ہو، جس کا مدار
عقل کے بدلے آسمانی روشنی پر رکھا گیا ہو وہ عیسائیوں کے اعمال سے علم اور تہذیب کا پھیلا تھوڑا، اور
انسان کو ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ ورج پر پہنچانے والا کہا جاوے۔ فَاعْتَبِرْ يَا اُولٰٓئِكَ الْاَلْبَابَ اِنَّ هٰذَا
لَكُنْىْ عَجَابٌ۔ سو عبرت پڑو اے عقل والو۔ بے شبہ عجیب بات ہے۔

صاحب! مذہب اور علم کی ہمیشہ لڑائی ہو اکی ہے، اور اب بھی یہ جنگ اچھی طرح جاری ہے۔ یورپ
جہاں آج کل علم کی قوت ہے وہاں علم ہی کی عکس کاری ہے مذہب اُس کے مقابلہ سے عاجز ہے۔ وہ مذہب
جسے سرولیم سور دنیاوی ترقیوں کا رہنما کہتے ہیں، اُن ملکوں سے نصرت ہو رہا ہے، اور قریب ہے وہ مانہ
کہ سوائے گرجا کے پادریوں اور بے علم کاشٹکاروں اور نادان بوڑھیوں کی زبانوں کے اُس کا اثر کسی کے دل
پر نہ رہیگا۔ یورپ اور امریکہ میں بد اعتقاد ہی اس کثرت اور اس زور سے پھیلتی جاتی ہے کہ کسی کی عقارت
نہ نفرت نہ ملاست نہ کوئی پولیٹیکل قوت اُسے دبا سکتی ہے۔ بغیر ایک محقق کے مذہب کی حالت ہے
کہ نہ ملک کی پالیسی پر اُس کا اثر رہا ہے، نہ جنگی جوش جو مذہبی بنیاد پر قائم تھا نظر آتا ہے، جو کچھ باقی ہے وہ
یہ ہے کہ چند سنگ مرمر کے بت بعض گرجوں میں پڑانے زمانہ کے مجاہدین کے نظر آتے ہیں۔ جو تاریکی کہ
یورپ پر قائم ہو گئی تھی وہ اب رفع ہوتی جاتی ہے، صبح ہو گئی ہے اور جدید اور بہتر حالت کے آثار پیدا ہو رہے
ہیں، سوسائٹی اس آنے والی روشنی پر آنکھیں لگائے ہوئے جھپٹی ہے، اور صاف صاف معلوم ہو رہے
کہ سولیزیشن کے دریا کی ہمارے پرانا رستہ چھوڑ چکی ہے اور نیا رستہ ڈھونڈ رہی ہے۔ اب یہ حال پیدا ہوتا ہے
کہ کیا اسلام پر بھی علم کا ایسا ہی اثر ہوگا۔ اُس کا جواب ”ہاں“ بھی ہے اور ”نہیں“ بھی؛ وہ خیالی مذہب،
جو کہ مجموعہ ہے ہمارے ادنام، اور دسائوس اور بت پرستوں کی رسموں، اور شرکوں کی عادتوں، اور دل خوش کن
کہانیوں کا وہ بلاشبہ علم کی روشنی کے سامنے نہ ٹھیرے گا؛ مگر وہ اسلام جو مطابق ہے فطرت کے، اور مراد
ہے علم تحقیق الاشیاء کے، اور جو موافق ہے سچے علم کے، اور جو بتایا گیا ہے قرآن میں اُس کو علم کی ترقی
اور ترقی ہوگی، اور وہ دنیا میں اور پھیلتا جاوے گا، اور علم کی روشنی کے سامنے اُس کا خوبصورت چہرہ اور
چمکنے لے گا۔ فَاقْصِرْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِلْ بِلِخْلَقِ اللَّهِ
ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ۔ پس اپنا منہ دین کی طرف سیدھا کر ڈیڑھے رستے سے مڑ کر۔ خدا کی فطرت جس پر
اُس نے آدمیوں کو مخلوق کیا۔ خدا کی ساخت میں تبدیل نہیں ہے۔ یہ سیدھا دین ہے۔

غیر

لکچر

یونان کی ترقی اور یورپ کا تنزل پھر اُس کی ترقی کی تالیف و اسباب

جو ۳۰۔ دسمبر ۱۸۳۰ء کو محمد انجیریشن کا نفرنس اجلاس نجسم میں بمقام الہ آباد، دیا گیا جب کہ نواب حسن الملک لکچر دینے کو کھڑے ہوئے تو تمام ہال چیریزی و آوازوں سے گونج گیا قبل شروع کرنے لکچر کے انہوں نے کہا کہ ”آج مجھ کو یقین ہے کہ اس لکچر سننے میں شروع سے آخر تک آپ کے کانوں کو غلیف نہ ہوگی، لیکن بڑے دل سے کام لینا ہوگا۔ اور قوموں کی ترقی و تنزل کے حساب کو سن کر کسی قدر اپنی قوم کی ترقی و تنزل کے وجوہ پر خیال کرنا ہوگا۔ کیونکہ ہر قوم کی ترقی اور تنزل کے اسباب قریباً قریباً یکساں و مشابہ ہوتے ہیں۔ اس لکچر میں دوسری قوموں کی ترقی اور ترقی سے تنزل دکھایا گیا ہے خاص کر یونان اور یورپ کا ذکر ہے۔ یونان کا یورپ استادی کے اور یورپ کا یورپ جہالت اور جہالت سے پھر ترقی کرنے کے جو مقدر علیہ یوگ مسلمانوں کو اپنی قوم کی ترقی و تنزل کے اسباب پر قیاس کرنے کو۔ گو سرسید یا مولانا الطاف حسین حالی یا خود لکچر یا شاعر بے بدل خیر قومی حالت کا رد نہا روتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کی موجودہ تہذیب و شائستگی بد جہا بہتر ہے اس حالت سے جو پچھلے زمانہ میں یورپ کی تھی جس پر مردہ اور بیمار کی مثال ٹھیک لگ سکتی ہے یہاں جب مردہ زندہ ہو جاتا ہے تو کیا حال کا رخصت اچھا نہیں ہو سکتا۔ مردہ کو سچ کی ضرورت ہے اور مریض کو معمولی طبیب ڈاکٹر بھی چھٹا کر سکتا ہے بعض لوگوں نے اس پر چیز زدی سید احمد نے چیکو سے اپنے ایک دوست سے جو قریب تھے کہا کہ مسلمانوں کا مریض قابل علاج نہیں ہے نہ سیجا کچھ کر سکتا ہے نہ طبیب اس دوست نے کہا نہیں نہیں اس جلسہ میں سب طبیب و ڈاکٹر ہیں صرف ذرا سے رکیک خیالات اور مذہبی غلط فہمیوں کی اصلاح درکار ہے۔ اس لکچر کے پڑھنے میں ایک مقام اُپر تو نے یہ بات کہی کہ اگرچہ نبوت ختم ہو گئی ہے لیکن نبی اسرائیل میں بہت سے پیغمبر وقتہ فوقتہ اُن خرابیوں کے دور کرنے کو جو اصل مذہب میں لمبائی ہیں اور مذہب علیحدہ ہوتی ہیں اُنے تھے اس قوم میں یعنی مسلمانوں میں ہر صدی میں ایک مجدد ہوتا ہے اِنَّ اللہَ عَزَّ وَجَلَّ بیعت لہذا الا مئة علی مل س کل مائتہ سنة من مجدد لها و بینہما اس حدیث کو پڑھ کر پوچھا

کاس صدی کا مجدد کون ہے؟ پھر کیا آپ جانتے ہیں میرے بیان کی ضرورت نہیں ہے؟
اس کے بعد انہوں نے نہایت فصاحت و بلاغت سے یہ کچھ لکھنا شروع کیا:-

حضرات! میں نے اپنے پہلے کچھ کو شروع کیا تھا ان لفظوں سے کہ روئے زمین پر مسلمانوں ہی کی قوم ایسی نہیں ہے جس کو ترقی کے بعد زوال ہوا ہو، اور بھی بہت سی قومیں ایسی گذر چکی ہیں کہ ان کی بھی ایسی ہی حالت ہوئی۔ میں اس دوسرے کچھ کو بھی یہی کہ کر شروع کرتا ہوں کہ مسلمانوں ہی کی وہ قوم نہیں ہے جنہوں نے علم و تہذیب میں ترقی پائی ہو، پھر ان میں زوال آیا ہو، بلکہ اور بھی بہت سی قومیں دنیا میں ایسی گزر چکی ہیں جنہوں نے علوم و فنون میں مسلمانوں سے بہت بڑھ کر ترقی کی تھی اور مسلمانوں نے انہیں سے علم سیکھا تھا، مگر اب ایسی جاہل اور علوم سے بے خبر ہیں کہ گویا تربیت یافتہ قوموں میں ان کا نام ہی نہیں ہے اور نیز بعض قومیں ایسی ہیں جو اول نہایت تا تربیت یافتہ، جاہل، بلکہ وحشی تھیں اور انہوں نے ایسی ترقی کی کہ اب علم اور صنعت اور کمال میں دنیا کی استاد ہیں۔ مجھے اس کچھ میں دونوں تصویریں دکھانی منظور ہیں اس لئے میں یونان اور یورپ کا ذکر کرتا ہوں۔ یونان کا اس لئے کہ وہ قوم علوم و فنون میں مشہور ہے ہم نے انہیں سے علم سیکھا ہے یہ قوم ہماری استاد ہے اس قوم کی حیرت انگیز تاریخ سے آپ کو اپنی علمی ترقیوں کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر جائیگی۔ اور ترقی کے بعد ان کا علوم و فنون سے بے خبر ہو جانا آپ پر ثابت کر گیا کہ کسی چیز کو دنیا میں قیام نہیں ہے حکومت ہو یا سلطنت علم ہو یا تہذیب اس کا بھی دورہ ہوا کرتا ہے آج ایک ملک اور ایک قوم میں اس کا خیر ہے کل دوسرے ملک اور دوسری قوم میں اس کا ڈھکنا بچ رہا ہے۔ نلکا الا یا ہر ندا ولھا بین الناس۔ یورپ کا اس لئے ذکر کرتا ہوں کہ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اس کی حالت نہایت خراب تھی اور تباہ ہونے میں اس کی کوئی چیز باقی نہ رہی تھی سارا ملک جاہل تا مہذب غیر تربیت یافتہ بلکہ وحشی تھا مگر پھر اس نے ایسی ترقی کی کہ آج اس کے اقبال کا آنا نصف النہار پر چمک رہا ہے۔

اس سے آپ کو تعجب ہو گا کہ جو قوم دہ آدم و سانس میں مبتلا ہو جو قوم علوم و فنون سے متفق ہو، جو قوم تہذیب و شائستگی کی دشمن ہو، جس ملک پر چل کر تعصب کی تار کی چھائی ہو، جس ملک کی زمین صرف مذہبی جہالت کی جو سے انسانوں کے خون سے رنگین ہی ہو، جس ملک میں بھوت پلید جن شب بظانوں پر عقائد اور گھنٹے تعویذ فال و نجوم پر یقین ہو اس میں علم کی ایسی روشنی بھیل جاوے جس سے ثابت ہو کہ اس قسم کے تاریک خیالات کا گویا دغاں گز رہی نہ ہوا تھا اور اس سے بھی آپ کو تعجب ہو گا کہ اول علم و تہذیب کے آفتاب کی شعاعیں اسلام نے دوائ تک پہنچائیں اور ہم نصیری مسلمانوں کی صحبت و رشتہ گردی سے ان کو علم و تہذیب کا خیال پیدا ہوا، اور اس سے آپ کو حیرت بھی ہوگی اور اپنی ترقی کی امید اور سب سے بڑھ کر آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ مذہب اور علم کا ہمیشہ جھگڑا رہا اور ایک دوسرے پر غلبہ جاتا رہا، اور ان کے نتیجے بھی نہایت دلچسپ ہیں کہ علم کے غلبہ کا مذہب پر کیا اثر ہوا اور مذہب کے غلبہ نے علم کا کیا حال کیا اس کے ساتھ یہ بھی آپ کو معلوم ہو گا کہ مذہب کیونکر بگڑتا اور پھر اس کی اصلاح کیونکر ہوتی ہے اور اس کی خرابی اور درستگی کے اسباب کیا کیا ہوا

کہتے ہیں۔ غرضکہ یہ ایک ایسا عجیب اور مفید مضمون ہے کہ اُس سے ہم مسلمان بہت کچھ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں
افسوس ہے کہ ایسے عمدہ اور مفید مضمون کے نہ بیان کرنے کی مجھے بیعت ہے نہ اُس کے لئے وقت۔ مجھ
امید ہے کہ ہمارے نوجوان لائق ذی استعداد انگریزی دان مسلمان اس مضمون کو آئندہ نہایت شرح و بسط اور
خوبی سے بیان کر سکیں گے۔

اب یونان کا حال سنئے۔ یونان ایک ایسا ملک ہے جو مدت تک اندرونی جھگڑوں اور فسادوں
میں مبتلا رہا۔ دیکھی ایک سلطنت قائم نہ کر سکا اُس میں نہ دولت کا نام تھا، نہ حب الوطنی اور قومی ہمدردی تھی اُس کے
باشندے اکثر بددیانت اور رشوت خوار تھے، اُن کا جوش صرف صورت یعنی بت تراشی اور عمارت پر ختم تھا،
وہ اکثر ایران کی سلطنت میں نوکر ہوتے، اور پولٹیکل فسادوں میں ایران کے مدعیان سلطنت کو مدد دیتے
جیسا کہ اور سلطنتوں میں ہوا ہے آخر یہ ابھرتی سپاہی ایران کی اہلی حالت سے واقف ہو گئے، اور اُن
کا رعب اُن کے دلوں سے جاتا رہا، اُن کو ایران کی سلطنت پر قابض ہونے کا خیال پیدا ہوا، اسکندر
کے زمانہ میں یہ آرزو اُن کی پوری ہوئی، اور دارا کے مارے جانے کے بعد یونانی اُس وسیع سلطنت
کے مالک ہو گئے اُس نے اُن کو کچھ ملک ہی ہاتھ نہیں دیا بلکہ اسی زمانہ میں اُن کو علمی ترقی بھی نصیب ہوئی۔
سکندر کی لشکر کشی اور اُس کی فتوحات سے یونانیوں کے دماغوں میں بے انتہا تحریک ہوئی، بقول ڈاکٹر
ڈراپر کے ان جنگوں سے یونانیوں کی آنکھیں کھل گئیں، مختلف ملکوں کے تجربہ اور شاہدہ نے اُن کو علمی
ترقی کا شائق کر دیا، بہت سے جہانگیر لائق یونانیوں نے سکندر کے ساتھ یونان سے ڈیوب تک
اور وٹاں سے دریائے نیل، اور دریائے نیل سے دریائے گنگ تک، تمام ملکوں کی سیر کی، بحر اسود
کے شمالی حصہ کی ٹھنڈی ہوا کھائی اور مصر کے ریگستان کی گرم خشک ہوا کے صدمے بھی اٹھائے،
مصر کے اہرام اور مینار بھی اُن کی نظر سے گزرے، سریانی بادشاہوں کے محل، شہر بابل کی شہر نیاہ،
اور اُس کے عجیب بت خانے، اور رصد گاہ، اور پانی پہنچانے کے حیرت انگیز ذریعے، اور بے
بڑی تعجب خیز وہ سڑک جس کے ذریعے سے دریائے فرات کے نیچے سے آمد و رفت ہوتی تھی انہوں نے
دیکھی ان حیرت افزا اور عظیم الشان یادگاروں ہی نے جو اتنی بڑی ہیں کہ زمانہ کی عمر اُسی سے شروع ہوتی ہے
یونانیوں کو تحریک دے دی بلکہ ایران کے تازہ اور جدید عجائبات نے بھی اُن کے دلوں میں جوش پیدا کر دیا، اور
اُن کی صناعتی اور بت تراشی اور مرمر کے بت خانوں اور حیرت انگیز اور بلند اور پاکیزہ شہر نیاہوں اور رنگ آمیز لوہوں
اور سونے چاندی کی شاہی عمارتوں نے ایرانیوں کو کچھ کم متعجب نہیں کیا، ان سب چیزوں کو دیکھ کر یونانیوں کی
آنکھیں کھل گئیں، اور بکسے خیالی اور نظری بیکار اور فضول خیالات کو اُن کو علمی تجربوں اور صنعت و فنون کے
مفید عملوں کا شوق پیدا ہوا۔ سکندر کے مرنے کے بعد اُس کا علاقائی بھائی بطلمیوس مصر کا حاکم اور پھر وٹاں کا
یہ مضمون ڈراپر صاحب کی کتاب سے لیا گیا۔

بادشاہ ہوا، اُس کے ساتھ بیت المقدس کے حملہ کے بعد ایک لاکھ بیویاں آئے اور اُس کے جانشین نے
 اور ایک لاکھ اٹھانوے ہزار یہودی جو مصری لوگوں کی غلامی میں تھے قیمت دیکر آزاد کئے اور اُن کو وہی
 حقوق عطا کئے جو یونانیوں کو حاصل تھے، اس بتاؤ سے ہزارا یہودی اور سربانی خود بخود مصر میں آکر آباد ہو گئے
 اور یلیوس کی مہربانیوں اور نیا بیوں اور اُس کی حکومت کے شہرہ نے یونانیوں کو بھی ترغیب دی کہ وہ اپنا وطن
 چھوڑ کر وہاں آئے۔ یلیوس نے اہل علوم و فنون کو ترقی دینی شروع کی، اُس نے علما کو اکٹھا کیا، کتابیں جمع
 کیں، اُن کے ترجمے کرائے، کتب خانے، مدرسے، کالج قائم کئے تحصیل علم کا شوق ڈال دیا۔ طلبہ
 کے لئے وظائف مقرر کئے۔ علم اور اہل علم کی ایسی قدر کی کہ اسکندریہ نہ صرف مصر کا دارالافتاء ہو گیا بلکہ
 علوم و فنون کے لحاظ سے بھی وہ دنیا کا دارالعلوم بن گیا۔ یلیوس نے اس غرض سے کہ جو علوم اُس وقت
 تک حاصل ہو چکے ہیں وہ قایم رہیں، اور آئندہ اُن کو ترقی دیکھا دے اور پھر اُن کی شاعت ہو، ایک عجیب خانہ
 بنایا، جس کے کمروں میں نہ صرف ہزار صنعت کے دیوتاؤں کے بنائے ہوئے بت اور تصویریں موجود تھیں،
 بلکہ اُن میں مختلف علوم و فنون، اور مختلف زبانوں کی سات لاکھ جلدیں بھی موجود تھیں۔ اُس کا عام حکم تھا، کہ جہاں
 سے اور جس فن کی کتابیں ملیں سرکاری خرچ سے خریدی جائیں۔ اگر کوئی مول نہ لے اُن کی نقلیں کرائی
 جائیں۔ اس کام کے لئے بیشمار نقل نویس مقرر تھے، اور ہزاروں روپے اُس پر صرف کئے جاتے تھے
 غیر زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کا ایک جدا صیغہ قائم تھا اور اُس پر اتنا روپیہ خرچ کیا جاتا تھا کہ اُس پر
 یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے تفصیل علوم کے لئے جو لوگ اُس میں آتے اُن کا خرچ سب سرکاری خزانہ سے
 دیا جاتا، وہاں علوم کو، ادب، ریاضی، ہیئت، طب، چار شاخوں میں تقسیم کیا تھا، ہر ایک کے پروفیسر اور
 مدرس اور فیلو علیحدہ علیحدہ تھے اور وہی لوگ مقرر ہوتے جو اُس فن کے کامل اور مشہور تھے، وہاں ایک
 رصد گاہ بھی بنائی گئی جس میں اسطلاب اور اُسی قسم کے دیگر آلات موجود تھے، ایک کیا خانہ بھی بنایا گیا جہاں
 کیمیا کی دریافت ہوا کرتی، علم تشریح کے عملی تجربوں کے لئے ایک کمرہ مخصوص تھا، جس میں نہ صرف
 مردے چیرے پھاڑے جاتے تھے بلکہ اُن جرموں پر بھی یہ عمل ہوتا تھا جن پر قتل کا فتوے ہوتا۔ اس کے
 سوائے وہاں ہر علم کے متعلق کچھ دئے جاتے، اور رہائش ہوتے، کہا گیا ہے کہ ایک وقت میں چودہ ہزار
 طالب العلم دوسرے ملکوں کے یہاں جمع ہو گئے تھے بعض بعض پادری بھی یہیں کی تعلیم پائے ہوئے تھے۔
 اگرچہ اسطو کے فلسفہ کی تعلیم ان مدرسوں میں ہوتی تھی مگر افلاطون کے فلسفہ سے بھی بے پرواہ نہ تھے بلکہ اخیر
 میں یہ نوبت پہنچ گئی کہ افلاطون کی حکمت نے اسطو کے مہول کو گویا اسکندریہ کے مدرسے سے خارج کر دیا۔ وہاں
 کا فلسفہ ایک دوسرے سے مختلف تھا، افلاطون کے فلسفہ کی بنیاد تھی، لکھا ہے جزئیات کا استخراج
 کرنا، اور اسطو کا مہول تھا جزئیات کے دریافت اور شاہدوں سے کلیات کا قیام کرنا۔ افلاطون کا ایک
 خیال پیش نظر رکھ کر اُس کے جزئیات کی تحقیق کرنا، اسطو بر خلاف اُس کے تفصیل جزئیات سے مانع قیام کر کے

کچھ قایم کرنا فلاطون کی حکمت سے بہت جلد اور نہایت جگہ درگزر اصل فقیر قابل اطمینان نتیجے پیدا ہوتے، اسطو
 کے اصول سے بے انتہا محنت اور دیر کے بعد مگر زیادہ مستحکم نتائج حاصل ہوتے، ایک حکیم نے دونوں فلسفہ
 کی مثال میں کہا ہے کہ فلاطون کی حکمت گویا ایک شاندار اور عظیم قلعہ ہے مگر جس کی بنیاد ہوا پر قائم ہے،
 اسطو کی حکمت ایک مضبوط عمارت ہے جس کی بنیاد بہت محنت اور ناکام مباحثوں کے بعد مضبوط چٹانوں کے
 اوپر رکھی گئی ہے۔ چونکہ قوت تخیل سے کام لینا بمقابلہ رستہ مدرک کے عمل میں لانے کے زیادہ دلچسپ و یاد
 دلاؤ ہے، اس لئے آخر اسکندر میں بمقابلہ مشاہدہ اور فکر کی محنت، اور ہتھورا کی رحمت، کی طبیعتیں
 آسان اور دلچسپ خیالی طریقوں کی طرف زیادہ رجوع ہو گئیں، اور فلاطون کی جدید حکمت سے مدرسوں میں
 بہت سے دہمی مجدد بھر گئے۔ مگر آخر کار اسطو کا فلسفہ زیادہ مفید ثابت ہوا، اور کچھ فیصلے حکیمانہ خیالی
 باتوں کو خدا حافظ کہہ کر اپنے علم کو ان واقعات پر قائم کیا جو علی تجزیوں اور مشاہدوں کو ریاضی کے ثبوت کی
 کسوٹی پر چڑھا کر حاصل کئے گئے تھے۔ اشرمیدرس کی تحقیقات اشیا ثقل کے متعلق اور علم درایا و مناظر بطلمیوس
 کی تصنیفات آج کل کی عملی فلسفہ کی تحقیقات سے بہت مشابہ اور پرلئے زمانہ کی دہمی تعویات کو نگاشت
 تحارت دکھلاتی ہیں *

اس عملی اور علمی فلسفہ کے سوائے اخلاقی فلسفہ بھی جاری ہو گیا تھا زینون نامی حکیم نے اس کی ایجاد کی
 تھی، اس نے انسان کی روزانہ زندگی کے افعال کی بُرائی اور بھلائی کی معیار قائم، اور انسان کو نیکی پس
 بنانے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ تمام خواہشیں اور شہوتیں اور آرزوئیں نقصانِ علم سے پیدا ہوتی
 ہیں، انسان کو اپنی خواہشوں کو روکنا اور عافلانہ اور نیک زندگی، عقل کی پابندی سے بسر کرنی چاہئے۔
 زندگی کو دائمی قوتوں کا مطیع کرنا اور رنج اور خوشی کو، یا برواشت کرنا مناسب ہے کہ گویا اس کا کچھ اثر طبیعت
 پر نہیں ہوا اس کا مقولہ تھا کہ میرے پاس ایک جوا ہے جس کو تمام دنیا کی قوت مجھ سے نہیں چھین سکتی،
 وہ یکدم مرنے سے مجھے کوئی روک نہیں سکتا *

اب دیکھئے کہ ان علمی ترقیوں کا یونان کے مذہب پر کیا اثر ہوا۔ علمی ترقی کے زمانہ سے اول یونانی دنیا
 کی اور قوموں کی طرح دیوتاؤں کی معتقد اور پرانی روایتوں پر چلنے والی تھی، ان کا اعتقاد تھا کہ ان کے عزیزوں
 میں دیو، جن، جادوگر، عجائب التفت مخلوق، بھری ہوئی ہے، آسمان بہشت کا فرش ہے، جس میں دیوتا مع
 پروں اور مصاحبوں کے دبار کرتا ہے، اور مع اپنے سب درباریوں کے انسانی اشغال اور عیش پرستی اور
 نفسانی لذتوں میں مبتلا ہے، معجزات، خرق عادات، اور خلاف فطرت چیزوں پر ان کا پورا اعتقاد تھا۔
 جب علم و حکمت کی روشنی چمکنے لگی ان کا قدیم قومی مذہب اس روشنی کے سامنے دھندلا ہونے لگا،
 اور فطرت کی علمی عظمت کے مقابلہ میں ان کے اومیس کے دیوتا ذلیل اور مقید ہو گئے۔ وہ دیوتاؤں کے شرکوں
 اور معجزوں پر شبہ کرنے، اور پرانی روایتوں اور برزگوں کے اعتقادوں کو ٹل اور کمائیاں سمجھنے کو، علم کی روشنی

نے جب اُن کے دماغ کو روشن کیا تو اُن کو معلوم ہوا کہ الہامِ اقدس اور پرانے افسانے ڈھکوسلے تھے۔ آسمان جسے وہ اندر کا اکھاڑہ سمجھتے تھے انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ دھوکے کی ٹٹی ہے، سوائے ستاروں اور فضا کے وہاں کچھ ہے ہی نہیں، کہاں کی بہشت اور کہاں کے دیوتا۔ غرض کہ مکان کے ساتھ کہیں بھی تشریف لے گئے اور علم نے اُن کے دیوتاؤں کو بھی عدم کا راستہ بتایا۔

یونان میں جب علم و مذہب کی لڑائی شروع ہوئی تو مہیا کہ ہمیشہ ہوا اور ہوتا چلا آتا ہے مذہب کی بہت کچھ حمایت کی گئی، علم کے حملوں سے مذہب کے بودے اور ناپائیدار قطعہ کی حفاظت کے لئے بہت کچھ یا بوسانہ تدبیریں عمل میں لائی گئیں، مذہبی پیشواؤں نے ان جدید تحقیقاتوں کو کفر و الحاد ٹھہرایا، مذہب میں شک کرنے والوں پر کٹکے قوت سے جاری کئے گئے، نئے خیالات پھیلانے والوں بلکہ اُن کے ماننے والوں کو سزائیں دیں، اُن کا مال و اسباب ضبط کیا، وطن سے نکالا، جب اس سے بھی وہ آگ نہ بچتی تو قتل اور ہلاک کرنے سے غلام کو روکنا اور علم کی روشنی کو بجھانا چاہا۔ مگر یہ سب تدبیریں عبث، اور ساری کوششیں فضول تھیں۔ آئندہ کھولنے کے بعد دنیا کی عجائبات کے دیکھنے سے روکنا، کیا انسانی طاقت کا کام ہے، علم کے سامنے جھوٹے مذہب کے جھوٹے خیالات اور جھوٹی باتیں کہیں قائم رہ سکتی ہیں آخر کا اس لڑائی میں علم جیتا اور اُن کا جھوٹا مذہب مٹا۔

اب ذرا اُس سلسلہ پر خیال کیجئے کہ علم کے پھیلنے کے آغاز سے مذہب کے زوال تک یونانیوں کے مذہبی خیالات کیسے درجہ بدرجہ بدلتے گئے، اول تو مذہبی آدمیوں نے علمی تحقیقاتوں ہی کو غلط ٹھہرایا اس دلیل سے کہ جو باتیں تہذیبِ برس سے مانی جا رہی ہیں ضرور وہ صحیح ہوں گی، ہزاروں برس تک لاکھوں آدمیوں کا اُسے ماننا، اُس کی صحت کی دلیل ہے، یہ فرقہ وودہ تھا جس نے اپنی غلط حمایت سے مذہب کو ادھبی شکست دی اور مذہب کی غلطی مذہبی خیالات کی حماقت کو تسلیم کر لی۔ اس کے بعد دوسرا فرقہ پیدا ہوا جس نے مذہبی اعتقادات کے خلاف پوری شہادت پائی، اور اُس کے خلاف علمی مسائل کی صحت کا اعتراف کیا، مگر مذہب کے قائم رکھنے کے لئے مذہبی روایات کو بہتعارات اور شبیہات پر محمول کیا، اور اپنے بزرگوں کے بچاؤ کا یہ راستہ نکالا کہ انہوں نے زمانہ کی سمجھ کے موافق پوشیدہ علوم اور صحیح واقعات کو دوسرے پیرایہ میں بیان کیا ہے، پھر تیسرا فرقہ کھڑا ہوا جس سے پرانے فضولیات اور لغویات کو جدید علمی تحقیقاتوں سے تطبیق کرنے، اور مذہبی الفاظ، اور مذہبی باتوں کی تاویل شروع کی، مگر کہیں ایسی کوششیں جھوٹے مذہب اور باطل خیالات کو قائم رکھ سکتی ہیں، آخر وہ دور پورا ہو گیا جن میں مذہب کے حامیوں کی رائے پھر کھاتی رہی اور وہ وقت آ گیا کہ جو عقیدے جمالت کے سبب سے قبول کئے گئے تھے اور جن میں شک ہو گیا تھا اور جن کے قائم رکھنے کے لئے استعاروں اور شبیہوں اور تاویلوں سے کام لیا گیا تھا تھے اور افسانے اور ڈھکوسلے ٹھہرا کر ترک کر دیئے گئے۔

کیفیت تو ہمارے پرانے استاد یونانیوں کی جن سے ہم نے اول علمی سبق سیکھا تھا بیان ہوئی سب ذرا دل لگا کر ہمارے نئے استادوں یعنی یورپ کی ان قوموں کا حال سنئے جن سے ہم علم سیکھ رہے ہیں اور جو تہذیب اور علم کے دیوتا سمجھے جاتے ہیں ۔

پانچویں صدی سے پندرہویں تک پورا ہزار برس کا زمانہ ٹل ایگری کے نام سے مشہور ہے یہ زمانہ علم، تہذیب، شائستگی، طرز معاشرت، اور سوسائٹی کی حالت کے لحاظ سے جہالت اور تاریکی کا سمجھا گیا ہے ۔ اسی زمانہ میں روم کی شاہنشاہی تباہ ہوئی، وحشیوں کے حملوں سے اُس کے صوبے دیران اور برباد ہوئے ہر طرف اندھیرا چھا گیا، سارا ملک جہالت میں غرق ہو گیا، فلسفہ کو لوگ حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے، قانون کے علم سے بے پروائی اختیار کی، اُن کی عمدہ وسیع زبان لیٹین بگڑ گئی، شاعری کا خیال جاتا رہا صنعت و نعت پر زوال آیا، جاہل اور بے علم عہدہ داروں اور باہر کے ناخواندہ بادشاہوں کی حکومت نے رومیوں کی عظیم الشان شاہنشاہی کے ڈھچکے ڈھیلے کر دیا تھا یہاں تک کہ آخر وحشی لوگوں کے متواتر پچاس سال کی حملہ آوری نے اُن کی مصیبتوں اور آفتوں کو پورا کر دیا، مذہب کی خرابی، اور مذہبی پیشواؤں کی بددیانتی، اور پادریوں کی خود غرضی نے عیسائی مذہب کو ایسا عارت کیا تھا کہ مذہب عیسائی علم اور تہذیب اور تمدن اور انسانیت اور انصاف کا ایسا مخالف سمجھا جاتا تھا کہ اس زمانہ میں کسی کو اُس کا یقین نہیں ہو سکتا۔ عیسائی لوگ کافروں کے علوم کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے، لٹریچر اور ادب کی طرف کچھ توجہ نہ کرتے تھے، عیسائی بچے مکتبوں میں تعلیم کے لئے بھی نہ جانے پاتے تھے، مذہبی عقائدات میں فساد لگنے کے خیال سے علم پڑھنا گویا جرم تھا، مذہبی خیال سے کاٹھج کی چوٹھی کو نسل نے یہ حکم جاری کر دیا کہ کوئی پادری بھی سوائے مذہبی کتابوں کے دوسری قسم کی کتابیں نہ پڑھے، اس دلیل سے کہ جو علوم الہام ربانی کے خلاف ہیں وہ حقارت اور نفرت کے لائق ہیں اور اُن کے نزدیک سوا مذہب کے باقی تمام علوم الہام ربانی کے خلاف تھے۔ مذہبی عہدوں پر جو لوگ مقرر کئے جاتے تھے اُن میں بھی تعلیم کوئی ضروری شرط نہ تھی بلکہ اکثر جاہل لوگ ہی ان عہدوں پر مامور ہوتے۔ ایک محقق چند پادریوں کی ایک نقل لکھتا ہے کہ جب اُن سے پوچھا گیا کہ آپ یونانی اور عبرانی کیوں نہیں سیکھ لیتے تو فرمایا کہ یونانی زبان تو تہی ہے اور ہر نئی چیز سے بچنا چاہئے اور عبرانی زبان پڑھنے سے آدمی یہودی ہو جاتا ہے۔ جہالت کے ساتھ دوسو سے اور ادا م ہمیشہ ہمخان ہوا کرتے ہیں اُن کو بھی پادریوں نے خیر مقدم کہا اور تمام نے نہایت مبارکباد دی سے اُن کو قبول کیا اُس کے ساتھ رہبانیت کا ایسا جوش پیدا ہوا کہ وہ سہا علم ہی دفن ہو گیا۔ مجنونانہ زہاد و تعصبانہ خیالات نے انسان کی دماغی ترقیوں کو ایسا روکا کہ وہ روشنی باغ اور اعلیٰ خیال کے لوگ جو بہت کچھ علمی و فنی پھیلا سکتے تھے تاریک غاروں میں جا گھسے۔ بادشاہوں کے وحشیانہ پسند اور جہالت نے فرانس اسپین اٹلی پر ایسی جہالت کی تاریکی چھادی کہ کل قوم علم سے نفرت اور جہالت پر فخر کرتی

۱۰ یہ مضمون اور یہ واقعات انگریزی تاریخوں سے لئے گئے ہیں ۔

تھی کئی کے سٹوڈنٹ گارڈز بادشاہوں میں سے تھیوڈارگ اپنا نام تک لکھ نہ سکتا تھا، وہ علم کا ایسا دشمن تھا کہ مکتبوں میں پڑھنے کو بھی کسی کو جانے نہ دیتا تھا۔ اُس پر یہ ایک بڑی مصیبت واقع ہوئی کہ کئی کی پُرانی زبان لیٹن میں بہت تبدیلی ہو گئی، چونکہ علمی کتابیں اسی زبان میں تھیں، جب اس زبان کے سمجھنے والے کم ہو گئے، تو علم کا خزانہ بھی عام لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہو گیا اور چونکہ تمام مدرسے اور تعلیم کا یہاں گرجوں اور خانقاہوں کے متعلق تھیں اور اُس پر پادریوں کا پہرہ تھا اس لئے عوام کے لئے تعلیم کا دروازہ بند ہو گیا۔ اگرچہ لاطن زبان بدل گئی تھی مگر چوتھی زبانیں اُس سے نکلی ہیں لوگ اُسے بولتے تو تھے مگر دوسری تحریر میں نہ آتی تھیں اور عوام عام اپنی زبان میں لکھتے پڑھنے کا کوئی ذریعہ نہ رکھتے تھے اس لئے چال ہو گیا کہ لوگوں نے نہ صرف کتابیں لکھنی چھوڑ دیں بلکہ حرف شناسی سے بھی بے بہرہ ہو گئے مذہبی فرقوں کے سوا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے لوگ ایسے جاہل اور کلمہ بازی تھے کہ اپنا نام تک نہ لکھ سکتے تھے یہاں تک کہ اُس زمانہ کے ادرا، دستاویزات و پچاسے اپنے نام لکھنے کے صرف صلیب کا نشان کر دیتے تھے۔ شارلین سا شخص بالکل لکھنا نہ جانتا تھا اور نہ صرف امرا بلکہ مذہبی علماء کا یہ حال تھا کہ شارلین کے زمانہ میں اسپین کے ہزار پادریوں میں ایک بھی ممبری خط نہ لکھ سکتا تھا۔ اس جہالت سے ہزار ہا اوام اور سو سے پیدا ہوئے۔ انصاف اور حق و باطل کی تیز گرم لہر ہے کہ تھیں پکڑنے یا گرم تل میں تھوڑے بونے یا ٹھنڈے پانی میں تیرنے پر نہ ہونگی۔ تہذیب کی یہ خرابی تھی کہ کئی میں مرد اور عورت ایک ہی برتن میں کھانا کھاتے، لکڑی کے دستہ تک کی چھریاں نہ تھیں نہ گھر میں ایک بیٹا و پیالے کے سوا بے برتن تھے، روشنی کے لئے موم یا چربیوں کی تیلوں کا نام تک نہ جانتے تھے، کھاتے وقت نوکر تھیں بدبو اور دھوئیں اڑنے لگے کھڑا رہتا تھا، مردوں کی پوشاک چڑے کی ہوتی تھی جس میں کسی قسم کا استہسان نہ ہوتا تھا، عورتوں کی پوشاک نہایت ہی بدینہ اور بری ہوتی۔ عورتیں نہایت ذلیل اور حقیر اور غلامی کی حالت میں تھیں، لونڈیوں سے کچھ زیادہ ان کی عزت نہ تھی۔ غرض کہ کیا بلحاظ علوم و فنون کے کیا بلحاظ تہذیب و نشاۃ الٰہی کے سارے یورپ پر تاریکی چھا رہی تھی +

علم ہیئت کے عمدہ مسائل سے صرف ایک سدا اُس وقت یورپ چھی طرح جانتا تھا یعنی ہالے پینڈون کا نجوم جس سے آئندہ کی پیشین گوئی کیجاتیں اور ختم تریاں بنانی جاتیں۔ ایک بزرگوار تھیوڈارگ میں اس دنیا سے سدھارے اُن کا نام تھا کارڈینل ڈیٹلی وہ علم ہیئت کو علمی اور پراسخوئی سے کام میں لانا چاہتے تھے کہ وہاں کے پیٹ سے لکھنے والے بچے کی ختم تیری ہی نہیں بنا سکتے تھے بلکہ اپنے علم نجوم کی قوت سے اُنہوں نے حضرت مسیح کی ختم تیری بھی تیار کر ڈالی اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ علم نجوم کی رُو سے فوج کے طرفان کی تاریخ بتائی جاسکتی ہے۔ حضرت کی عمر نے وفات کی ورہ علم ہیئت میں تو ایسے کامل تھے کہ بلاشبہ فوج کے طرفان کی تعلیم بنیادی ڈالتے۔ اور انہیں ایک بزرگوار کو مت سمجھو وہ اس خط میں گرفتار تھے

جگہ صدیوں تک بڑے بڑے فاضل اور عالم یورپ کے اس میں شمول و مستغرق رہے گینگر بھی جو علم ہیئت میں ایسا بڑا کامل تھا جس نے بظاہر موسیٰ نظام شمسی سے انکار اور کرہ زمین کا نسل دیکر کروں کے فضا میں ہونا اول اول انکلا وہ بھی نجوم کے علم کی صحت سے انکار نہ کر سکا۔

فلاسفہ جادو کا حال بھی سن لیجئے۔ کہ وہ ملک جس کے علم کا سچا جادو اب ساری دنیا کو سحر کئے ہوئے ہے وہ جھوٹے جادو اور سحر کے کیسے معتقد تھے ۱۸۴۷ء میں اتھوسینٹ ہاشتم روم کے پوپ نے اپنے مشہور بل یعنی حکم سے جو عام خیالات سحر اور جادو کی بابت عوام میں پھیلے ہوئے تھے ان کو چرچ کی بھی طرف سے تسلیم کیا۔ یعنی مذہبی اعتقادات میں سحر و جادو کا اعتقاد مانا گیا اس نے حکم دیا کہ ساحروں خصوصاً جادو گروں کی تلاش کی جاوے اور ڈھونڈ کر ماری جاویں تاکہ ان کے جادو کے عمل سے بچاؤ عیسائی محفوظ رہیں جرمنی میں دو انسپلر جادو گروں کے ڈھونڈنے کے لئے مقرر ہوئے۔ پولس کے آدمیوں پر کیا بھروسہ ہو سکتا تھا۔ اور معصوم پوپ کو ان پر کب اطمینان تھا اس لئے ایک پادری صاحب بھی ان کی مدد کے لئے مامور ہوئے اور ایک مجموعہ ضابطہ کا (جیسا کہ ہمارا مجموعہ ضابطہ کارروائی فوجداری ہے) سرعہ لگانے کے طریقے اور تحقیقات کرنے کے قواعد اور ہدایت کے لئے منضبط کیا گیا جس کا نام تھا سیلیوس میلے میکارم اس ضابطہ سے جادو کی تاثیر کی صحت کا مجموعہ خیال عموماً پھیل گیا اس کے بعد انگلینڈ ششم نے ۱۸۴۷ء میں لیوہم نے ۱۸۵۱ء اور آئرلینڈ ششم نے ۱۸۵۲ء میں ان قواعد و ضوابط کو کافی سمجھ کر اور زیادہ سخت اور ہیئت ناک احکام جاری کئے جس سے تمام لوگوں میں جادو کا خوف پھیل گیا۔ اگر کسی کو کوئی بیماری جس کا ظاہری سبب معلوم نہ ہو پتی یا جسم کے کسی عضو میں کچھ درد ہو یا کسی کے معاملات میں خلل پڑتا یا خاندان پر کوئی آفت آتی یا کوئی طوفان جاتا یہاں تک کہ اگر کوئی جانور بے سبب مرتا یا کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا اس کا باعث جادو ہی قرار دیا جاتا (سبحان اللہ) سبب اور نتیجہ کے قدرتی ضابطہ کو کیا اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے اور جس پر جادو کا الزام لگایا جاتا اس کا سزا پانا تو ایک امر ضروری تھا اور سزا بھی کیسی سزا یعنی زندہ جلایا جاتا۔ جو لوگ سحر و جادو کے جرم میں گرفتار ہوتے ان کا رٹائی پانا تو ناممکن تھا کیونکہ بہت ہی کم ایسا اتفاق ہوتا کہ کوئی نہ کوئی ثبوت جرم کا نہ مل جاتا اگر فوراً ملزم اقبال نہ کرتا تو اس کا سر موٹا جاتا اور بہت غور سے اس کے سر میں شیطانی نشانات ڈھونڈے جاتے اگر کوئی غیر معمولی نشان مل جاتا تو ثبوت جرم میں کوئی شک ہی باقی نہ رہتا اور اگر اس قسم کی شہادت دستیاب نہ ہوتی تو اقبال جرم کے لئے جہانی آیدائیں دیکھتیں۔ اس لئے خواہ مخواہ ملزم ان اینڈوں پر اقبال کو مقدم سمجھ کر ساحر اور جادوگر ہونا قبول لیتے۔ آپ لوگ شاید یہ خیال کریں گے کہ اگر سحر کی صحت کا یقین تھا اس کے کرنے والوں کو سزائیں ہوتی تھیں تاہم شاید دو چار ہی واقعات سال میں ایسے ہوتے ہونگے جن میں سزا دینے کی نوبت آتی۔ آپ کو نہایت تعجب ہوگا یس کہ کہ یہ صیبت ایسی عام تھی جس نے بستیایں خالی کر دیں اور طاعون و ہضہ کی بیماری کی طرح سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کا کام تمام کر دیا۔ ایک

چھوٹے سے ضلع لنڈم ملک جرمنی میں چار برس کے اندر کل آبادی کا پانچواں حصہ جادو کے جرم میں جلا دیا گیا
 جینیوا میں نین مینے کے اندر پانچو جادوگر اور جادوگریاں جلائی گئیں۔ ضلع کو موپس ۱۸۵۲ء میں ایک
 ہزار آدمی اسی جرم میں جلائے گئے۔ کسی قدر عرصہ کے بعد جادو در فاشین یعنی صلاح کے نکلستان
 میں بھی یہ جنون پھیلا اور سب سے بڑھ کر پھیلا۔ ملکہ الزبتھ نے سحر کو اول درجہ کا جرم قرار دیا بلا لحاظ
 اس کے کہ وہ کسی نقصان کے واسطے استعمال کیا جائے یا نہیں جس میں اول نے اُس سے بھی زیادہ
 اُسے وسعت دی اور زیادہ صاف اور صریح الفاظ میں سحر کی سزا کے واسطے قانون جاری کیا۔ لوگوں کو
 جادوگریوں کی ایسی ہیبت ساگئی کہ بلا دو گورنٹ کے بعض آدمیوں نے جادوگریوں کے خارج کرنے کا
 پیشہ اختیار کر لیا، دیہ بدیہ پھرتے اور جہاں جلتے، ۴۰ شلنگ فیس لیتے تاکہ جادوگریوں کو اُن کے گاؤں
 سے نکال دیں اپنے پیشہ کے چلانے کے لئے وہ مشتبہ اشخاص کو گرفتار کرتے اور اُن سے جرم کا انبیا
 کر کے سزائیں دلاتے اور اس طور سے جادو کرنے والوں سے گاؤں کو صاف کرتے۔ منجملہ جادو کی سخت
 کی اور علامتوں کے ایک یہ طریقہ بھی شناخت کا نکالا گیا تھا کہ سوئیاں چھو کر دیکھتے کہ کوئی خاص نشان تو
 نہیں ہے جو بعض جادوگریوں میں پایا گیا تھا۔ سب سے تعجب کے لائق تو یہ طریقہ تھا کہ مشتبہ ساحرہ
 کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کپڑے میں لپیٹ کر اُسے تالاب یا دریا میں ڈال دیتے اگر ڈوب جاتی تو خیر یہ
 سمجھا جاتا کہ صطباغ کے پاک پانی کا اُس پر اثر ہے اور اگر تیرنے لگتی تو وہ جادوگری سمجھی جاتی اور پھر جلائی جاتی غرض کہ
 نتیجہ دونوں حالت میں موت تھا۔ سترھویں صدی کے وسط میں جادو کے سرخ لگانے والوں کا ایک
 سرگروہ تھا جس کا نام تھا یٹھینو پکنس۔ سب سے زیادہ آدمی انگلستان میں جادوگری کے الزام میں اُس
 زمانہ میں جلائے گئے جو لانگ پارلیمنٹ کہلاتا ہے یعنی سترھویں صدی کے وسط میں ۱۶۵۷ء میں ایک عورت
 اور اُس کی لڑکی بچہ ۹ سالہ کو پھانسی ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنی روح شیطان کو بیچ دی تھی اور اپنی بیٹی بے
 اتار کر صابون کھول کر اُن سے طوفان پیدا کیا تھا۔ ۱۶۵۷ء میں اسکاٹ لینڈ میں جادوگریوں کی سزا کے لئے
 ایک قانون منظور ہو گیا۔ اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ جیمس ششم جب ڈیوارک سے شادی کر کے واپس آیا۔ تو اُسے
 معلوم ہوا کہ چند جادوگریوں نے ایک مجلس قائم کر کے راستہ میں طوفان برپا کر کے بادشاہ کے مارنے
 کی کوشش کی ہے یہ جادوگریاں پکڑی گئیں اور جہانی ایذاؤں کے بعد ایک جادوگری نے قبول کیا
 کہ شیطان جو کہ بادشاہ کا بڑا دشمن تھا اُن لوگوں سے ملا ہوا تھا اور جو بادشاہ کے مارنے کی کوشش کر رہا
 تھا۔ اس مقدمہ میں تیس جادوگریاں قتل کی گئیں۔ انگلستان میں اُن زمانہ میں جادوگریوں کی سزا دینے کے
 لئے ایک مجلس قائم ہو گئی تھی اور اُن کے لئے قانون بھی منظور ہو گئے۔ اس مجلس کے عہد دورہ کرتے
 پھرتے تھے صرف گلاسگو کے ایک ہی دورہ میں سترہ آدمی زندہ جلا دیئے گئے۔ ڈاکٹر اسپرنگ نے
 بیان کیا ہے کہ عیسائیوں نے نوے لاکھ جادوگریوں کو زندہ جلا دیا ہے ۱۶۵۷ء میں جرمنی میں ایک

شخص زیر پیدا ہوا جس نے اُس کو اول غلط بتلایا ۸۰ سالہ میں دوسرا شخص پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ جادو کے منکر بہت نظر آنے لگے۔ گو کہ انگلستان میں ۱۸۰۰ء کے بعد زندہ جلاسنے کی سزا نظر نہیں آتی ہے۔ لیکن جرمن میں ۱۸۰۹ء میں سوئٹزر لینڈ میں ۱۸۰۰ء میں اور ہونز میں ۱۸۰۰ء میں بھی زندہ جلائے گئے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ ۱۸۰۰ء میں انگلستان میں ایک شخص ڈاکٹر ہیرس کی عدالت میں مجرم قرار دیا گیا تھا اس لئے کہ اُس نے لوگوں سے کہا کہ بیاری جادو سے پیدا ہوتی ہے اور اُس کو بھی جادو آتا ہے اور اُسی سے وہ آرام ہو سکتے ہیں۔ اکثر مریضوں سے اُس شخص نے روپیہ بھی جادو کی بیاری کو دور کرنے کے لئے وصول کیا تھا۔

اگرچاس جہالت اور ناشایستگی کے اسباب مختلف ہوں مگر سب بڑا سبب پادریوں کا تسلط اور غلبہ تھا۔ چھٹی صدی میں گری گری وی کریٹ چرنج روم قابض ہوا۔ اور روم کا چرچ رفتہ رفتہ تمام ملک یورپ پر حاوی ہو گیا جزائر آئر لینڈ و اسکاٹ لینڈ وغیرہ کے قدیم مذہبوں کو بالکل غیبت و نابود کر ڈالا روم کے مذہب ہی پیشواؤں اور پوپوں نے دینداری کے پیرایہ میں دنیاوی سلطنت حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا اور آخر کار معصوم اور امام شہنشاہ بن کر دین و دنیا دونوں کو ڈبو بیٹھا۔

خرابی کے آثار بہت پہلے سے ظاہر ہونے لگے اور نئے نئے رنگ سے اُس زرافروں اور بار کا ظہور ہونے لگا اُن لوگوں کے سروں پر فضیلت کی کپڑیاں بندھنے لگیں جو محض جاہل اور ناشایستہ تھے، اُن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت آگئی جو مذہب کے حیلہ میں ہزاروں طرح کے ظلم کرتے تھے، فسق و فجور کا بازار گرم ہو گیا، عیسائی مذہب میں پورے طور سے بت پرستی شروع ہو گئی، مذہبِ ملت کی مجلسیں گراہی و ذلت کے مجمعے ہو گئے، اکابر ملت نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیا، فرائض دینی کے تارک ہو گئے، اپنے ذاتی عیش و عشرت اور حظوظ انسانی میں ایسے منہمک ہو گئے، کہ دینی خدمتیں چھوڑ کر ملکی اور فوجی عہدے حاصل کرنے لگے، روم کے پادری جو وعظ و نصیحت کے لئے ملکوں میں پھرا کرتے تھے۔ وہ نہ صرف علم و فضل سے بے بہرہ ہوتے بلکہ فسق و فجور میں ہم تن مبتلا۔ اُن لوگوں نے شیخا اختیار کر لیا تھا کہ جہاں جاتے وہاں کے لوگوں سے اپنے لئے نذر و نیاز حاصل کرتے، اور اُس کے صلہ میں اُن لوگوں کو مغفرت نامے لکھ دیا کرتے گویا کہ گناہوں کا بخش دینا انہیں کے اختیار میں تھا۔ اور رضوان خازنِ جنت انہیں کل چاکر۔

بھلا یہ بات آپ لوگ اس وقت یقین کریں گے کہ مذہبی زور، اور معصوم پوپ، اور دیندار بادشاہ کے سبب اس قدر غلو اور تعصب بڑھ گیا تھا کہ معمولی طبیب تک نظر نہ آتے تھے، شفا خانوں میں سچا طبیبوں کے پادری مقرر ہوتے تھے جو کہ دوا دینے کے بدلے دعا دیتے اور پڑھا ہوا پانی پلا کر بیمار کو خدا کے رحم پر چھوڑ دیتے۔

کائسٹین ٹین بادشاہ قسطنطنیہ کی دینداری کی بدولت وہ زیارہ یورپ میں ہو گیا تھا، کہ یا رسیجا
دوا کے جھاڑ پھونک، دعا اور گٹھے تعویذوں، اور پادریوں کے کشموں، سے اچھا ہوا کرتے تھے۔
بیت المقدس کی پاک مٹی اور وہاں کی خاک کثرت سے لائی جاتی، اور جن اوشیشطانوں کے دور کرنے
اور مریضوں کے اچھا کرنے کے لئے بڑی قیمت سے بکتی۔ مرے ہوئے عیسائیوں کی ردحوں کی حاضرات
ہوتی، دلیوں کے خرقے اور ان کے پھٹے پرانے کپڑے بلکہ ان کی ہر ایک چیز تبرک سمجھی جاتی، اور مصیبت
کے دور کرنے کے لئے یہ چیزیں ضاعی آلات خیال کیجاتیں۔ پیروں اور شہیدوں کی زیارات کی اچھی طرح
پوچھا ہوتی، ان کے عرس کئے جاتے، ان کے قبروں پر گرجے بنائے جاتے، اور شکلات میں ان سے مدد
مانگی جاتی، غرض کہ کوئی بات دوسرا اور دہم اور بت پرستی اور جہالت کی ایسی باقی نہ تھی کہ جس کی برکت سے
یورپ اُس زمانہ میں محروم رہا ہو۔ ان اداہم اور وساؤس کے پیدا ہونے سے جو نتیجہ مذہبی تعصب کا تھا
علم بالکل مغلوب ہو گیا اس لئے کہ علم اور جھوٹے مذہب اور جھوٹے خیالات میں بالکل دشمنی ہے جھوٹا مذہب کسی
قسم کی تحقیقات کو جائز نہیں رکھتا، جھوٹا مذہب ہر قسم کی ترقی سے پرہیز کرتا ہے، جھوٹا مذہب انسان کے
قواسے دماغی کی ترقی کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے، جھوٹا مذہب اپنے تاریک خیالات کے قائم
رکھنے کے لئے تحقیق کا چراغ جلنے نہیں دیتا، برخلاف اُس کے علم ہر چیز کی تحقیق چاہتا ہے، ہمیشہ خیالات
میں ترقی اور ایلوں کا تغیر کرتا ہے اور وساؤس کی تاریکی کو اپنی روشنی کے سامنے ٹھیرنے نہیں
دیتا۔ اور اپنی سچی باتوں سے جھوٹے دہموں اور دوسو سوں کو انسانی دماغوں سے خارج کر دیتا ہے۔
مذہب اختلاف جائز نہیں رکھتا، مگر اُس کی اجازت دیتا ہے جب کہ یورپ میں مذہب اور جھوٹے اداہم کا
غلبہ ہوا اُس کا لازمی نتیجہ تھا کہ علم اُس کے خوف سے بھاگ کر کسی دماغ میں پناہ لے، اُس زمانہ میں علم
نے بعض بعض دماغوں کی کوٹھڑیوں میں پناہ تو پائی مگر ہمیشہ اُس پر غفل نگارہ، اور جس طرح جلاوطن کیا ہوا
قیدی بھاگ آنے پر موت کی سزا پاتا ہے باہر نکلنے پر اُس کو موت ہی کی سزا دی گئی یعنی جن دماغوں میں پناہ
لی تھی وہ توڑ دئے گئے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ گیلے لیونامی ایک شخص تھا جس نے یہ کہا تھا کہ زمین
آفتاب کے گرد پھرتی ہے، چونکہ یہ بات انجیل کے عقاید کے خلاف تھی وہ گرفتار ہوا اور سزا کا مستحق ٹھہرا
خدا جانے کیسے اچھے اُس کے نصیب تھے کہ مشکل اُس کی جان بچ گئی اگرچہ اس طور پر گیلے لیونامی بھاگ گیا
اور اُس کا خیال انجیل کے خلاف سمجھا گیا اور اُس پر اتنا دوا کا قتل ہوا مگر زمین کو آفتاب کے گرد پھرنے
سے مذہب نہ روک سکا۔ علم کا تحصیل کرنا ناجائز اور خلاف مذہب ہی اُس وقت نہ سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ جو لوگ
علم پڑھتے اور عقل کی باتیں سیکھتے وہ جادوگر سمجھے جاتے۔ بہت سے عالم جادوگری کے جرم میں زندہ جلا
جاتے اگر اُس زمانہ کے قواعد کے موافق کوئی سحر کی سزا سے بچ جاتا تو اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا،
بہت سے آدمیوں کے نام تاریخ میں ایسے پائے جاتے ہیں کہ جب وہ سین کے مدرسوں کے علم سیکھ کر گئے

اور اسناد و محنت کے دقیق اور نازک مسائل بیان کرنے لگے، تو سمجھا گیا کہ عیلم کے اُس درخت کا پھل کھا کر آئے ہیں جس کے کھانے سے آدم ہشت سے نکالے گئے اور جس کے پھل سپین میں مسلمانوں کے علمی و دانتوں میں پھیلے ہوئے سمجھے جاتے تھے۔

اب خیال فرمائے کہ ایسے ملک ایسی قوم نے اپنے آپ کو اُس اعلیٰ درجہ کی شائستگی پر کیونکر پہنچایا اور جمالت کے ایسے تاریک غار سے نکل کر علم و تہذیب کے آسمان پر چڑھ کر اپنے آپ کو دنیا کا آفتاب کیونکر بنایا۔

اس ترقی کے لیے اسباب میں سے مذہبی اصلاح، چھاپہ، اور قطب نما کی ایجاد، اور ملکی باتوں میں تالیف و تصنیف ہے۔

مذہبی اصلاح جسے رفاہیون کہتے ہیں نہ نہایت دلچسپ اور غور کے قابل ہے جس نے جو ابھی مختصر کیفیت مذہب عیسائی کی خرابیوں کی بیان کی اُس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ عیسائی مذہب اپنی مذہبی پیشواؤں کی خود غرضی اور حرص و طمع اور نفس پرستی کے سبب خراب ہو گیا تھا اور نہ بکے بہانہ سے بہت کچھ تسلط دنیا پر پوپ نے حاصل کر لیا تھا۔

اگرچہ بعض بعض خدا کے نیک بندے اس حال کے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے اور اصلاح کی خواہش رکھتے تھے مگر کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی آخر کار پندرہویں صدی میں لوگوں سے نہ رٹا گیا اور سلاطین میں پاپائیوں کی مصلحت پیدا ہوئی۔ اُس نے ان غلطیوں پر قوم کو متنبہ کیا اور اس میں اصلاح کی ضرورت ظاہر کی مگر عیسائی ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے قوم اُس کی نصیحتوں سے براشتہ ہوئی اور اُس کو کافر و مخالف قرار دیا گیا اور جلاؤ والا پتھر شائع میں ملک لینڈ میں ہنری ہشتم کے زمانہ میں اس میں اصلاح دین پیدا ہوا مگر وہ بھی اپنی کوششوں میں نا کام رہا، اسی طرح سے بہت سے شہروں میں بہت سے لوگوں نے کوششیں کیں لیکن دم کی چرج کی قوت کی وجہ سے کچھ نتیجہ حاصل نہ ہوا اسی زمانہ میں بہت سی کتابیں مذہب کے عقاید و اعمال کی خرابیوں اور غلطیوں کی نسبت تصنیف اور شائع ہوئیں اگرچہ تصنیف نے ان تصنیفات کی بدولت قوم کے فاضل سے بہت سی ایذائیں پائیں مگر لوگوں کے دلوں پر ان تصانیف کا اثر پڑا اور عموماً لوگوں کے خیالات اُس لیے نہ جو غہنے اور ہر جگہ اُس کا چرچہ ہونے لگا، اب وہ زمانہ آ گیا کہ ان مختلف اور متفرق کوششوں کا نتیجہ حاصل ہوا، وہ زمانہ ۱۵۲۰ء کا تھا کہ جس میں مشہور مصلحین عیسوی لوٹھر تاجی عالی ہمت شخص کھڑا ہوا، اور اُس نے مذہبی اصلاح کا وہ نظریہ شروع کیا، اُس نے کالینخان لومۃ لایسپر عمل کر کے نہایت جوش و خروش کے ساتھ مشائخ روم کی برائیوں کا اعلان کیا، اور متعدد رسالے اُن کے اعمال کی مذمت اور عقاید حق کے اثبات میں شائع کئے، اور ایک گروہ کثیر کو اپنا ہمدم اور موافق کر لیا، اور صنادید جرمن کو بالا اعلان خطبہ سنایا کہ چرچ روم سے منہ موڑیں اُس نے باوجود مزاحمت و مخالفت اکثر اہل قوت کے اُن کی مقاومت کی، اور اپنی آناوی اور عزائم میں پیش قدمی کی، اور باوازیلہ پچھلے لگا

کتم لوگ ترک (مسلمان) کے مقابلہ اور محاربہ کی کیا فکر کر رہے ہو، بڑا مٹا ترک تو یہی پوپ روم ہے جس کی شناخت تمام رومے زمین پر پھیل گئی ہے، یہی تو بڑا زہن دین ہے اُس کے ساتھ کلمہ کھانا مذاہب کا۔
 لوتھر کو بہت بڑی محنت اور تکلیف اٹھانی پڑی اور بڑے بڑے مباحثے اور مناظرے کرنے پڑے جس کا نتیجہ اُس کا جلاوطن اور آخر قید ہونا تھا اُس کے قید ہو جانے سے یہی نہیں ہوا کہ مذہبی جوش خیز مدت کے لئے ٹھنڈا ہو گیا بلکہ رفاہی مشن کو سخت صدر پہنچا، مختلف فرقوں میں نزاع و خصومت کے آثار نمودار ہو گئے اور اکثر مقامات میں آتش فتنہ بھڑک اٹھی حتیٰ کہ زراعت پیشہ اقوام نے بھی بسر کردگی انا باپ ٹسٹ منزرنگ مارے قتل کر دیا اور تمام ملک جرمن میں بے امنی پھیل گئی *

لوتھر اصلاح کے نشہ میں ایسا شرا تھا کہ قید نے اُسے اور بدست کر دیا، اور اُس کی طبیعت کے ولولے قید خانہ میں اور زیادہ جوش مارنے لگے، آخر اُس سے صبر نہ ہو سکا اور ۱۵۲۲ء میں جیل خانہ سے نکل کر ویٹن برگ میں جہاں خدا کی آگ بھڑک رہی تھی پہنچا، مگر اُسے ایک دوسری مشکل کا سامنا کرنا پڑا جو مخالفین کی مخالفت سے بھی زیادہ اُس کے کام میں خلل ڈالنے والا تھا یعنی اُس کا دوست اور مددگار اور اصلاح مذہبی میں اُس کا دہنا باز وارسس ملک بالینڈ کا رہنے والا اُس سے بچ کر گیا، لوتھر اپنے کام میں ایسا ڈوبا ہوا تھا کہ اُس نے اپنے دوست کی مخالفت میں نفسانیت کو ذرا دخل نہ دیا، اور اپنے گروہ میں بھڑک پڑنے کے بڑے نتیجوں کے پیش نہ آنے کے خیال سے اپنے دوست کی بہت کچھ دیکھ لی، اُس نے اپنے دوست کو لکھا کہ اگر تم اپنے خیالات کو میرے خیالات سے متفق نہیں کر سکتے تو غیرہ کر دو، مگر خدا کے لئے علانیہ مخالفت تو نہ کرو، اپنی گروہ کو مخالفین اور روم کے پادریوں کی مذہبی فوج کا ایک حصہ نہ بناؤ۔ نہ میں تمہارے خلاف کچھ کہوں نہ لکھوں نہ تم کوئی مناظرہ اور مجاہدہ میں کچھ لکھو۔ وارسس کو اپنے پرانے دوست اور اصلی مصلح سے کچھ ایسا ناخوش ہو گیا تھا کہ اُس نے ایک بات بھی اُس کی نہ مانی، اور لوتھر کے خلاف میں رسالہ لکھ ہی ڈالا۔ اس سے لوتھر کی یہ حالت ہوئی کہ عین ضبط اُس کے ماتھے سے جاتی رہی اور جواب دہنے پر مجبور رہا، اور آخر سلسلہ مناظرہ اور مقابلہ کا یہاں تک چھڑا، اور حصہ کی آگ یہاں تک بھڑک اٹھی کہ ان الفاظ کا استعمال ہونے لگا جو تہذیب اور صلاحیت کے بالکل خلاف تھے، لوتھر کو اس جوش نے نہایت نقصان پہنچایا اور اُس کے کام میں بہت خلل پڑا، یہاں تک کہ اُس کا غصہ اور اُس کے گروہ اور نا ملائم کلمات خود اُس کے معتقدین اور متقلدین کے دلوں میں کانٹوں کی طرح چبنے لگے، مگر با اینہم لوتھر اپنا کام کرتا رہا اور فریڈرک الیسیکسی اور اُس کے جانشین سے اُس وقت دلی، اور بادجو د پوپ روم کے فتوے کے جو لوتھر کے خلاف میں صادر ہوئے، لوتھر آزادی اور اپنے مجد ویطریقہ کے پھیلانے میں پہلے سے زیادہ مشغول ہوا، اور آہستہ آہستہ سب مشکلات پر غالب آیا۔
 چونکہ لوتھر کی اصلاح صرف خیالات کی اصلاح نہ تھی بلکہ اُس سے ایک بڑا انقلاب سلطنت اور حکومت میں پیدا ہوا تھا، اس لئے بہت قوت اور سختی کے ساتھ قوم نے اُس کو بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھا نا چاہا، باجبا جیسے

ہونے، اور اس نئے فرقہ کی تجویزوں کے روکنے کے لئے کونسلیں جمع ہونے لگیں آخر شہداء میں،
جرمنی میں شاہ جرمن کے بھائی کی میرٹھلی سے ایک اخیر جیسے منعقد ہوا، اور اس میں یہ قرار پایا کہ اس مجددی فرقہ
نے جو جو تغیرات مذہبی مسائل میں کئے ہیں وہ واجب العمل نہ سمجھے جائیں، تاہم فنیکہ کسی اجماع عام کے ذریعے
اس پر بحث ہو کر کوئی بات طے نہ ہو جائے، مگر کیا ایسی تدبیریں اس جہش کو روک سکتی تھیں جو کہ خدا نے
ان لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا جو مذہب کو خراب ہونا اور قوم کو ڈوبتا ہوا دیکھ کر حبسۃ اللہ اس کی دوستی
کے لئے کھڑے ہوئے ہوں، ایسے لوگ کہیں خود غرض اور دنیا پرست لوگوں کے ساتھ صلح کر سکتے اور
ذرا سے بھی اس خط سے اپنا قدم پیچھے ہٹا سکتے ہیں، جو خدا نے ان کے دلوں میں کھینچ دیا ہو۔ فرقہ مجددیہ
نے اس اجماع کو اجماع علی الضمانہ خیال کیا اور سب نے ملکر اس کے روکنے اور مقابلہ کرنے پر مخالفت
کی۔ اسی روز سے یہ تیار فرقہ پروسٹینٹ کے لقب سے مشہور ہوا جس کے معنی مخالف کی مزاحمت اور اپنی
آپ حمایت کرنے کے ہیں۔ اس کے بعد بہت سے جھگڑے ہوئے اور زبان و قلم سے گورکریف سناں
کی نوبت پہنچی اور ملکی لڑائیاں اصلاح کے حامیوں اور اس کے روکنے والوں میں ہونے لگیں۔ مگر ترکوں کے
متواتر حملوں نے ان اندرونی خونریزیوں کو جلد بند کر دیا اور شہداء میں دونوں فریق نے اس بات پر فیصلہ
کر لیا کہ ایک دوسرے کا معارض اور مزاحم نہ ہو، جس کو جو طریقہ اچھا معلوم ہوا اختیار کرے، اور اس طور پر اس سال
میں جرمنی نارمیشن کا خاتمہ ہو گیا۔ دوسرے ملکوں میں بھی اس اصلاح کا قدم پہنچا اور جھگڑے اور لڑائیاں شروع
ہوئیں اور اگرچہ ہر ملک اور ہر صوبے بلکہ ہر مقام پر اصلاح پھیلانے والوں کو کچھ نہ کچھ مصیبتیں اور تکلیفیں پہنچی
مگر اسپین اور اٹلی میں تو ایسے دردناک شاقعات پیش آئے اور ایسی بے رحمی سے کام لیا گیا کہ جس کے بیان
سے سننے والوں کے دل کانپنے لگتے ہیں، ان مقامات میں مردم کی چرچ کو اپنی کامل قوت اور سطوت کا مقابلہ
ریفائیشن کے استعمال کرنے کا بوجھ قریب موقع ملا، اور اگرچہ ریفائیشن کی اصلاح انہیں مقامات میں بڑی
کامیابی کے ساتھ ہوئی، لیکن انکو ریشن کے ظلم نے ابھرنے نہ دیا اور جن لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا
چراغ اپنے دلوں میں روشن کیا تھا وہی ان کے لئے داغ دل ہو گیا، اور ایسی آفتیں ان کو پھیلانی پڑیں کہ جن کا گمان
اور دم بھی نہ تھا، اس ہولناک اور وحشت انگیز دینی محکمہ نے جو ظلم و ستم ڈھائے اور جس طرح پرہیزی نوع انسان کے
ساتھ سلوک کئے وہ ان مردم خوار وحشیوں اور جنگلیوں کی بے رحمی اور وحشیانہ افعال سے کچھ کم نہ تھے
جو کہ انسان کو جلا کر ان کے گوشت کے کباب بنا کر کھایا کرتے ہیں، یہ ناپاک مذہبی عدالت ہولی آفس یعنی پاک
محکمہ کے نام سے قائم ہوئی۔ خفیہ تحقیقاتیں کیجائیں چھوٹے الزاموں پر لوگ گرفتار کئے جلتے ان کا مال اسباب
ضبط ہوتا آخر بیچاے بیکناہ گنہگار ہو کر یا قید ہوتے یا گلا گھونٹ کر مارے جاتے، یا زندہ جلتی ہوئی
آگ میں جلانے جاتے، اس محکمہ کی کارروائی آخر صرف عیسائی مذہب کے ان لوگوں پر محدود نہ رہی جو کہ
برہمنی اور دین کے مغرب سمجھے جاتے، بلکہ یہودی اور مسلمانوں کی واسطے بھی اسے وسعت دی گئی، فردی نیت

اور ایہ بلایک سلطنت میں ان کو لیشن کی ٹری گرم بازای ہوئی، میان ملک کردار السلطنت سیول کے قریب میں جلائے کے واسطے ایک بگ بنائی گئی، جہاں قریباً ہر روز انکو زلشن کے قربان شدہ آدمی جلائے جاتے تھے۔ اور اس سے بڑھ کر سنہ ۱۸۵۸ء ایک ایک انکو زلیتر جنرل مقرر ہو جس کے انکو زلشن کی شہادت اور تابکاری مکالم کے درجہ کو پہنچ گئی، جرم کا اقبال تو جرم ہی تھا مگر اس سے انکار کرتے ان کے بچنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی، ان کو جسمانی ایذائیں دی جاتیں، اور پھر قید کئے جاتے یا زندہ جلائے جاتے۔ میں اس موقع پر دل کے کپکپا دینے والے خونی واقعات اور ان مذہب کے پیرو میں ظلم اور وحشیانہ حرکات کرنے والوں کے ظلم و ستم کو نہ زیادہ بیان کرتا ہوں۔ اس کا موقع ہے مگر اس پر آپ قیاس کر لیجئے کہ اس مجیکے آنا بکائی بیچ سے اس کے زوال شہادت تک ۱۹۱۲ء زندہ جلائے گئے اور ۱۹۵۹ء آدمیوں کی جو دستیاب ہوئے انہیں جلائی گئیں اور ۲۵۰۱۹۱۲ء آدمی قید کئے گئے جس کی کل میزان صرف اس حکم کی قربانیوں کی دلوں سے ملے

تقر (۳۱۰۲۱) ہوتی ہے +

اس طرف تو یہ سخت تذبذب اصلاح کے روکنے اور مذہبی برائیوں کے باقی رکھنے اور عوام کو سہل نہ ہوئی اور دینی احکام سے جاہل اور بے خبر رہنے کے لئے ہو رہی تھیں، اس طرف اصلاح کا اثر بہت آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں پر ہو رہا تھا، نہ پوپ کے کفر کے فتوے اسے روک سکے، نہ قتل اور جلتے کا خوف اسے داسکا، باجوئیں مذہب کے خلاف قیام ہو گئیں تھیں، وہ رفتہ رفتہ ظاہر اور عوام میں پھیلنے لگیں، اور جو سیلاب مذہب کے خلاف جوش و خروش ہو ا تھا وہ کسی ظلم و ستم کی سہ سے نہ ٹر سکے۔ اور آخر کار بہت بڑے حصہ میں پورے پھیل گیا یہاں تک کہ اس کی پُر زور موجودوں نے پوپ اور اس کی معصومیت اور امامت اور سلطنت سب کو پورے سے ایسا بھا دیا کہ اس زمانہ کے جزو مد میں سوائے اس کے ڈھانچے کے کو وہ کبھی کبھی نظر آتا ہے کہیں اس کا لاشہ بھی دکھائی نہیں دیتا +

یہ مذہبی اصلاح صرف عیسائی مذہب کی اصلاح نہ تھی بلکہ حکومت اور اخلاق اور علم اور طرز معاشرت سب کی اصلاح کا باعث ہوئی اس لئے مذہب کے حیلہ سے پوپ اور پادریوں نے ان تمام باتوں پر اپنا قبضہ کر لیا تھا اور سب پر مذہب طوی، اور سب میں مذہب کا دخل تھا، مذہب کی اصلاح کے بغیر حقیقت کسی اور چیز کی اصلاح ہو نہ سکتی تھی، مذہبی روک ٹوک سے اصلاح کی قوت ہی گویا بیکار ہو گئی تھی، برسوں بلکہ پشتہ پاشت تک کی تقلید اور جہالت نے ان کو پادریوں کی باتیں ماننے اور ان کے پیچھے چلنے کے سوائے کسی کام کا نہ رکھا، تمام فطرتی قوتیں بیکار رہیں، تمام دلوں نے ٹھنڈے ہو گئے تھے، اس غار میں نے ان میں ایک نئی جان ڈالی اس نے گویا سوتوں کو خفقت کی نیند سے جگا دیا، اس کی بدولت ہر ملک میں نئے خیالات پھیل گئے، عوام الناس مذہبی کتابیں پکھنے اور پڑھنے لگے، ان پر مذہبی پیشواؤں کی بے ایمانیاں اور خود غرضیاں کھل گئیں، اور اصلی مذہب میں جو کچھ اپنی طرف سے انہوں نے ملا رکھا تھا اس کو وہ جان کئے، عوام الناس اور ادا نے

لوگوں میں اُن خیالات کے پھیلنے سے اُن کی تہذیب پر بڑا اثر پہنچا، اگرچہ بہت لوگوں نے اُن خیالات کو قبول بھی نہ کیا تاہم وہ مذہبی طریقوں اور مذہبی باتوں پر سرگرمی اور آزادی سے بحث کرنے لگے۔ پچھلے کے ترجمے اپنی اپنی زبان میں لکے اور اُس پر سے پادریوں کے ساتھ سوال و جواب کرنے کے لائق اور اس پر مستعد ہوئے، یہاں تک کہ پادریوں پر ہنستے اور ان کی جہالت پر افسوس کر کے کہنے لگے کہ ہم کو جو سبق پادریوں سے ملتا ہے اُس سے بہتر اور عمدہ سبق ہماری کتابیں ہم کو دیتی ہیں، رفتہ رفتہ پادریوں نے بھی اپنی چال بدلی اور مذہب کے حیلے میں آزادی کو دبانا اور تہذیب کو روکنا چھوڑ دیا، یہاں تک کہ اب وہ زمانہ آگیا جس میں مذہب اپنی قسمت پر چھوڑ دیا گیا اور پڑانے مذہبی خیالات اب جاہلوں کے دلوں اور کج بحث پادریوں کے دماغوں اور نامہ مخفیہ طبعیت عورتوں کے سینوں کے سوا کسی اور جگہ دکھاتے نظر نہیں پڑتے۔

دوسرا بڑا سبب چھاپہ کی ایجاد ہے اگلے زمانہ میں جہالت کی بڑی وجہ کتابوں کی قلت تھی اور عوام کا تو ذکر کیا ہے خواص اور اراک کو بھی قیمت کی گرانی کے سبب اُن کا ملنا دشوار تھا ساتویں صدی کے آغاز سے جب کہ مصر سے پیرس (لیف) کا یورپ میں آنا موقوف ہوا، دسویں صدی کے اختتام تک جبکہ کاغذ بنانے کا سزا ایجاد ہوا چمڑے کے سوا کوئی چیز لکھنے کے لئے موجود نہ تھی اور اُس کی قیمت اتنی گراں تھی کہ کتابوں کے لکھنے اور اُن کے باقی رکھنے میں اُس سے مدد نہ ملتی بلکہ عمدہ کتابوں کے تلف ہونے کا یہ بھی ایک بڑا سبب بن گیا، کہ ہر کتاب کے لئے گرانی قیمت کے سبب نیا چرم نہ خریدا جاتا، بلکہ حیرت کوئی نئی کتاب لکھوانا چاہتا تو دوسری کتاب کو مٹا کر اور اُس کے چمڑے کو صاف کر کے اُس پر دوسری کتاب لکھوائی جاتی، اس وجہ سے بہت قدیم تصنیفوں کی تصنیفات ضائع ہو گئیں، اور اُن کی جگہ زائدوں کی کتابیں اور جاہلوں کے پھسلانے کے مذہبی قصے، رگڑ، گیارہویں صدی میں کاغذ کے ہنر کی ایجاد نے اس وقت کو کچھ کم کر دیا اور کتابیں زیادہ لکھی جانے لگیں۔ چودھویں صدی کے وسط میں کاغذ کی ازرانی اور اصلاح کے خیالات اور لاطن زبان کے دوبارہ زندہ کرنے کے شوق نے پرانی کتابوں کی نقلوں پر لوگوں کو متوجہ کیا، اور کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد بڑھنے لگی، مگر چونکہ عمدہ عمدہ کتابیں پادریوں کے قبضے اور خالقانوں کی منتقل الماریوں میں بند تھیں، اور سوائے مذہبی پیشواؤں کے اور کسی کو اُن پر نظر ڈالنی حرام تھی، اُن کے ملنے میں بڑی دقت اور مشکل پیش آئی، اٹلی کے طالب علموں نے پندرہویں صدی میں قلمی کتابوں کے جمع کرنے اور علم ادب زندہ کرنے میں اپنی تمام عریں صرف کر دیں، مگر انسانوں کی خوش نصیبی سے جس وقت اٹلی کے زندہ دل علم دوست، علمی کتابوں کی تلاش کرنے میں سرگرم تھے اور نہایت دقت اور مشکل سے قلمی کتابوں سے کچھ علم حاصل کرتے تھے اُس وقت اتفاقاً یورپ میں ایک ایسی عمدہ ایجاد ہوئی جس کے برابر دنیا کے انسانوں کی تاریخ میں کوئی دوسری چیز نہیں، وہ ایجاد کیا تھی چھاپہ کی کل۔ اس ایجاد نے کتابوں کو سسا اور علم کو ارزاں کر دیا۔ اُس وقت سے پندرہویں صدی کے

کتابیں آسانی سے چھپنے لگیں اور لٹریچر کی اشاعت اٹلی میں کمال زد رشور سے ہونے لگی، گویا اُس وقت سے تعلیم کا آفتاب اُفق پر آیا، اور اُس نے اپنی نورانی شعاعیں دنیا پر ڈالنی شروع کیں، اگرچہ بعض کم نصیب ملکوں میں اُس کی روشنی کزیمیں اسی وقت نہ پڑی، اور فرانس انگلینڈ میں پندرہویں صدی کے آخر تک قدیم علم پھر زندہ نہ ہوا، تاہم اُس کی روشنی ہر وہ ملک میں چمکنے لگی اور رفتہ رفتہ ہر حصہ میں نیا کے پھیل گئی۔

چھاپہ کی ایجاد سے پہلے ہوا کہ مختلف علوم کی کتابیں آسانی سے اور بکثرت ملک میں پھیل گئیں یا پُرانے علوم محفوظ ہو گئے، یا اُن علوم کے جاننے والوں کی تعداد بڑھ گئی، بلکہ اُن دانشمند اور لائق لوگوں کو اپنے عمدہ اور مفید ترقی بخش خیالات کے عوام الناس میں پھیلانے کا عمدہ ذریعہ مل گیا، چھوٹے چھوٹے رسالوں اور پرچوں کے چھپنے اور بکثرت تقسیم ہونے اور سوسائٹی میں اُس پر بحث ہونے سے تہذیب اور طرز معاشرت پر اتنا اثر پڑا کہ پچھلے زمانہ کی صدیوں میں اُس کا ہونا ممکن نہ تھا، اٹھارہویں صدی کے شروع میں سوسائٹی کی اصلاح، اور اخلاق کی درستی، اور طرز معاشرت میں تہذیب پھیلانے کے لئے جو کام ٹیلا اور اسپیکٹر پرچوں نے کیا ہے وہ شاید بالیقیناً کسی بڑی سے بڑی کتاب نے نہیں کیا۔ اگرچہ چھاپہ کی کل ایجاد نہ ہوتی تو نہ رفرمیشن کو ایسی مدد ملتی نہ علم و تہذیب اس تیزی اور اس جلدی سے یورپ میں پھیلتے۔

رفارمیشن اور چھاپہ کے سوائے وسائل سفر کی آسانی اور تجارت کی ترقی نے بھی یورپ کی تہذیب اور تمدن پر بہت عمدہ اثر پیدا کیا۔

تجارت کی ترقی کو ایسی شکلات نے روک رکھا تھا جن کا کل کرنا کل تھا پہلے تو مال متاع کا جمع کرنا مشکل تھا پھر اُس کی حفاظت اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو سامان لیجانے میں چور اور ڈاکوؤں کا خوف تھا ہر زمیندار کے علاقے میں راہداری کا محضول دینا پڑتا۔ چودھویں صدی میں شمالی اور جنوبی ممالک میں تجارت کا آغاز ہوا جب تک مقناطیس کا استعمال پورے طور پر معلوم نہ تھا تکش تھا کہ اٹلی کے تاجر جزائر عبور کر کے نئے دریاؤں میں جانے کی جرأت کرتے، مگر مقناطیس کی ایجاد سے ویسا ہی تغیر ہو گیا، جیسا کہ چھاپہ کی کل سے، اُس سے جہانِ رانی کو بڑی ترقی ہوئی، اور کثرت سے جہاز ایک ملک سے دوسرے ملک میں آنے جانے لگے، اور تجارت کی ترقی کے ساتھ علم اور تہذیب میں بھی بہت بڑی ترقی ہوئی یہ جہاز صرف ایک ملک کا مال ہی دوسرے ملک میں نہ پہنچاتے تھے، بلکہ ایک قوم کے خیالات اور اُن کے علوم اور اُن کی تہذیب بھی دوسرے ملکوں میں لیجا کر پھیلاتے تھے۔

ان ضروری اور اہم اور حیرت انگیز ترقیوں کے اسباب کے سوائے اور بھی چند اسباب یورپ کی ترقی کے کے ہوئے جن کو لائق موزعین نے اپنی قابل قدر تصنیفات میں بیان کیا ہے۔

غلامی کی متوقفی اور اُن کی آزادی بھی ایک اُن میں سے ہے، یورپ میں بھی کیشیا کی طرح غلامی کی رسم جاری تھی، بلکہ وہاں غلاموں کی سختیاں اور تکلیفیں غیر قابلِ برداشت تھیں، اس سے انسانوں کا وہ کردہ جو اور انسانوں کی طرح اپنی فطرت میں آزاد اور خود مختار تھا جانوروں کی طرح ذی عقل اور ذی شعور طبقہ سے خارج، اور اپنے قدرتی حق سے آزادی کے محروم ہو رہا تھا، غلاموں کی آزادی سے صرف یہی نہیں ہوا کہ غلاموں نے اپنے قدرتی حقوق حاصل کئے، بلکہ وہ پردہ اُس کا اثر اُن کے اقوال پر بھی پہنچا، اُن کے اخلاق جس کا برتاؤ وحشی درندوں کی طرح غلاموں پر کرتے تھے درست ہو گئے۔ اُن کی شہستی جو غلاموں کے اوپر کاروبار چھوڑ دینے سے اور اُن کو سیلوں کی طرح ہمیشہ کام میں مجبے رہنے سے پیدا ہو گئی تھی جاتی رہی، وہ کام جو غلاموں سے لئے جاتے تھے یا خود اُن کو کرنے یا اُس کے لئے تھیلیوں کے ٹنڈے کھولنے پڑے۔

نئی زبانوں کی ترقی اور ملکی زبانوں میں تحریری ہونے اور کتابوں کا لکھا جانا بھی ایک اہم سبب ترقی کا ہوا، اول لاطن زبان علمی زبان تھی جب وہ مرنے لگی اور اُس سے نئی نئی زبانیں پیدا ہوئیں، تو بولنے میں اُن زبانوں کا استعمال ہوتا۔ مگر اُن میں لکھنا پڑھنا عجیب سمجھا جاتا، ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ جو زبان مردہ ہو جائے مگر کتابیں اور تحریریں اُسی زبان میں ہوتی رہیں، تو گو اور کوئی مخالفت مذہب یا گورنمنٹ کی طرف سے ہی نہ ہو، تب بھی وہ تھوڑے ہی آدمیوں میں محدود رہتی ہے، اُس سے زیادہ حصہ انسانوں کا مستفید نہیں ہو سکتا، جب سے لاطن زبان کی قید اُٹھ گئی اور اپنی اپنی ملکی زبانوں میں کتابوں کا لکھنا پڑھنا جاری ہوا، علوم کے خزائن کی گویا مُہر نادر ڈھکی اور پبلک کا ہاتھ اُس پر پہنچنے لگا۔

ان واقعات اور اسباب سے جو میں نے بیان کئے آپ کو معلوم ہو گیا، کہ یورپ کا زوال کیونکر ہوا تھا اور اُس نے ترقی کیونکر کی، اول جو زوال ہوا وہ مذہبی دست اندازی اور پوپ کے اختیارات اور اقتدار کے زیادہ ہو جانے، اور ہر دینی و دنیاوی معاملہ میں مذہب اور پوپ کے دخل دینے سے ہوا، اُس سے جمالت پیدا ہوئی، جمالت سے سپریشیشن یعنی ادا ادا اور دسائیں پیدا ہوئے، ادا ادا اور دسائیں سے بدکاریاں اور بد اعمالیاں پیدا ہوئیں، اُس نے قوم کو فحش اور ذلیل کیا، جب ترقی ہوئی وہ انہیں مصلوں کے طے کرنے کے بعد ہوئی۔ گویا اہل سبب یورپ کی تباہی اور بربادی کا مذہب اور مذہبی خیال تھا۔

یہ ایک لمحہ کے لئے نہ سمجھا جائے کہ اہل مذہب اور سچا عیسوی دین اُس کا باعث ہوا۔ کوئی سچا مذہب جو خدا کی طرف سے ہو دنیاوی ترقیات اور علوم و فنون کی اشاعت کا مانع اور تہذیب شناسکی کا مخالف نہیں ہوتا، مگر خود عیسائی مذہب میں اُن لوگوں کے خیالات سے جو کہ اول بت پرست تھے

اور پھر عیسائی ہو گئے، اور اُن کی صفائی بُت پرستوں کے اعتقادات، اور رسوم کے لئے سے جاتی رہی، اور پوپ اور پادریوں نے اپنے ذاتی اغراض اور ذاتی فوائد کے لئے مذہب کو اپنی پہلی حیثیت پر نہ رہنے دیا، ایک بڑے نامی محقق یورپین نے اس سے بڑی بحث کی ہے وہ لکھتا ہے، کہ دو بیسوں سے عیسائی مذہب اور بُت پرستی محفوظ ہو گئے اول روم کے نئے بادشاہی خاندان کی پولیٹیکل ضرورتیں، اور دوسرے نئے مذہب کی اپنے آپ کو ترقی دینے کی پالیسی۔

پہلی ضرورت نے کاسٹن ٹائن کو جو بڑا نامور بادشاہ اور عیسائی تھا مجبور کیا کہ وہ اپنے آپ کو نہ صرف عیسوی مذہب کا حامی بلکہ کل رعایا کا مربی بادشاہ بنادے چنانچہ اُس نے اپنی صلاح کل کی پالیسی اختیار کی، اگر اُس عیسائی گجے بنائے تو اُس کے ساتھ بت پرستوں کے مندروں کی بھی مرمت اور تعمیر کی، اگر اُس نے پادریوں بات سنی، تو محمد بن سے بھی اصلاح لی، اس شہنشاہ کو جو کہ صرف پادشاہت کا خواہاں اور بڑا دنیا کا آدمی تھا، اپنے آپ کو سب کی نظروں میں پیارا بنانے اور سلطنت قائم رکھنے کے لئے یہی مناسب معلوم ہوا کہ عیسائی اور بت پرست دونوں پارٹیوں میں اتحاد اور یکجہلی پیدا کرے۔

دوسری ضرورت یعنی عیسوی مذہب کی اپنے آپ کو ترقی دینے کی پالیسی کا نتیجہ ہوا کہ صادق الاعتقاد عیسائی بھی شہنشاہ کی اس پالیسی کے مخالف نہ ہوئے شاید انہوں نے یہ خیال کیا ہو گا کہ عیسوی عقاید بت پرستوں کے خیالات کے ساتھ ملنے سے مذہبِ یادہ اور جلد پھیل جاوے گا، اور آخر کار سچا مذہب ہی غالب آدے گا، اور اُس کی سب آلائشیں دور ہو جاوے گی۔

اب سنئے کہ اس آمیزش کا نتیجہ کیا ہوا عیسوی مذہب میں بت پرستی داخل ہونی شروع ہوئی، اور قدیم زمانہ کے یونانی توہمات پھر زندہ ہوئے اور جو کہانیاں اور قصے اور پرائی رو تھیں اُن کے دیوتاؤں اور ولیوں کی چلی آتی تھیں وہ دوسرے رنگ میں جلوہ دکھانے لگیں، شہنشاہ کے خوش کرنے کے لئے بت پرستوں کے ایک غار سے عیسے مسیح اور اُن کے ساتھ کے دو چوروں کی صلیب مع کتبہ اور کیلوں کے جو اُس وقت کام میں لائی گئی تھیں تین صدیوں کے بعد ڈھونڈ نکالی گئیں، اور کرامت اور معجزہ سے ثابت کر دیا گیا کہ یہ اصل چلی ہیں، جو کہیں یونان کے بُت پرست مذہب سے پیشہ کیا کرتے تھے اُن سب کی نقل عیسائی مذہب کے پادری کرنے لگے، چمکدار جیہ پادریوں کا تاج اور طرہ موم بتیاں صف بستہ گرجے میں جلتا، سونے چاندی کے ظروف کا چہرچہ میں استعمال کرنا، وغیرہ وغیرہ سب کو پادریوں نے خوشی سے اپنے یہاں داخل کیا، اور اُسے مذہبی مراسم قرار دیا، دس لوگوں کا بڑا نشان صلیب کے ساتھ قبول ہوا، اور دس لوگ جیسے کہ آدمیوں کے مرنے کے بعد دیوتا بناتے تھے، اُسی طرح عیسائی مذہب میں بہرہ دلی بنے لگے، پھر قلب بیت کا رنڈا نکل ہوا، اور حضرات پادری روٹی اور شراب کو عیسے کا گوشت اور خون بنانے لگے، جس نیزہ سے عیسے مسیح کو زخم لگایا گیا تھا جن کیلوں سے اُن کو صلیب پر لگایا تھا، جو کانٹے کا تاج اُن کو پہنایا تھا اُس کی یاد میں جشن ہونے لگا اور اُن ہی رسوم نے

ان کے یہاں تک اندھا اور بے سمجھ کر دیا کہ اگرچہ مختلف خانقاہوں اور مختلف گروں میں یہ تاج رکھا ہوا تھا مگر کسی نے ذی خیال کیا نہ اس کے کہنے کی جرأت کی کہ یہ اصل بیڑا غیر ممکن ہے اور ایک کے سوا بے باقی جعلی اور فحشی ہیں، غرض کہ عیسائیانہ کڈر تاج گیارہ پستوں کے عقیدے، اور ان کی رسمیں کسی نہ کسی لباس میں عیسوی مذہب میں داخل ہونے، اور روز بروز بڑھنے لگیں۔ یہاں تک کہ وہ تمام اودام اور سادس جن کا مخصوص بیان میلٹن کیس کے ذکر میں ہے کیا ہے، وہ ایسے عقاید دینی اور مذہبی خیالات ہو گئے، کہ ان کا انکار گویا ارتداد اور کفر تھا، اور چونکہ وہ علم مذہب کے مخالف تھے اس لئے پادریوں اور پوپ کو اس کے قایم رکھنے کیلئے علم کی تحصیل اور دوسری زبانوں کے سیکھنے کی مخالفت کرنی پڑی، اور اس طور سے مذہب علم کی تحصیل، اور تہذیب کی ترقی کا مانع اور جہالت کا حامی ہوا، غرض کہ اب نتیجہ نکلا کہ مذہب جھوٹا ہو گیا جو جھوٹی باتیں ہے مذہب میں لمبا و نیکی باجوہ رسمیں باجوہ خیالات مذہبی لوگ ماننے لگے، وہ علمی اور تمدنی ترقی کے ضرور حاصل اور زاحم ہو گیا اور چونکہ دینی ترقی اور منزل دنیا دی، ترقی اور منزل کے ہمتان ہے، اس کا اثر دنیاوی امور میں طرز معاشرت سلطنت اور حکومت پر بھی پہنچ گیا۔

اب اس کا ثبوت یورپ کی دوسری رفتار سے لیجئے، کہ جب اٹلی میں پوپ کی قوت گھٹنے لگی، باغی قوتوں میں تحریک پیدا ہونے کا موقع ملا، جیسی جیسی یہی قوت گھٹتی گئی باغی قوتوں کو ترقی ہوتی گئی، جیسے جیسے علم بھینا گیا، مذہب کا زور کم ہوتا گیا۔

اب اس موقع پر یہ بات بیان کے قابل ہے کہ یورپ میں ادل علم کیونکر بھینا۔ کس قوم اور کس ملک سے اور کس طرح یورپ نے علم سیکھا جس سے ان کو پادریوں پر غلبہ ہوا، اور جس نے مذہب کے غلط اودام، مذہب کے غلط خیالات، مذہب کی بیماریاں زنجیروں سے یورپ کو نکالا، وہ بد نصیب قوم ہماری ہے جس کی صحبت سے یورپ کے خیالات میں ترقی آئی اور ہم بد نصیب مسلمان ہیں جن کے علم اور تہذیب کی شعا میں اول اول دھن نہیں۔ اس کی بنیاد کو زبردستی وصلیبی لڑائیاں ہیں جو عیسائیوں کے ہاں جنگ مقدس کے نام سے مشہور تھیں جو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان بیت المقدس کے لئے ہوئیں، پطرس نامی اس کا بانی تھا اس نے عیسائیوں کو اس پر آمادہ کیا کہ زمین مقدس کو مسلمانوں سے پاک کریں پوپ نے وعدہ کیا کہ جو اس لڑائی میں شریک ہو گا وہ نجات ابدی کا استحقاق حاصل کرے گا، فرانس اور اٹلی کے ہزار ہا آدمی جمع ہوئے، طامعین اور مفیدین، شانہ زدن، امیر زادے، اور علماء اور عورت، دمر و صلیب اٹھا کر جل کھڑے ہوئے۔ یہ پہلا غول تھا جو مشرق میں مجنون پطرس کے ہمراہ مشرق کو روانہ ہوا، سلطان سلیمان نے یہ کیا کہ میدان میں ان سب کو پوپ کے وعدہ کئے ہوئے بہشت کے لینے کے لئے عدم کا رستہ بتایا، اس گروہ کی تعداد اسی ہزار تھی چار برس بعد دوسری گروہ نے عیسائیوں کی جس کی تعداد کئی لاکھ تھی حملہ کیا اور مشرق میں بیت المقدس مسلمانوں سے چھین لیا، اور بیچارے مسلمانوں کو بغیر تیز مرد عورت جوان اور بچے کے تزیغ کیا، مگر مسلمان پھر جلد بھل گئے

اور انہوں نے مقابلہ کرنا اور عیسائیوں کو نکالنا شروع کیا تب دوسری لڑائی کا آغاز ہوا اور ۱۷۹۳ء میں فرانس اور جرمن اور اٹلی کے لوگ قریب دو لاکھ آدمیوں کے فرانس کے بادشاہ فریپ کے زیر حکومت روانہ ہوئے، ان کا ترکوں نے وہی حال کیا جو کہ پطرس تارک الدنیا کے لشکر کا کیا تھا، ساحل پر اترتے ہی شاہ سلیمان نے اچھی طرح اُن کی خدمت کی، اور سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضہ سے نکال لیا، مگر سردار اور قیدیوں کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ آج تک اُس کی تعریف عیسائیوں کی زبان پر ہے، اس کے بعد یورپ کلینٹ ثالث نے تیسرے جہاد پر لوگوں کو آمادہ کیا، جس میں فرانس اور انگلستان کلبے شمار لشکر اپنے سردار بادشاہ کے روانہ ہوا، فرانس کا بادشاہ نو چند روز کے بعد اپنے ملک کو لوٹ گیا مگر چڑو شیر دل سلطان صلاح الدین سے لڑتا رہا، اور آخر کار مجبور دلاچار ہو کر عزت کے ساتھ صلح کر کے لوٹ گیا، اس کے بعد ۱۸۰۱ء میں چوتھے جہاد کی تیاری ہوئی کچھ جہادوں کی طرح اس کا بھی انجام ہوا، اور عیسائیوں کو شکست ہوئی اسی طرح سے دو جہاد او ہوئے اور ان کا نتائج میں یورپیں نہم والی فرانس کے آخری جہاد میں شکست پانے اور مرجانے سے خاتمہ ہوا، یورپ کے مورخین لکھتے ہیں کہ ان جہادوں کی بدولت فلسطین کی زمین میں چالیس لاکھ عیسائی دفن ہوئے۔ اگرچہ جہاد کے ختم ہونے کے زمانہ سے ۱۸۰۳ء تک جب کہ یورپ میں اصلاح شروع ہوئی قریب دو سو برس کے زمانہ گزرا اور اُس زمانہ میں بظاہر زیادہ ترقی یورپ نے نہیں کی۔ مگر جیسا کہ یورپ کے اکثر محققین لکھتے ہیں ان جہادوں سے یورپ کے خیالات میں بڑی اصلاح اور اُن کے خیالات میں تبدیلی کی بنیاد قائم ہو گئی، اول تو کردار کے نتائج اور متوازن شکستوں نے جو مسلمانوں کے ہاتھ سے ہوئیں، تمام عیسائی قوموں کے اعتقاد کو متزلزل کر دیا، اور وہ سمجھے کہ خدا کے بیٹے میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اپنی پاک زمین کو کافروں کے قبضہ سے نکال سکے، دوسرے جو ہزار عیسائی سپاہی اُن جنگوں سے واپس آئے اُنہوں نے بظاہر گواہ کیا کہ اُن کے دشمن ایسے لوگ نہ تھے جیسے کہ پادری بیان کرتے تھے بلکہ وہ بہادر خوش خلق اور انصاف پسند تھے۔

ہسلم صاحب اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان لڑائیوں کی بنیاد وہ نفرت اور تعارت تھی جو کہ عیسائی مسلمانوں کی کرتے تھے مگر مسلمانوں کے حالات اور صفات دیکھ کر، وہ تعارت کم ہو گئی، اور مسلمانوں کی سبب قبول سے تعصب بہت کم ہو گیا، اور مسلمانوں کی فیاضی نے عیسائیوں کے دل پر بڑا اثر کیا، چنانچہ تمام عیسائی مورخ سلطان صلاح الدین کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ تیسرے اسپین کے عربوں سے شیولری کا بہادارانہ اور متحملانہ خیال ہر طرف پھیلنے لگا، جس کے باعث ذاتی عزت کا عمدہ خیال پیدا ہو کر یورپ میں آئندہ ایک نیا قانون جاری ہو گیا، ایک محقق موصی لکھتا ہے کہ کچھ شک اس میں نہیں ہے کہ عورتوں کے ساتھ برتاؤ کے سوائے دوسری ہر چیز میں مسلمان سردار، یورپ کی شیولری کے فرائض ادا کرنے کے لئے ہر طرح قابل اور موزوں تھے، اس لئے کہ اُن کا خلاق، اُس وقت ہند اور شائستہ تھے جب کہ مغربی ممالک چشم انداز حالت میں ڈبے ہوئے تھے، شیولری ایک طریقہ تھا یا اسے کوئی ایک فرقہ سمجھ لینا چاہئے جو میڈل سبکس میں اس لئے قائم کیا گیا تھا، کہ اُس سے اخلاقی

اور تلافی خرابیاں دور ہوں، اور جو لوگ اُس میں شریک ہوں وہ خوش اخلاق و فاداریاں ہوں، خوش اخلاق سے صرف یہی غرض نہ تھی کہ آداب مجلس ادا کئے جاویں، بلکہ ہر شخص اپنا عجز و تکبر رٹا ہر کرے، اور دوسروں کی تدبیر سے عزت کرے، اور وفاداری سے مقصود تھا کہ ہر شخص اپنے تمام وعدوں پر ثابت قدم رہے، عہد شکنی، ایسی ذلیل چیز سمجھی جاتی کہ اُس کا دل کسی ہی بہادری سے نہیں مٹ سکتا تھا، شوری کی فیاضی کی نسبت حضرت انا ہی کہنا کافی ہو گا کہ وہ ایک لازمی عادت بھی جاتی تھی اور اس گروہ کا ہر شخص مال و متاع کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، ہر ایک کا مکان جو اس فرقہ میں شریک ہوتا ہما نداری کے لئے کھلا ہوا تھا۔

یہ ترقی اور اصلاح خیالات کی تو مسلمانوں کی صحبت اور مسلمانوں کی بہادری اور فیاضی اور خوش اخلاق دیکھ کر ہوئی اور پھر اور علم جس لحاظ سے عیسائی ملکوں میں پہنچا اُس کی کیفیت ہے کہ جب پوپ جنوبی فرانس اور اٹلی سے جلا وطن کر دئے گئے اور مذہبی باؤ کم ہوا، تو عربی علم نے اُٹلی کے شمال میں اپنا قدم جمایا، اور ارسطو کے فلسفہ نے جو اُس وقت عربی لباس پہنے ہوئے تھا، اپنے بہت سے عقیدہ اور غلامیہ پر پیدا کر لئے، اور لوگ کھلم کھلا اُس کو سیکھنے لگے، جب علم اس طور سے ایک مرتبہ شمالی اٹلی میں قائم ہو گیا، تو ہر سندہ ہر سندہ اٹلی میں پھیل گیا، اور قریبہ اور غرناطہ کے نو نہر علمی سوسائٹیاں قائم ہونے لگیں، اب تک تو اس کی ایک ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں قائم ہوئی تھی جو ہے جو گویا اس بات کی یادگار ہے کہ کس بہتہ سے سویڈریشن یورپ میں داخل ہوا تھا، ڈیڑھ صاب لکھتے ہیں کہ ابجرا کے مول سے جو ہم کو واقفیت ہوئی وہ عربوں کی بدولت، یہ علم عربوں نے پہلے اٹلی میں تیرھویں صدی کے آغاز میں داخل کیا اُس وقت لوگوں کا خیال اس علم کی طرف اس قدر کم مائل تھا کہ تین سو سال تک اس علم میں کوئی یورپین تصنیف نہیں ہوئی تھی۔ فرانس اور جرمن اور انگریزوں سے طالب علم علم کے اُس چشمے سے پانی پینے کے لئے آتے تھے جو صرف مورس یعنی مسلمانوں کے شہروں میں بہتے تھے، اور پھر اُس سے اپنے ملک والوں کو اُس کی طرف مائل کرتے تھے، ایک یورپین مورخ لکھتا ہے کہ ساری سن لوگوں یعنی مسلمانوں نے سوت اور دوتی سے کاغذ بنانے کا طریقہ ایجاد کیا اور اُس سے یورپ کو بہت فائدہ پہنچا، باری لونا، کی بندرگاہ سے اسپین کے مسلمان یہودی تجارت کی مدد سے بہت بڑی تجارت کرتے تھے، اور انہوں نے بہت سی تجارتی ایجادیں نکالی تھیں، یہ ایجادیں دوسرے علموں کے ساتھ انہوں نے یورپ میں داخل کیں، آپ لوگ پسین کر کچھ کم حیرت نہ کریں گے کہ یورپ کے خیالات تجارت کے پھیلنے کی نسبت ایسے غلط تھے کہ تجارت بالکل رک گئی تھی، پادری سمیرہ کے سخت مخالف تھے، اور تاگ اور دریا کے بیمہ کو اس وجہ سے ناپسند کرتے تھے، کہ وہ گویا خدا کو درغلانا ہے، اور زندگی کا بیمہ خدا کی مرضی میں مخالفت کرنا سمجھا جاتا تھا، سو دسے بارہن پر روپے دینے کے وہ سخت مخالف تھے، مگر یہ سب تجارتی طریقے اور ہنڈیوں کا رواج اُسی زمانہ میں اسپین کے فیئفوں کے ذریعہ سے یورپ میں جاری ہوا، ٹیکا لگانا بھی مسلمانوں کے ملکوں سے یورپ میں داخل ہوا، جس وقت لیڈی ہیری ٹیلی ماٹیک گریو نے اسلیم میں سطح زمین سے ٹیکا لگانے کی مسلمان ایجاد کو یورپ میں داخل کیا تو پادریوں نے اُس کی اس قدر

خلفت کی کہ اگر انگریز کے پاؤں شاہی خاندان نے اُس کیجا کو قتل نہ کیا ہوتا تو وہ ہرگز کام میں نہ لائی جاتی۔ لیکن
 سارا ملک مسلمانوں کی بدولت علوم و فنون اور تہذیب و شایستگی کے سبب دنیا کا بہت ہو رہا تھا جس زمانہ
 میں پیرس اپنی غلاظت اور عفونت سے پیش اور بنجارہ کا گھر تھا، اور غایت لطف کے سبب ناک بند کئے بغیر چلنا
 مشکل تھا، اُس زمانہ میں مسلمانوں کے شہر صفائی اور پاکیزگی میں جنت کے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ نہ صرف
 مسجدوں اور شاخا خانوں اور مدرسوں سے اُن شہروں کی رونق تھی بلکہ صفائی اور پاکیزگی اور روشنی کا ایسا انتظام
 تھا کہ ہر کوچہ اور گلی میں پختہ فرش تھا ٹرکوں پر اتنی قبیلےں روشن ہوئیں کہ شب میں چلنے والے اُن کی روشنی
 میں بھرا کرتے، ان شہروں کے دیکھنے اور اس انتظام کی خوبیوں پر نظر کرنے سے اُن عیسائی مسافروں اور
 سیاحوں کی آنکھیں کھلتیں اور جب وہ اپنے وطنوں کو واپس آتے تو بمقابل مسلمان شہروں کے اپنے یہاں
 کی غلاظت اور نجاست کو دیکھ کر دل میں نفرت کرتے، مگر وہ ہی خیالات اور پادریوں کی روک کچھ کرنے نہ دیتی، مگر
 جب پادریوں کا دباؤ کم ہوا اور علم پھیلنے لگا، اُس سے صفائی کی طرف خیالات رجوع ہوئے اور بیاریاں جو نتیجہ
 گناہوں کا سمجھی جاتی تھیں وہ عفونت اور غلاظت کا نتیجہ سمجھی جانے لگیں۔ اس سے لوگوں کے دل میں یہ خیال
 پیدا ہوا جو اُس زمانہ میں نہایت ہی عجیب سمجھا جاتا تھا کہ طاعون وغیرہ سخت بیماریاں خدا کی طرف سے مذہبی
 گناہوں کی سزا نہیں ہیں اور نہ اُن کے دور کرنے کا یہ علاج ہے کہ پیروں اور دلیوں کی منتیں مانی جائیں، بلکہ
 غلاظت اور لطف کا نتیجہ ہے اور صرف جسم اور مکانات اور راستوں کی صفائی سے وہ دور ہو سکتی ہیں۔
 بارہویں صدی میں پیرس کے رستوں پر ایسی خراب بدبو نکلتی تھی کہ اُن پر فرس بندی کرنے کی ضرورت
 واقع ہوتی، جس سے فوراً پیش اور بنجارہ جس سے جسم پر چھلے پڑ جاتے تھے کم ہو گیا اور صفائی حالت اسپین
 کے مسلمان شہروں کی طرح ہونے لگی اور قریطہ اور غلاظت کے نو نہ پر شاہ راہوں پر روشنی کا طرہ بھی
 جاری ہوا۔

اس طور سے اول مسلمانوں کی صحت اور وہ بھی وہ صحت جو لڑائی اور ہمد کے دنوں میں ہوئی، او
 بعد اُس کے مسلمانوں کے عمدہ عادات، عمدہ خصال کے اثر سے جس کا لڑائی کے وقت اُن کے دل پر ہوا، اور پھر
 مسلمانوں کے شہروں کی پاکیزگی اور صفائی دیکھ کر جس کا اثر سیاحوں اور مسافروں کے اوپر پڑا، پھر مسلمانوں
 کے علوم سے جو کہ مسلمان مدرسوں میں آکر سیکھے، اور مسلمان کتابوں سے جو کہ تجارت کی اور چیزوں کے ساتھ یورپ
 پہنچیں، یورپ میں تعلیم و تہذیب کی ترقی ہوئی، اور ترقی بھی ایسی جیسے کہ بیج سے درخت جس کے سایہ میں
 ہزاروں پناہ پاتے۔ جس کے پھول پھل سے لاکھوں خوش اور میر ہوتے، اور جس سے پھر اُن گنتی بیج پیدا ہوتے
 ہیں، جن سے خدا کی ساری زمین بارخ ہو رہی ہے۔

میرے اس مختصر بیان سے آپ کو اتنی باتیں معلوم ہو گئیں کہ یونان کیسا جاہل ملک تھا، اور پھر اُس نے
 علم کیسے ترقی کی، اُس کا مذہب جو خیالی اور اوانام پر مبنی تھا، علم کے حملہ کی تاب نہ لاسکا، اور اُس کے بچانے کی

ٹھوس ششوں کا نتیجہ ناکامیابی ہوا، پھر یہ بھی کہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ چند صدی اول یورپ کی کیا حالت تھی، اور
 وہ حالت مذہبی کے سب سے پیدا ہوئی تھی، اور وہ خدائی مذہب آدمیوں کے خیالات اور ان کی رسوم کے بجائے
 سے کیا خراب ہو گیا تھا، اور دوسری قوموں کی رسمیں اور دوسرے مذہب کے خیالات، مذہب میں مل جانے
 سے کیسے ایک حصہ مذہب کا ہو گئے، اور پھر وہ خیالات اہل مذہب کے اعتقادات سمجھے گئے، اور پادریوں کے
 نفسانی اغراض اور دنیاوی طمع کی وجہ سے ان کو ایسی تقویت ہوئی، کہ ان کو مذہب کے خلاف کتنا جرم اور بڑی
 سزا کے لائق سمجھا جاتا، اور ان غلط خیالات نے ہزار برس تک اپنا کامل قبضہ سارے یورپ پر رکھا، اور علم کو
 قلعہ بند کر دیا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب علم کے علم، اور عقل کے پرچم، اور فلسفہ کے پریرے یورپ میں اٹنے
 لگے، اور مذہبی خیالات کو شکست ہوئی تو ان خیالات کے لئے کوئی جگہ پناہ کی بھی باقی نہ رہی، بلکہ قلعوں
 میں بھی رہنے نہ پائے، قید بھی کافی نہ سمجھی گئی اور علم نے اپنا انتقام لیا اور بغیر جلا سے ان کو نہ چھوڑا، پھر یہ
 بھی آپ کو معلوم ہو گیا کہ جب تک علم کا غلبہ نہ ہوا کسی قسم کی ترقی نہ ہونے پائی سلطنت، تہذیب، شائستگی،
 دولت، ثروت، تجارت، زراعت، ہنر، صنعت، جس چیز کو لینے یہ سب کچھ علم کے بعد ہوا۔ علم کو فوج تھی کہ
 اُس نے ملک کو فتح کیا، اور دشمن کو نکالا، اور اس سے قلعہ خالی کرایا، باقی ترقیاں گویا رسول کا انتظام تھیں، کہ
 ملک کی اصلاح اور درستی کے لئے ان کی ضرورت ہوئی اور جب دشمن کا کھٹکانہ مادہ آرام سے تھک کر اپنے انتظام
 جاری کرنے لگے، پھر یہ بھی آپ کو معلوم ہوا کہ ایسی جہالت اور وحشت کے دور کرنے میں کیا مشکلات پیش
 آئیں، اور کیا کیا سامان اُس کے دفع کرنے کے لئے مہیا کئے گئے اور ان میں کتنی دیر لگی، اور یہ بھی آپ کو
 معلوم ہو گیا کہ اول علم کی شعاعیں ہمارے ہی ملک سے یورپ میں پہنچیں، اور ہماری صحبت اور ہمارے اطوار اور
 ہمارے عادات ہمارا علم ابتدائی حالت درست کرنے میں کیسا یورپ کا مددگار ہوا، پھر نہایت خوشی سے اپنے
 سنا ہوگا، جو رسمیں اور عادات ان خیالات اور ادغام اس وقت اڑنے سے ادھے مسلمانوں کے فرقوں میں پھیل چکے
 ہیں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ کے عیسائیوں کے مذہبی خیالات تھے، بلکہ یقیناً بعض سننے والوں کو خیال پیدا
 ہو گا کہ شاید میں نے خوش کرنے اور اپنے کچھ کو مزہ دار کرنے کے لئے بہت سی بے اصل کہانیاں اور غلط قصے یورپ
 کی جہالت کے گھر کو بھر دیے ہیں، غرض کہ ان سب باتوں کے جاننے کے بعد مجھے حقیقت کچھ کہنے کی اب ضرورت
 باقی نہیں رہی۔ اگر میں ان رسموں اور رسوم کو گناہا اور بتاتا بیٹھوں، جواب ہم لوگوں میں جاری
 ہیں، اور ان کی غلطیاں دکھانے کی کوشش اور جو کوئی نہ مانے اُس کے سامنے دلیلیں کرنا شروع کروں، تو گویا مناظرہ
 بلکہ کبارہ کی ایک نئی کتاب کے تالیف کرنے، اور اُس کے جواب اور جواب الجواب لکھنے کا راستہ کھولوں، چاہا لات
 ایسے صاف ہیں کہ اس پر بھی اگر کوئی نہ سمجھے اور دوسری قوموں کے ایسے بن اور روشن سبب ترقی اور
 زوال کے سمجھ کر بھی عبرت نہ پکڑے اور خود اپنے بزرگوں کے حیرت انگیز خیالات سے واقف اور اپنے حالات
 میں ایسی افسوسناک اور حیرت انگیز تبدیلی کو دیکھ کر ترقی کا خیال نہ کرے، تو سمجھ لینا چاہئے کہ خدا کی منہی ہمارے

کے خلاف ہے اور اُس کا قتل ہے ہماری خواہشوں کے مخالف مادہ ہو چکا ہے۔

اگرچہ میں نے تیسرے لکچر میں اس امر پر بحث کر رکھی ہے کہ جو اسباب یورپ کی ترقی کے باعث ہوئے، اُن میں سے بعض اسباب ہم کو بھی حاصل تھے، اُن کے موجود ہوتے ہوئے بھی کیوں ہم نے ترقی نہ کی اور ان اسباب سے ہم نے کیوں فائدہ نہ اُٹھایا، اور پھر کونسے اسباب ایسے ہیں جو ہم کو حاصل نہیں ہوئے، اور اُن کے نہ حاصل ہونے کے موافق کیا ہوئے، مگر اس موقع پر اتنا کہتا ہوں کہ ہمارے مقدس کو تھکری بدولت تعصب اور غلط خیالات جو تعلیم کے مانع تھے کسی قدر مٹ گئے اور جلد مٹ گئے اور ہم مسلمانوں کو معلوم ہو گیا اور جلد اور آسانی سے بغیر کسی کے قتل کرنے یا زندہ جلانے جانے کے جس کے اول سستی تو سرسبز تھی اُن کے بعد شاید میری باری آتی اور میرے بعد اکثر اُن کی جو اس چوترہ پر خاص کر بیویوں پر بیٹھے ہوئے ہیں کہ اسلام ان کو یا پاک اور ان ادا نام سے برا ہے اور اب میں دیکھتا ہوں کہ تعلیم کا یہ بڑا مانع زیادہ باقی نہیں رہا۔ لوگ اب تعلیم کی قدر کرتے ہیں تعلیم چاہتے ہیں تعلیم پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر جب تک کوئی قومی کالج نہ ہو اور جہاں مسلمانوں کو نہ بھی اور دنیاوی علوم کے حاصل کرنے کے سامان جمع نہ ہوں نہ شوق سے کچھ کام لگتا ہے تعلیم پورے طور پر حاصل ہو سکتی ہے اُس کے لئے سرسبز کی طرف دیکھو اور جو قومی تعلیم گاہ اُس نے بنائی ہے اُسے پورا کرنا اور روپے سے اُس کی مدد کرو۔ اگر یہ قومی کالج اُس کے جیسے ہی پورا نہ ہو ادا نام نے اس کام کو اُس کے ماتحتوں سے پورا نہ کرایا تو نہایت افسوس ہو گا۔ مگر جو لوگ اس تعلیم گاہ کو مفید جانتے اور مدد نہیں کرتے اُن کے حال پر۔

مجھے اس موقع پر شہنوی شریف کی ایک حکایت یاد آئی ہے وہ عرض کرتا ہوں :-

حکایت

آں سکے می مردو گریاں آں عرب ہیں چہ سازم مرا تدبیر چسیت سائے بگذشت و گفت ایں گریہ چسیت گفت در ملکم سگے بد نیک خو روز صیاد مہر و شب پاسبان تیز چشم و خشم گیسو روز و داں صید میکردی و پاسم داشتے گفت رخشن چسیت زخم خوردہ است گفت صبر کن بریں رنج در مرض	اشک می بارید و میگفت از کرب زین پس من چوں توانم بے تو نیست نوحہ و زاری سغی تو از بہر کسیت ہنک بھی میرہ میان راہ او شیر ز بودا و نہ سگے پہلواں نیک خود با وفا و مہرباں وز دراز و یک من نگذاشتے گفت جمع کلک زارش کردہ است صبراں را لطف حق بخشد و عرض
--	--

بعد از اس گفتش کہ اے سالارِ حُر گفت نان و زاد و دولت و خوشی من گفت چون ندی بیس ہلک نان نہاد دست ناید بے درم در راہ نال	حیث اندر پشتِ ایں نسیان پُر مے کشم از بہر قوتِ ایں بدن گفت تا ایں صدندارم اتحاد لیک بہت آب و ویدہ را بیکال
---	---

میں اب خدا سے دعا کرتا ہوں کہ خدا ہم لوگوں کو توفیق دے کہ سرسید نے جو کام شروع کیا ہے اور جس میں بلاشبہ قوم نے توفیق سے بڑھ کر امید سے زیادہ مدد کی ہے قوم پورا کرے جس سے سرسید کے جیتے جی علی گڑھ کالج کی عمارت پوری ہو جائے، سرسید کا توبہ توبہ قوم کا گمراہ بن جائے اور اس کے اخراجات کے لئے کافی سٹریٹ جمع ہو جائے اور اس سے قوم کے بچے توبہ توبہ سید کے بچے اتنے اور ایسے نکلیں کہ وہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی کے بیج ہوں اور رفتہ رفتہ ساری اسلامی زمین کو ہر ابھرا پھلا پھولا بلخ بنادیں۔ خدا ہے ہماری جانوں کا پورا کرنے والا، ہماری مصیبتوں کا رفع کرنے والا اور ہماری دعاؤں کا سننے والا ہے۔ ہم کو یہ سب کچھ مشکل ہے مگر اُس کو سب آسان ہے۔ پس اے میرے دوستو، اے میرے بھائیو، دعا کرو اور صدقِ دل سے دعا کرو خدا سے، اُس خدا سے جو علما اجل ہے اور جو دنیا کو پیدا کرنے والا نہایت عظمت اور رحمت والا اور تمام بندوں کے گناہ بخشنے والا قادرِ مطلق ہر ایک کے پاس اور ہر ایک کے حال سے خبردار ہے۔ وَهُوَ أَقْرَبُ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ اور جس کی شان ہے۔ يَفْعَلْ مَا يَشَاءُ وَيَجْزِي مَا يُرِيدُ وَمَنْ شِئِبِ الْمَصْطَرَّةِ إِذَا دُعَاهُ وَيَكْتَفِي السُّوءَ۔ هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قُتِلُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَةً وَهُوَ إِلَٰهُنَّ الْحَمِيدُ +



نمبر ۶

لکھنؤ

جوا شاعت اسلام پرنسپل محسن الملک پور نے ۲۰ مئی ۱۸۹۲ء کو حیدر آباد وکن میں دیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یا معاذینِ المسلمین!

آج ہمارے بزرگ اور واجب التعلیم حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب قلعہ قیس آبادی نے جس کام کے واسطے آپ لوگوں کو تکلیف دی ہے، وہ ایک ایسا کام ہے جو ہمیشہ سے ہمیں خوب اور پسندیدہ

رہا ہے، اور جس کی طرف ہماری طبیعتوں کا میلان اور ہمارے دلوں کا جوش و ولولہ مشہور ہے، وہ کیا ہو؟
اشاعتِ اسلام یعنی اسلام کا اُن قوموں میں پھیلنا، جہاں اب تک لوگ اس سے واقف نہیں ہیں، اور
خدا کے نام کی منادی اُن ملکوں میں کرنی یا جہاں اب تک اُس کے پاک نام کی منادی نہیں ہوئی۔ پس کیا
نیک اور مبارک ہے یہ کام، اور کیا دلکش اور پیارا ہے یہ نام، خدا برکت دے اُسے جس نے ایسے
نیک کام کے لئے آپ کو گول کو دعوت دی، اور رحمت ہو اُن پر جنہوں نے اُسے قبول کیا۔

میرے عزیز بھائیو! آپ کو خدا کا شکر کرنا چاہئے، کہ یہ مشکل کام شاعری کا جس کی مدد کیلئے
آج آپ جمع ہوئے ہیں۔ خدا نے آپ پر کیسا آسان اور سہل کر دیا ہے، کہ نہ اُس کا کرنا آپ کو مشکل ہے،
اور نہ وہ مصیبتیں اور تکلیفیں جو اُس کے پیچھے آپ کے بزرگوں نے اٹھائیں، آپ کے سامنے ہیں۔
اس کے آغاز ہی پر خیر فرمائے، کہ آج جو اس اہم کام کے لئے آپ جمع ہوئے، تو اُسی میں آپ کو
کیا تکلیف ہوئی۔ بڑی سے بڑی رحمت یہ ہوئی، کہ نسیم صبح کی طرح ٹھنڈے ٹھنڈے گھر سے نکلے،
اور بادِ بہاری کی مانند ایک ہوا دار پُر فضا مکان میں آپ پہنچے۔ جہاں دارِ پاک کیوں کی بدولت سر نے نہ
جانا کہ آفتاب کی تمازت اور دھوپ کی شدت کیا چیز ہے، صبارِ قمار گھوڑوں نے پاؤں کو خبر نہ ہو
دی، کہ کانٹوں کا درد اور آبلوں کی سوزش کس کا نام ہے۔ گھر سے بھوکے نہ نکلے کہ خالی پیٹ لگنا رہا۔
”الْجُحُوعُ الْجُحُوعُ“ پیاس کی تکلیف نہ ہوئی، کہ سوکھی زبان چلاتی ”الْعَطَشُ الْعَطَشُ“ پھر اس کے انجام
پر نظر کیجئے کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ چند درم یا چند نیارے مدد کرنی، اور اپنی کمائی میں سے ایک چھوٹا سا
حصہ دینا۔ نہ وطن سے ہجرت کی ضرورت، نہ خویشِ اقارب سے جدا ہونے کی حاجت، اب خیال کرو اپنے
بزرگوں کو کہ انہوں نے اس کام کے پیچھے کیسے دکھ اور درد سے، اور کبھی مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔
اسلام کی محبت میں اپنے پیاروں اور عزیزوں کو چھوڑا، ماں باپ جو روپوں کو خیر باد کہا، بے زاد و رطل
خدا کی راہ میں چل کھڑے ہوئے، ایسی جتنی جتنی پتھریلی زمینوں پر چلنا پڑا جہاں سوائے گرم آفتاب کے
اُن کے سر پر کچھ سایہ نہ تھا۔ اور ایسے پُر خار جنگلوں میں جانا پڑا، جہاں سوائے ٹوکدار کانٹوں کے اُن
کے سوجھے ہوئے پاؤں کا کوئی غماز نہ تھا۔ بھوک کے مارے پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے، اور پیاس کی
شدت میں زبانِ مُتہ سے نکلی پڑتی، مگر وہ خدا کے خیر، اللہ کی یاد میں سیرا کبھی اُف نہ کرنے، اور اسلام
کے پھیلانے اور خدا کی منادی کرنے میں، تمام مصیبتوں کو رحمت سمجھتے۔ حقیقت اسلام اُن کا تھا، اور
مسلمان وہ تھے، ہم نام کے مسلمانوں کو اسلام کی کیا قدر، اور اُس کا کیا درد۔ لیلیٰ کی یادیں یادیرِ پیاپی کا خزہ
قیس ہی جانتا ہے، اور عشق میں شیریں کے کوہِ کنی کے درد کی فرما دی کو خبر ہے۔

تو نازنین جہانی و ناز پروردہ تراز سوزِ درد و نیازِ ناخبر
چو دل بہرِ نگارے نہ بستہ لے ترازِ حالتِ عشاقِ بے نواخبر

انہیں کا وہ اسلام تھا، جس کی بدولت اس امت نے خَلِیْلُہٗ اَلْمَسَدُ کا لقب پایا، اور اُن کے حق میں خدا نے ”کُنْتُ مُحَمَّدًا خَلِیْرًا مَّتَّہُ اُخْرِجْتُ لِلنَّاسِ“ فرمایا، انہیں کی حریت انگیز کوشتشوں کے سبب اسلام کا جھنڈا اقبصر کے قصار و کسرے کے ایوان پر اڑنے لگا، اور ایشیا کے میدانوں اور یورپ کے پہاڑوں میں ”اَللّٰہُ اَکْبَرُ“ کی صدا گونجنے لگی۔

انہیں بزرگوں کی محنتوں اور تکلیفوں کا نتیجہ ہے، کہ اسلام اس تیزی اور اس خوبی سے پھیلا، کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے۔ انہیں کی تکلیفوں اور برداشتوں کا ثمرہ ہے، کہ خدا کے نام کی منادی جنگل اور دریا و غار اور پہاڑ، ویرانہ اور آبادی میں ہو گئی۔ انہیں کی وہ دل کی کپکپا دینے والی تقریریں تھیں، جنہوں نے عرب سے سنگمل جنگلیوں کے دلوں کو موم کر دیا۔ انہیں کے وہ پاک کلام تھے، جنہوں نے حبشیوں کے دلوں کو اسلام کے پاک عقاید سے روشن کر دیا۔ انہیں کی بدولت بتخانوں میں گھنٹوں کی مکروہ صدا کے بدلے وہ ”اَللّٰہُ اَکْبَرُ“ کی پیاری آواز آنے لگی۔ انہیں کی کوشتشوں سے آتشکدوں میں آگ کی بجائے خدا کے کلام کی روشنی ہونے لگی۔ شرک و بت پرستی کی تاریکی دنیا سے دُور ہوئی، اور ایک بیخون و بیچگون، بے شہرے نمون خدا کی منادی جہان میں پھیر گئی۔ بتخانے ویران ہو گئے۔ آتشکدے ٹھنڈے پڑ گئے، بت نشیت کا طلم ٹوٹ گیا۔ اور دہریت کا باطل خیال باطل ہو گیا۔ ”وَمَا تَلَا تَحَقُّقًا وَتَرْهَقُ الْبَاطِلَ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوًّا“ اگر ہم اپنے بزرگوں کی پیروی کرتے اور حُسنِ عقیدت و حُسنِ عمل کے ساتھ اسلام کی شاعت میں سرگرم رہتے، تو غالباً آج کوئی خطہ زمین کا ایسا نہ ہوتا جہاں خدا کا نام نہ پکارا جاتا۔ اور اسلام کا پرچم نہ لہکتا ہوتا۔ مگر افسوس کہ ہم میں سوائے نام کے کوئی تہصّل، کوئی عادت، کوئی چیز بھی اُن کی باقی نہ رہی، اور سوائے اپنی نفسانی خواہشوں میں مُشہک ہونے کے کوئی باتِ شریعت و اسلام کی ہمیں یاد نہ رہی۔ زبانہ اُن سے خالی ہو گیا، پر کوئی اُن کا جانشین نہ ہوا۔ وہ خدا کے بندے دنیا سے چل بسے، مگر کوئی اُن کا وارث نہ ہوا۔ اور وارث ہوئے، تو ہم سے جن پر صادق ہے خدا کا یہ قول ”فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِ هِمْ ذَلْفٌ اَصَاغُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ ذُرَاآئُکُمْ کَعُولٍ کَرَامِیْ“ دنیا کو عبرت کی نظر سے دیکھو، اور مسلمانوں پر اور اُن کے اسلام پر غور کر دو۔ کیا پاؤں کے کوئی ایسا خطہ زمین کا، جہاں کے مسلمانوں کو اسلام کا عشق، اسلام کا درد، اسلام کا شوق ہو، کیا دیکھو گے، کسی ملک میں کسی فرقہ کو مسلمانوں کے ایسا جس کو اسلام کی شاعت، اسلام کی حفاظت، اسلام کی حمایت کا کچھ بھی خیال ہو۔ کیا ہو گئیں وہ بستیاں، جہاں ایسے پاک مسلمان اور جانناز مسلمان آباد تھے۔ کہاں گئے وہ مسلمان جن کے اسلام اور اسلام کی خوبوں کی دنیا میں مصوم تھی۔ افسوس

۱۔ سچ آیا اور جھوٹ بھاگا، ایک جھوٹ بھاگنے والا ہے۔

۲۔ پھر اُن کے پیچھے ایسے ماحلف ہوئے جنہوں نے نماز کو چھوڑا اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی۔

صَدَنُوسٌ دِيَارُهُمْ خَالِيَةٌ وَعِظَامُهُمْ بِالْبَيْتِ سَوِيَّةٌ قَدْ عَفَتْ وَحَسُوهُمْ قَدْ انْطَفَتْ
مَا بَقِيَ مِنْهُمْ مُطْعَمٌ وَلَا طَاعِمٌ وَلَا تَارٍ وَلَا ظَاعِمٌ

قَائِنٌ كِلَامُ الصَّيْدِ مِنْ آلِ هَاشِمٍ وَلَا هَاشِمٌ بَاقٍ وَلَا اِهْلُهُمْ لَقُوا
نَبَذَهُ هُمْ اَيَّامُ السَّلَاةِ قَتَلَتْ دَثَّ وَفَقَّ قَهْمُ رَبِيبِ السُّوْنِ فَفَقَّ قَتَلُوا
نہایت ٹھیک کہا ہے ہمارے حال پر ہمارے ہندوستان کے سعدی حالی نے

وہ ملت اگر دوں جس کا قدم تھا ہر اک کھونٹ میں میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا وہ اُمت لقب جس کا خیر الالم تھا
نشاں اُس کا باقی ہے قرآن قد ریاں

کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی سماں

وگر نہ ہماری رگوں میں لمبویں ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں
دلوں میں زبانوں میں اور گفتگو میں طبیعت میں فطرت میں عادت میں خو میں

نہیں کوئی اسلام کی بات باقی

اگر ہے کسی میں تو ہے انصاف باقی

اس تاامیدی کی حالت میں اگر کوئی چیز ہمارے دل کی تسلی دینے والی ہے، تو خدا کا یہ وعدہ کہ "اِنَّهُ
مُتِمِّمٌ تَوْرَتِهِ وَكِتَابِهِ الْكَافِرُونَ"۔ وہ نور کیا ہے؟ اسلام، جس کی تکمیل اور تمام کرنے کا وعدہ خدا نے
فرمایا ہے۔ اگر ہماری حالتوں میں کچھ تبدیلی نہ ہو، اور ہم اپنی خواہ غفلت سے نہ نکلیں، اور اپنے بزرگوں
کی کہانیاں شکر و تحسین میں نہ آئیں، اور اپنے آباؤ اجداد کی نشانیاں دیکھ کر بھی ہمارے لوں میں گدگدی
پیدا نہ ہو، تو کیا شک ہے کہ جو اسلام نام کو باقی ہے وہ بھی نہ رہیگا، اور جو بیاری صورت اسلام کی
بگڑی ہوئی حالت میں نظر آتی ہے وہ بھی نظر نہ پڑے گی۔ کیا ایسا ہوگا؟ اور کیا خدا کی یہ روشنی مجھ جیسا ہے؟
لَا وَاللّٰهِ لَا، وَاللّٰهِ لَا، وَاللّٰهِ لَا، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ "هُوَ الَّذِيْ يَنْزِلُ
الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ" کیا سچ ہے یہ قول

اے قوجہ۔ اُن کی بتیاں خالی ہیں، اور اُن کی ہڈیاں بوسیدہ، اُن کی نشانیاں مٹ گئیں، اُن کی تلواریں کند ہو گئیں،
کوئی نہ را اُن میں کھانے یا کھلانے والا، پیٹیم یا مسافر۔ کہاں گئے بزرگانِ نبیؐ، اُن کی اولاد، اُنہوں
کے مصیبتوں نے اور زمانہ کی بلاؤں نے اُن کو تباہ کر دیا، اور بت نے اُن کو شاد کیا +

اے اہل مصر یہ ہے ع نہیں کوئی درہ نہایت کا باقی +

اے قسم ہے اُس خدا کی جس کے ہاتھ میں ہے میری جان +

یہ دہی جو برساتا ہے پانی بعد اس کے کہ لوگ ناامید ہو گئے ہوں اور پھیلاتا ہے اپنی رحمت اور وہی ہے کاموں کا
بنانے والا اور سب خوبوں سے موصوف +

”جب تک اس سے تپ تک اس“ پھر کہیں ہم اس چھوڑیں؛ اور خدا کی رحمت سے ناامید ہوں؛ اور کیوں ہوں ہم اگرچہ بیارہیں۔ مگر ابھی مرے نہیں، گو ضعیف ہو گئے ہیں، مگر ابھی دم نہیں توڑا، دماغوں کی قوت، دلوں کا جوش، طبیعتوں کا دلولہ، بلاشبہ بہت کچھ کم ہو گیا ہے، مگر ابھی باقی ہے۔ وہ دل کے ہلا دینے والی آواز اللہ اکبر کی جو ہمارے بزرگوں کے منہ سے نکلی تھی اگرچہ سست پڑ گئی ہے، مگر کانوں میں اب تک گونج رہی ہے۔ وہ خوبصورت تصویر اسلام کی جو ہمارے باپ دادا نے کھینچی تھی اور جس نے ساری دنیا کو اپنا گرویدہ اور رفیق بنا کر لیا تھا، اگرچہ نقاب میں چھپ گئی ہے، مگر ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی، وہ اب بھی خون جو ہماری رگوں میں دوڑتا پھرتا تھا۔ اگرچہ دھیمپا پڑ گیا ہے، مگر ابھی جاری ہے۔ وہ ہاشمی جوش جو ہمارے سینوں میں بھرا ہوا تھا، اگرچہ سست ہو گیا ہے مگر ابھی باقی ہے، وہ نور اسلام جس سے ہمارے دل روشن تھے اگرچہ دھندلا ہو گیا ہے، مگر ابھی بچھا نہیں۔ اب بھی اسلام کی حرارت اس قدر باقی ہے، کہ اسلام کا نام سن کر وجد میں آجاتے ہیں۔ مذہب کا جوش اب تک اتنا ہے کہ دین کی آواز سنتے ہی چونک پڑتے ہیں۔ اور یہی دلیل اس بات کی ہے کہ اسلام ابھی باقی ہے؛ اور مسلمان ہنوز زندہ ہیں؛ اور جب تک زندگی ہے۔ ہر طرح کی امید ہے۔ آج ہی کا یہ جلسہ اور اس وقت کا یہ مجمع، جہاں مسلمانوں کی اتنی پاک صوتیں اس وقت نظر آرہی ہیں، ہماری امیدوں کا تازہ کرنے والا، اور ہماری یاس کا مٹانے والا ہے۔ یہ جلسہ نہ کوئی شاہجہاں ہے؛ جہاں لوگ سلام و مجرے کے لئے جمع ہوئے ہوں۔ نہ کوئی تقریب شاہی اور خوشی کی ہے؛ جہاں سیر و تفریح کے لئے آئے ہوں۔ ایک اللہ کے بندے نے خدا کی راہ میں قدم رکھا؛ اسلام کے درد نے اُسے بتایا کیا؛ اور اُسے اسلام کے پھیلانے کا خیال آیا۔ دوسرے نے اُس کی مدد کی؛ اُس کے دل کو ٹھیرایا۔ اور خدا کے نام کی مسادی کرنے میں اُس کا شریک ہوا، اور وہ دونوں خدائی فقیر، کشکول ہاتھ میں لئے اور جھولی گلے میں ڈالے ہوئے، شَیْنًا لِلّٰہ، پکارتے یہاں پہنچے؛ ایک تیسرا خدا کا بندہ اُن کی مدد پر کھڑا ہوا اور آپ کو دعوت دی۔ اسلام کا نام سنتے ہی وہ مذہبی جوش جو آپ لوگوں کے دلوں میں چھپا ہوا تھا سوچ زن ہوا، اور آپ کو یہاں تک لایا۔ وہ محبت اسلام کی جو آپ کے سینوں میں پوشیدہ تھی، جوش میں آئی، اور اُس نے آپ کو یہاں تک پہنچایا پس حاجی عبد اللہ صاحب عرب کا ایسے نیک کام پرست ہونا، مولوی حسن علی صاحب اعظم کا اُن کی مدد پر کھڑا ہونا، حضرت مولانا وسیتنا حاجی شاہ عبد الرحیم صاحب قبلہ کا آپ کو دعوت دینا، آپ سب لوگوں کا آنا اور اس کام میں مدد کے لئے آمادہ ہونا، یہی باتیں ہیں جو ہمارے مرے ہوئے دل کو زندہ کرنے والی، اور ناامیدی کی حالت میں امید دلانے والی ہیں۔ اے کاش خدا ہمارے امید پوری کرے اور ہم کو ایسے نیک کام میں مدد کرنے کی پوری توفیق دے۔

اے میرے عزیز بھائیو! جناب مولوی حسن علی صاحب واعظ ابھی آپ کو سمجھا چکے ہیں حاجی عبد اللہ

صاحب عرب اور وہ دونوں امریکہ میں اسلام کی منادی کرنی چاہتے ہیں، اور اُن کو یہ شوق دیں گے ایک ایسے ذمی و جاہل اور ذمی علم آدمی کے سبب سے پیدا ہوا ہے، جس نے دین اسلام کو سچا اور برحق سمجھ کر قبول کیا ہے، اور اپنے ملک میں اسکی اشاعت کرنے کا خواہشمند ہے، جو کچھ اُس کا خیال ہے۔ اور جس طرح وہ اس کام کو انجام دینا چاہتا ہے، اُس کی پوری کیفیت آپ کو اُن تحریروں سے معلوم ہو گئی جو مولوی صاحب نے ابھی پڑھیں، اُس کی نسبت مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری غرض اس وقت کھڑے ہونے اور اس پریشان تقریر کرنے سے صرف یہ ہے کہ میں اُس تحریک کی تائید کروں، اور اس میں اُن کا ہم صغیر بنوں۔ مگر یہ کام ایسا ہے جس میں مجھے بہت ہی تھوڑا کہنا ہے۔ اس لئے کہ اسلام کی اشاعت کے ثواب، اور اُس میں مدد دینے کی فضیلتیں، جو کچھ خدا اور اُس کے رسول نے فرمائی ہیں، وہ ایسی ہیں کہ ہر مسلمان کے دل پر توحید کے کلمے کی طرح نقش ہیں۔ اسلام کی دعوت دینے کی فرضیت ہر گز کو معلوم ہے۔ اس لئے اس کا بیان درحقیقت تحصیل حاصل ہے۔ البتہ ایسے موقع پر جو شکوک اور شبہات پیدا ہو سکتے ہیں، اور اس کے اختلاف میں جو خیالات ظاہر اور جو دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں، اُن کا بیان ضرور ہے۔ تاکہ اس کام کے شروع کرنے سے اول اُن پر غور اور اُن کا تصفیہ کر لیا جائے۔

اول یہ آیا کہ اسلام کی اشاعت کا اور کاموں پر جو مسلمانوں کی بھلائی کے لئے ہیں ایسا مقدم ہے، کہ اُن سب کو چھوڑ کر اسی کو اختیار کرنا چاہئے، یا یہ کہ پہلے مسلمانوں کی اور ضرورتیں پوری، اور اُن کی حالتیں درست کر لی جائیں، تب اس کام کا خیال کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اُن تمام مشکلات پر غور کر لیا جائے، جو اس کام میں پیش آنے والی ہیں۔
تیسرے یہ کہ وہ کونسا ذریعہ ہے جس سے مسلمانوں کو طہیتان ہو، کہ جس غرض کے لئے وہ چہزہ دیئے اُسی میں اُن کا رد یہ صرف ہوگا، اور جس کام کے لئے اُن سے روپیہ لیا جائیگا وہ اچھی طرح چلیگا۔
چوتھیں باتیں ہیں جو بظاہر تصفیہ طلب ہیں۔ اس لئے میں ان کو ذرا تفصیل سے بیان کرنے، اور آپ کے قیمتی وقت لینے کی اجازت چاہتا ہوں۔

پہلے امر کی نسبت بلاشبہ بہت کچھ راہوں کا اختلاف ہوگا، اور مختلف مذاق مختلف خیال اور مختلف طبیعتوں کے آدمی، اپنے مذاق اپنے خیال اور اپنی طبیعت کے موافق اُس کی نسبت لے دیں گے۔ کوئی کہیگا، کہ اور بہت سی چیزیں اسلام کے فائدے اور مسلمانوں کی بھلائی کی ایسی ہیں جو اُس پر مقدم، اور مسلمانوں کی توجہ کی مستاج ہیں، اور بہت سے کام مسلمانوں کے فائدے کے ایسے ہیں جن کو اسی ملک کے مختلف حصوں میں مختلف طور پر غریب مسلمان انجام دینا چاہتے ہیں، مگر رد یہ کی مدد نہ ملنے سے اِدھر سے پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کو چھوڑ کر نئی دنیا میں اسلام پھیلانے کا خیال کرنا مناسب نہیں ہے۔ اور اگر اسلام کی اشاعت کا کام اُن پر مقدم ہے، تو امریکہ کی کیا خصوصیت ہے، خود ہندوستان

میں اس کی ضرورت ہے، افریقہ والوں میں بہت کچھ مادیہ اسلام کے قبول کا پایا جاتا ہے۔ لڑپول سب زیادہ مدد کا محتاج ہے۔ ان سب کو چھوڑنا اور امریکہ کو اس کام کے لئے منتخب کرنا ترجیح بلا مرجح ہے۔

بعض لوگ خصوصاً وہ جو زیادہ دور اندیش اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے خواہاں ہیں، کہیں گے کہ اب بھی دنیا میں مسلمانوں کی کچھ کمی نہیں ہے، مگر کیا بلحاظ عقائد و اخلاق کے، کیا بحال تعلیم و تربیت کے، کیا بلحاظ تہذیب و معاشرت کے، وہ بہت پیچھے پڑے ہوئے ہیں، اور ان کی حالت بہت کچھ اصلاح کی محتاج ہے، وہ روز افزوں ذلت و ادبار کی حالت میں گرفتار ہیں، اور افلاس اور جہل کی مہلک بیماری میں مبتلا، ہر روز ایک نئی مصیبت کا انہیں سامنا، اور ہر شام ایک تازہ بلا سے ان کا مقابلہ ہے۔ نہ ان کی تعلیم کا بندوبست ہے، نہ تربیت کا انتظام۔ سینکڑوں خاندان ایسے ہیں، جو علم کے سعدن اور کمال کے مخزن تھے، اور جہاں سے صد ہا مسلمان عالم بن کر نکلتے تھے۔ اب ان کا پتہ بھی نہیں ہے۔ ان کی اولاد جاہل، علم سے بے بہرہ اور در بدر مارے پھرتی ہے، جس کا نہ کوئی پڑساں ہے نہ بھرپور۔ اسی طرح ہزار ہا گھرانے ایسے امیروں کے تھے، جن کی دولت و ثروت سے اسلام کی عزت تھی، اور جن کی بدولت ہزاروں مسجدیں آباد، سینکڑوں خانقاہیں معمور، اور بیسیوں مدرسے جاری تھے۔ اب ان کا نشان بھی نہیں۔ ان کے سپاہیوں نے غفلت، فقیروں اور درویشوں کو محتاج ہیں، کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی، کہ قانون نے ان کا اور ان کے بچوں کا کیا حال کیا، اور بھوک کے مارے وہ کب مر گئے۔ ایسی حالت میں کب مناسب بلکہ جائز ہے، کہ ان کی خبر نہ لی جائے اور ان کی اس افسوسناک حالت پر کچھ توجہ نہ ہو، وہ اسی دردناک حالت میں چھوڑ دئے جائیں، اور ایک دور و دراز ملک میں اسلام پھیلانے کے لئے روپیہ جمع کیا جائے۔ اول اپنے درد کی دوا کرنی لازم ہے، تب دوسرے مریض کی خبر لیتی چاہئے۔ پہلے اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر کی مرمت مناسب ہے، تب دوسرے کے لئے محل اور عمارت بنانے کی فکر اس لئے مناسب بلکہ واجب ہے، کہ مسلمانوں کے لئے وہ ذریعے پیدا کئے جائیں، جن سے ان کی مصیبت دور ہو۔ اور ان کے واسطے وہ سامان جمع کئے جائیں جن سے وہ اس فلت سے نکلیں۔ ان کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ اور ان کو لئے مدرسے بنائے جائیں ان کی تربیت کا انتظام کیا جائے۔ اور جن نیک بندوں نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ ان کو مدد دی جائے۔ اور مسلمانوں کے افلاس اور جہل سے نکلنے کی تدبیریں، جو مختلف حصوں میں ہندوستان کے ہو رہی ہیں، پوری کی جائیں۔ اس کے بعد اسلام کی اشاعت کا دوسرے ملکوں میں ارادہ کرنا چاہئے۔

اگر زمانہ کے انقلاب اور اس کے نتائج خصوصاً نئی تعلیم اور نئی تہذیب کے بڑے نتائج پر غور کرنے والوں کی باتیں سنئے، تو وہ کہیں گے کہ اسلام کی شاعت بلاشبہ نہایت عمدہ اور نواب کا کام

ہے۔ مگر اسلام کی حمایت، اور اُس کی حفاظت، اُس پر مقدم ہے۔ جس طرح کہ حملے کی یہ نسبت مدافعت زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اسلام پر تو چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ غنیم کے متواتر حملوں اُس کے مورچے ٹوٹ گئے ہیں۔ اس کا دروازہ کھل گیا ہے۔ دشمن کی فوج گھر میں گھس آئی ہے۔ اور اَنَقَتْلُ الْقَتْل کا غل مچا ہوا ہے، نہ محصورین کا کوئی بچانے والا ہے، نہ عورتوں اور بچوں کا کوئی محافظ۔ گھر میں آگ لگی ہوئی ہے، کوئی اُس کا بجھانے والا نہیں، فوج منتشر ہوتی جاتی ہے۔ کوئی اس کا روکنے والا نہیں، اس پر جو لوگ زندہ ہیں، اور کچھ کر سکتے ہیں، اُن کو یہ خطبہ ہے کہ دوسرے ملک پر چڑھائی ہو۔ اور نئے قلعے فتح کئے جائیں۔ نئی تعلیم، اور نئی تہذیب کے مسلسل اور متواتر حملوں سے اسلام کے عقیدے، مذہب کی باتیں، اور شرعی احکام، ہمارے تو تعلیم یافتہ بچوں کے دلوں سے حرفِ غلط کی طرح مٹتے جاتے ہیں۔ اور لاندہ بی و بال کی طرح پھیل رہی ہے۔ نہ اسلامی سلطنت باقی ہے۔ کہ حکومت کا خوف اُسے روک سکے، نہ قاضیوں کے حکم اور مفتیوں کے فتوے کا ڈر ہے کہ جان بچانے کے خیال سے کفر کی بات کوئی زبان سے نہ نکال سکے۔ یہ تو آنا دی کا زمانہ ہے۔ اُسکی برائیوں کی روک تھام بھی نادی ہی سے ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت اور ایسے وقت میں ضرورت ہے اس کی، کہ ایسی مذہبی تعلیم سے، جو اس زمانہ کے مناسب ہو۔ اتحاد و لاندہ بی کے خیالات بند کئے جائیں۔ اور انگریزی تعلیم کے بُرے نتیجے، ایک نئی قومی اور ایک نئی مذہبی تعلیم سے روکے جائیں۔ نئی نئی کتابیں تالیف اور درس میں داخل ہوں نئی تحقیقاتوں اور نئے علم کلام سے مذہب کی حمایت اور حفاظت کی جائے۔ ان باتوں کو چھوڑنا اور امریکہ میں مذہب پھیلانے کا خیال کرنا۔ دور اندیشی اور دانشمندی سے بعید ہے۔

دوسرے شبہ کی نسبت۔ کہ کونسی باتیں اس کام کے آغاز کرنے سے اول خیال اور تصفیہ کے لائق ہیں۔ بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔

سب سے اول یہ کہ جہاں اسلام پھیلانے کی فکر ہے۔ وہاں علوم و فنون کی ترقی اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی ہے۔ وہاں کے باشندوں کے مذاق۔ اور اُن کے خیالات دوسرے ہی قسم کے ہو گئے ہیں۔ اُن لوگوں کے دلوں سے خود اُن کے مذہبی عقائد جو ہوتے جاتے ہیں۔ وہ خود اپنے یہاں کی وحی الہامی باتوں سے منکر۔ اور مذہب اور علم کی کشمکش میں حیران پریشان ہیں۔ وہاں مذہب کی روشنی خود چھپی ہوئی جاتی ہے اور علم کی نئی روشنی پر سب کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں عیسائیت کے بدلے دہریت اور حکمت پھیلتی جاتی ہے۔ پھر اُسے روز بروز ایسی ترقی ہے۔ کہ نہ پادریوں کی تقاریر و سختی اور حکومت کی قوت۔ اُسے دبا سکتی ہے۔ وہاں مذہب کا جوش ہی باقی نہیں رہا۔ پس اُن درحقیقت اسلام پھیلانا۔ اُن لوگوں میں نہیں ہے جو عیسائی یا کسی مذہب کے پابند ہیں۔ بلکہ اُن شخصوں میں ہے جو مذہب کے منکر۔ اور حقایق ہستیاء کے معتقد۔ اور علم کے پیرو ہیں۔ گویا یہ مباشرتہ اسلام اور عیسائیت میں نہ ہوگا۔

بلکہ اسلام اور فلسفہ میں

اس لئے دیکھنا چاہئے کہ جس حریف سے مقابلہ پڑ گیا۔ اس پر چڑھائی کرنے کا سامان اور اس کے اوپر غالب آنے کے آلات بھی ہمارے پاس موجود ہیں کہ نہیں۔ اس مسئلے کو بالکل ایک لڑائی سمجھنا۔ اور یہ خیال کرنا چاہئے۔ کہ گویا ہم کسی مضبوط سنگین قلعے پر۔ جس پر تو یہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور جسکی توپوں کے گولے میلوں اور کوسوں تک کی خبر لیتے ہیں، چڑھائی کرنا چاہتے۔ اگر ہمارے پاس اپنے تیر و کمان اور ڈھال تلوار کے سوا ہے، کوئی دوسرا سامان، جو اس چڑھائی کے لئے ضرور ہے نہ ہو مثلاً نہ تو قلعہ شکن توپیں ہوں، اور نہ ہم کے گولے، نہ سرنگ لگانے کے لئے بارود ہو، نہ قلعہ اڑانے کا سامان، نہ ہمارے سپاہیوں کو ایسی لڑائی کا تجربہ ہو، اور نہ ایسے قلعوں پر چڑھائی کرنے کی مشق، تو لڑائی کا ارادہ، اور قلعہ کے فتح کی اُمید، محض نادانی ہے۔ اس پر بھی اگر صرف شہادت کا شوق ایسے مقابلہ پر ہے جائے، تو ایسی شہادت خود کشی سے گھر بیٹھے بخوبی حاصل ہو سکتی ہے۔ بھلا خیال تو کیجئے کہ ایسے ملک میں جہاں علم و حکمت کی ایسی ترقی ہو، کہ اسطو اور افلاطوں کا کوئی نام نہ لیتا ہو، جن کے علم و حکمت کے مقابلہ میں پیرانا فلسفہ صرف غلط کی طرح صفو دل سے ٹھوہر گیا ہو، جنہوں نے تجربات اور مشاہدات سے ہر چیز کو علم الحقیقین سے عین الحقیقین کے درجے پر پہنچا دیا ہو، جن کی تحقیقاتوں و تحقیقاتوں کے نتیجوں پر اعجاز و کرامت اور سحر و طلسمات کا شبہ ہوتا ہو۔ وہاں ایسے لوگوں کا، جو دوسرے مذہب والوں سے ملنے کو گناہ، دوسرے لوگوں کی زبان سیکھنے کو حرام، اور فلسفہ پڑھنے کو کفر جانتے ہوں۔ اور جو بہت سی ایسی باتوں پر، جو خلاف حکمت، خلاف فطرت، اور خلاف واقع، ہوں۔ تقلیداً اعتقاد کرتے ہوں ایک تعلیم یافتہ اور لاد مذہب قوم کو مسلمان بنانے کے لئے جاتا، اور اُسے اسلام کی دعوت دینی کی پیروی ہوگی، اور ایسے لوگوں کی باتوں سے وہاں کے لوگ اسلام کی طرف کیا راغب ہونگے۔ یہ وہ کام ہے کہ ابن رشد اور ابن طفیل سے فلاسفر، بوعلی اور فارابی سے حکیم، غزالی اور رازی سے امام، طوسی اور دوانی سے محقق، اس کے لئے ہونے چاہئیں کہ اصل اُن تحقیقاتوں اور اُن کے علوم سے واقف ہوں، اور علمی مسائل کا مذہبی عقاید سے متحد اور موافق ہونا ثابت کریں۔ پھر اسلام کی دعوت دیں، ایسے اہم اور نازک اور مشکل کام کو ہمارے مختص و اعطاد اور ہمارے نادان واقف مولوی کس طرح انجام دیں گے۔ کونسی باتیں اسلام کی، جن کا اثر اہل علم، اور اہل حکمت پر ہو، وہ خود جانتے ہیں، جو اُن کو سمجھا بیٹھے۔ اور کن دلیلوں سے وہ اسلام کی سچائی اُن پر ثابت کر سکیں گے۔ یہی ہمارے نیچے جو انگریزی پڑھتے، اور مدرسوں میں معمولی تعلیم پاتے، اور بیہیت و جغرافیہ و تاریخ کی آسان کتابیں پڑھتے، اور ابتدائی مسائل جانتے ہیں۔ ایسے بزرگوں کی بزرگمانہ باتیں سنکر ہنستے۔ اور اُن کی باتیں تمقہوں میں اڑاتے ہیں۔ بلکہ اُن کی باتوں سے اُن کے دل اسلام اور ایمان سے آفر پھرتے جاتے ہیں۔ تو علم کے دریا میں تیرنے والوں، حکمت کے

سند میں غوطہ لگانے والوں۔ فیثا غورس الطنبیوس کی تحقیقاتوں کے غلط ثابت کرنے والوں کے سامنے وہ کیا باتیں کرینگے؟

دوسری بات غور کرنے کے لائق یہ ہے، کہ کون سے اصول اور عقاید و ماں جاری کرنے مقصود ہیں۔ اس لئے کہ وہ سچا دین اور سیدھا سادہ اسلام جو ہم کو نبی اُتھی نے سکھایا تھا، اپنی اصلی حالت پر اس وقت باقی نہیں ہے۔ اُس بے رنگ نے ہزاروں رنگ پکڑ لئے ہیں، اور اُس کی سادگی، ہزاروں بناوٹ اور تکلفات کے پردے میں چھپ گئی ہے۔ اختلاف اور تفریق کی کوئی حد باقی نہیں رہی۔ کہنے کو تو بہتر فرقے ہیں۔ مگر تفصیل پر نظر کیجئے۔ تو شمار اُن کا سیکڑوں سے بھی گزر جاتا ہے۔ پھر ہر ایک اپنے کو ناجی اور دوسرے کو ناری سمجھتا ہے؟

اس لئے اول اپنے اندرونی اختلافات دور کرنے کی فکر چاہئے اور اسلام کے وہ اصول اور عقائد قرار دینے چاہئیں۔ جن کو پھیلانا، اور ایک تعلیم یافتہ قوم کو اُس کے اوپر ایمان لانے کی دعوت دینی منظور ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے اختلافات کی وہ ترقی ہے کہ ایک خاندان میں ایسے دو مسلمان بھی ملینگے جو اصول و عقاید درکنار۔ فروع، اور فروع میں بھی نہایت چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں جھگڑتے یا ایک دوسرے کی تکفیر نہ فرماتے ہوں۔ اُن بہتر مذہبوں کو جانے دو۔ جو اسلام میں مشہور ہیں۔ کسی ایک فرقے ہی کو لے لو۔ اور اُن میں جو اختلاف، اور اختلاف سے مخالفت، اور مخالفت سے عداوت، ہو رہی ہے۔ اُس پر نظر کرو۔ تو سوائے ناامیدی اور اسلام پر افسوس کرنے کے کوئی دوسری حالت نظر نہ پڑے گی۔ مثلاً اہل سنت کے فرقے کو لیجئے جس میں میں بھی داخل ہوں۔ اور اکثر حاضرین مجلس۔ اور خیال کیجئے کہ اس کا کیا حال ہے۔ اگر انصاف اور غور سے دیکھو تو غالباً شتر سے زیادہ اسی ایک فرقے کی شاخیں ہونگی۔ جن میں طرح طرح کے پھل پھول گئے ہوتے ہیں۔ اور قسم قسم کے جھگڑے ذری ذری ہی بات بردن رات ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں ہاتھ ناف سے اوپر رکھنے نہ رکھنے پر جھگڑا، کہیں مین باہر کہنے نہ کہنے پر کراہ۔ کہیں انگشت شہادت اٹھانے نہ اٹھانے پر لڑائی۔ کہیں نکالین اور دو الین کہنے پر فوجداری۔ غرض کہ جتنے مٹہ اتنی باتیں۔ جتنے آدمی اتنے جھگڑے، ایسی حالت میں کہ گھر میں یہ پھوٹ پڑ رہی ہو، دوسروں پر حملہ کرنا۔ اور اپنی لڑائی طے کئے بغیر غیروں سے مقابلہ کیا مفید ہوگا فرض کیجئے، کہ مسلمانوں نے اس تجویز کو پسند بھی کیا، اس نیک کام پر متفق بھی ہو گئے۔ چندہ بھی جس قدر منظور ہے جمع ہو گیا۔ اور وقت آیا کسی داعی کو یہاں سے بھیجنے اور دیب صاحب کو مدد دینے کا، تو کس فرقے کے مولوی بھیجے جائینگے، اور کس خیال اور کس عقیدے کے لوگ منتخب ہونگے۔ اگر اہل حدیث نے جناب مولانا مولوی عبد القدوس نامی کسی عالم کو بالفرض منتخب کیا، تو مقلدین کینگے۔ کہ ہَذَا اَوْھَلٰی هَذَا کَافِرٌ۔ اگر مقلدین نے مولوی مدار بخش نامی، کسی متقی دیندار کو مثلاً اس کام کے

دائے تجوز کیا، تو اہل حدیث فرمائینگے، کہ ہَذَا اِنْ عَنِّي هَذَا اَنَسَقْ۔ پھر فرمائے کہ کون منتخب ہوگا، اور وہ نَفْضُو جس کے لئے یہ کوشش ہو رہی ہے کیونکر حاصل ہوگا۔ رہا یہ اختلاف وہ نہ دور ہوا نہ ہوگا۔ نہ ہو سیکگا۔ نادان ہے وہ جو اس کا خیال کرے، اور پاگل ہے وہ جو اس کی تمنا کرے۔

اب رہا تیسرا شبہ کہ جس نیک کام کے لئے روپیہ وصول کرنا منظور ہے۔ اس کے ضائع نہ ہونے کا کیا اطمینان ہے۔ اُس کی نسبت کہا جاسکتا ہے، کہ جس اللہ کے بندے کے بھروسے یعنی وہ صاحب پرکیم شروع کیا جاتا ہے۔ اُن کا حال کیا ہے۔ اُن کو خود اسلام اور اسلام کے اصول و فروع سے کمان تک نفیست ہے۔ اور ان کے خیالات دین اسلام کی نسبت کہاں تک اسلام کے مطابق ہیں، پھر اُن کا رویہ اور طریق کیا ہے، اور وہ اپنے ارادے میں کہاں تک مستقل اور اس کام کے کرنے میں کیسے مستعد ہیں، اور وہ اس کام کو کس طرح اور کس کی صلاح و مدد سے چلائینگے۔

پس اے میرے دوستو! اور دین اسلام کی امریکہ میں اشاعت چاہنے والو! یہ وہ اہم اور تفصیہ طلب باتیں ہیں، جو کسی کے خیال میں گزر سکتی ہیں، اور جن کا فیصلہ ضرور ہے، مگر میں اپنے دوست حاجی عبداللہ صاحب عرب اور اُن کے موید مولوی حسن علی صاحب کی طرف سے کہہ سکتا ہوں، کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس کے لئے ہم اپنے ارادہ سے ہٹا سکیں، یا جو ہم نے ارادہ کر لیا ہے، اُس سے پیچھے ہٹ سکیں۔ اس دنیا میں کوئی کام دینی ہو یا دنیوی ایسا نہیں ہے جس پر کچھ اعتراض نہ ہو سکیں اور جس پہلو سے دیکھا جائے، اُس میں کامیابی ہی کی امید ہو۔ مثلاً جو لوگ اشاعت اسلام سے دوسرے کاموں کو ضروری، اور خود مسلمانوں کی بُری حالتوں کی اصلاح کو مقدم سمجھتے ہیں اُن کو دو باتوں پر غور کرنا چاہئے۔

اول یہ کہ کیا وحقیقت ان کا یہ خیال صحیح ہے۔ دوسرے یہ کہ کیا اس کام میں دُکری اُن کی تجوز کا ردائیوں کی مانع ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ نہ اُن کا خیال دوسرے کاموں کے مقدم ہونے کی نسبت صحیح ہے اور نہ یہ کام دوسرے کاموں کا مانع ہے۔

پہلا امر توصاف ہے، کہ اسلام کی اشاعت ایسا فرض ہے کہ کوئی دوسرا کام کو کہتے ہی ٹوا بیگا ہو۔ اور گوی مسلمانوں کے لئے کیا ہی مفید ہو، اُس کی فرقیّت کو مسلمانوں پر سے ساقط نہیں کر سکتا۔ اور جب تک اس فرض کفایہ کو کچھ لوگ خدا کا نام لیکر پورا نہ کریں۔ مسلمان اُس سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ وہ خدا جس نے فطرۃ ہر انسان کو مسلمان ہونے کی تکلیف دی ہے سب سے اول سب سے مقدم اور سب سے بڑھ کر، اپنے بندوں سے یہ چاہتا ہے کہ اس کو ایک جانب اور ایک سائیں، نہ کسی کو اس کا شریک سمجھیں، نہ کسی کے آگے سجدے کے لئے سر جھکائیں، اور اُن لوگوں سے جن کو بے محنت، اور بے زحمت کے اسلام کی دعوت دی، اور اپنی رحمت سے مسلمانوں کے گھر میں پیدا کر کے مسلمان بنایا، یہ خواہش رکھتا ہے کہ جو اہم

اُس نے اُن کے پُروری ہے، وہ اُوروں تک پہنچاویں، اور جو نعمت اُن کو دی ہے، دوسرے بندوں کو بھی اُس میں شریک کریں؛ پس ہر مسلمان پر فرض ہے، کہ دوسرے کے کان میں اسلام کی آواز پہنچا دے اور خدا کی توحید اور رسول کی رسالت کی صدا دوسروں کو سنا دے۔ کُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ، خدا خوش ہوتا ہے سب سے بڑھ کر اُن لوگوں سے جو بکئے ہوئے لوگوں کو اس کی طرف لاتے ہیں۔ اور رسول مقبول فخر کریں گے اُن پر جو اُن کی اُمت بڑھانے میں ساعی ہیں۔ ایک بیدین کے سامنے خدا کی خدائی، اور اُس کی بکائی پر حجت لانا بہتر ہے۔ ہزار مسلمانوں کے روبرو غلط کرنے سے اور ایک منکرِ الوہیت کا مسلمان بننا بہتر ہے، ایک لاکھ مسلمانوں کی حالت درست کرنے سے۔ فَإِنَّ هَٰذَا أَصُولُ الْبِرِّ وَمُحَمَّدٌ أَنْزَلَهُ هُوَ الشَّكُّ جِدُّ۔ یعنی تمام نیکیوں کی جڑ اور سب نیکیوں سے بڑھ کر توحید ہے۔ درحقیقت توحید تمام نیکیوں کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے اعضا کے مقابلے میں دل اِذَا صَلَحَ صَلَحَ الْجَمِيعُ وَإِذَا فَسَدَ فَسَدَ الْجَمِيعُ یعنی اگر وہ اچھا ہے تو سب اچھے ہیں اور وہ بُرا ہے تو سب بُرے اور خدا کا ماننا۔ تمام عبادتوں میں ایسی عبادت ہے جس کا صلہ ہے جنت، قرأتے ہیں رسول مقبول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مِّن مَّائَاتٍ وَلَا یُشْرُکُ بِاللَّهِ شَیْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ یعنی جو مرے ایسی حالت میں کہ خدا کا شریک کسی کو نہ جانتا ہو، تو وہ جنتی ہے، اور حکایت کرتے ہیں سرورِ کائنات اپنے خدا کی طرف سے، کہ مَن لَقِیْنِیْ بِقَرَابِ الْأَرْضِ خَطِیئَةً لَا یُشْرِکُ بِاللَّهِ شَیْئًا لَقِیْنِیْ بِعِتَابِهَا مَغْفِرَةً یعنی اگر کوئی ملیگا مجھ سے ایسی حالت میں کہ دنیا بھر کے گناہ لئے ہوئے ہو۔ مگر میرا شریک کسی کو نہ جانتا ہو، تو میں بھی ملو گا اُس سے اس لحاظ پر کہ دنیا بھر کی مغفرت اُس کے لئے ہو۔

کیا نہیں سنی ابو ذر والی وہ حدیث۔ کہ حضرت نے فرمایا اُن سے۔ کہ جانو شغری پہنچا دے سب کے کہ مَا مِنْ أَحَدٍ لَیْسَ دُنَا لَآ إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللَّهِ حَیْثُ تَابَ مِنْ قَلْبِهِ إِلَّا حَضَمَهُ اللَّهُ عَلَى النَّارِ کہ نہیں ہے کوئی جو گواہی دے خدا کی توحید کی اور محمد کی رسالت پر سچے دل سے۔ مگر حرام کرے گا خدا اُس پر آگِ فریخ کی۔ اور جب متعجب ہو کر پوچھا ابو ذر نے کہ وَاِنْ ذُنْیَ وََاِنْ سَرَقَ کہ اگر چہ زانی بھی ہو اور چور بھی۔ غصہ میں آکر فرمایا کہ وَاِنْ ذُنْیَ وََاِنْ سَرَقَ وََاِنْ سَرَقَ عَلٰی رِغْمِ اَلْفِ آجِنِ ذَمٍّ، کہ ہاں نہ کیا ہو، اور چوری کی ہو۔ تو کسی کا خیال کرنا کہ اسلام کی دعوت پر دوسری چیزیں مقدم ہیں، بعینہ ایسا ہے، جیسے کسی کا کتا، کہ بڑبڑالی تپتے مقدم ہیں یا فرض سے سنت اور نفل بہتر ہے۔ وَهَذِهِ أَمَّا جَائِلِفَةُ الْعَقْلِ وَالْثَقْلِ۔

اب رہی یہ بات، کہ یہ کام دوسرے کاموں کا جن کو مسلمان کرتے ہیں، یا کرنا چاہیں مانع ہو گا، اُس کے فیصلہ کرنے کے لئے اپنی روزمرہ کی کارروائیوں اور عہدہ پر نظر کرنا اور دیکھ کر دنیا میں مختلف خیال اور مختلف مذاق کے آدمی ہیں۔ ہر شخص اپنے خیال اور مذاق کے موافق کام کرتا ہے کُلٌّ یَعْمَلُ عَلَى شَأْنِکَیْہِ

نیکی کرنے والوں اور بھلائی چاہنے والوں ہی کو دیکھو، کہ ان میں سے ہر شخص کسی نہ کسی خاص قسم کی نیکی کا شائق اُسی کے پھیلانے میں متوجہ، اور اُسی کے پورا کرنے میں سرگرم ہے۔ کسی کو بھوکوں کا کھانا کھلانے، اور تنگوں کو کپڑا پہنانے، کا شوق ہے۔ کسی کو لوٹے، لنگڑے، اندھے، بہوں کی دردناک حالت کے ساتھ ہمدردی ہے، کوئی خواہشمند ہے، کہ بیماروں کے لئے شفا خانے، اور غریبوں کے لئے محتاج خانے قائم ہوں۔ کوئی چاہتا ہے کہ کسی طرح غمزدہ بیواؤں کی مصیبت دور، اور دوسری شادی کی رسم جاری ہو کسی کو یہ شوق ہے کہ مسجدیں تعمیر ہوں۔ خانقاہیں بنائی جائیں، حاجیوں کے لئے مکہ میں گھر۔ اور مدینہ میں رباط تیار ہوں، کوئی چاہتا ہے کہ مسلمانوں میں نماز روزہ کا چرچہ ہو۔ شریعت کے احکام جاری کئے جائیں۔ مولوی وعظ کئے کے لئے، محتسب درے لگانے کے لئے مقرر ہوں۔ کسی کی یہ سعی اور خواہش ہے، کہ مدرسے بنائے اور کالج تیار کئے جائیں، اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو۔ غرض کہ جتنے دماغ اتنے ہی خیالات، اور جتنے دل اتنے ہی مذاق، ولیناس فیما لیغشون فلانہیہ پس کیا اشاعت اسلام کا نام اس لمبی اور طویل فہرست میں نیک کاموں کے درج نہیں ہو سکتا اور کیا دنیا میں خدا کے ایسے بندے جن کو اس نیک کام کا شوق ہو، نہیں مل سکتے۔ اگر انصاف بلکہ ایمان کی نظر سے دیکھو۔ تو اس شوق کے شائق۔ اس جنون کے دیوانے، اس نشہ کے متوالے، ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں ہی ملینگے، اور لاکھوں موجود ہیں۔ اور ہمارا دوسرے سخن بھی انہیں کی طرف ہے۔ اور ہم انہیں سے اعانت اور مدد کے زیادہ خواہاں ہیں۔ ہر شخص کو خدا اُس کے شوق میں سرگرم اور اُس کے کام میں مشغول رکھے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اور سب کام بند ہو جائیں اور اسمیٰ یک کام پر سب لوگ جھجک پڑیں۔ بلکہ ہم اتنا چاہتے ہیں کہ یہ کام بھی جو خاص خدا کا کام ہے، شروع ہو جائے، اور کچھ اللہ کے بندے ایسے کھڑے ہو جائیں، کہ وہ اپنی مردانہ ہمت اور فیاضانہ مدد سے اس کام کو جاری کر دیں۔ تاکہ یہ بڑا فرض جو ہر مسلمان کی گردن پر ہے، ادا ہو جائے۔ اور باز پرس کے دن اس فرض کے ترک پر ہم سب سے باز پرس نہ ہو۔ پھر یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے۔ کہ ایک کام کا شائق دوسرے کاموں میں مددینے سے انکار نہیں کرتا۔ اور نہ ایک نیکی پھیلانے والا دوسری نیکیوں سے چشم پوشی کرتا ہے۔ نہ ایک کام کے دوسرے اور کام بند ہوتے ہیں۔ تو کیا سبب ہے، کہ جو لوگ اور اچھے کاموں میں سرگرم ہیں وہ اغلا و غلغلۃ اللہ میں کچھ بھی مدد نہ کریں، یا خفیف سی اعانت اُن کی۔ اُن کے دوسرے کاموں کی مانع اور روکتے والی ہو۔ کون ہے ایمان اور اسلام کی ترقی چاہنے والا، جو ایسا خیال کرے۔ اور خفیف سی مدد، اور نحوڑی سی اعانت کرنے سے اپنا نام انصاف اللہ کی فہرست میں نہ لکھنا چاہے اور ایسے ملک میں جہاں اس تیرہ سو برس میں اب تک کسی نے اسلام کا نام نہ لیا ہو، اور جہاں خدا اور خدا کے رسول کے نام کی نہادی اب تک نہ ہوئی ہو۔ اسلام پھیلانے میں کوشش نہ کرے۔

دیار امر، کہ ہندوستان، افریقہ، اور انگلستان چھوڑ کر امریکہ میں اسلام کی اشاعت مقدم سمجھنے کا کیا سبب ہے۔ اس کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ایسا ملک ہے، جہاں کے لوگ پورے آزاد اور آزادانہ خیالات رکھتے ہیں۔ اُن کو مذاہب مختلفہ کی تحقیق کا شوق ہے، اور اگر سچ سمجھ جائیں تو اس کے قبول کرنے پر بھی آمادہ ہیں۔ اس لئے دوسرے ملکوں کی نسبت وہاں اسلام کا وعظ کرنا زیادہ مستحب اور مفید ہے۔ بلاشبہ جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی یکدم کرنا چاہئے۔ مگر یہاں خدا کی مہربانی سے کڑوڑوں مسلمان ہیں۔ اور ہر حصہ میں مسلمان عالم، مسلمان واعظ موجود، اور اسلام کے نام لگے اُس کے عقائد سے عموماً سب کو واقفیت ہے۔ اور ہمارے واعظ اس کام میں مشغول بھی ہیں بخلاف نئی دنیا کے کہ وہاں نہ مسلمان موجود ہیں۔ نہ اسلام کے نام سے وہاں کے باشندے واقف، نہ اب تک کسی نے اسلام کی منادی وہاں کی ہے، یہی حال افریقہ کا ہے کہ وہاں کے ایک حصہ میں اب تک مسلمانی سلطنت موجود ہے۔ اور مسلمان سیاحوں اور مسلمان تاجروں کے ذریعہ سے اسلام وہاں پھیلنا جاتا ہے، اور اسلام کی منادی کرنے والے وہاں بھی موجود ہیں۔ سوائے اس کے امریکہ کے ایک عالم کا ایمان لانا، نہر افریقہ کے جانب احمشیوں کے مسلمان ہوجانے سے اسلام کے حق میں زیادہ مفید ہے۔ اُن لوگوں کو کاملاً زیادہ توجہ کے لائق ہے۔ اور بلاشبہ وہاں مدد دینے کی زیادہ ضرورت ہے۔ مگر جب کہ یہ خیال کیا جائے، کہ وہاں یہ کام شروع ہو گیا ہے۔ اور وہاں کا ایک شخص جو کہ ذی علم اور ذی وجاہت ہے، اسلام کے پھیلانے میں مصروف ہے، اور اُسے مدد پہنچ رہی ہے۔ تو ہم کو اپنی تجویز سے باز رہنے کے لئے کوئی وجہ کافی معلوم نہیں ہوتی۔ خصوصاً جب کہ اس بات پر خیال کیا جائے کہ لندن وہ مقام ہے جہاں اب سیکڑوں مسلمان آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور اسلام کی خوبیوں کے ظاہر کرنے، اور اسلام کی حقیقت بتانے کا اُنہیں اچھا موقع حاصل ہے۔ مگر جہاں اب ارادہ کیا جاتا ہے، وہ ایک ایسا مقام ہے کہ اب تک وہاں کسی نے یہ کام شروع کیا ہے، نہ مسلمانوں کو وہاں سے زیادہ تعلق ہے۔ نہ مسلمان سیاح، نہ مسلمان تاجر، نہ مسلمان عالم، نہ مسلمان طلبہ وہاں آتے جاتے ہیں۔ جس سے وہاں کے لوگوں کو اسلام کی حالت دریافت کرنے کا موقع ملے۔ اس لئے جب خدا نے وہاں کے ایک بندہ کو اس کام پر آمادہ کر دیا ہے۔ تو اُس کی مدد نہ کرنی گویا ایک ایسی قوم کو جو مادہ اسلام لانے کا رکھتی ہے۔ اسلام سے محروم رکھتا ہے۔ اب میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں اس پر، کہ جو لوگ مسلمانوں کے اخلاص اور جہل کی خراب حالت پر نظر کر کے، چاہتے ہیں۔ کہ اول اُن کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے، اور جو کچھ تجویزیں اس کے لئے کی گئی ہیں، وہ ادھوری چھوڑ کر دوسرا کام شروع نہ کیا جائے غالباً کوئی نہ ہوگا، جو اس بات کو دل سے نہ سُنے اور مسلمانوں کی زار حالت پر متانت ہو کر اُس کے علاج کا خواہاں نہ ہو۔ بلاشبہ یہ نہایت ضروری امر ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام سب کاموں پر مقدم ہے

مگر ہمارے اس کام سے اُس میں خلل نہیں ہو سکتا۔ اور جیسا کہ ابھی میں کہ چکا تھا ٹھوڑی سی مدد اس کام میں فیاض اور عالی حوصلہ مسلمانوں کو اُس کام کے پورے کرنے سے روک نہیں سکتی۔ علاوہ ہزاروں مسلمان ہیں۔ جو ابھی تعلیم و تربیت کی ضرورت نہیں جانتے، یا جانتے ہیں مگر اس طریقہ کو جسے اس زمانہ کے مسلمان قوم پسند کرتے ہیں، مفید نہیں سمجھتے۔ بلکہ ثواب حاصل کرنے کے لئے دوسرے ہی راہوں میں دھنسیج کرتے ہیں۔ کوئی مسجد بنانا ہے۔ کوئی مہمانسرایے، کوئی حج کرانا ہے، کوئی درگاہوں پر نذرین چڑھانا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں لیلیں اُن کے سامنے مسلمانوں کی تعلیم کی ضروری ہونے کی لائے، وہ ایک بھی نہیں مانتے، اور لاکھ طرح اُن کو سمجھائے، وہ اسے ٹوٹا بکلا کام ہی نہیں سمجھتے۔ مگر وہ خود اسلام کی اشاعت کو کو لو کا ن فی اَمْرٍ ذِکَہ ایسا سمجھتے۔ کہ اُس میں چندہ دینا گویا جنت میں داخل ہونے کے لئے اجازت نامہ لینا ہے، اور بلاشبہ اگر اُن کی نیت صادق ہے تو اُن کا خیال درست ہے۔ اِنَّا عِندَ ظَنِّ عَبْدِیْ جِی تو ہم نہیں سمجھتے۔ کہ کیوں ہم ایسے لوگوں سے مدد کے طالب نہ ہوں۔ اور کیوں ایسے لوگ جو محض ثواب کے لئے خیرات کرتے ہیں، ایسے بڑے ثواب کے کام میں مدد نہ دیں؟

ظلت اب رہا خیال، کہ مسلمان انگریزی خوانوں کے عقاید اور مذہبی خیالات کی اُن بُرے تیجوں سے حفا کی جائے، جو نئی تعلیم سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اور اس کے لئے ایسی مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جائے، جو موجودہ حالت کے لحاظ سے مناسب ہو، اُن کے لئے نئی کتابیں تالیف کی جائیں۔ اور اُن محلوں جو علم کے ہو رہے ہیں۔ اُن کے عقیدے، بلکہ اُن کا اسلام بچایا جائے، اور جو روپیہ جمع ہو، اسی کام میں صرف کیا جائے، بلاشبہ غور و فکر کے لائق ہے۔ اور اُس کی ضرورت ہم تسلیم کرتے ہیں۔ مگر یہ خیال گو کتنا ہی عالی اور مفید ہو، اور گو یہ کام کیسا ہی ضروری اور اہم ہو۔ مگر اول تو ہمیں اُس کا نہ تو مشکل معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ اس ہم اپنے کام کو بجائے خلل انداز ہونے کے اُس کے لئے بھی مفید سمجھتے ہیں، مشکل ہونا اس کام کا غالباً سب قبول کریں گے۔ اس لئے کہ انگریزی خوانوں کو نئی تعلیم کے بُرے اثر سے بچانا خیر ہے۔ اس پر کہ ہم کو نئے علوم اور نئی تحقیقاتوں کا ویسا ہی علم ہو، جیسا کہ اپنے مذہب کا۔ اور ہم کو حکمت جدیدہ کے نئے مسائل پر اتنا ہی عبور ہو۔ جتنا کہ اپنے دین کے اصول و فروع پر۔ پھر ہم فقط اُن علوم کے جاننے والے بنی ہوں بلکہ ہم کو تحقیق اور فیصلہ کی قوت بھی ہو۔ اور ہم عین مذہب و دماغ، اور مضامین طبیعت بھی رکھتے ہوں۔ تاکہ باہم اس اختلاف کو دور کر سکیں جو علمی مسائل اور دینی عقاید، اور شرعی احکام اور مذہبی روایات میں نظر آئے یا اُن دونوں میں سے کسی کو غلط اور کسی کو صحیح ٹھہرا سکیں۔ اور ہم اُس علمی اور رحمت کو معقول دلائل سے ثابت کرنے کے لئے قوت بھی رکھتے ہوں، تاکہ وہ طبیعت یا ترویج یا تاویل، جو ہم کریں، دوسرا بھی اُسے قبول کر سکے، اور دوسروں کی طبیعتوں پر بھی اُس کا اثر ہو، گویا ہم ایک ایسے زمانہ میں وہ کام کریں۔ جو امام غزالی اور امام رازی وغیرہ ائمہ دین نے کیا تھا۔ پھر کچھ ایسے لوگ ہوں، جو ان محققوں کی تحقیقاتوں کو شائع کریں

اور سلمان انگریزی خوانوں کی استعداد اور علم کے درجات کے لحاظ سے، اور اُن کے ماقے اور سمجھ کے موافق نئی کتابیں لکھیں۔ گویا ہماری قوم میں نئے علم کلام کے ایجاد کرنے والے اور اُس کے تائید دینے والے، اور اُس کے پھیلانے والے، ایسے ہوں۔ جیسے اگلے زمانہ میں ہوئے تھے، یعنی کوئی امام تھا۔ کوئی مجتہد، کوئی محقق، کوئی علامہ، اور کوئی عالم۔ تاکہ ہمارے بچے جو نیا علم حاصل کر رہے ہیں، دین پر قائم رہیں، اور ملحد اور لاندہ ب نہ ہوتے پائیں۔ اب دیکھنا چاہئے کہ ایسے لوگ ہماری قوم میں موجود ہیں یا آئندہ اُن کے ہونے کی کچھ امید ہے۔ اُس کا حال یہ ہے۔ کہ اب تک ہمارے علماء علوم جدیدہ کی حقیقت کیسی، اُن کے نام بھی نہیں جانتے، اور کیونکر جانیں، وہ علوم بند ہیں ایسے صندوقوں میں۔ جن پر انگریزی، فرنگ، اور جرمنی، کی مٹریں لگی ہوئی ہیں۔ جن کو اب تک ہمارے بزرگ عالموں نے توڑا نہ توڑنے کا ارادہ کیا، نہ توڑنے کی اجازت دی۔ ایک نامہ چاہئے، کہ کوئی اُن علوم کو متفصل صندوقوں سے نکالے۔ اور اُنہیں عربی جامہ پہنا دے۔ اور ہمارے تشککین کے سامنے جو عربی لباس کے سواے دوسرے لباس میں کسی کی صورت دیکھنی نہیں چاہتے۔ پیش کرے تاکہ وہ اسے دیکھیں اور اس سبب اور ہولناک دشمن سے بچنے کی کچھ تدبیر کریں۔ مگر یہ کون کر سکتا ہے کہ اُس وقت تک ہماری قوم میں ایسا کوئی باقی رہے جو عربی جامہ میں بھی اُس کی شکل دیکھ کر پہچان سکے۔ بظاہر تو اُس روزانہ فوٹو منظر سے جو علم میں ہو رہا ہے۔ اور علما اور اربزرگان دین کے اس چل چلاؤ سے جو رذائے دیکھتے ہیں۔ اس کی بھی توقع نہیں ہے۔ پس جب کہ اپنے ہی علموں کے جاننے والے نہیں ہیں، اور منقول اور مذہبی علوم ہی کے لالچے پڑے ہوئے ہیں۔ تو علوم جدیدہ سے واقف ہونے، اور نئے فلسفہ کو مذہب سے تطبیق یا تردید کرنے کا خیال، جنون نہیں ہے، تو کیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہم اشاعت اسلام کا دوسرا ملک میں خیال چھوڑ بھی دیں۔ اور جو کچھ ہم اُس کے لئے جمع کریں۔ وہ اگلے میں صرف کرنے کے لئے دے بھی دیں۔ تو اُس سے کیا حاصل ہوگا۔ بلکہ جو تجویز اس وقت امریکہ میں سلام پھیلانے، اور ٹروپک مدد دینے کی پیش ہے۔ غالباً اس کام کے لئے بھی مفید ہوگی۔ اس لئے کہ صدیاں گزر گئیں، کہ ہم سے ایجاد کی قوت جاتی رہی۔ اور جس طرح کہ کسی عضو کو مدت تک بیکار رکھتے سے آخر وہ عصبوبیکار ہو جاتا ہے ہمارے دماغ تقلید کے سبب تحقیق اور غور کے لائق نہیں رہے۔ ہم سے امید نہیں ہے۔ کہ ہم نئے علموں اور نئے فلسفہ کو سیکھیں۔ اور اپنے مذہبی مسائل کو اُس سے تطبیق دینے کے لئے نیا علم کلام ایجاد کریں، یا ایسی کتابیں جو اس مقصود کے لئے ضروری ہوں تالیف کر سکیں۔ یہ کام بھی اگر ہو سکیگا۔ تو یورپ ہی کے عالموں سے جو مسلمان ہو جائیں۔ یا مشرق اُن کے دل و دماغ ایسے ہیں کہ اسلام لانے اور اسلام کی حقیقت جاننے کے بعد ایسی کتابیں تصنیف کر سکیں گے۔ جو ہمارے انگریزی خوانوں کے لئے مفید ہوں۔ اور جس سے اُن کے عقیدے فاسد اور خراب نہ ہونے پائیں۔ کیا گذشتہ زمانہ

کی تاریخ سے اس کا ثبوت نہیں ہوتا، اور کیا آپ لوگ یونان اور فارس کے علوم پھیلنے کے بعد، سوخت مقابلہ مذہب اور علم میں ہوا، اُس سے واقف ہیں؟ اُس وقت بھی یہی مصیبت پیش آئی تھی، جو اب پیش ہے، اور نئے تعلیم یافتوں کے عقیدے ایسے ہی بگڑنے شروع ہوئے تھے، جیسے کاب ہو رہے ہیں۔ مگر انہیں لوگوں کی مدد سے جو کہ اُن علوم کے جاننے والے تھے، اور جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ علوم کے متواتر اور مسلسل حملے جو مذہب پر ہو رہے تھے، روکے گئے، اور انہیں کی عمدہ تجویزوں سے اسلام کی حفاظت اور اُس سے تقویت ہوئی۔ یونان اور عرب کے ذہنی علم اور قبائلی دیوب کے مسلمان ہونے، اور اُن کے مفید اور عمدہ کتابوں کے تالیف کرنے، اور علم کلام کے ایجاد ہونے سے، یہ طائفہ فیصل اور اسلام کو فتح نصیب ہوئی، عربوں نے تو اس طرف بہت ہی کم توجہ کی۔ اور وہ اس جہاد اکبر میں بہت ہی کم شریک ہوئے۔ جو کچھ کیا عجیوں نے کیا۔ اسی طرح اب وہ وقت ہے کہ یورپ کے نئے علم اور نئے فلسفہ کا نیا حملہ، مذہب پر ہے۔ اُس کی مدافعت کے لئے غالباً خدا نے یہ تدبیر سوچی ہے کہ انہیں کے دلوں میں اسلام کا نور ڈالے۔ اور انہیں سے وہ مذہب کی حمایت کا وہ کام لے جو عجیوں سے پچھلے زمانہ میں لیا تھا۔ **وَإِذَا رَأٰدَ اللّٰهُ شَيْئًا فَهَبَّ اَعْيَانُ امْسِيَا بِهٖ** ۞

اب میں جواب دیتا ہوں اُس مشہور کا، کہ جہاں اسلام پھیلانے کی فکر ہے، وہاں علوم و فنون کی ایسی ترقی ہے کہ مذہب مغلوب ہو رہا ہے۔ وہاں مقابلہ اسلام کا فلسفہ سے سمجھا جا رہے، نہ کہ عیسائیت سے۔ اگر ہم اسے تسلیم بھی کر لیں اور مان بھی لیں، کہ ہر ایک باہشتندہ وہاں کا عالم حکیم فیسی اور عیسائیت سے منکر۔ اور مذہب سے متنفر ہے۔ تب بھی ہم کو کوئی وجہ اس ارادے سے باز رہنے کی نہیں ہے اس لئے کہ اُس وقت ہم کو اس کا خوف ہوتا۔ جب کہ ہمارا اسلام، حکمت و فطرت کے خلاف ہوتا۔ یا عقل و قیاس سے کام لینے کی مخالفت ہوتی، یا علوم کو رکھنے، اور حقایق اشیاء کی تحقیق سے ہم روکے گئے ہوتے۔ بلکہ برخلاف اس کے غالباً دنیا کے تمام مذہبوں میں اسلام ہی وہ مذہب ہے، جس کی بنیاد حکمت و فطرت پر ہے۔ اور جس میں عقل و قیاس سے کام لینے پر تاکید، اور جس میں علم کا یکسٹھافن اور حقایق اشیاء کی تحقیق معرفت الہی کے لئے ضروری ہے۔ شاید کسی مذہب نے ایسی صراحت سے دین اور فطرت کو متحد نہ بتایا ہوگا، جیسا کہ اسلام نے، جس کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ **فَطَوَّرَ اللّٰهُ الَّذِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهِمَ**، اور نہ کسی مذہب میں خدا نے عقل و قیاس سے کام لینے پر ایسی تاکید کی ہوگی جیسی کہ اسلام میں، جس میں خدا کی خدائی کی حجت اور اسلام کے اصول کی تصدیق عقل اور قیاس پر رکھی گئی ہے۔ اور بجا **فَاَعْتَبِرُوا يَا اُولِی الْاَلْبَابِ** اور **فَاَعْتَبِرُوا** یا **اُولِی** **الْاَبْنَادِ** کہ کراس پر اشارہ کیا گیا ہے۔ اور نہ کسی آسمانی کتاب نے حکمت حاصل کرنے کی

لے اور یہ ارادہ کرنا ہے اللہ کسی چیز کے کرنے کا تو اس کے ویسے ہی اسباب فراہم کر دیتا ہے ۞

ایسی ترغیب دی ہوگی، اور نہ اُس کی ایسی فضیلتیں بیان کی ہوگی۔ جیسے کہ قرآن نے کہا **قَالَ اللَّهُ تَعَالَى**
مَنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا۔ اور نہ کسی مذہب کے بانی نے علم حاصل کرنے کو، ہر مرد اور
 عورت پر ایسا فرض کیا ہوگا، جیسا کہ ہمارے حضرت نے، جنہوں نے فرمایا ہے کہ **طَلَبُ الْعِلْمِ**
فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ اور نہ کسی ملت میں حقائقِ شکیبہ کی تحقیق، معرفتِ الہی کے لئے
 ایسی ضروری سمجھی گئی ہوگی۔ جیسی کہ اسلام میں۔ جس کے ماننے والے اور خدا کی معرفت چاہنے والے
 رات دن یہی دعا کرتے ہیں کہ **رَبَّنَا آتِنَا حَقَائِقَ الْأَشْيَاءِ كَمَا هِيَ**، اور نہ کسی مذہب میں دعوت
 کا طریقہ انسانی طبائع کے اختلاف کے لحاظ سے، اور اُن کی استعداد اور سمجھ اور علم کے درجات کے
 خیال سے جدا جدا حکمت یا موعظت یا مناظرہ، پر رکھا گیا ہو، جیسا کہ اسلام میں جو دعوت الے الحق کی نسبت
 کہتا ہے، کہ **ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ**
أَحْسَنُ، پس جب کہ ہمارے مذہب کا اصول یہ ہے، کہ کوئی سچا علم مخالف اسلام کے نہیں ہے، اور
 ہم اُس پر یقین رکھتے ہیں، جیسا کہ خدا کی توحید پر، تو کیا وجہ ہے، کہ ہم اُس ملک میں اسلام پھیلانے سے
 ڈریں۔ جہاں علم کی ترقی ہے۔ اور اُن لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے میں تردد کریں، جو عالم اور حکیم
 اور فلسفی ہیں۔ اگر ایک لحظہ کے لئے ہمیں ایسا خوف ہو تو ہم کو فی الفور مذہبِ اسلام کو جھوٹا سمجھ کر چھوڑنا
 چاہئے، مگر نہ مذہبِ اسلام جھوٹا ہے، نہ اُسے کسی امتحان، اور کسی مقابلہ کا ڈر ہے۔ کسوٹی سے کھوٹے
 سکے کو خوف ہوتا ہے، نہ کھرے کو، روشنی سے چور کو ڈر ہوتا ہے، نہ ساہو کو۔ اور نام کو علم سے
 خطرہ ہے، نہ یقینیات کو، جھوٹے مذہب کو علم سے مقابلے کا خوف ہے، نہ سچے اسلام کو۔ پھر اُس
 کے مسائل ایسے ہیں، جن سے ہمارے اس دعوے کی صداقت ہوتی ہے۔ اور کوئی بات اُس میں
 ہمارے اس دعوے کے خلاف معلوم نہیں ہوتی، بلکہ جتنا غور کرتے جائے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مذہب
 اور علم **حَقَائِقَ الْأَشْيَاءِ** درحقیقت دونوں متحد اور مطابق۔ اور ایک دوسرے کے موید اور مصدق
 ہیں *

اے میرے عزیزو اور پیارے مسلمانو! بڑے اور اصل مسئلے اسلام کے دو ہیں، جو اس ایک
 کلمے میں جمع ہیں۔ جس کے کہنے سے گیارہ سالہ مسلمان اور حُریت کا مستحق ہو جاتا ہے یعنی **لَا إِلَهَ إِلَّا**
اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ پہلے سے مراد خدا کو ایک جاننا۔ اور اس کو ایک ماننا ہے۔ دوسرے

۱۔ اور جس کسی حکمت دی گئی اُس کو سب طرح کی خوبیاں دی گئیں *

۲۔ علم کا یکہنگنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے *

۳۔ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہر چیز کی حقیقت جیسی کہ ہے دکھا دے *

۴۔ اپنے پروردگار کی راہ پر دعوت دینے کی حکمت اور انجمنِ نبوی کے اور مناظرہ کرانے سے ایسی باتوں سے جو پسندیدہ ہوں *

لِحَبْرَةٍ فَعَلَيْكُمْ مِنَ الْغَمِّ ۖ فَوَدَّ لَوْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ ۝
اور کہیں فرماتا ہے کہ دیکھو اپنے آپ کو کس طرح تم کو ماؤں کے پیٹ سے نکالا، کہ کچھ نہ جانتے تھے،
پھر کان بنائے سننے کے لئے، آنکھ بنائی دیکھنے کے واسطے، اور دل دیا سوچنے اور سمجھنے کے لئے
تا کہ تم شکر کرو۔ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ اُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ
وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۚ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ پھر فرماتا ہے کہ ہماری خدائی کا ثبوت تو
ہر چیز سے ہوتا ہے، اور ہمارے خالق اور صانع ہونے پر تو ایک ایک چیز اس عالم شہادت کی
شاہد ہے۔ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں ہماری نشانیاں ہیں، اُن لوگوں کے لئے جو ایمان
لائیں۔ اور خود انسان کی پیدائش اور جانوروں کی خلقت ہماری نشانی ہے، اُن لوگوں پر جو ایمان
اور بات و ن کے اختلاف اور جو کچھ آسمان سے اُتارنا۔ اور زمین کو مرنے کے بعد جس طرح جلایا۔ اور ہوا
جس طرح چلتی ہے، ان سب میں ہماری خدائی کے پتے ہیں۔ اُن کو جو عقل و سمجھ رکھتے ہیں۔ اِنَّ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبْتِغِيْ مِنْ دَابَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ
يُّوقِنُوْنَ ۝ وَاختَلَفَتِ الْبَلَدُ وَالْمَنَارُ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ ۝

غرض کہ سارا قرآن اس قسم کے بیانوں اور خطابوں اور دلیلوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور اسی قسم
کے مشابہت سے شہادت پیش کی گئی ہے۔ اور اسی طور پر ملکوت و سموات و ارض کو طرح طرح سے
بیان کر کے اپنی حجت پوری کی ہے، کَذٰلِكَ لَكُمْ اٰیٰتٍ لِّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ اور سب سے
بڑھ کر دل پر اثر کرنے والی بلکہ دل کے ہلا دینے والی وہ جھڑکیاں ہیں، جو اُن لوگوں کو سنانی ہیں،
جو ان چیزوں کے دیکھنے، اور ان باتوں کے سننے، اور ان حجتوں کے پیش ہونے پر بھی اُس
کی خدائی کو نہیں مانتے، یا اُس کو دوسرے کو عبادت کا مستحق جانتے ہیں، چنانچہ کہیں فرماتا ہے
تَقُلُّ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۚ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْ اَسْفَلِ الْمَقَابِلِ ۚ
ہے، ایک نجس قطرہ سے پانی کے اُسے پیدا کیا۔ پھر سب چیز اُس کی ٹھیک ٹھاک کی، پھر اُس کے
نکلنے کی راہ آسان کی، پھر اُسے موت دی، پھر اُسے جہنم لے گیا۔ قُلُّ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۚ
اَلَمْ يَخْلُقْكُمْ مِنْ تُطْنُفٍ ۚ فَفَصَّ لَكُمُ السَّيْلَ الْكَبِيْرَ ۚ ۝ شَقَّ لَمَاتَهُ
فَاَفْتَنَ ۚ ۝ شَقَّ اِذَا شَاءَ اَلْشَّرَ ۚ ۝ اور کہیں اُن منکروں کے بے سمجھ اور ضدی ہونے پر
افسوس کرتا ہے، جو حشر و نشر کو نہیں مانتے، اور فرماتا ہے کہ کیا نہیں دیکھتا انسان کہ ہم نے
اُسے نطفہ نجس سے پیدا کیا، اور پھر ہمیں سے جھگڑا کرتا، اور ہمارے ہی مقابلے پر ہوتا، اور ہمارے
اوپر اُلٹی مشیں لاتا، اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا، اور کہتا ہے۔ کہ کون زندہ کر سکیگا ہڈیوں کو،

جب کہ وہ خاک ہو جائیگی، کہہ دے اے پیغمبر کہ وہی اُن میں جان ڈالیکا، جس نے اول پیدا کیا، اور وہ سب طرح سے کرنا جانتا ہے۔ اَوَلَمْ يَرَا اَنَّ لَنَا لَشَانًا اَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْبٌ مُّصِيْنٌ ۝ وَخَصَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۚ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي اَنْشَأَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۝ اَخْرَايَسَةَ اَنْكَارِ كَرْنِ دَاوُوْنَ كُوْ اُنْ كَ اَنْكَارِ اَوْرَ كَفْرِ يَرِ، نَادَانِ اَوْرَ كَفْرِ كَنْ يَرِ، اَكْتَفَا نَ كَر كَ فَرَا تَلَسَ، کہ وہ دل رکھتے ہیں، مگر سوچتے نہیں، آنکھ رکھتے ہیں، مگر دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں، مگر سنتے نہیں پس وہ چوپائے ہیں بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے۔ لَهْمُ قُلُوْبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهْمُ اَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهْمُ اَاْذَانٌ لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ اَوَلَيْكَ كَاِثْمُ الْفَاعِلِ ۚ هُمْ اَصْحٰبُ الْاُفْلُوْنِ ۝ *

پس جو شخص ذری بھی عقل رکھتا ہو اور تھوڑا سا خوراک آیتوں کے مضمون پر کرے اور خدا کی عجیب صنعت اور حیرت انگیز کارخانے کو عبرت کی نظر سے دیکھے، تو وہ کبھی نہ خیال کریگا کہ ایسا عجیب و غریب کارخانہ قدرت کا بغیر ایسے صانع کے جو اُس کا مدبر اور منتظم ہو، خود بخود ہو گیا ہو۔ بَلْ تَكْمَدُوْا فِطْرَةَ السَّمَوٰتِ وَتَشْهَدُوْنَ بِاَنَّهَا مَقْهُوْمَةٌ تَحْتِ تَنْخِيْرٍ ۚ وَمُصْرَفَةٍ لِّمَقْتَضَاةٍ تَدْبِيْرٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قُلُوْبًا غٰفِلِيْنَ ۚ بلکہ فطرت انسانی اس پر شاہد ہے کہ یہ تمام کارخانہ ایک ایسے صانع کی صنعت ہے، جس کی مٹھی میں ساری چیزیں ہیں، اور جو اپنی حکمت اور تدبیر کے موافق جس طرح چاہتا ہے اُس کو چلاتا ہے اِنِّی اللّٰہُ شَکَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ مَنِ ۚ کیا خدا میں شبہ ہے جو پیدا کرنے والا ہے آسمان و زمین کا۔

پس بڑا حصہ اسلام کا بلکہ وہ اصل حصہ جس کی تعلیم کے لئے روز آفرینش سے انبیاء و مرسلین دنیا میں بھیجے گئے، اور جو کل نام شروع سے اسلام ہے یعنی خدا کا ایک جانتا، وہ ثابت کیا گیا ہے، علم اور عقل سے، اور خود انسان اُس پر گواہ ٹھہرایا گیا ہے کہ مَنْ عَرَفَتْ نَفْسُهُ فَقَدْ عَرَفَتْ رَبَّهَا ۚ اور جو کچھ مخلوق اور مصنوع اور مابین السموات والارض ہے، انہیں سے اُس پر جنتیں لائی گئی ہیں۔ اور سمجھ بوجھ سے کام نہ۔ لینے اور علم و عقل کو دخل نہ دینے سے منکرین پر زبرد تو بیج کی گئی ہے۔ گویا اسلام کا سبب علم اور عقل، اور کفر کی وجہ جبل اور نادانی قرار دی گئی ہے۔ تو فرمائے کہ اس بڑے جزو کو اسلام کے علم یا عقل سے کیا خوف ہے، اور جہاں اشیاء کی حقیقت کھلتی جاتی ہے، وہاں اُس کو کس بات کا ڈر ہے۔ بلکہ جس طرح سچا کہہ سکتا تھا کہ کو چاہتا ہے کہ قلب اور کھوٹے کو اُس سے جدا کرے، اور جس طرح بے جرم ہیرا جو ہری کو ڈھونڈتا ہے، کہ وہ اُس کی قدر کرے، اور قیمت لگائے۔ اسی طرح اسلام خود پکار رہا ہے، کہ ہے کوئی سچے علوم کا جاننے والا، کہ

کہ مجھے پرکھے اور تصدیق کرے، اور ہے کوئی حقائق اشیاء کا سمجھنے والا کہ مجھے دیکھے اور ایمان لائے،
ہاں اگر خوف ہوگا تو توحید فی الثقلیث اور تثلیث فی التوحید کو، جو نہ سمجھ میں آئے، نہ جسے عقل قبول
کر سکے اور یہی سبب ہے کہ وہ علم اور عقل کی روشنی کی برداشت نہیں کر سکتا۔ اور جس مذہب کی
بنیاد اس پر ہے وہ علم و حکمت کے مقابلے کی تاب نہیں لاسکتا۔

لا إله إلا الله کے بعد دوسرا جزو پاک کلمہ کا یعنی دوسرا حصہ سلام کا حجت رسول اللہ
ہے یعنی آنحضرتؐ کی رسالت کی تصدیق، اس کی نسبت ہم کہتے ہیں، اور اُس پر پورا یقین رکھتے
ہیں، کہ اس میں بھی کوئی بات ایسی نہیں ہے جو علم و حکمت کے خلاف ہو یا جہاں علم کا چرچہ ہے
وہاں اس کی تصدیق میں کوئی غیر معمولی وقت پیش آئے، ہم اسے بھی جزو اول کی طرح ایسی
حکمت و دلیلوں اور دل میں بیٹھنے والی حجتوں سے ثابت کر سکیں گے کہ ہر ایک حکیم اسی طرح اُسے قبول
کر سکے، جس طرح کہ ایک غیر متعصب اہل کتاب اور ایک حکمت و فلسفہ کا جاننے والا اسی طور پر اس کا
اقرار کرے، جیسے کہ ایک معمولی سمجھ کا آدمی۔ مگر ہاں ہماری دلیلیں کسی قدر زمینی نظر آئیں گی۔ اور ہمارے
استدلال کا طرز از جدید معلوم ہوگا، جس طرح پرانے ہندیاں اس زمانے میں نئے قلعوں کے قمع کرنے
کے لئے کافی نہیں ہیں، اسی طرح اس زمانے کے علم و حکمت اور اس زمانہ کے خیالات کے موافق،
ہماری پرانی دلیلیں ہمارے دعوے ثابت کرنے کے لئے مفید نہیں ہیں۔ اس زمانہ میں ایسے لوگوں
کے سامنے جو کہ فطرت کے خلاف کسی چیز کے ہونے کے منکر ہیں۔ خرق عادت کا نبوت کی دلیل
قرار دینا ایسا ہے کہ جیسے دو اوڈو کا پانچ کہنا۔ اس لئے ہم موسائیوں یا عیسائیوں کی طرح پیغمبری
ثابت کرنے کے لئے اُن چیزوں کو پیش نہ کریں گے۔ جسے سن کر اس زمانہ کے ذہنی علم و تفہیم گھٹیں
اور بجائے اس کے کہ اسلام کی طرف رغبت کریں، اُن باتوں کو سُنتے ہی متغیر ہو جائیں، ہم نہ
کہیں گے کہ ہمارے پیغمبر نے لٹھی کو سانپ بنا دیا تھا، اس لئے وہ پیغمبر تھے۔ ہم نہ کہیں گے کہ انہوں نے
مردوں کو جلایا، اس لئے تم اُن کی رسالت کو مانو۔ ہمارے نبی نے اپنی نبوت کی تصدیق خلاف فطرت
باتوں سے خود ہی نہیں چاہی اور اپنی رسالت پر ایمان لانے کے لئے خرق عادت کو حجت ہی
نہیں ٹھہرایا، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ قَالُوا كَوَلَا نُؤْتِلُ عَلَيْهِ آيَاتِ مَنْ سَرَّ بِهٖ قُلُوبُنَا
أَلَا يَتْلُو عَلَيْنَا اللَّهُ مَا وَابِقُنَا أَنَا نَذِيرُكُمْ ۝ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ
يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ذِكْرُنَا فِي ذٰلِكَ لَوْحَةٌ مِّنْ لِّقَٰوْمٍ مُّشْرِقِينَ ۝ بَلْهُمْ كَسِبَتْ لَهُم مَّغْرِبُهُ

لے کہتے ہیں کفار کہیں کوئی نہیں نشانی پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے بھیجی گئی، کہ جسے لے پیغمبر کی نشانیاں صرف خدا کے پاس
ہیں اور نہیں تو فقط کھلے طور پر ڈرانے والا ہوں اور کیا یہ اُن کے لئے کافی نہیں ہے کہ ہم نے اُس پر ایسی کتاب اتاری جو ان پر
پڑھی جاتی ہے اُس میں اُن کے لئے رحمت ہے۔ اور نصیحت ہے اُن لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔

خدا کا، جو انسان کو سیدھی راہ دکھانے کے لئے آیا، اپنی نبوت کے لئے خود حجت ہے، اور وہ کتاب جو دنیا کی ہدایت کے لئے لایا، خود اپنے دعوے کی دلیل ہے۔ ہم انہیں کو معجزہ، انہیں کو آیت، انہیں نبوت کی تصدیق کے لئے پیش کرتے ہیں۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب گرد لیلے بایدا زوے رتباب

موسے کا عصا کو سانپ کر دینا، اور اس کا جادو گردوں کے سانپوں کو نکل جانا، ان کے ساتھ گیا۔ اس وقت کوئی موسائی اپنے نبی کے اس معجزہ کو دکھانہیں سکتا۔ کہ لوگ اسے دیکھ کر انہیں خدا کا پیغمبر مانیں۔ اسی طرح جیسے مسیح کا مردوں کو جلاتا۔ ان کے ساتھ آسمان پر گیا۔ کوئی عیسائی اسے اب پیش نہیں کر سکتا۔ کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لوگوں کو ان کے رسول یا (معاذ اللہ) ابن اللہ ہونے کا یقین ہو۔ اگر ہم اپنے رسول کی رسالت ثابت کرنے کے لئے اسی قسم کے کثرتوں اور کثرتوں کو پیش کریں۔ تو موسائیوں اور عیسائیوں سے بڑھ کر اپنے دعوے کو کسی مسکت دلیل اور چپ کر دینے والی حجت کیونکر ثابت کر سکیں گے۔ اس لئے ہم قرآن کے کلام الہی ہونے پر خود قرآن کو پیش کریں گے، اور آپ کی نبوت کے ثبوت میں خود آپ کے حالات کو۔

عصا کے سانپ ہو جانے، اور مرد کے زندہ کرنے کا ایک فلسفی یا کفار کر سکتا ہے، یہ کہ کر کہ ہزاروں برس کی خبر کی تصدیق شکل، اور نظرات الہی کے خلاف لاطھی کا لڑوا ہو جانا، اور مرد کا جینا، ناممکن۔ مگر قرآن ایسا معجزہ ہے، جو آنکھوں کے سامنے ہے، اور جس کا طاقت بشری سے مافوق ہونا، ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اور آنحضرت کے حالات ایسے ہیں جس کے معلوم ہونے کے بعد کوئی آدمی عالم ہو یا حکیم، آپ کے مؤمنین اللہ ہونے سے انکار کر ہی نہیں سکتا جس وقت ہم قرآن کو کسی ٹکڑے سے ٹکڑے کے سامنے پیش کریں اور کہیں۔ کہ اسے دیکھو، اور بتاؤ، کہ کوئی کتاب کسی دشمن یا کسی حکیم یا کسی فلسفی کی جو بلحاظ عبارت کے، اور بظہر مضامین کے اس کے برابر ہو۔ تم نے دیکھی ہے۔ اور تم اس کے مقابلے میں لاسکتے ہو۔ آخر دنیا میں بہت بڑے ادیب اور فنی گزرے ہیں، جن کی فصاحت و بلاغت کا غلغلہ آسمان تک پہنچا۔ مگر بتاؤ تو سہی کہ سوائے خیالی باتوں کے الہامی باتوں کو کوئی اس طرح لکھ سکا، یا بجز رزم ریم مدح و ذم، حسن و جمال، اور خط و خال کے کسی نے انسان کے دل کے پاک کرنے والی باتیں اس خوبی سے بیان کی ہیں۔ اگر کوئی ایسی کتاب دنیا میں روز افزون ترش سے اب تک کسی ملک، کسی قوم، کسی مذہب میں تو پیش کرو۔ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَكِنْ تَنْفَعُوا فَإِنَّكُمْ كُنْتُمْ مَكِيدِينَ وَفَوَّضْنَا إِلَيْكُمْ أَلْأَمْرَ الْإِنْسَانِ وَالْجَنَّةِ وَالْجَنَّةِ أَعْدَتْ لِلْكَافِرِينَ ○ اور یہ بتاؤ کہ خیالی باتوں کے عہدہ الفاظ میں کرنے والوں، اور ہجو و مبالغہ کے مضامین اچھی عبارت میں لکھنے والوں میں سے، کوئی ایسا ہوا ہے جو اپنے کلام کے پیش ہونے کا مدعی ہوا ہو، اور کسی نے اس کا معارضہ نہ کیا ہو، بخلاف قرآن کے جس نے آواز

بند سے دعویٰ کیا کہ لَعْنُ الْجَمْعَةِ الْاَلَا لَسُوْا كَجَحْنٍ عَلٰی اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا
يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهِ وَاَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ كَذِبًا ۝ مگر کوئی قادر نہ ہو کہ تم کو اس کا کلام بھی ایسا لاسکے، جو
نظم و تالیف، شیرینی بیان، فصاحتِ زبان، بلاغتِ معانی، اور پاکیزگی مضامین میں اُس سے مشابہت
اور مناسبت رکھتا ہو، باوجودیکہ اُس نسبت ایسے فصیح و بلیغ شاعر موجود تھے۔ جو فصاحت میں کوس لال ملک
بجاتے، اور اپنے نظم کو خانہ کعبہ پر آویزاں کر کے هَلْ يَمُنُّ فَصِيحٌ وَهَلْ مِنْ شَاعِرٍ بَکَارِ نے تھے جن
کی مہارت تھی یہی کہ کسی طرح سے اس دعویٰ کو قرآن کے غلط ٹھہرائیں، اور اپنے خاندان، اپنی قوم،
اپنے ملک، اور اپنے مذہب کو، اس نئے دین سے بچائیں، اور اس کے بعد اب تک دنیا میں،
ہزاروں، لاکھوں، ادیب و خطیب ایسے گزرے، جن کی فصاحت و بلاغت مشہور ہے۔ اور جن کی
بے نظیر نظم و شہادتِ موجود، اور جن میں بہت سے ایسے ہوئے، جن کی یہی تہمتا اور یہی آرزو تھی کہ
قرآن کی ایک جھوٹی سی سورۃ کے برابر بھی کچھ کہیں۔ مگر نہ بھسکے، اور اپنی تہمتا اپنے ساتھ قبر میں لے گئے
اور پھر وہ دعویٰ اور تہمتی اور طلبِ معارضات تک بحال خود موجود ہے، اور ان کی سے خطاب
اِنَّ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ ۝ وَاذْهَبُوْا سُبْحًا
كٰدُمِيْنَ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ہنوز جاری، پھر جب یہ کہا جائے کہ، یہ کتاب
جو خدا کی طرف سے پیش کی گئی ہے، اُس کا پیش کرنے والا ایک اُٹھی تھا۔ جو نہ ایک لمحہ کے لئے
مکتب میں بیٹھا، نہ ایک لحظہ کے لئے استاد کی شکل دیکھی، نہ عالموں کی صحبت پائی نہ حکیموں سے ملا،
نہ شاعروں سے شعر سیکھا، نہ ادیبوں سے ادب، چالیس برس تک اپنی ہی قوم میں رہا۔ دیکھا تو انہیں عربوں
کو، اور سنا تو انہیں جاہلوں سے، اس پر اُس نے ایسا کلام پیش کیا جس کی عبارت پر ہزاروں درشتا ہوا
کی لڑیاں تیار اور جس کے مضامین پر دنیا کے حکیموں اور دشمنوں کی ساری حکمت و تسلِ زبان جس کا کلام
عشقیہ مضامین اور خیالی باتوں سے خالی، اور زکریہ قلب اور تصفیہ نفس کی تدبیروں سے بھرا ہوا، جس کی
زبان کی لطافت و بکھر کر عجب کے سارے فصحا و بلغا بکاراٹھے اِنَّ هٰذَا اَلَا سِحْرٌ مُّضِيْنٌ، اور
جس کے مضامین کی پاکیزگی و بکھر کو دنیا کہنے لگی کہ اِنَّهٗ لَکَرٰی وَرَمٰنَہٗ لَکُمُ الْمُؤْمِنِيْنَ، تو اسے کس طرح سے
۱۳۵ اگر آدمی اور جن کے سب جمع ہو جائیں اس بات پر کہ مثل اس قرآن کے لاسکیں تب بھی لاسکیں گے اگرچہ ایک دہ سہری، دیکھی کر سٹ
۱۳۶ ہے کوئی فصیح اور ہے کوئی شاعر جو مقابلہ پڑا دے +
۱۳۷ اگر تمہیں شک ہے اُس چیز میں جو ہم نے اپنے بند پر اتاری یعنی کتاب تو لاؤ تم کوئی ایک سورت اُس کے مانند
اور بلاؤ اپنے اور مدگاروں کو خدا کے سوا اسے اگر تم بہتر ہو +
۱۳۸ یہ نہیں ہے مگر کھلا جادو +
۱۳۹ حقیقتِ نفیست ہے اور رحمتِ ایمان لانے والوں کے لئے +

محد کو بھی کیا چارہ ہوگا، سوا اس کے، کہ اقرار کرے اس بات کا، کہ یہ کلام ضرور بشری طاقت سے خارج ہے، اور انسان کی قوت سے باہر، اگر کسی چیز پر عجز یا کرامت کا اطلاق ہو سکتا ہے، تو اسی پر، اور اگر کسی شے کو عجز نہ کر سکتے ہیں تو اسی کو، اگر کوئی کلام دنیا میں خدا کا کلام مانا جاسکتا ہے، تو یہی۔ اور اگر کوئی کسی کتاب کو خدا کی کلام سمجھ سکتا ہے تو اسی کو۔

جس طرح ہم نے قرآن کو قرآن سے ثابت کیا۔ اسی طرح ہم آنحضرت کی نبوت کو آنحضرت کے حالات سے ثابت کرینگے۔ اور آپ کی رسالت کے دعوے پر آپ کی ذات ہی کو حجت لائینگے، خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ **يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ سُورًا مَبِينَةً** یعنی آئی تمہارے پاس پروردگار کی دلیل اور حجت اور وہ کیا ہے، حضرت سرور کائنات **عَلَيْهِ أَفْضَلُ الصَّلَاةِ وَالْطَّحِيَّاتِ** کی ذات مبارک اور اس کا ثبوت ہوتا ہے، آپ کی زندگی کے حالات، اور آپ کے کاموں اور ان کے نتیجوں سے جو دنیا کو حاصل ہوئے۔ جب کوئی غور کرے اس بات پر، کہ آپ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے، جہاں قدرت نے کوئی سامان ایسا مہیا نہ کیا تھا کہ وہاں کے باشندوں کے خیالات کو مدد دیتی، اور نہ وہاں انسان کے ہنر اور صنعت نے ایسی چیزیں جمع کی تھیں جہاں انہوں کے رہنے والوں کے دل دلغ پر ہوتا۔ بلکہ جیسا ملک تھا۔ ویسے ہی باشندے۔ جیسی زمین اور آب و ہوا تھی ویسے ہی رہنے والے، دل ان کے سخت جیسے پتھر، مزاج ان کے گرم جیسے عوم، تند خوئی میں بادیہ صحر سے زیادہ جنگجوئی میں جنگل کے درندوں سے بڑھ کر، اول محبت اور اتفاق سے خالی، دماغ غرور اور جہالت سے بھرے ہوئے، کفر اور شرک سب پر چھایا ہوا، اداہم اور ضلالت میں ڈوبے ہوئے، میر جی اور بد اعمالی رگ میں سمائی ہوئی، تو فیزی اور غارت گری میں مشاق، حرام کاری اور بی حیائی پر نازاں، خدا سے بالکل بے خبر، مبنیاء و معاد سے سراسر جاہل، بتوں کے پوجنے والے، بت و شر کے منکر، جھوٹ پرست کے معتقد، رسول کے بندے، جہالت کے پتیلے، ظالم، سنگدل، سفاک، بیرحم، زشت خو، بد اعمال، بد کردار، ستم پیشہ، لوٹیرے، ضدی، ہٹیلے، جھگڑالو۔

نہ ملتے تھے ہرگز جوار بیٹھتے تھے سب تھے نہ تھو جھگڑا بیٹھتے تھے
جو دشمن آپس میں لڑ بیٹھتے تھے تو صدائے قبیلہ بگڑا بیٹھتے تھے

بلند ایک ہوتا تھا گرداں شہرا
تو اس سے بڑھ کر اٹھتا تھا ملک سارا
چلن ان کے جتنے تھے حسرت و مایہ ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کھٹتا تھا ان کا زمانہ نہ تھا کوئی مستان کا تازیانہ
وہ تھو قتل و غارت میں چلاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں میاں جیسے

ایسے ملک اور ایسی قوم میں خدا کا ایک ایسا بندہ پیدا ہوا جس نے باپ کی شفقت کا خرہ کچھا تھا، نہ ان کی محبت دیکھی تھی، نہ کسی قسم کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع پایا تھا، ایک مدت دراز تک اپنے جاہل اور بُت پرست اور بد اخلاق لوگوں میں زندگی بسر کرنے کے بعد وہ قوم کے سامنے آیا، اور خلافت ملک کی آیت ہوا، اس کے خلاف ملک کے حالات کے، خلاف قوم کے خیالات کے، بلکہ خلاف اُن تمام توقعات کے، جو ایسی حالت میں ہو سکتی ہوں۔ روحانی نیکیوں کے پھیلانے، اور ایک نئی زندگی بٹھانے اور نہ صرف اپنے ملک اور اپنی قوم کو، بلکہ ساری دنیا کو غفلت اور جہالت اور کفر کی پیاریوں سے نکالنے کے کام پر خدا کی طرف سے مامور ہونے کا دعوے کیا، قوم کو ذلیل بُت پرستی میں ڈوبا ہوا دیکھ کر اپنے دادا ابراہیمؑ کی طرح کہنے لگا **هَذَا النَّمَانِيُّ الَّذِي أَنْتُمْ كُنْتُمْ عَاكِفُونَ** اور ملک کو ٹراتے ہوئے بتوں کی پرستش میں مبتلا پارکھا کرنے لگا۔ **أَفَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَفْعَلُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ أَفِئْتُ لَكُمْ دَلِيلًا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ** اس آواز نے تمام قوم کو غفلت کی نیند سے جگا دیا، اور ایک نئی روح اُن میں چھڑک دی، اور ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا جس سے اُن کی تمام اندرونی اور بیرونی چیزیں ایسی بدل گئیں، گویا قلبِ بہتیت ہو گیا، نہ اُن کے وہ دل رہے جن میں شرک اور بُت پرستی کے خیالات تھے، نہ اُن میں وہ خیالات رہے، جن سے اوہام میں ڈوبے ہوئے تھے، نہ اُن میں وہ اوہام رہے جن سے طرح طرح کے گناہوں اور بد اعمالیوں کے ترک ہوئے تھے۔ نہ اُن کی وہ طبیعتیں رہیں جن میں جاہلیت کا جوش تھا، نہ اُن کا وہ جوش رہا جس سے وہ نقصہ غریب، کینہ حسد، اور انتقام کی مہلک پیاریوں میں مبتلا تھے، نہ اُن میں وہ بیماریاں رہیں، جن سے زندگی نام کو بھی باقی نہ رہی تھی۔ اُس خدائی آواز نے جو اس پاک بندہ کے مُنہ سے نکلی کہ **إِنَّكُمْ وَمَنْ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ** اُن کے دلوں کو شرک اور بُت پرستی کے خیالات سے ایسا صاف کر دیا، جیسے تند ہوا کا جھوکا زمین کو خرس خاشاک سے، اور اُس بیان نے حشر و نشر کے جس نے گویا زمین و آسمان شوق کر کے بہشت و دوزخ کی صورت اُنہیں دکھا دی۔ ان کی طبیعتوں کے سارے جاہلانہ جوش، ایسے ٹھنڈے کر دیئے، جیسے کہ زور کی بارش بھڑکتی ہوئی آگ کو۔

پس یہ انقلاب تھا یا جادو جس نے قوم کی حالت میں ایسی حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی اور

۱۔ کیا میں یہ تصویریں جن کے گرد تم گھوم رہے ہو ؟

۲۔ کیا پوچھتے ہو تم سوائے خدا کے ایسی چیزوں کو جو نہ تمہیں فائدہ پہنچا سکیں اور نہ نقصان، انہوں نے تم پر اور ان چیزوں

تم پوچھتے ہو، سوائے خدا کے کیا کچھ نہیں سوچتے ؟

۳۔ تم اور جن کو کہ تم پوچھتے ہو، سوائے خدا کے ایندھن ہیں دوزخ کے ؟

وہ وعظ تھا یا اس قرآنی کا تصور، جس نے سیکڑوں برس کے غردوں کو جلا دیا، وہ بشر کا کلام تھا یا روح القدس کی آواز، جس سے عرب اور عجم میں زلزلہ پڑ گیا۔ اور وہ عبد اللہ کے تہیم فرزند کا کام تھا یا خدا کی قدرت جس نے سارے سرکشوں کا غرور توڑ دیا۔ اور اُن کے غرور بھرے ہوئے سراپا کھلنے والے الجھل کے سجدے کے لئے جھکا دئے، وہ کیا چیز تھی، اُس خدا کی منادی کرنے والے میں، جس کی دعوت نے برسوں کے بیکے ہوؤں کو خدا کی راہ دکھا دی۔ اور وہ کس کی دی ہوئی قوت تھی، اُس کے کلام میں۔ جس نے ایسے حیرت انگیز، اور غیر منقطع، دائم الاثر، تاثیر لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی۔ جس سے مُشرک خود ہو گئے، کافر ایمان لے آئے، بُت پرست بُت شکن ہو گئے، گمراہ راہ دکھلانے لگے خدا تائناں حقیقت و معرفت کی باتیں کرنے لگے، وحشیوں میں تہذیب پھیل گئی، جاہل، عالم اور نادان، حکیم ہو گئے۔ زہد و پرہیزگاری، نیکی و پاکدامنی، قومی نصلت ہو گئی۔ جاہلیت کی تمام سہیں موقوف ہو گئیں۔ قتل، زنا، چوری، جھوٹ، غریب جوئی، شراب خوری، کی ساری بد عادتیں جاتی رہیں۔ جاہلانہ حیثیت اور حبیبیت کا نشان نہ رہا، خاندانی جھگڑے اور نشیبی عداوتیں مٹ گئیں، سرکشی اور خود سری کے باطل خیالات باقی نہ رہے۔ روحانی اور اخلاقی بُرائیاں طبعیتوں سے ایسی نکل گئیں۔ جیسے کفر و شرک کی سہیں عرب سے دماغ، غرور و نخوت سے۔ سینے، عداوت اور کینے سے، ایسے صاف ہو گئے۔ جیسے بتوں سے کعبہ۔ دشمن ایسے دوست ہو گئے، جیسے ماں جائے بھائی۔ غیر ایسے بگائے بن گئے، گویا عزیز اور رشتہ دار۔ اختلاف اور پھوٹ کا نام نہ رہا۔ عداوتیں الفت سے بدل گئیں۔ بچڑے ہوئے قبیلے ایک ہو گئے، وہ کیا تصرف تھا! جس نے عرب ہی کینہ دار اور ضدی قوم کو ایک اسلامی رشتہ میں منسلک کر کے ایسی برادری بنا دیا، جس کے اتحاد اور اتفاق کی تیکر دنیا میں نہیں ملتی۔ اور وہ کیا نسخہ تھی، جس نے اعراب سے وحشیوں اور بدول سے جنگیوں کو ایسا رام کر دیا کہ گویا جنت اور نفرت، پھوٹ اور تفرق، خود سری اور سرکشی کا نام نہ جانتے تھے۔ پس ایسا حیرت انگیز تصرف انسان کے دلوں پر اور ایسی عجیب تسخیر لوگوں کے قلوب کی، اور ایسی تبدیلی قوم کے حالات کی، اور ایسا انقلاب ملک کے اخلاق اور تمدن کا، جو نہ کسی دُنیا کے طے سے بڑے شاہنشاہ سے ہو سکا، نہ کسی بڑے سے بڑے حکیم اور تقویٰ سے، بلکہ جس کی نظیر کسی بڑے الو العزم پیغمبر کے زمانے میں بھی پائی نہیں جاتی، کیا نتیجہ تھا! صرف ایک ایسے انسان کی کوششوں کا، جو مومن مسند نہ تھا یا ہو سکتا تھا! صرف ایسے ایک آدمی سے جس کو خدا نے اپنی طرف سے اس کام پر مامور نہ کیا تھا۔ اور کیا اس کی تصدیق کے لئے کسی معجزہ یا خرق عادت کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ اور کیا اُس کی ہیرت و تعجب اور ہدایت، عصا کے سانپ بنانے، یا موم کے جلانے، یا چاند کے دو ٹوکے کرنے سے کم سمجھی جاتی ہے اگر مومن کا عصا شیعوں کے بنے ہوئے سانپوں کو کھا گیا۔ تو محمدی عصا اس تیرہ برس میں کھوں ڈول بکے گئی تھی اور عجم کا فاسدہ اور اخلاقی رذیلان جوان کو دلوں کو چٹے ہوئے۔ اور اُن کے روجوں کو دس سہے فتح ہو گیا۔

اور اگر عیسے نے دو چار اندھے، اور دس بیس لونے، لنگڑے، بلکہ دو ایک مُردے زندہ کر دئے، تو خود خدا نے (روحِ نداء) آن لگتی اور بشمار دل کے پیاروں کو چنگا کر دیا۔ اور لاکھوں آدمیوں میں جو باعتبار روحانی زندگی کے مر گئے تھے، جان ڈال دی۔ پھر موسے اور عیسے کے معجزوں کا اثر اُن کے ساتھ گیا۔ مگر مسمیٰ معجزہ اب تک زندہ ہے، اور قیامت تک زندہ رہیگا، اور اس کا فیض جیسا جاری تھا ویسا ہی آخری دن تک جاری رہیگا۔ نہ آپ کے انتقالِ جسمانی سے اُس میں خلل آیا اور نہ آئینگا۔ اور نہ آپ کے نقل مکان سے اُس میں کوئی ہرج ہوگا نہ ہوگا۔

مصلطفے را وعدہ کرد الطاف حق	گر میری تو نمبرِ دایمِ سبق
من کتاب و معجزات را رافع ام	بیش و کم کن را ز قرآن مانع ام
ہست قرآن مرزا، ہچوں عصا،	کفر را اور کشد چوں اثر دعا
تو اگر در زیرِ خاکِ خفتہ	چوں عصائش داں تو آنچہ گفتہ
گرچہ باشی خفتہ تو در زیرِ خاک	چوں عصا آگہ شود آں گفت پاک
فاصلہاں را بر عصائت دست نے	تو بنسب اے شہ مبارک خفتنے

اگر کوئی ہوشیار حکیم اور کوئی دانشمند فلسفی ایسے پاک بندہ کی سیرت اور تعلیم اور ہدایت پر غور کرے، جس نے نہ صرف عرب کی حالت بدل دی۔ اور نہ فقط حجاز سے بُت پرستی ہمیشہ کے لئے مٹا دی۔ بلکہ جس نے مردہ دل بیودیوں اور عیسائیوں کو بھی، جن میں روحانی زندگی کا کوئی نشان باقی نہ رہا تھا، نئے سرے سے جلادیا، اور جس نے موسے اور عیسے کی تعلیم کو جسے لوگ بھول گئے تھے۔ اور جس کو اپنے فاسد رایوں اور باطل خیالات ملانے سے خراب کر دیا تھا، پھر تازہ کر دیا۔ اور جس نے نہ صرف لات و منات کے پوجنے والوں، اور جبل اور عرتے کے آگے سر جھکانے والوں، کو خدا کی راہ دکھا دی، اور شرک اور کفر کی تاریکی سے نکال کر اُن کے دلوں کو نورِ ایمان سے روشن کر دیا۔ بلکہ مغرور اور خود سرِ جہت و لاخوت کے ماننے والے، کو باطنِ بیودیوں کو، وہ روشنی دکھا دی، جو طور پر موسے کلیم اللہ نے دیکھی تھی، اور آپس میں لڑانے والے اور تین خدا کے ماننے والے مردہ دل عیسائیوں کے دلوں میں وہ روح چھوٹکدی۔ جو مسیح پر اتاری تھی۔ تو ایسے شخص کی نسبت وہ کیا رائے قائم کر گیا، اور اُسے کیا سمجھ گیا۔ اگر ہم اُسے سو بھیس کہ ایسے شخص کو اگر معاذ اللہ تم نہی نہیں مانتے، تو بلاشبہ قیہ ضرور مانو گے۔ کہ وہ ایک ایسا بشر تھا، جس کی مانند دوسرا اس دنیا میں نہیں ہوا۔ اور جسے دانشمند اور متحقق اور حکیم کے ناموں اور جوں سے بڑھ کر دوسرا کوئی نام اور دوسرا کوئی درجہ دینا ضرور ہے۔ پھر وہ نام کیا ہے، اسوائے سول اور نبی کے، اور وہ درجہ کونسا ہے سوائے پیغمبری اور رسالت کے، فقہو لانشہد ان لا الہ الا اللہ وانشہد ان محمد اعبدا ورسوله "قسم ہے انصاف کی جس نے محمد کو پیدا کیا، کہ ان باتوں کو سنکر

اور ان حالات کو سوچ کر کوئی آدمی نہ ہوگا، سوائے اُس کے، جس کے دل کی آنکھ کو خدا نے تفصیل
اندھا کر دیا ہو، جو اس کی رسالت میں شک کرے۔ اور اُسے مؤیدین اللہ اور خدا کا داعی نہ سمجھے اور
بے اختیار اشدانہ لہ رسول اللہ نہ پکار اٹھے ۞

پس جس طرح اسلام کے پہلے حصے یعنی لا الہ الا اللہ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے، جو
عقل سلیم اور فطرت انسانی کی مخالف ہو۔ اسی طرح دوسرے حصے یعنی محمد رسول اللہ میں بھی کوئی
ایسی پہیلی یا چیمستان نہیں ہے، جو علم و حکمت کے خلاف ہو۔ اور ایسے ملک میں جہاں علوم کی ترقی
ہے۔ اُس کے سچے اور صحیح ہونے میں شبہ ہو سکے۔ اگر اُس ملک میں عیسائیت علم سے مغلوب رہی
ہے۔ تو اُس کا سبب اُن کے عقاید کا فساد ہے، اور اُن کے مذہب کے اصول کی خرابی۔ جس سے
اسلام بالکل پاک صاف ہے، بلاشبہ تعلیم یافتہ ملک میں مشکل اور نہایت مشکل ہے، کہ کوئی عالم یا حکیم
ایسے مذہب کو مانے، جس میں مریم کا فرزند خدا کا اکلوتا بیٹا مانا گیا ہو۔ اور جس میں خدا نے عدل قائم
رکھنے کے لئے اپنے پیارے بیٹے کو بندوں کے گناہوں کا کفارہ اور قربانی کا بکرا بنایا ہو۔ اور صلیب
دئے جانے کے بعد اُسے آسمان پر بلا کر اپنے دہنئے آنکھوٹھے پر بٹھا لیا ہو، اور ایسے بڑے دعوئے کے
ثبوت میں صرف وہ چیزیں پیش کی جاتی ہوں، جن کو قدرت کے قانون کے ہول جاننے والے تسلیم نہ
کرتے ہوں۔ مگر ایسے مذہب کے ماننے میں کچھ مشکل نہیں معلوم ہوتی۔ جس کے داعی نے اپنے آپ کو نہ خدا کا بیٹا کہا
نہ فرشتہ، نہ خدا کی خدائی میں اپنے کو ذلیل نہ ٹھیرایا۔ نہ ایک عاجز اور مجبور بندہ سے بڑھ کر کوئی خصوصیت
اپنے لئے قائم کی، بلکہ دنیا کو غلطی میں نہ پڑنے کے لئے پکار کر صاف کہہ دیا کہ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ
يُوحٰى اِلٰى اِنَّمَا الْهٰكُمُ اللّٰهُ وَ اَحَدٌ مِّنْ كٰنَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ
بِعِبَادَتِ رَبِّهِ اَحَدًا، کہ میں صرف ایک آدمی ہوں تم جیسا، صرف فرق یہ ہے کہ مجھ پر وحی ہوتی ہے کہ
تمہارا خدا ایک ہے، اور جو کوئی اُس سے ملنا چاہے، اُسے چاہئے کہ نیک کام کرے، اور خدا کی عبادت
میں کسی کو شریک نہ کرے ۞

اے میرے دوستو! اور میرے عزیز مسلمانو! غالباً میرے اس مختصر بیان سے آپ کے دلوں کو پورا
اطمینان ہو گیا ہوگا، کہ اسلام کو علم کا کچھ خوف نہیں ہے، اور نہ اسلام کی شہادت کو ایسے ملک میں جہاں
علم کی ترقی ہے، کوئی چیمہ مانع ہے، اور نہ اسلام کے دونوں حصوں یعنی توحید اور نبوت کے ثبوت کے
لئے ہیں علم سے اندیشہ ہے، بلکہ اُس سے مدد ملنے کی امید ہے، مگر اسی کے ساتھ آپ کے دلوں میں یہ
بات ضرور کھٹکتی ہوگی۔ کہ اگر واقعی اسلام اور علم، شریعت و حکمت، مذہب و فطرت ایک ہیں، اور ایک
دوسرے کے حامی و مددگار۔ تو پھر بظاہر دونوں میں اب تک طاؤس و مار کی طرح عداوت کیوں مشہور رہی
اور مذہبی پیشوا اور دیندار عالم ہمیشہ حکمت و فلسفہ سے لوگوں کو کیوں ڈراتے۔ اور علم و عقل کو مذہبی باتوں

میں دخل دینے سے کیوں روکتے رہے ہیں۔ اگر دین و حکمت کا اتحاد صحیح ہوتا۔ تو کفر کے اکات، کوفلہ کی، ف، پر کیوں ترجیح دی جاتی۔ اور منطق و حکمت کے پڑھنے والے، کیوں خبیث سمجھے جانے، اسلئے آپ کے اطمینان کے لئے اس وقت اسکی بابت کچھ کہنا مناسب سمجھنا ہوں *

صاحبو! جیسا کہ میں نے کہا اور میں نے کیا، جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے، حقیقت میں علم اور مذہب دونوں ایک اور ایک دوسرے کے حامی ہیں اور جو کچھ اختلاف نظر آتا ہے وہ یا غلط فہمی پر مبنی ہے یا اپنی اپنی حدود سے تجاوز کرنے پر *

غلط فہمی، تو یہ ہے۔ کہ جس کو مذہب ہی اعتقاد کہا جاتا ہو۔ وہ سچے مذہب نے نہ سکھایا ہو۔ یا جو علمی تحقیقات کا نتیجہ سمجھا گیا ہو، اس کا ثبوت قطعی نہ ہو۔ مثلاً یہ خیال کہ قات زرد کا پہاڑ ہے۔ اور دنیا کو ایسے گہرے ہوئے جیسے باغ کو چار دیواری، اور آسمان کے کنارے، اُس پر رکھے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے آسمان بن نہ نظر آتا ہے۔ یا یہ کہ زمین ایک بڑے پتھر پر رکھی ہوئی ہے اور وہ پتھر ہیل کے سینکڑے ہے، جب کہ ہیل اپنا سینکڑا ہلاتا ہے، تو پتھر ہلتا ہے، اور اُس سے زلزلہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ باتیں مذہبی ہیں اور ان کا ماننا ضرور ہے، تو بلاشبہ مذہب اور علم کا اتحاد ثابت نہ ہوگا۔ مگر چونکہ ان اقوال کی بنیاد غلط فہمی پر مبنی ہے، اور یہ باتیں جھوٹی اور لغو کہا نیوں کی طرح سستی سنانی مذہب میں داخل ہو گئی ہیں۔ اس لئے اس سے اس اتحاد پر کچھ اثر نہیں پہنچتا۔ اسی طرح بعض فلاسفہ کا یہ خیال، کہ دنیا کا بننا والا اور اپنی قدرت کا مد سے اُس کا انتظام قائم رکھنے والا کوئی نہیں ہے، اتفاقات سے خود بخود یہ سب کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، اگر سچا مسئلہ علم کا ہے، تو مذہب کی مخالفت اُس سے لازمی ہے مگر جب کہ وہ ایسا مسئلہ ہے جو قطعی دلائل سے ثابت نہیں ہوا بلکہ اُس کی بنیاد کوہ قات کے زرد ہوئے سے زیادہ نہیں ہے تو اس سے کبھی کبھی مخالفت علم مذہب کی ثابت نہیں ہوتی۔ پس وہ باتیں جو عقائد مسئلہ مذہب میں سے نہ ہوں۔ اور جو قطعی اور یقینی طور پر ثابت نہ ہوں، اگر مذہب میں داخل ہو گئی ہوں یا وہ مسائل جن کا ثبوت براہین ہندسیہ اور دلائل منطقیہ سے قطعی طور پر نہ ہوا ہو، اگر علمی مسائل کہے جاتے ہوں تو اس سے مخالف دونوں کا ثابت نہیں ہوتا۔ مخالف کے لئے تو وحدت موضوع اور محمول، قوت و فعل، شرط اور اضافت، جز و اور کل، مکان اور زمان، کی شرط ہے۔ اگر اس میں سے ایک میں بھی فرق ہوا، تو تناقض ثابت نہ ہوگا۔ اس لئے جب تک مذہبی اور علمی مسائل دونوں اپنے اپنے طور پر قطعی اور یقینی نہ ہوں ان کے اتحاد میں خلل نہ ہوگا اور اَلْبَاقِيْنَ لَا يَزُولُ اِلَّا الْبَاقِيْنَ مثلاً کا مقولہ ہمیشہ اس بحث میں پیش نظر رکھنا پڑیگا *

دوسرا سبب یعنی مذہب اور علم کا اپنے اپنے حدود سے تجاوز کرنا، وہ یہ ہے کہ جو قدرتی حیل مذہب اور علم کی ٹھیری ہوئی ہیں۔ اُن سے کوئی باہر نکل جا دے اور دوسرے کی سرحدیں چلا جا دے

مثلاً عالم شہادت اور ناسوتِ علم کی مملکت ہے، اور عالمِ غیب اور لاہوت میں مذہب کی حکومت موجود عالم کی تحقیقات کرنا، اور مادی کائنات کی حقیقت دریافت کرنی، علم سے متعلق ہے۔ اور خدا کو پہچاننا، اور اُس کی مرضی دریافت کرنی، اور اخلاقِ حسنہ سے نفس کو درست کرنا، اور بعد الموت کے آنے والی حالت کے لئے تیاری کرنی مذہب کا کام ہے۔ مذہب کے حدود سے خارج ہے کوئی نیا فلسفہ سکھا دے، یا ہیئت و ہندسہ کی تعلیم دے، اور موجوداتِ عالم کی تحقیقات کرے۔ اس کا کام نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو سکھاوے کہ اس عالم کی ترکیب اور ترتیب کیونکر ہوئی، وہ کس مادہ سے بنایا گیا، مادہ خود کیا ہے، ہیولے اور صورت کسے کہتے ہیں، اجزاء لایچجزے کیا تھے ہیں، ابعاد ثلثہ اور عناصر اربعہ کیا ہیں۔ اس کا کام نہیں ہے، کہ وہ اس بات پر غور کرے۔ کہ نیکت کی طرح سطحِ چرخ پر ہم رہتے ہیں، گول ہیں یا چٹبی، اور یہ نیلی نیلی چھت جو ہمیں نظر آتی ہے فضا ہے محض ہے یا سونے چاندی کا گنبد، سورج ہم سے کتنا دور ہے، کئی برس میں توپ کا گول زمین سے اُس تک پہنچ سکتا ہے وہ منور ہے یا تاریک، متحرک ہے یا ساکن، آباد ہے یا ویران، اگر آباد ہے تو اس کے رہنے والے ہماری ہی صورت و شکل کے آدمی ہیں یا بے دم بندر۔ اگر مذہب ان باتوں میں دخل دے تو سمجھا چاہیے کہ اُس نے اپنے حدود سے باہر قدم رکھا، اور اپنے دوست یعنی علم کی سرحد میں مداخلت کی۔ یہ گویا اس کی طرف سے لڑائی کا پیام سمجھا جائیگا، اور ضرور دونوں میں جنگ شروع ہوگی۔ اُن یہ سچ ہے، کہ مذہب ان علمی باتوں پر اشارہ کرتا ہے، اور الہامی کتابوں میں قادرِ مطلق کی بے نظیر قدرت کے ظاہر اور اس کے وجود کے ثبات، کرنے کے لئے سادے اور عام فہم طریقے سے مطابق اُس زمانہ کے خیالات اور معلومات کے کچھ کچھ ان چیزوں کا اجمالاً بیان ہوتا ہے۔ اور اُس پر فکر و غور کرنے، اور اس کے دقائق و حقائق کی تحقیق پر رغبت دلائی جاتی ہے، مگر صرف اشاروں اور عام فہم باتوں میں آئندہ علم کا کام ہے کہ وہ بذریعہ اُن آلات کے جو تحقیقات اور ادراکِ اشیاء کے لئے انسان کو دئے گئے ہیں۔ یعنی جو اس او عقل، اُن کی حقیقت دریافت کرے، اور اپنی وسیع مملکت میں آزادی اپنا کام کرے۔ علم کا کام ہے کہ قدرت کے کارخانے پر نظر کرے، موجودات اور قدرتی مصنوعات کو غور کی نگاہ سے دیکھے۔ ان کے درجے قرار دے، ان کا باہمی تناسب ثابت کرے، اُن کی اصلیت اور خاصیت اور حالت سے بحث کرے، اسے اختیار ہے کہ وہ کوشش کرے، اس بات کے دریافت کرنے کی، کہ آسمان کی چیز ہے، زمین کیا شے ہے، نباتات اور حیوانات، دریا اور پہاڑ کی ترکیب کیونکر ہوئی ہے، پانی کیسے برستا ہے، ہوا کیونکر چلتی ہے، آفتاب متحرک ہے یا ساکن، چاند نورانی ہے یا تاریک، یہ نیلا نیلا گنبد جو نظر آتا ہے، اُس کی حقیقت کیا ہے، ہزاروں چرخ جو اُس میں جلتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ کیا ہیں، اُن کی جسامت اُن کا بُعد، اُن کی خاصیت کیا ہے۔

پھودہ آباد ہیں یا دیران چلتے ہیں یا ٹھیرے ہوئے۔ نباتات کی کتنی قسمیں ہیں، حیوانات کی اصل کلیہ اور ان کے خاندان کتنے ہیں۔ پھر انسان کیونکر بنا، وہ اپنی نفع میں اور حیوانوں سے جدا ہے یا صرف ترقی یافتہ تنگور ہے۔ غرض کہ جہاں تک عقل اور حواس کام دیسکیں، وہ موجودات عالم پر غور کرے، اور اس کی تحقیقات، اُسے اختیار ہے، کہ عقل کے گھوڑے جہاں تک وہ اپنے وسیع میدان میں دوڑا کر دوڑاے، اور اپنی فکر کے جنگل میں جہاں تک ہو سکے وہ گھومنا اور چکر لگاتا پھرے، مگر اس کے لئے بھی ایک حد ہے، جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتا۔ اگر اس سے وہ تجاوز کر گیا، اور مذہب کی سرحد میں قدم رکھ گیا، تو اس کی طرف سے گویا لڑائی کا اشتہار ہوگا، اور وہ ضرور مذہب پر حملہ کرنے والا سمجھا جائیگا۔

علم موجودات کے حالات اور ان کے خواص اور تاثیرات دریافت کر سکتا ہے۔ مگر سوال علم کے کسی عنصر یا بسیط کی ماہیت اور حقیقت نہیں بتا سکتا، وہ آسمان اور زمین کی خلقت کی آغاز اور انسان کی پیدائش میں کروڑوں سال کا زمانہ قرار دے لیتا ہے۔ مگر اس کا آغاز کیونکر ہوا، اسے نہیں سمجھ سکتا وہ چاند، سورج، زہرہ و مشتری، مریخ و عطارد، اور تمام سیاروں کی جہاست، ان کا فاصلہ، اور ان کی گردش کی مدت جان سکتا ہے، مگر قدرت کے اس بھید کو نہیں بتا سکتا، جس سے ان کی جہاست اور جہیز اور فاصلہ کے ایک عین اندازہ قرار پانے کی علت معلوم ہو۔ اور ان کے ایک مفری چال پر گردش کرنے کا سبب سمجھ میں آوے۔ آفتاب ہے کہ وہ اپنے محور پر ایک عین چال پر گھوم رہا ہے مگر اس کی چال کے عین کرنے والی قوت کون ہے۔ اَلشَّمْسُ تَجْرِي لَمْ تُسْقِطْهَا ذَٰلِكَ نَفْثُ الْغَيِّثِ الْعَلِيمِ ○ چاند ہے کہ اس کے پھرنے اور سیر کرنے کے لئے منزلیں مقرر ہیں جن سے وہ باہر نہیں جاسکتا، مگر اس کی منزلیں ٹھہرنے والی طاقت کیا ہے۔ وَالْقَمَرَ تَدَّ ذَٰلِكَ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ○ آفتاب ہے کہ چکر کھارہا ہے، چاند ہے کہ دوڑ رہا ہے، مگر وہ کونسی زبردست قوت ہے جو دونوں کو اپنے حدود سے تجاوز نہ کرنے پر مجبور رکھے ہوئے ہے لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الْبَلَدُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ○ علم بتا سکتا ہے کہ آسمان و زمین اور تمام سیاروں بلکہ ساری دنیا کی چیزوں میں ایک قوت کشش کی ہے، جس سے وہ سب اپنی اپنی جگہ پر ٹھہرے ہوئے اور ایک دوسرے کے محافظ ہیں۔ مگر وہ قوت کیا ہے۔ اور اس کا دینے والا اور قائم رکھنے والا کون ہے۔ اس کے ادراک سے اس کی سمجھ ضرور

۱۔ سورج چلا جاتا ہے اپنی ٹھیری ہوئی راہ پر یہ اندازہ ہے مقرر کیا ہوا اس زبردست باخبر کا۔

۲۔ اور چاند کے لئے ہم نے مقرر کردی ہیں منزلیں یہاں تک کہ پھر آجاتا ہے، جیسے پُرانی ٹہنی۔

۳۔ نہ سورج کو پہنچ سکتا ہے کہ پچھلے چاند کو اور نہ رات بڑھ سکتی ہے آگے دن اور ہر کوئی ایک ایک گھیرے میں پھرتے ہیں۔

اللَّهُ يُسَبِّحُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَكِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ
 إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَوْرًا ○ وہ عالم کی بناوٹ کی نسبت کہ سکتا ہے کہ بے انتہا اور بیشمار مختلف قسم کے
 اجزاء لایجزی کے باہمی تضاد سے جو فضا سے غیر محدود میں اڑتے پھرتے تھے۔ کروڑوں برس کی مدت
 میں بنا ہے، مگر اُس کی قوتِ مدد کہ اس امر کے ادراک سے قاصر ہے، کہ وہ اجزاء لایجزی کیا ہیں۔
 ان کی ابتدا کب سے ہے، انہیں فضا سے غیر محدود میں کس نے چھوڑا۔ اور کس قوت نے اُن کو ترکیب
 دیکر ایسی حیرت انگیز دنیا بنائی۔ اَنْ تَزُولَا لَا يَتَفَكَّرُونَ ○ وہ علم تشریح سے انسان
 کی ایک ایک رگ اور ایک ایک پٹھے کی تفصیل، اور اس کے جسم کی ترکیب اور اُس کے مختلف
 حواسوں کے خواص بتا سکتا ہے، مگر اس کے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں ہے جو اُس چیز کو بتا سکے جسے
 جان کتے ہیں۔ اور جس سے یہ خاک کا پتہ ان زمین پر بیٹھے بیٹھے آسمان کی سیر کرتا ہے۔ قُلِ الْوُجُوهُ
 مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ○ اس نے سیاروں کے دیکھنے کیلئے
 بڑی طاقتور دوربینیں ایجاد کیں اور اُس کے ذریعہ سے کروڑوں میل کے فاصلہ سے اُن کے جسم اور
 چیز اور دائرہ گرد کو دیکھا، مگر کوئی ایسی دوربین ایجاد نہ کر سکا جو اُن سیاروں کے بنانے والے کو دیکھ
 سکتا۔ اُس نے آسمانوں کی کیفیت، ستاروں کی گردش، برجوں کی تعداد دریافت کرنے کے لئے
 رصد خانے بنائے۔ مصلاب ایجاد کئے، مگر وہ قدرت کی ان قوتوں کے جاننے کے لئے جو ان چیزوں
 میں چھپی ہوئی ہے۔ اور جس سے طلسم کا رخانہ چل رہا ہے۔ نہ کوئی رصد خانہ بنا سکا، نہ کوئی مصلاب
 ایجاد کر سکا۔ کیونکہ یہ اُس کے اختیار سے خارج، اور اس کے حدود سے باہر ہے جب وہ اپنی حد سے
 آگے بڑھنے کا ارادہ کرتا ہے، تو مذہب اُسے روک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر ایک قدم آگے بڑھایا
 تو تجبی النہی تجھے جلا کر خاک کر دیگی۔ اب آگے عالم غیب اور عالم لاہوت ہے، جہاں سے میری حکومت
 شروع ہوتی ہے، مذہب بتاتا ہے کہ عالم شہادت میں جو کچھ تم دیکھتے ہو، ان تمام چیزوں کا ایک بنانا
 والا ہے، جس کی قدرت کے قدم کے نشان ہر جگہ پائے جاتے ہیں، اور جس کی ہستی کا ثبوت آسمان
 اور زمین، چاند اور سورج، پہاڑ اور دریا، آگ اور پانی، ہوا اور خاک، بلکہ ریک کے ہر ذرہ، اور
 سمندر کے ہر قطرہ، اور درخت کے ہر پتے سے ہوتا ہے۔

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَّهِ آيَةٌ تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدٌ

ہرگز درختانِ بنبر در نظر ہوشیار ہر ذرے دفترِ معرفت گردگار

کوئی سیارہ آسمان پر، کوئی جاندار زمین پر، کوئی پرندہ ہوا میں، کوئی درخت جنگل میں، ایسا نہیں ہے
 جسے اللہ کے لئے ہر آسمان زمین کو کرنے سے اور اگر کچھ تو کون اُن کو روک سکتا ہے جس کو وہ ہر ذرہ پر بخشنے والا ہے
 اور ہر ایک چیز میں اُس کی نشانی ہے جو دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ اس کا بنانے والا ایک ہے۔

جو اُس کے خالق اور صانع ہونے پر گواہی نہ دیتا اور اپنی زبان حال سے اپنے پیدا کرنے والے کی تسبیح و تقدیس نہ کرتا ہو۔

وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يَسْتَعِجِلُّ بِمَحْمَدٍ وَلٰكِنْ لَا تَقْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔ جب ہم ایسی ذات کی معرفت اور اس کی صفات کا علم اور اس کی مرضی دریافت کرنی چاہتے ہیں، اور اس تک پہنچنے کا شوق ہم کو پیدا ہوتا ہے، تو علم اس کے دروازہ تک پہنچا کر یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہے لَوْ كُنْتُ اَعْمَلَةً۔

اگر ایک سرسبز برتر پر فروغ منجلی بسوز و سرم علم ہم کو ایک قادر مطلق کی ہستی کا اقرار کر کے (خواہ وہ خالق کے نام سے ہو، یا علتِ اعلیٰ کے پردہ میں، بھٹکتا ہوا اور اندھیرے میں ٹکریں مارتا چھوڑ جاتا ہے۔ اس وقت مذہبِ حیح کی شعل لیکر ہمارے راہ بتانے کے لئے سامنے آتا ہے، اور ہم کو اپنی نہ بھگنے والی روشنی دکھا کر سیدھے راستے پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ جہاں سے اُس کے جلال و جمال کی نشانیاں نظر آنے لگتی ہیں، اُس کی وصال کا شوق بڑھتا جاتا ہے، اور جہاں فی اوجہ ظہانی حجاب دور ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار وہ یہی حالت پر پہنچ جاتا ہے، کہ کانوں میں کوئی آواز نہیں آتی، الا اس کی۔ آنکھ کسی چیز کو نہیں دیکھتی الا اُسے، دل میں کوئی خیال نہیں گزرتا الا اُس کا۔ مِمَّنْ يَسْمَعُونَ وَالْبَدَنُ يَنْظُرُونَ وَفِي عَظْمَيْهِمْ وَجِلْدَانِهِمْ يَتَفَكَّرُونَ وَعِبَادًا يُكَلِّمُهُمْ يَنْتَسِبُهُمْ وَلِإِلَاقَاءِ رِجَالِهِمْ لِيَشْكُرُوا تَعْلِيمَهُ۔

غرض کہ یہ ہیں علم اور مذہب کے حدود جو مختصر میں نے بیان کئے۔ پس اگر علم جس کی رسائی عالمِ ازل اور ملکوت تک نہیں ہے۔ اور جو انسان کی آئندہ زندگی کے حالات جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتا، ان باتوں میں دخل نہ دے، اور اپنے دوست مذہب کے حدود میں مداخلت نہ کرے۔ تو مذہب کبھی اُس کے مزاحم نہ ہوگا۔ بلکہ اُس کے فکرو میں وہ اُسے ہوا اور روشنی کی طرح آزاد رہنے دیگا۔ اور جہاں تک وہ اپنے اصلی دشمن یعنی جہل سے مقابلہ کرے، اس کا معین و مددگار ہوگا، بلکہ اس پر فتح حاصل کرنے پر اُسے مبارک باد دیگا۔ البتہ اگر اُس نے اُس کی حدود میں مداخلت کی، اور الہیات کے مسائل اور مبدا و معاد کی باتوں میں دخل دیا، تو مذہب اُس کو اپنے اوپر حملہ کرنے والا سمجھیکے گا۔ اور اُس سے مقابلہ کرے گا۔ اور اُسے سخت ریجروں میں قید کر کے اپنے لوگوں کو اس سے ملنے کا مانع ہوگا۔

۱۔ اور کوئی چیز نہیں ہے مگر تسبیح کرتی ہے، اس کی تعریفیں مگر تم اُس کی تسبیح نہیں سمجھتے۔

۲۔ اگر ایک نشست بھرتے بڑھو تو جل جاؤں۔

۳۔ اُسی سے سنتے ہیں اُسی کو دیکھتے ہیں اُسی کی عظمت و جلال کو سوچنے ہیں اور اُسی کے فرشتوں سے مشابہ ہوتے ہیں اور اپنے پروردگار کے ملنے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔

پس اے میرے دوستو! مذہب اور علم کی مخالفت صرف غلط فہمی یا اپنے اپنے حدود سے تجاوز کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اور اسی لئے ایک دوسرے کے مخالف سمجھے جاتے ہیں۔ اگلے زمانہ میں جبکہ یونانیوں کا فلسفہ اسلام میں پھیلا۔ تو مخالفت کا خیال زیادہ تر اس لئے پیدا ہوا۔ کہ اُن کے فلسفہ نے اپنی حکومت کی کوئی حد نہ رکھی تھی۔ اور اُس نے مذہب کی ریاست میں اپنے احکام جاری کرنے چاہے تھے۔ بلکہ مذہب کے لئے ایک چھوٹا سا مکتبہ بھی نہ چھوڑا تھا۔ اُس نے اپنا کام **الْإِنشَاءُ بِالْأَلَمِ مَحْصِلُ الطَّاقَةِ الْبَشَرِيَّةِ قَرَامِدِ يَأْتِي**۔ اور چواہر روحانیہ، اور حالات نفسانیہ، اور مبادی و معاد کی تحقیق کو اپنے حدود میں داخل رکھا تھا، اُسے صرف موجودات عالم اور عالم شہادت ہی سے بحث نہ تھی، بلکہ عالم غیب اور ملکوت اور لاہوت کو بھی اپنے قلم و میں سمجھتا تھا۔ ایسی حالت میں لامحالہ مذہب اُس کی مخالفت کا اشتہار دیا۔ اور اُس سے منقاد کیا۔ اور اپنے کمزور اور ضعیف لوگوں کو اُس سے ملنے کو منع کیا، مگر اب وہ صورت نہیں رہی۔ اس زمانہ کے علم نے اکثر اپنے حدود قایل کر دیئے ہیں۔ اور سوائے عالم شہادت کے وہ عالم غیب اور ملکوت اور لاہوت میں دخل نہیں دیتا۔ اور وہاں تک رسائی اپنی قدرت سے خارج سمجھتا ہے، اب جو کچھ مخالفت نظر آتی ہے، وہ اکثر غلط فہمی پر مبنی ہے اور مذہب کے حدود تجاوز کرنے پر ہے۔

اگر غلط فہمیاں دور نہ کر دی جائیں۔ اور وہ اپنے حدود سے تجاوز کرنے پر نہ روکا جائے۔ تو بلاشبہ موجودہ حالت مذہب کی علم کے مقابلہ میں اطمینان بخش نہ ہوگی۔ اور نہ ہمارا خیال اسلام کی اشاعت کا اہل علم کے سامنے مناسب ہوگا۔ اور ضرور ہمیں اُن لوگوں کے سامنے جو فطرت کے خلاف کسی بات کو نہیں مانتے۔ مشکل پیش آوے گی۔ مگر ہمیں اس مشکل کو نہ مشکل سمجھنا چاہئے۔ اور نہ اس سے اندیشہ کرنا۔ اس لئے کہ فرمان شاہی جس میں مذہب کے حدود اور اختیارات اور قانون اور ضابطے سب بچھے ہوئے ہیں، وہ ہمارے پاس بخشنہ اور بعینہ موجود ہے۔ اور جس طرح خدا نے بھیجا تھا۔ ویسا ہی بشیر کسی قسم کی تحریف اور تغیر کے وہ اب تک ہر ایک مسلمان کے ہاتھ میں ہے، وہ فرمان شاہی خود تمام غلطیوں کو دور کرتا اور اسلام کی حدود بتاتا اور باذن بلند کہتا ہے کہ **تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ** ○

اے میرے دوستو! اب وقت نہیں ہے کہ میں علم اور مذہب کی موافقت کی نسبت کچھ زیادہ کہوں بلکہ جو کچھ کہا گو وہ اس مضمون کے لحاظ سے نہایت کم ہے۔ مگر اس موقع کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے، اس لئے میں اُسے کسی آئندہ وقت کے لئے ملتوی کرتا ہوں۔ اور انشاء اللہ نعلے کسی اور موقع پر اسی مضمون پر تفصیلی بحث کرونگا، ابھی مجھے چند سوالات کا جواب دینا باقی ہے۔

۱۔ میں متور کی برائیاں میں خدا کی بڑھو اُس سے اور جو کوئی اُس سے بڑھیکہ کا وہ ظالموں میں سے ہوگا۔

ایک یہ کہ اسلام میں سیکڑوں فرشتے ہیں، کس فرشتے کا اسلام جاری کرنا منظور ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اُس اسلام کو جاری کرنا منظور ہے۔ جو قرآن میں ہے اور جس کے جاری کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور جس کو خدا کے رسول نے جاری کیا، اور جسے اُس کے بعد اُس کے صحابہ اہلبیت جاری کرتے رہے۔ اگر لوگوں نے اس اسلام میں کچھ ملا دیا ہے، اور ان کی تفریق سے اسلام کی حقیقت چھپ گئی ہے، اس سے اصلی اسلام کی حقیقت معلوم ہونے میں کچھ دشواری نہیں ہے۔ اول تو ہزاروں بندے خدا کے ایسے ہیں جو اس سچے اسلام کے معتقد اور اُس کے پابند ہیں۔ خدا کی زمین ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہے، اور آسمان نے ایسے مسلمانوں کو بھی زمین کے پردے سے اٹھا نہیں لیا ہے، اور اگر فرض کرو کہ کوئی ایسے اسلام کا جاننے والا صغیر زمین پر باقی بچے ہو، تو وہ کتابِ باقی ہے جس میں اسلام کی سچی تصویر بنی ہوئی ہے، اور جو ہمیشہ باقی رہے گی اگر لوگوں نے غلط فہمی یا نادانی یا تعصب سے اسلام کی خوب صورت شکل کچھ بگاڑ دی ہے اور اختلافِ مذہب سے اسلام مختلف شکلوں اور مختلف صورتوں میں نظر آ رہا ہے، یہاں تک کہ اُس کی پیاری صورت کا بعض جگہ کفر و شرک کی بھونڈی اور کالی شکل سے نیز کرنا بھی شکل ہے، اس سے اسلام میں کچھ خلل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اسلام کی اصلی صورت چھپ سکتی ہے۔ اس لئے کہ اسلام کی حقیقت اصلی صورت وہ نہیں ہے، جس کو علم و حکمت کے دشمن نے کھانے پھرتے ہیں۔ بلکہ اصلی تصویر اُس کی اُس الہم میں موجود ہے جو اس کے مصور نے نہایت احتیاط سے اپنے امین کے ہاتھوں اپنے رسول کے پاس بھیجی تھی، اور جس کو وہ پاک بندہ خدا کا خدا کے بندوں کو دکھا کر اُس کا گرویدہ کرتا تھا، اور جس کو اُس کے بار اور ہر اہل بیت میں لئے ہوئے تمام دنیا کو بکھاتے پھرتے تھے، اور جس کو دیکھ کر سارا جہان اس کا شیعہ اور عاشق ہو گیا تھا۔ اور جس کی صدا ہزاروں بکھوکھو کا نقیب بغیر کسی قسم کی تغیر و تبدیل کے ہر مسلمان کے پاس اس وقت موجود ہیں۔ جب یہ سچا اور صحیح فوٹو تم میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ہے، تو کس بات کا تم کو خوف ہے، اس اصلی تصویر کو نقل میں یا کر جہاں چاہو جاؤ، اور اسلام کی شبیہ دنیا کو دکھلاؤ، پھر دیکھو کہ اس تصویر کے کتنے چاہنے والے پیدا ہوتے ہیں، اور کتنے لوگ اُس پر جان و دل قربان کرتے ہیں ۛ

بنائے رُخ کہ خلقے والہ شونہ و جیراں

بکٹا لے لب کہ فریاد از مرد و زن برآید

اسلام کی دعوت قیامت تک جاری رہنے کے لئے بڑے اطمینان کی بات تو ہے وہ یہی ہے کہ اس کا اصلی دعوت نامہ ہمارے پاس موجود ہے، اور بغیر کسی قسم کی کمی و بیشی کے اُس کے اصول و احکام معلوم، اور مَا بَيْنَ الدِّينَيْنِ مَحْظُوظٌ هُنَّ - نہ زمانہ کا ماتھہ اُس سے بدل سکا، نہ بدل سکتا ہے، نہ انسان کی تحریف کا اثر اُس پر ہوا، نہ ہو سکتا ہے۔ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ خَلْقٍ مُجِيدٍ -

لے نہیں آتا ہے باطل اُس کے سامنے سے یا اس کے پیچھے سے یہی ہوا ہے حکمتِ الہیہ سراسر ہے ہونے کی طرف سے ۛ

اس کتاب میں جو اسلام دکھائے وہی سچا اسلام ہے، اور اسی کا پھیلاتا ہمیں منظور ہے۔ اگر مذہب کو لوگوں نے بگاڑ دیا ہے، اور اختلاف اور تفریق سے اس میں لوگوں کے خیالات اور رائیں اور باتیں داخل ہو گئی ہیں اس کا اثر اسلام پر نہیں پہنچ سکتا، نہ پاک کتاب میں اس سے کچھ فرق آ سکتا ہے۔ وہ باتیں جو نقاب کے ہیں، جو اس کے پیارے منہ پر لپکتی ہیں، یا شل لباس کے ہیں جو اپنے مذاق اور طبیعت اور خواہش کے موافق انسانوں نے اُسے پہنا دئے ہیں، جب یہ نقاب اتار دئے جائیں، اور وہ مختلف لباس الگ کر لئے جائیں، تو اسلام کی دلربا اور دلفریب صورت جیسی تھی ویسی ہی نظر آنے لگیگی ۷

دمدم گر شود لباس بدل مرد صاحب لباس راجہ خلل

رہا یہ امر کہ باہمی اختلاف کے سبب سے کوئی مسلمان اصل اسلام کی اشاعت کا بائج ہو، اور توحید اور رسالت کی منادی کرانے میں خلل ڈالے، اور قرآن کی دعوت دینے میں اختلاف کرے، اسے میں نہیں مانتا، میرے نزدیک کوئی مسلمان کسی فرقہ کا ہو۔ اشاعت اسلام میں اپنے فروعی اختلاف سے خلل ڈالنے کی ہرگز جرات نہ کرے گا۔ اور منکرین اسلام کو اپنے جھگڑوں کے سبب اصل اسلام کی دعوت دینے میں بائج نہ ہوگا۔ کون کافر مسلمان ہوگا جو کفر کی کسی شاخ کو اصل اسلام پر مقدم سمجھے، یا کفر کے کسی فرقے کو اسلام کے کسی فرقہ پر ترجیح دے آپ مولوی عبد القدوس سے پوچھیں یا میاں عبد الخیر شمس سے یا کسی اور سے، یقیناً سب یہی جواب دیں گے کہ سب جھگڑے طاق پر رکھو، اور خدا کے نام کی منادی کرو لوگوں سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرالو۔ پھر اس کے بعد فروع میں لڑتے جھگڑتے رہو، جس فرقہ میں اسلام کے کوئی داخل ہوگا، مسلمان کہلائیگا، اور اسلام کا جلوہ ہر صورت میں نظر آئیگا، مسلمان، مسلمان ہیں اور کافر سے ہزار درجہ بہتر۔ اشعری ہوں یا معتزلی، دہائی ہوں یا جعتی، شیعہ ہوں یا سنی، اسلام کے وسیع دائرہ سے کوئی خارج نہیں ہے ۷

شاخ گل ہر جا کہ روید ہم گل است خم مل ہر جا کہ جو شد ہم مل است

گزر مغرب بر زند خورشید ہر عین نور شید است دئے چیزے دگر

گزر بغداد و ہری بازرے اند بے مزاج آب و گل نسل ہے اند

پس دل ہم کو فکر کرنی چاہئے، توحید کے پھیلانے اور خدا کے منکرین یا بتیں خداؤں پر اعتقاد رکھنے والوں کو موجد بنانے، اور ان شخصیت کی رسالت پر ایمان لانے کی نہ کسی اور بات کی، اگر ہم اس میں کامیاب ہو گے اور ایک پھرے ہوئے دل کو بھی اس کی طرف پھیر لیا، یعنی ایک منکر کو بھی مومن بنا لیا، یا ایک عیسائی کو بھی تثلیث کے گورکھ دھندے سے نکال دیا۔ ہماری سعی بلاشبہ مشکور ہوگی، اور ہم خدا کے سامنے شک نہ کرے اور اس کے نام کی منادی کرنے والوں میں داخل ہو جائیگی ۷

اب رہا تیسرا شیعہ کہ کیا یہ ذریعہ اطمینان حاصل کرنے کا ہے اس پر کہ جو روپیہ مسلمانوں سے

وصول ہوگا، وہ ضائع نہ ہوگا۔ اور جہ کام کے لئے وصول کیا جاتا ہے اُسی میں صرف ہوگا، شبہ ایسا ہے جس کی نسبت مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کے کام عموماً اعتبار اور بھروسے پر چلتے ہیں۔ ہندسی دیلوں کی طرح اُن پر کامل یقین اور پورے اطمینان حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جب کہ ہم ایک دو تہند، نیک طینت، فیاض طبیعت، ہوشیار اور سمجھ دار مسلمان کو جیسے کہ عبداللہ صاحب عرب، ہیں۔ اس کام پر مستعد دیکھتے ہیں۔ اور ان کے حالات اور خیالات اور برتاؤ اور رویہ سے بخوبی واقف ہیں اور یہ بھی ہم کو معلوم ہو گیا ہے۔ کہ اُنہوں نے خود جاکر اُس خدا کے بندہ کی، جس نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے تمام حالات دریافت کر لئے ہیں۔ اور اُس کو اطمینان ہے کہ یہ عمدگی سے چلیگا اور جس کام کے لئے روپیہ وصول کیا جاتا ہے، اُسی میں صرف ہوگا۔ تو ہم کو اس میں شبہ کرنے کا کوئی قوی سبب نہیں ہے، سوائے اس کے حاجی عبداللہ صاحب خود ایک رقم خطیر اپنے پاس سے صرف کرنے پر آمادہ ہیں۔ بلکہ بدرجہ مجبوری کل خرچ اپنے پاس سے دینے کو موجود، اور نیز وہ صاحب خود یہاں آنے پر مستعد اور آپ کے ملنے کے لئے آمادہ ہیں۔ اور غالباً آدینے بھی۔ تب خود آپ کو موقع اُن کے تمام حالات دریافت کرنے اور اپنے اطمینان حاصل کرنے کا ملے گا، ان حالات میں بظاہر کوئی وجہ بے اطمینانی کی، اور روپیہ کے تلف یا ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔ رہا یہ امر کہ خود اُن کو اسلام اور شریعت سے کہاں تک واقفیت ہے، اور وہ خود اسلام کی حقیقت کیا جانتے ہیں۔ اور کس طور سے اُس کی منادی اپنے لوگوں میں کریں گے، اُس کی نسبت میں صرف اتنا کہتا ہوں۔ جب کہ ایک سمجھ دار ذی علم، لائق اور صاحبِ ہند اور پوپین نے اسلام کے اصول کو سچا مانا۔ اور خدا کو ایک۔ پیغمبر کو برحق، اور قرآن کو کلامِ الہی، مان لیا ہے۔ تو اس سے یہی امید ہے، کہ وہ اپنے اہل وطن کے خیالات اور مذاق کے موافق ایسے طور سے اسلامی اصول اُن کو سکھائیگا، جس کی تقلید کی مسلمانوں سے توقع نہیں ہو سکتی، اور اس کا اثر بھی اُن پر وہ ہوگا جو ہماری تحریروں اور تقریروں سے نہیں ہو سکتا۔ اگر اس میں کسی کو شبہ ہو تو یورپ کے اُن عالموں کی تحریروں کو دیکھیے۔ جنہوں نے باوجود علانیہ مسلمان نہ ہونے کے اسلام کی نسبت اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ اور فقط قرآن مجید کے ترجمہ کو دیکھ کر اور آنحضرت کی سیرت پر مطلع ہو کر متعصب پادریوں اور منافقوں کے غلط الزامات کو رد کا ہے۔ اور قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی ایسی خوبیاں ظاہر کی ہیں، کہ میں تو اس وقت ساری اسلامی دنیا میں مٹھوڑے ہی سے مسلمان عالموں کی نسبت خیال کر سکتا ہوں، کہ وہ اس کے کام کریں، اور قرآن مجید، اور سرور کائنات کی ذات مبارک پر کتنے جینی کرنے والوں، اور حکیموں، اور فلسفیوں کے دونوں باوجود تحریروں ایسا اثر ڈال سکیں، اور ایسی مدلل اور عمدہ تحریریں، کر سکیں۔ بلاشبہ ہزاروں مسلمان عالم ایسے موجود ہیں۔ جو مسلمانوں کے حلقے میں بٹھ کر اسلام کا وہ بیان کریں، کہ سننے والوں کو عرش بریں کی

زیارت کراویں، اور اپنے مریدوں کو وہ داستانیں اور کہانیاں سنائیں۔ کہ سامعین فتنائے
الاشیاء کے درجہ پر پہنچ جائیں۔ انبیاء کے معجزات اور اولیاء کی کرامات کا ذکر اس فصاحت سے
فرمائیں کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کا غلغلہ ملا، اعلیٰ تک پہنچے۔ اور آسمان وزمین کے
عجائبات کی وہ تفسیر کریں کہ ساتوں طبق زمین کے اور ساتوں پردے آسمان کے سننے والوں پر
کھل جائیں، مگر کہاں ہیں وہ عالم مسلمان، جو منکرین کے سامنے اسلام کی ایسی حقیقت بیان فرمائیں
کہ اُن کے دل کے شکوک اور شبہات کھل جائیں۔ اور علم و حکمت کے جاننے والے اُسے سنکر
اَمْتًا وَصَدًا فتنایکارتے لگیں۔ کہاں ملیں گے وہ محقق مسلمان، جو اسلام کی حقیقت، اُن لوگوں پر
ثابت کریں جو کسی بات کو بھی خلاف فطرت نہیں مانتے، اور کہاں پائینگے ہم اُن مسلمان و غفلوں کو
جو خدا کے اقوال کو خدا کے افعال سے مطابق ہونا ثابت کر دکھائیں۔ اور علم کے حملے سے مذہب کو
بچائیں۔ اے میرے عزیزو، مسلمانوں کو جدیدیں لانا، مومنین کو جوش دلا نا، معتقدین کے دلوں کو
مسخر کرنا، مریدوں پر دجا اور محبت کی حالت طاری کر دینی، بخدا آسان اور نہایت آسان ہے۔
مجنوں کے نالہ و فریاد کے لئے یلی کا نام لیں ہے۔ اور فرڈا کے سر پھوڑنے کے لئے شیریں کی یاد
دلائی کافی ہے، مگر منکرین کے دلوں میں اسلام کی سچائی بٹھانی، اور مذہب کے نہ مانتے والوں پر
اسلام کی حقیقت ثابت کرنی، اور معترضین کے اعتراضوں کی تردید، اور عیب نگانے والوں پر اس
کی خوبیوں کا اثبات، اور حکیمانہ اور فلسفیانہ باتوں کا جواب، اور اسلامی مسائل اور مذہبی روایات کا
فطرت اور علم سے مطابق کر دکھانا، مشکل اور نہایت مشکل ہے قیس کے کہنے سے کہ ”یلی را بچشم
مجنوں باید دید“ کوئی یلی پر عاشق نہیں ہو سکتا۔ فرڈا کی فقط حالت دیکھ کر دیکھنے والا شیریں پر جان
نہیں دینے لگتا۔ مجنوں کے کہنے سے کہ یہ یلی کے کوچہ کا کُتا ہے، دوسرے لوگ اُسے پیانہ لیں سکتے
اور فرڈا کی شوریدگی دیکھ کر دیکھنے والے بے ستون سے جوئے شیر لانے پر آمادہ نہیں ہوتے، اسی طرح
صرف ہماری اعتقادی باتوں سے منکرین پر کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ اور ہمارے تقلیدی خیالات سے
اسلام کی حقیقت دوسرے لوگوں پر ثابت نہیں ہو سکتی۔ اُن کے دلوں پر اسلام کی سچائی بٹھانے
کے لئے تو ہمارا یہ کہنا کافی نہیں ہے، کہ ہمارے مذہب میں ایسا ہی آیا ہے، یا ہماری کتابوں میں
ایسا ہی لکھا ہے یا ہمارے مجتہدوں اور عالموں نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ اور چونکہ ہمارے خیالات دوسرے
قسم کے ہیں، اس لئے ہم سے اس کی توقع کرنی فضول ہے کہ ہم یورپ کے لوگوں کے سامنے اسلام کے
وہ حقائق بیان کریں جن کو سن کر وہ اسلام کی طرف رغبت کریں۔ اور تمام مذہبوں پر اُسے ترجیح دیں
البتہ جو کوئی اُن تعلیم یافتہ لوگوں میں سے مسلمان ہو گیا ہے، یا آئندہ ہو۔ اور جس نے اسلام کی دعوت کا
کام اپنے ذمہ لیا ہو، اور آئندہ لے، اُس سے بلاشبہ اس کی امید ہے۔ کیونکہ ایسے آدمی کا دماغ

دوسرے خیالات سے خالی اور تقلیدی باتوں سے پاک ہوگا اور اس پر سوائے قرآن اور احادیث صحیحہ کے دوسرے کسی کے کتنے کا اثر نہ ہوگا۔ اور نہ وہ تقلیداً ہر کتاب کو خدا کی کتاب اور ہر قول کو رسول کا قول سمجھیکے گا۔ اس لئے پوری اُمید ہے کہ وہ اپنی سعی میں کامیاب ہو، اور اسلام کی سچائی اور حقیقت اپنی قوم پر ثابت کر سکے۔

صاحبو! جو کچھ میں نے کہا وہ کتنا ہی ناتمام اور ناقص ہے۔ اور گو اُس میں کتنی چینی کی بہت گنجائش ہے۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ غالباً بہت سے لوگ ایسے دین کے شائق اور اسلام کے متبید ہیں کہ وہ اب کسی شبہ یا خیال سے اشاعت اسلام کے کام کو بغیر ضروری نہ سمجھیں گے۔ بلکہ اور تمام کاموں سے، جو مسلمانوں پر فرض ہیں، اس سے مقدم جانیں گے۔ اس لئے اب اُس کے جاری کرنے کی تدبیر کرنی چاہئے اس کے لئے میں آپ کی توجہ مولوی حسن علی صاحب واعظ کی تقریر پر دلاتا ہوں، جو ابھی ہ فرما چکے ہیں اور جس میں انہوں نے مصارف و اخراجات کے لئے اسی ہزار روپیہ کا تخمینہ بتایا ہے۔ اب اُس کے جمع اور وصول کی فکر ہونی چاہئے۔ کہ یہی سب پر مقدم ہے اور سب سے مشکل ہے۔

گر جاں طلبی مضافۃً نیست زرے طلبی سخن دین است

شاید اس جلسہ میں تو کوئی ایسا نہ ہوگا، مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بہت سے مسلمان ایسے ہیں کہ اسلام کے ساتھ روکھی سوکھی ہمدردی کرنے کو بہت مستعد اور سب آگے، مگر روپیہ سے مدد کرنے کے لئے نہایت ناکارہ۔ اور سب سے پیچھے۔ اسلام کی حالت اور مسلمانوں کی مصیبت پر اتنی آہیں کریں کہ آسمان اُن کے دھوئیں سے سیاہ ہو جائے، اور اُن کے غم میں اتنے آنسو بہائیں کہ محرم کے اُجرتی رونے والے بھی شرم جائیں۔ اپنے بزرگوں کی کہانیاں سن کر یا لیتنی کنت معہم کا اتنا غل مجائیں کہ کرومیاں ملار اعلیٰ بھی چونک پڑیں۔ اسلام کے نام پر ایسی محبت اور ایسی شیفگی ظاہر کریں کہ قیس اور فرید بھی شرم جائیں۔ مگر جب کام کا وقت آوے اور روپیہ کی مدد مانگی جاوے۔ تو نظر پیا کر مجلس سے ایسے نکل جائیں، جیسے چور، اور اگر پھنس جائیں اور نکل نہ سکیں۔ تو چندہ کی فہرست لانے والے کی طرف ایسا گھوڑیں، جیسے کہ پھانسی کے دارنٹ لانے والے کو، اور اگر شرماترجمی سے نام اور رقم لکھا پڑے، تو دینے کے نام دیں گالیاں۔ یہاں تک کہ اگر مالک الموت بھی نقا صفا کے لئے آوے تو اُس کو بھی جان دے دیں، مگر نہ دیں چتہ کار روپیہ۔ ایسے نام کے مسلمانوں کا نام نہ لینا اور اُن کا ذکر نہ کرنا چاہئے۔ مگر بہت سے ایسے ہیں۔ جو خدا کے نام پر مال کی کیا حقیقت ہے، جان دینے کے لئے مستعد اور گھربا قربان کرنے کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ اور جن کو خدا نے استطاعت بھی دی ہے۔ ہمارا روئے سخن بھی انہیں لوگوں کی طرف ہے۔ اُن سے اب حاجی عبداللہ صاحب عرب کی طرف سے مولوی سن علی صاحب کی طرف سے، اس مجلس کے بانی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قبلہ کی طرف سے،

تو یہ تو یہیں نے کیا غلطی کی، اور مجھ کو سے کن کن کے نام گناہ دئے۔ حضرات معاف کرنا ان کی طرف سے نہیں، بلکہ خدا اور خدا کے رسول کی طرف سے سوال کیا جاتا ہے۔ کہ اس نیک کام میں جس کو تم نیک جانتے اور نیک مانتے ہو۔ اپنی ہمت اور استطاعت اور حالت کے مطابق کچھ دو۔ اور گول گول سفید سفید اریض نورانی میں سے چند ٹکڑے خدا کی طرف سے مانگنے والوں کی تھیلی میں بھی ڈال دو۔ تاکہ ثابت ہو کہ تم مسلم ہو۔ اور اپنے اسلام کے دعوے اور اشاعت اسلام کی خواہش میں سچے۔ احب الناس ان یتزکون ان یقولوا انا وھم لا یغتنون ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین ○ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ کہتا کہ ہم مسلمان ہیں کافی ہے اور امتحان کے بغیر یہ دعوے تمہارا قبول کر لیا جائیگا، ہرگز نہیں، خدا تمہاری اس سمجھ کی تکذیب کرتا اور داتا ہے کہ ہم بے امتحان کے نہ چھوڑینگے اور جو تم سے ادل تھے اُن کو بھی امتحان لئے بغیر نہ چھوڑا۔ امتحان سچا سچ اور جھوٹ کی کسوٹی ہے، اور وہ امتحان کیا ہے، جان و مال، دولت و عزت، گھر بار، کاسب کی محبت کے سلسلے سچ سمجھنا۔ اور خدا کے نام پر سب کچھ قربان کر دینا۔ بحوالہ اللہ تعالیٰ قل ان کان اباؤکم و ابناءؤکم و اخوانکم و انرا و احکم و عشیئرتکم و اموالکم اقترفتھموا و نجارتکم تخشون کسادھا و مسکن تروفلھا احب الیکم من اللہ ورسولہ و جھاد فی سبیلہ فتریبوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لا یھدی القوم الفاسقین ○ اس امتحان میں کامل العیار نکلتا خدا کے خلیل ہی کا کام تھا، جو سچے مسلم تھے اور جو اپنے اسلام کے دعوے میں امتحان کے وقت سچ اور پورے اُترے اُن کی ایک حکایت، کیسی حکایت، دل پر اثر کرنے والی، بلکہ دلوں کو بلا دینے والی مولانا جامی علیہ الرحمۃ کی سلسلۃ الذہب سے لیکر آپ کو سنا تا ہوں، فاستمعوا لک و انصتوا لک لکم ترحمون *

حکایت

چون غلیل اللہ آں امام انام	یافت از حق مواہب انعام
افسردہ دلش نہاد بر	غلطت خلقتش نگنہد بر
شد پئے رہرواں صاحب دل	بر دل پاک او صف تا دل
کثرت مالش از عدد بگذشت	رہ و گلہ اش ز حد بگذشت
کوہ صبحش امواشی و نمش	شہر و دہ بر حواشی و خدش
لیک یا این ہمہ نغمے آسود	پئے کسب رضا حق مے بود
روز بودے شغل مہمانی	شب در اندیشہ خدا خوانی
در مقام مجاہدست قایم	در عبادت قدم زدے دایم

حال اور اچو قد سیاں دیدند
 مئے زیمیانہ گساں خوردند
 کاس ہمد و جمد و مید مش
 عشق نعمت زدست برے راہ
 حق چو آں وہم و آں گساں داشت
 بہر نقد خلیل خواست محک
 خلعت از صورت بشر کردند
 بانگ تسبیح و نعرہ تہلیل
 ناں صدا دوزاے روح افزا
 نام جانان شنید و جاں افشا
 لے خوش آن نعمائے در دامین
 بر کند عقل را ز پنج وز بن
 چون شدند آں گردہ سیمہ سرا
 با خود آمد خلیل و داد آواز
 جان من از سماع ناشدہ سیر
 حالت صوفیاں نگشتہ تمام
 نیست در مذہب مسلمانی
 مرغ را کہ کف تو دانہ کش است
 یا کن قصہ سچ جان داری
 نیم کشتہ نہ مردہ نے زندہ است
 حال اہل صنلال در عقبہ
 قد سیاں کو ہر ادب ستند
 تاکہ این ذکر را نیگاں گوئیم
 کار بے مزد ہیچ کس نہ کند
 کار خواہی بزد بکشت دست
 آنچه دارم ز مال گفت و عقار
 بار دیگر کنسید بہر خدا
 جز ہمیزان طعن نہنجیدند
 طعن بجال و سے آنچنان بردند
 نیست جز در مقابل نقش
 عشق منعم نہا نقش آگاہ
 چارہ آں در امتحال دانست
 داد فداں کہ فرقہ ز ما کہ
 سجدہ گویاں برو گردہ کردند
 برگرفتند در جوار خلیل
 عقل و ہوش خلیل رفت از جا
 آستیں بر ہمہ جہاں افشا
 کہ بود ذوق بخش و شور انگیز
 نو کند در دوسوز عشق کہن
 خاش از سیمہ ہوش ریا
 کیں نوار از تو کنسید آغاز
 بر خوشی چرا شدید دلیر
 بر منشی بود سکوت حرام
 جز باتمام ذبح قربانی
 نیم سبل را کتی نہ خوش است
 یا چو کردی تمام کش بارے
 جان عاشق بایں نہ از زندہ است
 لایموت آمدست و لا یحی
 در جواب خلیل حق گفتند
 کار کردیم مزد آں جو نیم
 مزد دیدہ ز کار بس کشند
 گرہ از کار مزد بکشت دست
 میکنم بر شما دودانگہ تار
 این نواسے طرب فرمے ادا

بر گزشتند قدسیاں تسبیح
 بانگ قدوس و نغمہ سبح
 دل و جانش در انتظار آمد
 وجد و حلائے چنان کہ ہست محال
 بلکہ ناستہ از خیال و گساں
 قدسیاں باز لب فرو بستند
 بانگ برداشت آن ستودہ پیر
 بازیں فکر را عادہ کنسید
 جان من ماہی ست و ذکر حق آب
 ماہی از آب صبر نتواند
 ہر چہ از آب بر کنست لڑد
 سو سماراست زیر ریگے ال
 سبح خواناں کہ مزد جوئے شدند
 مائے و ہوئے او گند در ملکوت
 ذکر ذوالکبریاے و انجوت

شد خلیل از سماع آل بیخوش
 کرد رخ و لباس ہستی شوق
 نالہ شوق پر گرفت خلیل
 جملہ رائے کم فداے شما
 منشیید زیر سر و نموش
 باز آغاز آن فواکہ دند بکو
 شد خلیل از فداے ایشان مت
 وقت خوش یافت نراں تر از دوش
 ساخت طے پردہ و جود از پیش
 سر بردن ز در حبیب ہستی حق
 کانچہ دارم من از کثیر و خلیل
 تا زہم نگساید فداے شما
 کہ شدیم در سماع آل ہمہ گوش
 در د تسبیح خود ادا کردند
 واد بکیارگی عنان از دست
 دست ہمت فشانند صوفی دش

ہر چہ بود دشمن ملک و مال پسند

جملہ در پائے مطرباں افکند

ز آتش امتحان جوا براہیم
 قدسیاں پیش او شدند عیاں
 خالص آمد چو زرتاسب سلیم
 کہ رسولیم از خداے جہاں

آدمی نیستیم ما ملکیم نفد پہنائے نرا مجلیم
آمدہ بہر امتحان تو ایم ناقدِ مخزنِ نہان تو ایم
شد احمد کا مدے بشمار چوں زردہ وہی تمام عیار
تو غلبی و در تو عشقِ خداے متخل شدہ ز سرتاپاے
جز و جزو تو از قدم تافرق گشتہ در خلعتِ محبت غرق
بندہ منعم نہ بندِ نعم از فواتِ نسیم ترا چہ الم
گر نعم فی المثل نعم گردد نیست عشق تو آنکہ کم گردد
چوں دلت از خداے شکبند تاجِ خلعت ہمیں ترا زبند
ہر گمانے کہ داشتیم ترا گشت روشن کہ سہو بود خطا
عشق تو ذاتی ست نہ عرضی گشتہ صافی ز شوبِ ہر عرضی

عشق چوں بر جمال ذات بود

حاشا شد کہ بے ثبات بود

اس حکایت کے خاتمہ کے ساتھ میری تقریر کا بھی خاتمہ ہے اس کے بعد نہ کسی اور بات کے
کتنے کی ضرورت، نہ کسی تحریک کی حاجت، اگر اس کے سننے کے بعد بھی کوئی اپنے کیسے نہ کھولے
اور خدا کے نام پر، خدا کے نام بند کرنے کے کام میں، خدا کے نام کی منادی کرنے کے لئے کچھ حصہ
اپنی آمدنی کا دے۔ اور پھر بھی خدا کی اطاعت، خدا کی محبت اور اسلام کا دعوئے کرے تو اسے خود
سوچنا چاہئے، کہ وہ اپنے دعوئے میں سچا ہے یا جھوٹا۔ خدا کا کلام اگر سچا ہے تو ایسا دعوئے کرنے والا
بلاشبہ کاؤب ہے۔ اور فتوہ صوابی احمق یا قی اللہ بامرہ کی تہدید میں اضل ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ
الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ شَهِدَ كُمْ تَزَاتُوا وَجَاهِدُوا بِأَمْرِ الْهَيْدِ وَالْقِسْمِ فِي سَبِيلِ
اللّٰهِ اُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ *

نمبر

ایچ

یہ افتتاحی ایچ نوا صاحب دہرنے ۲۷- دسمبر ۱۹۳۲ء کو اجلاس شہتم محمدن ایچ کیشنل کانفرنس منعقدہ
علی گڑھ میں بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کے فرمائی۔

بزرگان قوم و برادران! جو عزت اس وقت آپ نے اس معزز اور قومی جلسہ کے صدر انجمن ہونے کی مجھے بخشی ہے، وہ ایک ایسی عزت ہے کہ ہر ایک نامور مسلمان اُس پر فخر کر سکتا ہے، مجھ سا ناچیز آدمی جس قدر اُس پر فخر کرے اور آپ کا شکر، وہ کم اور درحقیقت بہت کم ہے۔ مگر جب کہ میں ایک طرف اس معزز خدمت کے مشکل فرائض کو دیکھتا ہوں، اور دوسری طرف اپنی ناقابلیت کو، تو چاہتا ہوں، کہ اُس بیچارے مومن کی طرح جسے نازیبوں نے زبردستی ناز پر حملے کے لئے آگے کر دیا تھا، اور وہ نازیبوں کو سجدہ میں چھوڑ کر مسجد سے چل دیا، میں بھی موقع پاکر نکل جاؤں۔ لیکن چونکہ ایسے موقع کے ملنے کی مجھے اُمید نہیں ہے، اس لئے براہوں یا بھلا، آپ کے سامنے حاضر ہوں، اور بتائیں آپ کے حکم کے اس کو کسی پر بیٹھتا ہوں۔ اگر میں اپنی اس معزز خدمت کے فرائض ادا کرنے میں قاصر رہوں، تو اُمید ہے کہ مجھے آپ معاف فرما دیں گے۔

صاحبو! جیثیت صدر انجمن ہونے کے اس وقت میرا پہلا فرض یہ ہے کہ آپ کا خیر مقدم کروں اور آپ کی تشریف آوری کا شکرا ادا کروں۔ مگر میں متزدد ہوں کہ آیا آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے یا نہیں، اس لئے کہ آپ یہاں اُس فرض کے ادا کرنے کے لئے آئے ہیں، جو قوم کا آپ پر ہے، پس ہر ایک متنفس جو یہاں موجود ہے، خود مین بان ہے اور خود نمان، خود داعی ہے خود مدعو، خود شا کو ہے اور خود مشکور، کوئی ان میں سے اپنی قومی خدمت کا صلہ نہیں چاہتا، نہ کوئی اپنے اس فرض کے ادا کرنے پر کسی سے شکریا اجر کا طالب ہے، بلکہ ہر ایک مسلمان دل کی زبان سے کہہ رہا ہے کہ لا ترید منکح جناء ولا تشکورا مگر چونکہ اس وقت اس شہر کے ہر گوشہ سے آپ کے خیر مقدم کی صدا آرہی ہے، اور اس قومی گھر کے ہر در و دیوار سے مبارکباد کی آواز بلند ہے میرے اختیاء میں نہیں ہے کہ میں اُن کا ہم صیغہ نہ بنوں اور آپ کا خیر مقدم نہ کروں۔

صاحبو! جس وقت میں اُن مجلسوں پر نظر کرتا ہوں، جو آئے دن ہمارے یہاں ہوا کرتی ہیں تو مجھے اس مجلس کے دیکھنے سے جرأت آمیز خوشی ہوتی ہے، کل کی بات ہے، کہ جب ہم مجلس کا نام سنتے، تو بجز تنہیت یا تعزیت کی تقریب کے، کسی اور طرف ذہن منتقل نہ ہوتا، نہ سولے شخصی اغراض کے قومی مقاصد کے لئے لوگوں کے جمع ہونے کا خیال دل میں آتا، چند سال پہلے کس نے سنا تھا، کہ لوگ کہیں اس لئے جمع ہوئے ہوں کہ قوم کا کچھ کام کریں، اُس کی منزل یافتہ حالت پر متاسف ہوں، اور اُس کی ترقی کی تدبیر کریں۔ لیکن اب حالت دوسری ہے، بہت سے مسلمان ایسے پیدا ہو گئے ہیں، جو قوم کے لئے کام کرتے ہیں، اُس کا خیال رکھتے ہیں، اس کی ذراک حالت پر افسوس کرتے ہیں۔ اُس کی ترقی کے خواہشمند ہیں، اور بعض ایسے بھی نظر آتے ہیں، جو قوم کے اغراض کو اپنے ذاتی فوائد پر مقدم رکھتے ہیں، اور بچائے نفسی نفسی کے قومی قومی پکارتے ہیں۔

جس طرح اس انیسویں صدی میں بہت سی چیزیں بدل گئیں، اسی طرح ہمارے مانوس الفاظ فرض، ادب و دعوت، اور مجلس، کے معنی بھی بدل گئے۔ اور بجائے ذاتیات کے ان کا اطلاق قومی اغراض پر ہونے لگا۔ اب فرض سے مراد ہے، قوم کی بھلائی، جو ہر ایک مسلمان پر بقدر اپنی طاقت کے ضروری سمجھی جاتی ہے، دعوت کے معنی ہیں، کسی قومی کام کے لئے بلایا جانا۔ اور عمل کا مقصود ہے، قوم کی بہبود کے لئے لوگوں کا جمع ہونا۔ چنانچہ آج جو بہت سے نیک دل پاکیزہ خیال لوگ دور دراز مقامات سے سفر کی رحمت اٹھا کر، اور اپنے کام کا ہرج کر کے، یہاں آئے ہیں۔ اُس سے کوئی ذاتی فائدہ مقصود نہیں، نہ کسی خاص شخص کی خوشی منظور ہے، بلکہ صرف قومی خیال اُن کو یہاں تک لایا ہے، اور فقط اس غرض سے یہاں جمع ہوئے ہیں، کہ قوم کی ترقی کی تدبیریں سوچیں، اور اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی تجویزیں کریں، اپنی متفرق اور منتشر قوموں کو ایک جگہ جمع کریں، خیالات کے تبادلوں سے غلطیوں کی اصلاح کریں، اور باہمی صلاح و مشورہ سے قوم کی ترقی کا کوئی سیدھا راستہ نکالیں، اس لئے اس مجلس کے دیکھنے، اور اُس کے شریک ہونے، سے میرے دل کو ایک عجیب و غریب انگیزہ خوشی ہے، اور یہ خوشی اس خیال سے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے، کہ آج آپ وہاں جمع ہیں، جو قومی خیالات کا گھر ہے، اور جہاں یہ پیارے اور ہونہار بچے، ہمدردی، محبت قومی، تعلیم و تربیت کے پیدا ہوئے ہیں، اور کانفرنس کا یہاں ہونا وہی لطف دے رہا ہے، جو بچے کا ماں کی گود میں بیٹنا۔ آپ جانتے ہیں یہ کانفرنس علی گڑھ کا پیارا بچہ ہے، اس شہر کو اُس سے مادری محبت ہے، اس کی بہت سی اسیدیں اُس سے وابستہ ہیں، آج وہ نہایت خوش ہے، کہ اس کا پیارا بیٹا، اور دھڑ دھڑکی ہو اٹھا کر تازہ و توانا، صحیح و تندرست، اس وقت اُس کی گود میں بیٹھا ہوا کھیل رہا ہے، اور اُس کی آنکھوں میں سالگرہ کے جشن میں اتنے دوست و احباب جمع ہیں، *

صاحبو! میری یہ خوشی کچھ خیالی نہیں ہے، بلکہ اُس کا ایک خاص اور قوی سبب ہے، میرے نزدیک جس طرح کہ کانفرنس قومی ترقی کے لئے نہایت مفید ہے، ویسا ہی کانفرنس کا یہاں ہونا اُس کے اغراض و مقاصد کے لئے فائدہ بخش ہے۔ اس لئے کہ اُس کا اصلی مقصود ہے مسلمانوں کی ترقی، اور وہ منحصر ہے، اعلیٰ تعلیم پر، اور یہ وہ مسئلہ ہے جس کو ہم مسلمان نہایت مشکل اور ناخوش سمجھتے ہیں، اور جس کی عظمت اور وقعت ہماری ہمتوں کو توڑ دیتی ہے، اور جس کے اسباب جمع کرنے کا ہم ارادہ تک نہیں کرتے، اور اسی مسئلہ کا سمجھنا، اور اسی مشکل کو آسان کرنا، اور اسی کا شوق پیدا کرنا، اور اسی کی ہمت دلانا، ہمارا اصل مقصود ہے، اور یہ مقصود دوسری جگہ سینکڑوں زر و لبویشن کے پیش کرنے، اور بحثوں و مباحثہ کرنے، اور مینوں کے پھرنے، سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا، جیسا کہ یہاں دو تین دن رہنے، اور کالج کے ملاحظہ کرنے اور طالب علموں کی حالت دیکھنے، سے حاصل ہو سکتا ہے۔ قومی تعلیم کے مشکل مسئلہ کے معنی نہایت آسانی سے

یہاں سمجھیے آسکتے ہیں۔ اُس کی شکلات جن کا رُخ ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے، یہاں حل شدہ دکھلائی دیتی ہیں اور قومی قوت، اور قومی عزت کا نمونہ، اور قومی ترقی کی تدبیر کی مجسم صورت؛ یہاں نظر آ رہی ہے۔ یعنی وہ کلچ جس میں دماغی تعلیم کے ساتھ مذہبی اور اخلاقی تعلیم بھی دیا جاتی ہے، جہاں لڑکوں کی تربیت کا خیال، اور اُن کے اخلاق کی درستگی کا لحاظ، اور اُن کے چال و چلن کی نگرانی کی جاتی ہے، جہاں انگریزی پڑھنے والوں میں، قومی دلوں کے، اور اسلامی جذبات، بھی پائے جاتے ہیں۔ اور جہاں قومی قوت کے اجتماع، اور سیلف ہیلپ، کا عمدہ تجربہ دیکھتے ہیں آتا ہے۔ اور جہاں کا طالب علم ہونا پبلک اور گورنمنٹ دونوں کے نزدیک، عمدہ تعلیم، پاکیزہ خیالات، پسندیدہ اخلاق، قومی محبت اور گورنمنٹ کی وفاداری کی، کافی سند سمجھی جاتی ہے، اس حیرت انگیز کارخانہ کو دیکھ کر ممکن نہیں ہے، کہ لوگوں کے دلوں میں جوش نہ آوے، اور آئندہ کے لئے ہمت پیدا نہ ہو۔ اور اپنی متفقہ کوششوں کو کام میں لانے کی رغبت نہ ہو۔ پس اے میرے دوستو، ان خیالات سے میں آپ کا یہاں جمع ہونا، اور قومی ترقی کی تدبیریں یہاں بیٹھ کر کرنا، زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اور یہاں آنے پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

اے میرے دوستو! اگر آپ کا خیر مقدم، انگریزوں کی کرسی پر بیٹھ جاؤں، تو میں اُس فرض کے ادا کرنے میں اپنے آپ کو قاصر سمجھوں، جو بحیثیت صدر انجمن ہونے کے مجھ پر ہے۔ مجھے ضرور ہے، کہ میں اس کانفرنس کی اغراض و مقاصد کی نسبت جو غلط فہمیاں، اور اُس کی کارروائیوں پر غلط فہمیاں ہو رہی ہیں اُن کا کچھ تذکرہ کروں۔

صاحبو! آپ کو معلوم ہے، کہ ہمارے اس کانفرنس کے اغراض کی نسبت غلط فہمیاں بھی ہوئی ہیں، اور اُس کی کارروائی پر نکتہ چینی بھی کی جاتی ہیں۔ نکتہ چینی کی نسبت ہم کو تعجب نہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ جو لوگ کوئی بڑا کام کرتے ہیں، وہ معصوم نہیں ہوتے، نہ اُن کی کارروائی غلطی، خطا، اور نقص، سے خالی ہو سکتی ہے۔ اور گو کیسی ہی لیاقت، محنت، اور ایمان داری سے وہ اپنا کام کریں، نکتہ چینی کا موقع ضرور باقی رہتا ہے، علاوہ بریں نکتہ چینی فی نفسہ نہایت مفید بلکہ ایک قسم کی مدد ہے، بشرطیکہ نکتہ چینی سے کی جاوے۔ ہمارا یہ مجمع خود نکتہ چینی کے لئے قائم ہے، اور نکتہ چینی ہی اُس کا اصل مقصود ہے، تاکہ جو غلطی ایک کے خیال میں ہو، وہ دوسرے کے خیال سے اصلاح پاوے، اور جو نقص ایک کی رائے میں ہو، وہ دوسرے کی رائے سے رفع ہو۔ اے صاحبو پھر ہمارا کارروائیاں، ہمارے مباحثے، اور ہماری تجویزیں، ملکیت عام ہیں، اور ہر ایک شخص کو اُس پر بری بھلی رائے ظاہر کرنے کا حق ہے۔ ہم ہر ایک کی بات دل سے سننے کے لئے آمادہ ہیں، اور ہم ہر ایک نکتہ چینی پر خیر مقدم کہنے کو طیار ہیں، مگر اُن اُس وقت ہم کو افسوس ہوتا ہے، جب کہ ہمارے

کافر نس کے اغراض و مقاصد، دیدہ و دانستہ غلط بیان کئے جاتے ہیں، اور بیدردی سے اُس کی تضحیک کی جاتی ہے۔

صاحبو! بڑا اعتراض کافر نس پر یہ ہے، کہ کوئی عملی فائدہ اُس سے قوم کو نہیں ہوا۔ یہیں خیال کرتا ہوں کہ کافر نس پر یہ الزام عائد ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ تعمیل اُس کے مقصود اور اُس کی قدرتی خارج ہے۔ جو لوگ کافر نس پر یہ اعتراض کرتے ہیں، غالباً انہوں نے کافر نس کے اشتہار اور پہلے سال کے پہلے رزلوشن، کو بھی ملاحظہ نہیں فرمایا۔ پہلا رزلوشن جو ۱۸۶۶ء میں جناب **سید احمد خان** ہلاور نے پیش کیا، وہ یہ تھا، کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جاوے، اور ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لئے، مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہو کرے، اس رزلوشن کے پیش کرتے وقت **سید** نے یہ فرمایا تھا کہ گو ہم ایک قوم کے مسلمان کہلاتے ہیں، مگر ایک جگہ کے رہنے والے دوسری جگہ کے رہنے والوں سے ایسے ہی ناواقف ہیں، جیسے کہ کوئی اجنبی قوم ایک دوسرے کے حال سے ناواقف ہو۔ کوئی ذریعہ ہمارے پاس ایسا نہیں ہے کہ مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں، ایک کے حال سے دوسرے کو آگاہی ہو، ہم آپس میں مل کر اپنے خیالات جو قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ہوں دوسروں پر ظاہر کر سکیں۔ اور جو غلطی ہمارے خیال میں ہو، وہ دوسروں کے خیال سے بخوبی اصلاح پاوے، اس مقصود کو جو کافر نس کے قائم کرتے وقت ظاہر کیا گیا تھا، پھر **سید** صاحب نے اپنے پچھلے سال کی رپورٹ میں سن نظروں میں بیان فرمایا کہ اس کافر نس کا کام ہے، کہ آپس کی اصلاح و مشورے سے اتفاق جم غیر مسلمانوں کے اس بات کو قرار دے، کہ کیا اور مسلمانوں کی بھلائی اور ان کی قومی ترقی کے لئے مفید ہے، اور ان کے فوائد کو قوم کے لوشن کرے، ان کی تعمیل ہونی کافر نس کی قدرت اور اختیار سے باہر ہے۔ یہ خود قوم کا کام ہے کہ جس تجویز کو خود انہوں نے قوم کے لئے مفید قرار دیا ہے، اُس کے عمل درآمد میں کوشش کریں، آپس جس قدر اندسوس ہو وہ قوم کی حالت پر ہونا لازم ہے۔ کافر نس تو مثل ایک نیاوی و اعظم کے قوم کی بھلائی باتوں کو بیان کرتی ہے، وہ قوم کو بخلائی ہے، اُس کی خراب حالت سے اُس کو مطلع کرتی ہے، اُن پر عمل کرنا، اور اُس کی تعمیل کے لئے کوشش کرنا، قوم پر یا بزرگان قوم پر منحصر ہے۔ مگر کافر نس جو کچھ کرتی ہے اُس سے زیادہ کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتی، یہ بیان **سید** صاحب کا کافر نس کے اغراض و مقاصد اختیار کرنے کی نسبت ایسا صاف ہے، کہ اس سے ہر شخص خیال کر سکتا ہے، کہ صرف تجویز کرنا اور تدبیر بنانا، اس مجلس کا کام تھا، نہ کسی تجویز تعمیل کرنا۔ اس پر اگر کوئی کہے کہ مجلس نے کچھ کام نہیں کیا، وہ بعینہ ایسا ہے، جیسا کوئی قانون بنانے والی کونسل کی نسبت کہے، کہ اُس نے کوئی مقدمہ فیصل نہیں کیا، یا عمارت کے نقشہ بنانے والے پر، یہ الزام لگایا جاوے کہ اُس نے مکان نہیں بنایا۔ یا ڈاکٹر پر اعتراض کرے کہ اُس نے نسخہ لکھا مگر بیمار چھانہ ہوا۔ اُن اگر کوئی یہ کہے کہ

مجلس کا قیام کرنا ہی بے سود اور لغو تھا تو یہ اور بات ہے۔ مگر میرے نزدیک ایسی مجلس کی نہایت ضرورت تھی، اُس کے اغراض اور مقاصد بہت عمدہ ہیں، اُس نے بہت عمدگی سے اپنا کام کیا، اور قوم بہت فائدہ پہنچایا، اُس میں نہایت مفید رزلوشن پیش کئے گئے بہت خوبی سے اس پر بخش ہوئیں، نہایت آزادی سے رائیں دیکھیں، اور فیصلہ لیاقت سے تقریریں کی گئیں، اور بہت سی مفید تجویزیں قوم کو بتائی گئیں۔ اگر قوم کی حالت پیش نظر رکھ کر کانفرنس کی کارروائی پر غور کیا جاوے، اور کچھ باتوں کی روئدادیں انصاف سے دیکھی جاویں۔ تو میرے نزدیک کانفرنس کی کارروائی نہایت اطمینان کے لائق، اور اُس کی کامیابی مبارکباد کی مستحق ہے۔ ہمارے پاس کانفرنس کی بدولت اس وقت ایک ایسا اچھا کارڈ اور دفتر موجود ہے جس کا جمع ہونا بغیر کانفرنس کے ممکن نہ تھا، اُس نے ہمارے لئے ایسا سامان اور مواد مہیا کر دیا ہے، کہ اگر ہم اُسے کام میں لاویں تو ہم بہت جلد ترقی کر سکتے ہیں حقیقت میں کانفرنس نے قوم کے لئے راہیں طیار کر دی ہیں، اور تمام مشکلات کو اُن کے سامنے سے دور کر دیا ہے۔ اگر قوم اُس پر چلنا شروع کرے، تو آج وہ منزل مقصود کو پہنچ سکتی ہے، اور نہ صرف راہوں کے تیار کرنے ہی پر اُس نے قناعت کی، بلکہ قوم کو چلنے کی بھی رغبت دلائی، غفلت کے بُرے نتیجے اُسے بتائے۔ مسرت پڑے رہنے سے جو مصیبتیں اُس پر گزریں، وہ ظاہر کیں، پیچھے بچانے سے جن دردناک آفتوں میں وہ مبتلا ہونے والی ہے اُس کا درد لایا، بزرگوں کی کہانیاں سنا کر اُس کے دل بڑھائے، گزشتہ زمانہ کی ثروت اور عزت کے قصے لکھ کر خوش دلایا، تاریخی واقعات بیان کر کے قوموں کی ترقی و منزل کے اسباب بتائے، اوہام اور تعصبات اور خیالات جو سبھی راہ پر چلنے کے مانع تھے، دلوں سے ہٹا دیے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی تدبیر ایسی ہے، جو قوم کے جگانے اور اُس کو ترقی کے راستہ پر چلانے کے لئے چاہئے تھی، کہ اُس نے نہیں کی، میرے نزدیک تو اُس نے اپنے فرائض کو بہت اچھی طرح انجام دیا، اور نہ صرف وہی کیا جو اُسے کرنا چاہئے تھا، بلکہ اُس سے بہت بڑھ کر کیا۔ اگر ہم اور باتوں سے قطع نظر کریں، اور صرف اُن نظموں اور کچھروں اور مضمونوں کو دیکھیں، جو کانفرنس میں پیش ہوئے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کانفرنس کی کوششیں بیکار نہیں گئیں۔ اور لوگوں نے بیفائدہ محنت نہیں کی، میں اُن لوگوں کو نہایت بے درد اور نامنصف سمجھتا ہوں، جو ان چیزوں کو صرف شاعرانہ نظر سے دیکھتے ہیں، اور اسے قوم کے حق میں مفید نہیں سمجھتے۔ میرے نزدیک وہ کچھ جو مولانا مولوی نذیر احمد صاحب نے کانفرنس میں نہ کی ہیں، آپ زور سے لکھنے کے لائق ہیں، اور قوم کے دل کے پتھروں پر نقش کرنے کے قابل۔ آپ یقین کیجئے، کہ اگر یہ کچھ یورپ یا امریکہ میں دئے جاتے، اور فرض کر دو کہ وہ اُس زمانہ کی سمجھ سکتے، تو ہزاروں آدمی صرف اُس کے سننے کے لئے جمع ہوتے، لاکھوں روپیہ اُس پر شمار کرتے، اور اُس سے اتنی آمدنی کہ ہمارے محض اُن کے کچھ کا ایک بڑا حصہ طیار ہو جاتا۔

صاحبو! یہ ہی کہا جاتا ہے، کہ کانفرنس ایک مجمع ہے صرف تو تعلیم یافتہ، اور نئے خیالات رکھنے والوں کا، نہ اُس میں علما اور شائع شریک ہیں؛ نہ اُمرا اور بزرگان قوم اُس میں داخل ہیں؛ اور اُس کی تجویزیں صرف ایک محدود اور مختصر فرقہ کی رائے ہیں، نہ عام مسلمانوں کی۔ میں اس کے جواب میں نہایت ادب سے کہتا ہوں؛ کہ اگر کل قوم تعلیم یافتہ ہوتی، اور زمانہ کی ضرورتوں سے واقف، اور اپنی ترقی کے وسائل ہیا کرنے کے لائق۔ تو ایسی کانفرنس کی ضرورت ہی نہ ہوتی، اور جب خدا کی مہربانی سے قوم کا ایک بہت بڑا حصہ تعلیم یافتہ ہو جاوے گا، تو وہ وقت ہو گا کام کرنے کا نہ سوچنے کا، وہ زمانہ ہو گا ترقی کے نتیجوں کے دیکھنے کا، نہ اُس کے اسباب جمع کرنے اور غربت دلانے کا، وہ دن ہو سکے مبارکباد دینے کے، نہ رونے اور رولانے کے۔ وہ وقت ہو گا فصل کاٹنے اور پھل کھانے کا، نہ زمین جوتے اور بیج بونے کا۔ ہم خود قبول کرتے ہیں کہ یہ مجمع ہے ایسے لوگوں کا جن کے خیالات نئے ہیں، جو تعلیم اور تربیت کے اصول سمجھتے ہیں، جو قومی ترقی کی تدبیریں جانتے ہیں، جن کو اپنی موجودہ حالت میں بہت کچھ صلاح اور درستی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ مگر کوئی مہربانی کر کے مجھے بتائے، کہ دنیا کی تاریخ میں کس قوم نے بغیر ایسے فرقہ کے ترقی کی ہے، اور جب تک کہ کوئی قوم ترقی نہ کرے ایسے خیال کے لوگ کہاں کثرت سے پائے گئے ہیں؟

صاحبو! قوم کی ترقی کا آغاز ہمیشہ اسی طرح سے ہوتا ہے، کہ پہلے کوئی عالی دماغ مستقل مزاج، جس کا دل دماغ ایسے کام کے لئے بنایا گیا ہو؛ قوم کی اصلاح کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ اور ایک ایک دودو آدمی اس کی باتیں سمجھنے؛ اور اُس کے کہنے پر چلنے، اور اُس کی تائید کرنے لگتے ہیں؛ اور پھر رفتہ رفتہ اُس کا ایک ایسا مختصر گروہ بن جاتا ہے، اور وہ لوگ اپنے خیالات پھیلانا، اور اپنی جماعت کو بڑھانا شروع کرتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کا اثر ساری قوم پر ہو جاتا ہے، اور قوم ترقی کے درجہ پہنچ جاتی ہے، مگر صاحبو بغیر خیالات کے بدلنے، اور بغیر کسی شخص کے پیشوا ہونے؛ اور بغیر کسی ایک مضبوط اور مستعد لوگوں کی جماعت قایم ہونے کے، اگر کسی قوم کی کبھی اصلاح ہوئی ہو، تو مجھے اُس کی نظیر بتائے۔ غرض کہ صاحبو جو چیز الزام ہماری نسبت کی جاتی ہے ہم اُس پر فخر کرتے ہیں اور کہنے والوں کا شکر؟

رہا یہ امر کہ بزرگان قوم، اور علما اور شائع، اس میں شریک نہیں ہیں، اسے میں تسلیم نہیں کرتا، جو لوگ ایسا کہتے ہیں؛ اُن کو چاہئے، کہ ذرا تعریف گوارا کریں؛ اور کانفرنس کی فہرست ملاحظہ فرمائیں؛ اور ایک لحاظ کے لئے اس نال میں تشریف لائیں؛ اور مجھے بتائیں؛ کہ اس سے بہتر مجمع مسلمانوں کا انہوں نے کہاں دیکھا ہے؛ اور اس عزت اور درجہ کے مسلمان اور کسی قومی مجلس میں کہاں جمع ہوتے ہیں۔ اور اگر فرض کیا جاوے کہ یہ مجلس بے سود؛ اور صرف مجمع چند بڑے خیالات کے لوگوں کا ہے؛ تو میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ براہ مہربانی؛ یہ مجلس مجھے بتائے؛ جو مسلمانوں کے لئے مفید اور سودمند ہو اور

جہاں علما فضلاء، مشائخ اور اولیاء مہم اور دو تندرست مسلمانوں کی بھلائی کے لئے جمع ہوئے اور اپنے دقت، عقل، اور دولت، کا کچھ حصہ اپنی قوم کے کام میں بھی لگاتے ہوں۔ اور اُس جگہ کا نام بتائے، جہاں ہم جا کر قوم کی بہت اور اسلامی محبت، اور قومی جوش، کا ثبوت، اور اُن کی عمدہ تدبیروں، اور مفید کاموں، کا نمونہ دیکھیں، اور قوم کی ترقی کی امید کریں۔ اور ہم یہ بھی نہیں کہتے، کہ آپ ہماری قوم کی توجہ دنیاوی ترقی کے کاموں میں دکھائے، اس لئے کہ یہ نجس اور ناپاک چیز مسلمانوں کی توجہ کے قابل نہیں ہے۔ الدنیا جیفۃ و طالبہا کلاب۔ یہ کام دنیا کے کتوں کا ہے، اور پھر فرقہ کے دنیا طلب لوگوں کا مسلمانوں کی شان اس سے ارفع و اعلا ہے۔ بلکہ وہ تدبیریں بتلائے، جو انہوں نے اپنے پاک اور پیارے دین کے لئے کیں ہوں، اور اُن کی اُس توجہ کا ثبوت دیجئے، جو انہوں نے دین کی حمایت، اور اُن کی حفاظت، اور اُس کی شاعت، میں کی ہو۔ مغربی علوم پر خاک ڈالنے۔ انگریزی کو کفر سمجھنے۔ یورپ کی طرز کے کالج اور اسکولوں کو جانے دیجئے، کہ یہ سب چیزیں ہیں، جو صرف چند روزہ دنیا کے کام آنے والی ہیں، اور مسلمانوں کے اعتقادات اور خیالات کی بگاڑنے والی۔ مگر وہ مقامات بتائے، جہاں دین اور اسلام کی حفاظت کا بندوبست کیا گیا ہو، اور وہ مدرسے دکھائے جہاں دینی علوم کی تعلیم دی جاتی ہو اور اُن دارالعلوم کا نشان دیجئے، جو بغداد اور قریبہ کے نمونوں پر قائم کئے گئے ہوں، اور اُن علما کا نشان دیجئے، جن کو صرف قوم کی توجہ اور فیاضی نے بچایا، اور علمی مشاغل میں مشغول رکھا ہو، اور اُن طالب علموں کو دکھائے، جو صرف قوم کی مدد سے پرورش پاتے، اور علم حاصل کرتے ہوں۔ مگر افسوس صد افسوس، کہ جہاں تک خیال کیا جاوے، اور جس حصہ کو ہندوستان کے دیکھا جاوے، دین اور دنیا دونوں کا کیسا حال ہے، اگر ہم دیکھیں کہ مسجدیں آباد ہیں، خانقاہیں گرم ہیں، علما اور فضلاء کا گردہ بدستور موجود ہے، پڑانے مدارس طلباء سے بھرے ہوئے ہیں، تو ہم سمجھیں، کہ صرف زہاد و توبہ، دنیاوی علوم کی تحصیل، اور دنیاوی مدارس میں مدد دینے کی مانع ہے۔ اور فقط یا بنی شریعت کی، مغربی تعلیم کی حرام ہے، اور اپنی خیال دنیاوی ترقی کا سدا رہا ہے۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں، کہ اُس کا حال اس سے ہزار درجہ زیادہ برتر ہے دینی مدارس قوم کی بے توجہی سے برباد ہیں، علما فضلاء بھوکوں مر رہے ہیں، دینی علوم کی تحصیل کڑیواں کو کوئی بھیک کے ٹکڑے تک نہیں دیتا اور اگر کہیں کچھ نیک دل بزرگوں نے کوئی مدرسہ کھڑا کر لیا ہے، اور چند غریب طالب علم کابل اور بنجارا کے جمع ہو گئے ہیں، تو دنیاں خاک اڑ رہی ہے، اور قوم کی پیچیدگی کا نوحہ ہو رہا ہے اور استاد و شاگرد دونوں بھوکوں مرتے ہیں، تو اسے ہم کیا سمجھیں، مانا کہ ہم نے مغربی علوم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا، مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے سے اتحاد پھیلایا، مانا کہ ہم نے کافر نفس قائم کر کے مسلمانوں کو بہکایا، مگر ہم پر لعنت کرنے والے خدا کے لئے یہ بتادیں کہ انہوں نے اپنی قوم کے لئے کیا کیا، اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں کونسی کوشش کی اگر

ہم نے مسلمانوں کے لئے دیر و کشت بنایا، مانا کہ گناہ کیا، مگر یہ فرمائے کہ اُن کا بنایا ہوا بیت المقدس کہاں ہے؛ جہاں جا کر ہم سجدہ کریں اگر ہم نے اپنے بھائیوں کے واسطے قومی کا تفرقہ قائم کیا، ہم قبول کرتے ہیں کہ ایک بے سود کام کیا، مگر ہمارے دوست براہِ جہانِ بیرونیوں، کدائوں نے قوم کے حال پر مرنے پڑنے، قوم کی مصیبت پر ماتم کرنے، پر کونسی مجلس بنائی ہے، کہ ہم وہیں جا کر نو حوکیں، اور سرپیشیں۔ ہم اگر مضر یا بے سود کام کرنے کے گناہ گار ہیں۔ تو قوم کو مرتے دیکھتے اور کچھ نہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے؟

گردِ سر تو گشتن و مردن گناہ من دیدن ہلاک و رحم نہ گردن گناہ کیت
گیرم کہ وقتِ فوجِ طہیدان گناہ من دانستہ دشمنہ تیز نہ گردن گناہ کیت

غرض کہ اے میرے بھائیو۔ یہ الزام جو ہم پر لگایا جاتا ہے، اور وہ طعن جو ہم پر کئے جاتے ہیں، نہ دیندار کے خیال سے ہیں، نہ مذہب کے لحاظ سے، بلکہ درحقیقت غفلت اور کاہلی کا نتیجہ ہے، کہ تہ پڑانے طریقوں پر قوم کے لئے کچھ کرتے ہیں، نہ دینی کاموں میں اپنی استعداد کی نشانیاں دکھاتے ہیں، نہ نئی راہ پر چلنے کے لئے اُن کا قدم اٹھتا ہے، نہ دوسروں کا چلنا پسند کرتے ہیں۔ غرض کہ نہ تو دیکھیں نہ دوسروں کو کرنے دیں، ایسے لوگوں کی باتیں سن کر رنجیدہ ہونا، اور ایسے طعن و طنز سن کر پریشان ہونا ہمت والوں کا کام نہیں ہے۔

اے میرے بھائیو نہ آج تک کوئی بڑا کام بغیر طعنوں کے برداشت کرنے اور دلفکار باتوں کے سننے

کے کہیں دنیا میں ہوا ہے۔

صاحبو! قومی اصلاح اور قومی ترقی، کوئی آسان کام نہیں ہے؛ بلکہ اس دنیا کے تمام کاموں میں اور سب سے زیادہ مشکل، ہمارا کام، اور تکلیف دہ ہے۔ حقیقی اصلاح اور سچی قومی ترقی اور دینی اصلاح، اور علم و ادب اور معاد کی صلاح، اور یہ کام صرف پیغمبروں کا ہے، مگر دنیاوی اصلاح اور دنیاوی ترقی بھی ایسی شکل ہے کہ اُس کے لئے بھی خدا کے تعالیٰ خاص لوگوں کو پیدا کرتا، اور اُس کے لائق اُن کے دماغ، بنا رہا ہے، مگر پیغمبروں یا صلحان قوم، خدا نے سب کے لئے یہ قاعدہ رکھا ہے، کہ اُن کی کوشش کو منزل مقصود تک پہنچنے میں بہت سے درجے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اول، اُن کا ہنک اڑایا جاتا ہے اور ایک ناممکن کام کے خیال سے وہ دیوانے ٹھہرے جاتے ہیں۔ پھر اُن پر طعن و طنز ہوتے ہیں۔ پھر اُن پر تہمتیں کی جاتی ہیں، اور اُن کے ارادے بدیتی پر محمول کئے جاتے ہیں، پھر اُن کے مقاصد میں غلط بیانیوں کی جاتی ہیں۔ پھر کچھ کچھ باتیں اُن کی سمجھ میں آنے لگتی ہیں اور اُن کے کاموں کی عظمت اور وقعت کا خیال ہونے لگتا ہے اور آخر مفید سمجھ کر لوگ مدد دینے لگتے ہیں اور اُس کی کامیابی دیکھ کر تعجب کرتے، اور خود بھی کہنے لگتے ہیں، کہ پہلے کیوں ہم ایسا نہ سمجھے، اور کیوں اول ہی اس کام میں شریک

نہ ہوئے ❖

اے میرے بھائیو، یہ وہ واقعات ہیں جو ہر ایک اصلاح کرنے والے کو پیش آتے ہیں، اگر آپ کی مجلس کا مقصود، قومی اصلاح اور قومی ترقی ہے۔ تو آپ کو بھی ان تمام درجات کے طے کرنے، اور ان تمام دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنے کے لئے آمادہ رہنا چاہئے۔ مگر آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ آپ کو ایسے سکرٹری ملے ہیں جو آپ کی طرف سے سب مصیبتیں اٹھا چکے ہیں، ان کا مسخک اڑ چکا، ان پر طعنے ہوئے، وہ دیوانہ اور سوداگر بن چکے، خود غرضی کا الزام ان پر لگ چکا، تہمتیں جتنی ہونی چاہئیں، ان پر بولیں، مسلمان ہو کر وہ کافر بھی ٹھہر چکے، ان کے مقاصد میں غلطیانیوں کی بھی کوئی حد نہیں رہی اب وہ اس درجہ پر ہیں، جہاں مصیبتوں کا خاندہ ہوتا، اور اُس کے تینوں کے دیکھنے کا دور شروع ہوتا ہے، اب لوگ ان کے کاموں کی قدر کرتے ہیں۔ ان کی بات سنتے ہیں، ان کی وقعت اور عزت کرتے ہیں، ان کو اپنا رہنا جانتے ہیں، پس اے میرے دوستو! باوجود ان تمام مشکلات کے طے ہونے اور آپ کو ایک قد میں لمبانے کے اگر آپ صرف چند طعن آمیز باتیں سننے سے بخیدہ ہونگے، اور اس مجلس کی کامیابی کی نسبت شک کرنے لگیں گے، تو مجھے تعجب ہوگا۔ آپ کو چاہئے کہ آپ تھقل سے کام لیں، اپنی محنتوں کی کامیابی پر بھروسہ رکھیں، کیونکہ جس قدر آپ اپنے فرائض سے زیادہ واقف ہونگے، جس قدر آپ میں ہمدردی کا جوش زیادہ ہوگا جس قدر آپ انسانیت کا زیادہ خیال رکھیں گے۔ جس قدر آپ قوم کی زیادہ فکر کریں گے اور جس قدر آپ کا علم زیادہ ہوتا جاوے گا آپ اپنے آپ کو زیادہ تکلیف میں پادیں گے، اور آپ پر زیادہ مصیبتیں نازل ہونگی ❖

بھائیو! عقل، علم، اور انسانیت، یہ خود مصیبت کے اسباب ہیں، اور ہر شخص کو اس دنیا میں اسی قدر تکلیف اٹھانی پڑتی ہے جس قدر اس میں عقل اور علم ہے۔ کاش ہم انسان ہوتے تو ان مصیبتوں میں سے ایک مصیبت بھی نہ اٹھانی پڑتی۔ یہ وہ امانت خدا کی ہے جسے آسمان اٹھا سکا، زمین نہ پہاڑ، ہم نے نادانی سے اٹھا لیا، اور ظالم جاہل ٹھہرے۔ انا عرضنا الا مانۃ ۛ

آسمان بار امانت تو انت کشید

قرعہ فال یشام من دیوانہ زدن

صاحبو! مجھے وہ دن یاد ہیں کہ جب ہم لوگ غفلت کی بہشت میں رہا کرتے تھے، نہ اپنی خبر تھی نہ دوسرے کا خیال۔ نہ قوم سے مطلب تھا، نہ مدرسہ سے غرض، نہ مسلمانوں کی دردناک صورت ہم کو دکھا کر نہ کوئی سنا مانتا تھا، نہ اے قوم اور اے قوم کی آواز ہمارے کان تک پہنچتی تھی، نہ کوئی چندہ مانگنے والا تھا، نہ کانفرنس میں بلائے والا۔ بے خبری کے نشہ میں مست پڑے ہوئے کہا کرتے تھے ۛ

بہشت آنجا کہ آزار سے نباشد
کے رابا کے کار سے نباشد

اور اپنے پیشواؤں کے شکور تھے، جنہوں نے اوہام کا سنگین پہرا، علم کے درخت پر کھڑا کر دیا تھا، اور ہم کو وہاں تک جانے نہ دیتے تھے کہ اس میں ہمارے مسر سید سامنے آئے، اور یہ آواز دی۔ ہل
اد لکھ علی شیعہ الخلد و ملاح لا بلی۔ انہوں نے ہم کو علم کا درخت دکھایا اور اُس کے پھل
کھانے کی رغبت دلائی۔ اُن کا یہ کہنا تھا، کہ ہمارے بزرگ چلانے لگے کہ خبردار ان کے پاس نہ جانا،
اور ان کی بات نہ سنا۔ "انہ لکھ عدد و مہین" اور چاروں طرف سے یہ آواز آنے لگی کہ لکھ نقیہ
هذه النتيجة فتكونا من الظالمين، مگر یہ بھی مزاج کے ایسے ستم، اور اپنے ارادے کے
ایسے مضبوط، تھے کہ ترغیب دیتے اور یہ کہتے رہے، کہ تم حقارت کرو یا ملاست، زجر کر دیا تو بیخ، میں تو
ضرور علم کا پھل اپنی قوم کو کھلاؤں گا، اور بغیر اس کے کھلائے نہ مانوں گا۔ آخر انہوں نے اپنا کہا پورا کیا۔
اوہام کا پہرہ علم کے درخت پر سے اٹھا دیا اور لوگوں کو اُس کا پھل کھلایا۔ "واخر جھما مہما کا نافیہ"
جن لوگوں نے وہ پھل کھایا، نیکی و بدی کو پہچاننے لگے، اور اُس گناہ میں غفلت اور بغیر کی بہشت
سے نکالے گئے، وہ اپنے آپ کو نگاہ دیکھ کر شرمندہ ہوئے، اور اپنی عریانی چھپانے کی فکر کرنے لگے،
بھائیو، مصیبتیں کیوں ہوئیں، اگر ہم نیکی و بدی کی تیز کا درخت نہ دیکھتے، اور اپنے بزرگ مسر سید
کے کہنے سے اُس کا پھل نہ کھاتے، ایک اُن کی بات کے سننے سے یہ ساری مصیبتیں گلے پڑیں، اب
ہم ہیں، اور طرح طرح کی تکلیفیں، قومی ہمدردی، قومی محبت، قومی ترقی، قومی تعلیم، قومی تربیت،
قومی اصلاح، اور خدا جانے کتنے عذاب۔ گھر چھوڑنا، سفر کی مصیبت اٹھانی، کانفرنس میں ناچندہ دینا،
اور پھر بڑا بھلا سنا۔

من گریہ تہشیں نے دستم من آہ دل حزین نے دستم
نئے نام میں گذشتہ دہشتاں لئے عشق ترا جہیں نے دستم

مگر جب کہ خود ہم نے ان مصائب کو قبول کیا، تو اُسے اب مردانہ وار برداشت کرنا چاہئے تاکہ وہی
راحت، اور لازوال خوشی، ہم کو نصیب ہو جو تیرہاں تکلیفوں کا، اور شرہ اُن مصیبتوں کا ہے مگر صاحبو
اس کے لئے مہربان وقت کا انتظار ضرور ہے، میں اُن لوگوں کو نتیجہ دیکھنے کی امید نہیں دلا سکتا جو صبری
کرتے، اور نہ اُن مایوس لمبیعتوں کو پھل پانے کا متوقع کر سکتا ہوں، جو وقت کا انتظار نہیں کر سکتے،
ایسے لوگ کامیابی کے مستحق نہیں ہوتے، زمانہ اُن کی خواہشوں سے اپنی رفتار بدل نہیں سکتا۔
قدرت کے قانون میں اُن کی بے صبری سے کچھ تبدیلی نہیں ہو سکتی، وقت سے پہلے کوئی سیج اپنا پھل
نہیں لاتا، نہ کسی کی بے صبری سے کھیتی قبل از وقت طیار ہو سکتی ہے، پس اے بھائیو، جو لوگ

ہماری کانفرنس کے عملی نتائج کے ظاہر نہ ہونے سے مایوس ہوتے، اور اُسے غیر مفید سمجھتے ہیں، اُن کو کسی پکشتہ کا سے جا کر سبق لینا چاہئے، تاکہ معلوم ہو کہ صرف بیج ڈالنا پھل پانے کا مستحق نہیں کرتا۔ زمین میں بیج ڈالنے سے فصل کے طیار ہونے تک، کئی درجے طے کرنے پڑتے ہیں۔ پانی دینا، گھاس صاف کرنا، (کسانوں کی اصطلاح میں اس کو نلائی کہتے ہیں) پرند اور چرند سے بچانا ہوتا ہے اور ان سب باتوں کے پورا کرنے کے لئے بہت بڑی محنت درکار ہے، اور بہت کچھ صرف کی ضرورت ہے اور سب سے بڑھ کر کھیتی کا آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رہنا، اور اُس کیلئے خدائے ذوالجلال سے دعا کرنے رہنا، پھر یہ محنت اور صرف اور انتظار اتنا ہی زیادہ ہو گا جتنی کہ جنس لطیف اور عمدہ ہو گی میں نے کسی کاشتکار کو نہیں دیکھا، کہ وہ ان چیزوں کے طیار کرنے میں جو اس جسم خاکی کی عدا ہے، صرف زمین میں دانے ڈال دینے پر قناعت کرتا، اور ان تمام ضروری باتوں سے جو کھیتی کے طیار ہونے تک مطلوب ہیں غفل ہوتا، اور پیش از وقت اپنی محنت کے نتیجے پانے کی امید رکھتا ہو، پس اے میرے بھائیو، جس شخص نے روح کی غذا طیار کرنے کا ارادہ کیا ہو، اور صیغہ علم لطیف، پاکیزہ، اور نازک زراعت شروع کیا ہو، وہ بیج ڈالنے کے دوسرے دن اگر اُس کے پھل پانے کا متوقع ہو، تو سو اے بوالہوسے اور دیوانگی کے اُس کی امید کو آپ کیا کہیں گے۔ یہی حال تاری اس کانفرنس کا ہے کہ، چند آدمیوں نے ملکر علم کی زراعت کا ارادہ کیا، انہوں نے ایک بڑے گھنے جنگل کو کاٹا اُسے خاردار درختوں سے صاف کیا، اُس کے ایک گوشہ کو کھیتی کے لائق بنایا، اور اب اُس میں بیج ڈالا ہے، فصل کے طیار ہونے کا وقت ابھی دُور ہے۔ تمام درجے محنت، نصرت، اور نگرانی، اور حفاظت کے ابھی باقی ہیں، اس پر بعض لوگ ایسے ہیں، کہ زراعت کے طیار ہونے کے شاک، اور اپنی محنت کے پھل نہ ملنے پر مایوس ہیں۔ میرے نزدیک یہ وہ لوگ ہیں جن کو اوردے قانون قدرت کے بالضرور مایوس ہونا چاہئے، اور جن کی کامیابی بموجب قواعد فطرت کے ناممکن ہے۔

عمر بایک نہ نایک پنہ دانہ زاب گل شاہدے راعلہ شہید یا شہیدے رکفن
روز بایک نہ نایک مشت پشتیم از پشتیش زاہدے راخرقہ گردو یا حمارے ارسن
لے میرے بھائیو! ابھی ہم لوگ نہایت نازک حالت میں ہیں، اور ہمارا زمانہ نہایت خطرناک ہے، ہم امید اور یاس کے بیچ میں چل رہے ہیں؛ جب ہم دیکھتے ہیں کہ قوم کے خیالات میں کچھ تغیر ہو گیا ہے، وہ اپنی حالت سے واقف اور اُس پر شاسف ہے، اور سب کے دل میں یہ بات میٹھ گئی ہے، کہ موجودہ حالت دردناک ہے؛ اور اُس کا بدلتا قوم کی زندگی کے لئے ضرور ہے، تو ہم کو بہت کچھ امید ہوتی ہے اور پھر جب ہم ایسے گروہ کو دیکھتے ہیں جو قوم کی ترقی کی تدبیروں میں

سرگرم ہے، اور اُس کی اصلاح اور بہبودی کی فکریں کر رہا ہے، اور اُن میں ایک جوش قوم کی بھلائی کا پیدا ہو گیا ہے، تو آئندہ کے لئے اور بھی دل خوش کن امیدیں نظر آتی ہیں، مگر جب اس بات پر نظر جاتی ہے کہ بقایہ قوم کے یہ فرقہ بہت قلیل ہے، اور ابھی اُس میں بھی کچھ کرنا باقی ہے تو قوم کی ترقی سے ناامیدی ہوتی ہے۔ اس لئے کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ ہماری قسمت میں آئندہ کیا لکھا ہے، ہم اپنے مقصود پر کامیاب ہونگے، یا ہمدردی کو ششیں ضائع اور رائیگاں جائینگے، مگر جس رستہ پر ہم نے چلنا شروع کیا ہے، وہ سیدھا راستہ ہے، اور سیدھی راہ پر چلنے والا اگر بار جلتا رہے، بلاشبہ منزل مقصود پر پہنچتا ہے، اس لئے ہم کو بھی امید ہے کہ ہم ضرور اپنے مقصد پر کامیاب ہونگے

واللہ لا یضیع اجر العاملین *

لے میرے دوستو! میں نے آپ کا بہت وقت صرف کیا اور میں نے اپنی پریشان تقریر آپ کو بہت پریشان کیا، میں اپنی کرسی پر بیٹھتا ہوں۔ اور آٹھویں سال کی کانفرنس کے کھلنے کا اعلان کرتا ہوں *

نمبر

اسپیج

یہ مختصر سی اسپییج نواب حسن الملک بہادر نے ۲۰ دسمبر ۱۹۳۸ء کو بحیثیت ہونے پر پریذیڈنٹ محفل دیوچکیشنل کانفرنس اجلاس ہشتم مقام علی گڑھ میں مولانا مولوی محمد شبلی نعمانی کی دلیہ نظم کی منیت بطور ریاء کس کے فرمائی :-

حضرت! مولانا شبلی صاحب نے جو نظم اس وقت سنائی وہ بلاخط الفاظ کی عمدگی اور معافی کے، پاکیزگی کے اس قابل ہے کہ قوم ہمیشہ اُسے ترزاں بناوے اور اُس کا ورد رکھے اور اُس پر عمل کرے *

صاحبو! مولوی شبلی صاحب کی نظم یا نثر اس کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی اس کی تعریف کر خصوصاً محمد ساناچیتر، چارل، جس کی تعریف درحقیقت تحسین ناشناس ہے۔ مگر وہ جوش جو اس نے دلوں میں پیدا کر دیا ہے، اور وہ حالت جو اُس کے دردناک شعروں نے طاری کر دی ہے، مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں مجلس کی طرف سے اُن کا شکریہ ادا کروں اور شکرتیہ کے دوٹ پاس کرنے کا محرک بنوں، مجھے امید ہے کہ ہر ایک شخص جو اس وقت مجلس میں موجود ہے میرے ساتھ اتفاق کرے گا

اور ایک ایسے عالی دماغ، روشن خیال عالم کا جس نے اپنی بیظیر تالیفات سے ایک نئی روشنی قوم کو دکھائی اور ایک نیا اور سیدھا راستہ تصنیف کا بتایا ہے، دل سے شکر ادا کر بیگا۔

نمبر ۹

اسپیج

یہ اسپج بھی ۲۷- دسمبر ۱۸۹۳ء کو اجلاس ہنتم محمد انجمن کونسل کا فرنس منعقد ہو گیا جس میں اس نے بحیثیت پریذیڈنٹ ہونے کے، مختلف اصحاب کی رپورٹوں کے ختم ہونے کے بعد بطور ریماکس کے فرمائی :-

بزرگان قوم و حاضرین! میں نے اپنے بزرگ و دلسوز سکریٹری کی رپورٹ سنی، چونکہ وہ الفاظ و دل سے نکلے تھے دل میں بیٹھے۔ اور درد سے بھرے ہوئے تھے درد سے سنے گئے حقیقت میں نہایت سچا ہے یہ بقولہ کہ، ہر چہ از دل مے خیزد بدل میریزد۔ جس دلی جوش سے یہ رپورٹ لکھی گئی تھی، سنے والوں کے دلوں پر بھی اُس نے ویسا ہی جوش پیدا کیا۔ اور جو لطیف اور پاکیزہ معنی محبت کے اُس کے سخت اور درشت لفظوں میں چھپے ہوئے تھے، سامعین بھی اُسے بخوبی سمجھے۔

حاجو! انسان کی حالتیں اور دل کی کیفیتیں مختلف ہوتی ہیں، اور اُن کی تاثیریں بھی جدا جدا ہوا کرتی ہیں۔ وہ ادھر سے اور نا تمام جملے جو ایک معصوم بچے کے منہ سے نکلتے ہیں، نہایت پیارے اور بیٹھے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جب ہم اُن کو ایک فاج زدہ سیر فرقت کی زبان سے سنتے ہیں، تو اُن کے سننے سے نہایت نفرت ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ بات جو ایک میر جم، سنگدل دشمن، عداوت سے ہمارے پیسوں کے متعلق کہتا ہے، ہم کو نہایت خستہ دلائی اور بچ دیتی ہے۔ مگر جب اُس کو کوئی ہمارا دلسوز دوست، محبت اور ہمدردی سے کہتا ہے، اُس کا دوسرا ہی اثر ہمارے دل پر ہوتا ہے۔ وہ فقرے جو ہمارے سید کی زبان سے اس وقت نکلے، اگر ہم اپنے کسی مخالف کی زبان سے سنتے تو ضرور خستہ آتا، مگر جب کہ اُس درد بھرے دل سے نکلے، جو ہماری محبت میں حل رہا ہے، تو اُس نے دوسری ہی کیفیت ہمارے دل میں پیدا کی۔ اگرچہ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا، کہ قوم کی وہ حالت ہے جس کی تصویر ہمارے بزرگ سکریٹری نے دکھائی ہے، مگر میں اُن کے دل کے درد کی ضرورت و ادیتا ہوں، اور اُس درد کا اثر اس وقت کچھ اپنے دل میں بھی پاتا ہوں۔ اے میرے بزرگو! آپ جانتے ہیں، کہ وہ قومی ترقی کے طالب ہیں، اور اُس کے عاشق، اور اُس کی طلب میں

سرگرم اور سرگرداں، جس طرح طالب بغیر مطلوب کے ملنے کے میں نہیں ہوتا، اور کوئی چیز سوا اُس کے دیکھنے کے اُسے تسلی نہیں دیتی، یہی حال ہمارے سرسید کا ہے

دست از طلب نذار و تا کام اور آید

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

اُس کی طلب میں اُن کی عرضائے ہوئی، اُس کے انتظار میں اُن کی جوانی بلکہ بڑھاپا بھی گذر گیا، وہ اُس کے پیچھے بدنام ہوئے، ملامت کے تیروں کا نشانہ بنے، دیوانہ ٹھہرے، ذلتیں سہیں، مصیبتیں اٹھائیں، رسوا ہوئے، در بدر مارے پھرے، گھر گھر کی خاک چھانی، نقیبوں کی موت کی، اس پر بھی جب اپنے مطلوب کی صورت نہ دیکھی، تو درد سے چلانے، اور بایوس ہو کر نالہ و فغاں کرنے لگے۔

صاحبو! ذرا اس جوش کو دیکھئے جو قوم کی محبت کا اُن کے دل میں موج زن ہے، اور ذرا اُس آگ پر خیال کیجئے جو اُن کے سینہ میں بجھ کر رہی ہے، اور ذرا اس حالت پر نظر ڈالئے جو قومی ترقی کی ہوس میں اُن کی ہو رہی ہے

بخرام سوے کلبہ احزان، او شبے

تا بنگری کہ عشق تو با او چرے کتد

کوئی صبح ہے کہ آپ کا خیال اُن کو نہیں ستاتا، اور کوئی شب ہے کہ اُس کے غم میں وہ نہیں روتے

کدام روز کہ سر مشق انتظارش نیست

کدام شب کہ سہر گزیر در کنارش نیست

اس حال پر بھی جب وہ قوم کو متوجہ نہیں پاتے، اور اپنے مطلوب کے ملنے کی صورت نہیں دیکھتے، تو اُن کا دل ٹوٹ جاتا ہے، اور بایوس ہو کر جو دل میں آتا ہے کہ گذرتے ہیں، مگر اے میرے عزیز و اُن کی محبت کی آواز دل کے کانوں سے سنو، اور اُن کے زہر آمیز لفظوں میں محبت کی شیرینی دیکھو۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں، کہ اُن کا یہ کہنا کہ، قوم مردہ ہو گئی ہے۔ میرے نزدیک، قوم کے زندہ کرنے والی آواز ہے اور اُن کا جلے ہوئے دل ہے، "مرد اور مردہ، کہنا ہماری حیات ابدی کی دعا ہے، اے میرے بزرگ سرسید میں نہیں جانتا کہ آپ کی ان درد انگیز باتوں کا اوروں کے دل پر کیا اثر ہوا۔ مگر میں تو اپنے دل پر اُس کی عجیب تاثیر دیکھتا ہوں۔ اگر کوئی میرے سامنے ہزار قصیدے تعریف کے پڑھتا، اور لاکھ دعائیں دیتا، لیکن اُس کا اتنا اثر نہ ہوتا جتنا کہ آپ کے ان سخت لفظوں کا ہوا

یہج آدابے و تر تیبے مجو۔ ہر چہ مخو اہد دل شکست گو

کفر تو دین است و دینت میں جاں ایمنے و ز تو جسانے دایاں

اے میرے بزرگ سرسید میں سنتا ہوں، کہ فقیروں پر مختلف حالتیں طاری ہوا کرتی ہیں

ایک جذب کی، اور دوسری سلوک کی، پس جذب کی حالت میں جو کچھ آپ کو کہنا تھا کر لیا، اب تھوڑی سی کیلئے ذرا سلوک کی راہ پر آئے اور ہم بے درووں کی بات بھی سنئے۔

جناب والا آپ کی یا یوسی جس درجہ پر آپ نے ظاہر کی، میرے نزدیک واقعی حالت سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس کا نفرنس کو قائم ہوئے ابھی صرف سات برس ہوئے ہیں، کیا آپ کے نزدیک کامیابی کے لئے یہ مدت کافی تھی، اور سوتی ہوئی قوم کا جگانا اتنی مدت میں ممکن تھا۔ قومی زندگی کے لئے آٹھ برس بہتر لڑاؤ دن کے ہیں۔ شکل سے اتنے دنوں میں قوم کی ترقی کی امید ہو سکتی ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے کہ منزل جلد اور یکساں ہوتا ہے۔ لیکن ترقی کی رفتار ہمیشہ تدریجی ہوتی ہے۔ ایک لڑکا بھی سمجھ سکتا ہے کہ پہاڑ پر سے گزرا آسان ہے لیکن اس پر چڑھنا اور چوٹی پر پہنچنا مشکل ہے۔ اگر آپ نے یہ امید کی تھی کہ کا نفرنس سات برس میں قوم کو ہوشیار کر دیگی، تو آپ نے قوم کی غفلت، اور کا نفرنس کی قوت، اور اپنی امید کا اندازہ غلط کیا تھا۔ بلکہ اگر آپ اس کی مدت اور اس کے نتائج کا مقابلہ کریں، تو بجائے یا یوسی کے آئندہ کے لئے بہت کچھ دل خوش کن امیدیں نظر آتی ہیں۔ اس ہونہار سنجے کی عمر پڑا خیال کیجئے کہ آج اس کو آٹھواں سال شروع ہوتا ہے، اور پھر اس کی ڈیل ڈول اور توانائی کو دیکھئے، کہ اپنے ہم سن بچوں سے بہت بڑا معلوم ہوتا ہے، اس کی خوش فعلیاں قوم کو گرویدہ کر رہی ہیں، اس کی پیاری پیاری باتوں نے قوم کو اس کا عاشق بنا دیا ہے، اس کے ادھورے مگر پیارے اور دل بھانے والے لفظوں کے سننے کے لئے چاروں طرف سے لوگ چلے آ رہے ہیں، اگر کوئی آٹھ برس کے لڑکے سے ان کاموں کی توقع رکھے، جو تیس برس کا جوان کرتا ہے تو بیچارے لڑکے کا قصور نہیں ہے، نہ اس کے ہونہار ہونے میں دوسروں کو شبہ ہو سکتا ہے، ہاں اس چاہنے والے کی طرف یہ خیال ہوگا، کہ غرور محبت، یا افتقار سے ضرورت سے وہ اپنے ہونہار بیٹے کی جانی کامیابی از وقت طالب ہے۔

جناب من! آپ خدا کے لئے اپنے جو شہرے ہوئے دل کو ٹھنڈا کیجئے، اور کا نفرنس کے نتائج پر مصفاہ نظر ڈالئے۔ میرے نزدیک اس کے نتیجے نمایاں ہیں، اس کی کامیابی کھلی ہوئی ہے، اس کے مفید کام عیاں ہیں، وہ غیر معلوم اثر جو اس نے قوموں پر ڈالا، اس کے آثار دکھائی دیتے ہیں، مقامی اختلافات مٹانے میں اس کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے ہیں، متفرق اور منتشر قوتوں کے مختلف اور متناقض خیالات میں اتفاق اور اتحاد پیدا ہو رہا ہے، قوم کی ترقی کی خواہش نہایت گرجوشی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے، اور ایک نل خوش کن انقلاب قوم کی حالت اور لوگوں کے خیالات میں پیدا ہو رہا ہے۔ قوم کی حالت پر مرثیہ خوانی ہو رہی ہے، اور اس کی اصلاح اور بہبودی کے لئے بھی تدبیریں عمل میں آ رہی ہیں جن چیزوں کو ہماری قوم اول بے اعتباری اور حقارت سے دیکھتی تھی، اب اس کے اغراض و مقاصد کی تعریف کرتی ہے، جن تدبیروں کو ہمارے بھائی مضر جانتے تھے اب اس کے فوائد اور نتائج سمجھنے لگے ہیں،

اب وہ ہمارے کاموں کی قدر کرتے ہیں، اور ہمارے ساتھ ہمدردی سے پیش آتے ہیں، اور ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا ہے، جو کائنات کے کاموں پر خوب غور کرتے اور ہماری محنتوں کو شکر گزاری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ کوئی خیالی تصور نہیں ہے، جو میں کھارہ ہوں، بلکہ آپ سب قیامت اپنی آنکھوں سے اس عالم میں ہمدردی اور جوش اور اتفاق کی تصویریں دیکھ رہے ہیں۔ یہ مجمع خود پکار رہا ہے کہ گو مسلمانوں میں بہت کچھ اختلاف ہے، اور گو ان کے خیال، رائیں اور طریقے اور مزاج مختلف ہیں مگر قومی ترقی کے کام میں سب متفق ہونے پر آمادہ ہیں۔ اتفاق کا قوی اور مضبوط رشتہ سب میں پیدا ہو رہا ہے اور ہمارے مختلف خیالات، اور مختلف رایوں کے جدے جدے دریا، پہا ملتے ہوئے نظر آ رہے ہیں جس میں جہاں تک ان پاکیزہ صورتوں کو دیکھتا ہوں جو میرے سامنے ہیں، ان کے دلوں کا جوش ان کے چہروں سے ظاہر ہے، اور ان کی پیشانی پر نور کے خط سے اتفاق اور ہمدردی کے مبارک الفاظ قدرت کے قلم سے لکھے ہوئے نظر آ رہے ہیں *

اے میرے بزرگ **مسرح سید**۔ کیا آپ سے بہتر کوئی اس بات کو سمجھ سکتا ہے، کہ عادت اور طبیعت اور پرانے خیالات بدنہایت شکل ہوتا ہے، اور ایک راہ سے بٹا کر دوسرے راستہ پر چلنے میں بہت دقتیں پیش آتی ہیں۔ برسوں کے سونے ہوئے ایک آواز میں نہیں اٹھتے، پرانی بیماریاں جلد اچھی نہیں ہوتیں، بزرگوں کے خواب کی تعبیر مدتوں میں ظاہر ہوتی ہے، اور زمانہ کی پوری پیشین گوئی کے پورے ہونے میں دیر لگتی ہے۔ اور دنیا کی تاریخ میں تزلزل یافتہ قوم کی ترقی کی ایسی تیز رفتار جس کے آپ خواہاں ہیں، پائی نہیں جاتی *

اے میرے بزرگ **مسرح سید** اس پر مجھے تعجب نہیں ہے، کہ ہماری تدبیروں کے نتیجے ہماری مرضی کے موافق اب تک ظاہر نہیں ہوئے، بلکہ اس پر حیرت ہے کہ کیونکر اس کے آثار ایسے جلد نظر آنے لگے۔ جہاں تک میں دیکھتا ہوں کوئی مقام ایسا معلوم نہیں ہوتا، جہاں قومی ترقی کے چرچے نہ ہوں، اور جہاں پرانے دریا کا رخ بدلتا ہوا نظر نہ آتا ہو، کوئی جگہ ایسی نہیں ہے، جہاں کچھ مجاہد اپنے دشمنوں سے نصیب اور جہل سے دلا رہے ہوں، اور کوئی مقام ایسا نہیں رہا جہاں کچھ بہت شکن مسلمان اپنے پرزور ہاتھوں سے رسم و رواج کے بنگل اور مہیب تنوں کو نہ توڑ رہے ہوں۔ میں بہت سے نوجوانوں کو اسی مجلس میں دیکھتا ہوں جن کے ہاتھ میں قومی جھنڈا ہے، اور جن کے بازوؤں پر الفرض کا مبارک نشان ہے، اور جن کی پیشانی پر اکلا خلاص کا پاک طغرا بنا ہوا ہے! جہاں تک میں دیکھتا ہوں۔ قوم کے بیدار ہونے کی علامتیں ہر چار طرف سے نمودار ہیں، اور ہمارے سامنے نہایت روشن زمانہ ہے۔ تاریک رات گزر چکی ہے، صبح کی نشانیاں افق پر نظر آرہی ہیں، اے میرے بزرگ **مسرح سید** آپ اسے صبح کا ذب سمجھتے ہیں سمجھتے، مگر اس کے بعد صبح صادق کا ہونا لازمی ہے۔ میں آئندہ کی پیشین گوئی نہ کر دینا، اور

نہ مجھے نہ آپ کو معلوم ہے کہ آئندہ ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے، اور ہمارا کیا انجام ہوگا، مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا باصرہ کمزور ہوگا، کہ ہم لوگ شعل لئے ہوئے ایسے ٹھیک راستہ پر چل رہے ہیں، کہ جس سے ضرور ہم اُس مقام مقصود پر پہنچیں گے، جہاں ہم کو آسائش اور طمانیت نصیب ہو۔ ہم کو اپنا فرض ادا کرنا چاہئے، آئندہ ذمہ داری قوم پر ہے، اور اُس کی قسمت کا فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا کام ہے کوشش کرنا، اور خدا کے ہاتھ میں ہے نتیجہ دکھانا، اگر اپنی کوششوں کے نتیجے ہم نے اپنے سامنے دیکھ لئے، ہمارا دل خوش ہوگا، اپنے بونے ہوئے درخت کے پھل کھاؤ گے، اگر ہماری زندگی نے وفائی اور ہماری کوششیں ہمارے سامنے بار آور نہ ہوئیں، تب بھی ہمارے دل کو اس خیال سے خوشی اور تسفی ہوگی، کہ جو کام ہم نے کیا وہ فی نفسہ اچھا اور کرنے کے لائق تھا، اور ہم امید کریں گے کہ آئندہ آنے والی نسلیں اُس سے فائدہ اٹھائیں گی، اور ہمارے بونے ہوئے درختوں کے پھل پھول ہماری اولاد کھا لیں گی۔ جب ہم مرجائیں گے ہمارے روتے نہیں یاد کریں گے، اور ہماری محنتوں کی داد دینگے اور ہمارے ناموں کو نثر گزاری کے ساتھ یاد کریں گے۔

صاحبو! جو کچھ میں نے اس وقت اپنے بزرگ مسر سید کی رپورٹ کے جواب میں عرض کیا اُس کی طرف میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ غالباً آپ میرے قول کی تصدیق، اور میرے خیال کی تائید فرمائیں گے میں نہیں کہتا کہ ہم تمام مشکلات سے پار ہو گئے، یا ہم منزل مقصود پہنچ گئے، یا ہم کو کامیابی نصیب ہو گئی، بلکہ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ ہماری ابتدائی مشکلات کم ہو گئی ہیں، اور ہم بڑی دشوار گزار پہاڑیوں سے نکل گئے ہیں، اور کو ابھی منزل مقصود بہت دور ہے، مگر ہم کو اپنی کچھلی کامیابیاں دیکھ کر دامن تک پہنچنے سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، اگر آپ چند سال کرشتہ سے اپنی موجودہ حالت کو ملائے، اور ششہ اع سے جو عملی کوششیں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کی گئی ہیں، اُن پر سرسری نظر کیجئے۔ تو میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ اُس سے آپ کو حیرت انگیز خوشی نہ ہو۔ ذرا اُس زمانہ کو یاد کیجئے، جب انگریزی تعلیم کا نام لینا مسلمانوں کے افروختہ کرنے کے لئے بس تھا، اور انگریزی سوسائٹی میں شریک ہونا جہنم میں بھیجے جانے کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ ہم مسلمانوں کے دماغوں میں غور باطل کی ایسی ہوا بھری ہوئی تھی، کہ انگریزی علوم کو تعارت سے دیکھتے تھے، اور اپنے خیالی علوم پر ایسے نازاں تھے، کہ عقلی ترقی کے میدان میں دوسروں کے ساتھ دوڑنے کو اپنی ذلت سمجھتے تھے، اپنے بزرگوں کی شہرت اور سکینامی پر ایسے معذور تھے، کہ اپنی عزت اور ناموری کے لئے کسی اور چیز کے حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے، تعصبات کے طوق اور سلاسل میں ہم ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ گردن اٹھا سکتے تھے، نہ ہاتھ پاؤں ہلا سکتے تھے، اور ہمارے پیشوا ویرجھم اللہ تعصبات کی قیدوں کو اور مضبوط کرتے جاتے، اور مذہبی پیرا میں ہماری غفلت اور کاہلی کو اور ترقی دیتے تھے، کہ اس دردناک حالت کو جس میں تمام مسلمان

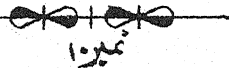
پھنسے ہوئے تھے، دیکھ کر ہمارے بزرگ سرسید کا دل جھلا اور انہوں نے قوم کے خیالات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا جس وقت خیال اُن کے دماغ سے کاغذ پر آیا اور زبان سے نکلا اُس کی مخالفت شروع ہوئی، یہ مخالفت صرف انہیں لوگوں نے نہیں کی، جو کہ اُن کے خیالات کو برا جانتے تھے، یا خود انہیں کچھ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اُن دوستوں نے بھی، جو کہ اُن کے ہم خیال تھے، اور جو کہ اُن کی کوششوں کو مفید سمجھتے تھے، پہلے فرقہ نے یہ کلمہ مخالفت کی، کہ اُن کی تدریسیں مسلمانوں کے لئے مضر ہیں، اور مذہب کے خلاف، دوسرے گروہ نے یہ سمجھ کر، کہ وہ ایک ناممکن چیز کا ارادہ کرتے ہیں، اور دیا کو اٹا ہانا چاہتے ہیں۔ مگر وہ اپنے ارادے میں ایسے مضبوط تھے، کہ نہ کسی مخالفت کی پرداہ کی، نہ کسی مشکل کا خیال کیا، دوستوں سے کہا کہ میرے پیچھے چلو اور خدا کی قدرت کا نمائندہ دیکھو، مخالفوں سے کہا کہ آگے بڑھو، اور میرے دست و بازو کی قوت آزمائو، غالباً بہت سے لوگ ابھی موجود ہیں، جنہوں نے یہ نمائندہ دیکھا ہے، بلکہ وہ بھی جو اس دنگل میں شریک تھے +

صاحبو! میں جب اُن دنوں کو یاد کرتا ہوں۔ تو ایک عجیب حالت مجھ پر طاری ہوتی ہے، اور اُس زمانہ کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے +

صاحبو! مجھے پر دونوں حالتیں گزر چکی ہیں، حضرت کی مخالفت اور موافقت دونوں کا مزہ میں کچھ چکھا ہوں۔ مجھے دونوں فرقوں میں شریک رہنے کی عزت حاصل ہے۔ اول اُس مخالف فرقہ میں، جو نہ بہت ہی اُس سے آپ کو نہایت برا جانتا تھا۔ پھر اُس دوسرے فرقہ میں، جو آپ کے خیالات پر نہایت عقائد۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں، کہ دونوں فرقوں میں میرا ہی نمبر اول تھا تو شاید سب اللہ نہ ہوگا، حضرت کی تکفیر کا نفع اُس سب سے اول آپ ہی کے پریسیڈنٹ نے دیا اور توریٹ اور بیٹل کی تفسیر لکھنے پر سب سے اول آپ ہی کے برعکس نے آپ کو چھپا پادری کہا، یہ وہی علی گڑھ ہے جہاں سب سے اول تفسیر ہی نے حضرت کو تبیین الکلام کے لکھنے پر ملامت کا ایک بڑا لہجہ بھیجا، پر یہی وہ مقام ہے جہاں یہ نادان دین باطل دونوں حضرت کی نذر کر گیا +

صاحبو! جب سرسید لندن کو تشریف لے گئے، وہاں کی ترقی یافتہ حالت دیکھنے اور ہمدردی اور اتفاق اور قومی جو شش پر خیال کرنے سے اپنی قوم کی حالت پر اُن کو تہمت رنج ہوا اور اُس کی اصلاح اور ترقی کی خواہش جو ہمیشہ سے دل میں تھی بہت بڑھ گئی۔ میرے پاس آپ نے ایک بڑا پلندہ اُن اشتہارات کا بھیجا جس میں انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کی نفرت کے سبب لکھنے والوں کے لئے انجام تجویز کیا تھا، اور یہ تحریر فرمایا کہ اسے میرے آنے سے پہلے مسلمانوں میں تقسیم کر دو، میں نے اول تو جوش میں آکر کچھ دوستوں کے پاس چند اشتہار بھیجے گا اور دیکھا، مگر پھر اُس کی بہت نیوٹری اور اُن اشتہاروں کو ردی کے ٹوکے میں ڈال کر حضرت کو جواب لکھ دیا کہ تاملہ انتک لفی ضلالت القندیہ آخر

جب آپ لندن سے واپس آئے تو وہ اشتہار خود جاری کئے اور اپنے جوش بھرے دل، اور پرزور ہاتھوں سے قوم کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ گو قوم کی آنکھوں سے وہ ہم کی طرح کھول دی، اُن کے دلوں سے خوف کے بھوت بھگا دئے، اُن کے دماغ سے اوہام کی خوفناک صورتیں نکال ڈالیں۔ اُن کی رسم و رواج کے بُت توڑ دئے، اور اُن کے دلوں کو تمام باطل خیالات سے پاک کر دیا۔ علم سے نفرت دلانے والوں کے منہ خالی ہو گئے، تعصبات اور اوہام کے تخت اُلٹ گئے، اب نہ کہیں تعلیم کی مخالفت میں حبیب آدابیں سنائی پڑتی ہیں۔ نہ کہیں علم سے رغبت دلانے والوں کے لئے کفر کے فتوے نظر آتے ہیں، اور بزورِ پرانی خیالات کم ہو رہے ہیں۔ دن بدن پرانا جوش ٹھنڈا پر رہا ہے۔ مخالفت کی وہ تیزی جس نے شروع میں ایک طوفان برپا کر دیا تھا، نظر نہیں آتی۔ اختلاف کی وہ آگ جس کے شعلے نہایت زور سے بھڑک رہے تھے، ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ اب جو کچھ باقی ہے، وہ یا شرمندگی ہے یا افسوس اور صبا کرمانہ گور ٹا ہے رہی سہی مخالفتیں بھی کم ہو رہی ہیں اور علم اور مذہب کے دو دریا جن کے بیچ میں بہت ہی بڑا فاصلہ تھا بتدریج نزدیک ہو رہے ہیں، اور وہ زمانہ نزدیک ہے کہ دونوں مل کر ایک ساتھ بہنے لگیں، اور خدا کی زمین کو سرسبز و شاداب کریں۔ پس اسے صاحبو۔ یہ مشکلات جو حقیقت میں اہل مشکلات تھیں کم ہو گئیں اور نیش و اکرار گھاٹیاں جن سے نکلنا دشوار تھا، پیچھے رہ گئیں، اب جو کچھ باقی ہے وہ صرف قوم کی توجہ اور بہت ہے۔ پر کوئی وجہ نہیں کہ ہم کچھ اچھی حالت دیکھ کر آئندہ کے لئے ناامید ہوں۔ مگر اُن ثابت قدم رہنا اور سید کا ساتھ دینا شرط ہے۔



ابینچ

یہ ابینچ نواب صاحب نے ۲۷ دسمبر ۱۹۹۳ء کو مولوی رفعت علی صاحب کی دلچسپ نظم پر بطور دیار کس کے فرمائی۔

حضرات! ابھی میں نے اپنی امتحان کی تقریر میں کہا تھا کہ وہ کوشش جو سید کر رہے ہیں اور وہ کام جو کانفرنس میں ہوتا ہے اُس کا پوشیدہ اور غیر معلوم اثر قوم پر ہو رہا ہے اُس کا ثبوت اس وقت آپ کو مولوی رفعت علی صاحب کی پاکیزہ اور بے مثل نظم سے مل گیا۔ یہ میں نہیں کہتا اور نہ کہ سکتا ہوں کہ سید کی کوششوں اور کانفرنس کے کاموں نے اُن کو شاعر بنا دیا، اور وہ خدا داد قوت جو اُن کی نظم میں ہے انہوں نے پیدا کر دی، مگر یہ ضرور کہو گا کہ جس طرح وہ قوت کام میں لائی جاتی تھی، اور جس طور پر ایسی پاکیزہ اور بلند طبعیتوں کے جوہر دکھائے جاتے تھے اُسے ضرور بدل دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ

وہ کام جو یورپ کے شعرا کرتے ہیں، وہ اب ہمارے شعرا کرنے لگے۔ اور نتیجے جو عمدہ نظمیں مغربی ملکوں میں ظاہر ہوتے ہیں، ہمارے ملک میں بھی ظاہر ہونے لگے۔ میں سمجھتا تھا کہ انوری، خاقانی مر گئے، مگر اس وقت معلوم ہو گیا کہ وہ ہنوز زندہ ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ فردوسی و عرفی موجود نہیں ہیں لیکن مولوی رفعت علی نے ثابت کر دیا کہ وہ ہمارے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر اے صاحبو۔ میرا یہ کہنا صرف نظم کی ظاہری حالت اور شعرا نے لیاقت کے لحاظ سے ہے۔ ورنہ مولوی رفعت علی کو خاقانی و انوری کہنا گویا اُن کی ہجو کرنا ہے۔ اس لئے کہ اُن شعرا کی قابلیت گو وہ کیسی ہی بلند پایہ اور عالی مرتبت تھی، تو وہ غرضی باتوں میں صرف ہوتی تھی۔ اور وہ اپنی طبیعت کے جو ہر کمینہ اور رذیل چیزوں میں ضائع کرتے تھے۔ کوئی کسی شاہ کی تعریف میں اپنی لیاقت دکھانا۔ کوئی کسی امیر کا بھاٹ بن کر اپنے دماغ کی قوت ضائع کرتا۔ انعام، طمع اور صلیک امیہ میں وہ اپنی ساری خدا داد قوتیں برباد کرتے۔ اور اللہ تعالیٰ بنعمہ الغا وون کے مصداق ہوتے۔ مگر مولوی رفعت علی نے اُس عطیہ کو جو خدا نے اُن کو دیا ہے اُسی موقع پر صرف کیا جہاں ضرورت کرنا چاہئے تھا۔ اور اُس خدائی نعمت کا شکر اُنہوں نے اُسی طرح ادا کیا، جس طرح ادا کرنا چاہئے تھا۔ اُنہوں نے اپنے موتیوں کے ہار گلے میں نہیں ڈالے۔ وہ اپنے نفیس جواہر کی قیمت میں نزت ریزوں کے طالب نہیں ہوئے۔ انہوں نے جو نظم اس وقت پڑھی ہے وہ نہ کسی بادشاہ کی مدح ہے نہ کسی امیر کی تعریف۔ بلکہ وہ اپنے بزرگوں کی گزشتہ شان و شوکت کا قصیدہ اور اپنی موجودہ قوم کی موجودہ حالت کا مرثیہ ہے۔ اُس کے الفاظ کی پاکیزگی اور نظم کی خوبی بلاشبہ خاقانی اور انوری کی یاد دلاتی ہے مگر جو خیالات اُس میں ظاہر کئے گئے ہیں، اور جو مقصود اُس کا ہے، اور جس اثر کے پیدا کرنے کے لئے وہ لکھی گئی ہے وہ خاقانی اور انوری کے خیال میں بھی نہ تھی۔ اُن کا زمانہ اور اُن کی سوسائٹی کی ایسی حالت ہی نہ تھی کہ ایسے پاکیزہ خیالات اُن کے دلوں میں آتے، اور وہ اپنی لیاقت اور استعداد قوم کے کاموں میں صرف کرتے، اور سوائے شخصی اغراض کے کوئی قومی غرض پیش نظر رکھتے۔ یہ نظم جو اس وقت مولوی رفعت علی صاحب نے پڑھی ہے وہ البتہ ایسی ہے جو قوم کو ایک سیدھے دست پر لانے والی، اور اُن کے مردہ دلوں کو جلانے والی ہے، اور یہ وہ شاعری ہے جس کی شان میں کہا گیا ہے کہ الشعر امد تلامذۃ الرحمن، اگر اس قسم کی شاعری نے جس کے بانی ہمارے مولانا حالی صاحب ہیں اور جس کی ترقی دینے والے مولوی رفعت علی صاحب معلوم ہوتے ہیں، رواج پایا۔ اور اس دست پر ہمارے نوجوان اور ذوی استعداد و لائق شعرا نے قدم رکھا تو درحقیقت قوم کے خیالات اور حالات کی اصلاح بہت جلد اور بہت استحکام سے ہوگی، اور جو کام یورپ کے شاعروں نے کئے وہی کام ہمارے شاعر اپنی قوم کے لئے کر سکیں گے۔ اس لئے کہ جو دماغی قوتیں خدا نے اُن کو دی ہیں وہی ہماری قوم کے شاعروں کو عطا کی ہیں، اور وہ تاثیر جو اُن کی زبان میں خدا نے رکھی ہے۔ وہی ہمارے الفاظ میں بھی ہے، پھر کیا سبب ہے کہ جب ہمارے شاعر وہ

طریقہ اختیار کریں، تو اُس سے وہی نتیجہ پیدا ہوں باجوہ و رب میں ہوئے۔ اے حضرات میں اس موقع پر اب کچھ نہ کہو، لگا اور نہ اپنے مقصود کے دائرہ سے قدم باہر رکھو، لگائیں صرف یہ کہ اگر اب اپنی کڑی پرکھتے ہوں کہ مولوی نعمت علی صاحب کا شکر ادا کیا جاوے اور مجلس اُن کی اس عمدہ نظم پر ووٹ آف تھینکس پاس کرے۔

نمبر ۱

اسپیج

یہ اسپییج نواب محسن الدولہ محسن الملک بہادر نے ۲۸۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کو اجلاس ششم محمدان ایجوکیشنل کانفرنس مقام علیگڑھ میں رزلوشن نمبر ۳ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی۔ لہذا مضمون رزلوشن بھی ذیل میں بحسنہ درج کیا جاتا ہے:-

رزلوشن نمبر ۳

(اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ گورنٹ سکولوں اور کالجوں میں بسبب نہ ہونے مذہبی تعلیم جو ضرر مذہبی اور اخلاقی مسلمان طلباء کو پہنچا ہے اُس کے انسداد کے واسطے اس طور پر کڑائی انگلش ایجوکیشن کو بجائے نقصان کے ایک اعلیٰ موید ہو۔ عربی زبان دانی کے رواج پر تدریجاً خاص توجہ کے ساتھ کوشش کی جاوے)۔

حضرات!

تیسرا رزلوشن جس کو محمد عبدالرزاق صاحب نے پیش کیا اور جس میں مولوی بشیر الدین صاحب نے ترمیم کی ہے، درحقیقت نہایت غور کے لائق ہے، اور جو گفتگوئیں اُس پر ہوئیں وہ نہ صرف دلچسپ ہیں، بلکہ اُن سے کانفرنس کے ممبروں کا جوش و ہوا اس قسم کے معاملات میں اُن کا دلی تعلق معلوم ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اس قسم کی بحثیں اور ایسے معاملات پر رایوں اور خیالات کا اظہار نہایت مفید اور اصلی مقصود اس کانفرنس کا ہے۔ اس قسم کے مباحثوں سے ہم قوم کی اصلی رائیں دریافت کر سکتے ہیں اور ایسی ہی پرچوش تقریریں اور ریلیوں سے قوم اپنے لئے آئندہ سیدھا راستہ نکال سکتی ہے۔ سمر سید کی پرچوش گفتگو سے اگرچہ میں اتفاق نہیں کرتا، اور اُن کے اس فرمانے کو کہ مذہبی تعلیم کے لئے لوگ کہتے بہت کچھ ہیں، اور کرتے کچھ نہیں مناسب وقت نہیں سمجھتا۔ مگر اُسے بالکل غیر مفید اور غلط

بھی نہیں کہہ سکتا

صاحبو! سید صاحب کا ارشاد ہمارے عمل اور قول کی نسبت کہ، جو ہم کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ اگر عام ہوتا، تو یہی تسلیم کرتا اور اُسے بے موقع اور بے محل نہ کہتا، مگر جب کہ اُن کا یہ فرمانا صرف مذہبی تعلیم کے متعلق ہے تو میں اُسے پسند نہیں کرتا۔ بہت سے زر دیوشن متعلق عام تعلیم کے لوگوں نے پیش کئے اور بہت بڑی بڑی بحثیں مسلمانوں کی تربیت اور ترقی کے لئے کی گئیں، اور بڑے زور و شور سے لوگوں نے اُس پر گفتگو میں لیں، مگر کیا سید صاحب یا اور کوئی کہہ سکتا ہے کہ اُن زر دیوشن کے پیش کرنے والوں یا اُن پر جوش مقررہوں نے اُس پر اسی زور و شور سے عمل کیا، جس زور و شور سے تقریر کی تھی۔ اگر دنیاوی تعلیم اور دنیاوی ترقی اور دیگر معاملات میں ہم دیکھتے کہ ہمارا عمل ہمارے قول کے مطابق ہے اور ہمارا جوش جو کائنات کی ناک کے اندر ہوتا ہے۔ اُس کے باہر بھی قائم رہتا ہے اور پھر مذہبی تعلیم میں اس کے خلاف پاتے، تو جو کچھ سید صاحب نے فرمایا وہ سب قابل تسلیم ہوتا، بلکہ میں ایسے کہنے والوں کو اُن سے بھی بڑھ کر علامت کے قابل سمجھتا۔ مگر صاحبو۔ ہم کو اپنی موجودہ حالت دیکھنا اور انصاف اور اعتدال سے کام کرنا چاہئے۔ ہماری موجودہ حالت کیا ہے۔ نہ ہم میں مذہبی تعلیم کا اثر ہے، نہ اخلاقی تعلیم کا، نہ مذہبی علوم سے متعلق ہیں نہ مغربی فنون سے۔ نہ ہمارے اخلاق درست ہیں، نہ ہمارے خیالات بہت تو ایک مرنے والی قوم کے افراد ہیں، جس میں نہ جسمانی طاقت ہے، نہ دماغی قوت۔ پس اگر ہم سے بیماروں کے سے کام مزد ہوں تو ہم معذور، اور مرفوع القلم ہیں۔ اگر ہمارے خیال ہمارے احوال کے، اور ہمارے اقوال ہمارے خیالات کے، اور ہمارے خیالات ہمارے مذہب کے، اور ہمارا مذہب ہماری آسمانی کتاب کے موافق ہوتا تو پھر روٹا کس بات کا تھا، اور اس مجمع اور اس کائنات کی ضرورت کیا تھی، مگر جب کہ سب جانتے ہیں کہ ہم بیمار ہیں، اور نہ ایک عارضہ بلکہ طرح طرح کے عوارض میں مبتلا ہیں۔ اور اچھی بیماریوں کے علاج ہی کے واسطے ہم جمع ہوتے اور اُس کی فکریں کرتے ہیں۔ تو بیمار پر خفا ہونا ڈاکٹر کا کام نہیں ہے، بلکہ اُس کے علاج کی فکر کرنا اُس کا فرض ہے۔ اگر سید صاحب اُن لوگوں پر جو دنیاوی تعلیم کے متعلق تدبیریں بتاتے اور تقریریں کرتے ہیں مگر کچھ کرتے نہیں۔ اسی طرح غصہ کرتے، اور اسی جوش سے اُن کے عمل کو اُن کے قول کے مطابق نہ ہونے پر ملامت فرماتے تو اس موقع پر میں اُن کے ارشاد کو نامناسب نہ کہتا۔ مگر صرف مذہبی تعلیم پر ایسا فرمانا، لوگوں کو مختلف قسم کے شکوک لانا بلکہ اشتغال طبع کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے میں اپنے بزرگ سید کی تقریر سے اختلاف کرتا ہوں۔ مگر اے صاحبو! اگر آپ غور کریں تو آپ سید کی تقریر سے ناراض اور خفا ہونے کی کوئی وجہ نہ بتا دیں گے، اس لئے کہ آپ خوب جانتے ہیں کہ وہ ایک ایسے آدمی ہیں، جن کا عمل ان کے قول کے مطابق ہے، اور جو وہ کہتے ہیں وہی کرتے ہیں، اس لئے اُن کا ایسے موقع پر خفا ہونا اور مذہب سے

نازک اور ضروری اور اہم معاملہ میں مسلمانوں کے قول اور فعل کو مطابق نہ دیکھنا اور اُس پر انہیں نصیحت کرنی اُن کو بیلا ہے۔ اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ اُن کا غصہ محبت آمیز ہے اُن کی خفگی بزرگانہ بلکہ پادشاہانہ ہے اُن کا کہنا گویا ہمارے لئے نصیحت اور ایک قسم کی تعلیم ہے اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہم اُن کی نصیحت اور اورادہ اور خیال کو دیکھیں نہ اُن کے لفظوں کو اور اُس شیرینی پر جو اُن کے الفاظ میں چھپی ہوئی ہے خیال کریں نہ اُس کی ظاہری تلخی کو۔

صاحبو! اگر مسر سید کے سوائے کوئی دوسرا آدمی ایسی گفتگو کرتا، تو میں بحیثیت صدر انجمن ہونے کے اُسے خاموش کرتا یا اُس کے جواب میں کچھ کہتا۔ مگر چونکہ مسر سید اس کے کہنے والے تھے اس لئے میں نے کچھ نہیں کہا۔ اُن کا کہنا ویسا ہی ہے جیسا کہ کسی بزرگ کا اپنے چھوٹوں کی نصیحت کے لئے ہوتا ہے، اور اُن کا تھا ہونا ایسا ہی جیسا کہ کسی استاد کا اپنے شاگردوں پر ہوا کرتا ہے۔

صاحبو! میں نے سنا ہے کہ بنارس میں کسی راجہ کے یہاں ایک تصویر ہے جس میں نواب شجاع اللہ اُس خاندان کے بزرگ کو اپنے ہاتھ سے کوڑا مار رہے ہیں۔ کسی نے اُس تصویر کو دیکھ کر راجہ سے کہا کہ ایسی بے عزتی کی تصویر تم نے کیوں اپنے گھر میں لگا رکھی ہے۔ اُس نے کہا کہ اس عزت کے ثبوت میں ہمارا دادا نواب رس تھے۔ بالکل ایسی ہی مثال آپ کو یورپ میں ملیگی :-

کوئی چار دہم، بادشاہ فرانس نے اپنے ایک درباری کے خود لائیں ماریں تھیں۔ وہ اس پر تمام غم فرمایا کرتا تھا اور اُس نے اپنے دیوان خانوں میں ایک تصویر اسی واقعہ کی آویزاں کرائی تھی۔ یہی حال ہمارے مسر سید اور مولوی شمس الدین صاحب کا ہے کہ اگر کہیں مسر سید کی چھڑی اُن پر پڑ جاتی اور اس بوڑھے باپ کی محبت کی مار کا وہ مزہ چکھ لیتے، تو تمام عمر اُسے یاد کرتے اور خوش ہوتے۔

صاحبو! اس نازک اور اہم مسئلے پر جو کچھ مختلف خیالات لوگوں نے ظاہر کئے یہ مسئلہ اُس کا حق تھا۔ حقیقت اُسکی عظمت اور رفعت کا بھی تقاضا ہے کہ بہت کچھ اُسکی نسبت کہا جائے اور بہت کچھ جو شل سکے متعلق ظاہر کیا جاوے۔ حقیقت یہ نازک معاملہ ہے۔ مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کی بھی ضرورت ہے، اور مذہبی تعلیم کی بھی اگر اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کریں تو دنیا نہیں ملتی، اگر مذہبی تعلیم سے متنوع نہ ہوں تو دین ہاتھ سے جاتا ہے۔ اسے دونوں قسم کی تعلیم کا اُن کے لئے انتظام ہونا چاہئے۔ اگر مسلمان اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے تو وہ دنیا میں ذلیل اور بے عزت سمجھے جاویں گے، اور ہر قسم کے درجے اور عزت سے محروم رہیں گے، اور اگر مذہبی علوم سے بے خبر رہے تو رفتہ رفتہ مذہب سے اُن کا یقین اٹھ جاوے گا، اور بغیر مذہب کے اُن کا وجود عدم یکساں ہے۔ مذہب اُن کی جان ہے، جس بدن میں جان نہ ہو وہ مٹی میں بننے کے لائق ہے۔ اگر کوئی ہماری قوم کا طالب علم تمام مغربی علوم کا عالم ہو جاوے، اور تمام یورپ کے فنون میں ماہر ہو، اور ہر قسم کی عزت اور ترقی حاصل کرے۔ مگر مذہب سے بے خبر ہو، اور اسلام پر ثابت قدم نہ رہے تو وہ قوم

کے لئے تنگ ہو گا نہ فقرا اور ایسے مسلمان سے جاہل رہنا اچھا سمجھا جاویگا۔ اور ایسی عزت پر دولت کو ترجیح دیکھا دیگی۔ پس اسے صاحبو جس قدر مسلمان طالب علموں کے لئے دونوں قسم کی تعلیم کا بندوبست کیا جاوے اور جو مناسب تدبیریں اس مقصود کے حاصل ہونے کے لئے کی جاویں۔ وہ سب قابل غور اور توجہ اور مدد کے ہیں نہ لائق غصہ اور نفی اور طاعت کے۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ اس زر ولیوشن کی نسبت جو ترمیم پیش ہوئی ہے اس کو سرکاری پیش کرے اور اول اس کی نسبت دوٹ لئے جاویں :-

غیر ۱۲

ایسیج

یہ مختصر سی ایسیج نواب صاحب موصوف نے ۲۸۔ دسمبر ۱۸۹۳ء کو یکمیت پریزیڈنٹ ہونے اجلاس ہشتم مٹن ایجوکیشنل کانفرنس کے مقام علیگڑھ میں سٹریسید محمد محمود صاحب بیرٹرائٹ لاکے لکچر شروع ہونے سے پہلے بطور خیر مقدم کے فرمائی :-

حضرات !

وہ وقت آگیا، جس کے آپ منتظر تھے اور وہ خوش بیان۔ فصیح اللسان۔ خوش و جوان ایسیج پر موجود ہوا جس کی باتیں سننے کے لئے آپ مدت سے مشتاق تھے۔ میرا عزیز پیارا بھائی محمود اس وقت آپ کے سامنے اس لکچر کے سنانے اور ان چیزوں کے دکھانے کے لئے کھڑا ہوا ہے کہ لا اذن سمعت ولا عین رات۔ جسے دیکھی کان نے سنا اور دیکھی آنکھ نے دیکھا۔ فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون

غیر ۱۳

ایسیج

یہ ایسیج نواب صاحب بہادر نے ۲۸۔ دسمبر ۱۸۹۳ء کو بیرونہما تھرا اجلاس ہشتم مٹن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ میں سٹریسید محمد محمود صاحب بیرٹرائٹ لاکے نیٹیر لکچر کے اختتام پر یکمیت میرٹھ میں کے بطور ریمارکس کے فرمائی :-

حضرات ! میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس لکچر کے ختم ہونے پر اپنے خیالات لکچر اور لکچر کی نسبت

ظاہر کروں، اور چونکہ میں نے لکچر اس سے پہلے دیکھ لیا تھا اس لئے میں نے اُس کی نسبت اپنے خیالات بھی قائم کر لئے تھے۔ مگر صاحب جس طرز سے میرے بھائی نے اُسے ادا کیا اور جو کچھ اپنی تقریر میں اس وقت اُس پر اضافہ کیا اُس کا اثر میرے دل پر کچھ ایسا ہوا ہے کہ نہ مجھ میں کچھ سوچنے کی طاقت باقی ہے نہ کچھ کہنے کی۔

چنانچہ انیوں ساقی درمے انگند

حرفیاں رانہ سہلندونہ دستار

درحقیقت اس لکچر کی نسبت کچھ کمنا فضول ہے۔ ہم اس کی ترتیب کی تعریف کر سکتے ہیں۔ ہم اُس کے نقشوں اور ڈائیگراموں کی خوبی بیان کر سکتے ہیں۔ مگر اُن کی تحویر، اور تقریر، اور الفاظ معانی، اور طرز ادا، اور جوش بیان نے جو اثر دلوں پر کیا ہے، اور جس ظرافت آمیز فصاحت سے انہوں نے تاریخانہ حالات بیان کئے ہیں، اور جس خوبی کو انہوں نے اپنی قوم کی تعلیم کی سچی تصویر کھینچی ہے، اور جن دردناک واقعات کا انہوں نے بیان کیا ہے، اُن سب باتوں نے من حیث المجموع، ایک ایسی حالت طاری کر دی ہے کہ اُس کی کیفیت سننے والوں کے دل جلتے ہیں۔ اُسے کوئی کس طرح بیان کر سکے۔ درحقیقت اس لکچر کی نسبت یہ کہنا کہ ”عطر آنت کہ خود ہوید نہ آئکہ عطار بگوید“ ایک حکایت نفس الامری ہے، نہ شاعرانہ۔ میں جانتا ہوں اور میں دیکھتا رہوں کہ کیسی محنت اس لکچر کی تیاری میں لکچر اٹھائی ہے، اور کتنی کتابیں اور کئی ہزار صفحے اُس کے لئے اس بارعزیز نے پڑھے ہیں، اور کس قدر اُس کے مواد جمع کرنے کے لئے اُس کو زحمت اٹھانی پڑی ہے۔ کن کن باغوں میں وہ گئے، اور کہاں کہاں سے پھول لائے، جس کا عطر کھینچ کر اس وقت آپ کے سامنے پیش کیا۔ اور جس سے اس بات کا کہ سپید عطر فروش ہوا کرتے ہیں انہوں نے ثبوت دیا۔ اس لکچر کی تیاری میں جو محنت انہوں نے اپنا دیا اور گوارا کی اُس کا اندازہ آپ اس لکچر کے مضامین اور تاریخانہ واقعات اور ہندسوں اور نقشوں اور ڈائیگراموں کر سکتے ہیں۔ درحقیقت جس خوبی سے ان مضامین کو انہوں نے ترتیب دیا، اور تاریخانہ واقعات کے بیان میں ظرافت کی چاشنی جس طور سے ملائی، اور ایک روکھے پھیکے مضمون کو جس طرح انہوں نے باورہ کر دیا، یہ انہیں کا حصہ تھا، اور ایک ایسے مضمون پر جس میں بہت کچھ کہا جا چکا ہو ایسا لکچر دینا، جو نہ صرف فی الوقت مؤثر ہو، بلکہ جو ہمیشہ بکار آمداد رہد وقت غور کے لائق ہو، اور جس کو قوم اور گورنمنٹ تعلیم کے متعلق ایک ضروری اور اہم کارڈ سمجھی۔ انہیں کے لئے رہ گیا تھا۔ اس لکچر کے فائدے اور اُس کی خوبیاں اُسی قدر زیادہ معلوم ہوتی جا ئیں گی جس قدر اُس پر زیادہ غور کیا جائیگا اور جس قدر زیادہ توجہ سے اُس پر نظر ڈالی جائیگی۔

صاحبو! یہ کہنا کچھ بالآخر نہیں کہ مسلمانوں کے لئے یہ ایک ایسا صحیفہ ہے جو اُن کی نظر سے کبھی نہ

گورا تھا۔ اور اس میں وہ واقعات درج ہیں۔ جو انہوں نے کبھی نہ سنے تھے، وہ ایک تاریخ ہے اس انقلاب کی جو مسلمانوں کی حالت میں سلطنت کی تبدیلی سے پیدا ہوا، اور ایک سلسلہ ہے ان واقعات کا جو اصول تعلیم کے تغیر سے مسلمانوں پر پیش آئے۔ اس سے وہ نتیجے ظاہر ہوتے ہیں جو مسلمانوں کے تعصب اور غفلت نے ان کو دکھائے، اور اس سے ان کا وہ مقام معلوم ہوتا ہے، جو انہوں نے علم کے میدان میں حاصل کیا، اور پھر ان واقعات کے بیان میں نہ مبالغہ ہے نہ رنگ آمیزی، نہ مضامین کو فصاحت کے سانچے میں ڈھال کر اپنی مرضی کے موافق بنایا ہے، نہ دلوں پر اثر ڈالنے کے لئے استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیا ہے، بلکہ تمام واقعات ہندسی دلائل پر مبنی ہیں اور ہر چیز کا ثبوت علم اعداد سے دیا ہے۔

میرے نزدیک ایسی سچی تصویر مسلمانوں کی حالت کی غالباً اب تک کسی نے نہ کھینچی تھی اور ایسا صاف آئینہ قوم کے سامنے اب تک کسی نے نہ رکھا تھا، جس میں وہ اپنی گزشتہ اور موجودہ حالت کی صورت اچھی طرح دیکھ سکیں۔ اور اپنے عیب اور صواب کو بخوبی سمجھیں۔ حقیقت ایک لحاظ سے میرے عزیز اور پیارے محمود نے نہایت دانشمندانہ کام کیا۔ اور مسلمانوں کی نصیحت اور قوم کو اپنی حالت پر مطلع کرنے کا نہایت عمدہ ڈھنگ نکالا۔ ان کے باپ یا کسی اور نے جو کچھ مسلمانوں سے کہا اس کے الفاظ سخت ہوا کرتے تھے اور مسلمانوں کی اصلی حالت کا بیان تلخ معلوم ہوتا تھا، مگر سید محمود نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جو ناگوار ہو، اور ایک فقرہ بھی ایسا نہیں لکھا، جو کسی نے ناپسند کیا ہو، یا جسے سن کر کسی کو غصہ آیا ہو۔ ان کا سارا کچھ ٹپ جھانسنے، اس میں کچھ بھی نہیں۔ سوائے واقعات کے بیان، اور حالات کے اظہار، اور ہندوؤں اور قوموں کے، لیکن جب غور سے دیکھئے، تو مسلمانوں کے تعصب اور جہالت اور ان کی غفلت اور غور کا ثبوت جیسا اس سے ہوتا ہے، اور وہ ہندو سے اور نقشے جیسا مسلمانوں کی پست اور ذلیل حالت کا بیان کر رہے ہیں، وہ نہ کبھی **سید احمد خاں** نے کیا، نہ کبھی مولوی نذیر احمد نے، نہ کسی مقرر اور نہ کسی لکچرار نے۔ انہوں نے جھگڑنے اور عیوب بیان کرنے اور غصہ دلانے سے پرہیز کیا۔ صرف ایک صاف آئینہ قوم کے ہاتھ میں دیدیا۔ کہ وہ اپنی اپنی صورت اس میں دیکھ لیں۔

حضرات! کیا میرا یہ کہنا مبالغہ ہے، کیا وہ پست حالت مسلمانوں کی جو اس کچھ نے دکھائی، اور کیا مسلمانوں کی اس کمی کا، جو بمقابلہ ہندوؤں کے تعلیم میں ان نقوشوں نے ظاہر کی اس کا صحیح اندازہ کبھی اول آپ نے کیا تھا اور کیا ایسی خوفناک صورت مسلمانوں کی حالت کی جو اس وقت آپ نے دیکھی آپ کے خیال میں تھی۔ بلاشبہ سب سمجھتے تھے کہ مسلمان ہندوؤں سے تعلیم میں کم ہیں اور سب کو خیال تھا کہ انہوں نے سرکاری مدارس سے کم فائدہ اٹھایا ہے، مگر کسی کے خیال میں یہ نہ تھا کہ وہ بمقابلہ ہندوؤں کے اتنے کم ہونگے اور تعلیم میں ان کی حالت ایسی خراب ہوگی۔ بہر حال ایک نئے ڈھنگ سے نہایت

خوش ہوئی سے سید محمود صاحب نے مسلمانوں کی حالت دکھا دی اور چند لکیروں میں ساری قوم کی کھپائی
موجودہ کیفیت ظاہر کر دی *

حضرات! اُن کا مافی کورٹ سے جدا ہونا نہایت رنج و دہ تھا۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے قوم کو
اس کا نہایت صدمہ تھا۔ مگر آج ہمارا وہ رنج جاتا رہا۔ اور اُنہوں نے قومی خدمات کرنے سے ہم کو اُس کا
نغمہ البدل دیدیا۔ بلاشبہ مافی کورٹ کی جج پر ایک مسلمان کا مقرر ہونا باعث فخر تھا مگر قائدہ اُس کا
محدود اور خافی تھا۔ البتہ قومی تعلیم اور تربیت کی اشاعت ایک ایسا کام ہے جس کا نفع عام اور ہمیشہ
باقی رہے۔ بسبب سرکاری ملازمت کے وہ قومی خدمت کرنے سے معذور تھے۔ اور نہ جیسے کہ چاہئے
جج کی حالت میں وہ مرضی کے موافق کام کر سکتے تھے مگر اب وہ آزاد ہیں اور تمام قیدوں سے بری۔ اب
وہ قوم کو اپنے دل و دماغ سے وہ قائدہ بچھا سکتے ہیں۔ جو جج کی حالت میں کبھی نہ بچھا سکتے تھے۔
اُن کا علم وسیع ہے اور طبیعت سلیم، اُن کا دل پاک ہے اور دماغ بلند، خیالات اُن کے پاکیزہ ہیں۔
تقصیب اور فسادیت کا اُن میں نام نہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو اُن پر اعتماد
ہے اور کل قوم اُن پر بھروسہ رکھتی ہے۔ نہ اُن پر کفر کے فتوے جاری ہوئے نہ کبھی مسلمانوں نے اُن
پر طعنے کئے۔ اور نہ کبھی تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھے اور نہ خراب آفاق مشہور ہوئے۔ وہ ہمیشہ اُن جھگڑے
قصصوں سے غلجہ رہے۔ آج پہلا دن ہے کہ اُنہوں نے اسٹیج پر قدم رکھا اور اپنے دل اور دماغ کے جوہر
دکھلائے اُنہوں نے اپنی طلاق لسان اور فصاحت بیان اور شیرینی زبان سے اُن امیدوں کو تازہ کر دیا
جو اُن کی ذات سے قوم کو تھیں، اور اُنہوں نے اپنے اعتدال خیالات اور سلامت طبیعت دکھا کر اس
بات کا یقین کرادیا، کہ وہ نہ صرف لائق باپ کے لائق فرزند ہیں، بلکہ بعض باتوں میں اُن سے بھئی فائق
ہیں۔ آج اُنہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ صرف قانون ہی میں اعلیٰ لیاقت نہیں رکھتے تھے اور ایک عمدہ
جج ہی نہ تھے بلکہ اُن کا علم بھی ایسا ہی وسیع ہے اور قومی خدمت کے لئے بھی وہ ہر طرح سے موصی ہیں
اور جو صفات ایک آدمی میں مشکل سے جمع ہو سکتے ہیں وہ اُن کے جامع ہیں۔

اینکہ ے گویند رآں خوشتر دشن

یار مایں دارد و آل نیز ہم

ما جواب میں زیادہ کہنا نہیں چاہتا اور کتنا ہی کموں نہ پھرار کے ذاتی صفات کا نہ اُن کے عمدہ
اور بنیظہ لکچر کی خوبیوں کا بیان کر سکتا ہوں، اس لئے میں مجلس کی اس خواہش کو ظاہر کر کے اپنی کڑی
بٹھتا ہوں کہ سید محمود کی اس قومی خدمت کا جو ہمیشہ آئندہ آنے والی نسلوں تک یاد رہیگی۔ تنک یہ ادا
کیا جاوے اور اُن کی صحت اور سلامتی کی دعا مانگی جاوے۔ اللہ تعالیٰ مقبل منانک انت السمیع
العلیہ *

اسپیج

یا

مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ

یہ اسپیش نواب صاحب بہادر نے ۲۴۔ دسمبر ۱۸۹۲ء کو اجلاس ہشتم محمدن ایگلو اور نیشنل کانفرنس علیگلہ میں رزلویشن نمبر ۱ (جو بجنیل میں درج ہے) کی تائید کرتے ہوئے فرمائی اور اس رزلویشن کو مرحوم سر سید نے پیش کیا تھا:-

رزلویشن نمبر ۱

(مضمون رزلویشن، اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ درباب ترقی تعلیم و تربیت مسلمانوں کے جو کچھ اب تک ہوا ہے وہ محض ناکافی ہے اور اگر یہی حالت رہی تو صدیوں کے گزرنے پر بھی تبدیل حالت کی توقع نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا اور اس سے بھی زیادہ تربیت کا جمہوری متفقہ کوشش سے انتظام نہ کیا جاوے۔ اگر اس طرح پر نہ کیا جاوے گا، تو کانفرنس کی رائے میں ترقی تعلیم و ترقی حالات مسلمانوں سے بالکل باایوس ہونا چاہئے)۔

صاحبو!

جس رزلویشن کو ہمارے بزرگ عالی جناب سر سید احمد خاں صاحب بہادر نے پیش کیا ہے، میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ اگر یہ رزلویشن انہیں لفظوں سے لکھنے کے اجلاس میں پیش کیا گیا ہوتا، تو میں نہیں سمجھتا، کہ اس سے کوئی بھی اختلاف کرتا، اور اگر اس وقت یہ رزلویشن ان پرانے لفظوں میں پیش ہوتا، تو میں اس کی تائید نہ کرتا۔ میرے نزدیک یہ دو نواں رزلویشن باعتبار معنی اور مطلب کے ویسے ہی مختلف ہیں، جیسے باعتبار عبارت اور الفاظ کے، اور مجھے تعجب ہے کہ اس رزلویشن کا اس موقع پر ذکر ہی کیوں کیا گیا؟

بہر حال چونکہ اس رزلویشن کے الفاظ صاف ہیں، اور مطلب اس کا کھلا ہوا، اور میرے نزدیک وہ نہایت صحیح، اور منظوری کے لائق ہے۔ اس لئے میں اس کی تائید کے لئے کھڑا ہوا ہوں، مگر

قبل اس کے کہ میں رزولوشن کی تائید میں کچھ کہوں، مجھے مجبوری یہ کہنا پڑنا ہے، کہ جناب مدوح کے اُن خیالات سے میں متفق نہیں ہوں، جو اس رزولوشن کے پیش کرتے وقت، اپنے دل کی بات کی نسبت ظاہر فرمائے ہیں۔ اُن کا یہ فرمانا کہ ”مجھ کو مسلمانوں کی ترقی اور مسلمانوں کی قوم کو دنیا میں ایک معزز قوم ہونے سے بالکل بایوسی ہے“ اور اُس کے ثبوت میں یہ کہنا کہ ”اس امر میں کوشش کرتے کرتے تین قرن گزر گئے“ اور کچھ نہیں ہوا، چھتیس برس سے اسی کوشش میں سرگردانی ہے اور پھر کو لہو کے پیل کی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وہیں ہیں جہاں تھے“ کو بلحاظ اُن کی دلی خواہش کے صحیح ہوا، مگر میں اُسے تسلیم نہیں کرتا۔ مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے اور اس درجہ تک پہنچانے میں جو کچھ کامیابی اُن کو ہوئی ہے وہ دل شکن نہیں، بلکہ دل خوش کن ہے۔ اور نہ صرف یہ میرا ہی خیال ہے، بلکہ ہر ایک شخص جو اس مدرسہ کی تاریخ سے واقف ہے۔ اور جس نے اس کوچ کو دیکھا ہے، اور فرمانروائے ہند سے لیکر ضلع کے حاکم تک، جس کو یہاں آنے کا اتفاق ہوا ہے سب سید صاحب کی کامیابی پر حیرت ظاہر کی ہے، اور قوم کو مبارکباد دی ہے۔ اور اس وقت اگر آپ کو سید صاحب کی کامیابی اور قوم کی مدد اور فیاضی، کی شہادت چاہئے تو اس قومی گھر کو ملاحظہ کیجئے کہ اس کے ہر دروازہ دیوار، اور اُس کی ہر سمت، اور ہر گوشہ سے، کامیابی کی آواز آرہی ہے۔ ذرا اس ہال کو آنکھ اٹھا کر دیکھئے، کہ ہمارے سر پر کتنے بزرگ بیٹھے ہوئے فرما رہے ہیں، کہ ہم ہیں اس کے بنانے والے، اور سرسید کی مدد دینے والے۔ پھر پور ڈنگ ہوس کی قطاروں کی طرف جائے۔ اُس کے، ہر دروازہ پر کوئی نہ کوئی قومی خیر خواہ کھڑا ہوا کہ رہے کہ ہم ہیں اس کے بانی، اور سرسید کی اعانت کرنے والے۔ پھر اُن بڑے اور رفیع افشان کمروں کو جا کر دیکھئے، جہاں صبح کو قرآن مجید پڑھا جاتا ہے، اور کالج کلاس کی تعلیم ہوتی ہے، وہاں آپ سلسلہاں چا امیر کبیر حیدر آباد کو یہ کہتا ہوا پاؤینگے کہ ہم نے اتنے دور دراز فاصلہ سے سرسید کی آواز سنی، اور اُن کی مدد کی۔ اُس کے بعد دھنگ ہال کی طرف قدم رنج فرمائے، وہاں آپ گریٹ سسلا درجننگ مرحوم کو کھڑا دیکھینگے کہ وہ فرما رہے ہیں، کہ میں ہوں اس کا حامی، اور اپنے سرسید کی کوششوں کا قدر کرنے والا۔ پھر نظام بیوزیم کی طرف جائے ”تو اس کے ہر دروازے پر آواز سنئے گا، کہ دکن کے بادشاہ اور مسلمانوں کے مستأج نے سرسید کے در کو سنا۔ اور اس کا حامی اور مرنی ہوا سرسید کی التجا کا سننے والا، اور اس قومی گھر کا قائم رکھنے والا۔ پھر احاطہ کی دیوار کو دیکھئے، وہاں سینکڑوں مسلمان صنف باندھے ہوئے کھڑے کر رہے ہیں کہ ہم ہیں اپنی قوم کے بھی خواہ، اور اس قومی کام میں سرسید کا ساتھ دینے والے، اور نہ صرف مسلمانوں کو ہی آپ ایسا کہنا اور مدد دینے والا پاؤینگے، بلکہ بہت سے نیک دل یوچین

اور ہندو بھی آپ کو سپید صاحب کی کامیابی کے شاہد، اور اپنی فیاضی کے ثابت کرنیوالے
 دیتے۔ غرض کہ اس کالج کے باہر باہر بھیتے، اوپر یا نیچے، جہاں دیکھئے، اور اس کی کسی چیز کو، دیکھو یا دیو
 جھٹ ہو یا فرش، باغ ہو یا احاطہ، ملاحظہ فرمائے، وہاں آپ کو ان کی کامیابی کی ایسی مضبوط شاہدیں
 ملیں گی، جن کو زمانہ کا کچھ بھی مٹا نہیں سکتا۔ باوجود ایسی شہادتوں کے میں نہیں سمجھتا، کہ ہمارے بزرگ
 سر سپرد کیوں قوم کی طرف سے ایسے ناامید ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک جو کام انہوں نے قوم
 سے لیا ہے، نہ ہماری پچھلی تاریخ میں اس کی نظیر مل سکتی ہے، نہ اس زمانہ میں کسی جگہ ہم اس کی مثال
 پاتے ہیں۔ بہت بڑا نمود کا کام جو اس صدی، میں اور انگریزی عملداری کے شروع سے اب تک،
 اس صوبہ میں ہوا، وہ میور کالج ہے۔ اور جس پر اس صوبہ کے حاکم اعلیٰ برسوں تک متوجہ رہے ہیں
 مگر اس کے لئے دو لاکھ نو ہزار روپیہ سے زیادہ جمع نہ ہو سکا۔ اور اس میں بھی ایک بہت بڑی رقم
 لاکھ روپیہ کی صرف مل جی ایلنگو کی دی ہوئی ہے۔ اب بمقابہ وقعت اور رعیت اور درجہ
 سر دیو میور صاحب بہادر لٹنٹ گورنر کے سپید صاحب کی حالت کو دیکھئے، کہ باعتبار درجہ کے
 صرف ایک ماتحت جج۔ بلحاظ دولت کے محض مفلس۔ بنظر عقاید کے مشہور زمانہ۔ بوجہ مخالفت جمہور
 کے خارق جملہ۔ طرز معاشرت قوم کو نفرت دلانے والا۔ لباس آپ کا مسلمانوں کے نزدیک من
 تشبہ بقوم کا مصداق۔ پھر اسی زمانہ میں تہذیب الاخلاق جاری۔ اور مذہبی خیالات کی اصلاح میں آپ
 سرگرم۔ اس پر رقم مطلوبہ کی مقدار نہایت قلیل۔ اور مانگنے کا ڈھنگ دنیا سے زالاج

اے کہ توجہ مجموعہ خوبی زکدامت گویم
 جس ادا کو آپ کی دیکھئے دل فریب، اور جس بات پر نظر کیجئے ہوش ربا
 زرق تالقم دم ہر کجا کہ مے نگر
 کر شمعہ دامن دل میکشد کہ جانا خواست

اس ساز و سامان سے آپ چندہ جمع کرنے کے لئے آمادہ ہوئے اور وہ بھی ایسے کام کے لئے جو
 قوم کے نزدیک مذہب کا برباد کرنے والا، اور جس میں شرکت گناہ کبیرہ۔ اس پر سات یا آٹھ لاکھ
 روپیہ مسلمانوں کی گرہ سے نکلوانا اور ایک ایسی شہادت جو اپنی طرز میں بے مثل ہو بنا لینی، اور
 ایک ایسے بڑے کالج کا جو کیمبرج اور اکسفورڈ کی برابری کرے قائم کر لینا، ایک ایسی چیز ہے، جس کے
 خیال سے حیرت ہوتی ہے اور جس کے دیکھنے سے یہ سارا کارخانہ جادو اور طلسمات کا معلوم ہوتا ہے
 اور ہر شخص جس پر نظر کرنے سے ص

ایک مے بنیم بہ بیداری ہست یارب یا پنجاب

کننے گلتے ہیں۔ باوجود اس کے جب ہمارے قبلہ و کعبہ اپنی ناکامیابی ظاہر فرماتے ہیں اور قوم کا مشیہ

پڑھتے ہیں تو کچھ کہا نہیں جاتا ۛ

اے دمانت لب لب نے دہاں شیریں تر

خندہ شیریں سخن گفتن از اناں شیریں تر

حقیقت میں اس کالج کی نسبت جیسی کوششیں سید صاحب کی مشکور ہوئی ہیں، اور جیسی کچھ قوم نے اُن کی مدد کی ہے، وہ نہایت عجیب اور بیش ہے، اور اس کا ثبوت، کہ ایک مستقل مزاج انسان اپنی نیت کی سچائی۔ ارادہ کی مضبوطی۔ مزاج کی استقامتی۔ ہمت کی بلندی۔ ذاتی لیاقت۔ اولیت کی صفائی سے کیسی تشکیل آسان کر سکتا ہے۔ اور باوجود سخت مزاحمتوں کے قوم کے دلوں کو کیسا کچھ مسخر کر سکتا ہے۔ درحقیقت نہایت سچ ہے جو کچھ سرچارلس کرا سویت صاحب بہادر نے اس کالج کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ "جو شخص کے پاس لاکھوں روپیہ موجود ہو، اُس کے نزدیک ایک بڑا انشٹیویشن قائم کرنا آسان ہے، اور جو شخص ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہو، اُس کو کسی کام کے پورا کرنے اور اُس کے واسطے روپیہ ہتیا کرنے لئے، دوسرے شخصوں پر رعب ڈالنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ لیکن پرائیویٹ شخص یعنی ایک شخص کے واسطے، جس کو اس دنیا کی دولت کا ایکٹھا حصہ نصیب نہ ہو، ایک ایسا کام اپنے ذمہ لینا، جیسا کہ ایک بڑے مدرسہ کا قائم کرنا ہے، اور پچیس تین برس کے عرصہ میں اس مقصد کو قریب قریب پورا کرنا، جیسا کہ انشٹیویشن پورا ہوا ہے۔ ایک نہایت دشوار اور اعلیٰ درجہ کا کام ہے، جس پر ہر ایک شخص نازاں ہو سکتا ہے" ۛ

صاحبو! میں نہیں سمجھتا کہ کسی شخص کو اس کام کے دیکھنے سے آئندہ کے لئے یا لوسی ہوگی بلکہ اسے دیکھ کر اور کچھ حالات پر خیال کر کے، آئندہ کے لئے ضرورتی ہمت پیدا ہوگی ۛ

صاحبو! میرے نزدیک جتنا کام ہو گیا، وہ جس قدر مشکل تھا، باقی ماندہ کام کا پورا کرنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ وہ ترقی جو قوم کے خیالات میں ہو رہی ہے، اور وہ نتائج جو یہ کالج دکھلا رہا ہے، خود اُس کی تکمیل کے ضامن ہیں ۛ

صاحبو! آپ مجھے معاف فرمائیے، کہ میں نے آپ کا اتنا قیمتی وقت ضائع کیا۔ اور قبل شروع کرنے نفس مطلب کے میں نے یہ لمبی گفتگو کی۔ چونکہ ہمارے بزرگ سرسید اپنی ناکامیابی پر ہمیشہ نالاں رہتے ہیں، اور رات دن اُس کا رونا دیا کرتے ہیں۔ آخر کہاں تک انسان برداشت کرے، اور کب تک بے قوم، داسے قوم، سنا کرے۔ ایک دن دو دن۔ کہاں تک تو ہی کچھ انصاف کرے، یہ تو جتنا روز کا لے سوز بھراں ہو گیا

اس لئے اے میرے بزرگو! مجھ سے راز کیا اور میں نے بھی اپنے دل کا درد نکال دیا۔ ایسے صبل رزلویشن کی نسبت گفتگو کرتا ہوں ۛ

صاحبو! جو رزولوشن انہوں نے اس وقت پیش کیا ہے، اُس کے الفاظ صاف ہیں، اور اُس کے مطلب میں کچھ پیچیدگی نہیں ہے۔ سید صاحب نے اُس میں دو امر پیش کئے ہیں:-
 ”ایک یہ کہ جو کچھ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی ترقی کی نسبت اب تک ہوا ہے، وہ ناکافی ہے۔“ دوسرے یہ کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کے لئے متفقہ کوشش سے انتظام کا ہونا ضروری ہے۔
 ورہ مسلمانوں کی ترقی سے مایوس ہو جانا چاہئے، اور اس کا اصل مقصد وہ ہے ”درستہ العلوم کا پورا کرنا۔ اس لئے مجھے ضرور ہے کہ شرج و بسط سے اس کی نسبت گفتگو کر دوں اور اپنے خیالات پورے طور پر بظاہر کر دوں۔ اس لئے کہ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے، اور نہایت مشکل، اور قوم کی نہایت توجہ کے لائق۔ اس لئے اگر آپ کا قیمتی وقت کچھ اس کے سننے میں ضائع ہو، تو آپ مجھے معاف فرمادینگے۔“
 صاحبو! اس رزولوشن کے متعلق چند باتیں تصدیق طلب ہیں:-

اول یہ کہ ہم صرف قوم کے نام قایم رہنے اور اُس کی تعداد کم نہ ہونے پر قانع ہیں، یا ہم یہ چاہتے ہیں، کہ وہ بھی دنیا کی اور معزز قوموں کی طرح ایک معزز قوم ہو۔ اور اُس وقت وہ معزز سمجھی جاسکتی ہے یا نہیں؟
 دوسرے یہ کہ ترقی سے کیا مراد ہے، اور کس حالت پر پہنچنے سے اُس کی ترقی سمجھی جاسکتی ہے؟

تیسرے یہ کہ اعلیٰ تعلیم اور تربیت سے کیا مراد ہے، اور بغیر اُس کے آیا مسلمان اُس حالت پر جس قومی ترقی کی امید ہو، پہنچ سکتے ہیں یا نہیں؟
 چوتھے یہ کہ درستہ العلوم مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا مسلم ذریعہ، اور دیگر مسلمانوں کا بلوں کے عمدہ نمونہ ہے، یا نہیں؟
 پانچویں یہ کہ اس کی تکمیل پر قوم کو متوجہ ہونا، اور متفقہ کوششوں سے انتظام کرنا قومی مفاد کے لئے لازم ہے، یا نہیں؟

پہلے امر کی نسبت میری یہ رائے ہے۔ کہ قوم کا نام قایم رہنا، اور برائے نام اُس کا ہونا اُس کے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر اسی پر ہم قانع ہیں تو ہمیں کچھ فکر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسلمان خدا کی مہربانی سے گنتی میں اب بھی کم نہیں ہیں، اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ چین، روس، اور افریقہ، میں اُن کا شمار لاکھوں سے متجاوز ہے۔ مگر ہم صرف اُن کی تعداد پر قانع نہیں ہیں۔ بلکہ ہم اُن کو دنیا کی اور معزز قوموں کے موافق معزز قوم ہونا چاہتے ہیں۔ اور اس ہندوستان میں اپنی قوم کو کم سے کم، ملک کی اور معزز قوموں کے برابر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ جس طرح اور قوموں کا حال ہے، ہماری قوم بھی شامل ہے، مختلف قسم کے حالات کے لوگوں سے

کوئی امیر ہے کوئی غریب، کوئی دوئمند ہے کوئی مفلس، کوئی جاہل ہے کوئی عالم، مگر بہت بڑا حصہ ہمارا قوم کا خلافت دوسری معزز قوموں کے جوہارے ہوٹوں ہیں، مفلس اور ذلیل حالت میں ہے، اور سوائے ایک فرقہ قلیل کے عموماً مسلمانوں کی حالت نہایت نباہ اور خراب ہے۔ لاکھوں مسلمان ایسے ہیں جن کو نہ کھانے کے لئے روٹی ملتی ہے۔ نہ پہننے کو کپڑا نہ کسی مجلس میں جانے کے لائق۔ نہ کسی حاکم سے ملنے کے قابل، اسلام کے بنام کرنے والے، اور مسلمانوں کی ذلت کا نمونہ، اور وہ فرقہ قلیل جو کسی قدر خوشحال ہے، اقل توکل مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے اس کی نسبت نہایت کم ہے۔ دوسرے نسبت اپنی اور ہوٹوں قوموں کے، وہ بھی گویا ذلیل اور مفلس ہیں اور ان کا افلاس بمقابلہ ان کے نہ صرف مال و دولت میں ہے، بلکہ ہر چیز میں، خصوصاً اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں۔ اگر آپ ہندوستان کے مختلف حصوں کا سفر کریں، اور ضلوع اور شہروں اور قصبوں میں پھریں، اور مسلمانوں کی حالت کو دوسری قوموں کی حالت سے مقابلہ کریں، تو آپ کو ہر جگہ دونوں کی حالت میں فرق عظیم معلوم ہوگا۔ بنگال میں جا کر نام آور قوم بنگالیوں کو دیکھیے۔ بمبئی میں جا کر فیاض اور بلند ہمت پارسیوں کو ملاحظہ کیجئے۔ دکن میں جا کر آلو العزم مرہٹوں سے ملئے۔ مدراس میں ذکی الطبع ہندوؤں کی کیفیت دیکھیے اور پھر ہر جگہ اپنے نصیب بھائیوں کا ان سے مقابلہ کیجئے، تو ہر جگہ وہ فرق نظر آجگا، جو در در روشن اور شب تاریک میں ہوتا ہے۔ ہر جگہ کسی بنگالی اور کیا پارسی، کیا مرہٹے اور کیا مدراسی، سب میں آپ ایک جوش مستعدی اور آلو العزمی کا پائینگے، اور ہر ایک کو زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلتا اور ترقی کرتا ہوا دیکھینگے۔ کلج ان سے بھر ہوئے لیٹینگے۔ کچہریوں میں دہی دکھائی دیگے۔ حکومت کی کرسیوں پر آپ انہیں کو بیٹھا ہوا دیکھینگے۔ ٹی کورٹ میں یورپین ججوں کی برابر دہی بیٹھے لیٹینگے۔ کونسل میں والسرائے اور گورنر کے ساتھ ملکی معاملات میں آپ انہیں کو صلاح و مشورہ دیتے ہوئے پائینگے۔ بڑے بڑے تجارت کے کارخانوں میں انہیں کی صورتیں دکھائی دیگی۔ گورنمنٹ ہوس اور معزز مقاموں میں ہی نظر آدینگے۔ غرض کہ کوئی جگہ عزت کی ایسی نہ ہوگی جہاں وہ نہ ملیں۔ اور کوئی ذریعہ ترقی کا ایسا نہ ہوگا، جس کے حاصل کرنے میں وہ سامعی اور سرگرم نہ ہوں۔ بمقابلہ ان کے مسلمانوں کو آپ ہر عزت کے مقام سے خارج، اور ہر قسم کی ترقی کے ذریعہ سے محروم، دیکھینگے۔ نہ کالجوں میں ان کو دیکھیے گا، نہ حکومت کی کرسی پر ان کی صورت نظر آوے گی۔ نہ ملکی انتظام میں ان کی آواز سنائی دیگی۔ نہ علمی مجالس میں وہ لیٹینگے۔ نہ ان کی ترقی کی کوئی علامت نظر پڑے گی۔ اور اگر کہیں ان کی شکل آپ دیکھیے بھی، تو اتنی کم کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

صاحبو! جو میں کہ رہا ہوں، اس کا تعلق جہاں تک تعلیم سے تھا وہ میرے بھائی اور عزیز

سید محمد صاحب آپ پر ثابت کر چکے، بلکہ اس کی سچی تصویر انہوں نے آپ کو دکھادی اور
جہاں تک سرکاری ملازمت سے تعلق ہے اس کی حالت مجھ سے سنئے۔

میرے ہاتھ میں جو کاغذات آپ دیکھتے ہیں، یہ انتخاب تمام ہندوستان کے صوبوں کی سول
کابینے، اور وہ بھی بابت اکتوبر ۱۹۳۳ء کے، جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر صوبہ کے ہڈ پارٹنر
میں، کتنے ہندو ملازم ہیں، اور کتنے مسلمان۔ تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ وہ مسلمان جو ہندوستان کے
بادشاہ تھے، اور جو بعد زوال سلطنت کے اسی انگریزی حکومت میں تمام معزز عہدوں پر مقرر تھے،
اور جن کی تعداد بموجب اس زمانہ کی سرکاری فہرستوں کے لاکھ کاڑھوں والے عہد میں گری
ملازمت میں فیصدی ۵۰ فی اب کس قدر کم ہے۔

ہر صوبہ کی صیغہ و تفصیل سنانا تو آپ کو تکلیف دینا ہے۔ مگر اس وقت کچھ مختصراً اس کا حال

بیان کرتا ہوں:-

اول صوبہ بنگال کو لیجئے وہاں کل عہدہ دارے مندرجہ گزٹ میں ایک ہزار ایک سو نو سے
ہندو ہیں، اور ۱۲۷ مسلمان۔ ان میں بھی یہ دیکھنے کے لائق ہے کہ ۱۶ ہندو، کلکٹر اور مجسٹریٹ
ہیں اور مسلمان صرف ۲-۲۳ ہندو، ڈپٹی کلکٹر ہیں اور مسلمان ایک-۲۵۳ ہندو، مجسٹریٹ
ہیں اور ۳۵ مسلمان-۲۸۴ ہندو، منصف ہیں اور ۸ مسلمان-پبلک ورکس میں ۱۱ ہندو،
ہیں اور مسلمان ندارد-۱۳ ہندو، پوسٹ ماسٹر ہیں اور ایک مسلمان-۵۵ ہندو، سب جج ہیں اور
۷ مسلمان-۱۵۵ ہندو، اسٹنٹ سرجن ہیں اور مسلمان ۶-۱۱ ہندو، انجینئرز ہیں اور مسلمان کوئی
نہیں۔ صیغہ تعمیرات میں ۱۴۷ ہندو ہیں اور مسلمان ۱۲۔

بمبئی پریسڈینسی کا حال اس سے بدتر ہے۔ ۹۳۸ ہندو عہدہ دارے مندرجہ گزٹ پر
ہیں، اور صرف ۶۲ مسلمان۔ اس میں بھی یہ کیفیت ہے کہ ۱۹ ہندو تحصیلدار ہیں اور ۲ مسلمان-
۵۹ ہندو ڈپٹی کلکٹر ہیں، اور ۶ مسلمان-۹ ہندو اسٹنٹ کلکٹر ہیں اور ایک مسلمان۔ کمشنر کے
دفتر میں ۶ ہندو ہیں، مسلمان کوئی نہیں۔ پوسٹ آفس کے علاقہ میں ۶۵ ہندو ہیں اور ۲ مسلمان
علاقہ عدالت میں ۳۱ ہندو ہیں اور ۴ مسلمان۔ اس میں ذرا اسل مر کو غور سے ملاحظہ فرمائیے کہ ۱۲۵
سب آرڈیننس جج ہندو ہیں، اور مسلمان صرف ایک۔ علاقہ طبابت میں ۸ ہندو سول سرجن
ہیں، مسلمان کوئی نہیں۔ اور ۳۴ ہندو اسٹنٹ سرجن ہیں اور مسلمان ایک-۱۷۹ ہندو،
اسپتال اسٹنٹ ہیں، اور مسلمان ۹۔ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں ۲۴ ہندو ہیں، اور ایک مسلمان۔
اب مدراس کا حال سنئے کہ وہاں کل عہدہ دارے مندرجہ گزٹ پر ۵۰۹ ہندو اور ۴۳
مسلمان۔ اب ان کی تفصیل پر لحاظ فرمائیے، ۱۱۰ ہندو منصف ہیں اور ایک مسلمان۔ ۴۸ ہندو

سب آرڈینٹ جج ہیں، اور ایک مسلمان۔ ۱۴۳ ہندو تحصیلدار، اور ۹ مسلمان۔ ۸ ہندو ڈپٹی کمشنر ہیں اور ۵ مسلمان۔ علاقہ تعلیمات میں ۹۰ ہندو پروفیسر اور انسپکٹر ہیں اور مسلمان صرف ۴ اس سے بڑھ کر یہ امر قابل لحاظ کے ہیں کہ علاقہ ہندوستان، پیمائش، پوسٹ، ڈاکخانہ، فنانشل، عدالتہائے خفیہ، جیل، اور رجسٹریشن، سے مسلمان بالکل خارج ہیں۔ حالانکہ ان صیغوں میں ۸۲ ہندو ہیں *

آسام اور برہما کا ذکر کرنا ہی فضول ہے، وہاں سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمان باوجود یکہ تعداد میں زیادہ ہیں مگر ملازمت سرکاری سے بالکل خارج۔ آسام میں ۱۹۸ ہندو ملازم ہیں اور صرف ۱۶ مسلمان۔ حالانکہ مسلمان بنگالہ ہندوؤں کے فیصدی ۳۰ ہیں۔ برہما کا بھی یہی حال ہے کہ ہندو ۴۵ ملازم ہیں اور مسلمان صرف ۱۸۔ حالانکہ بنگالہ ہندوؤں کے آزدے مردم شماری کے مسلمانوں کی نسبت فیصدی ۶۵ ہے *

سندھ میں ۲۰۶ ہندو ہیں اور ۱۱ مسلمان۔ غالباً آپ اس کو سن کر البتہ خوش ہونے لگیں گے، مگر اول تو مسلمان وہاں ہندوؤں سے بہت زیادہ ہیں، دوسرے یہ کہ یہ ترقی صرف ذلیل ملازمت میں ہے۔ اس لئے کہ وہاں کی سول سٹ میں چیف کانسلبل بھی داخل ہیں، اور یہی ان کی ترقی ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ چیف کانسلبل کے عہدہ پر ہندو صرف ۱۲ ہیں اور مسلمان ۶۱۔ اگر یہ ۶۱ ایک سو چودہ میں سے خارج کر دئے جاویں، تو باقی عہدوں پر مسلمان صرف ۵۳ رہتے ہیں۔ باقی عہدوں کا یہ حال ہے کہ جو ڈیشل علاقہ میں ۱۶ ہندو، جج وغیرہ کے عہدوں پر ہیں اور مسلمان صرف ایک۔ مانگڈاری کے علاقہ میں ۱۱۸ ہندو ہیں اور ۲۵ مسلمان، سنٹرل پرائس کا حال البتہ اچھا ہے کہ وہاں ۴۹۶ ہندو ہیں، اور ۲۹۵ مسلمان، جس میں اکثر اسٹنٹ کشتری کے عہدہ پر، ۵۸ ہندو ہیں اور ۶ مسلمان۔ تحصیلدار پر ۲۸ ہندو ہیں اور ۱۵ مسلمان *

پنجاب کا حال سنئے، کہ وہاں ۳۱۲ ہندو عہدہ دار ہیں اور ۱۶۲ مسلمان، جس میں ۶۸ ہندو منصف ہیں اور ۱۵ مسلمان۔ اور ۲ ہندو عدالت خفیہ کے جج ہیں اور ایک مسلمان۔ ۴ ہندو، ایکٹر اسٹنٹ کشتری ہیں اور ۳ مسلمان۔ اور ۶ ہندو تحصیلدار ہیں اور ۴ مسلمان۔ ۱۹ ہندو، پوسٹ ماسٹر ہیں اور ۳ مسلمان۔ ۷ ہندو سپرنٹنڈنٹ جیل ہیں اور مسلمان کوئی نہیں۔ اور علاقہ تعلیمات میں ۱۴ ہندو ہیں اور ایک مسلمان۔ البتہ اسٹنٹ کشتری ایک ہندو ہے اور ۳ مسلمان۔ اور ۶ ہندو کٹر اسٹنٹ ہیں اور ۵ مسلمان۔ مگر لحاظ تعداد مردم شماری کے مسلمان بہ نسبت ہندوؤں کے ۵ فیصدی ہیں۔ اس لئے چاہئے تھا، کہ ہندو

سے اُن کی تعداد زیادہ ہوتی۔ حالانکہ اُن کی تعداد بمقابلہ ہندوؤں کے صرف ایک تائی ہے۔
اب ممالک مغربی و شمالی و اوڈھ کا حال سنئے۔ ۶۶۰ ہندو عہدہ دار ہیں اور ۳۹۹ مسلمان
جن میں سے ۶۵ ہندو نصف ہیں اور ۳۸ مسلمان۔ اور ۱۶ ہندو سب آرڈینٹ جج ہیں اور
۱۴ مسلمان۔ ۳ ہندو عدالت خفیہ کے جج اور ایک مسلمان ۳ ہندو ڈسٹرکٹ شش جج ہیں
اور ایک مسلمان۔ مگر جانتے جھڑپٹ ہندو ۳ ہیں اور ۵ مسلمان۔ ۱۰۵ ہندو ڈپٹی کلکٹر ہیں اور
۴ مسلمان۔ اور ۱۰۶ ہندو تحصیلدار ہیں اور ۱۴۹ مسلمان۔ ۵۳ ہندو سپرنٹنڈنٹ اور انسپکٹر
ڈاک خانوں کے ہیں اور ۸ مسلمان۔ اور ۳۶ ہندو پوسٹ ماسٹر ہیں اور ۲ مسلمان۔ صیغہ تعلیمات
میں ۳۶ ہندو ہیں اور ۵ مسلمان۔ ۲ ہندو سول سرجن ہیں مسلمان کوئی نہیں۔ ۶۵ ہندو اسسٹنٹ
سرجن ہیں اور ۶ مسلمان۔ اور پبلک ورکس میں ۳۵ ہندو ہیں۔ اور ۸ مسلمان۔ اگرچہ بمقابلہ
ہندوؤں کے ۳۹ فیصدی مسلمان اس پراونس میں نوکریں۔ مگر جب کہ یہ دیکھا جاوے۔ کہ
ملازم پیشہ شریف خاندان کے مسلمان ۳۶ برس پہلے کتنے زیادہ ملازم تھے۔ اور دیوانی عہدوں
پر وہی مامور تھے اور ہندو کاشتکاری پیشہ کس قدر زیادہ ہیں۔ تو یہ نسبت باوجود اس عمدگی
کے، مسلمانوں کی ترقی کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ کم سے کم ہندوؤں کے برابر مسلمانوں کا ملازم ہونا
چاہئے۔ چنانچہ سلا کلینڈ کا لون صاحب نے اپنی اُس ایسیج میں جو ۱۸۹۲ء میں درسنہ
العلوم میں دی تھی، یہ فرمایا تھا کہ، منجملہ اذکنہ جینیوں کے جو گزشتہ ۵ برس کے انتظام کی
نسبت کی گئی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کو نا واجب ترجیح دی ہے اور پچھلے ۵ برس کے اند
۲۶ ڈپٹی کلکٹر مقرر کئے گئے ہیں جن میں سے ۱۶ ہندو تھے اور ۱۰ مسلمان۔ ۵ شخص تحصیلدار
مقرر کئے گئے، جن میں سے ۴ مسلمان تھے اور ۶ ہندو۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ ان ملازم
میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ اس تعداد کے لحاظ سے ترجیح یا عہدہ
دیجاوے۔ لیکن اگر ہم کاشتکاروں کے گروہ کو نظر انداز کریں، اور صرف اُن قوموں کا لحاظ کریں
جن کا ان معاملات میں پاس کیا جاتا ہے تو یہ سب نامناسبیت فوراً دور ہو جاتی ہے۔

صاحبو! اب اس وقت صیغہ ملازمت میں جو حالت مسلمانوں کی ہے اُس کی پوری
اور سچی صورت آپ کے سامنے ہے، اور اپنی آنکھوں سے آپ اُن کو دیکھ رہے ہیں ۵۰۱۵
ہندو عہدہ دارے مندرجہ گزٹ پر مامور ہیں، اور ۱۲۴۱ مسلمان۔ اور جو تفصیل صوبہ دارین نے
بیان کی اُس سے غالباً آپ یہ سمجھ گئے ہونگے، کہ جن صوبوں اور جن عہدوں میں مقابلہ کا امتحان
ہوتا ہے، یا جن میں قانونی اور انگریزی کی کیا قوت زیادہ ضروری ہے، انہیں عہدوں پر مسلمان
کم اور نہایت کم ہیں اور جو عہدے گورنمنٹ کے اختیاری ہیں وہاں ان بقیہ مسلمانوں کو نسبت

کچھ مل جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت جوڈیشل و ڈپارٹمنٹ سے بخوبی ہوتا ہے کہ ان عہدوں میں قانونی لیاقت اور امتحان شرط ہے اُسی میں ہمارے بھائی بہت کم نظر آتے ہیں۔ چنانچہ کل ہندوستان میں عدالت کے عہدوں پر ۵۵ ہندو مقرر ہیں اور ۱۰۴ مسلمان۔ ان میں سے اگر مالک مغربی کے ۵۵ اور پنجاب اور سنٹرل پراونس کے ۵۱ نکال دئے جاویں۔ تو باقی صوبوں میں مسلمانوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ کیا اس سے زیادہ کوئی شہرناک، اور دل کو صدمہ دینے والی کوئی چیز ہوگی، کہ بنگال میں ۳۳۹ ہندو اس صیغہ میں ہیں اور صرف ۵ مسلمان۔ اور بمبئی میں ۱۷۱ ہندو اور صرف ۴۴ مسلمان۔ اور مدراس میں ۱۳۲ ہندو اور صرف ۲ مسلمان۔ غرض کہ مسلمانوں کی معاش کا بڑا ذریعہ یعنی ملازمت سکری باقی نہ رہا اور اُس میں اُن کی تعداد اس قدر کم ہے کہ اُس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ باقی رہی تجارت، اُس سے شریف مسلمانوں کو پہلے بھی عارتھا، اور اب بھی، اِس کو چھپ میں نہ اول اُن کا گذر ہوا تھا، نہ اب کہیں نظر آنے ہیں۔ اور یکجز ہندی نسل مسلمانوں کے کسی شہر یا کسی مٹی یا کسی گاؤں میں مسلمان تاجر نہ دکھائی دیں گے۔ ملازمت اور تجارت کے بعد اگر زمینداری پر نظر کیجئے، تو اُس کا حال یہ ہے، کہ بمبئی اور مدراس میں رعیت داری بندوبست ہے، وہاں سوائے لٹگوٹ بند کاشتکاروں کے کوئی زمیندار نظر ہی نہیں پڑتا، والا وہ لوگ جو جاگیردار اور زمیندار والے کہلاتے ہیں، اور کچھ حصہ میں مدراس کے زمیندار بھی۔ مگر قریباً وہ کل کے ہندو ہیں۔ بنگال کے صوبہ میں مسلمان بجاو زمینداری کے ہندوؤں کے مقابلہ میں کچھ نسبت نہیں رکھتے، باقی رہا صوبہ، اور پنجاب، اگر ۳۴ برس پہلے کی حالت پر نظر کی جاوے تو بلاشبہ وہی تشریل پائے گا جو اور صیغوں میں ہوا ہے۔ سینکڑوں مسلمان ایسے ہیں، کہ صاحب جائداد ہو، اور زمیندار یاں رکھتے تھے، مگر فضول خرچی اور غفلت سے قرضدار ہوئے، اور اپنی جائدادیں محتاجوں کے قبضہ میں دیدیں۔ غرض کہ ہر صورت سے مسلمان ایسی ذلیل حالت میں ہیں کہ اگر چند روئے اُن کی خیر نہ لی گئی تو آئندہ اُن کی پیاری لاعلاج ہو جاوے گی، غرض کہ پہلے امر نصیہ طلب کا میں یہ فیصلہ کرتا ہوں، کہ ہم صرف قوم کے قائم رہنے پر تعلق نہیں ہیں، بلکہ ہم اُس کا معزز قوم ہونا چاہتے ہیں، اور اس وقت اُس کا نام معزز قوموں کی فہرست سے خارج ہے۔

اب رہا دوسرا امر کہ ترقی سے کیا مراد ہے، اور کس حالت پر پہنچنے سے اُس کی ترقی سمجھی جاسکتی ہے، اُس کی نسبت میں یہ کہتا ہوں، کہ ترقی سے چاروی مراد اس وقت ترقی حقیقی نہیں ہے، یعنی اُس درجہ پر پہنچنا جو یورپ کے لوگوں اور عیسائی قوموں کو حاصل ہے، اس کا تو وہی خیال کرے، جسے قوم کی محبت نے مجنون بنا دیا ہو، اِس لئے میں اپنے بزرگ سرسید قبلہ کی طرح یہ نہیں کہتا، کہ میں اپنی قوم کو آسمان کی مانند کرتا چاہتا ہوں اور اُن ستاروں کو دکھیتا چاہتا

ہوں، جوان میں چمک رہے ہیں، اور مشوقانہ اذکی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ بلکہ میں اسی پر قانع ہوں کہ وہ زمین ہی پر رہیں، مگر وہ تاریکی جس نے اُسے گھیر لیا ہے دُور ہو جاوے، اور اُس کی صورت نظر آنے لگے، اور اپنی موجودہ حالت سے نکل کر اُسی حالت پر پہنچ جاوے، جو ہندوستان کی اور معزز قوموں کی ہے۔ تاکہ آبادی کی مناسبت سے وہ ہر عزت میں اپنا واجبی حصہ حاصل کر سکے اور اعلیٰ درجوں پر جہاں ہندو، پارسی، بنگالی۔ مدراسی پہنچ گئے ہیں وہ بھی پہنچ جاوے۔
 آپ رہائشہ الامرا کے اعلیٰ تعلیم و تربیت سے کیا مراد ہے، اور بغیر اُس کے وہ حالت جس کو ترقی کہا جاوے حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں:-

صاحبو! اعلیٰ تعلیم سے مراد یہ ہے، کہ وہ نہ صرف اُن اعلیٰ درجہ کی ڈگریوں کو حاصل کر سکیں جو ہندوستان کی یونیورسٹیوں نے مقرر کی ہیں، بلکہ وہ علم کی حقیقت سے واقف اور اُس کے عمدہ نتائج سے مستفیع ہوں۔ جو لوگ صرف ڈگری حاصل کرنے پر قناعت کرتے اور فقط کتابی تعلیم پاتے ہیں، وہ کتاب کے کیڑے ہوتے ہیں نہ عالم، وہ کتابوں کے لادنیوالے ہوتے ہیں نہ تعلیم یافتہ انسان۔ اعلیٰ تعلیم یہ ہے کہ انسان اُن قوتوں کو اچھی طرح کام میں لاسکے، جو خداوند تعالیٰ نے اُسے اور اک خفائق اور معرفت اشیاء کے لئے دی ہیں۔ تاکہ وہ قادر مطلق کے عجیب اور جبرت انگیز قدرت کے کارخانوں کو دیکھ سکے، اور صانع حقیقی کی عجیب و غریب صنعتوں کو بقدر انسانی طاقت کے سمجھ سکے، وہ خفائق اشیاء کے جاننے کا شائق ہو، اور قادر مطلق کی معرفت کا جو یا۔ اعلیٰ تعلیم مقصود طلب مال نہیں ہے، بلکہ شوق حق اور ذوق علم ہے، تاکہ انسان اپنا وقت اور اپنی عقل اور اپنے علم کو کائنات عالم کے حالات و ریافت کرنے، اور بنی نوع انسان کے فائدہ پہنچانے میں صرف کرے، اور جو علم کے خزانے زمانہ کے دانشمند جمع کر گئے ہیں، اور جو بیش بہا ترکہ اُن کے بزرگ چھوڑ گئے ہیں اُن کو کام میں لاوے تاکہ اس دنیا میں اُسے وہ خوشی اور فراخ خاطر نصیب ہو، کہ جسے کوئی چھین نہ سکے، اور عاقبت میں خدا کی خوشنودی و ابدی و ابدی راحت حاصل ہو۔ اور یہی وہ تعلیم ہے، جو تمہارے بزرگوں نے حاصل کی تھی، اور جس کے حاصل کرنے سے وہ دنیا کے اعلیٰ اور معزز ترین لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے، اور جن کے نام اب تک عزت اور زیرگی سے ساری دنیا میں لئے جاتے ہیں۔ اور جس کے سبب سے آج یورپ کے لوگ تمام دنیا کے انسانوں کے خیالات کی رہنمائی کر رہے ہیں اور جن کے ادنیٰ نتیجوں میں سے وہ فائدہ لے رہے ہیں جو بنی نوع انسان کو اُن کی عجیب و غریب ایجادوں اور صنعتوں سے پہنچ رہے ہیں۔ اور یہی وہ تعلیم ہے جس سے انسان نہ صرف بلحاظ خیالات کی عمدگی اور اخلاقی خوبیوں کے حکیمانہ زندگی اور فلسفیانہ طرز اختیار کرتا ہے، بلکہ معاشرت اور دنیا دارانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی اُس سے بڑی مدد ملتی ہے، اُس سے بہت بڑھتی

ہے، اولوالعزمی پیدا ہوتی ہے، ناموری کا شوق ہوتا ہے، دولت اور عزت کے حاصل کرنے میں تمام
 شکلیں سامان معلوم ہوتی ہیں۔ انسان محنت کا عادی، اور مصیبت کے اٹھاتے میں مشاق ہوتا ہے
 یہاں تک کہ اس کی محنت کی کتابیں ناممکن کا لفظ نظر ہی نہیں پڑتا۔ یہی وہ تعلیم ہے، جس کے نتیجے
 ہم اپنی ہیکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کہ وہ اپنی ہمت اور اولوالعزمی سے کسی چیز کو شکل نہیں سمجھتے،
 نہ کسی خاص چیز کے پابند رہتے ہیں۔ اگر ایک چیز میں ناکامیاب ہوئے۔ تو فوراً دوسری چیز پیدا کر لیتے
 ہیں۔ اور اگر ایک پیشہ میں گزر کی صورت دیکھی، تو دوسرا کام کرنے لگتے ہیں۔ نہ کسی خاص ملازمت
 کے پابند ہیں، نہ کسی خاص پیشہ اور حرفہ کے، ان کی ہنرمندی اور استعداد اور چالاکی اعلیٰ تعلیم کے
 سبب سے ایسی بڑھ گئی ہے، کہ وہ ناکامیابی کا نام تک نہیں جانتے۔ اور بقول آئینریبل
 اسٹھولرسن وائس چانسلر یونیورسٹی کلکتہ کے ان کی تعلیم نے تمام سختیوں کو دور نہیں کیا، تاہم
 اتنا خفیف کر دیا ہے کہ وہ سختی قابل برداشت ہو گئی ہے، اور ان کو اس بات پر قانع نہیں رکھا کہ
 صرف ان پیشوں کے پابند رہیں جو ان کے باپ دادا کیا کرتے تھے۔ انہوں نے وہ نئی شایع تجارت
 اور حرفہ کی اختیا رکیں جن کو ان کے بزرگ پسند نہ کرتے۔ اگر ان کو خشکی میں جگہ نہ ملی، انہوں نے
 سمندر کی نوکری اختیار کی۔ اگر ان کو گھر میں کام نہ ملا، قطب شمالی اور جنوبی تک مسافرت کی تلاش میں
 چلے گئے۔ ہزاروں نوجوان عالی خاندان پہاڑوں پر چار اور قہوہ کی زراعت کرتے ہیں۔ کینیڈا کے
 جنگل صاف کر رہے ہیں۔ آسٹریلیا میں بکریاں اور خرباں امریکہ کے میدانوں میں مویشی چرا رہے ہیں
 چین کے کارخانہ سائے تجارت میں کام کرتے ہیں، اور نام کے باغوں میں کاشتکاری سے عیش
 پیدا کر رہے ہیں۔

صاحبو! مگر ہم کو اس قسم کی اعلیٰ تعلیم کا خیال کرنا، اور اپنی قوم کی موجودہ حالت سے اس
 کی امید رکھنی نادانی ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ سوائس یورپ کے ہندوستان کی اور قوموں نے
 بھی ابھی یہ تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ بڑی سے بڑی خواہش اس وقت ہماری یہ ہے، کہ وہ اس قسم
 کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیں، جس سے وہ مش اور اپنی بوطن قوموں کے، ان عزتوں کے مستحق ہو
 جو انہوں نے حاصل کر لی ہیں۔ وہ انگریزی کے لٹریچر میں ایسے ماہر ہو جائیں، کہ اپنے خیالات
 عمدگی سے اس زبان میں ادا کر سکیں، فصاحت اور بلاغت سے تقریر کرنے لگیں۔ عمدہ اخبار
 کے لائق اڈیٹر ہو سکیں۔ قانون میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کر لیں، معزز عہدوں کے قابل
 ہو جائیں۔ گورنمنٹ کو ملکی معاملوں میں صلاح دی سکیں، اپنی قومی حاجتیں گورنمنٹ کے سامنے
 عمدگی سے پیش کر سکیں، زمانہ کے حالات اور ملکی انقلابات سمجھنے کے لائق ہو جائیں، اور وہ
 حقوق جو دوسری قوموں کو حاصل ہیں ان کو بھی حاصل ہوں۔ وہ بھی علمی جلسوں میں شریک ہو سکیں

وہ بھی عزت کے مقامات میں دکھائی دیں، وہ بھی حکومت کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے نظر آویں۔
 اس کے سوائے بحیثیت مسلمان ہونے کے اُن کو ایسی تربیت ہو، کہ اپنے مذہب پر ثابت قدم ہوں۔ اپنی قوم کے ساتھ محبت رکھیں۔ اپنے خاندان اور وطن کی انگلیوں میں معزز ہوں، قومی بہبود اور قومی ترقی کا خیال ہو، اپنے بھائیوں کے فائدہ پہنچانے کے شائق، اور اپنی قوم کی عزت بڑھانے میں سرگرم ہوں، غرض کہ اعلیٰ تعلیم اور تربیت پانے کا خلاصہ یہ ہے، کہ ایسے لوگ ہم مسلمانوں میں طیار ہو جائیں کہ وہ انسان بھی ہوں اور مسلمان بھی۔ اُن کے دماغ میں علمی خیالات ہوں، اُن کے دل میں عمدہ اخلاق، وہ پسندیدہ عادتوں کے عادی ہوں، تحمل، بردباری، انتانت، سنجیدگی، ممدوح خود داری، شریفانہ آزادی، اور بہادرانہ مستقل مزاجی کی صفیتیں اُن میں موجود ہوں۔

تا کہ جب وہ دنیا کے سامنے آویں، اور اپنی ذات اور اپنے خاندان اور اپنی گورنمنٹ کے کام کرنے کے لائق ہوں، تو وہ اُس کی لیاقت رکھتے ہوں اور وہ اپنے نامور بزرگوں کی لائق اولاد، اور اپنی مشہور قوم کے معزز عہدہ اور اپنی آزاد گورنمنٹ کے متقدم شیر ہوں۔ اگر مسلمانوں کو اس قسم کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو صرف یونیورسٹی کی ڈگری پالینا، اور بی۔ اے اور ایم۔ اے ہو جانا کافی نہیں ہے، نہ وہ مقصود جو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے ہے، حاصل ہو سکتا ہے۔ کیا آپ ایسے سینکڑوں اور ہزاروں آدمی نہیں دیکھتے، جو یونیورسٹی کے اعلیٰ درجہ کے نمغے سینہ پر لگا لئے پھرتے ہیں اور جو کالج کی تعلیم کے سب درجے طے کر چکے ہیں۔ مگر کوئی انہیں تعلیم کا اُن کے دل و دماغ پر معلوم نہیں کرتا اُس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہندوستان میں سوائے کتابوں کے پڑھا دینے، اور طالب علم کے حافظہ میں واقعات کا ایک کافی ذخیرہ امتحان پاس کرنے کے لئے جمع کر دینے کے، کوئی دوسرا ایسا انتظام نہیں ہے، جس سے علم کا انثر اُن کے دل پر ہو، اور جس سے طالب علموں کے خیالات اور حوصلوں اور خواہشوں اور ارادوں اور کاموں سے کچھ بھی نشانی اُس تعلیم کی پائی جاوے، جو ان کو انسان بنانے کے لئے دیکھائی ہے۔ بلکہ ایسی کتابی تعلیم اخلاق، مذہب، اور عمدہ حوصلوں کو اور خراب کر دیتی ہے آپ ذرا اُن تقریروں کو دیکھئے جو سال بسال یونیورسٹی کے چاند سالانہ جلسوں میں کہا کرتے ہیں، اور یہ اختلاف الفاظ، اس ناقص تعلیم کی برائیاں اور مکمل علم کی نصیحت، اور اس بات پر افسوس کرتے رہتے ہیں، کہ یونیورسٹی کی تعلیم نے ملک میں صرف ایک کثیر تعداد ایسی نیم تعلیم یافتہ نوجوانوں کی پھیلا دی ہے، جن کا علم بالائی ہے، جن کی خود بینی بید ہے، جو تقریر میں لسان ہیں، لیکن اُن کو ان الفاظ کے معنی جب تک استعمال کرتے ہیں جن فقرات کو وہ دہراتے ہیں، اُن کا مطلب بھی ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہے اور جو تعلیم و سوچ و معاش حاصل کرنے کے کوئی دوسرا فائدہ نہیں سمجھتے، اور معاش کو بھی بھڑکائی ملازمت کے اور کسی جگہ تلاش نہیں کرتے، اور اسی علم کی تکمیل کی نصیحت کے ساتھ وہ اس کا بھی قرا

کرتے ہیں، کہ کالج اور سرکاری یونیورسٹیاں ایسی کامل تعلیم دینے میں قاصر ہیں۔ چنانچہ ایک سالہ طلبہ میں یونیورسٹی کے ہنر اسکولسی دیر سے وگورنر جنرل ہند نے اول اعلیٰ تعلیم کا مقصد بیان فرمایا، اور یہ کہا کہ میرے نزدیک اعلیٰ تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں ہے، کہ طالب علم کے دماغ میں بہت سی باتیں جمع ہو جاویں، اور وہ مختلف علوم کی نسبت لسانی کے ساتھ گفتگو کرنے کے لائق ہو جاوے، یا یہ کہ وہ اپنی یونیورسٹی کے تمام امتحانات کو بھی پاس کرے۔ بلکہ اُس کا مقصد اُن مختلف فنون کو ترقی اور استحکام دینا ہے جو اُس کو عطا کی گئی ہیں۔ اگر اس بات میں میری رائے صحیح ہے، تو جس چیز کی سب سے پہلے تعلیم میں ضرورت ہے، وہ علم کا کامل ہونا ہے، اور اسی موقع پر ہنر اسکولسی نے یہ بھی صفا فرمادیا، کہ کامل تعلیم کے وسیلوں کے ہینا کرنے میں گورنمنٹ قاصر ہے، اور اُس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ بغیر مذہبی تعلیم کے کوئی تعلیم کامل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ گورنمنٹ ہند پر یہ بات واجب اور لازم ہے، کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ہندوستان کے باشندوں کے مذہب یا مذہبی خیالات میں، علانیہ یا دیر پردہ دست اندازی کا ہونا منظور ہو، لیکن جو قید اس طرح پر ہماری تعلیم کے مقاصد کی نسبت قرار دی گئی ہے، اُس کے نقص ظاہر کرنے سے میں باز نہیں رہ سکتا، کیونکہ یہ ایک میرے دلی اختلافات میں سے ہے۔ کہ جس انتظام تعلیم، میں مذہبی تعلیم اور تربیت کا کچھ بند نہ ہو، وہ یقیناً ناقص اور خیر کٹل ہے۔ اور پھر یہ فرمایا کہ جس چیز کو آج کل کے زمانے میں خالص دنیوی تعلیم کہتے ہیں، وہ اس لفظ کے سبب سے بڑے اور عمدہ ترین معنوں میں کامل ترین نہیں ہے۔

صاحبو! جو کچھ ہنر اسکولسی نے فرمایا ہے تمام اعلیٰ درجہ کے لوگوں کا وہی خیال ہے، اور نہ صرف یورپین لوگوں کا، بلکہ ہماری قوم کے آدمیوں کا بھی جنہوں نے تعلیم کے مسئلہ پر بہت غور کیا ہے، اور جنہوں نے ولایت کی تعلیم کو دیکھا ہے، اگر آپ انگلستان جاویں، اور وہاں کی تعلیم دیکھیں، اور اُس کے اصول اور نتائج پر غور کریں، تو آپ کو اس امر کے خیال کرنے میں ذرا تاثر نہ ہوگا کہ جو تعلیم ہندوستان میں دی جاتی ہے، وہ تعلیم نہیں ہے، بلکہ انسان کو کتا بوں کا لادنے والا بنایا جاتا ہے۔ اور اُس کا سبب جیسا سر چارلس کسل سو بیٹ صاحب نے فرمایا ہے یہ ہے، کہ پورے ملکوں میں جہاں کہہ سوسائٹی نے، قدرتی بالیدگی کے ساتھ ترقی کی ہے، اور جس پر خارجی اثرات کا زور نہیں ڈالا گیا ہے، ایسے اسٹیبلشمن اس ضرورت کے پورا کرنے کے لئے قائم کئے گئے ہیں، کہ اُن کو صرف سرکاری ملازمت کے واسطے نہیں، بلکہ عالمیہ پیشوں میں پبلک کی خدمت کرنے کے لئے تعلیم یافتہ آدمی بھی بھیجے جاویں، علاوہ بریں بہت سے شخصوں نے صرف علم کی خاطر اس کی جستجو کی ہے، اور بہت شخصوں نے عمدہ تعلیم کے حصول کی کوشش بطور جزو ایک ایسے سامان کے کی ہے، جو ہر ایک شخص کو گو اُس کا پیشہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، اپنے سفر زندگی میں اپنے

پاس ہٹا کرنا لازم ہے، لیکن اس ملک میں جہاں کہ تحریر کا خاصکر خارجی ذریعہ سے ہوتی ہے، جہاں اعلیٰ درجہ کی تعلیم لوگوں کو قریباً مفت دی گئی ہے، جہاں کہ روزگار کا میدان لوگوں کی پست حالت کی وجہ سے نہایت محدود ہے، اور جہاں کہ علم اپنے خاص فائدہ کی غرض سے تلاش بھی کیا جاتا ہے، تو وہ اس قسم کا علم نہیں ہے، جس کے سکھانے کا ہمارے کالج نے ذمہ لیا ہے، اس قسم کے محتاج طالب علموں کی جماعت کے پیدا کرنے میں صاف صاف برا خطرہ ہے جن کی تعداد باوجود اس کے کہ وہ دنیا میں اپنی وجہ معاش پیدا کرنے کے واسطے کافی تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔

پس اسے صاحبو! اعلیٰ تعلیم سے مراد ہے کہ ہم کتابوں کے بوجھ اٹھانے والے نہ بنیں بلکہ انسان بنیں اور اسی کے ساتھ مسلمان رہیں، اور علم کو علم کے لئے حاصل کریں، اور اس کے عمدہ نتیجوں سے منتفع ہوں، اور اسے میرے بزرگوں کی نسبت ایسی تعلیم کے قوم کی ترقی کی امید کرنا خیال باطل ہے۔

صاحبو! اب رہا چوتھا اور تصفیہ طلب کہ درستہ اعلوم اعلیٰ تعلیم و تربیت کے حاصل کرنے کا مسلم ذریعہ، اور دیگر مسلمانوں کے لئے عمدہ نمونہ ہے یا نہیں۔

اس کی نسبت میری یہ رائے ہے کہ درستہ اعلوم اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا ایسا مسلم ذریعہ ہے کہ جس سے بڑھ کر ہندوستان میں ہونا درحقیقت ناممکن ہے، اور دوسرے مسلمانوں کے لئے ایسا عمدہ نمونہ ہے جس سے بہتر ہونا تیس میں نہیں سکتا۔ اگر قوم کی ترقی سے مراد یہ ہے کہ اُسے اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا شوق ہو، اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرے۔ اُس کے لڑکے یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریاں پاویں، اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ولایت جا کر اپنی تعلیم کی تکمیل کریں، وہاں کی یونیورسٹیوں کے درجے حاصل کریں، وہاں جا کر قانون سیکھیں، اور بعد کا میابی کے گورنمنٹ کی نظر میں معزز سمجھے جائیں، سرکار کو اُن کی وفاداری پر بھروسہ ہو، اور اُس کے ساتھ مذہب اور قومیت کا خیال بھی اُن میں پایا جاوے، تو میں کہہ سکتا ہوں کہ، ہمارا یہ کالج بلاشبہ قومی ترقی کا مسلم ذریعہ ہے اور نیز اگر قومی ترقی سے یہ مقصود ہے، کہ خاص قوم کا کوئی ایسا انسٹیٹیوشن موجود ہو جو اُن اصول پر قائم کیا گیا ہو، جن پر ہنگستان کے انسٹیٹیوشن قائم ہیں، اور نیز وہ اُن خیالات پر مبنی ہو جن پر ایسے بڑے انسٹیٹیوشن انگلینڈ میں بنائے جاتے ہیں، اور نیز اُس کا قائم کرنا فی نفسہ قوم کی عزت اور شہرت کا سبب ہو، اور اُس سے قوم کی عالی دماغی، فیاضی، علم کا شوق، اور شائستگی پھیلانے کی رغبت ظاہر ہو۔ اور نیز اس سے اُن نتائج کے حاصل ہونے کی امید ہو جن سے اُن کے تعلیم پانے والے، اپنی سوسائٹی کے عمدہ ممبر اور اپنی گورنمنٹ کے معتد مشیر اور اپنی سرکار کے پورے وفادار ہوں۔ تو میں یاد آ رہے ہوں کہ ان تمام باتوں کے لحاظ سے یہ کالج قومی ترقی کا ذریعہ ہے، اور

رویت، اور شہادت، دونوں سے اس کا کال ثبوت ہے، اور یہ ایک اور گورنمنٹ دونوں اس بات کے مقرر ہیں حقیقت میں اس کالج نے ابن باتوں کے لحاظ سے وہ وقعت یہ ایک اور گورنمنٹ کے دلوں میں پیدا کی ہے کہ اُس کی نظیر ملتی شکل ہے۔ یہ ایک کا بھروسہ اور اعتماد اس وقت آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور یہ بولتی ہوئی سنیں یہ ایک کے اعتماد کی آپ کے سامنے ہیں اور وہ بھی نمونہ ہیں، بلکہ سیکڑوں، اور وہ بھی نہ فقط ایک ضلع یا قسمت یا ایک صوبہ کی بلکہ تمام ہندوستان کے صوبوں کے طالب علم، اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔ اور گورنمنٹ کا بھروسہ جو کچھ اس کالج پر ہے، اُس کا اظہار مختلف دسیراؤں اور متعدد لغٹ گورنمنٹ کے اس طویل پر ظاہر کیا ہے کہ جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ اس کالج کے احاطہ میں آکر فحشوڑی دیر کے لگے ایشیائی شاعر بن گئے تھے۔ اس لئے کہ جن خیالات معمولی یورپین خٹلمین کے مسلمانوں اور اُن کے کاموں کی نسبت ہیں، اور جن کو دوسرے موقع پر انہوں نے ظاہر کیا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کام کو مسلمانوں کے بڑا نہ کہنا گویا بہت بڑی تعریف ہے، نہ یہ کہ ایسی تعریف کرنی، جس کے دیکھنے سے ظہوری اور آنوری پیدا آتے ہیں۔

صاحبو! اس کالج کا جو نتیجہ اب تک ظاہر ہوا، اور جس سے اس بات کا ثبوت ہو کہ اُس نے کہاں تک ترقی کی۔ اُس میں کتنے طالب علم داخل ہوئے، اُس میں کتنے طالب علموں کے ڈگریا پائیں، اور کتنے ولایت گئے۔ علاوہ اسکے اس کالج کے مسلمان طالب علموں کو دوسرے کالجوں کے ساتھ جو اس صوبہ میں ہیں کیا نسبت ہے۔ ایک ایسا امر ہے جس کے لئے ہمیں اٹھارہ برس پیچھے جانا، اور دہائی سے پھر چلتا پڑے گا تا کہ معلوم ہو، کہ شہادہ سے اب تک اس کالج نے کیا نتیجہ دکھلائے اُس کا مختصر حال یہ ہے۔

۲۴۔ مئی ۱۹۰۷ء کو کالج کھولا گیا۔ اور یکم جون ۱۹۰۷ء سے اسکول کی پڑھائی شروع ہوئی اور یکم جنوری ۱۹۰۸ء سے کالج کلاس قائم ہوئی۔ اور یکم جنوری ۱۹۰۸ء سے فرسٹ آرٹس کے امتحان تک اور یکم جنوری ۱۹۰۹ء سے بی۔ اے کلاس کے امتحان تک اور یکم جنوری ۱۹۱۰ء سے قانونی امتحان میں انیلیٹ ہو گیا اور ۱۹۱۰ء میں لا کلاس کی ایل ایل بی ڈگری کے امتحان تک الہ آباد یونیورسٹی سے متعلق ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں ۶۵ مسلمان اسکول کلاس میں داخل ہوئے اور آخر ۱۹۱۰ء میں کل تعداد طالب علموں کی ۳۵۹ تھی جس میں سے ۳۰۰ مسلمان تعلیم پاتے تھے۔

۱۹۹ اسکول کلاس میں ۱۰۱ کالج کلاس میں۔ منجملہ ان طالب علموں کے ۲۱۸ مالاک مغربی و شمالی کے رہنے والے ہیں جو ۲۳ مختلف اضلاع سے آئے ہیں۔ ان میں سے ۶۰ کالج کلاس میں پڑھتے ہیں، ۱۵۸ اسکول کلاس میں اور ۸۷ پنجاب کے رہنے والے ہیں جو میں ضلع

سے آئے ہیں ان میں ۴۵ کالج کلاس میں پڑھتے ہیں، ۳۳ اسکول میں اور آؤر ۸ اسکول کے طالب علم بنگال کے رہنے والے ہیں۔ اور ۸ راجپوتانہ کے اور ۶ حیدرآباد اور اندور کے اور ۵ سنٹرل پراونس کے اور ۲ بمبئی ۲ برہما اور بلوچستان کے اور لا کلاس میں ۶۹ طالب علم داخل تھے۔ ۳۲ مسلمان اور ۳ ہندو۔ منجملہ ان طالب علموں کے ۲۲۸ مسلمان اور ۳ ہندو پور تھے۔ باقی ڈی اسکا لاس کالج کے طالب علموں میں سے ۱۳ طالب علم ہیں جنہوں نے انگریزی میں تعلیم ختم کر لی ہے اور ۹ طالب علم ہیں جو لندن میں تعلیم پاتے ہیں *

جس طرح طالب علموں کی تعداد قابل اطمینان ہے، ویسے ہی امتحانات کا نتیجہ بھی شفی بخش ہے۔ ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۴ء تک، ۲۳۴ لڑکوں نے انٹریس پاس کیا، جس میں سے ۳۷ ہندو ہیں اور ۳۱ مسلمان ہیں۔ اور ایف۔ اے کلاس میں ۱۳۷ طالب علم اب تک پاس ہوئے جن میں ۳۸ ہندو اور ۹۹ مسلمان ہیں۔ اور بی۔ اے میں ۵۱ پاس ہوئے، ان میں ۱۷ ہندو اور ۳۴ مسلمان ہیں۔ ایم۔ اے کی ڈگری ۵ طالب علموں نے حاصل کی جن میں سے ایک ہندو اور ۴ مسلمان ہیں۔ البتہ لا کلاس میں ابھی مسلمان لائیں۔ ایل۔ ایل کی ڈگری میں صرف ۲ ہندو اور ڈی کورٹ کی وکالت میں صرف ایک ہندو نے ڈگری پائی، اور عدالتہ صلیع کی وکالت میں ۵ نے ڈپلوما پایا، جس میں مسلمان صرف ایک ہے *

اگر مدرسۃ العلوم کے کالج کلاس طالب علموں کا دوسرے کالج کے طالب علموں سے مقابلہ کیا جاوے۔ تو اس کالج کی کامیابی اور زیادہ صاف نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ جتنے مسلمان کل کالجوں میں ممالک مغربی و شمالی کے پڑھتے ہیں، اگر وہ سب ملا کر مدرسۃ العلوم سے مقابلہ کئے جاویں تو حیرت انگیز کامیابی مدرسۃ العلوم کی معلوم ہوتی ہے۔ اسی سال میں ۱۷۱ طالب علم مسلمان دوسرے کالجوں میں پڑھتے ہیں۔ کیننگ کالج مکھنوی میں ۶۱۔ اور میور کالج الہ آباد میں ۵۰۔ اور اگرہ کالج میں ۲۲۔ اور بنارس کالج میں ۲۴۔ اور بریلی کالج میں ۱۱۔ اور میرٹھ کالج میں ۳۔ اور صرف مدرسۃ العلوم میں کالج کلاس میں مسلمان طالب علموں کی تعداد ۱۰۱ ہے *

اب اگر خیال کیا جاوے کہ کیننگ کالج مکھنوی کتنے دنوں سے قائم ہے اور مکھنوی خود کتنا بڑا شہر ہے اور ادھ کے ضلع کے رہنے والوں کو وہاں جانا کس قدر قریب اور باعث آسائش ہے اور ڈگری اسکالر ہونے سے کس قدر ان کو آرام مل سکتا ہے، اور نیز لحاظ اور بوجہ کفایت اخراجات کے کس قدر فائدہ ہے۔ مگر مسلمان طالب علموں کی تعداد اس میں صرف ۶۱ ہے یعنی پورے نصف ہمارے کالج کے طالب علموں کی۔ اور الہ آباد جو کہ گورنمنٹ کانسٹر ہے، اور جہاں میور کالج مشہور کالج ہے اور جہاں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے طالب علموں کا زیادہ دخل ہونا چاہئے مگر وہاں صرف

تفصیلی ریکی مسلمان طلب علموں کا کالج کلاس علیک مدبر ۱۸۹۳ء تا ۱۸۹۶ء

مستفادہ صفحہ ۲۰۷

سے آئے ہیں ان میں ۴۵ کالج کلاس میں پڑھنے والے ہیں۔ اور ۸

درجات	۱	۲	۳	۴	۵
۱۸۷۸					
۱۸۷۹					
۱۸۸۰					
۱۸۸۱					
۱۸۸۲					
۱۸۸۳					
۱۸۸۴					
۱۸۸۵					
۱۸۸۶					
۱۸۸۷					
۱۸۸۸					
۱۸۸۹					
۱۸۹۰					
۱۸۹۱					
۱۸۹۲					
۱۸۹۳					
درجات	۱	۲	۳	۴	۵

طالب علم بنگال کے رہنے والے ہیں۔ اور ۸ سنٹرل پرائنس کے اور ۲ بھٹی ۲ برہما تھے۔ ۳۲ مسلمان اور ۳ ہندو۔ منجھدا تھے۔ باقی ڈی اسکالرس کالج کے طالب علم تعلیم ختم کر لی ہے اور ۹ طالب علم ہیں جو لندن جس طرح طالب علموں کی تعداد قابل ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۴ء تک ۳۳۴ اور ۳۳۵ اور ۳۳۶ مسلمان ہیں۔ اور ایف۔ اے کلاس ۳۸ ہندو اور ۹۹ مسلمان ہیں۔ اور بی۔ اے مسلمان ہیں۔ ایم۔ اے کی ڈگری ۵ طالب مسلمان ہیں۔ البتہ لاکلاس میں ابھی مسلمان ناٹی کورٹ کی وکالت میں صرف ایک ہندو نے ڈپلوما پایا جس میں مسلمان صرف ایک اگر مدرسہ علوم کے کالج کلاس طار جاوے۔ تو اس کالج کی کامیابی اور زیادہ میں ممالک مغربی و شمالی کے پڑھتے ہیں، اگر حیرت انگیز کامیابی مدرسہ علوم کی معلوم کالجوں میں پڑھتے ہیں۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں ۲۲ اور بنارس کالج میں ۲۴ اور مدرسہ علوم میں کالج کلاس میں مسلمان اب اگر خیال کیا جاوے کہ کیننگ

شہر ہے اور ادوہ کے شہزاد کے رہنے ہے اور ڈگری اسکالر ہونے سے کس قدر ا کے کس قدر فائدہ ہے۔ مگر مسلمان طالب علم ہمارے کالج کے طالب علموں کی سادہ اور آبا ہے اور جہاں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جہاں

۵۰ مسلمان ہیں یعنی ہمارے کالج کے طالب علموں سے ایک صف اور پھر جب یہ خیال کیا جاوے، کہ خود ان شہروں کے رہنے والے جہاں کالج قائم ہے اپنے گھر چھوڑ کر یہاں آئے تو اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے اس کالج کی تعلیم اور تربیت کی نسبت عام خیالات کیسے عیہ ہیں اور اُس کی وقعت اور عظمت نے کس قدر لوگوں کے دلوں پر اثر کیا ہے، چنانچہ میں دیکھتا ہوں کہ ۴ طالب علم خود لڑا دے اور ۲ لکھنؤ کے اور ۱۶ میرٹھ کے اور ۷ بریلی کے اور ۱۹ دہلی کے یہاں تعلیم پا رہے ہیں اور پھر یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت جو اس کالج کا عمدہ مقصد ہے۔ بلکہ جس کے لئے یہ کالج قائم کیا گیا ہے روز افزوں ترقی پر ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۸۷ء میں ۲ مسلمان کالج کلاس میں تھے اور اس سال ۱۰۱۔ اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ بجائے ایک کے ۵۰ ہو گئے۔ اور یہ ترقی اگر سال وار دیکھی جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترقی کی رفتار کالج کلاس میں نہایت تیز ہے۔ اس لئے کہ سنہ ۱۸۸۷ء سے کالج کلاس قائم ہوا، جس کو اب تک ۵ برس ہوئے۔ اگر پانچ پانچ برس کی اوسط پر خیال کیا جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۸۷ء سے سنہ ۱۸۹۲ء تک اوسط سالانہ اضافی طالب علموں کا کالج کلاس میں ۸ تھا۔ دوسرے پنج سال میں یعنی سنہ ۱۸۹۳ء سے سنہ ۱۸۹۸ء تک اوسط سالانہ ۲۳۵ تھا۔ اور تیسرے پنج سال میں یعنی سنہ ۱۸۹۹ء سے سنہ ۱۹۰۴ء تک ۴۳۵ تھا یعنی پہلے ۵ برس کی نسبت دوسرے ۵ برس میں بجائے ۸ کے ۲۳۵ اور تیسرے ۵ میں ۴۳۵ ہو گئے۔ اس ترقی کی نسبت مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہند سے اُس کی خود شہادت دی رہے ہیں اور وہ نقشہ (ڈاگرام) جو اس وقت آپ کے سامنے ہے خود ترقی کی اصلی تصویر ہے۔ جسے آپ اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ اصول جن پر انگلستان میں ایسے انسٹیٹیوشن قائم ہوئے ہیں، کیا ہیں، اور ان پر یہ کالج قائم کیا گیا ہے یا نہیں۔ اور کیوں اُس اصول پر قائم کرنے کی ضرورت ہوئی۔ اُس کا حال یہ ہے کہ بڑا اصول ایسے انسٹیٹیوشن کے قائم کرنے کا سیلف ہیلپ ہے یعنی اپنے خرچ سے آپ کام کرنا، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ایک شخص بلکہ وہ ملک یا قوم جس کو اس سے اپنا فائدہ حاصل کرنا ہو اُس کام کے کرنے میں اس طور پر متفق ہو گیا وہ ایک شخص واحد ہے۔ کیونکہ جس طرح انسان باعتبار روح و جسم کے ایک ہے۔ مگر اُس کے اعضا مختلف ہیں، اور گو ہر ایک کا کام جداگانہ ہے، اور اگر فرداً فرداً نظر کی جاوے تو ہر ایک کی بناوٹ، اُس کی صورت، اُس کی غرض، اُس کا جُدا جُدا ہے۔ پھر اُن میں کوئی نازک ہے، کوئی سخت، کوئی اعلیٰ ہے، کوئی ادنیٰ، کوئی بنزدل، بادشاہ کے ہے، کوئی بجائے پیادہ کے، کوئی بطور آقا کے ہے، اور کوئی مثل خدمت گزار کے،

لے ڈان کرام جبرک و کراس پیچ میں ہے متحدہ کاغذ پھپھیا ہوا یہاں لگا دیا ہے۔

مگر ان سب کا مجموعہ انسان ہے، اور انسان کی زندگی اعلیٰ درجہ کی یعنی نہایت تندرستی اور صحت کے ساتھ اسی وقت ہو سکتی ہے، کہ ہر ایک عضو اپنی اپنی خدمت کو اچھی طرح بخلا دے۔ یہ ہی حال قوم کا ہے کہ اس کے افراد کے مجموعہ کا نام قوم ہے، اور اس میں مختلف اقسام، مختلف درجہ، مختلف حالات مختلف درجات، مختلف خیالات، مختلف خواہشوں، مختلف ارادوں، اور مختلف طبیعتوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر سب فکر ایک دوسرے کے شریک اور اپنی اپنی حالت کے موافق قومی مفہد میں مدد کرتے ہیں، قوم کی زندگی اور اس کی صحت قائم رہتی ہے، اگر ان میں اتفاق نہ ہو، اور ایک نے دوسرے کی مدد نہ کی، اور اس غلطی میں پڑ گئے کہ ہر ایک کو اپنا کام کرنا چاہیے، تو قوم کی زندگی میں یہاں ہی خلل آجاتا ہے۔ انسان کی صحت میں اس وقت فرق آتا ہے، جبکہ بیماری وغیرہ سے محض اس کا بیکار اور اپنے کام کرنے سے مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر جس طرح کہ اعضاے رئیس کے بیکار ہو جانے اور اس کے کام نہ کرنے سے زندگی تمام ہو جاتی ہے، اسی طرح جب قوم کے رئیس اور امیر اور دولتمند اور عالم اور وہ لوگ جن کا لوگوں پر قرب و دواب ہوتا ہے، نگتے ہو جاتے ہیں اور اپنے قومی فرض کو ادا نہیں کرتے، اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اپنا کام کرنا چاہیے نہ دوسروں کا، اور اس بات کو بھول جاتے ہیں، کہ قوم کا کام درحقیقت اپنا ہی کام ہے، تو قوم ضعیف ہو جاتی ہے، اس کی قوت، دولت، عزت، میں خلل آجاتا ہے اور مرنے کے قریب ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی نے خیر نہی اور علاج نہ کیا تو مر جاتی ہے۔ پس یہ قانون قدرت ہے، جس کے اصول کو جاہل سے لیکر حکیم تک ہر شخص سمجھتا ہے، مگر خوش نصیب ہیں وہ جو اس پرنسپل کو سمجھتے ہیں، جیسا کہ کسی زمانہ میں ہماری قوم اس پر کار بند تھی، اور اب یورپ اس پر عمل ہو رہا ہے، اور اسی کے سبب سے شفاخانوں اور تیم خانوں اور محتاج خانوں اور کالج اور مدرسوں کا تمام یورپ میں خیال بکھیا ہوا ہے۔ اور ہر قدم پر قوم کی زندگی اور پوری صحت کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ چونکہ اس وقت میری غرض صرف تعلیم سے ہے اس لئے میں اس کی کیفیت عرض کرتا ہوں کہ وہاں کیونکر تعلیم کا ایسا بڑا کوثر قائم ہے۔ اور اپنے قومی کام کو قوم کس طرح انجام دیتی ہے۔ صاحبو، تعلیم تین قسم کی ہے، ایک اونے درجہ کی جیسے ہمارے یہاں کے دیہاتی مدارس، دوسری اوسط درجہ کی، جیسے ہمارے یہاں کے تحصیل اور ضلع کے سکول۔ تیسرے اعلیٰ درجہ کی، جیسے ہمارے یہاں کے کالج۔ ابتداً تعلیم کی امداد میں گورنمنٹ بہت کچھ دیتی ہے، لیکن اعلیٰ درجہ اور اوسط درجہ کی تعلیم کے واسطے وہ کچھ نہیں دیتی۔ بڑی بڑی یونیورسٹیاں جیسے اوکسفورڈ اور کمبریج وہاں قائم ہیں، وہ صرف پرائیوٹ شخصوں کی فیاضی سے قائم کی گئی ہیں، اور جو حال کہ یونیورسٹیوں کا ہے وہی حال انگلستان کے کالجوں اور پبلک سکولوں کا ہے، یعنی پرائیویٹ شخصوں کے قائم کئے ہوئے ہیں اور وہ اس زمانہ سے چلے آتے ہیں۔ جب کہ انگلستان ایسا دولتمند

ملک نہ تھا جیسا کہ وہ آج کل ہے، اور جب کہ انگلستان کے نہایت بڑے بڑے سردار ہندوستان کے زمانہ حال کے بڑے بڑے سرداروں اور زمینداروں کے مقابلہ میں نہایت غریب آدمی ہوتے تھے۔

اے میرے بھائیو! یہ وہ بڑا اصول ہے جس پر وہاں کالج اور مدرسے ہوتے ہیں اور جن میں سو اسی چنڈہ کے، اور بجز پرائیویٹ شخصوں کی مدد کے گورنمنٹ کچھ نہیں دیتی، اور پھر جیسے کچھ اُس کے مصارف ہیں اور جیسے ہتھکنہ نیا در قیام ہیں، آپ میں سے ہر ایک شخص اُس کو جانتا ہے۔ کروڑوں اور لاکھوں روپیہ کے سوا ہزاروں سے تو وہاں کچھ کام نہیں چلتا۔ پھر اتنی بڑی رقبہیں کہاں سے آئیں۔ نہ سرکار نہ صرف میروں سے، بلکہ ہر درجہ اور ہر حالت کے آدمیوں سے، ڈیوٹ سے لیکر گھاس کھونڈنے والے کے چنڈہ سے، اور دس لاکھ روپیہ سے ایک آنہ تک۔ اور اُس ملک میں اس قسم کے کاموں کی اب ایسی عادت ہو گئی ہے، کہ ہر ایک آدمی امیر ہو یا فقیر، بادشاہ ہو یا سپاہی، اپنی عزت اور اپنی انسانیت اس میں سمجھتا ہے کہ وہ قوم کا کچھ کام کرے۔

اے میرے بھائیو! اس طرح پر کام کرنے کو سیلف ہیپ، کہتے ہیں۔ یعنی اپنی آپ مدد کرنا اور یہ وہ اصول ہے جس پر یہ کالج قائم ہے اور یہ وہ تحفہ ہے جو ہمارے سرسید ہمارے لئے لندن سے لائے۔ جب ہمارے حضرت لندن کے جج کو گئے تھے۔

آپ جانتے ہیں کہ جو شخص یورپ کو جاتا ہے اور انگلستان کو دیکھتا ہے اور بڑے بڑے شاپ اور کارخانوں میں جاتا ہے تو وہاں لطیف اور خوشنما اور خوبصورت اور چمکدار اور خوش رنگ لٹجانی والی چیزیں دیکھ کر آدمی کا دل لپچانے لگتا ہے اور بقدر اپنی استطاعت کے بلکہ اُس سے بڑھ کر قرض لیکر اُن چیزوں میں سے کچھ اپنے لئے، کچھ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لئے لیتا ہے۔ ہلے تلے کعبہ جب لایت گئے، حضرت کے ہاتھ میں نہ روپیہ تھا نہ دماغ میں جو امانہ خیال۔ صرف ایک دل تھا قومی محبت کی دولت سے بھرا ہوا۔ اُس سے نہ فریخہ نہ خرید سکتے تھے نہ شیشہ آلات، دل کی دولت دیکر سیلف ہیپ خرید کر کے لائے اور یہاں آکر اُسے اپنے عزیزوں اور دوستوں میں تقسیم کیا۔

دینچ آمدش زماں ہمدوستاں تہی دست رفیق سوسے دوستاں
بل گفت از مصرف آؤدند بردوستاں ارمغانے برند
ورا اگر تہی بود زماں قند دست سخناے شیریں تاز قند ہست
نہ قندے کہ مردم بصورت خورند کہ ارباب معنی بکاغذ برند

پس اے میرے بھائیو! اس کالج کی بڑی خوبی اور بڑی عمدگی یہ ہے کہ وہ سیلف ہیپ کے اصول پر قائم کیا گیا ہے اور اس کی ضرورت قطع نظر اُن باتوں کے جو میں نے اوپر بیان کیں ہندوستان

کے مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ قوی تھی۔ اٹھلے گورنمنٹ سے مسلمانوں کو ایسے کاموں میں مدد مانگنی ویسی ہی شرمناک ہے، جیسے کہ کوئی شخص اپنے بچوں کی امیرانہ خوراک اور شامانہ لباس کا خواہشمند ہو مگر بھیک مانگ کر اپنی خواہش پوری کرنی چاہتا ہو۔

لیکن صاحبو! بھیک لو، لنگڑے، اپاہج، بیماروں کو مل سکتی ہے، مذکر ہٹے کٹے، مسنڈوں کو، ایسے مانگنے والوں کو بھیک کے بدلے گالی اور جوتی ملا کرتی ہے۔ چنانچہ جب کہ ہمارے بھائیوں نے مجبوری یا حسب عادت سکر سے ایسی بھیک مانگی ایسا ہی سخت جواب پایا، اور انصاف کیجئے کہ جب وہ قوم جس کی حکومت ہندوستان پر ہے اپنے ملک میں ایسے کاموں کے لئے روپیہ خرچ نہیں کرتی اور نہ خرچ کر سکتی ہے تو کیا سبب ہے کہ وہ ہندوستان میں ایک کرے اور تمام تندرست صحیح الجسم موٹے تازے جوانوں کو بھیک کے ٹکڑے دیا کرے اور پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ وہ کہاں سے لاکر دے، گورنمنٹ کا خزانہ پبلک ٹریزری ہوتا ہے اور وہ ملک کے لوگوں سے ملک کے کام کے لئے روپیہ وصول کرتے اور انہیں کاموں میں لگاتے ہیں۔ بہت بڑی رقم جو سکر کو وصول ہوئی ہے وہ ان زراعت پیشہ لوگوں سے جو شکل سے اپنی گذر کر سکتے ہیں اور جن کا بڑا حصہ قوتیت اور تدبیر میں بالکل ہم سے جدا ہیں۔ پس کیا سبب ہے کہ غریبوں کا روپیہ امیروں کے کام میں صرف کیا جاوے اور ہندو کاشتکاروں سے ٹیکس لے کر مسلمانوں کے لئے مدرسے خاتقا ہیں اور مسجدیں بنائی جاویں۔

آخر انصاف کرنا چاہئے کہ ایسا مسلمانوں کا کیا حق ہے جس سے گورنمنٹ سے ایسی خواہش کریں۔ بہر حال اس قسم کی شرمناک خواہش کو سرسید نے بھیک مانگنے سے بدتر خیال کیا اور اپنی قوم کی عزت اور شان اور اپنے مقصود اور غرض کے بھی خلاف پایا اور بے شرم اور بے حیا ہونے پر بھی اُس کے ملنے کی امید نہ دیکھی۔ اس لئے وہ التجا جو لوگ گورنمنٹ سے کرتے تھے وہ اُس نے قوم سے کی۔ وہ بھیک جو لوگ گورنمنٹ سے مانگا کرتے تھے، اُس نے اپنی قوم سے مانگی۔ وہ استحقاق جو لوگ گورنمنٹ پر جتاتے تھے اُس نے قوم پر جتایا، وہ دعوے جو لوگ گورنمنٹ پر کرتے تھے اُس نے قوم سے کئے، وہ گالیاں جو لوگ گورنمنٹ کو دیتے تھے اُس نے قوم کو دیں، بہر حال مردانہ وار قوم کا کام قوم سے لینے پر بہت کی کر باندھی اور اپنے ارادہ میں مضبوط ہو کر قوم کے سامنے آیا۔

قوم نے اگرچہ اس بات کو اپنی عادت اور مذاق اور رسم کے خلاف سمجھ کر تعجب کیا اور کچھ توجہ نہ کی۔ بلکہ مخالفت۔ مگر چونکہ آخر قوم مرد گئی تھی، حیا اور شرم کھٹی تھی، نیک اور بد کو پہچانتی تھی اور اُس میں بہت لوگ بہت دالے بھی تھے اور سخاوت اور نیا منی کے عادی، اور علم کے قدردان اور قومی تربیت کے خواہاں۔ انہوں نے اُس کی بات سنی اور اُس کی مدد کی جس کا نتیجہ آپ اس وقت دیکھ

رہے ہیں اور جس وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس کالج کی بنیاد سیلف ہیلمپ پر ہے۔
 صاحبو! اس اصول پر قائم ہونے سے نہ صرف یہ کالج اس درجہ تک پہنچ گیا، بلکہ جو عزت قوم کو حاصل
 ہوئی اور جس عظمت کی نگاہ سے گورنمنٹ نے مسلمانوں کے اس کام کو دیکھا وہ خود ایک ایسی چیز ہے کہ جس قدر
 مسلمان اُس پر فخر کریں اور خوش ہوں وہ کم ہے۔

صاحبو! ذرا اُن آپسچوں کو ملاحظہ کرو، جو دیسراویں، اور گورنروں نے اسی مقام پر دی ہیں اور
 جن میں اسی اصول پر عمل کرنے کی آپ کو مبارکباد دی ہے اور جس پر عمل کرنے سے اتنی بڑی مدد کالج
 کی ہے۔ ہر اکیسویں لارڈ لٹن نے کالج کے فونڈ ریزیشن کے جلسہ میں فرمایا تھا۔

اے صاحبو! میں آپ کو اُس شخص کے پڑانے قصہ کا یاد دلانا فضول سمجھتا ہوں، جس نے ہر طور سے
 دیکھتا سے یہ دعائیں تھی کہ وہ اُس کی گاڑی کی ایک میں دھسے ہوئے پتہ کو نکال دے۔ گراؤس کی عام قوت
 تک قبول نہیں ہوئی جب تک کہ اُس نے خود اپنا کندھا پتہ کو نہ لگایا۔

اے صاحبو! میں آپ کو اس استعداد پر مبارکباد دیتا ہوں جس سے آپ اپنا کندھا پتہ کو لگا
 رہے ہیں۔ آئریسل ڈیپوٹنٹ پریسیڈنٹ ایجوکیشن کمیشن جب اگست ۱۸۸۷ء میں یہاں آئے تو انہوں نے
 یہ کہا اگر سیلف ہیلمپ کی اُس قسم کی مثالیں اور موجود ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی کچھ
 ضرورت نہ ہوگی، اور اگر یہ کالج تمام ہندوستان کے واسطے نہ صرف سیلف ہیلمپ کے، بلکہ اس اثر
 کی بھی ایک عمدہ نظیر ہے جو ایک عمدہ کام پر مستحکم اختصار رکھنے سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے
 اور ہر اکیسویں لارڈ لٹن نے یہ فرمایا تھا کہ میں اس کامیابی کو ایک ثبوت اُس کام کا سمجھتا ہوں۔
 جو اس ملک میں تعلیم کے معاملہ میں پرائیویٹ شخصوں کی الوالہ العزیز اور ذاتی رعب و داب کی قوت
 سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مجھ کو یقین واثق ہے کہ ہندوستان میں تعلیم کے دقیق اور اہم مسئلے کا حل
 طور پر حل کرنے کی توقع صرف اُسی حالت میں ہو سکتی ہے جب کہ پرائیویٹ شخصوں کی فیاضی اور
 پرائیویٹ شخصوں کے انتظام سے گورنمنٹ کوششوں کو مدد ملے۔

اے صاحبو! آپ نے ایڈریس میں بیان کیا ہے کہ سیلف ہیلمپ اب تک آپ کی قوم پر
 زندہ ہے۔ بس اس سے بڑھ کر اور کوئی عمدہ دلیل اُس کامیابی کی نہیں ہو سکتی ہے جو غالباً آپ کو
 اپنی کوششوں میں حاصل ہوگی۔ سس ایلفرڈ لائل نے اس کالج کو دیکھ کر یہ کہا کہ یہ کالج
 جیسا کہ آپ نے بیان کیا ہے سب سے پہلا ہی کالج ہے جس میں وہ اصول شامل ہیں جس کا ذکر
 آپ کے ایڈریس میں کیا گیا ہے یعنی تعلیم کے معاملہ میں سیلف ہیلمپ کا اصول بعضی وہ سیلف ہیلمپ
 جس کی تقویت گورنمنٹ کی فیاضانہ اعانت اور علانیہ مدد سے ہوتی ہے۔ مجھ کو بخوبی یقین ہے کہ
 یہ ہی وہ اصول ہیں جس کی بنا پر گورنمنٹ ہندوستان کے تمام حصوں میں ملک کے اعلیٰ درجہ کی

تعلیم کو مدد دینا اور اُس کی تکمیل کرنا چاہتی ہے۔ ان حضرات میں محمدان ایٹکھو اور ٹیل کالج علیگڑھ سب سے پہلا کالج ہے جس نے اس باب میں پیش قدمی کی ہے اور بتایا ہے کہ ان ہولوں کا کس طرح پر کامیابی کے ساتھ عملدرآمد ہو سکتا ہے۔ اس نظیر کے قائم کرنے سے اس کالج کے بانیوں نے گورنمنٹ اور رعایا اور علیٰ عموم ہندوستان کی تعلیم کے حق میں ایک عمدہ خدمت کی ہے۔ کیونکہ ہم کو وہ ایک ایسے مسئلہ کے حل کرنے میں مدد دے رہے ہیں۔ جواب تک شاید ہی دنیا کے کسی حصہ میں خواہ مخواہ طور پر حل ہوا ہے یعنی سلطنت اور اُس کی رعایا کی تربیت یافتہ قوموں کے باہمی اتفاق کے ذریعہ سے ایک ایسے طریقہ میں تعلیم کے سرانجام دینے کا مسئلہ جو لوگوں کے میلان طبع کے موافق ہو، اور جس سے ضرورتیں تعلیم کے باب میں رفع ہوں، اور تعلیم رعایا کے خیالات کے موافق ہو جائے جو مقصد کہ ہم سب کو مد نظر ہے، وہ بالکل عیاں اور بغیر کسی شبہ کے ہے یعنی ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمام فرقہ کے لوگوں کو اُن کی حیثیت اور لیاقت اور ضرورتوں اور جو موقع اُن کی تعلیم و تربیت سے نفع اُٹھانے کے واسطے حاصل ہو اُن کے موافق تعلیم دیکھا وے۔

پھر اے صاحبو! اس سے زیادہ ثبوت اُس ہول کی عمدگی اور خوبی کا کیا ہو سکتا ہے جو اُن زبان سے نکلا جو ہندوستان کی سلطنت کے فرمانروا، اور تعلیم کے دیوتا، اور رعایا کی ہیودی کے خواہاں ہیں۔ اب بقایا اس کے اُن خواہشوں کی نسبت جو سکڑے خاص مدد ملنے کے واسطے مسلمانوں نے کیں۔ کیا جواب ملا۔ اور اُس کی نسبت کیا رائے ظاہر کی گئی۔

مسٹر ایم این شینل محمدان ایبوسی ایشین نے ایک عرضداشت لائبریری کے حضور میں پیش کی اور اُس میں یہ درخواست کی کہ مسلمانوں کے ساتھ خاص رعایت کی جائے اور نوکری جو وقت صرف یونیورسٹی کی ڈگریوں پر ہی محاط نہ ہو، اور جو ڈیپل عہدوں کے واسطے بغیر اس کے کہ امیدواروں سے یونیورسٹی محکمہ کے امتحان بچہ آف آرٹس کے پاس کرنے کی ابتدائی شرط کی تکمیل کرائی جاوے، علیحدہ امتحانات مقرر کئے جائیں، اور بی۔ ایل کا نہ ہونا مانع تقرر نہ ہو۔ پھر یہ درخواست بھی اُس میں کی گئی تھی کہ مسلمان لڑکوں کے والدین زیادہ تعلیم دینے کا مقصد ورتیں رکھتے ہیں اور تدریس کی ضروریات اور زندگی کی رونمائہ حاجتوں کے مٹا کرنے کے ذریعہ سے اکثر طالب علم ابتدائے عمر میں اپنی تحصیل علم کے چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں، اس لئے مسلمانوں کی تعلیم کے واسطے کوئی خاص بندوبست کیا جاوے۔

صاحبو! میں نہیں جانتا کہ گورنمنٹ نے اس کا کیا جواب دیا۔ مگر ایک انگریزی اخبار میں اُس کی نسبت یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ہمارے نزدیک جو علما مسلمانوں نے اپنی عرضی میں بیان کیا ہے نہ وہ واجب ہے، نہ مناسب، نہ قابل عملدرآمد۔ گورنمنٹ نے ایک تصدیق اور نیک ارادہ سے تمام ملک

میں تمام فرقوں اور قوموں کے لوگوں کے واسطے مدرسے قائم کئے ہیں۔ اور گورنمنٹ کا اس میں کچھ قصور نہیں ہے کہ لوگوں کا ایک فرقہ تعلیم کی جانب زیادہ ترائفات کرے اور اُس کے ذریعہ سے اپنے تئیں سرکاری نوکری کے واسطے دوسرے فرقہ کی نسبت زیادہ تر لائق بنائیں۔ گورنمنٹ نے ہندو کو کوئی ایسا فائدہ نہیں پہنچایا ہے، جو اُس نے مسلمانوں کو نہ پہنچایا ہو۔ اگر سرکاری عہدوں پر بیشتر ہندو مامور ہیں تو اُس کی کچھ یہ وجہ نہیں ہے کہ گورنمنٹ نے اُن کی کوئی طرف داری کی ہو، بلکہ اُس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تئیں مسلمان ہم وطنوں کی نسبت اُن عہدوں کے واسطے زیادہ تر لائق بنایا ہے۔ ایک شایستہ گورنمنٹ کے تحت میں سرکاری نوکری کی قابلیت کی خاص شرط ہمیشہ تعلیم ہونی چاہئے، اور چونکہ یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی نسبت کوئی اور زیادہ تر عمدہ کفالت اُس تعلیم کی نہیں ہے۔ اس لئے گورنمنٹ اس باب میں صرف اپنا فرض ادا کرتی ہے کہ وہ سرکاری عہدوں پر لوگوں کے مامور کرنے میں اُن شخصوں کو ترجیح دیتی ہے، جنہوں نے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی ہو۔ ہم کلاسٹکس کے ساتھ اس یقین میں متفق ہیں کہ ذاتی مادہ اور جوہر بھی وہ صفیں ہیں جن کا امتحان یونیورسٹی کے امتحانات کے ذریعہ سے نسبت کسی اور طریقہ امتحان کے جو علی العموم قابل عمل درآمد ہو، زیادہ تر عمدہ طور سے ہو سکتا ہے، جس نوجوان آدمی نے ایک یونیورسٹی کے تمام امتحانات کو ڈگری امتحانات تک کامیابی کے ساتھ پاس کر لیا ہو، اُس کی نسبت واجباً یہ گمان کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ دوسرے شخص کی نسبت جس نے اس قسم کا امتحان پاس نہ کیا ہو، زیادہ مادہ اور جوہر رکھتا ہے۔

صاحبو! غالباً قریب قریب اسی کے گورنمنٹ نے جواب دیا ہوگا، کیونکہ دوسرے انگریزی اخبار نے ایسی رعایتوں کی خواہش پر نہایت سچ اور واجب یہ رائے دی تھی کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خاص حقوق کے واسطے ہرگز درخواست نہ کریں، بلکہ اُن کو ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو کر رعایا کے قومی حقوق کی درخواست کرنی چاہئے۔ سرکاری نوکری کے معاملہ کی نسبت ہم کو نہایت افسوس ہے کہ سرکاری نوکری میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے، لیکن اُن کو چاہئے کہ جو نفرت وہ مغربی علم اور شائستگی سے رکھتے ہیں اُس کو وہ ترک کر دیں، جیسے کہ ہندوؤں نے ترک کر دی ہے۔ اور پھر یہ بات بہت جلد جاتی رہیگی کہ سرکاری نوکری خاص ہندوؤں کی ہی ملکیت معلوم ہو۔

صاحبو! اسی طرح سندھ کے مسلمان بھی کلاسٹکس ہیڈس گورنمنٹ بمبئی کے سامنے اپنا رونا روئے تھے۔ لاؤٹس مینڈیس میں جو گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کیا تھا اسی قسم کی بھیک مانگی تھی۔ اور مسلمانوں کو نوکری کم لگن گورنمنٹ کی کم توجہی کا نتیجہ بیان کیا تھا، نہ اپنی غفلت اور کاہلی کا۔ اُس میں لکھا تھا کہ سرکار انگریزی انصاف کے واسطے مشہور ہے اور تمام رعایا کی طرف سے تعظیماً اور مساوات

کا برتاؤ رکھتی ہے۔ اس لئے ہم حضور سے درخواست کرنے ہیں کہ خاص لحاظ فرمادیں تاکہ ہمارے لئے ملازمت کا دروازہ جو ہندوؤں نے بند کر دیا ہے، کھل جاوے۔ پھر مدرسہ کے لئے یہ درخواست کی تھی کہ ہماری قوم بوجھ نہ بڑھنے انگریزی کے، پس ماندہ قوم کے لقب سے بدنام ہے اس ذلت آمیز لقب کے دور کرنے کے لئے ہم نے ایک مدرسہ قائم کیا ہے حضور ہماری کمزور کوششوں میں مدد کریں اور اس درخواست پر جو خاص عطیہ کے واسطے ہم پیش کرنے والے ہیں لحاظ فرمادیں۔

اس کے جواب میں گورنر صاحب نے فرمایا کہ آپ کی شکایت کہ زبان انگریزی کے اجراء سے مسلمانوں پر سختی ہوتی ہے اور یہ کہ نوجوان ہندو جنہوں نے مشنری اسکولوں میں تعلیم پائی تھی، ان پر بازی لے گئے ہیں۔ البتہ یہ ایک سختی ہوتی، اگر حکمران قوم کی زبان دنیا میں علمہ عموم استعمال نہ کی جاتی ہوتی اور سرکاری ملازمت کے امیدواروں پر زبردستی قائم کر دی گئی ہوتی۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انگریزی کا جانا معنی رکھتا ہے، تجارتی زبان کے جاننے کے۔ اور نیز ایک ایسی زبان کے جاننے کے، جو تمام اقوام میں تبدیل خیالات کے لئے، سب سے زیادہ مروج زبان ہوتی جاتی ہے تو میں قبول کرتا ہوں کہ میں شکایت کی کوئی وجہ معقول نہیں پاتا۔ زبان انگریزی کے جاننے کی پابندی اس ملک کے تمام اقوام کے امیدواروں کے لئے مشترک ہے اور میں نہیں خیال کرتا ہوں کہ اداسل میں چاہے جو کچھ حالت ہو، اب کوئی شکایت اس معاملہ کے متعلق باقی ہے۔ پھر گورنر صاحب نے اس شکایت پر کہ مقابلہ کا امتحان نہ لیا جاوے اور اس طور پر سرکاری عہدوں کے لئے انتخاب نہ ہوا کرے، یہ فرمایا کہ اس اہول کے متعلق جس پر گورنمنٹ سرکاری نوکری کے لئے ملازموں کا انتخاب کرتی ہے۔

یہ واضح ہو کہ اگرچہ گورنمنٹ تمام قوموں کے ساتھ بغیر کسی جانب داری کے سلوک کرنے کی خواہش رکھتی ہے، تاہم اس پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے ملازم سب سے زیادہ لائق شخصوں کو مقرر کرے اور اگر ہم ایسے لوگوں کو مامور کریں جو امتحانوں میں کامیاب ہونے کی قابلیت نہیں رکھتے ہیں۔ جو ہم امیدواروں کی لیاقت کے جانچ کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں، تو ہم پر الزام جانب داری کا لگا یا جاسکے گا۔ ویسا ہی حال تمام دنیا میں ہے کہ جیسے جیسے تعلیم نے ترقی کی ہے امتحانات کی پیڈیٹو ہوتے ہیں۔ اور گو یہ امتحان ان لوگوں کو جو سرکاری نوکری کی خواہش رکھتے ہیں بلاشبہ ناگوار ہے، مگر مجھے کوئی اور اصول نظر نہیں آتا ہے جس پر گورنمنٹ عمل کرے۔ جیسا کہ میں سوچتا یا اسی پر بیٹھائی کے دیگر مقامات میں کہ آیا ہوں یہ ضرور ہے کہ سرکار ختم الامکان عہدہ سے عہدہ نوکروں کو حاصل کرے اور سرکاری خدمات کی اسی مناسبت کے حاصل کرنے کا جس کا آپ کو حق ہے، یہ ہی ایک طریقہ ہے کہ آپ تعلیم کی دل سے سرپرستی کریں۔ اور اپنے نوجوانوں کو اس کی طرف ایسی رجعت دیں کہ آپ کے

حسب خواہش نوکریوں کے حاصل کرنے کی وہ قابلیت پیدا کریں۔ اس کے بعد گورنر ممدوح نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ ان نوجوان آدمیوں کو اگر وہ اعلیٰ درجہ کی نوکریوں کی تنہا کرتے ہیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرنی ضرور ہوگی۔ مسلمان طالب علموں کی تعداد فی الحال عجیب ہے، ان طالب علموں کا کل تعداد میں سے جو مدارس میں بشمول مدارس مساجد و مدارس لوکل پورٹ تعلیم پاتے ہیں۔ ابتدائی طالب علموں کی تعداد ۶۹ فیصدی ہے و سکندریہ درجوں میں پڑھنے والوں کی تعداد صرف ۹ فیصدی ہے اور جو کلچر میں تعلیم پاتے ہیں، ان کی تعداد صرف ایک فیصدی ہے۔

پھر گورنر ممدوح نے اپنی بیجوری کا اظہار اور اس اعانت کا بیان کیا جو گورنمنٹ بمبئی نے مسلمانوں کے ساتھ کی ہے اور اُسے ان لفظوں میں فرمایا کہ:-

اے صاحبو! آپ کی قوم کے ساتھ منصفانہ سلوک کرنے کی ہر خواہش کے ساتھ ہی یہ خیال کرتا ہوں کہ آپ خود غور فرمادیجئے، کہ جب تک اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی طرف بہ نسبت حال کے زیادہ نہیں توجہ کی جاتی ہے، بہت مشکل ہے کہ آپ کے نوجوان اونچی نوکریوں پر پہنچ سکیں۔ ان کو بہ نسبت حال کے کہیں زیادہ تعلیم پانا چاہئے۔ آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں تک گورنمنٹ اسکالرشپوں سے تعلق ہے مسلمانوں کے لڑکوں کو بارہ سال کی عمر تک اسکالرشپ حاصل کرنے کی اجازت ہے جب کہ ہندوؤں کے لڑکوں کو صرف دس سال کی عمر تک مل سکتی ہے، اس لئے آپ کو اپنے لڑکوں کو ہندوؤں کے لڑکوں پر دو سال کا فائدہ حاصل ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اُسے بہت ذرا سی فیصدی جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ مگر ہم کو پریسڈنسی کے تمام حصوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنا ضرور ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ بحیثیت مجموعی پریسڈنسی کے دوسرے حصوں کی نسبت مسلمانوں کے ساتھ زیادہ رعایت کی گئی ہے۔

صاحبو! اس سے آپ کو گورنمنٹ کی رائے اور گورنر صاحب کا جواب مسلمانوں کی پسند و نخواستوں پر معلوم ہو گیا، اب بطور نمونہ کے میں پریس کی رائے بیان کرتا ہوں کہ انہوں نے ایسی خواہشوں کی نسبت کیا رائے ظاہر کی۔

صاحبو! بمبئی گزٹ نے ہنگلے اور سندھ کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت اور ان کی اس قسم کی درخواستوں پر نہایت افسوس کیا اور ان کی خواہشوں کی تنقیر کر کے یہ لکھا کہ سندھ کے مسلمانوں کی تعلیم کی کوششیں ویسی ہی پورے طور سے ضعیف ہیں اور ترائی اُس کے ویسے ہی حقیر ہیں جیسے ہنگلے میں۔ پکیشن کے نقصانات پر نقصانات پر مسلمانوں نے اپنے آؤریس میں جو شکایت کی ہے وہ کچھ کم بختی کی بات نہیں ہے۔ یہ بہت زیادہ سخت لفظ ہوگا اگر ہم ان شکایتوں کو پورا حقائق کہیں۔

کرچی کے عرضی گزاروں نے اپنے اڈریس کے اُس حصہ کے خاتمہ پر کلمہ **ہیں** لیس کو یہ یاد دلایا ہے کہ انگیزی حکومت کا انصاف قوموں و ذاتوں و مذاہب میں کسی حد انگیز تمیزوں کو روا نہیں رکھتا ہے۔ ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ آیا لکھنے والوں کو اُن الفاظ کے معنی نہیں معلوم تھے جو وہ دیکھ رہے تھے ؟

اس قسم کے اڈریسوں کا سارا مشاء و مدعا سرکار کو اس بات پر راغب کرنے کا ہوتا ہے کہ یہی حد انگیز تمیز قائم کرے، جس کو وہ اپنے اڈریس میں ناپسند کرتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ اس ملک کی گورنمنٹ نے ایسے فرق اور اس قسم کی قومی تمیز کو روا رکھا ہے۔ مثلاً لارڈ ہیریس کرچی کے مسلمانوں کو یہ یاد دلاتے ہیں کہ جہاں تک۔ سرکاری اسکالرشپوں سے تعلق ہے مسلمانوں کے لڑکوں کو بارہ سال کی عمر تک اُن کے حاصل کرنے کی اجازت ہے، جب کہ ہندوؤں کے لڑکوں کو صرف دس سال کی عمر تک ہے، اسی طرح ادبھی تمیزیں ہیں، مگر اُن سے مسلمانوں کے ہی لئے آسانی ہوتی ہے۔ اگر کہیں حد انگیز تمیز موجود ہے تو اُس کی نسبت مسلمانوں کو سب سے آخر میں اعتراض کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ تمیز انہیں کے حق میں اس پتے عقیدہ سے روا رکھی گئی ہے کہ اُن کے ساتھ رعایت واجب ہے لیکن اب او زیادہ رعایتوں کے لئے زمانہ نہیں رہا ہے ؟

اے میرے بزرگو! یہ جو کچھ میں نے عرض کیا نہایت کم ہے اور صرف بطور نمونہ کے بیان کیا ہے، اگر میں اس کی تفصیل کروں تو غالباً کانفرنس کے سب دن اُسی کے بیان کرتے میں گزر جائیں۔ اب آپ اپنی حالت کا بگلائے اور سندھ سے مقابلہ کیجئے، اور جو جواب اُن کو دئے گئے اور جو کچھ آپ کی کارروائی کی نسبت کہا گیا، دونوں کو ملائے۔ کیا آپ کا دل اتنی کارروائیوں کو دیکھ کر فخر اور خوشی سے نہ چھو لگا۔ اور کیا آپ اپنے کام کی نسبت عمدہ خیالات ظاہر ہونے اور عمدہ جوابات کے پانے اور عمدہ نتائج کے دیکھنے سے تازاں نہ ہونگے ؟

اے صاحبو! اگر قومی عزت کوئی چیز ہے، اور اگر فرمانروایان ہند اور گورنروں کا تعریف کرنا اور مبارکباد دینا کوئی خوشی اور فخر کی بات ہے، اور اگر عمدہ کاموں کی کامیابی محنت اور خرچ اور تکلیف کا کافی صلہ ہے، اور اگر اُن اصول کا جو آپ نے اختیار کئے اُن سے مطابق ہونا ثابت ہو، جس پر انگلستان کی یونیورسٹیاں اور کالج قائم ہیں۔ تو میں نہیں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر آج تک کوئی بات مسلمانوں کے فخر اور خوشی کی ابتدا عملداری سرکاری سے اب تک ہوئی ہے اور کبھی کوئی موقع ہماری قوم کا اپنی کارروائی پر نازاں ہونے کا ملا ہے ؟

صاحبو! اب میں دوسرا اصول بیان کرتا ہوں۔ جو اس کالج کے قائم کرنے میں ملحوظ رکھا گیا ہے، وہ کیا ہے۔ مذہبی تعلیم۔ بقول سر جان اسٹریچی کے۔ ہمارے اس کالج میں ایک

زبردست مذہبی عنصر موجود ہے۔ اور ہمارے موجودہ حالات اور علم اور خیالات کے لحاظ سے نہایت ضروری اور مقبول ہے۔ اور یہ اس کالج کی خاص صفتوں میں سے ایک بڑی صفت ہے۔ اس مذہبی تعلیم کو انگریزی تعلیم کے ملانے سے نہ صرف اپنے مذہب کی حفاظت، اور نہ فقط انگریزی پڑھنے والوں کے دلوں میں مذہبی اعتقادات کے قائم رہنے کا، اور ان کو مذہب اسلام پر ثابت قدم رکھنے کا بندوبست کیا ہے، بلکہ جیسا کہ سر جان اسٹرنج صاحب نے فرمایا ہے کہ ہم نے اس قاعدے کے مقرر کرنے سے گویا اپنے اعتقادات کا اعلان کر دیا، کہ اب بھی یہ بات ایسی ہی سچ ہے جیسی کہ اُس زمانہ میں تھی جب کہ مسلمانوں کو دہلی، قزلبہ، یا غرناطہ، میں عروج تھا کہ مذہب اسلام جس نے دین پر ایک بڑا اثر کیا ہے زمانہ حال میں بھی جب کہ اُس کی تعمیر صحیح طور پر کرنی باقی ہے۔ انسان کی ترقی اور شوخ نصیبی کا دوست ہے، اور ایک عمدہ مسلمان جو اُسی کے ساتھ ایک اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ شخص ہو۔ گوشت و انگیزی کی خیر خواہ رعیت ہونے میں خطا نہیں کر سکتا۔

صاحبو! ذرا آنکھ کھول کر ہندوستان کے چار طرف دیکھئے۔ اور جو مسلمان دوسرے کالجوں میں پڑھتے ہیں، اُن کی مذہبی حالت کو یہاں کے طالب علموں سے مقابلہ کیجئے۔ اگر نصیبی سے پادریوں کے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں، تو وہیں وہ تمام سہیں ادا کرنی پڑتی ہیں، جن کو کوئی مسلمان حقیقت میں گوارا نہیں کر سکتا۔ اور اگر سرکاری مدرسوں میں پڑھتے ہیں، تو وہاں نہ مذہبی تعلیم کا کچھ انتظام ہے، نہ مذہبی فرائض کے ادا کرنے کا بندوبست، اور نہ اُس کی فرصت، اور نہ غالباً اجازت۔ کیا کوئی لڑکا اسکول میں قرآن شریف پڑھ سکتا ہے۔ کسی مذہبی کتاب کو کھول سکتا ہے۔ کیا جانا نہ بچھا سکتا ہے۔ یا اذان سن کر مسجد میں جاسکتا ہے۔ اب بقایہ اُن کے ذمہ ہیں کی حالت دیکھئے کہ صبح کو کالج کلاس کے کمرے قرآن مجید کی تلاوت سے گونج رہے ہیں۔ پانچ وقت اللہ اکبر کی آواز سے کالج دہل جاتا ہے۔ مسجد عینہ طالب علموں سے آباد رہتی ہے۔ موزن، خلیب، اور واعظ سب سامان موجود ہے، جسے دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ آیا یہ کالج قصر باروم کی زمین پر بنا ہے اور خدیو یا سلطان اُس کے حامی اور سرپرست ہیں۔ آپ جمعہ کے روز مسجد میں تشریف لائے اور مولوی عبد اللہ صاحب کا وعظ فرمانا اور لڑکوں کا اُس میں حاضر رہنا بچشم خود دیکھئے، تاکہ آپ کو تعجب ہو کہ انگریزی پڑھنے کے ساتھ اس قسم کی اخلاقی تعلیم اور اس طرح کا وعظ کیونکر ملایا گیا۔ اور مغربی علوم کے ساتھ مشرقی تہذیب کا کیونکر پیوند لگ سکا۔

میں نے جناب مولوی عبد اللہ صاحب ناظم امور دینیہ سے مذہبی تعلیم متعلقین کی نسبت دریافت کیا تھا کہ موجودہ حالت اُس کی کیا ہے اور عملاً کیا ہوتا ہے انہوں نے میرے جواب میں جو کچھ لکھا ہے وہ میں آپ کو سناتا ہوں :-

جن اوقات میں کہ حاضری محضر صاحب لیتے ہیں اُن نمازوں کی جماعت میں اکثر طلباء حاضر ہوتے ہیں۔

تحقیقاً قریب سب طلباء کے ایسے ہیں جو جماعتِ صلوٰۃ خمسہ میں حاضر ہوتے ہیں۔ دو جماعتوں کو ترجمہ قرآن شریف پڑھایا جاتا ہے، جو کالج کے طلباء ہیں اُن کو ربط آیات تفسیر رحمانی سے اور تحقیقات بیضاوی شریف سے اور نکات برکت کشف برادری اساتذہ کا ملین مکملین سے بتائے جاتے ہیں، اور چھوٹے طلبہ کی جماعت کو صرف حوالی ترجمہ ہی یقین کیا جاتا ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح جلیلین شریف و مشارق الانوار و ترجمہ کلام اللہ شریف کے اسباق ہوتے ہیں۔ چار پانچ طلبہ کو فضائل تہجد شکر نماز تہجد کا بفضلہ تعالیٰ لا شوق ہو گیا ہے۔ بعض طلبہ نے نماز تہجد کی وعید سن کر قضا عمری کا التزام کیا چند طلبہ فضائل صلوٰۃ الادامین و صلوٰۃ التبیح سے مستفید ہو کر صلوٰۃ الادامین و صلوٰۃ التبیح کے حریص ہو گئے۔

طلبہ نے جو احقر کو عقد انا مل سے وظیفہ پڑھنے دیکھا اور اُس کی سنیت سننی بعض نے اُس کو سیکھا جب کہ طلبہ کو یہ معلوم ہوا کہ احقر کو دلائل الحسب و حزب الاعظم کی شیخ الدلائل مکی سے سند حاصل ہے ایک طالب علم کالج کے بغرض تحصیل سند سنا رہے ہیں اور حزب الاعظم اور حزب ابجر کی بھی انشاء اللہ سند حاصل کرینگے۔ الحمد للہ فی زمانہ پانچوں وقت کی نماز اول وقت ہوتی ہے۔ اس سے آپ اُن فائدوں کا اندازہ کر سکتے ہیں جو لمحاظ مذہبی تعلیم اور مذہبی تربیت کے مسلمان طالب علم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ اس وقت کسی اور جگہ ایسی نظیر ملیگی، کافی نہیں ہے بلکہ حقیقت میں کسی دوسری جگہ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اس قسم کے مذہبی امور کا ملانا کوئی چاہے تو اگر ناممکن نہیں تاہم طلبہ نہایت مشکل ہو گا یہ اسی کالج کی خصوصیات سے ہے اور یہ عزت اس مدرسہ کے قائم کرنے والوں کی قسمت میں لکھی تھی۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

تیسرا اصول جو اُن دو اصولوں سے جن کا میں ذکر کر چکا کچھ کم نہیں ہے وہ اعلیٰ تربیت ہے جس کے لئے یہ کالج مشہور ہے اور جس کی نظیر ہندوستان کے کسی مقام پر مل نہیں سکتی۔

صاحبو! ذرا بورڈنگ ہوس کی طرف تشریف لیجائے، اور طالب علموں کے رہنے اور ایک دوسرے کے ساتھ ملنے جلنے کو ملاحظہ کیجئے وہاں آپ گویا ایک نئی خلقت دیکھینگے، جن کی دنیا ہی دوسری ہے وہ اپنی چھوٹی سی دنیا میں باہم اس طرح رہتے ہیں، جیسے ایک خاندان میں چند رشتہ دار۔ ایک کو دوسرے کے ساتھ ہمدردی ہے اور ایک کو دوسرے کا خیال، ان کا بڑاؤ، آپس میں برادری ہے، اور اُن کا ملنا مخلصانہ۔ باوجود اختلاف عقاید اور خیالات کے باہم متفق ہیں۔ اور بجز ادا کرنے اپنے اپنے فرائض مذہبی سب ایک دوسرے کے شریک وہ مذہبی اختلافات جو تعصب اور جہالت کے سبب ہے

دوستوں کو دشمن اور بگائوں کو بیگانہ کر دیتے ہیں اور جن سے آئے دن جھگڑے قضیے پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور جن سے ملک کے امن و امان میں خلل آجاتا ہے، اور جن سے گورنمنٹ کو سخت کارروائی کرنی پڑتی ہے، یہاں اُس کا کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا، نہ اس وجہ سے کہ لاندہی نے اُن خیالات کو دل سے نکال دیا ہو یا وہ مذہبی اعتقادات باقی نہ رہے ہوں، بلکہ صرف عمدہ تعلیم اور عمدہ تربیت نے اُن کے دلوں کو ایسا روشن کر دیا ہے، اور تہذیب اور اخلاق نے تعصب اور جہالت کو اُن کے دل سے ایسا نکال دیا ہے، کہ وہ اگرچہ اپنے عقاید پر ثابت قدم ہیں، مگر اپنے اپنے مذہبی فرائض اپنے اپنے طور پر ادا کرتے ہیں۔ سنی، شیعہ، ہندو کے ساتھ رہتے ہیں۔ مقلد اور غیر مقلد ایک جگہ نماز پڑھتے ہیں۔ ایک ہی صف میں مقتدی اپنے اپنے خیال کے موافق خاموشی یا آواز اُچھین کتے ہیں۔ یہ اتفاق باوجود عقاید کے اختلاف کے دیکھنے والے کو نہایت متحیر کرتا ہے، اور وہ غیر ممکن چیز ہے۔ یہاں کے طالب علموں کو عمل کرتا ہوا پاتا ہے۔

ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے اس اتفاق کو دیکھ کر حیرت کی اور کہنے لگے کہ ”کالج کے گرد پھرنے میں شیعہ اور سنیوں کی نماز پڑھنے کی جگہ کو پاس پاس دیکھنے سے میں نہایت متحیر ہوا، ہندوستان کی تواریخ میں اول ہی مرتبہ حیدرآباد دکن سے شیعہ مسلمان اور دہلی اور بنگالہ کے دراز مقامات سے سنی مسلمان تعلیم کے عام مقصد کے واسطے آتے ہیں، ایک جگہ رہتے ہیں، ایک جگہ پڑھتے ہیں، ایک جگہ کھیتے ہیں اور ایک دوسرے سے کسی قدر فاصلہ پر چپ چاپ اپنی نماز پڑھتے ہیں“

صاحبو! حقیقت میں اس طور پر مسلمان لڑکوں کی رہنما کردہ اپنے مذہبی اعتقادات سے باخبر ہوں اور مغربی تعلیم کے زیر اثر۔ ان کی اخلاقی تعلیم کے نگراں، مسلمان عالم اور مسلمان واعظ ہوں اور ان کی علمی تعلیم اور معاشرت کے خبرگیراں یورپین پرنسپل اور یورپین ماسٹر، گویا دین اور دنیا دونوں نعمتوں کا اُن کے لئے مہیا کر رہا ہے۔

صاحبو! ہمارے کالج کی عمدہ تربیت کا صرف یہ ہی ایک فائدہ نہیں ہے کہ اختلاف عقاید کے نہریلے اتر جاتے رہے ہیں اور باوجود مذہبی خیالات میں ثابت قدم رہنے کے طالب علموں میں دوستی اور محبت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ بلکہ تربیت کے لئے جو ضروری انتظامات چاہیں وہ سب اُن کے مہیا کئے گئے ہیں۔ اُن کے رہنے کا طریقہ اُن کی جسمانی ورزش کے قاعدے اور دماغی قوت کے ساتھ جسمانی صحت کے قائم رہنے کا بندوبست، اور باوجود پڑھنے کی سخت محنت کے اُن کی طبیعت کے افسردہ نہ ہوجانے اور اُن کی زندہ دلی قائم رکھنے کے لئے جو تدبیریں کی گئی ہیں اُن کو جن عمدہ لفظوں میں ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے بیان کیا ہے، میں بیان نہیں کر سکتا اور نہ جیسی وقعت اُن کی بلے

کی ہو سکتی ہے میں اپنی رائے کی نسبت اُس کا خیال کر سکتا ہوں۔ اُن کی لئے ایسے معاملات میں گویا ایک سند ہے، جس میں کوئی شک نہیں کر سکتا، اور اُن کا کتنا تعلیم و تربیت کے معاملہ میں ایک ایسا قول ہے، جس کی نسبت نہ گورنمنٹ نہ پبلک کو کسی قسم کا شبہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہاں کی تربیت کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ اُس کالج کے بانیوں کی طبیعت کی فیاضی صرف اُس کے قاعدوں اور اُس کی تعلیم میں ہی نہیں پائی جاتی ہے، بلکہ اس مقام کے تمام انتظام سے پائی جاتی ہے۔ ہر ایک لڑکے کے پاس چند کمرے ہوتے ہیں جن میں ایک برآمدہ اور ایک پڑھنے کا کمرہ اور ایک سوئے کا کمرہ اور ایک غسل خانہ ہوتا ہے۔ اس طرح ہر اُس کو یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ جب اپنے مکان سے باہر ہو تو وہ اپنے ہجمنوں کے ساتھ بات چیت کر سکتا ہے اور یہ فائدہ کچھ کم نہیں ہے کہ وہ اپنے پرائیویٹ اوقات میں اطمینان و تنہائی میں مطالعہ کر سکتا ہے۔ لڑکوں کے اسکول لٹریچر و کھیل انگلش سیکل اسکولوں کے عمدہ نمونوں پر قائم کئے گئے ہیں، اور وہ نوجوان آدمیوں کا ایک ایسا فرقہ پیدا کرتے ہیں۔ جو میں یقین کرتا ہوں کہ بہت سی باتوں میں اپنے ننہیں اُن اصلی مدرسوں کے جن کے نمونوں کی پیروی کی گئی ہے ناقابلِ ثبات نہ کرینگے، یہ جو کچھ ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے کہا وہ ایک امید تھی جو یہاں کے انتظامات نے اُن کے دل میں پیدا کی تھی، اُس کے دس برس کے بعد جب سر آکلینڈ کالون صاحب نے اس کالج کے نتائج کی نسبت اپنی رائے ظاہر کی وہ اس وقت میں آپ کو سناتا ہوں۔ تاکہ آپ خود میری بات کا اندازہ کر سکیں، کہ وہ امید کہاں تک پوری ہوئی۔ اور یہاں کے تعلیم و تربیت یافتہ طالب علموں نے گورنمنٹ کے دل پر کیا اثر پیدا کیا۔ سر آکلینڈ کالون صاحب نے اسی مقام پر ایک دفعہ یہ فرمایا کہ مجھ کو بار بار یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ علیگڑھ کا باشندہ ہونا، انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے درمیان عزت اور اعتبار کا ذریعہ ہے وہ اپنے ساتھ وہاں کی تعلیم و تربیت کی ہر اور اُس شخص کی عقل و دماغ کا نقش بن جاتے ہیں۔ جس کی نگرانی میں اُن کی تعلیم و تربیت کی تکمیل ہوئی ہے۔ پھر دوسری دفعہ جناب ممدوح نے یہ کہا کہ جو شخص ان نوجوان آدمیوں سے واقف ہے، جو اس کالج سے پاس ہو کر نکلے ہیں وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کرینگے کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی علامتیں ایسے ہی صاف صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے کہ انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور ہماری یونیورسٹی کے گریجویٹ ظاہر کرتے ہیں۔ علیگڑھ کا کالج کا ایک طالب علم فیاضہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم و تربیت اور آزادانہ خصلت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ ہندوستانیوں کے اُس فرقہ کا ایک نمونہ ہو گیا ہے۔ جو انگریزوں کی خواہش کی بخوبی داد دینے کے واسطے کوشش کرتا ہے لیکن وہ بھی یہ توقع رکھتا ہے کہ ہم اُن کی خواہشوں کی اسی طرح پرداد دیں۔

پھر اے صاحبو! یہ بات بھی خیال کرنے کے لائق ہے کہ باوجودیکہ یہاں کی تعلیم انگلستان کے

مدارس کی تعلیم کے موافق ہے اور یہاں تربیت بھی انہیں اصول پر ہوتی ہے باوجودیکہ اس کے خرچ میں بہت تخفیف ہے۔ اسے سن کر آپ تعجب کریں گے اور غالباً میرے اس کہنے کو مبالغہ سمجھیں گے۔ اور ایسا سمجھنا کچھ بعید از قیاس نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم تعلیم پر خرچ کرنے کے عادی نہیں ہیں اور نہ صرف پانچ روپیہ جینے سے زیادہ اپنے بچوں کی تعلیم پر صرف کرنے کے عادی ہیں اس لئے ہمارے نزدیک بلاشبہ میں پچیس روپیہ جینے کا خرچ ایسے کام میں فضولی اور اسراف میں داخل ہے، مگر اے میرے بھائیو! اگر آپ عمدہ چیز کے طالب ہیں تو پوری قیمت دینے کے لئے آمادہ رہئے۔ قیمتی چیز بغیر پوری قیمت ادا کرنے کے نہیں مل سکتی اور اگر کسی سبب سے سستی مل جاوے تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنا چاہئے۔ ڈاکٹر ہنٹ صاحب یہاں کے اخراجات کا ولایت کے مصارف سے مقابلہ کرتے وقت کمال حیرت یہ کہتے ہیں ”یہ عمدہ تعلیم اور دراصل عمدہ طریقہ زندگی کے ایک خرچ پر سکھائے جاتے ہیں جو ہمارے انگلش پبلک اسکولوں کے اخراجات کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ جو خرچ بورڈ اور لاجنگ کی نسبت ادا کرنا پڑتا ہے۔ اُس کی مقدار ایک سو پچیس روپیہ سالانہ سے لیکر دو سو اٹھائیس روپیہ تک اور کل اخراجات بورڈ اور لاجنگ اور تعلیم اور میڈیکل فیس اور کرکٹ کلب کی بابت ایک سو نوے روپیہ سالانہ سے لیکر تین سو اٹھ روپیہ تک یعنی سولہ پونڈ سے لیکر پچیس پونڈ سالانہ تک ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ ایک ثبوت اس بات ہے کہ ہندوستانی منظم ایک بڑے پبلک اسکول کا کفایت بندوبست کرنے میں کیا کر سکتے ہیں، علیگڈھ کالج کو ایک انگریزی پرنسپل اور کم سے کم ایک انگریزی پرفیسر ولایت سے طلب کرنا اور اُن کو یورپین لیبر کی اُس بڑی شرح پر تنخواہ دینی پڑتی ہے۔ جو اس ملک میں جاری ہے۔ تاہم وہ ایک انگریزی تعلیم اور اسکول لئیٹ کے طریقے کو انگلش پبلک اسکولوں کے نمونہ پر اُس خرچ کے قریب ایک دسویں حصے پر سکھاتا ہے جو ایک انگلش اسکول میں دینے کے لئے درحقیقت ایک انگریزی لڑکے کو ادا کرنا پڑتا ہے“۔

پس اے صاحبو! یہ وہ اصول ہیں جن پر آپ کا مدرستہ العلوم قائم کیا گیا ہے اور جس کی خوبی اور عمدگی کی یہ تعریفیں ہوتی ہیں اور جس کی کامیابی پر ہذا اکیلیسنی لارڈ لٹن نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ کل شاہنشاہی کو مبارکباد دی ہے اور اسے تمام ہندوستان کی تعلیم و تربیت کے لئے عمدہ نمونہ خیال کیا ہے، جیسا کہ اُن کے اُن الفاظ سے ظاہر ہے، جو انہوں نے اس کالج کی بنیاد رکھنے وقت اپنی زبان مبارک سے فراموش نہ کی کہ جب میں اُن مشکلات کے تسلیم کرنے میں جو آپ نے چھیلیں اور ایسی اعلیٰ کامیابی سے اُن پر غالب آئے، نہایت سرگرمی سے آپ کے ساتھ ہمدردی کرتا ہوں، اور جب کہ میں ویسی اُس کامیابی پر جس سے آپ اُن مشکلات پر غالب

ہوئے، دل سے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ آپ کی کامیابی اور جگہ بھی اس قسم کے ارادوں کی تحریک کا، نہ صرف عقلی تربیت کی اشاعت کے لئے بلکہ اُس چیز کے لئے جو اس سے بھی زیادہ اہم یعنی عقلی تربیت کی قدردانی کے لئے ذریعہ ہوگی۔ کیا بعد غور کرنے ان تمام باتوں کے اور بعد اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے آپ میرے ساتھ اس بات میں متفق نہ ہونگے، کہ مدرستہ العلوم اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا سلم ذریعہ اور دیگر مسلمانی کالجوں کے لئے عمدہ نمونہ ہے۔

اب مجھے صرف پانچویں امر پر بحث کرنا باقی ہے کہ آیا مدرستہ العلوم کی تکمیل پر قوم کو متوجہ ہونا اور متفقہ کوششوں سے انتظام کرنا قومی مقاصد کے لئے لازم ہے یا نہیں۔

صاحبو! میں نہیں سمجھتا کہ بعد ان تمام حالات پر غور کرنے اور اس کالج کے عمدہ نتائج ملاحظہ کرنے کے کوئی شخص جس کو خدا بھی قومی ترقی کا خیال ہو، اُس کی تکمیل اپنے اوپر فرض اور واجب نہ سمجھے گا اور ترقی کے ایسے ذریعہ کو جس میں اپنی کامیابی کا ایسا کھلا اور صاف ثبوت دیا ہو، ناقص اور ناتمام چھوڑ کر مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے محروم کرنا چاہیگا۔

صاحبو! اب ہماری قوم کے لئے وقت بہت کم باقی ہے اور قسمت کے فیصلے میں کچھ نہیں ہے اور اُس کا فیصلہ بھی آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ نے اپنی متزلزل اور خوفناک حالت پر خیال کیا اور اُس علاج اعلیٰ تعلیم دلانے سے نہ فرمایا۔ اور ایک گروہ کم اور ناقص تعلیم یافتوں کے ملتا کر کرنے پر کفایت کی اور ناقص تعلیم کے ذریعے جیتا کرنے سے آپ نے اپنے آپ کو قومی فرض سے سبکدوش سمجھ لیا۔ یا اُس سے اپنی قوم کی ترقی اور عزت کی امید کی تو آپ بڑا دھوکا کھا وینگے۔ اور زمانہ بہت جلد آپ کو آپ کی غلطی پر مطلع کروینگا۔ اور نہ صرف وہ لوگ جو ذیل، اور مغس، اور جاہل ہیں بلکہ وہ لوگ جو کہ اُس وقت تک خدا کی مہربانی سے صاحبِ عزت، اور صاحبِ دولت، ہیں۔ اور جن کی گورنمنٹ اب تک عزت کرتی ہے، یا وہ لوگ جو اپنے خاندان کی زرگی، اور اپنے باؤا جدا کی علم و فضیلت، کی بدولت ابھی تک قوم کی نظر میں کچھ عزت رکھتے ہیں۔ یا وہ لوگ جو اب تک سرکاری ملازمت میں اعلیٰ درجہ کے عہدوں پر مامور ہیں۔ ان سب کی اولاد کا بغیر اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے ایک ہی نتیجہ ہونے والا ہے، اور سب کے سب اُسی تاریک اور گہرے غار میں ذلت اور گناہی کے ساتھ گرنے والے ہیں، جس میں اب تک سینکڑوں خاندان اور ہزاروں مسلمان گر گئے اور جن کا کچھ نشان اور تپہ تک باقی نہیں رہا۔ جو وقعت اور رُشخ اب تک دولت مند اور معزز مسلمانوں کو کچھ باقی ہے اور جو تھوڑے تعلق انتظامات ملکی میں اُن کو حاصل ہیں اور وہ ذرا سا اعتبار جو گورنمنٹ کو ملکی معاملات میں صلاح اور مشورہ دینے سے موجود ہے باقی نہ رہیگا، اس لئے کہ اُن کو زمانہ کی حالت کے مطابق خود اپنے فوائد سمجھنے کی قابلیت نہ رہیگی اور نہ اپنے فوائد کو وہ اُن دلائل اور ان طریقوں

سے ثابت کر سینگے جن کی اس مانہ میں ضرورت ہے اور حقیقت جس طرح کہ اب تک بہت سے معزز خاندانوں کی دولت لوگوں نے چھین لی ہے اسی طرح اُن کی رہی سہی عزت بھی وہ لوگ لے لینگے جو تعلیم میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت اور گورنمنٹ پر اپنے مقاصد کے اظہار پر قادر ہی نہیں ہیں بلکہ جو گورنمنٹ کو قائل اور مجبور کر کے حاصل کرتے ہیں۔

جن مسلمانوں کے کان بہرے نہ ہوں، اور جن کی آنکھیں اندھی نہ ہوں، اور جن کے دماغ سے سمجھنے کی قوت جاتی نہ رہی ہو، وہ ان باتوں کو سنیں جو اُن کی قوم کی غفلت اور نااہلیت کی نسبت ہو رہی ہیں۔ اور اُن چیزوں کو دیکھیں جو اُن کی ہمسایہ قومیں کر رہی ہیں اور اُن قبچوں کو سمجھیں جو آئندہ پیدا ہونے والے ہیں۔ ابھی تک دنیا کی مہذب قومیں اور ہمارے ملک کے حاکم ہمارے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں، وہ ہمارے روز افزوں تنزل پر تاسف ہیں، پارٹس گورنمنٹ ہماری دستگیری ہی کرنے کے لئے طیار نہیں ہے بلکہ انتظام مملکت میں بھی ہم سے مشورہ اور صلاح لینے کے لئے اور اُس میں شریک کرنے کے لئے بڑی خواہشمند ہے، اور مل ایک ناصح مشفق اور دور اندیش رہتی ہے ہم کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرنے کی طرح سے رغبت اور شوق دلاتی ہے اور نہ صرف زبانی بلکہ روپیہ سے بھی ہماری مدد کر رہی ہے، مگر ہماری غفلت اُس کو بھی مایوس کرتی جاتی ہے۔

صاحبو! دوسری قومیں جہاں تک پہنچ گئیں، اور جو ترقی تعلیم میں اُنہوں نے حاصل کی اُس کا اندازہ اور غیر متناسب بیشی سے نہیں ہو سکتا جو ہمارے ہموطن ہندوستانیوں نے کی ہے اور جس کو میرے عزیز دوست سید محمود صاحب نے ابھی اپنے لکچر میں بیان کیا ہے اور نہ صرف اُس نقشہ سے معلوم ہو سکتا ہے جس سے مسلمانوں کے مقابل میں دوسری قوموں کا بہت اوپر چڑھ جانا آنکھوں سے نظر آ رہا ہے، بلکہ اُن کارروائیوں کے دیکھنے سے ہو سکتا ہے جو اس وقت ہندوستان کے ہر صوبہ اور ہر قسمت اور ہر ضلع اور ہر شہر بلکہ ہر گاؤں میں دوسری قومیں اپنی ترقی حاصل کرنے کے لئے کر رہی ہیں۔ ذرا آنکھ کھول کر ایک نیشنل کانگریس کی کارروائی کو دیکھئے اور اُس کے نتیجوں پر خیال فرمائے۔ کیا وہ جوش جو ہمارے دوسرے ہموطن دکھلا رہے ہیں اور جس استقلال اور گرجوشی سے وہ کام کر رہے ہیں، اور جو خلاص اور اتحاد باہم اُن کے ہے اور وہ ہمدردی جو قلم سے زبان سے ال سے جان سے وہ ظاہر کر رہے ہیں، اس قابل ہیں کہ آپ اُسے عزت کی نظر سے نہ دیکھیں اور آپ کی حیات اور غیرت کا خون جو شش نہ کرے اور اپنی قوم کے لئے اُن کے مقابلے میں کچھ نہ کریں۔

بھائیو! نتیجہ کس چیز کا ہے صرف اعلیٰ تعلیم کا۔ وہ تعلیم کی بدولت اس لائق ہو گئے ہیں کہ اپنی

اغراض پبلک کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ وہ اپنا استحقاق کو نمٹا پر ثابت کر سکتے ہیں، وہ اُس چیز کے پانے کی لیاقت رکھنے کے مدعی ہیں، جس چیز کو وہ مانگتے ہیں۔ اور باوجود اس بات کے کہ اُن کی کوششیں کچھ ناجائز ہیں، اور کچھ ناواجب، اور کچھ پیش از وقت، اور باوجود اس بات کے کہ اُن کی کارروائیاں حیرت انگیز ہیں، اور باوجود اس بات کے کہ بہت زبردست مزاحمت اُن کے سامنے ہے، مگر صرف تعلیم میں اعلیٰ لیاقت پیدا کرنے، اور انگریزی میں پوری مہارت رکھنے، اور فصاحت و بلاغت سے تفرہ رکرنے، اور اپنی پر جو شش تقریروں اور زبردست تقریروں سے اپنے مطلب کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور ایک حیرت انگیز رسوخ اور وقعت انگلستان کے پبلک کے دلوں میں پیدا کر رہے ہیں، اور بندریج پارلیمنٹ کے ممبروں کی توجہ بلکہ ہمدردی حاصل کر رہے ہیں۔ کیا پارلیمنٹ میں سیمیل ٹنٹن اگزیٹیشن و لائٹ اور ہندوؤں جگلا ایک وقت مقابلے کے امتحان حاصل کرنا، اور کیا گورنر جنرل کی کونسل میں انتخاب کا قاعدہ جاری ہونا، ایسے بڑے دواغھے نہیں ہیں، جن کو حیرت کی نظر سے مسلمان دیکھیں اور جس پر اپنی آئندہ افسوسناک حالت پر توجہ نہ کریں، کیا بغیر اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے آپ وہ درجہ حاصل کر سکتے ہیں جو اُن لوگوں نے حاصل کر لیا ہے اور کیا صرف اسکول کی تعلیم بلکہ کالج کی معمولی تعلیم آپ کو اُن کی برابر کر سکتی ہے۔ آپ ذرا انصاف کیجئے کہ کتنے آدمی آپ کی قوم میں ایسے ہیں، جن کو آپ لاکھ موہن گھوش اور بابا بوسراند ناتھ بیزجی، اور آنرےبل داد بھائی نوروزجی کی برابر کھڑا کر سکتے ہیں۔ اور آپ چھوٹے چھوٹے اسکولوں کے قائم کرنے سے کیا ایسے لوگ پیدا کر سکتے ہیں،

اس وقت جس رفتار سے آپ چل رہے ہیں اُن کی برابر نہ چنایک طرف اُن کی گدگد بھی آپ نہیں پہنچ سکتے۔ آپ کا اور اُن کا مقابلہ پیادہ اور سوار کی چال کا نہیں ہے، بلکہ ایک انگڑے اور اپانچ کی چال کا ریل پر جانے والے سے مقابلہ ہے۔ اگر اس رفتار کو آپ نے بدلا اور سینکڑوں اور ہزاروں مسلمان اعلیٰ درجے کی تعلیم پر نہ پہنچے تو کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ بھڑکولے کی کانوں میں کوئلانکا لٹنے اور آسمینوں میں بورے لادنے یا مال گودام میں تھیلوں پر انگریزی نمبر لکھنے کے سواے دوسری عزت کی جگہ نظر نہ آئیگے۔ بھائیو دہی سہی عزت بھی آپ کے ہاتھ سے بھل جاوے گی۔ یہ میرا کہنا ایشیائی شاعری نہیں ہے۔ نہ صرف میرے وہم نے کوئی ہولناک تصویر آپ کے آئندہ زمانہ کی کھینچی ہے۔ بلکہ آپ یقین کیجئے کہ جو میں کہ رہا ہوں یہ اُن پلٹیکل منجوں کی پیشین گوئی ہے جو کبھی اُنچے کے دیکھنے میں غلطی نہیں کرتے اور جن کا کہنا کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔

صاحبو! سہل کلینڈ کالون صاحب جو مسلمانوں کے حقیقی محسن اور مربی تھے آپ کی قسمت کا لکھا آپ کو بتا گئے ہیں، اور نہ صرف غریبوں کو اور نہ فقط واسطہ درجہ کے مسلمانوں کو بلکہ

اُن لوگوں کو جواب تک باعتبار دولت اور عزت کے بہت کچھ وقعت اور بزرگی رکھتے ہیں۔ کیا آپ نے اُن کی وہ اسپیش نہیں دیکھی جو انہوں نے کیننگ کا کالج میں دی تھی، اور نعلیہ داران اودھ کو اپنی اولاد کی تعلیم نہ دلانے پر شفقانہ ملامت فرمائی تھی، اور یہ لکھ ڈرایا تھا کہ، اگر آپ اس زمانہ کی روشنی کے مطابق جس میں آپ موجود ہیں چنا اختیار نہ کریں گے تو اور لوگ جو دولت اور عزت میں آپ سے کم ہیں اُس سے مستفیض ہونے میں مستی اور تغافل نہ کریں اور اس سے آپ کو بہت نقصان پہنچے گا، اور جو تہرہ اور عزت سرکار نے آپ کو عطا کی ہے وہ فوراً آپ کی غفلت اور کوشش نہ کرنے کی وجہ سے جاتی رہیگی۔ اور گورنمنٹ کو اُن معاملات ملکی میں جن سے آپ کو تعلق خاص ہے اور جو بالخصوص آپ ہی سے تعلق ہونا چاہئیں آپ مشورہ نہ دے سکیں گے، اور آپ کا اختیار اور رسوخ اس وجہ سے جاتا رہے گا کہ اور لوگ جو رائے دینے کی لیاقت رکھتے ہوں گے، وہ آپ کے نفع یا آپ کی خواہش کی طرف توجہ نہ کریں گے۔ اور پھر لفٹننٹ گورنر جن صاحب نے جو مسلمانوں کی رض کو خوب پہچانتے تھے خیال فرما کر کہ یہ لوگ علم کے لئے باعزت کے واسطے کچھ کوشش کرنے والے نہیں ہیں، البتہ انگریزی گورنمنٹ کے بڑے خیر خواہ ہیں اور اپنی خیر خواہی پر قائم رہنا چاہتے ہیں، نہایت خوبی سے اُن کو سمجھا یا کہ گورنمنٹ کی خیر خواہی بغیر تعلیم کے ایک دعوئے ہے بغیر دلیل کے اور ایک بات ہے صرف اُن سے کہنے کی اور بعد ایک بہت بڑی لمبی تمہید کے فرمایا کہ میں تمہاری خیر خواہی کو عملی خیر خواہی اُس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ گورنمنٹ کی اس خواہش کے پورا ہونے میں سب سے پہلے نہ کرو، کہ تمہارے لڑکے تعلیم مستحق ہوں۔

بلنٹ صاحب نے جو مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ بلکہ اپنی قوم میں مسلمانوں کی محبت میں نام ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت تعلیم و تربیت خراب دیکھ کر اور دوسری قوموں سے اُن کو ذلیل پا کر اور آئندہ کی حالت پر نظر فرما کر ایک بڑے مجمع میں مسلمانوں کے یہ کہا کہ میں ہندوستان کی آئندہ حالت کو خیال کرتا ہوں، تو میری رائے میں تم کو بہت کوشش کرنی ہوگی، اگر تم اور گروہوں کی برابر اپنا مرتبہ قائم رکھنا چاہو گے، اس لئے ہر سال بمقابلہ انگریزوں کے ہندوستانیوں کو زیادہ اختیار ملیں گے۔ اور وہ دن بہت قریب ہے کہ تمام سول ایڈمنسٹریشن انہیں کے ہاتھ میں ہوگا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نیاز زمانہ شروع ہونے والا ہے اور میں تمہاری حالت بہت ہی نازک پاتا ہوں۔ اگر تم وقت پر متنبہ اور مستعد نہ ہو اور وہ تدبیریں اختیار نہ کرو جو تمہارے ساتھی صلاح حال کے واسطے اختیار کرتے ہیں اگر تم اوروں کے ساتھ اپنے نہیں ملتا رہو گے تو تم پیچھے رہ جاؤ گے اور پھر ایام گزشتہ پر پچٹاؤ گے، مگر وہ پچھانا ایسا ہی بیکار ہوگا، جیسے کہ پولیسکل بدبختوں پر پچھانا بیکار ہوا ہے اُن پیشین گوئیوں سے جو پولیسکل منجھوں نے تمہاری آئندہ حالت کی نسبت کی ہیں اور اُن لوگوں کے صاف صاف کہہ دینے سے

جن کے ہاتھ میں تمہاری قسمت ہے، اس بات کا پورا فیصلہ ہو چکا کہ اب آئندہ کی تمہاری عزت یا ذلت، ترقی یا تنزل، اقبال یا ادبار، شکست یا فتح، رونا یا ہنسا، تمہارا مزا یا صیحا، خود تمہارے ہاتھ میں ہے اور وہ صرف اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت پر منحصر ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ترقی کرو، اور اُس قومی مقابلے میں جو اعلیٰ چیزوں کے حاصل کرنے کے لئے اس زمانہ میں ہر ایک فرقہ میں ہو رہا ہے تم بھی شریک ہو۔ اور اس دوڑ میں جو عزت کے میدان میں تمام قومیں کر رہی ہیں تم کسی کے پیچھے نہ رہو، تو تم کو چاہئے کہ اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کرنے میں کوشش کرو، اور اُن ذریعوں کو پورا کرو جو اُس کے لئے اس وقت تک خود تمہاری کوششوں سے طیار ہوئے ہیں۔

صاحبو! زمانہ کا تجربہ ہم کو ہو چکا، غفلت کے نتیجے ہم دیکھ چکے، اپنے ہاتھوں ہم نے اپنی حیات کر لی، کہ جو ہمارے دست نگر تھے ہم اُن کے محتاج ہیں، جن پر ہم حکومت کرتے تھے وہ ہمارے حاکم ہیں۔ جن کو ہم حقارت سے دیکھتے تھے وہ ہمیں ذلیل سمجھتے ہیں، جن کو ہم ناتربیت یافتہ کہتے تھے وہ ہمیں جاہل جانتے ہیں، ساری دنیا میں ہم بیک ورڈ قوم شمار ہیں، ہند سے لیکر لندن تک ہماری جہالت کا شہرہ ہے، تعلیم سے نفرت میں ہم ضربِ ہشل ہیں۔ غرض کہ اے صاحبو! جہاں تک ہم اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو تباہ کر سکتے تھے کہ چلے، اور جہاں تک ہم سے ہو سکتا تھا دلیل اور رُسا ہو لئے ہم نے بزرگوں کی کمائی ٹا دی، ہاشمی عزت کو ہم نے خاک میں ملا دیا، اب نہ ہم میں عصیت رہی نہ قومیت، نہ قریشی دبدبہ نہ عربی جوش، نہ فاروقی ہیبت رہی نہ حیدری شجاعت، لگوں ابھی جان باقی ہے اور کچھ وقت بھی، اگر ہمت کریں اور تحلیف اٹھاویں اور غیرت کو کام میں لاویں، تو ابھی کچھ کر سکتے ہیں، اگرچہ اور قومیں بہت دُور نکل گئیں اور ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں، اب بھی اگر چلنا شروع کریں تو شاید ان کی برابر ہو سکیں، بشرطیکہ سیدھی راہ پر چلیں، اور جلد چلیں، اور تیز چلیں۔ اور سیدھی راہ صرف اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت ہے جو ہم کو اُن کی برابر پہنچا سکتی ہے۔

بھائیو! ہندوستان کی اصلاح اور ترقی کی ہر ایک امید آج کل انگریزی زبان کی تعلیم اور انگریزی زبان کے ذریعے سے مغربی خیالات کے شائع ہونے پر منحصر ہے۔ اور آج کل صرف انگریزی زبان اور اُس کے لٹریچر کا ایک کامل علم ہی ترجیح اور عزت کے خاص ذریعے ہیں۔ اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت ہی ہندوستان کے باشندوں کو اپنے ملک کی گورنٹ میں شریک ہونے کے لائق بنا سکتی ہے۔ اور انگریزی زبان میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت ہی تمہارے آواز کو وہ قوت دے سکتی ہے جو سمندر پار پہنچ سکے، اور جس کو سات ہزار میل کے رہنے والے سُن سکیں اس چیز کو دوسری قوموں نے حاصل کیا۔ اور اُس کے نتیجے بھی پائے، مسلمانوں نے اُس سے غفلت کی اور محروم رہے۔ جو قومیں خدا نے ہندوؤں کو دی تھیں وہی ہم کو بھی دی ہیں مگر وہ انہیں کام میں لانے اور ہم نے انہیں بیکار کر دیا جس زمانہ میں وہ زندگی بسر کرتے تھے انہوں نے اُس کی

رفقار کو بچانا، جو غیر ملکی حالت میں ہوا تھا انہوں نے اپنے آپ کو اُس کے موافق بنایا، جس چیز کی بناؤ میں جو ہر شے تھی انہوں نے اُس کو حاصل کیا، اُس سے فائدہ اٹھایا۔ اور جس بات کے قدر دان کیجھے اُسی بات کے حاصل کرنے میں کوشش کی، اور عزت پائی۔ برخلاف اس کے مسلمانوں نے نہ زمانہ کی چال کو دیکھا، نہ ہوا کا منہ بچانا، نہ اپنی طرز کو بدلا، نہ ضرورت اور حاجت پر خیال کیا، کاہلی اور غفلت کی رنجشوں میں جکڑے رہے، اور غرور کے نشہ میں مست رہ کر تعصب اور نخوت سے، ہر چیز کو حقارت اور نفرت سے دیکھتے اور تمام بُرائیوں کے لئے خیالی بہادر و خیالی مذہب کا جیل کرتے رہے۔ حتیٰ انا ہمدھام

اللذات ومفرق الجماعات فسخان حال الذی لایعوت ومیداء الملک والمملکوت ۛ

صاحبو! اگرچہ منزل اور ترقی اور ذلت اور عزت کا ہمیشہ دور ہوا کرتا ہے اور مثل دلاب کے ٹیڈل کبھی بکھرا اور کبھی خالی ہوتا ہے، مگر تجربہ اور کوشش دو ایسی چیزیں ہیں کہ وہ پھر گرے ہوئے آدمیوں کو اٹھا سکتی ہیں۔ مگر مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ اکثر اُن میں سے اب تک نہ تجربہ سے کام لیتے ہیں اور نہ کوشش کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ دوسری قومیں کیا کر رہی ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے، وہ دیکھ سہے کہ دوسری قومیں کس تیزی سے چل رہی ہیں اور خود نہیں چلتے، اور اگر چلتے ہیں تو سیدھی راہ چھوڑ کر اُلٹے راستہ پر۔ وہ دیکھتے ہیں کہ صرف اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ درجہ کی انگریزی لیاقت میں ہندوؤں کو اُن حقوق کا مستحق بنایا جو گورنمنٹ اپنی سب رعایا کو دینا چاہتی ہے لیکن مسلمانوں کا اب تک اُس کا خیال نہیں ہوتا، نہ اُس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نہ اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اُن کی ہمتیں کچھ ایسی ٹوٹ گئیں ہیں کہ وہ وہاں تک پہنچنے کی اپنے آپ میں طاقت ہی نہیں پاتے، اور کچھ ایسے مست ہو گئے ہیں کہ اس راستے پر چلنے کا ارادہ تک نہیں کرتے مگر باوجود اس کے وہ انہیں حقوق کے طالب ہیں جن کو ہندو حاصل کر رہے ہیں، مگر کس طرح، ہندو اپنی لیاقت اور استحقاق جتا کر، اور مسلمان اپنی عاجزی اور نالائقی کا اظہار کر کے، وہ اپنا حق مانگتے ہیں اور ہم بھیک، وہ اپنا قرضہ چاہتے ہیں اور ہم تبرعات، وہ یہ کہہ مانگتے ہیں کہ ہم نے تعلیم پائی، ہم نے علوم سیکھے، ہم نے انگریزوں کی برابر امتحان دیا اور مقابلے کے امتحان کے لئے طیار ہیں، ہمارا حق ہم کو دو۔ ہم اپنی نالائقی اور اپنی بے علمی دکھا کر عاجزی سے کہتے ہیں کہ ہم بے علم ہیں، انگریزی علوم سے ناواقف ہیں۔ ہم امتحان نہیں دے سکتے ہمارے بزرگوں پر خیال کے رحم کرو، اور بھیک کا ٹکڑا دو۔ ہندو مستعد ہیں کہ جدھر حکومت چلے اور جس چیز کی سلطنت ضرورت سمجھے اُس کا ساتھ دیں، اور مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ سلطنت اُن کی ضرورت مقدم سمجھے اور جس طرف وہ چلنا چاہیں گورنمنٹ اُسی طرف چلے۔ ہندو خوش ہیں کہ سلطنت کے انقلاب نے اُن کو فائدہ پہنچایا۔ اور مسلمان روتے ہیں کہ سلطنت کے بدلنے سے اُن کی قسمت بدل گئی۔ مگر کیوں، اس لئے کہ ہندوؤں نے اپنی حالت کو سلطنت کے بدلنے سے بدل دیا۔ اور مسلمانوں نے اپنی حالت کے بدلنے کا ارادہ

تک نہ کیا۔ مسلمانوں کا فرض ناید ہے کہ انگریزی سلطنت نے اُن کو تباہ کر دیا، مگر میرا کہنا یہ ہے کہ نہیں انگریزی سلطنت نے کچھ تباہ نہیں کیا، بلکہ علم کی سلطنت اُن کی تباہی کا باعث ہوئی۔ یہ ایک مسلم بت ہے کہ سلطنت کے انقلاب سے دہی ملک خراب ہوتا ہے جو آباد ہو۔ اور وہی لوگ بگڑا تو ہیں جن کی حالت اچھی ہو، اور خدا بھی یہی فرماتا ہے کہ ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها وجعلوا اعسن الاهلها ذلک وکن لک یفعلون ۛ

مگر ہندوستان کے مسلمانوں کو جس سلطنت نے تباہ کیا اور جس نے اُن کی عزت لی، اور جس نے ان کے معزز لوگوں کو ذلیل کیا، وہ علم کی سلطنت ہے، نہ یہ انگریزی حکومت، جس قدر وہ اس سلطنت کا مقابلہ کرتے گئے ذلیل ہوئے، اور جس قدر اُس کی اطاعت نہ کی سزا پائی۔ اگر وہ ہندوؤں کی طرح علم کی سلطنت کے مطیع ہوتے، اور اُس کی مرضی پر چلتے، بلاشبہ وہ اس کی معزز رعیت ہوتے۔ مگر انہوں نے علم کی سلطنت کا مقابلہ کیا، اُس سے بغاوت کی، اُس کے حکم کو نہ مانا، اس لئے وہ خراب ہوئے۔ مصیبتیں اٹھائیں اور ذلیل ہوئے ۛ

مگر صاحبو! علم کی سلطنت جیسی اپنے مرکبوں کو مزادینے میں سخت ہے، ویسی ہی ہر وقت اپنے باغیوں کے قصور معاف کرنے پر بھی آمادہ ہے۔ اُس کے حقوق کا اشتہار ہر وقت جاری ہے۔ اور کوئی نافرمانوں کو پھر اپنی سلطنت میں شریک کرنے کے لئے آمادہ ۛ

پس اے میرے بھائیو! اور اے علم کی سلطنت سے بغاوت کرنے والو! اپنے حال پر رحم کرو اور علم کی وسیع سلطنت میں جو درجہ اور جو منزلت چاہتے ہو، اُسی کے لائق اپنے آپ کو بناؤ، اگر اُن کی رعیت بن کر رہنا پسند کرتے ہو، اور قلیوں، اور مزدوروں میں شریک ہونے پر قانع ہو بہتر۔ اور اگر بڑے درجہ کے طالب ہو، اور اُس کے معزز فرقہ میں شریک ہونے کی آرزو ہے، اور اُس کے مشیر بننے کی تمنا، تو کوشش کرو، اور وہ ذریعہ حاصل کرو جو تم کو اُس درجہ پر پہنچنے کے لائق کرے ۛ

صاحبو! کون شخص ہے جو اعلیٰ درجہ پر پہنچنے کا آرزو مند نہ ہو گا۔ اور بغیر ایک ایسے گروہ کے طیارہ کر کے جو درحقیقت اعلیٰ درجہ کا تعلیم و تربیت یافتہ نہ ہو، کون اب قوم کی ترقی کی امید کر سکیگا، اس لئے اگر آپ میری رائے سے متفق ہیں تو میں کمال ادب و باتیں عرض کرتا ہوں، ایک یہ کہ آپ اُس رزولوشن کو منظور فرماویں جو سرسید نے پیش کیا ہے، دوسری یہ کہ اُس کی تکمیل کی نظر توجہ کریں ۛ

پہلا امر کے متعلق مجھے اس شبہ کے دُور کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کا اثر چھو اسکولوں پر پڑا ہو گا۔ اس لئے کہ میرے نزدیک اس کی منظوری اور اُس کی تعمیل سے اسکولوں میں مسلمانوں کے زیادہ داخل کرنے کا اور شوق پیدا ہو گا۔ اور جہاں اسکول نہیں ہیں وہاں نئے اسکول قائم کرنے کی ضرورت

ہوگی، اس لئے کہ جب تک ہزاروں مسلمان لڑکے اسکول میں نہ پڑھیں گے، تو کالج کلاس میں داخل ہونے کیلئے طالب علم کہاں سے آویں گے، اور مدرسہ علوم کے قائم کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ ایک ایسا مرکز ہو، جس کا دائرہ جہاں تک وسیع ہو سکے وسیع کیا جاوے۔ مدرسہ علوم کے بانی اپنے ایلبرس میں جو واسطے گورنر جنرل ہند کی خدمت میں پیش کیا تھا اپنی خواہش اسکولوں کی ترقی کے متعلق ظاہر کر چکے ہیں۔ اور جیسا کہ سپر صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا ہے اُن کا بھی مقصد نہ تھا کہ اسکول قائم نہ ہوں، البتہ اُن کی یہ رائے ہے کہ اسکولوں میں اسٹاف اعلیٰ درجہ کا ہوا لکڑیں اس سے اتفاق نہیں کرتا، مسلمانوں کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ ایسی قیدوں کے پابند کئے جائیں، اور کوئی اسکول بغیر بارہ سو روپیہ مہینے کے خرچ کے قائم نہ ہو۔ مگر اس موقع پر اس بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے اس لئے کہ اس وقت کے پیش کئے ہوئے رزلوشن میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے اس قسم کا شبہ ہو سکے، اس لئے اسکولوں کا قائم کرنا، اس رزلوشن کی منظوری یا اس کی تعمیل کا حاج نہیں ہے، بلکہ اُس کا مقدمہ ہے، لاکھوں لڑکے جب ابتدائی کلاس میں ہوتے ہیں تب اسکول کی اعلیٰ کلاس میں اُن کا شمار ہزاروں پر رہ جاتا ہے، اور جب اسکول کی اعلیٰ کلاس میں ہزاروں کا نمبر ہوتا ہے، تب کالج کلاس میں اُن کا شمار سینکڑوں پر رہ جاتا ہے۔

صاحبو! جتنے بچے ڈالے جاتے ہیں وہ سب نہیں اُگتے، اور جتنے اُگتے ہیں وہ سب کھل نہیں لاتے یہی حال تعلیم کا ہے کہ جتنے اوزار دیجے میں داخل ہوتے ہیں وہ سب اعلیٰ درجے تک نہیں پہنچتے اور جو اعلیٰ درجے پہنچتے ہیں وہ سب کامیاب نہیں ہوتے اس لئے جتنی کوششیں مسلمان طلبہ علموں کے اسکول میں زیادہ داخل ہونے کے لئے کی جاویں گی، وہ گویا زینہ ہے اعلیٰ درجے کی تعلیم دلانے کا، اور یہ امر کہ مسلمانوں کو سرکاری اسکولوں میں پڑھانے کی رغبت لائی جاوے یا اُن کے لئے علیحدہ اسکول قائم ہوں یہ ایک امر ہے مختص المقام۔ ہر جگہ کے مسلمان خود اس کا فیصلہ کر چکے ہیں اس لئے سرکاری وہ غلط فہمی جو لکھنؤ میں ہوئی تھی اس رزلوشن سے نہیں ہو سکتی، لہذا مجھے امید ہے کہ آپ اسے منظور فرماویں گے۔

دوسرے امر یعنی بعد منظوری کے اُس کی تعمیل کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ اگرچہ سپر صاحب کو اس کام میں بہت کامیابی ہوئی اور نہایت حیرت انگیز مدد قوم نے کی اور بہت کچھ کام ہو گیا لیکن پورا ہونا اُس کا باقی ہے۔ عمارت کو آپ دیکھ رہے ہیں کہ ناتمام ہے، کمرے اور صوبے پڑے ہیں، بہت سے بوڑھنگے ہوس بننے باقی ہیں، مسجد پر صرف چھتر بڑا ہے، معمولی اخراجات کے لئے بھی کوئی ایسا سرمایہ نہیں ہے، جس پر کھروسہ ہو سکے، نہ تنخواہوں کے لئے کوئی فنڈ ہے، جس کی آمدنی پر اطمینان ہو۔ نہ وظیفوں کے لئے کوئی مستقل سرمایہ ہے، جس میں خلل چرنے کا اندیشہ نہ ہو۔ بلکہ بلحاظ تعمیر مکانات کے اور کیا بلحاظ اخراجات معمولی کے یہ کالج گویا ایک ایسی عمارت ہے جو لوگوں کے ہاتھ

پر کبھی ہوئی ہے، جو کوئی اپنا فائدہ الگ کر لے اتنا ہی حصہ گر پڑے بہت بڑے زبردست صرف دواقتہا میں ایک گونہ غنٹ کا دوسرے سرکار نظام کا جن پر بھروسہ ہو سکتا ہے۔ باقی کوئی آمدنی اعتبار رکھلاؤ نہیں ہے۔ اس لئے تحقیقت میں اگر آپ مدرسۃ العلوم کو کچھ مفید سمجھتے ہیں اور اس کو قوم کی ترقی کا ذریعہ۔ تو اس کی تکمیل پر توجہ فرمائیے، اور توجہ بھی نہ معمولی بلکہ دلی۔ میں آپ کے خیالات کا رہنما بننا نہیں چاہتا، اور نہ آپ کو اس کی تکمیل کی راہیں بتانے کی جرأت کر سکتا ہوں، بلکہ صرف میں ان لفظوں کو نقل کرتا ہوں، جو نہ ایسے شخص کے منہ سے نکلے ہیں جو مسلمان تھا، نہ مسلمان ملک کا رہنے والا، اور نہ جس کو اس مدرسہ کی تکمیل سے فائدہ، نہ اس کے برباد ہو جانے سے نقصان بلکہ صرف انسانی ہمدردی اور اس مدرسہ کی خوبی اور عمدگی نے اسے اس بات پر آمادہ کیا تھا، کہ اس نے خود بھی اس میں چندہ دیا، اور ایک بورڈ ٹنک ہو س بنوایا، اور مسلمانوں کو ایسے لفظوں میں اس کی تکمیل کی ترغیب دی، کہ جس کو سن کر نہایت ہی سخت دل ہو جو دلپیچے۔ وہ نیک نیت ترغیب دینے والا ڈاکٹر ہنڈلر ہے، جس نے اپنی اسپیش میں اس کام کے پورا کرنے کے لئے یہ کہا تھا کہ ”خاص مکان جب تک وہ پورا ہو جائے گا دنیا کی ہر ایک تعلیم گاہ کے ساتھ مقابلہ کر سکیگا اور اپنے حصوں کی وسعت اور عظمت کے لحاظ سے کیمبرج یا آکسفورڈ کی قابلِ تعظیم عمارتوں سے سبقت لیجا دیگا۔ لیکن بے صاحبو! اگرچہ اس کام کو بڑی ترقی ہوئی ہے، لیکن اب بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، میں دل سے امید کرتا ہوں کہ بہت سے شخصوں کے دلوں میں اس عمدہ کام میں شریک ہونے کا دلول پیدا ہوگا، ہم میں سے ہر ایک شخص کی زندگی میں ایسے زمانے گزرتے ہیں کہ ہماری طبیعتوں کو کسی عزیز دوست یا رشتہ دار کی موت کے سبب سے بڑی رقت ہوتی ہے، اور ہم ان شخصوں کی ایک یا دو کاربنا ناچاہتے ہیں جن کے ساتھ ہم محبت کرتے تھے، اور جو حلت کر گئے ہیں، لیکن جن حالت میں کہ ایک ایسا کام نامکمل پڑا ہوا ہے، جیسا کہ یہ ہے، تو مسلمانوں کو اس واسطے اپنے مردوں کے اوپر خالی حجرے بنانا یا عیدائوں کو اپنے گرجاؤں میں ستیا عدہ یا دگاریں بنانا واجب ہے۔ روپیہ کا ہر سینکڑہ جو اس مکان کے واسطے چندہ میں دیا جاتا ہے، گویا بنی نوع انسان کی ہمدردی کے واسطے دیا جاتا ہے، وہ نہ ارادہ سے کم میں ہر ایک فیاض شخص ایک خوبصورت مکان اس صبح صبح میں بنوا سکتا ہے جس پر اس شخص کا نام یا جس شخص کا نام وہ چاہے کندہ کیا جائیگا۔ لوگ بہت طریقوں میں بقلے نام کے خواستگار ہوتے ہیں، بعض تو کتابیں تصنیف کرتے ہیں، بعض اعلیٰ درجہ کے سرکاری منصب پر ترقی پاتے ہیں، بعض تو پ کے منہ پر شہرت حاصل کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں لیکن میں نے ہمیشہ یہ خیال کیا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ شک شہرت ایک بٹھے دار العلم کے قائم کرنے والی کی شہرت ہے۔

مگر اے صاحبو! جیسا کہ ڈاکٹر ہنڈلر صاحب نے فرمایا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نیک نامی کے خیال سے

مسلمان اس میں مدد کریں، یا اپنی یادگار بنائیں یا ثواب کی امید پر کام کریں، سب سے کم اس لوگوں کی حالت اس سے گزر گئی ہے، اور ایسے کام میں شریک ہونا یا نہ ہونا نیکنامی اور ثواب کا معاملہ نہیں رہا، بلکہ ایک مسئلہ ہو گیا ہے، قوم کی زندگی اور موت کا۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ قوم زندہ رہے یعنی اُس کی اور قوموں میں عزت ہو، وہ بھی دوسری قوموں کی برابر درجے حاصل کرے، وہ لوگ ضرور دل و جان سے مدد کریں گے اور اس ادھورے کام میں ساعی ہوں گے۔ اور جو صاحب قوم کی زندگی نہیں چاہتے یا اسے اس کی حیات کا ذریعہ نہیں سمجھتے، نہ وہ توبہ کریں گے نہ ہمارا روئے سخن اُن کی طرف ہے۔ مگر وہ دیکھیں اور خوب یاد رکھیں، کہ وہ دن قریب ہے کہ وہ اسے سمجھیں گے۔ مگر اُن کا سمجھنا کام نہ آویگا۔ اقتراب لانا سبھاہمد وھمد فی غفلۃ معر ضنون ❖

صاحبو! اس دنیا میں ہر چیز جو مخلوق ہے، جاندار ہو یا بیجان، وہ اپنی زندگی کے لئے کوشش کرتی ہے، اور اُس کی لڑائی دوسروں سے جاری رہتی ہے۔ اسے علم لمبغیات میں تنازع للبقا کہتے ہیں۔ نباتات سے لیکر حیوانات تک، سب میں اس کوشش اور جنگ کا اثر پائیگا۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ خود قائم رہے، اور اپنی نسل کو پھیلاوے، اور دوسرے کی جگہ خود لیکر اُسے فنا کرے۔ اس لڑائی میں جو قوی ہوتا ہے، وہ ضعیف کو ہٹا کر خود اُس کی جگہ پر قبضہ کر لیتا اور اپنی نسل کو بڑھاتا ہے ❖

بھائیو! یہی حال انسان کا ہے، کہ ہر ایک قوم اپنے لئے جگہ تلاش کرتی اور اپنے بڑھنے اور دوسرے کو فنا کرنے کے لئے لڑتی ہے، اور جو قوی ہے، وہ ضعیف کو مار کر خود اُس کی جگہ پر قابض ہو جاتی ہے، اور اُس کا فیصلہ ہمیشہ قوت کیا کرتی ہے، اور اس زمانہ میں قوت علم ہے اور یہ منقولہ کہ العاصۃ قوۃ جیسا کہ اس وقت پر صادق ہے۔ کبھی ایسا نہ تھا، پس اب دیکھو کہ ہر ایک قوم اپنی اپنی قوت کو ترقی دے رہی ہے اور تنازع للبقا کے مسئلہ پر آج کل نہایت شور سے عمل جاری ہے۔ اگر آپ نے اس قوت کو پورے طور پر حاصل نہ کیا، اور اپنے اس ضعف کا علاج نہ فرمایا تو یاد رکھو، اور خوب یاد رکھو، کہ تمہارا دنیا میں رہنا ناممکن ہو گا۔ میری یہ عرض یہ نہیں ہے کہ تم نام کے لئے باقی نہ رہو گے، بلکہ ایسی حالت پر نہ رہو گے جو تم کو کوئی معزز قوم کا آدمی سمجھے ❖

صاحبو! ذرا اپنی مصیبتوں پر خیال کرو۔ اور جن آفتوں میں تم مبتلا ہو اور جیسے کچھ اب تک بے خبر ہو اس پر غور کرو آگ لگی ہوئی ہے، اور تم تاپ رہے ہو، موت کا بازار گرم ہے اور تم بے فکر ہو، قافلہ چلے جاؤ اور تم سو رہے ہو، گھر میں ماتم ہو رہا ہے اور تم قہر میں ہو، قیامت کی آواز تم بے خبر ہو ❖

اے میرے بھائیو! کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ علم کا آفتاب مغرب سے نکلے، مغرب سے

آفتاب کا نکلنا قیامت کی نشانی ہے، اور کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ نشانی ظاہر ہو گئی، علم کا آفتاب جو ہمیشہ مشرق سے نکلتا تھا مغرب سے نکل چکا، اور مسلمانوں کے حق میں جو قیامت آنے والی تھی وہ آگئی اور اُن کے لئے توبہ کا دروازہ بند ہو گیا۔

بھائیو! توبہ کا دروازہ بند ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ کوئی توبہ کرے اور خدا قبول نہ فرماو اُس کے رحم و کرم سے توبہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ وہ وقت ایسا ہو گا کہ بہ سبب غفلت کے کسی کو اپنی حالت کی خبر نہ ہوگی، نہ کوئی توبہ کرنے کا خیال کرے گا، کیا خیال آپ اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتے کہ قیامت آگئی، اور عذاب شدید میں مبتلا ہونے کا وقت آگیا۔ مگر کوئی خیال نہیں کرتا، آنکھ رکھتے ہیں مگر نہیں دیکھتے، کان رکھتے ہیں مگر نہیں سنتے، دل رکھتے ہیں مگر نہیں سمجھتے، یہ پردہ غفلت کا کیوں آنکھ اور کان اور دل پر پڑا ہے، اور کس نے اُن کو ایسا غافل کر دیا ہے۔ کوئی ماننے یا نہ ماننے، مگر میں یہی کہوں گا، کہ اُس نے جو ہمیشہ ایک قوم کو اٹھاتا اور دوسری کو گراتا، وہی جو ایک کو پیدا کرتا، اور دوسری کو مارتا رہتا ہے۔ ورنہ آنکھ ہواور نہ دیکھیں، کان ہوں اور نہ سنیں، دل ہواور نہ سمجھیں۔

چشم باز و گوش باز و این کا

خیرہ ام در چشم بندئے خدا

اے بھائیو! علم طبعیات کا یہ سلسلہ ہے کہ جو چیز اوپر سے گرتی ہے جس قدر نیچے آتی جاتی ہے اُس قدر اُس کے گرنے اور زمین پر پہنچنے کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے، اور تیزی بھی اصداً قائم مضاعفہ حیال ہماری قوم کا ہے، کہ اُس کے زوال کی چال بہت تیز ہوتی جاتی ہے، اور اُس کے تیز کرنے کے اسباب بہت جمع ہو رہے ہیں۔ ذرا غور فرمائے کہ ادھر ہماری حالت بُری ہوتی جاتی ہے، ادھر امتحان کی سختیاں ترقی پر ہیں، ادھر ہمارا افلاس زیادہ ہوتا جاتا ہے، ادھر تعلیم کے خرچ بڑھتے جاتے ہیں، ادھر ہم کو اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے، ادھر سرکار اعلیٰ تعلیم میں مدد کرنے سے دست کش ہونا چاہتی ہے۔ کل کی بات ہے کہ اگر تنویر کے امتحان کو جاتے، تو اتنی باتوں کے پاس ہوتے، اب مشکل سے چالیس یا پچاس امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں، بلکہ بعض امتحانوں میں ساٹھ فیصدی تک ناکامیوں کا واسطہ پایا جاتا ہے۔ کل تک گورنمنٹ اعلیٰ تعلیم میں مدد کرتی تھی، میونسپلٹی مدرسوں کو اعانت پہنچتی تھی، اب روز بروز اُن میں کمی ہوتی جاتی ہے۔

آں درخت بدجوان ترقی شود ویں کنندہ پیر مضطرب شود

ہاں تبر گیسر مردانہ بزن تو علی دارا بس در قیاس بکن

صاحبو! اب ایک لحظہ کے لئے اُن اسباب پر بھی خیال کر لیجئے جو اس کی تکمیل کے مانع ہیں۔ میرے نزدیک کچھ اسباب پڑنے ہیں اور کچھ نئے، پڑانے اسباب میں سب سے بڑا سبب

افلاس ہے، اگر کیا آپ اسے قبول کر سکتے ہیں جب کہ آپ دیکھتے ہیں کہ باوجود اس افلاس کے مسلمان دنیا کرتے ہیں، بیاہر چاتے ہیں، بیٹوں کا خنہ کرتے ہیں، صاحبزادے کی بسم اللہ، اور آئے دن سینکڑوں طرح کے خرچ رہ کر رہتے ہیں، کوئی بند نہیں ہوتا، بلکہ فیاضی اور وسعہ داری کا ہمارے بھائیوں کو یہاں تک خیال ہے کہ بیوی کا زیور پہن کریں، گھر کا سامان فروخت کریں، زمینداری اور گھر تک پیسے، مگر کسی خاندانی رسم میں فرق نہ آوے، اور کوئی تقریب نہ بچائے، کیا ایسے لوگ جو عزت اور نام کا اس قدر خیال رکھتے ہوں، اور خاندان اور بزرگوں کی ناموری کے اس قدر خواہاں ہوں، اور ان کی فیاضی اور سخاوت اس درجہ بڑھی ہوئی ہو، تعلیم کو عزت کی سمجھتے، یا اپنے بزرگوں کی ناموری اس میں دیکھتے، یا اپنی اولاد کا اس میں فائدہ سمجھتے، تو وہ مدد کرنے سے دریغ کرتے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ وہ اس کو کوئی نام یا فائدہ کی چیز ہی نہیں جانتے، اگر مفید سمجھتے تو اسے میرے عزیز و با دوستانہ مسلمانوں کو جانے دو، کوئی غریب مسلمان ایسا نہ ہوتا جو اس کام میں شریک نہ ہوتا۔ اگر دور دریاں اس کو ملتی، تو ایک ٹکڑا اسی میں سے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے دیتا۔ کیا یورپ کے لوگ سب امیر ہیں اور کیا وہ کوئی غریب نہیں ہے؟

صاحبو! جیسے وہاں دو تین زیادہ ہیں، ویسے ہی مجلس اور غریب بھی کثرت سے ہیں۔ مگر وہ بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں، خود فائدہ کرتے ہیں، اور اپنی مزدوری کے چار پیسوں میں سے ایک پیسہ اس میں لگاتے ہیں۔ سینکڑوں آدمی وہاں ایسے ہیں، جو چار میں شکر نہیں ڈالتے، اس لئے کہ وہ کار خیر میں مدد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے، اس لئے شکر کی قیمت ہی اس میں دیدیا کرتے ہیں۔ سچا رڈ گارتھ چیف جسٹس ملک نے ایک مرتبہ تعلیم و تربیت کے متعلق تقریر کرتے وقت انگلستان کے غریبوں کی نسبت یہ کہا تھا کہ ”عمدہ تعلیم و تربیت ہمیشہ قومی ترقی کا سبب ہوتی ہے۔ اور نہ صرف امیر اور دولت مند، بلکہ غریب اور بے قید و رگوں نے صرف اپنی محنت اور کوشش سے یہ درجہ حاصل کیا ہے۔ سینکڑوں آدمی جو بچاؤ فائدہ کے دو تین نہ تھے، اور تعلیم و تربیت پائے ہوئے خاندان میں بھی نہ تھے، صرف اپنی خاص استعداد اور محنت کی بدولت اعلیٰ درجہ پر تعلیم و تربیت کے پونچے اور دولت و ثروت و عزت سب کچھ پیدا کی۔ اور انگلستان میں ہزاروں آدمی اس وقت ایسے ہیں جنہوں نے بحر ایک عمدہ تعلیم و تربیت کے اور کسی ذریعہ سے روپیہ اور عزت حاصل نہیں کی۔ انگلستان میں والدین اپنی اولاد کو عمدہ تعلیم و تربیت دینے کی غرض سے ہمیشہ صرف لڑاؤ دنیوی ہی نہیں، بلکہ زندگی کی معمولی آسائش بھی ترک کر دیتے ہیں۔ اور وہ کیوں ایسا کرتے ہیں اس لئے کہ وہ تعلیم کو سب سے زیادہ عمدہ اثر جو وہ اپنی اولاد کو دیکھتے ہیں خیال کرتے ہیں۔ نہایت غریب نسل کے آدمی اعلیٰ درجہ کی عزتوں کے اس ملک کے واسطے اپنی الواعزی سے سچی کرتے ہیں۔ اور امرار کے لڑکے تجارت اور کاروبار کے کرنے میں اپنی کشتی نہیں سمجھتے؟“

بھائیو! نئے اسباب جو مدد کے مانع ہیں، اُس میں سے دو سبب ایسے ہیں جن کا ذکر اس موقع پر ضرور ہے۔ ایک یہ کہ بعض لوگوں کو مفید کاموں کے کرنے کا خیال پیدا ہو گیا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی کام قوم کے لئے خواہ بامید ثواب خواہ بغرض نیک نامی کے کریں۔ اس لئے کوئی قیمتی خانہ بناتا ہے، کوئی محنت آج خانہ، کوئی اسکول۔ میں نہیں کتا کہ یہ کام نہ کرو، مگر ترتیب کا خیال رکھو، جو زیادہ ضروری ہو اُسے پہلے کرو، جو اُس سے کم ہو اُسے پیچھے رکھو۔ یاد دو نوں کام کرو، اور ایک کے خیال سے دوسرے کو نہ چھوڑو۔ اگر کسی گھر میں چار سیارہ ہوتے ہیں، تو بلاشبہ چاروں کا علاج کرنا پڑتا ہے۔ مگر جو بزرگ خاندان ہوتا ہے اور جس پر خاندان کی عزت اور نام کا قیام منحصر۔ اُس کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے، اس لئے کہ اُس کی زندگی کو یا سب گھر کی زندگی ہے۔ اس لئے اُسے میرے بھائیو اپنی اپنی خواہش کے موافق کچھ جاری رکھو، مگر مدرسۃ العلوم کی تکمیل کو بھی ایک ضروری کام سمجھو۔

دوسرا سبب نئے کالجوں کے قائم کرنے کا شوق۔ میں نہیں کتا کہ یہ ایک کالج کا قیام ہندوستان کے لئے کافی ہے یا نہیں یہ نہیں سمجھتا کہ سارے ہندوستان کے مسلمان یہاں آ سکتے ہیں، یا میں نہیں کتا کہ کہ سوائے اس کے دوسرا کالج قائم نہ کرو، بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ خدا وہ دن لائے کہ ہر شہر میں ایک مدرسۃ العلوم قائم ہو، اور ہر شہر میں ایک سید کھائی دے، مگر چونکہ یہ کالج قوم کی مدد سے قائم ہوا ہے، اور کل ہندوستان کے مسلمانوں کی توجہ اور مدد سے اس درجہ تک پہنچا ہے، اور اُس کے مقصود اور اصول اور نتائج کی تعریف ہو چکی ہے، اس لئے اسے ناقص رکھنا، اور ادھورا چھوڑنا، غالباً خود آپ کے نزدیک مناسب نہ ہوگا۔

صاحبو! کالج کی مثال جہاز سے دی گئی ہے، ایک کالج کا کھولنا ایسا ہے، جیسا کہ جہاز کا سمندر میں چلانا جہاز کا بندرگاہ میں سے روانہ کرنا آسان ہے، لیکن اس بات کا دیکھنا کہ وہ مضبوط ہے اور سمندر کے تلاطم کا تحمل کر سکتا ہے، اور اُس کے کیل اور کانٹے درست ہیں بہت مشکل ہے۔ کیونکہ جس قدر جہاز آگے بڑھتے جاوے گا، ایک وسیع اور بے تحقیق سمندر اُس کو ملیگا، اور چھپی ہوئی چٹانوں اور پہاڑیوں پر اُسے جانا پڑے گا۔ اور جو شخص اُس کے چلانے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کو اس بات کا سوچنا لازم ہے کہ وہ اُسے کہاں لئے جلتے ہیں اور اُس کی حفاظت کا اُنہوں نے کیا انتظام کیا ہے۔ اور جو لوگ کہ اُس پر سوار ہوتے ہیں، ان کو بھی سوار ہونے سے پہلے دیکھ لینا ضرور ہے، کہ جن کے ہاتھوں میں وہ اپنی جان سپرد کرتے ہیں، وہ نیک دل اور شریف ہونے کے علاوہ جہاز کی ناخدا کی قابلیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔

اسے میرے بزرگو! مجھے امید ہے کہ کوئی شخص مجھ پر مدرسۃ العلوم کی بیجا تائید کا الزام لگائیگا اور میری نسبت کسی قسم کا دوسرا شبہ نہ کریگا۔ میں بذات خود مدرسۃ العلوم سے دیرپا ہی تعلق رکھتا ہوں جیسا کہ آپ لوگ۔ اُن وہ نیاز جو مجھے اپنے بزرگ سر سید کی خدمت میں حاصل ہے بعض نیک دل

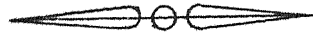
مسلمانوں کو یہ شبہ پیدا کرے کہ مدرسہ کی تائید اُن کے ذاتی خیال سے کی گئی ہے، اسے میں قبول کرتا اور
 آواز بلند کرتا ہوں، کہ میرے نزدیک **مسجد** کی تائید قوم کی تائید، مسلمانوں کی تائید، اور اپنی تائید
 ہے میرے نزدیک اُن کی محویت قوم کے کاموں میں اب ایسی نہیں رہی، کہ اُن کا مدد کرنا اور قوم کا مدد
 کرنا، دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہوں، بلکہ دونوں حقیقت میں اب ایک چیز ہیں۔ جب کہ میرے دل کو اس کا
 پورا یقین ہے، کہ اس وقت **مسجد** کے موافق نہ کوئی قوم کا خیر خواہ ہے، نہ اُس خیر خواہی کی راہ
 کا جانتے والا، نہ کوئی اُن کی برابر قوم کا آرزو مند ہے، نہ اُن کی تدبیروں کا سمجھنے والا۔ نہ کسی نے
 مثل اُن کے مسلمانوں کی ترقی کے اسباب پر غور کیا، نہ مثل اُن کے کسی نے قوم کی ترقی کے وسائل
 متیا کرنے میں کوشش کی، نہ مثل اُن کے کسی شخص نے اپنی ساری عمر اس خط میں ضائع کی، نہ اُن کے
 موافق کسی شخص نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے مسئلہ پر غور کیا، نہ اُن کے موافق کسی شخص نے اس مسئلہ کی
 مشکلات کو سمجھا یا، نہ مثل اُن کے کسی کی کوششوں کے ایسے عمدہ نتیجے ظاہر ہوئے، اس پر بھی اگر میں
 اُن کی تائید کو قوم کی تائید نہ سمجھوں، تو میں آواز بلند کرتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو قوم کا بدخواہ، اور قوم
 کا دشمن اور قوم کے زوال پر خوش ہونے والا سمجھوں گا، نہ قوم کا خادم، نہ قوم کا خیر خواہ، اگر کوئی نیک دل
 یہ خیال کرے کہ اس کالج کی تکمیل گویا **مسجد** کی ناموری کی تکمیل ہے تو اسے اختیار رہے یا خیال
 کرے۔ مگر اے صاحبو! اب اُن کی شان اس سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔ اور اُن کا مقام اس سے بڑھ گیا
 ہے، جو عزت و ذلت اُن کی قسمت میں کبھی تھی اُن کو مل گئی، اور جس اونٹنے یا اعلیٰ درجہ پر وہ پہنچنے والے
 تھے، وہ پہنچ گئے، اب زمانہ کا تقاضا بھی اُن کی عزت اور نام کو ٹٹا نہیں سکتا۔ مدرسہ کی تکمیل **مسجد** کی
 عزت کی تکمیل نہیں ہے، بلکہ قوم کی عزت کا پورا کرنا ہے، ورنہ دنیا ہی کیسے کہ تمام مسلمانوں میں صرف ایک
 آدمی تھا، جس نے قوم کے لئے اپنی جان و مال کو وقف کیا، جس نے قوم کی عظمت اور شان کو بڑھانا چاہا،
 جس نے قوم کی ترقی کا ایک عمدہ ذریعہ پیدا کیا۔ مگر افسوس کہ قوم نے اُسے پورا نہ کیا اور اسے تکمیل پر
 نہ پہنچایا۔

پس اے صاحبو! اس کا ناقص ہونا گویا قوم کی عزت اور ناموری کا ناقص ہونا ہے، نہ
مسجد کا۔ اگر قوم توجہ کرے اور اس کام کو دل پر رکھے تو اس کی تکمیل کچھ مشکل نہیں ہے اگر ایک ایک
 آدمی جمع کرنے پر لوگ متوجہ ہوں تو لاکھوں روپے جمع ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ قوم توجہ کرے، اور اس کام
 کے پورا کرنے پر آمادہ ہو، اور اُسے اپنا کام سمجھے۔

صاحبو! یہ امید کرنا کہ بغیر اس کے کہ کوئی خاص جماعت اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کرے،
 اور وہ اُن مختلف طریقوں سے جو وقتہ فوقتہ تجویز کئے گئے ہیں روپیہ کا جمع کرنا اپنے ذمہ لے۔ اس
 کام کا پورا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ اس وسیع اور پُر اثر مجمع میں، جو صورتیں شفیق

اور محبت قومی اور دوزانہی اور اسلامی جوش کی نظر آتی ہیں، اور جو مسلمان تعلیم و تربیت کی اشاعت کے
تو اُن، اور مسلمانوں کی بہبودی کے متمنی، اور اپنی قوم کی ترقی کے آرزو مند، اور قومی خدمت کے لئے پھر
آمادہ ہیں، وہ اس کام کو اپنے ذمہ لینگے، اور ایک ایسی کمیٹی قائم کریں گے، جس کا عملاً اس کام کی تکمیل کا معاہدہ
اور مشترک کجسم واحد کام کرنے کا ارادہ ہو، ذرا وہ اپنے وقت کا کچھ حصہ اس کام میں لگا دیں، اور قومی تعمیر
اور قوم سے قوم کے لئے بھیک مانگیں۔

اے میرے عزیزو! جو لوگ ایسا کریں گے وہ قوم کے لئے برکت ہوں گے، وہ منہ والی قوم کے جان
ڈالنے والے سمجھے جاویں گے، وہ ڈوبتے ہوئے جہاز کے بچانے والے خیال کئے جاویں گے، اُن کے نام عزت
سے لئے جاویں گے، اُن کی کوششوں کی قدر ہوگی، قوم کے دلوں میں اُن کی ایسی یاد گاریں بنیں گی، جن کو
کاٹا تھ بھی نہ ٹاسا سکیگا۔ اگرچہ کوئی کہ نہیں سکتا، کہ تقدیر نے قوم کی قسمت کیا فیصلہ کیا ہے۔ اور کوئی پیشینگوئی
نہیں کر سکتا کہ ہمارے قسمت میں کامیابی ہے یا نہیں، اور جو لوگ قوم کے لئے سعی کریں گے وہ کامیاب ہوں گے
یا نہیں۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو برکتیں ایسی جماعت پر نازل ہوتی ہیں، جن کے ارادے نیک
اور جن کی نیتیں پاک، اور جن کی غرض قومی بھلائی ہوتی ہے، وہ ضرور اُن لوگوں کی کوششوں پر بھی نازل
ہوگی، جو اپنی قوم کی بہبودی کے سامان جمع کرنے پر مستعد ہوں گے اور جو ایسے مبارک کام میں دل سے سعی
کریں گے۔



نمبر ۱۵

۱۔ اسپچ

یہ اسپچ نواب محسن الملک بہادر نے ۲۹۔ دسمبر ۱۸۹۳ء کو بوقت شب قبل از یکچشمس العلماء
مولوی حافظ نذیر احمد صاحب کے، پریزیڈنٹ ہونے کی حیثیت سے بطور خیر مقدم فرمائی۔

حضرات!

مجھے مولانا مولوی نذیر احمد صاحب سے ملاقات کی عزت میں برس سے حاصل ہے اور میرا اُن کا
بہت برسوں تک ساتھ رہا ہے اور اُن کی قابلیت اور لیاقت اور عالی دماغی اور علم و کمال کا ثبوت مجھ
بہت سے مواقع پر ملا ہے۔ غالباً ہندوستان میں اس نسل و دماغ کے مسلمان بہت کم ہونگے۔ میں نے
تو اس قابلیت کا شخص اپنی قوم میں نہیں دیکھا۔ مرحوم سر ساراجنگ اول ہمارے مولانا کی تقریر اور تحریر کے
عاشق تھے اور اُن کو اپنی محولی لیاقت کا آدمی کہا کرتے تھے۔ چونکہ میرا مولانا کا ساتھ بہت دنوں تک

رہا۔ اور مختلف موقع پر مختلف حالات میں میں نے اُن کی تقریریں سنیں اور اُن کی تخریریں لکھیں ہیں۔ مگر اُن ایک حسرت باقی تھی کہ اُن کو اب تک اسٹیج پر نہ کبھا تھا اور نہ اُن کو پکڑ دیتے سنا تھا۔ الحمد للہ کہ آج یہ دیر نہ تہمتا بھی پوری ہوتی ہے۔ میں سستا ہوں کہ مولانا کے پکڑ سننے والے ہنسنے اور رونے دونوں حالتوں کے لئے اول سے تیار ہو کر آتے ہیں۔ میں بھی دیدہ و دل اُن کی نذر کیلئے لایا ہوں۔

دیدہ اُس کل ہے دل اُس کا ہے جگر اُس کا ہے

تیر بیداد جدھر رُخ کرے گھر اُس کا ہے

صاحبو! یہ بھی میں نے سنا تھا کہ مولانا کے ٹکھٹے کا لوگوں کو ایسا اشتیاق ہوتا ہے کہ وقت مقررہ سے اول لوگ جمع ہو جاتے ہیں، اور وقت پر آنے والوں کو بہت تکلیف سے جگہ ملتی ہے اور ادراک صف تک پہنچنا تو ناممکن ہوتا ہے، آج لوگ دو دن کے ٹکھے ہوئے تھے، پانی بھی برستا تھا، رات کا وقت تھا۔ اندھیری خوب چھا ئی ہوئی تھی۔ میں اپنے دل میں سوچتا تھا، کہ آج سب سے اول، مجلس میں پہنچنے والوں میں غالباً میں ہی ہوں گا۔ مگر صاحبو یقین جانئے کہ اس ہال کے دروازہ پر پہنچتے ہی میں حیران ہو گیا اور وہ حالت دیکھی کہ کبھی میرے دیکھتے میں نہ آئی تھی یعنی سننے کے شوق میں لوگوں کا ایسا ہجوم کبھا کہ اگر میں پریسیڈنٹ نہ ہوتا، تو غالباً مجھے ہال کے اندر آنے اور بیٹھنے کو بھی جگہ نہ ملتی، کریسوں اور بچوں اور گیلری کا تو ذکر کیا ہے کسی مقام پر آدمی کے کھڑے ہونے کی، بلکہ یوں کہنے کہ تل دھرنے کیلئے بھی جگہ نہ تھی۔ پکڑ سننے کا شوق اسے کہتے ہیں، اور پکڑا رلیے ہوتے ہیں۔ اور خدا داد قابلیت اس طور سے لوگوں کے دل اپنی طرف بکرا کر رکھتی ہے یہ حالت ہے جو ہم یورپ کے مشہور اور نامور پکڑا روں کی نسبت سنا کرتے تھے۔ مگر الحمد للہ کہ آج ہم نے اپنی قوم میں بھی یہ حالت دیکھ لی، اور یہ حسرت کہ مسلمانوں میں کوئی ہیریسن فریڈرک۔ فردڈ اور میکس ملر ہیں باقی نہ رہی۔

صاحبو! میں اب اپنی بگو اس سے آپ لوگوں کے اشتیاق میں جو مولانا کی تقریر سننے کا زیادہ خلل ڈالنا نہیں چاہتا، اس لئے مولانا کو تکلیف دیتا ہوں کہ جناب ممدوح جو ہمارے کانفرنس کے تیردہیں، اپنی کرسی پر سے اٹھیں اور مجلس میں گئے باب دگھے باتش کی حالت پیدا کریں۔ جب چاہیں رولادیں اور جب چاہیں ہنسا دیں۔ جس کو چاہیں ماریں اور جس کو چاہیں جلادیں۔



نمبر ۱۶

ایسیج

یہ ایسیج نواب صاحب بہادر نے ۲۶- دسمبر ۱۸۹۳ء کو علیگڑھ میں وقت شب بعد انتقام لکچر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب کے بطور ریا کس کے فرامانی :-

حضرات !

میں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا تھا کہ اگر کافر نس میں سوائے مولانا مولوی نذیر احمد صاحب کے لکچر کے اور کچھ نہ ہوتا، تب بھی کافر نس کو کامیاب سمجھنا تھا۔ اُسی کو اب اس بے نظیر اور قابل قدر لکچر کے سننے کے بعد نہایت بلند آواز سے اور نہایت سچے دل سے اور زیادہ زور سے کہتا ہوں۔ یہ لکچر وحقیقت آپ زور سے کہنے کے لائق ہے اور قوم کے دل کے پتروں پر نقش کرنے کے قابل، آپ یقین کیجئے کہ اگر یہ لکچر یورپ یا امریکہ میں دیا جاتا تو اس سے اتنی آمدنی ہوتی کہ ہمارے محمدن کالج کا ایک بڑا حصہ تیار ہو جاتا ۔

صاحبو! میں بہت سی مجلسوں میں گیا ہوں بہت سے لکچر سنے ہیں، بڑے بڑے فصیح و بلیغ مقررین کی تقریریں سنی ہیں میں خود بھی اس بیماری میں مبتلا ہوں، مگر سچ جانئے کہ مولانا مولوی نذیر احمد صاحب کی سی طلاقت کسی زبان میں، اور ان کی سی نصاحت کسی بیان میں، اور ان کی سی شوخی کسی تحریر میں، اور ان کی سی ظرافت کسی تقریر میں، میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ تقریر ہے یا جادو، بیان ہے یا سحر، کہ کوئی اپنے قابو ہی میں نہیں رہتا۔ کسی کو اپنی جان اور دل ہی کی فکر نہیں رہتی۔ ساری مجلس پر محویت کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور تمام سننے والے بیخود اور دیوانے نظر آتے ہیں ۔

مولانا، میں خوش کرنے کے لئے نہیں کہتا۔ میری مجلس کے فرض ادا کرنے کے لئے آپ کی تعریف نہیں کرتا۔ بلکہ آپ یقین کیجئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ میرے دل سے نکل رہا ہے، بلکہ جو کچھ میرا دل کہنا چاہتا ہے وہ میں کہ نہیں سکتا۔ آپ نے جو کیفیت اس وقت ہمارے دلوں میں اپنی پر زور تقریر سے پیدا کر دی اور اپنی جادو بیانی سے جو سحر حلال آپ نے اس وقت ہم پر کیا، اور جس طور پر آپ نے ہماری دینی اور دنیوی حالتوں کی تصویر کھینچی اور جس خوبی سے آپ نے دنیا اور دین کے تعلقات کو ظاہر کیا اور جس صفائی سے آپ نے تعلیم اور تربیت کی حقیقت اور اس کی ضرورت بتائی اور جس درد سے آپ نے بزرگانہ اور دانشمندانہ ہیئت ہمارے بچوں کو کی اُس کا شکر کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ آنے والی نسلیں اس کا شکر ادا کریں گی اور وہ نتیجے جو ان تقریروں اور نصیحتوں سے پیدا ہونگے وہ آپ کی محنت کے کافی معاوضے ہونگے

ہم آپ کو کیا صلہ دیکھتے ہیں اور آپ کا کیا شکر ادا کر سکتے ہیں۔ مولانا آپ کو بھی اپنی جادوگری پر غائبانہ ہوتا ہوگا اور اپنی سحر بیانی پر مزہ آتا ہوگا۔ ذرا کھڑی اٹھا کر ملاحظہ کیجئے کہ از شب چہ قدر گذشتہ باشد اُس کے دیکھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ زلفش بیکر رسیدہ باشد۔ شام سے آپ نے اپنا کپڑا شروع کیا آدھی رات ہو گئی۔ آپ کو تقریر کرتے پانچ گھنٹے لگڑ گئے، مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی آپ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ آپ کی تقریر کا جوش۔ بیان میں قوت۔ زبان میں طلاقت ویسی ہی ہے جیسی کہ کھڑے ہونے کے وقت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اے یار عزیز ۵

مانست تو آدمی در آفاق ممکن نبود پری ندیدم
ویں بواجبی چشم ندی در صفت ساری ندیدم
ویں پردہ راز پارسیاں چندانکہ تو میری ندیدم
جو رہے کہ تو کردہ بر اسلام در ملت کا نسری ندیدم



نمبر ۱۷

ایسیج

یہ ایسیج نواب صاحب بہادر نے ۳۰ دسمبر ۱۸۹۳ء کو علیگڑھ میں بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے
اجلاس ہشتم محمدن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۳ء کے اختتام کانفرنس پر بطور آخری ایسیج
کے فرمانی :-

صاحبو!

جس درد آمیز خوشی سے میں نے اس جلسہ کو کھولا تھا آج سرت آمیز رنج کے ساتھ اُس کے بند کرنے
کا اعلان کرتا ہوں، جس طرح اس قومی جلسہ کو کھولنا فرحت بخش تھا مگر بلحاظ اس کے کبعض دوست جو
اس کے معزز ممبر تھے اور لائق رکن، جن کے دیکھنے سے خوشی ہوتی، اور جن کی مدد سے کانفرنس کو قوت
اُس میں شریک نہ تھے، وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے اور وہاں پہنچ گئے، جہاں کہ اصلی اہت و اصل
آرام نصیب ہوتا ہے، درد آمیز تھا۔ اسی طرح آج چار دن کی دھوم دھام کے بعد جلسہ کا اختتام یاروں
کی مفارقت، دوستوں کی نصحت، گودرد انگیز ہے۔ مگر وہ نتائج جو اس سے حاصل ہوئے، اور وہ
امیدیں جو آئندہ کے لئے پیدا ہوئیں، ہمارے دل کو البتہ تسکین دینے والی ہیں :-
صاحبو! ہماری مجلس درحقیقت قومی برات ہے۔ ہمارے یار دوست دور دراز مقامات سے

اس قومی شادی کی رونق اور عزت بڑھانے کے لئے آئے تھے۔ الحمد للہ! کہ یہ برات نہایت عمدگی سے مختص ہوئی، اور چیلہ اول سے آخر تک نہایت تجلی اور خوش اسلوبی سے گزرا۔ ساقی و مطرب، ندیم و مفتی، قاضی و مفتی، سب نے اپنے اپنے کمال اچھی طرح دکھائے، مجلس کے پُر لطف کرنے میں کسی کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا، مولوی شبلی صاحب نے خوب گیت سناے، مولوی نذیر احمد کی بکھٹ اہل مجلس کو عجیب لطف دکھایا۔ سید محمود ساسانی کہاں ملتا کہ جس نے یاروں کو ایسا مست کر دیا کہ نہ تن کی کسی کو خبر رہی نہ جان کی ۵

چناں ایون ساقی در مے افکند
حریفان را نہ سزاند و نہ دستار

صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں کوئی وقت ایسا دل پر صدمہ دینے والا نہیں ہوتا، جیسا خستہ کا، اور کوئی حالت ایسی تکلیف دینے والی نہیں ہوتی جیسی کہ جدائی کی، دوستوں کو خستہ کرتے اور یاروں کو الوداع کہتے وقت کو نسا دل ہے کہ ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوتا، اور کونسی آنکھ ہے، جو دیر یا نہیں بہاتی ۶

اے صاحبو! اگر ہماری یہ برات جہانی ہوتی، اور جدا ہونا ناظر ہری حالت پر محدود ہوتا تو اس وقت مجلسِ یرانِ قمر آتی۔ مطرب ساقی کا پتہ نہ ملتا، قتلِ مینا کی صدا نہ آتی، اور ندیم و مفتی نظر نہ پڑتے۔ سواکِ حسرت و افسوس کے کوئی چیز باقی نہ رہتی، مگر اے صاحبو! ہماری برات روحانی تھی، اس شادی میں بیکہ علم سے، اسلام کا حکمت سے، مشرقی خیالات کا مغربی علوم سے، عقہہ ہونے والا تھا۔ الحمد للہ! کہ وہ بخیر و خوبی ہو گیا، اور یہ مبارک روحانی شادی اچھی طرح ختم ہوئی۔ یہ وہ شادی ہے جہاں غم کا گدہ نہیں ہو سکتا اور یہ وہ عقہہ ہے جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا، نہ اس برات کا خاتمہ ہے، نہ ان باتوں کو فنا ہے۔ بلاشبہ ہمارے بیکہ عنصری مرجائینگے۔ ہمارے احجام فانی کی ترکیب باقی نہ رہیگی اور تشخصات شخصی احمد و ہمدی، حالی و شبلی، کے باقی نہ رہینگے۔ لیکن جب تک قوم زندہ ہے یہ قومی برات باقی رہیگی جب تک علم و مذہب دنیا میں باقی ہیں نزاروں احمد و محمود شریک ہوتے رہینگے، اور آئندہ آنے والی نسلیں علم و مذہب کے عقہہ کی اس مجلس کو جس کے قاضی ہمارے سید اور شعل دکھانے والے نذیر احمد و مطرب شبلی اور مفتی حالی، اور ساقی محمود تھے اور خوان اٹھانے والے نذیر احمد اور ہمدی تھے۔ ہمیشہ یاد کرتی رہیگی ۷

نمبر ۱۸

اسپیج

یہ اسپیش نواب محسن الملک بھادرنے ۲۹- دسمبر ۱۸۹۴ء کو اجلاس نہر محمدن ایکٹیشن کانفرنس منعقدہ علیگندھ میں رزولوشن درباب تائید ندوۃ العلماء کانپور پیش کرتے وقت فرمائی۔ دلچسپی عام کے لئے رزولوشن مذکور بھی اسپیش سے پہلے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اور وہ رزولوشن یہ ہے:-

رزولوشن

اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ جلسہ ندوۃ العلماء جو بنگام کانپور منعقدہ ہوا تھا اور جس میں علماء اور اکابر دین جمع ہوئے تھے تمام مسلمانوں کی توجہ کے لائق ہے اور اس کے مقاصد یعنی اصلاح طریقہ تعلیم اور رفع نزاع باہمی نہایت عمدہ اور مفید ہیں تمام مسلمانوں کو ایسی عمدہ اور مفید مجلس کی جس سے مسلمانوں کی دینی اور دنیوی بہبودی تصور ہے بدل و جان قلم سے، قدم سے، مادم سے مدد کرنی چاہئے *

صاحبو!

جو رزولوشن اس وقت میں نے پیش کیا ہے، مجھے امید ہے کہ اس کا نہایت خوشی سے خیر مقدم کیا جائیگا۔ اور ہر ایک کے دل سے بے اختیار ذلک ما کان نبغی کا نعرہ نکلیگا۔ اس لئے کہ آپ لوگ چند سال سے جس ضروری اور مفید کام کے لئے سعی کر رہے ہیں۔ اس کے پورا ہونے کی اب امید ہوتی ہے۔ اور ہمارے اقبال کا ستارہ جو دویہ را تھا وہ پھر اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے *

حضرات! ہمارے اس جلسہ کا مقصد دینی قوم میں تعلیم پھیلانا، اور ان علوم و فنون کی جاری کرنا ہے جس سے ہمارے دین اور دنیا دونوں کی فلاح اور ترقی ہو۔ مگر اس مقصد کے حاصل ہونے کی اسی وقت اچھی طرح امید ہو سکتی تھی، جب کہ وہ مقدس لوگ جو اپنے علم و فضیلت اور زہد و پرہیزگاری سے مسلمانوں کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہیں، اور شریعت اور حکمت کی شعل لیکنہم کو سیدھی داہ بتا سکتے ہیں، اس میں شریک ہوتے۔ مگر ہم اس مجلس کو ایسے بزرگوں سے خالی پا کر کبھی حسرت کبھی حیرت کرتے تھے، اور مسلمانوں کو پھر علم کے میدان میں دوسری قوموں کے سامنے آنے سے ہم کو ناامیدی ہوتی تھی۔ بارے خدا کا شکر ہے، کہ ہمارے دل کی کشتش نے اپنی تاثیر دکھائی، ہماری محنت نے غیر محسوس اثر قوم پر کیا۔ ہمارے

یہائیوں نے ہماری درد انگیز صدائیں سنیں، ہمارے بزرگوں نے اپنی قوم کی بیماری تسلیم کی، وہ اُس کے علاج پر آمادہ ہوئے، اور قومی مجلس نے ایک دوسری مگر نہایت پاکیزہ اور دولہا شکل میں ظہور کیا۔ یعنی ہندوستان کے مشہور اور نامور عالموں کا ایک بڑا جلسہ کانپور میں قائم ہوا۔ جس قوم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ حضرات علما نے زمانہ کی ضرورت کو دیکھا، اور ہماری اصلاح اور ترقی پر متوجہ ہوئے۔ یہی ہماری ترقی تھی اور یہی ہمارا مقصود ہے۔ خواہ وہ ایک کوشش کا نعرہ لے نام سے ہو، یا ندوۃ العلماء کے مبارک لقب سے۔ اور اس کے لئے ہم علی گڑھ میں جمع ہوں یا کانپور میں۔

شاخ گل ہر جا کہ روید گل است خم گل ہر جا کہ جو شد ہم گل است
گز مغرب بر زند خورشید سر عین خورشید است فی چیزے گر

صاحبو! مجھے اس بات کا اندیشہ ہے، کہ بعض لوگ میرے اس رزولوشن کے پیش کرنے اور ندوۃ العلماء کی تائید پر تعجب کریں گے، اور مجھے مغربی علوم و فنون کی اشاعت کرنے والے فرقہ کا نقیب، اور نئے خیالات پھیلانے والے لشکر کا علم بردار، سمجھ کر ندوۃ العلماء کی حمایت کرنے پر حیرت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ مگر میں ابھی اُس حیرت اور تعجب کو دور، اور اپنی اس رزولوشن کے پیش کرنے سے، قومی ترقی کی خواہش اور تائید کا ایک تازہ ثبوت پیش کر دینگا۔

حضرات! یہ حیرت غالباً اس وجہ سے لوگوں کو ہوگی، کہ وہ اس فرقہ کی اغواض کو جو نئے علوم، نئے خیالات، اور نئی تہذیب کا حامی کہا جاتا ہے۔ اُس گروہ کے مقاصد سے جدا سمجھتے ہیں، جو کہ پُرانے علوم، پُرانے خیالات، اور پُرانی تہذیب، کا محاذ اور قائم رکھنے والا ہے۔ اُن کے نزدیک دونوں کی موافقت ناممکن ہے، اور دونوں کا ایک سمت پر چلنا محال ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دونوں فرقے گویا دو ایسے وسیع ٹاپو ہیں، جن میں بہت بڑا اور خطرناک دریا حاصل ہے جس پر نہل بندھ سکتا ہے، نہ کسی بندہ کی قدرت اور کوشش اُن کو مٹا سکتی ہے۔ مجھے بھی پہلے کبھی یہ شبہ ہوتا تھا۔ چنانچہ جب ندوۃ العلماء کے قائم ہونے کی خبر ہوئی، تو میں بہت شوق سے اُس کی کارروائی دیکھنے کا منتظر رہا۔ مگر اب کہ میں نے اُس کی کارروائی دیکھی، اور اپنے علما کے خیالات سے جس طور پر مجھے اس رد و داد نے واقف کیا۔ اُس سے مجھے اس بات کا یقین ہوتا ہے، کہ دونوں فرقوں کی غرض مشترک ہے، دونوں فرقوں کی منزل مقصود ایک ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ جو کوئی اُس پر غور کرے گا اور ہمارے علما کے خیالات اور تقرروں کو اچھی طرح سمجھ گا، وہ بھی مجھ سے اتفاق کرے گا۔

صاحبو! اول آپ کو دیکھنا چاہئے۔ کہ قوم کے وہ علمبردار اور ہی خواہ، جو برسوں سے اپنی قوم کی حالت پر نالہ و شہیون کر رہے ہیں، اور جو اپنی قوم کی ترقی کی فکر میں رات دن مصروف ہیں، وہ کیا کرتے اور کیا چاہتے ہیں۔ پھر آپ کو اس بات پر نظر کرنی چاہئے، کہ ہمارے بزرگان دین جو قوم کی اصلاح پر

مستوج ہوئے ہیں، اُن کا کیا خیال، اور کیا خواہش، اور کیا ارادہ ہے۔ تاکہ آپ فیصلہ کر سکیں، کہ ان دونوں فریق کے لحاظ ہونینوں کے نزدیک دو مختلف راستوں پر چلتے ہیں مندرجہ تصور ایک ہے یا جدا جدا۔ اور اس بات کا فیصلہ نہ صرف خیال اور گمان سے کرنا چاہئے، بلکہ واقعات سے۔ جب تک کہ واقعات کے بیان میں صحت، اور نکتہ چینی کرنے میں انصاف، اور مقاصد کے سمجھنے میں غور نہ کیا جاوے، اور قومی ترقی کی تجویزوں میں اُس کی موجودہ حالت پیش نظر نہ رہے، تو امید نہیں ہو سکتی کہ ہم نتائج کے نکالنے اور صحیح رستے قائم کرنے میں کامیاب ہونگے۔

صاحبو! آپ جانتے ہیں، کہ پہلا فرقہ جو قوم کی ترقی کے غم میں گھلا جاتا ہے، وہ کیا کہتا ہوگا، کہ اور کیا چاہتا ہے۔ اگر فقہ لفظوں میں بیان کیا جاوے، تو وہ یہ کہتا ہے کہ قوم غافل اور کال ہے، باہم اُن کے بات بات پر جھگڑے اور فتنے ہیں، اُن کی موجودہ تعلیم ناکافی ہے، اُن کا طرز تعلیم غیر مفید ہے، اور تربیت قطعاً مفقود۔ اس لئے وہ یہ چاہتے ہیں کہ اُن کا باہمی اختلاف دور ہو، تعلیم کے نقصوں کی اصلاح کی جاوے، طرز تعلیم مفید بنایا جاوے، تربیت کی تدبیریں کی جائیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مغربی علوم و فنون جو اس زمانہ میں دولت، عزت، علم، اور خیالات کی ترقی کے لئے شرط لازمی ہیں، سکھائے جاویں۔ اسی کے لئے وہ مجلسیں کرتے ہیں، انجمنیں بناتے ہیں، کانفرنس قائم کرتے ہیں، انجیل لکھتے ہیں، اسپیشل دینیٹے ہیں، پکڑ سٹاتے ہیں، رزلیموشن پاس کرتے ہیں۔ بزرگوں کے فتنے سنا کر قوم کو خوش لاتے ہیں، اُن کی موجودہ حالت کے درد انگیز مرثیے بڑھ کر روتے اور رلاتے ہیں، اسکول قائم کرتے ہیں، کالج بناتے ہیں، اور قوم کے لئے قوم سے بھیک مانگتے ہیں۔ پس اے میرے بزرگو، اور عزیزو! اُس فرقہ کا جو دنیاوی ترقی کا خواہاں کہا جاتا ہے، یہ کہتا ہے چاہنا، اور یہ کرنا ہے، جو ان چند لفظوں میں نے بیان کیا۔ مگر اُس کے ساتھ وہ دین کو بھی نہیں بھولتے، مسلمانوں کو اسلام پر قائم رہنے کی تدبیروں سے بھی غفلت نہیں کرتے، وہ نئی تعلیم کی مضاد و خفاک بلادیوں سے بھی اپنی قوم کو بچانا چاہتے ہیں، اور احاد و دہریت کی عالمگیر بلا سے اپنے نوجوان بچوں کی حفاظت کی فکر کرتے ہیں۔ اُن کو بڑا خوف اس بات کا ہے، کہ کہیں اتحاد کی وجہ جو یورپ میں پھیلی ہوئی ہے ہم تک نہ پہنچے، اور ہمارے نوجوان طالب علم مذہب کے مضبوط اور مستحکم ہمارے چھوڑ کر، سامع کے وسیع اور عمیق سمندر میں نہ جا پڑیں جس سے اُن کی مرکز در داغی کشتیاں، شبہ اور ڈر کی کے چٹانوں سے ٹکریں کھا کر غارت ہو جائیں، اور موذی اور خوشخوار رنگ، اتحاد اور دہریت کے اُن کے دلوں کا شکار کر لیں۔ غرض کہ یہ حال ہے ایک فرقہ کا۔ اب دوسرے فرقہ کو دیکھئے، جو علما اور دینداروں کا ہے۔ جو اپنی مسجد اور خانقاہ سے نکھر قوم کے سامنے آیا ہے، اور قوم کی دُوبتی کشتی کے بچانے کو اُس نے اپنا ماتھ بڑھایا ہے۔ اگر آپ جانتا چاہتے ہیں کہ یہ حضرات کیا فرماتے، کیا چاہتے،

اد کیا کرتے ہیں، تو اس کتاب کو دیکھئے جو میرے ہاتھ میں ہے۔ اس روئداد کے دیکھنے سے آپ کو معلوم ہوگا، کہ اس مقدس فرقہ کو بھی اپنی قوم کی غفلت اور کاہلی کی شکایت ہے۔ اور نہ صرف عوام بلکہ خود علما کے باہمی اختلاف اور مخالفت پر افسوس ہے۔ وہ بھی موجودہ تعلیم کو غیر کافی اور قابل اصلاح، اور طرز تعلیم کو غیر مفید و لائق تبدیل سمجھتا ہے۔ یہ اکابر دین بھی مغربی علوم و فنون کے سیکھنے کی ضرورت بتاتے ہیں، بلکہ اب تک جو غفلت اس سے کی گئی اُسے بد نصیبی سمجھتے ہیں۔ اب انہوں نے اس امر کی ضرورت سمجھی ہے، کہ شخصی کارروائی چھوڑی جائے، جمہوری قوت سے کام لیا جائے۔ مسجدوں میں وعظ و فرما ہی پر قناعت نہ ہو، اور خانقاہ میں بیٹھ کر توجہ دینا ہی ضروری نہ سمجھا جائے۔ بلکہ مجلس تعلیم کی جائیں، مسلمانوں کے ہر فرقہ کے عالم ایک جگہ جمع ہوں، قوم کی ترقی کی تجویزیں سوچیں، آزادی سے ہر ایک مسئلہ پر بحث ہو، اور تمام کارروائی میں زمانہ حال کے مطابق قواعد و ضوابط کی پابندی کی جائے۔ مجلس کا کوئی نام رکھا جائے، اُس کے ارکان خاص طور پر مقرر ہوں، رائے دینے کے لئے خاص خاص استحقاق سمجھ جائیں۔ پھر مجلس کا کوئی صدر انجمن ہو اور سیکرٹری، تجویزوں کے پیش کرنے کے لئے کوئی محرک اور کوئی نمونہ، پھر اُس پر رائے لی جاوے، اور غلبہ رائے سے پیش شدہ تجویز منظور بھیجی جائے۔ غرض کہ حضرات یہ وہ چیزیں ہیں، جو ہم کو اس ندوۃ العلماء کی پہلی ہی مجلس سے معلوم ہوئیں، اور یہ اُس کا وہ آغاز ہے، جس میں تعصب، خود پسندی، اور رسم کی پیروی کی بوجھ نہیں پائی جاتی۔

آپ ذرا اُن درو انگیز تقریروں کو سنئے، جو قوم کی غفلت اور باہمی مخالفت کی نسبت ہمارے علمائے اُس مجلس میں کی ہیں۔ میں اس بات کی ضرورت سمجھتا ہوں، کہ وہ درو انگیز الفاظ جیسے اُن کی زبان سے نکلے، ویسے ہی آپ کو سنائوں۔ مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب دہلوی اپنی فصیح و بلیغ تقریر یوں شروع فرماتے ہیں:-

”الحمد للہ کہ مدت مدید کے بعد ہماری قوم بھی خواب غفلت سے بیدار ہوئی۔ جو دنیا میں بٹے بٹے کار نمایاں کر کے تھکی ماندی ہو کر سو گئی تھی۔ اور ایسی سوئی تھی کہ اس عرصہ میں وہ قومیں جو میدان ترقی میں صدائے کوس پیچھے تھیں، بہت آگے نکل گئیں اور نکلی چلی جا رہی ہیں۔“

صاحبو! اس بات پر تو کیا میں افسوس کروں کہ ہم میں خودیوں کی جگہ بڑی بڑی برائیاں پیدا ہو گئیں۔ اتفاق کے بدلے نفاق۔ ہمت و جہتی کے بدلے سستی۔ ہمدردی کے بدلے خود غرضی۔ صداقت و دیانت کے بدلے کذب و مکاری آگئی، دولت و انقبال کے بدلے افلاس و بدبختی نے آگھیرا۔ عزت و شوکت کے بدلے ذلت و خواری نے منہ دکھایا۔ افسوس تو اس پر ہے، کہ ہمیں اچھی طرح اس کی خبر بھی نہیں، اور جو ہے بھی، تو اُس کے تدارک کی جیسی چاہئے تھی ویسی فکر نہیں۔ اور جو کچھ نکل رہا ہے تو اُس کے موافق تدبیر نہیں۔ اور جو کچھ تدبیر ہے تو شخصی، جمہوری نہیں۔“

صاحبو! ہمارے مولانا صاحب نے ان چند نگر نہایت جامع اور پرزور لفظوں میں جو قوم کی درد انگیز تصویر کھینچی ہے، اور ان افسوسناک برائیوں کا جو ہم میں پیدا ہو گئی ہیں، جس طرح بیان کیا ہے۔ وہ حقیقت دہی باتیں ہیں جسے بعض ہی خرداں قوم برسوں سے کہہ رہے ہیں۔ مگر قوم ان پر خفا ہوتی تھی، ان کو اپنا دشمن سمجھتی تھی، ان کو نکتہ چین اور عیب جو کہتے، ان سے نفرت کرتے تھے، لیکن اب کہ ان کے پیشواؤں نے انہیں آئینہ دکھایا۔ اس لئے امید ہے کہ وہ اپنی صورت اس میں دیکھینگے، اور جو دل غ ان کے خوبصورت چہرے پر لگ گئے ہیں، اُسے دیکھ کر افسوس کرینگے، اور بالآخر دُاس کے مٹانے پر متوجہ ہونگے۔

حضراتِ اہل سنت اور اہل بیت سے بڑھ کر قوم کی خرابی کا بڑا سبب اختلاف ہے، اور اختلاف بھی ایسا، جو مخالفت اور عداوت کے درجہ پر پہنچ گیا ہے جس سے ایک بھائی دوسرے کی تفصیل اور تکفیر کرتا، اور اُسے دینداری سمجھتا ہے۔ اس کی بُرائی اس مجلس نے اس طور پر ظاہر کی جس ہمارے علما کی عالی دماغی، بلند خیالی، اور پاک دلی ظاہر ہوتی ہے، اور جو کافی شہادت اس بات کی ہے، کہ وہ ہر کلمہ کو اپنا بھائی سمجھتے، اور قومی اعتراض کے حامل کرنے میں سب کو شریک کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا غور سے سنو، وہ پاک الفاظ، جو موسیٰ حافظ شاہ محمد حسین صاحب الدہلوی کی زبان سے نکلے۔ اور جوش قابل ہیں، کہ ہر ایک مسلمان صفحہ دل پر لکھے، اور اس پر عمل کرے۔ وہ فراموشی نہیں کہ ”اول برکت اس مجلس کی یہ ہے، کہ اس نے شیعہ اور سُنی، متعین اور اہل حدیث، مختلف اذواق کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ امید ہے کہ جیسا قوائے مختلفہ کے اکٹھا ہونے سے ایک کیفیت متشابہ پیدا ہوتی ہے، جس کو مزاج کہتے ہیں۔ ان طبائع مختلفہ کے اجتماع سے ایک دوسری حالت پیدا ہو، جو قریب قریب اعتدال حقیقی کے ہو جائے۔“

صاحبو! مولانا صاحب کے الفاظ کو ذرا غور سے دیکھو۔ کہ انہوں نے اس اتفاق پر غور خوشی کا لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ برکت کا۔ اور اسی واسطے شیعہ سُنی، متعین اور اہل حدیث، مختلف خیال اور مختلف مذاق کے لوگوں کو جمع دیکھ کر فرمایا، کہ یہ اول برکت اس جلسہ کی ہے اور حقیقت ان کا فرمانا سچ ہے، قومی کام میں مذہبی تفرقہ کا شائبہ، اور غوغائی اختلاف کو خالی مجلس ہی میں محدود رکھنا، اور ایک خدا ایک رسول اور ایک قرآن کے ماننے والوں کا، اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کے کاموں میں ایک دل ہونا، حقیقت کا میاں بی کا پہلا نتیجہ ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام کی محبت اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا دعوے کرے، اور اس زینہ پر قدم نہ رکھے، وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔ دوسری قوموں کو دیکھئے، کہ وہ مقامی اختلافات کے مٹانے میں کسی ہرگز نہیں، غرض مشترکہ کے حاصل کرنے کی خواہش کس کس گرجھوشی سے ان میں بڑھتی جاتی ہے، اس طرح

وہ ایک دوسرے سے برادرانہ محبت اور اتفاق پیدا کرتی جاتی ہیں، اور خواہم باری کی تحقیق اور تحصیل میں کسی استعداد نہیں۔ مگر جن کا ایک خدا، ایک رسول، اور ایک مین ہے، صرف فروعی مسائل کے اختلاف سے ایک دوسرے کے دشمن، ایک دوسرے سے متنفر، اور ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔ اور افسوس تو اس پر ہے، کہ یہ دشمنی اور نفرت اور بھائی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ندوۃ العلماء زیادہ تر قوم کی شکرگزاری کی اس لئے مستحق ہے، کہ اُس نے قوم کے منزل ذلت اور غلامی کے اصلی سبب کو پہچانا، اور اُس کے دور کرنے کو اپنا اصلی مقصد قرار دیا۔ مبارک ہو گا وہ دن جب کہ قوم میں ایک نئی روح نے فطری، روشن، داغی، علمی، خوش، قومی، ہمدردی، اور اسلامی محبت کی پیدا ہوگی، اور ہم مسلمانوں کے جسم بے جان میں پھرتی جان پریگی *

صاحبو! اس باہمی اتفاق اور بدگمانی کی نسبت جو کچھ روئداد کی تہذیبیں دکھایا ہے، اور جسے تمام علما موجودہ ندوۃ العلماء کی آواز سمجھنا چاہئے۔ وہ اس قابل ہے، کہ ہر مسلمان ہر وقت اُسے دیکھتا اور روتا رہے، اور وہ یہ ہے کہ آج کل ایک اور سخت بلا ہم میں شل و پا کے پھیلی ہوئی ہے، اور روز بروز اُسے ترقی ہوتی جاتی ہے۔ وہ بلا ایسی ہے جس نے ہماری شوکت و عظمت کو عزت اور آبرو کو خاک میں ملا دیا ہے، ان کی تمام خوبیوں پر اُس نے پانی پھیر دیا ہے۔ مال کو تباہ کرتے ہیں، جانوں کو ہلاک کرتے ہیں، مگر خود فکر کر کے اُس سے کٹا رہ کشی نہیں کرتے، مصالحت وقت پر نظر نہیں ڈالتے۔ سخت افسوس یہ ہے کہ ہمارے مکرم اپنے آپ ہی کو ذلیل و خوار اور تباہ و برباد نہیں کرتے، بلکہ اپنے سچے اور پاک مذہبِ اسلام کو مخالفین کی نگاہوں میں ان عیبوں کا مخزن بنا لیتے ہیں، کیونکہ ان کی نظروں سے اس مقدس مذہب کی اصلی پیاری صورت تو پوشیدہ ہے، وہ اُس کے ماننے والوں کی حالت کو دیکھ کر قیاس کرتے ہیں۔ وہ بلا کیا ہے؟ نفاق یا ہی۔ بدگمانی خصوصاً علما میں۔ اب خیال کیجئے مقلدین اور غیر مقلدین میں کیسی کیسی شدتِ رنک لڑائیاں ہوتی ہیں، ایک بھائی دوسرے بھائی کی جان کا۔ مال کا۔ آبرو کا کس طرح خواہاں ہوتا ہے، خلاف مذہب کے اجلاس میں مقدمات جاتے ہیں۔ ہمارے محترم علما مجرموں کی طرح سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ صحیح بخاری۔ صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث اُن کے جو توں کے پاس اُن کے نیچے ڈھیر ہوتے ہیں، اور آئین و رفعِ یدین کی تحقیق۔ جناب۔ چوتھے گھنٹہ نام داس صاحب بہادر اور کریمول صاحب بہادر کے رویہ پر پیش ہوتی ہے، اور اس کو دین خیال کیا جاتا ہے، افسوس صد افسوس ایسے فہم و خیال پر ہمارے علما کا اجلاس میں اس طرح کھڑے ہونا، کیا شانِ علما کے خلاف نہیں ہے؟ کیا ہمارے دین کی کتابیں، ہمارے ہادیِ برحق کے ارشادوں کا یوں بیعتی سے لکھا جاتا دین کی ہتک تھیں ہے؟ مذہبی اختلافات کا جھگڑا، مخالفین مذہب کے رویہ پر پیش کرنا سخت بیدینی نہیں ہے؟ ضرور ہے

مگر خرم خیال نہیں کرتے ۞

اے میرے بزرگو! اے میرے عزیزو! ذرا خیال کرو اور اپنے سچے مذہب کی بھرپور تپانے
ہاتھ سے نہ کرو یہ سیوہ نہ ایں اس حد تک پہنچی ہیں، کہ ہمارے محض الفین ہنستے ہنستے آتے ہوئے
لگے۔ مگر آپ کو کچھ بھی خبر نہیں۔ آتے ان دردناک معاملوں کا فیصلہ کون کہے بجز علما کے ۞

مولوی منصور علی خان صاحب شاگرد رشید مولانا محمد قاسم صاحب مولانا احمد علی صاحب اسی کے
متعلق فرماتے ہیں کہ ”دوسری اقوام کے اختلافات کی بنا طبع دنیاوی اور حُب جاہ پر ہے، اور اہل اسلام
کے اختلافات کی بنا محض دینداری پر ہے۔ یہ نہیں چاہتے کہ کوئی شخص ذرہ برابر خلاف سنت کرے، اگر
اُس کو اپنے ذہن میں مخالف ذرا بھی پاتے ہیں، تو فوراً اُس سے بیزار ہو جاتے ہیں، اور اُس سے
کنارہ کشی کو عین سنت سمجھتے ہیں۔ صرف خیالی سنت اور خیالی تقویٰ پر ان کا دار و مدار ہے، الا ماشاء اللہ
حالانکہ کسی سنت کا ترک ایسا بُرا نہیں ہو، جیسا آپس میں عداوت پیدا کرنا بُرا ہے۔ کوئی تقلید کو شرک
اور مقلد کو مشرک بتلاتا ہے، کوئی غیر مقلد کو دہائی اور دشمن رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم جانتا ہے
کوئی اپنے مرشد کے مخالف کو گمراہ اور عدو سمجھتا ہے۔ غرض جو جس خیال میں ہے، دوسرے کو کبھی
اُسی خیال پر چبکھڑکنا چاہتا ہے۔ خدا و رسول نے، جن امور میں انسان کو مطلق کیا ہے یہ شخص اُس کو
متقید کرتا ہے۔ جب تک ایک دوسرے کا من جمیع الوجوہ موافق نہ ہو، ہرگز اُس سے اتفاق نہیں
ہو سکتا۔ ذرا اُس کو کسی بات میں اپنے مخالف پایا فوراً اُس سے کنارہ کش ہوا۔ بھلا یہ سنت کونسی
اور کونسا اسلام ہے، قرآن و حدیث میں کہیں اُس کا پتہ نہیں، ادنیٰ امور کا اخذ اور اعلیٰ کا ترک
اسی زمانہ میں شائع ہے ۞

صاحبو! جس طرح ہمارے علما نے مذہبی جھگڑوں کی بُرائیاں بیان فرما کر اُس سے باز رہنے
کی نصیحت فرمائی، اُس سے کچھ کم تعلیم اور طرز تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی، بلکہ اس ضروری مسئلہ پر جو
دنیا کی ترقی اور ترقی کا اصلی ذریعہ ہے، نہایت غور فرمایا، اور اُس کے متعلق نہایت عمدہ خیالات
ظاہر فرمائے۔ چنانچہ جہاں مقاصد مدوۃ العلماء کا بیان کیا گیا ہے، وہاں صاف اس بات کا اقرار ہے۔
کہ تمام خرابیوں کا باعث نقصان طرز تعلیم اور نا اتفاقی ہے۔ اور اُس کے بعد پھر صاف یہ کہا ہے
کہ ”اصلاح طرز تعلیم کا مطلب یہ نہ خیال کیا جائے، کہ اس انجمن کا مقصد صرف اس قدر ہے، کہ موجود
کتب درسیں پیشی دیکھی یا رد و بدل کر دیا جائے۔ نہیں، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی مد نظر ہے، کہ کیا
طرز تعلیم اختیار کیا جائے، اور کون سے اسباب مہیا کئے جائیں۔ جن سے ہمارے مدارس کے
مستفی طلبہ کو تہذیب و تمدن اور مذاق صحیح حاصل ہو۔ اور تحقیقات علمیہ کا شوق اور کمال حاصل کرنے کا حوصلہ
پیدا ہو، اور مخالفین دین کے مقابلے میں بھی ہمدرد نہ ہوں، بلکہ شائستہ سلوب سے جواب دیں گے۔

اس مضمون کی تشبیح مولوی حافظ شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے بہت اچھی طرح اپنی پُر زور ادنیائیت فصیح اور بلج تقریر میں کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”یہ علوم مرد و دنیاوی منافع کے حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں پہلے بھی وہ لوگ جو محض خدا کے لئے تحصیل علوم کرتے ہوں، بہت قلیل تھے۔ سلاطین سے علما کو مناسب جلیلہ قضا و افتاد غیرہ کے ملنے کی اُمید ہوتی۔ جو اپنے طور پر درس دیتے۔ اُن کے لئے وظائف مقرر ہوتے، عوام اہل علم کی بڑی قدر و منزلت کرتے۔ اب یہ ساری اُمیدیں منقطع ہو گئیں۔ تو پھر ہمیں کیونکر قاصر نہ ہوں۔ اس صورت میں تسلیم کی جیسی تمہم کرنا چاہئے کہ وقت کم صرف ہو اور ضروری علوم آجائیں“ اس کے بعد مولوی صاحب موصوف نے اُس طریقہ تعلیم کو جواب مرقع ہے۔ اور سلسلہ نظامیہ سے مشہور ہے۔ نا کافی اور قابل ترسیم سمجھ کر اس کی نسبت اس طرح فرمایا کہ ”اس طریقہ سے فیتہ جو تعلیم کا طریقہ تھا اُس میں زمانہ کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے ترمیم کی گئی۔ اب طریقہ مروجہ میں ضرورت کے موافق کیوں ترمیم نہ کی جاوے؟“ پھر آگے چل کر مولوی صاحب ممدوح نے موجودہ تعلیم کے چند نقص اور بیان کئے، ایک یہ کہ ”اس تعلیم سے عربیت نہیں آتی، اور باوجود علوم عربیہ کی تکمیل کے مشاغل و نظم کا لکھنا تو درکنار سمجھنے کی قدرت بھی نہیں ہوتی، نہ عربی کو سمجھ سکتے ہیں، نہ لکھ سکتے ہیں، کوئی شعر عرب العربا پیش کیجئے، قطع نظر موزوں ناموزوں پڑھنے کے اچھی طرح ترجمہ کرنا دشوار، کوئی مضمون اردو میں دیکھئے عربی میں ترجمہ کرنا مشکل۔ دوسرے یہ کہ اس تعلیم میں کتاب اللہ کے سمجھنے اور اُس کے نکات اور دقائق کے دریافت کا لحاظ کم کیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس تعلیم میں ایسی کوئی کتاب نہیں رکھی گئی جس میں تہذیب نفس کے قواعد بیان کئے گئے ہوں، اور محض کتاب اللہ اور کتاب الرسول کا ہونا جس طرح فقہ اور کلام کے مسائل سے۔ اذعان قاصرہ کے لئے معنی تھیں۔ ویسا ہی مسائل اخلاقی سے بھی معنی نہیں۔“

جناب مولوی حافظ شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی موجودہ تعلیم کے نقصانات میں سے ایک نقصان یہ بتاتے ہیں، کہ ”سابق کا علم کلام جو فلاسفہ اور معتزلہ کی رو سے مملو ہے، اب یہ نہ معتزلہ رہے نہ وہ فلاسفہ، اُن کے خیال بدل گئے۔ مگر اب علم کلام میں ابطال فلاسفہ حال اور رد نصارے کے داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ اور نیز ایسی کوئی کتاب اس تعلیم میں (یعنی موجودہ تعلیم میں) نہیں رکھی گئی۔ جس سے احکام دین کے اسرار اور اُن کی خوبیاں معلوم ہوں، حالانکہ زمانہ حال کے موافق اس کی بڑی ضرورت ہے۔“

صاحبو! یہ وہی خیال ہے جو ہمارے بزرگ مسر سید کی پیش نظر ہے، اور یہ وہی نقص ہے جو ہماری موجودہ تعلیم میں نہایت بُرا اور بُہت بُرا اور قابل اصلاح ہے۔
مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب دہلوی نے جو کچھ اپنی تقریر میں فرمایا، اُس کا بھی بعض حصہ سنانے

کے لائق ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بہت سے ترقی خواہان اسلام کا یہ حال ہو رہا ہے، کہ علوم جدیدہ جو نئی قوم کی حشمت و شوکت کا باعث ہیں پڑھنا چاہتے ہیں کتا ہوں ضرور پڑھنا چاہتے ہیں۔ مذہب اسلام مانع نہیں۔ مذہب اسلام ایسے ریتے کا گھر نہیں، جس پر نئی فلسفہ کا ریلوے کچھ اتر کرے، اور نہ کبھی کبھی صدیوں میں کچھ اتر گیا ہے۔ فلسفہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا۔ پر آسمانی مذہب کبھی نہ بدلیگا۔ اسلام کا کوئی نیاوی فلسفہ نہیں نہ کوئی ہیئت و ریاضی ہے۔ وہ صرف انسان کی اخلاقی و روحانی تعلیم کرنے والا ہے۔ اس کے ضمن میں بطور اثبات قدرت آسمان و زمین اور دیگر کائنات کا مخلوق الہی ہونا بیان فرمایا ہے، جس سے اس قدر مطلق کی بے انتہا قدرتوں کا ثبوت ہوتا ہے۔ اسی طرح تاریخ کا بھی بطور موجودہ ذمہ نہیں لیا ہے، بلکہ انہیں واقعات کا ذکر کیا ہے، جو انساں کے لئے عبرت و حیرت پیدا کریں اور بطلان کی ہیئت ثابت ہو جائے تو کیا، اور فیثا غورث کی قائم ہو جائے تو کیا، جزو لاینفک ہونا تو کیا، اور ثابت ہو گیا تو کیا۔ خلا کا بطلان ہوا تو کیا، اور اثبات ہوا تو کیا۔ ہمارے بزرگوں نے یونانی فلسفہ کے حملہ و کنے کے لئے ایسے ایسے مسائل علم کلام میں داخل کئے تھے جن کو آج کل محض جودت طبع کے لئے ہم لوگ پڑھتے ہیں، نہ وہ ہمارا مذہب تھا، نہ کتاب و سنت اور مشکوٰۃ بنوت کا فرمودہ تھا۔ سب کچھ بگڑ جائے تو ہماری بلا سے“

صاحبو! ان دو بزرگ عالموں کی تقریر سے آپ خیال کر سکیں گے، کہ ایک رائے تو یہ ہے، کہ فلسفہ حال کے ابطال کے لئے نئے علم کلام کی ضرورت ہے۔ اور دوسری رائے یہ ہے، کہ اسلام میں نہ کوئی دنیاوی فلسفہ ہے، نہ قرآن میں ہیئت و ریاضی اور طبیعیات کے مسائل کا بیان ہے، اور نہ اُس میں واقعات کا ذکر بطور تاریخ کے مورخانہ طرز پر کیا گیا ہے۔ بلکہ اسلام صرف انسان کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کے لئے ہے۔ اُس کے ضمن میں بطور اثبات قدرت، آسمان و زمین اور دیگر کائنات کا مخلوق ہونا بیان کیا گیا ہے۔ وہ کوئی ہیئت اور طبیعیات کی کتاب نہیں ہے، جس سے ہم یہ رائے قائم کر سکیں، کہ پرانی ہیئت صحیح تھی یا حال کی، اور نسبت موجودات اور کائنات عالم کے اسلام پرانی تحقیقات کے مطابق ہے، یا اس زمانہ کے۔ اس لئے کہ مطابقت اور مخالفت تو اسی وقت خیال کی جاسکتی ہے، جب کہ دونوں میں ایک ہی چیز کا بیان ہو مثلاً کہہ سکتے ہیں، کہ پرانی ہیئت حال کی تحقیقات کے خلاف ہے، یا عیسائی مذہب کے عقائد قرآن کے مخالف ہیں۔ اس لئے کہ دونوں کا موضوع اور مقصود ایک ہے، مگر جب کہ یہ بات مان لی گئی، کہ قرآن کوئی کتاب علم ہیئت اور طبیعیات کی نہیں ہے، نہ اُس میں واقعات کا ذکر مورخانہ طور پر کیا گیا ہے۔ تو پھر کوئی وقت ہی باقی نہیں رہتی، اور نہ مسائل جدیدہ کے ابطال یا تطبیق کی ضرورت پائی جاتی ہے۔ بلکہ اُس بڑی بحث کا جو متعلق مذہب اور علوم جدیدہ کے ہے۔ خاتمہ ہو جاتا ہے

مثلاً آپ لوگوں میں بہت سے ایسے ہونگے، جن کو وہ بحث و آسمان کی نسبت ایک مدت تک ہوتی رہی خوب یاد ہوگی، جو ثبوت آسمانوں کے وجود کا قرآن مجید سے پیش کیا گیا، جن دلائل سے ان کا ماننا بطریق موسیٰ ہیئت کے موافق لازم سمجھا گیا، اور جس شد و مد سے اُس کے نہ ماننے والوں پر کفر کے فتوے جاری ہوئے، غالباً وہ سب آپ کے پیش نظر ہونگے۔ ان تمام مباحثوں کی بنیاد صرف اس بات پر تھی، کہ جو کچھ بیان آسمانوں کا قرآن میں ہے، وہ گویا اُسی طور پر ہے جیسا کہ علم ہیئت میں بیاں کیا گیا ہے۔ اگر اُس وقت یہ خیال ہوتا، کہ قرآن علم ہیئت کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اُس میں آسمان و زمین کا ذکر بطور اثبات قدرت کے کیا گیا ہے۔ تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا، بہت ہی مسلمانوں پر کفر کے فتوے کیوں جاری ہوتے، اور یہ دونوں خیال کہ آیا آسمان ایک ایسا جسم ہے جو نہایت مضبوط اور سخت ہے، اور وہ ایک مکان کو گھیرے ہوئے ہے، اور مثل کرہ کے گول اور اندر سے خالی ہے، یا آسمان وہ چیز ہے جو اونچی اور نیچی ہم کو دکھائی دیتی ہے، جس میں ہوا چلتی ہے، بادل اُٹھتے ہیں، اور اس کی وسعت میں پرندے اڑتے ہیں۔ کیوں ایسے جدا جدا سمجھے جاتے، کہ ایک تو قرآن کے مطابق کہا جاتا، اور دوسرا قرآن کے خلاف۔ پہلے کا ماننے والا تو مسلمان سمجھا جاتا، اور دوسرے خیال کا رکھنے والا منکر قرآن ہے۔

لیکن گو یہ خیال کہ قرآن علم ہیئت و طبیعیات کی کتاب نہیں ہے، اور اسلام میں علمی مسائل کا بیان

۱۵ (فٹ نوٹ) میں برس ہوئے چپ سیر سید احمد خاں بہادر نے تہذیب الاخلاق میں ایک مضمون بنام تفسیر السموات لکھا تھا اور جس پر بڑا شور مچا ہوا تھا وہ دیکھنے کے لائق ہے اور وہ تبدیل جواب علماء کے خیالات میں ہوئی ہے غور کے قابل ہے اگر وہ خیالات جو اب علماء ظاہر کرتے ہیں اُس وقت ہوتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا اور سچا سیر سید کی تکفیر کی نوبت کیوں آتی۔ وہی بات جو بیس برس اُنہوں نے کہی تھی اب ہمارے علماء فرماتے ہیں۔ سیر سید اپنے مضمون تفسیر السموات کیوں شروع کرتے ہیں، ہم کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ علماء اسلام نے کوئی خاص علم ہیئت ایسا مقرر کیا ہے جس کی بنا پر قرآن مجید یا حدیث پر ہو، جہاں تک ہم کو معلوم ہے وہ یہی ہے کہ جو علم ہیئت یونانی حکیموں نے اختیار کیا تھا وہی بعینہ بدریہ ترجموں کے جو یونانی زبان سے عربی میں ہوئے ہم مسلمانوں میں پھیل گیا۔ جب قرآن مجید کی تفسیر لکھی گئیں اور قرآن مجید کی کسی آیت میں کوئی ایسا مضمون آیا جو علم ہیئت سے علاوہ رکھتا تھا تو انہوں نے اُس کی تفسیر یونانی علم ہیئت کے اصول پر کی یہاں تک کہ قرآن مجید میں سات آسمانوں کا ذکر تھا اور یونانی تو اسمان ملتے تھے تو علماء اسلام نے اُن سات آسمانوں میں عرش اور کرسی کو ملا کر پورے کو کرے میں ہم سمجھتے ہیں کہ علماء اسلام نے یونانی علم ہیئت کو تسلیم کیا اور اُن ہی کے اصول کو مذہبی کتابوں اور قرآن مجید کی تفسیروں میں داخل کر دیا رفتہ رفتہ وہ مذہب کے سانچا اور مسائل مذہبی میں ایسا بل چل گیا کہ یونانی علم ہیئت سے انکار کرنا گویا مسائل مذہبیہ سے انکار کرنا خیال میں سما گیا۔ پس جس قدر کہ ہم کو انکار ہے اُن ہی مسائل علم ہیئت یونانیہ سے ہے جن کو علماء اسلام نے مسائل مذہبی و تفسیر قرآن مجید میں شامل کیا ہے۔

یا تاریخی واقعات کا ذکر مورخانہ طور پر نہیں کیا گیا، صحیح ہو۔ اور گواہ اس سے بہت سی مشکلات دور ہو سکتی ہوں مگر اس میں شبہ نہیں ہے، کہ جب جزئیات پر نظر کی جاوے، اور مسائل مذہبی تفصیلی بحث ہو، تو یہ اجمالی خیال اُس تناقض کے دور کرنے کے لئے کافی نہ ہوگا جو اسلام اور حال کے علم میں ظاہر پایا جاتا ہے، بلکہ اس کے لئے جیسا کہ مولوی شاہ محمد حسین صاحب نے فرمایا، بالضرورت علم کلام کی ضرورت ہوگی۔ مگر اس کے لئے لازم ہے کہ علوم جدیدہ سے بخوبی واقفیت ہو، اور علمی مسائل کا علم کامل طور پر ہو۔ اور ایسی واقفیت ہونی چاہیے، جب تک کہ وہ کتابیں نہ دیکھی جاویں، جو ان علوم میں تفصیلات کی گئی ہیں، اور اُس کے لئے ضرور ہوگا کہ یورپ کی زبانیں سیکھی جاویں۔ اس لئے کہ جس طرح خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں یونان اور فارس کی علمی کتابیں ہماری زبان میں ترجمہ ہو گئی تھیں، اُس طرح آج ترجمہ کی ہوئی کتابیں قول نہیں سکتیں، اور اگر کسی نے اردو یا عربی میں کوئی ایک آدھ کتاب کا غلط سلسلہ ترجمہ کر لیا، اُس سے آدمی اصل علم سے واقف نہیں ہو سکتا۔ سوائے اس کے آج علوم کی اس قدر ترقی ہے، اور اُس کی اس قدر شاخیں ہو گئی ہیں، اور اس کثرت سے کتابیں روزانہ تصنیف ہوتی جاتی ہیں۔ کہ بغیر اصل زبان کے جاننے کے ترجمہ سے کبھی کام نکل ہی نہیں سکتا۔ مگر یہی اس بات کے دیکھنے سے خوش ہوں، کہ مدوۃ العلماء اس سے بے خبر نہیں ہے، اور وہ اصل زبان میں علوم کے حاصل کرنے کی ضرورت سے واقف ہے۔ مولوی منصور علی خاں صاحب لکھتے ہیں کہ ”چند علماء اہل اسلام جو معقول اور منقول اچھی جانتے ہوں، اور استدلالی قوت عمدہ رکھتے ہوں، اگر زبان انگریزی میں بھی مہارت پیدا کر کے جوابات مخالفین لکھا کریں۔ اور انگریزی اعتباراً تائید اسلام میں جاری کریں، تو اہل اسلام کو بڑی ترقی اور کامیابی حاصل ہوگی۔“ اس تجویز کو دیکھ کر ان لوگوں کو تعجب ہوگا، جو کہ مسلمان عالموں پر عموماً نقشب کا الزام لگایا کرتے ہیں، بلکہ اس سے زیادہ اُن کو مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب دہلوی کی تقریر کے بعض مقامات پر حیرت ہوگی، کہ وہ نہ صرف علوم و فنون جدیدہ کے حاصل کرنے کی ضرورت بتاتے ہیں، بلکہ اب تک جو غفلت مسلمانوں نے کی اُس پر اس طرح افسوس کرتے ہیں کہ ”تختِ پچاس برس سے نئے علوم اور جدید فنون جو فاتح اور حکمران قوم کے ساتھ آئے اُن سے بھی ہماری نفسی نے حصہ نہ لینے دیا، ایک تو افلاس تھا ہی، اُس پر نفاق اور جہل نے، اور بھی رہی سہی عزت اور دولت کو برباد کر دیا۔“

اے حضرات! اگر ہم کو یہ نفسی دانگی نہ ہوتی، اور گذشتہ پچاس برس میں بقول مولوی عبدالحق صاحب کے، ہم نئے علوم اور جدید فنون سے ناواقف نہ رہتے۔ تو قطع نظر اس کے کہ ہماری دنیاوی عزت و تہ سے نہ جاتی۔ ہم اب تک بہت سے عالم اپنی قوم میں ایسے دیکھتے، جو علوم دینی تفسیر اور حدیث کو بھی محققانہ طور پر جانتے ہوتے، اور علوم و فنون جدیدہ سے بھی بخوبی ماہر ہوتے۔ عربی

زبان میں بھی استادی کا فخر اُن کو حاصل ہوتا، اور یورپ کی زبانوں میں بھی کامل ہوتے۔ اور اُس علم کلام میں جس کی اب ضرورت بیان کی جاتی ہے، اب تک ہم بہت سی کتابیں موجود پاتے۔ کیا خوب فرمایا ہے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے، کہ ”کسی مذہب کی نزدیک کرنا، قبل اس کے کہ اُس کو سمجھیں اور اُس کی حقیقت سے مطلع ہوں اندھیرے میں نہر چلانے ہیں، اور بے سمجھے بوجھے محققہ مسائل کو غلط کہہ دینا، اور جو باتیں علم کی دلائل ہندسیہ کی طرح مستحکم دلیلوں سے ثابت ہو چکی ہیں، اُن کو نہ مانتا مذہب کی حمایت نہیں ہے، بلکہ ایسی حمایت کرنے والوں کو، وہ اسلام کا جاہل دوست سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی ایک کتاب میں فرماتے ہیں کہ ”ریاضیات میں ایک آفت اسلام کے دوستوں سے پیدا ہوئی ہے، جن کا یہ خیال ہے کہ دین کی فتحیابی یہ ہے، کہ جو علم فلاسفہ کی طرف مغرب ہو، اُس سے انکار واجب ہے۔ اس لئے انہوں نے جملہ علوم فلاسفہ سے انکار کیا ہے۔ اور اُن کی جہالت نے اُن کو یہاں تک آمادہ کیا ہے، کہ جو کچھ فلسفیوں نے کسوف و خسوف کے باب میں لکھا ہے اُس سے بھی انکار کیا، اور یہ سمجھا کہ اُن کے یہ اقوال بھی خلاف شرع ہیں، جب یہ بات ایسے شخص کے کان میں پڑتی ہے جس کو یا موریل قطعی سے معلوم ہو چکے ہیں، تو اُس کو اپنی دلیل میں تو کچھ شک پیدا نہیں ہوتا، لیکن اُس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اسلام اس دلیل قطعی کے انکار اور جہل پر مبنی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ فلسفہ کی محبت اور اسلام کی طرف سے بغض روز بروز ترقی پاتا ہے۔ پس جس شخص نے یہ گمان کیا، کہ ان علوم کے انکار سے اسلام کی نصرت ہوگی، اُس نے حقیقت میں دین اسلام پر سخت ظلم کیا، دوسرے مقام پر وہ فرماتے ہیں کہ ”جو شخص یہ گمان کرتا ہے، کہ ان مسائل محققہ علم ہیئت پر ہندسہ و حساب کی رو سے ایسے دلائل قطعی قائم ہو چکے ہیں کہ اُن میں شک کی مجال نہیں ہے، جو شخص ان دلائل سے واقف ہو، اور اُس نے اُن کی خوب تحقیق کر لی ہو، اور وہ حساب کی رو سے کسوف و خسوف کی پہلے سے خبر دیدی، اور یہ بھی بتادی، کہ کس قدر اذکتی دیر تک کسوف و خسوف رہیگا، اُس کو اگر یہ کہا جائے، کہ تمہارا قول خلاف شرع ہے، تو اُس کو اپنے قول کے یقینی ہونے میں تو شک ہونے سے رہا ہی، ہو نہ ہو شرع کی صداقت میں ہی اُس کو شبہ پیدا ہوگا، پس بقول شخصے کہ ”جاہل دوست سے عاقل دشمن بہتر ہے، جو لوگ شرع پر معقول طریقہ سے طعن کرتے ہیں، اُن سے مذہب اسلام کو اس قدر ضرر نہیں پہنچتا، جس قدر اُن لوگوں سے پہنچتا ہے، جو بیٹھتے ہوئے شرع کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ پھر اس کے آگے امام صاحب نے ایک حدیث کا ذکر کر کے فرمایا ہے کہ ”اگر کوئی یہ کہے کہ کسوف و خسوف کا اس طور پر بتانا اُس حدیث کے الفاظ کے خلاف ہے، جس کے یہ الفاظ ہیں کہ جب کسی شے پر اللہ تعالیٰ کی تجلی ہوتی ہے، تو وہ شے اُس کے آگے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ تو اُس کا یہ جواب ہے کہ اول تو ان زائد الفاظ کی صحت مشتبہ ہے۔ اندنیست

راہی کی تکذیب واجب ہے، اور اگر یہ روایت صحیح بھی ہو، تو امو قطعیہ کے انکار کی نسبت ایسی روایت کی تاویل کرنا سہل تر ہے۔ بہتیری جگہ بعض ایسے دلائل قطعیہ کی وجہ سے جو وضوح میں اس حد تک نہیں پہنچتے تھے جس قدر دلائل دربارہ کسوف و خسوف پہنچتے ہیں، ظاہر آیات کی تاویل کرنی پڑی۔ غرض کہ یہ امر کہ حال کے علمی مسائل پر غور کیا جائے اور اُس کی تردید یا تطبیق مذہبی مسائل سے کیجائے، بلاشبہ نہایت ضروری امر ہے۔ اور اُس کے لئے اُن علوم کا سیکھنا لازم ہے، اور ہمارے تمام عالموں پر یہ فرض کفایہ ہے۔

مگر حضرات! میں اس بات سے انکار نہیں کرتا، کہ ہمارے بعض یا اکثر علماء کو مغربی علوم و فنون سے نفرت نہیں ہے، یا وہ انگریزی تعلیم کو حرمت اور کراہت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ بلاشبہ اکثر اُس سے نفرت کرتے، اور اُس سے بُرا جانتے ہیں۔ لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ ان علوم کو اب تک وہ علوم ہی نہیں سمجھتے، اُن کا تو خیال ہے کہ جس طرح نقلی علوم قرآن اور حدیث میں جمع ہیں، اور اُس کی تفسیر اور تفصیل بچھلے علماء پر ختم ہو گئی، اسی طرح فلسفہ اور معقولات کا علم آرسطو پر ختم ہو گیا، اور فارابی اور بوعلی اُس کی تشریح کر چکے۔ اُن کے اقوال اور خیالات کے جمع کرنے سے بچھلے مصنفوں نے ہم کو فارغ کر دیا جس طرح علم دین میں کوئی اب نئی بات نہیں نکال سکتا، اور نہ نئی شریعت کوئی لاسکتا ہے۔ اسی طرح فلسفہ و حکمت میں اب کوئی نئی بات نہیں کہہ سکتا، نہ کسی علم و حکمت سے کوئی نئی بات معلوم ہو سکتی ہے۔ جو نئی باتیں بیان کی جاتی ہیں، وہ چند سودائیوں کے محل خیالات ہیں، جو دو ربینوں اور نئے آلات سے غلطیوں میں پڑے ہیں۔

مگر حضرات! یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اور نہ صرف ہماری ہی یہ حالت ہے۔ بلکہ ہم اگر یورپ کی گذشتہ حالت کو دیکھیں، اور اُس زمانہ کی جو ٹڈل ایجنز (یہ زمانہ چوتھی صدی عیسوی سے چوتھیں صدی تک سمجھا جاتا ہے) کے نام سے پکارا جاتا ہے، تانچے پڑھیں، تو ہم کو معلوم ہو گا کہ اُس زمانہ میں یورپ کی حالت ہمارے بدتر سے بدتر زمانہ سے بھی زیادہ ابترا و خراب تھی، اور جن افسوسناک غلطیوں میں ہم پڑے ہوئے ہیں، اُس سے ہزار درجہ بڑھ کر یورپ کے عالم پڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت اُن میں بھی دو قسم کے لوگ تھے، ایک وہ جو صرف منقولی تھے، اور علم کی جانچ مذہبی روایت سے کرتے تھے جس بات کو وہ اپنے ماننے ہوئے مسائل کے خلاف پاتے، اُسے صرف اسی بنیاد پر کہ وہ مذہب کے خلاف ہے باطل سمجھتے، اور اُس کے ماننے والے کو کا فر ٹھہراتے۔ دوسرے وہ جو منقولی تھے، مگر فلسفہ اور علم میں بھی کسی جدید بات کو نہ مانتے، بلکہ ہر علمی مسئلہ کے لئے بھی کسی اگلے حکیم یا عالم کی رائے کی سند چاہتے، ایک ناجی مورخ یورپ کا لکھتا ہے، کہ تیسری صدی عیسوی کے ختم پر جب کہ عیسائیت کا غلبہ ہونے لگا یونانی فلسفہ کا زوال برابر ہوتا چلا گیا۔ ایجاد اور تحقیق کی

قوت دماغوں سے جاتی رہی، بجائے موجود و محقق عالموں کے صرف اُن کے اقوال کی شمع کرنے والے رہ گئے، اور بجائے اس کے کہ خود حق کی تحقیق کریں اور اپنی دماغی قوت کو کام میں لادیں۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو بڑا معقول اور فلسفی سمجھتے، اپنی رائے کی تائید قدامت کے اقوال اور آراء سے کرتے، اور افلاطون یا ارسطو کی اصلی یا منسوب الہیم آرا کو حق کا معیار سمجھنے لگے۔ اس زمانہ میں علما اس طرح عمل کرتے تھے گویا نسل انسانی میں اصلی تحقیقات اور دریافت کرنے کا کبھی رواج ہی نہیں ہوا۔ اور گویا وہ حقائق جو دنیا کو معلوم ہیں، غور اور فکر اور تحقیق و تجسس کے نتیجے نہیں ہیں، بلکہ قدیم زمانہ میں بطور وحی کے آسمان سے نازل ہوئے ہیں۔ یہ خیال جو اس زمانہ کے لوگوں میں پیدا ہوا، اور یہ طریقہ جو انہوں نے علم میں اختیار کیا، وہ نتیجہ تحقیق کے چھوڑنے اور تقلید کے اختیار کرنے کا تھا۔ جب یورپ مذہبی باتوں میں تقلید پر مجبور کیا گیا، وہ بحث اور تحقیق کی راہ سے روک دیا گیا۔ تو اس کا اثر لازمی یہ تھا، کہ آہستہ آہستہ دماغوں سے ایجاد کی قوت اور تحقیق کا خیال جاتا رہا، اور اُن لوگوں کی رایوں اور خیالوں کا جانا ہی علم سمجھا جانے، جو لوگ کہ موجود اور محقق تھے۔ جب آزادی کے مناز خیالات حکومت یا مذہب کے حکم سے بند کر دئے جاتے ہیں، تو بتدریج تحقیق کی قوت ہی زائل یا ضائع ہو جاتی ہے، اور علوم اپنی جگہ پر قائم اور مست ہو کر پیچھے کی طرف جانے لگتے ہیں۔ جب آدمی صرف علمی اصطلاحات کو بغیر اُس کے کہ ساتھ علم کی اصلی حقیقت کا خیال رکھے یا ذکر کرنے پر قناعت کرتے ہیں۔ اور جب کہ علمی مہول اور فلسفی مسائل اس طرح مانے جاتے ہیں گویا وہ بھی ایک قسم کی روایتیں ہیں، نہ اموی یقینی۔ اور جب کہ بجائے دیکھنے کے صرف کہنے پر ایمان رہ جاتا ہے۔ اور جب کہ علم سمجھا جاتا ہے، کہ وہ کچھلے دشمن لوگوں کی محض رایوں کا ایک مجموعہ ہے، نہ یہ کہ علم اُن زندہ قوانین کا بیان ہے جو ہمارے دنیا پر حکمراں ہیں۔ تب لا محالہ یہ صورت پیدا ہوگی، کہ آدمیوں کے ہاتھ سے علم کی گرفت نکل جائیگی، اور وہ علم جس کو زمانہ سلف کے بڑے بڑے محققین نے تاریکی سے روشنی کی طرف نکالا تھا، پھر تاریکی کی طرف جانے لگیگا۔ اسی حالت میں یہ قابلیت باقی نہیں رہتی، کہ اُن علمی حقائق اور فلسفی مسائل کو جس کو پُر زور دماغوں نے نکالا تھا۔ یہ بوندے اور کمزور ہاتھ آگے بڑھائیں، اور ترقی دیں۔ بلکہ اُس میں اتنی قوت بھی باقی نہیں رہتی، کہ جس تاریکی سے علم نکل کر آیا تھا، پھر اُس تاریکی میں واپس جانے سے اُسے روکیں۔ اسی وجہ سے یورپ کی اُس زمانہ میں یہ حالت ہو گئی، کہ بجائے نئی باتوں کے ایجاد کرنے کے، پرانے حکیموں کی رایوں کا جمع کرنا ہی لڑنے لگے۔ ایک با وقعت جگہ پانے لگا۔ اور بجائے خود دلیل لانے کے ارسطو اور افلاطون وغیرہ حکیموں کے اقوال کو سند پیش کرنے لگے۔ اور جس طرح یہ کہنا کہ بائبل میں لکھا ہوا ہے، ارسطو اور افلاطون کی کتابوں کا حوالہ دینے لگے۔ اُس زمانہ کے علم حکیموں کے اقوال کو اس طرح جمع کرتے، جس طرح محدث روایتوں کو جمع کرتے ہیں۔ نہ اپنی عقل کو کام میں لاتے، نہ

اُس کی تنقید کرتے۔ گریسے اقوال کو اس طرح پر بیان کرنا، کہ گویا یہ اقوال مسائل لمبیات کے ثبوت کے لئے بڑے مستحکم دلائل ہیں، اس بات کی شہادت ہے، کہ وہ علم کو بہت سرسری نظر سے دیکھتے تھے، اور بہت سطحی طور پر سمجھتے تھے۔ نہ وہ اُن مسائل کی اصلی حقیقت سمجھتے تھے، نہ اُس کے سمجھنے کی فکر کرتے اور نہ اُس کی قوت رکھتے۔ فقط کسی بڑے کی رائے سمجھ کر اُسے مان لیتے، مگر علمی مسائل میں فقط سند کافی نہیں ہوتی ہے۔ ایسی سندیں اور بڑے بڑے آدمیوں کی رایوں کے حوالے، مذہبی باتوں میں بلاشبہ قابلِ وقعت ہیں، مگر علم میں اُس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ وہ علمی کتابیں جو اس زمانہ میں تصنیف ہوئیں، اس بات پر شاہد ہیں کہ فلسفیانہ دماغ باقی نہ رہے تھے، اور سوائے رایوں اور قولوں کے خلاصوں کے، فلسفہ کی جان کسی کتاب میں پائی نہیں جاتی۔ درحقیقت ایسی کتابوں کی غذا علم کا خون چوس ہوتی ہے۔ اور اُن کی مثال اُن کیڑوں کی سی ہے جو کسی جاندار کی لاش کے ٹرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت! یہ نہ سمجھنا کہ علم و فلسفہ کے منزل اور مصیبت کا خاتمہ اسی پر ہو گیا، کہ یکایک تحقیق کرنے والوں کے تفریح کرنے والے پیدا ہوئے، اور تصنیف کی قوت جاتی رہنے سے فقط شرح لکھنا رہ گیا بلکہ حالت بھی غنیمت تھی۔ اس لئے کہ شارحین اگرچہ غلامانہ اطاعت، رسطو اور افلاطون کی کرتے تھے، مگر اُن میں جودت اور ذہانت کی جھلک پائی جاتی تھی، وہ حکماء سلف کے خیالات ثابت کرنے کے لئے اپنی ذکاوت اور تیزی طبیعت سے کوئی نہ کوئی وجہ نکال لیتے تھے، اور اگرچہ حقائق کے ادراک اور نئی چیزوں کی ایجاد کی قوت نہ رکھتے تھے، تاہم وہ کسی حکیم یا فلسفی کے بارے اور قول سے مخالفت کو اگر کر سکتے بڑا نہ جانتے تھے۔ لیکن کچھ زمانہ کے بعد اس حالت میں بھی تبدیلی ہو گئی، اور جن غلاموں نے اپنے تئیں پرارے جوئے میں لگا دیا تھا، وہ یہ توجہ زبردستی اور دلوں کے گلے میں ڈالنے لگے۔ ذہن کی جس تیزی نے بعض مسلم تصانیف میں جو کچھ حقائق دریافت اور درج کئے تھے، چاہا کہ کسی آدمی کو ان حقائق کے سوائے اور کچھ نہ ملے، اور ان تصنیفات کے باہر کسی چیز کو وہ نہ دیکھ سکیں۔ اور اس کا نتیجہ ہوا کہ علما اور حکماء بغیر اس کے کہ خود اپنے آپ کو غلامی سے آزاد کریں، مطلق العنان اور طاہر بادشاہ ہو گئے۔ اور شارحین کی حیثیت میں انہوں نے مذہبی محکم کی حیثیت اور زیادہ کی۔ جب حکومت نے آزادی کو معدوم کر دیا، اور قومی عزت اور عظمت جو ہمیشہ آزادی سے پیدا ہوتی ہے جاتی رہی، اور بجائے شگفتگی اور جوش کے لوگوں پر اندوگی چھا گئی۔ اُس نے اس ناغی ضعف کو جو مذہب کے غلبہ سے پیدا ہونے لگا تھا اور بڑھا دیا، اور رفتہ رفتہ اُسے ایسا بچھڑا کر دیا، کہ تحریک کی قوت بالکل جاتی رہی۔ آدمی نیچر سے مشورہ کرنے بھول گئے، نئے حقائق کے دریافت کرنے سے جی پھرانے لگے۔ اور نہ صرف جی چرانے لگے۔ بلکہ اُسے ممنوع اور مکروہ اور ناجائز سمجھنے لگے۔ اس لئے کہ جب منطق اور فلسفہ مذہب

میں داخل ہو گیا، اور استدلال کا طریقہ مذہبی عقائد میں شمع ہوا، اور تردید تطبیق کے لئے حکمت اور فلسفہ کے اصول اور مسائل، دینی کتابوں میں داخل ہوئے اور ان میں ایسا غلط ملط ہو گیا۔ کہ ایک کا دوسرے سے پہچانا اور تمیز کرنا مشکل ہوتا۔ ایسی حالت میں یہ لازمی نتیجہ تھا، کہ علمی مسائل بھی مذہبی مسائل سمجھے جاتے، اور پھر آئندہ اُس میں بھی تحقیق بدعت اور اُس کا انکار کفر خیال کیا جاتا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مذہب نے اپنی حکومت نہ صرف مذہبی مسائل پر محدود رکھی، بلکہ تمام علوم کو اپنا ماتحت اور تمام حقائق کو مذہب کا جزو قرار دیا جس طرح کہ مذہب نے اپنے دائرہ کے اندر نہایت زبردست اور اعلیٰ حاکم کی طرف سے سند حاصل کی تھی، اور تمام چیزوں کو احکام الحاکمین کی طرف سے سمجھتے تھے، اسی طرح فلسفہ کو بھی مذہب کی شاہنشاہ نہ قوت میں شریک کر لیا۔ اور اُس کے مسائل سے انحراف کرنا بھی ناجائز اور قابل الزام اُدیگا گیا۔ غلطی کا خیال نشانِ جراثیم، اور تحقیق کا ارادہ بدعت سمجھا گیا۔ مسلم شدہ انسانی ہول سے انحراف اور بتعبدگی ویسی معیوب ہو گئی، جیسے قول ربانی سے انحراف، غرض کہ جس علم کو معقولات سمجھتے وہ بھی منقولات میں داخل ہو گیا۔

الحاصل اُس فرقے کے جو اپنے آپ کو معقولی سمجھتا، معقولات میں کیفیت تھی۔ اس سے انمازہ کرنا چاہئے، کہ وہ فرقہ جو اپنے آپ کو معقولی اور مذہبی سمجھتا اُس کی کیا حالت ہو گی۔

صاحبو! نہ اب اتنا وقت ہے اور نہ اس کا موقع کہ میں اس کا کچھ مفصل حال بیان کروں۔ مگر مختصراً اتنا کہنا چاہتا ہوں، کہ یہ فرقہ پہلے فرقہ کا بھی دشمن اور اُس کا مخالف تھا۔ اور سوائے مذہبی بات کے عقل اور علم کے نام سے متنفذ تھا۔ انہوں نے صرف اخلاقی باتوں میں بلکہ تمام چیزوں میں مذہب کو معیار صدق ٹھہرایا، اور اس بات کا دعوئے کیا۔ کہ جو کچھ خدا اپنے بندوں کو سکھانا چاہتا تھا وہ بذریعہ وحی کے سکھا چکا، اور جتنا علم انسان کو حاصل ہونا ممکن تھا، وہ بذریعہ ربانی الہام کے اُن کو بتا دیا گیا۔ انہوں نے اشتهار دیا کہ اُن کی مقدس کتابیں گویا علم کی حدود ہیں، اور اس علمی اجارہ میں اُن کے پادری سلطنت کی حمایت سے کسی حریف کی رقابت کو ارادہ کر بیٹھے۔ پس اس بلور پر علم مکروہ اور حرام اور ممنوع قرار دیا۔ اور حکم مذہب حکمت اور فلسفہ کی تعلیم بند کر دی گئی۔ چنانچہ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مذہب جو آج اپنے آپ کو علم کا حامی کہتا ہے، ہزار برس تک علم کا مخالف اور اُس کا دشمن اور اُن کی ترقیوں کا مانع اور محرم رہا۔ اور ظلمت کو ترقی ہوتی رہی۔ اور جو آفتیں اُس کے سبب سے علم پر آئیں، اور جو ہولناک نزائیں عالموں اور حکیموں اور فلسفیوں اور اُن لوگوں کو جو نئی تحقیقات کرتے یا کچھ بھی اُن کے اختلافات کے خلاف زبان سے نکالتے، دیجاتیں۔ اس وقت اُن کے خیال کرنے سے روٹ گئے کھڑے ہوتے ہیں۔ علم کے ساتھ اس مذہب کو ایسی عداوت ہو گئی، کہ اُس نے نہ صرف آئندہ کے لئے علم کی ترقی روکی، بلکہ پرانی علمی یا دگاروں کا باقی رہنا بھی گوارا نہ کیا، اور جب تک

سارے علمی خزانے برباد نہ کر لئے اور تمام علمی یادگاروں کو مٹا دیا، تب تک چین نہ آیا چنانچہ اسکندریہ کے بئب نے اسکندریہ کو اس مضمون کا فران شاہی بھجوا یا، کہ سر سپین جو مشہور کتب خانہ تھا منہدم کر دیا جاوے، اور اُس عظیم اور قدیم کتب خانہ کو جس کو بطلمیوس کے خاندان نے جمع کیا تھا، اور سیرز کی آگ سے بچ کر رہا تھا، اس جاہل متعصب پادری نے نیست و نابود کر دیا۔ اس مذہبی جوش نے جبل کو علم پر اور تعصب کو عقل پر اتنا غالب کر دیا تھا، کہ جو دردناک واقعات اُس وقت اُس سے پیدا ہوئے آج اُس پر یقین کرنا کیسا، کوئی اُسے حکایت اور افسانہ سے بڑھ کر تاریخی واقعات بھی نہیں مان سکتا چنانچہ سینٹ سرل (St Cyril) جس نے حضرت مریم کی پرستش کو رد و اج دیا، ایک عورت ہپاشیا (Hypatia) نامی کو جو حکمت کی عالم متبحر تھی، اور جو علمی مضامین پر لکھ دیتی، اور کتابیں تصنیف کرتی تھی، اور جس کے سبب سے اس تعصب پادری کو صدر مہینچا تھا۔ ایک دن جب کہ وہ مدرسہ کو جا رہی تھی اپنے پادریوں سے بچڑوایا۔ جنہوں نے اُس کو بیچ بازار میں اور زانو سنگا کیا، اور گرے میں لیجا کر پیڑ کے لٹھے سے اُس کا سر ٹھوڑا یا، اور اُس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے، اُس کے گوشت و پوست کو چھیل کر، اُس کی ہڈیوں کو آگ میں جھونک دیا۔ اُس واقعہ کے ساتھ ہی یونانی فلسفہ کا اسکندریہ سے چرچا اٹھ گیا، اور اُس علم کا جس کی اشاعت کے لئے بطلمیوس اور اُس کے خاندان نے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھانیں رکھا تھا، اس طور پر خاتمہ ہوا۔ سر سپین (Seapion) کا کتب خانہ تو برباد ہی ہو چکا تھا، جو کچھ اُن متذہب فلسفہ اور حکمت کی تحصیل کی باقی تھیں اُن کو ہپاشیا (Hypatia) کے عبرت انگیز واقعہ نے ٹھنڈا کر دیا، اور انسانی خیال کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا، اٹھیس (Athens) پر یہی آفت آئی اور فلسفہ کا بھی یہی حال ہوا۔ اُس شہر کے بھی تمام مدارس نوڑ دئے گئے، اور فلسفہ کی تعلیم کی قطعی ممانعت کی گئی۔ اور تمام علم حکمت کا دار مقدس کتابوں پر رکھا گیا، اور وہی تمام فلسفہ اور علوم کی سودنی قرار دی گئیں، اور تمام علوم یہاں تک کہ تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، طبقات ارض، اور دیگر علوم کی شاخیں اُس میں چسپاں کر دی گئیں، اور دلائل کا نیا ڈھنگ نکالا گیا۔ یعنی بجائے اس کے کہ عقلی دلیل پیش کی جاوے، علم کو مذہبی دلیل سے باطل کرنے لگے۔ میں صرف نمونہ کے طور پر آپ کو ایک دلیل سناتا ہوں، جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کیسی عمدہ اور قوی دلیلیں، علم کے مقابلہ میں یہ بزرگوں پر پیش کیا کرتے تھے۔ ایک زمانہ میں زمین کے گول ہونے کی بحث پیش ہوئی اُس کی کردیت کے بطلان پر یہ دلیل پیش کی گئی، کہ ”کیا یہ ممکن ہے کہ انسان ایسا بڑا بیوقوف ہو کہ یہ بات باور کرے کہ درخت اور پودے زمین کے دوسری طرف نیچے کو ٹٹک رہے ہیں، یا دناں کے باشندوں کے پاؤں اوپر ہیں، اور سر نیچے۔ اگر ان لوگوں سے پوچھو، کہ ان بیوقوفوں کا کیا جواب دیتے ہو، اور کیوں یہ چیزیں زمین پر سے گر نہیں جاتیں، تو وہ کہتے ہیں کہ اشیاء کی

بالطبع خالصیت ہے، کہ بھاری چیزیں مرکز کی طرف اور ہلکی چیزیں مثلاً بادل دھواں اور آگ، باہر کی طرف رجوع ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ان لوگوں کو کیا کموں۔ جب ایک بار غلطی کرتے ہیں تو اُس پر اس قدر قائم ہو جاتے ہیں، کہ ایک احمقانہ رائے کی دوسری احمقانہ رائے سے تسلیم کرتے ہیں۔ اسی مسئلہ پر مشہور پیشواے دین عیسوی کے سینٹ آگسٹس بڑے دعوے سے کہتے ہیں کہ زمین کی اُس طرف آبادی کا ہونا محال ہے، اس واسطے کہ کتاب مقدس میں حضرت آدم کی اولاد میں کوئی قوم اس قسم کی بیان ہی نہیں کی گئی۔ مگر اس مسئلہ کے خلاف میں کہ زمین کی شکل کر دی ہے، سب سے اہم اور لوجہ دلیل یہ سمجھی جاتی ہے، کہ ”اُس طرف کے باشندوں کو حشر کے دن ہمارے خداوند کا آسمان سے زمین پر اترنا کیونکر نظر آدیکھا“ اس لئے کہ جب زمین گول ہے تو اس کے ایک ہی طرف لوگ دیکھ سکیں گے۔ حالانکہ ہمارا خداوند مسیح جب آسمان سے اترے گا۔ تو وہ تمام لوگوں کو اترتا ہوا دکھائی دیگا۔ اس زمانہ میں جب کہ تمام علوم کا دارو مدار مذہب پر تھا، اور حقائق اشیاء کا بیان بھی مذہب کرتا تھا، اور سیریت جغرافیہ، اور طبقات ارض، غرض کل عالم کی حقیقت کا بنانا بھی مذہب کے ذمہ سمجھا جاتا تھا۔ ایک کتاب تصنیف ہوئی، جس کا مختصر بیان سنانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اور آپ کو تعجب ہو گا کہ وہ میانی جو آج ہم پر ہنستے، اور ہم کو علم کا دشمن سمجھتے، اور جو اس وقت حقیقت میں علم کے بڑے حامی اور مرتبی ہیں، وہ کیسے خیالات رکھتے تھے، اور اُن کے مذہبی عالم کیسی عجیب تصنیفیں کیا کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”اصول جغرافیہ کا یہ ہے کہ زمین ایک سطح ہے جس میں چار گوشے ہیں۔ مشرق سے مغرب تک چار سو دن کی مسافت ہے اور شمال سے جنوب تک اس سے ڈیوڑھی۔ اس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں جس پر آسمان قائم ہے۔ شمال کی جانب میں ایک بہت بڑا پہاڑ ہے۔ اس کے پیچھے جب آفتاب جاتا ہے تو دنیا پر تار کی چھ جاتی ہے، جسے رات کہتے ہیں۔ زمین کچھ جنوب کی جانب جھکی ہوئی ہے، اس وجہ سے دریائے فرات وغیرہ جن کا بہاؤ جنوب کی جانب ہے، بہت تیزی سے بہتے ہیں“ ایک دوسرے صاحب علم ہیئت کے متعلق فرماتے ہیں کہ ”آسمان آتشیں اور رقیق شے ہے اور برق کی ٹھنڈک سے اُس کی حرارت بڑھنے نہیں پاتی ورنہ ساری دنیا جلجاوے“

غرض کہ حقیقت تھی اُس علم کی، جس کی نسبت کہا جاتا تھا، کہ یربانی الامام کے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے، اور جس پر بزرگان دین نے انسانی علم کو حصر کر دیا تھا، کتاب مقدس کو جس کی صلی غرض یہ تھی، کہ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرے۔ اس غرض سے نکال کر انسانی علوم کا معیار بنادیا۔ اور لوگوں کے قولے عقلی پر جاننا نہ حکومت قائم کر دی۔ تمثیل تو موجود ہی تھی، پر وہ بہت سے پیدا ہو گئے، یونان کی اعلیٰ اور بڑی تصنیفات فلسفہ پر مگر ابھی کافوئے صادر کیا گیا، اسکندر یہ کے عجائب خانہ کے بے بہا اور نادر خزانہ پر جہل اور غلاق کا پردہ ڈال دیا گیا۔ اور عقل میں عقل کو دخل دینے اور مذہب کو علم

ملانے سے وہ مجذوبانہ بڑا اختیار کی گئی، جسے نہ کوئی سمجھ سکتا تھا نہ اُس سے کچھ فائدہ تھا۔ بہر حال اس زمانہ میں انہیں علوم کی تعلیم ہوتی، جن کو پادریوں نے اپنے قصب یا نادانی یا فائدہ کی غرض سے جاری کر رکھا تھا، اور اُس میں تغیر یا تبدل یا ترقی نہ فضول سمجھی جاتی، بلکہ بے ادبی، اور الہام ربانی کی مخالفت خیال کی جاتی، اور صاف صاف کہا جاتا کہ

وكل العلم في البیسل ولكن

تقاصر عنه افهام الرجال

جو کچھ خدا کو تانا تھا، وہ بندر بیکتب مقدسہ کے بتا دیا گیا، اُن کے سوا کسی قسم کے دریافت کی کوشش، گویا خدا کی کنہ اور ماہیت کی تلاش کرنی ہے۔

صاحبو! ان خیالات پر جس کی اصلی بنیاد سینٹ گسٹس (St. Augustus) نے ڈالی، اور جو اُس کی تصانیف میں پائے جاتے ہیں، اور جس کو اہل مذہب پندرہ سو برس سے مستند مانتے چلے آتے ہیں، غور کرنے سے کبھی یہ امید نہیں ہو سکتی، کہ اُن میں تبدیلی ہو سکیگی، اور نہ یہ یقین آ سکتا ہے کہ وہ نہ خیریں جن میں ہزار برس تک تمام یورپ قید رہا کبھی ٹوٹ سکیگی۔ مگر آخر وہ زمانہ آیا، جس میں ان قیدوں سے لوگوں نے نکلنا شروع کیا۔ اور وہ پادریوں کے ڈالے ہوئے طوق اور سلاسل کو توڑنے لگے۔ چونکہ پادریوں نے اس کا نام مذہبی قید رکھ دیا تھا، اس لئے آغاز اُس کا اُسی کے توڑنے سے ہوا مگر تقلید کی قید سے رہائی آسان نہ تھی، اس لئے بہت بڑی جنگ کرنی پڑی، بہت سے عزیز اور قیمتی جلیا ضائع ہوئیں، اور بہت دن اس کام میں لگے۔ مگر آخر وہ آزادی حاصل ہوئی، اور اچھی طرح حاصل ہوئی جب ایک مرتبہ تحقیق کا پھر شوق تازہ ہوا، اور لوگوں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اس آزادی نے مذہب ہی کو آمیزش سے پاک نہیں کیا، اور نہ انسانی کتابیں چھوڑ کر لوگ خدائی کتابوں پر غور کرنے لگے، بلکہ اُس کا اثر تمام عقلی علوم پر بھی ہونے لگا۔ دماغوں میں تحریک پیدا ہوئی۔ خیالات روشن ہونے لگے۔ اور حقائق کے دریافت کرنے پر لوگ متوجہ ہوئے۔ اور جب اس طور سے ایک دفعہ وہ بند توڑ دیا گیا، جو علم کے صاف اور پاک چشمہ پر بنا دیا گیا تھا تو حکمت اور فلسفہ کا چشمہ بہنے لگا، اور خدا کی زمین کو صوبوں سے بھر پڑی، ہوئی تھی، تروتازہ کرنے لگا۔ علم میں غلامانہ اطاعت کے بدلے صداقت کی تحقیق ہونے لگی۔ لوگ رایوں کے اوپر ناز عداور مناظرہ چھوڑنے لگے۔ اور بجائے اس کے کہ پچھلوں نے کیا کہا ہے، خود دیکھنا شروع کیا۔ شرح اور اقوال کے بیان کا عمل ختم ہوا، اور سائنس یعنی علم کا آفتاب اُفتق میں نظر آنے لگا۔ لوگوں نے جب خود سوچنا اور غور کرنا شروع کیا۔ تو بہت جلد پادریوں کی اُس حکومت سے جو عظیم برفاقم کی گئی تھی بناد ت کرنے اور یہ کہتے لگے، کہ دوسروں کو کیا حق ہے کہ زبردستی اپنی رائیں ہم سے منوائیں، اور ہم کیوں اندھوں کی طرح دوسروں کے پیچھے چلیں، آخر انہوں نے پُرانے فلسفہ

خیالات اور قدیم نظاموں کے پرانے لباس ہمارے کچھ نیک دہسے، اور مسائل مستمہ اور کتب دہسی کے عقائد کے ماننے سے بھی منکر ہو گئے۔ جب ایک دفعہ اُن کو یہ بات معلوم ہو گئی، کہ ہم خود حقائق کا ادراک کر سکتے ہیں، توقع کی طرف اُن کا میلان بڑھنے لگا، روز بروز انہوں نے حقائق کشیاری کی تحقیق آپادگی ظاہر کی۔ تقلید کی اس بغاوت، اور خیالات کی اس صفائی اور امتیاز نے سب سے اول علم ہیئت میں اپنا ظہور دکھایا، اور یہ صفائی اور صحت خیال، کو پرنکیس کے نظام میں تشکل ہوئی، اور ایک صدی کے سخت جنگ اور معاوضہ کے بعد گیلیلیو اور اس کے پیروں نے اُن مسائل کو ثابت کیا، اس کے بعد تیرج نہ صرف اسی علم میں ترقی ہوئی، بلکہ تمام علوم میں، خیال کے بدلے متناہدہ سے کام لینا شروع ہوا، اور ہر علم میں روزانہ ترقی ہونے لگی۔ اور نہ فقط پرانے علوم میں غلطیوں کی اصلاح ہوئی، بلکہ بہت سے نئے علوم ایجاد ہوئے۔ نئی نئی باتیں دریافت کی گئیں۔ اور وہ حیرت انگیز نتیجے ظاہر ہوئے جن کو نہ ہم نقطہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، بلکہ اُس سے ہم مستفید اور متمتع ہو رہے ہیں۔

حضرات! میں نے جو شبیہ یورپ کے علمی حالت کی چھوٹے سکیل میں اس وقت آپ کے دکھائی وہ کوئی خیالی تصویر نہیں ہے، بلکہ اصلی اور سچی صورت یورپ کے تنزل اور ترقی کی ہے، یہ کوئی افسانہ نہیں ہے جو میں نے آپ کو سنا یا ہو۔ بلکہ یہ وہ واقعات ہیں جو یورپ پر گزرے، اور جس ہم کو نہایت غور کرنا چاہئے، تاکہ ہم اپنی تعلیم کی موجودہ حالت کو ابتداء اور غیر مفید دیکھ کر یوس نہ ہوں اور اپنی قوم میں خیالات کی تبدیلی اور اُس سے ترقی حاصل کرنے سے شکستہ دل نہ ہوں۔

صاحبو! جو چیز دنیا میں ایک مرتبہ کسی قوم یا کسی ملک میں ہوئی ہے۔ کیا سبب ہے کہ دوسری قوم اور دوسرے ملک میں وہ نہ ہو سکے۔ اور جو نظیر ایک قوم کی ہمارے سامنے ہے، اُسے دیکھ کر ہماری تہتیں کیوں نہ بڑھیں، اور ہمارے دلوں میں جوش کیوں نہ پیدا ہو۔ اور ہم اپنے علماء سے جن میں خدا کی مہربانی سے بہت سے عالی دماغ اور روشن خیال آب تک موجود ہیں، اپنی حالت کی اصلاح کی توقع کیوں نہ کریں۔

خصوصاً ایسی حالت میں کہ نہ یورپ کے اُس زمانہ کی طرح جس کا ذکر میں نے ابھی کیا، ہم باطل خیالات اور غلط ادغام میں گرفتار ہوں، نہ ہماری تعلیم کی حالت اُس درجہ ابتداء اور خراب ہو، نہ ہمارے علماء اُس زمانہ کے پادریوں کی طرح حکمت و فلسفہ کے دشمن ہوں، کیا وجہ ہے کہ ہم ترقی سے نا امید ہوں۔ اور جب کہ خود ہمارے علماء نے تعلیم کی اصلاح پر توجہ شروع کی ہو، ہم کیوں ہیو خیالات دل میں پکاتے رہیں۔ سوائے اس کے یہ بات بھی غور کے لائق ہے، کہ ہم کو وہ مشکلات بھی درپیش نہیں ہیں، جو یورپ کو اپنی حالت کی اصلاح میں پیش تھیں، اس لئے کہ وہاں چرچ یعنی پادریوں کا فرقہ دینی اور دنیاوی دونوں حکومت رکھتا تھا۔ کوئی شخص اُن کے مقرر کئے ہوئے اصول

اور قواعد اور احکام اور ان کے بتائے اور بنائے ہوئے مسائل سے سرموجا و فریب کر سکتا تھا، اور ان میں تعصب اور خیالات کا وہ زور تھا، کہ اختلاف اور آزادی کو گونا گوت ہی خفیت ہوتی جائز نہ رکھتے تھے، اور ذرا سی مخالفت پر جلا وطن اور قتل کی سزا دیتے تھے۔ اس لئے وہاں اس مذہبی بغاوت کی ضرورت ہوئی، جس کا کچھ مختصر بیان میں نے کیا۔ مگر ہماری حالت دوسری ہے، نہ ہمارے علماء کو وہ حکومت ملی دینی اور دنیوی حاصل ہے، نہ وہ اپنی خصمت اور یگینا ہی کے مدعی ہیں۔ نہ ان کا کوئی ایک فرقہ ہے جو سب پر اقتدار اور اختیار رکھتا ہو، نہ ان میں وہ تعصب اور جہالت ہے کہ اصلاح کو کفر سمجھتے ہوں۔ ہاں اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ بعض لوگ جو فلسفہ حکمت کے ذائقہ سے آگاہ نہیں ہیں۔ اور وہ فقیہ اور ملا جن کو تحقیق کے وسیع میدان میں سیر کرنے کی عادت نہیں ہے۔ اور وہ حضرات جو زمانہ کی ضرورت اور حالت سے واقف نہیں ہیں، البتہ کسی قسم کی تبدیلی اور اصلاح کو پسند نہ کریں گے۔ مگر جب کہ خود ایک بڑا گروہ علماء کا اصلاح پر آمادہ ہوا ہے، اس لئے زمانہ کی ضرورت پر نظر کی ہے، وہ غیر مفید تعلیم کو نفعی اوقات سمجھ رہا ہے اور اسی گروہ میں میں دیکھتا ہوں، کہ وہ نامور عالم داخل ہیں جن کو لوگ مقتدا اور پیشوا سمجھتے ہیں، اور جو اپنے علم و فضیلت کے سبب سے اس کے اہل ابھی ہیں، تو چند تعصب اور بے خبر لوگوں کے اختلاف سے کیا خلل ہو سکتا ہے، اور اصلاح کا ارادہ ہمارے علماء نے کیا ہے وہ کیوں رک سکتی ہے، اور یہ اصلاح بھی تو ایسی نہیں ہے جس میں کوئی مذہبی اعتراض ہو سکے، یا یورپ کی طرح اس کے لئے مذہبی بغاوت اور مذہبی مسائل میں تبدیلی کی ضرورت ہو۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں دو قسم کی تعلیم ہے۔ مذہبی اور دنیاوی، جسے منقول اور معقول کہتے ہیں۔ مذہبی تعلیم میں کسی بڑی اصلاح کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہم اس میں کسی اہم تبدیلی کی ضرورت دیکھتے ہیں، نہ اس حصہ میں تعلیم کی، ہم سوائے علماء کے دوسرے کی مداخلت پسند کرتے یا جائز رکھتے ہیں۔ سنی اور شیعہ مقلد اور اہل حدیث سب مختار و آزاد ہیں، اور آزاد ہونے چاہئیں، کہ جن مذہبی کتابوں کو اپنے معتقدات کے موافق سمجھیں اسے درس میں داخل رکھیں۔ کسی دوسرے کو نہ حق ہے نہ اجازت، کہ اس میں مداخلت کرے۔ اب جو کچھ اصلاح کی ضرورت ہے، وہ دنیاوی تعلیم میں ہے۔ اور اس میں دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ موجودہ تعلیم جو غیر مفید اور فضول ہے وہ ترک کی جائے۔ دوسرے مغربی علوم و فنون کے سکھانے کی کوشش ہو اور ڈیڑھ نو وہ باتیں ہیں۔ جس پر اب تک ہمارے علماء کو توجہ نہ تھی، اور اگر تھی تو اس کا ہمیں علم نہ تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اب وہ اس طرف متوجہ ہوئے ہیں وہ معقول کی تعلیم کو بھی محتاج اصلاح سمجھتے ہیں، اور مغربی علوم کی تعلیم کی بھی ضرورت بتاتے ہیں دھندھا مکتا نبغی +

حضرات! میں نے تعلیم کے مسئلہ پر جو کچھ اس وقت کہا، اگرچہ اس سے آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا

اور غالباً کسی قدر میری گفتگو طول بھی ہو گئی۔ مگر مجھے اس بات کا دکھانا منظور تھا، کہ ترقی اور منزل کا دور ہوتا رہتا ہے۔ اور دولت ہو یا حکومت، اندھ بھو یا علم۔ غرض کہ ہر چیز مختلف ملکوں میں ہمیشہ کھنٹی بڑھتی رہتی ہے، کوئی قوم ایک ہی حالت پر کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی لئے کسی مصیبت زدہ قوم کو اپنی دولت اور ارباب کو دیکھ کر دل شکستہ اور یائوس نہ ہونا چاہئے، نہ کسی قوم کو اپنے اقبال کے آفتاب کو نصف النہار پر چمکتا دیکھ کر مطمئن۔ جس طرح یورپ کی جمالت اودام اور نعمتبات کو دیکھ کر شعلہ سے خیال ہو سکتا تھا۔ کہ پھر علم کی روشنی وہاں پھیلے گی یا تہذیب و شائستگی کی ایسی ترقی ہوگی۔ اسی طرح ہم کو اپنی موجودہ حالت دیکھنے سے کسی قدر یائوسی ہوتی ہوتی تھی۔ قوم کو خواب غفلت میں پڑا ہوا دیکھ کر اس کے چونکنے کا خیال بھی ہمیں نہ ہوتا تھا۔ مگر اب ہم اس کی بیداری کی نشانیاں دیکھتے ہیں اس کے جگانے والے چاروں طرف نظر آتے ہیں۔ کل کی بات ہے کہ ہماری قوم اپنی حالت پر ایسی مطمئن، اور اپنے علم و عمل پر ایسی نازاں تھی، کہ اس میں کسی اصلاح اور ترمیم کی گویا گنجائش ہی نہیں ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سمت سے نکتہ چینی کی صدائیں بلند ہیں۔ ہر فرقہ اپنے عیوب اور نقصانات کو دیکھ رہا ہے، اس کی درستی اور اپنی ترقی کی تدبیریں کر رہا ہے، اور وہ بڑا تیز اور بڑا جوشیلا میں ہوا ہے، اس کا ثبوت تہذہ احلما، ہے۔ جہاں کوئی تعلیم کو ناقص بتاتا ہے، کوئی اسے غیر مفید کہتا ہے، کوئی اس میں اصلاح چاہتا ہے۔ کیا آپ کو یہ امید تھی، کہ ہمارے علمائے کبار اس طرح جمع ہو گئے، اپنی منتشر قوتوں کو اس طرح جمع کرینگے، زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلنا چاہینگے، اور مغربی علوم کی تعلیم کی جسے اب تک لوگ بدعت اور ضلالت سمجھتے تھے، نہ صرف اجازت دینگے، بلکہ اس کا شوق دلا دینگے، اور درسی کتبوں اور پرانے علموں کے سوا کسی اور چیز کے سیکھنے اور سکھانے کی ضرورت تسلیم کرینگے، مگر اول ہی اجلاس میں انہوں نے دنیا کو متعجب کر دیا، اپنے عہدہ پاکیزہ خیالات سے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور اپنی مفید اور ضروری تجویزوں سے اس بات کو ثابت کر دیا، کہ یہی وہ فرقہ ہے جو قوم کی رہنمائی کر سکتا، اور قوم کو منزل مقصود پر پہنچا سکتا ہے۔ آپ لوگ جو مغربی تعلیم کا بڑا غل مچاتے تھے، اور اپنے علمائے کبار کو اس کا مانع اور مزاحم سمجھتے تھے کیسی غلطی میں تھے۔ اور کیسی غلط بدگمانیاں کرتے تھے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ جب وہ لوگ قوم کی حالت پر مطلع ہوئے۔ اور زمانہ کو دیکھا۔ تو انہوں نے کیا طریقہ اختیار کیا، اور کس راہ پر قوم کو چلانے لگے۔ خود اپنی گروہ کو کیا پیہنیں کیں، اور اپنے پیروں کو کیا سمجھایا۔ ذرا مولوی حبیب الرحمن صاحب کی تقریر کا خطہ فرمائے۔ وہ علمائے نسبت کیا فرماتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ "وارث انبیا کون سے علمائے آہودہ عالم جن کی ہدایت اور تبلیغ صرف فروعی اور اختلافی مسائل کے دو وقتی رسالوں اور چند صفحوں میں منحصر ہے، اگر مسلمانوں میں فسق و فجور کی وبا پھیلی ہوئی ہے تو ان کو پروا نہیں، اگر مخالفین اہل اسلام کے

مرد بنانے میں جان لڑا رہے ہیں تو ان کو اس سے بخت نہیں، اور اگر غیر مذہب والے اُن کو بالخاص تبلیغ احکام اسلام کے واسطے بلاتے ہیں تو اُس سے اُن کو کچھ سروکار نہیں۔ بلکہ وہ اپنی ہی کسر و انکساری میں مصروف ہیں، اور اُن کو اپنے بھائیوں کے خیر لینے سے فرصت نہیں۔ پھر وہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ ”حاشا ثم حاشا“

حضرات! انبیاء نے کوئی جامداد نہیں چھوڑی۔ کوئی ریاست اُن کے ترکے میں نہ تھی۔ انہوں نے صرف کچھ صفات چھوڑے جو اُن صفات سے تصف ہے وہی اُن کا وارث ہے۔ صرف کتابوں پر عبور کر جانا، اُن کا وارث نہیں بنا سکتا قرآنِ حَامِلِ فَخْرٍ عَزِيزٍ قَبِيْطٍ۔ پھر وہ یہ چوڑ کرتے ہیں کہ نصابِ تعلیم میں ایسی ترمیم ہو جس میں مذہبی علوم سے طلباء کو کماتھا، لگاؤ حاصل ہو، اور پھر اُن کو اتنا وقت ملے، کہ فنونِ جدیدہ میں فوغل اور زمانے کے رنگ ڈھنگ نشیب و فراز۔ آثار و طما سے شناسائی پیدا کر سکیں۔ بالفعل کم سے کم اتنا تو ضرور ہے کہ عربی اخبارات جو مصروفِ غیر میں شائع ہوتے ہیں وہ مدارس میں منگواے جائیں اور فنونِ جدیدہ کے تراجم دیں چھپے ہیں وہ طلب ہوں اور طلبہ بطور خود اُن کو مطالعہ کریں۔ اس سے بھی اُن کی نظر بہت کچھ وسیع ہو سکتی ہے۔ اگر رافع ضرورت یہ بھی نہیں ہے تو ایک عمدہ مشغلہ حال کے طلباء کے واسطے یہ ہو سکتا ہے، کہ جو متقدمین کی عزرا لوجہ کتابیں مصروفِ غیر سے طبع ہو کر آرہی ہیں۔ اُن کو پچھیں۔ اور اس سے انتقا ط کو کے رسالے شائع کریں یا اُن کے ضروری مقامات کے ترجمے رفاه قوم کے واسطے عام لوگوں میں پیش کریں۔ اس سے خود اُن کو اور عام مسلمان کو بہت کچھ فوائد نصیب ہو سکتے ہیں *

جناب مولوی عبداللہ صاحب انصاری نے اپنی قوم کی حالت کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے قوم کی حالت پر اس بزرگ و دیدار سے زیادہ غور کی ہو۔ یا اس پر سیر کا زفاصل سے بڑھ کر سما نوں کی ڈرا و فی تصویر کھینچی ہو۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”اس وقت جو ہم اپنی تعلیمی اور اخلاقی حالت دیکھتے ہیں تو اس میں انتہا درجہ کی ابتری پاتے ہیں، اور اس پر آفت تو یہ ہے، کہ ہماری تقدیر نے ایسا قضیہ تنگس کر دیا، کہ ہم لوگ بلا کو بھی بلا نہیں سمجھتے، بلکہ بلا کو عطا۔ درد کو دوا۔ زحمت کو رحمت۔ نعمت کو نعمت۔ تلون کو استقامت۔ ذلت کو عزت۔ قسارت کو اخوت۔ نفسانیت و تعصب کو حمایت دین و ملت سمجھنے لگے۔ بھلا وہ مریض کیونکر صحت پاسکتا ہے، کہ اپنے آپ کو مریض ہی نہ سمجھے۔ سب سے پڑھ کر انسان کے پیچھے یہ روگ ہے کہ باوجود بیمار ہونے کے پھر آپ کو تندرست سمجھے جس قوم پر شامت اعمال کا وبال اور انقلاب کی بلا اور عام تباہی کی وبا، آنے والی ہوتی ہے تو پہلے ہی سے اُس قوم کی اُلٹی قفل ہو جاتی ہے شاعت پسند و ناست پذیر طبائع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فی زمانہ نعوذ باللہ اپنا یہی حال ہے، اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ ”مخوفی قسمت“

اتفاقی کاموں میں بھی نفسانیت کو دخل دیا جا رہا ہے۔ وہ یہ کہ فقوڑی سی مسافت کے درمیان میں بہت سے مدارس جاری کر رکھے ہیں۔ یہ نہیں کہ اتفاق رائے انہیں مدارس کو جہات اربعہ میں ایک مناسب مسافت پر مقرر کرتے کہ جس سے عظیم الشان نفع پہنچتا۔ سب سے بڑھ کر یہ اتاری ہے کہ بعض بعض شہر بلکہ بعض قصبے میں بلا ضرورت کئی کئی مدرسے ہیں، اور ہر مدرسے کے مدرس دہشتم اپنے ہی مدرسے کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ حتیٰ کہ بعض حضرات اس درجہ اپنے مدرسے کی خیر خواہی میں نہمک ہو جاتے ہیں۔ کہ دوسرے مدارس کے تنزل بلکہ تخریب کے درپے ہو جاتے ہیں، جیسا کہ یہ امر آج کل شاہد ہو رہا ہے۔

صاحبو! اگر آپ لوگ ان باتوں پر غور کریں اور اس تغیر کو جو خیالات میں بزرگان قوم کے پیدا ہوا ہے، سوچیں۔ تو آپ کے دلوں میں بہت خوش کن امیدیں پیدا ہونگی۔ اور آپ اپنی قوم کی ترقی کی نشانیاں دیکھنے سے بہت خوش ہونگے۔

حضرات! اس میں شبہ نہیں کہ اس بڑی غفلت کے سبب سے جواب تک قوم نے کی، بہت بڑی تاریکی اُس پر چھا گئی تھی۔ مگر اب دور ہوئی جاتی ہے صبح ہو گئی ہے، روشنی کی شعاعیں نظر آنے لگی ہیں۔ قوم اس نئی روشنی پر آنکھیں لگائے ہوئے ہے اور دیکھ رہی ہے، کہ کس طرف اور کس طرح وہ بڑھتی ہے۔ اور صاف صاف معلوم ہو رہا ہے، کہ تعلیم کے دریا کی دھار پانا راستہ چھوڑتی جاتی، اور نئی راہ ڈھونڈ رہی ہے۔

حضرات! اندوۃ العلماء کے فوائد کے متعلق جو کچھ میں نے کہا، گواہ سے جیسا کہ چاہئے، میں بیان نہ کر سکا مگر غالباً میں اپنے پیش کئے ہوئے اندویشوں کے ثابت کرنے میں ضرور کامیاب ہوا، اور تمام شبہات اور شکوک میں نے اپنے نزدیک دُور کر دئے۔ اُن ایک خیال جو بعض لوگوں کو ہو رہا ہے، اُس کو بھی دور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے، کہ بعض سمجھتے ہیں کہ شاید شخصی خیالات اور تقدس کا ہمارا علما کو ایسے مجمع عام میں ہمیشہ شریک ہونے اور اپنے خیالات کے مخالف باتیں سُنی اور اتحاد اور اتفاق سے کام کرنے پر ثابت قدم نہ رکھے، اور بعض بزرگوں کا مذہبی جوش اسے بھی بدعت اور احداث فی الدین نہ کہنے لگے۔ مگر میرے نزدیک یہ خیال غلط ہے، بلکہ خود اُن کا علم اور تقدس اس بات کا ضامن ہے، کہ جو کام انہوں نے مشروع کیا ہے اُسے وہ پورا کر دکھائینگے، اور سید الفقوم خادم پر خیال فرما کر وہ قوم کی اس مبارک خدمت کو ہرگز نہ چھوڑینگے۔ لیکن اگر بالفرض بعض طبعتیں اُس کی متحمل نہ ہوں، نہ سہی۔ عموماً اس راہ پر ثابت قدم نہ رہنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے، اور بعض افراد کی مخالفت سے اصل مقصود کے فوت ہونے کا خوف ہے۔ پھر یہ بات بھی خیال کرنے کے لائق ہے کہ دوسری کونسی ایسی انجمن ہم مسلمانوں کی ہے، جہاں مخالفت نہیں ہوتی۔ یا ایک ہی خیال،

ایک ہی خواہش، اور ایک ہی ارادہ کے لوگوں میں باہم بھڑک نہیں پڑتی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں اگر کسی مجلس میں ایک بھی عالمی دماغ مستقل مزاج، اور بردبار لائق شخص ہوتا ہے، تو اُس کی قوت تمام مزاحمتوں کو دور کر دیتی ہے۔ اور اس قسم کے خست لافات کے برباد کن نتیجوں سے وہ اپنی انجمن کو اس طرح سے محفوظ رکھتا ہے، جیسے ایک ہوشیار اور تجربہ کار کپتان اپنے جہاز کو چٹانوں، پہاڑیوں، طوفان، اور تلاطم سے بچاتا ہے۔ اگر ہمارے علما کے فرقہ میں ایک بھی ایسا خیال نہیں کیا جاتا، تو سوائے مایوسی اور اسلام پر فاقہ پڑھنے کے کوئی امید مسلمانوں کی ترقی اور اسلام کی حفاظت کی نہیں ہے۔

مگر اے صاحبو! اسے یاد رکھو، اور خوب یاد رکھو، کہ بغیر اُس بزرگ اور عظمت اور بادعت گروہ کے جو علما کا ہے، ہم کبھی اپنے ارادہ میں اچھی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے، اور نہ صرف ہماری خوش قوم کو اپنے کمزور ہاتھوں سے پار لگا سکتی ہے۔ ہم جو کچھ اس حال میں کر رہے ہیں، اور جس کو کرتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا۔ اُس نے صرف ایک فیمل گروہ پر اثر کیا ہے۔ فقط چند لوگ ہمارے ہم خیال اور ہم داستان ہوئے ہیں۔ ہماری آواز اسی کرے میں گونجتی رہتی ہے، اور ہمارے خیالات کی مثل اسی احاطہ میں روشن ہو کر کچھ جاتی ہے۔ نہ قوم کا بڑا حصہ ہماری آواز سن سکتا ہے، نہ ہم اپنے بھائیوں کے گروہ کثیر کو یہ روشنی دکھا سکتے ہیں، گروہ آواز جو اُس مجلس سے نیکی کی جس کے ہاتھ میں مسلمانوں کے دل ہیں، اُسے ہر مسلمان پیشاور سے لیکر بڑھاتا، کشمیر سے لیکر بدراش تک سُنے گا، اور وہ مشعل جسے وہ لوگ دکھا نیگے جو دیانِ طریقت اور پیشوایانِ شریعت سمجھے جاتے ہیں، تو وہ ایسی بلند ہوگی کہ اُس کی نورانی شعلیں ہر مسلمان کے گھر میں نظر آویگی۔

صاحبو! مسلمان جاہل ہوں یا کامل، باہد اقبال ہوں یا بخل۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ وہ دل رکھتے ہیں اسلام کی محبت سے بھرا ہوا، اور طبیعت رکھتے ہیں مذہبی آگ سے بھڑکنے والی۔ جس چیز کو وہ اسلام کے خلاف سمجھیں گے، اُسے نہ کریں گے پر نہ کریں گے۔ اور جس راہ کو وہ دین کے خلاف سمجھتے ہیں، اُس پر نہ چلیں گے اور نہ گزرنے چلیں گے۔ اور اسلام اُن کے نزدیک ہی ہے جو علما بتاویں۔ پس اے حضرات! اگر ہم حقیقت قومی ترقی چاہتے ہیں، تو پہلا فرض ہمارا یہ ہے، کہ ہم اُن اپنا شریک کریں، اور اُن کو اپنے آگے رکھیں۔ اگر وہ ایک انچ ہماری طرف چلیں، تو ہم کو چاہئے، کہ ایک گز آگے بڑھ کر اُن کا استقبال کریں۔ اور وہ ایک قدم اپنے مقرر کئے ہوئے نقطہ سے آگے بڑھیں، تو ہم کو لازم ہے کہ ہم دو گز اُن کا خیر مقدم کریں، اور رجاءِ جبارِ جبارِ تعالیٰ، کہتے ہوئے اُن کے لئے راہ صاف کریں۔ اور ہم کو اُن سے بھی امید ہے، کہ وہ خدا کی وصال مندی اور رسول کی خوشنودی اور مسجد میں روزہ و نماز کے معمولی و عظمیٰ کرنے کو نہ سمجھیں گے، اور فقط مدرسہ میں بیٹھ کر چند پرائی کتابوں کے

پڑھا دینے سے اپنے آپ کو خدا اور قوم کے فرض سے سبکدوش نہ جانینگے، بلکہ علم کا نورانی جھنڈا تھیں
لیکر قوم کو جہاد اکبر و تادمہ کرینگے۔ تاکہ جہل، تعصب، اور ادا نام، جو قوم کے حقیقی اور زبردست دشمن
ہیں مغلوب کئے جائیں، اور فلسفہ، اور حکمت، عزت اور دولت، کی سلطنت پر پھر ہمارا قبضہ ہو۔ مجھے
امید ہے کہ یہ مبارک جھنڈا مذہبی اور مغربی تعلیم کا، جو ہمارے علمائے اپنے ہاتھ میں لیا ہے، اور
جس کے پرچم پر، بے تعصبی اور قومی ہمدردی کے مبارک الفاظ لکھے ہیں، اُسے آپ اپنے ہاتھ سے نہ گرنے
دینگے۔ اور آزادی کا پھریرا اڑا کر وہ پھر ایک مرتبہ فطیہ اور یغداد کی پھر یاد دلا دینگے، وان ذلک
علی اللہ لیسیر *



نمبر ۱۹

اسپیج

یہ اسپیش ڈاٹ صاحب نے اجلاس ہم محمدن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ شاہ جہان پور میں بہ حیثیت
پریزیڈنٹ ہونے کے افتتاح اجلاس کے وقت ۲۷ - دسمبر ۱۹۵۵ء کو فرمائی :-

بزرگان قوم !

جو عزت آپ نے اس معزز مجلس کے صدر نشین ہونے کی مجھے بخشی ہے، اُس کا میں دل سے
شکر ادا کرتا ہوں اور اس بات کا افسوس کہ میرے معزز دوست جناب سردار محمد حیات خاں صاحب جو
اس مجلس کی صدر نشینی کے لئے منتخب ہوئے تھے، بوجہ ایک ناگہانی اور دلگرا رصدمہ کے تشریف نہ
لا سکے اور یہ مجلس ایک ایسے پریسیڈنٹ کے صدر نشین دیکھنے کی خوشی سے اور عزت سے محروم ہوگئی
جس نے اپنی قوم کے لئے بہت ہی نمایاں کام کئے ہیں، اور جو اپنی وجاہت اور لیاقت اور استحقاق
سے تمام مسلمانوں میں معزز اور سر بلند ہے۔ اور جس نے کئی مرتبہ اس مجلس کی پریسیڈنٹی کے فرائض
اس لیاقت اور خوبی سے ادا کئے ہیں کہ وہ ایک عمدہ نمونہ صدر نشین ہونے کا تقسیم ہو چکے ہیں۔ اُن کے
عذر پر جو نہایت مجبوری اور افسوس سے قبول کیا گیا، جب آپ نے اپنی مہربانی سے مجھے اس خدمت
کے لئے منتخب فرمایا، تو میں نے کچھ تو اپنی نااہلیت اور کچھ بیماری کی وجہ سے کئی مرتبہ اس ذمہ داری
کی خدمت سے معاف کئے جانے خواہش کی، مگر جب میرا عقد قبول نہ ہوا۔ اور آپ کے سکریٹری
صاحب کا آخری فرمان پہنچا، میں آپ کے معزز سکریٹری کا آخری فرمان پاتے ہی جس طرح بیٹھا تھا

اٹھ کھڑا ہوا۔ اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ میری جسمانی صحت مجھے اپنی فرائض ادا کرنے سے کسی قدر مانع ہوگی اور میں اُمید کرتا ہوں کہ اگر بیماری اس خدمت کے فرائض ادا کرنے میں خلل انداز ہو تو آپ مجھے معذور سمجھیں گے اور معاف فرمائیے گے۔

حضرات! قبل کسی اور کام شروع کرنے کے مجھ پر فرض ہے کہ میں اپنے معزز دوست جناب خان بہادر برکت علی خاں صاحب اور دیگر رؤساء و عائد شاہجہان پور کا شکرا ادا کروں کہ ان کے بلانے اور خواہش سے ہم لوگ یہاں آئے اور علی الخصوص جناب محمد عثمان خاں صاحب کا احسان ہے کہ انہوں نے فرط مہمان نوازی اور حُب قومی سے اپنا عالی شان اور پُر آرام مکان ہم لوگوں کے لئے خالی کر دیا اور اس کے وسیع صحن میں وہ رفیع الشان ہال کا نفرنس کا عارضی طور پر بتایا گیا ہو۔ کہ جس سے بہتر میں نے اس قسم کے پبلک مجموعوں کے لئے جلدی اور پونہ میں بھی ہال بنا ہوا نہیں دیکھا۔ اور میں جناب مولوی رفعت علی صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میری نسبت ایسے عنایت آمیز الفاظ فرمائے ہیں جن کا میں سختی نہیں تھا۔

صاحبو! ربع صدی سے کچھ زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ جناب خان بہادر محمد برکت علی خاں صاحب کی ملاقات کی عزت مجھے حاصل ہے اُس دوستی اور محبت کی وجہ سے جو ذاتی خیال میرا ان کی نسبت ہے، اُسے میں اس وقت بیان نہیں کرتا۔ مگر جو حقوق ان کے قوم پر ہیں، اور جس اسلامی حمیت اور قومی ہمدردی سے انہوں نے قوم کی خدمت کی ہے۔ ان کی نسبت میں صرف اس قدر کہنے کی اجازت چاہتا ہوں، کہ اگر مثل ان کے چند مسلمان قوم کی فلاح اور بہبودی چاہنے والے اور ہونے، تو آج مسلمانوں کی حالت ہی کچھ دوسری ہوتی۔ اور سچے نالہ و نفاق کے قوم کی حالت پر خوشیوں کے نعرے چاروں طرف سے سنائی دیتے۔

اے صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ پچھلے سال کی کانفرنس میں ہماری قومی مجلس کا مقام بدیہی منعقد ہونا قرار پا چکا تھا، اور بدیہی کے معزز مسلمان نہایت مشتاق اور منتظر تھے۔ مگر سید صاحب قبلہ کی بیماری سے جب ٹال جانا ملتوی، اور اسی نواح میں کسی جگہ کانفرنس کا ہونا مناسب معلوم ہوا تو ممالک مغربی و شمالی و اودھ پر ہماری نظر تھی۔ مگر افسوس ہے کہ کسی گوشہ سے کوئی آواز ہمارے بلانے کی نہ آئی، نہ کسی شہر سے ہم کو دعوت دی گئی۔ مگر میرے معزز دوست ہی کا یہ کام تھا، انہوں نے رؤسائے شاہجہان پور کو قومی ہمدردی اور اسلامی محبت کا جو شبنم دلایا، اور ان کی تحریک پر اس شہر کے رئیسوں نے اپنی مردانہ ہمت اور فیاضانہ طبیعت سے یہاں کانفرنس کے منعقد کرنے کی تجویز کی، سادہ ہر طرح سے اُس کی شان و شوکت سے انجام پانے کے لئے کوششیں کیں۔ جو کچھ میں نے رؤساء شاہجہان پور کی کوششوں کی کیفیت اخباروں میں دیکھی ہے، اُس سے معلوم ہوتا

ہے کہ اسی شہر کے رئیس ہیں، جنہوں نے کانفرنس کے لئے ہر طرح کی محنت اور کوشش کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، یہی حضرات ہیں جنہوں نے قوم کے لئے سفر کیا، محنت اٹھائی، تکلیف اٹھائی، لوگوں کو سمجھایا، کانفرنس کے فوائد بتلائے، اور اپنے بھائیوں کے آرام و آسائش کے لئے ہر طرح کا انتظام کیا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج میں اس عالی شان اور امیرانہ آل میں ایسا معزز اور پر عصب مجمع دیکھتا ہوں، جن کے چہروں سے قومی حریت کا جوش نظر آ رہا ہے۔ **فَلِلّٰهِ دُشْهُنُمْ وَحَسْبِيَ اللّٰهُ اٰخِرُھُمْ** +

مے حضرات! اس کانفرنس کا یہ دسواں اجلاس ہے۔ پہلے اجلاس مختلف مقامات میں ملک پنجاب و شمال مغربی اٹلیع و او د میں ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ پہلی دفعہ ہے کہ قدیم اور مشہور ملک رومیلیکھتہ میں اس کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا ہو، اس لئے آپ مجھ کو اجازت دیجئے کہ چند الفاظ تمہیدی بیان کروں +

مے حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ اس کانفرنس کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کے بانیوں اور حامیوں کی کوششیں کس لئے ہیں؟ صاحبو اس کا مقصد قومی ترقی ہے، اور مسلمانوں کی فلاح اور بہبودی۔ اور چونکہ زمانہ نے بنا دیا ہے کہ یہ مقصد صرف اعلیٰ تعلیم اور عمدہ تربیت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اعلیٰ تعلیم اور عمدہ تربیت کے ہول و قواعد کا بغیر قوم کی صلاح و مشورے کے قرار دینا اگر ناممکن نہیں تاہم غیر موثر اور غیر مفید ہے۔ اس لئے ہمارے معزز سید نے جس کی عمر مسلمانوں کی ترقی کی فکر اور تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے میں صرف ہو گئی ہے۔ اس مجلس کو قائم کیا۔ اور سندھو کے تمام مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے، اور اپنی اپنی راہوں کے ظاہر کرنے کا موقع دیا۔ تاکہ باتفاق قوم مسلمانوں کی ترقی و تعلیم کے ہول و فروع طے ہوں۔ اور کسی ایک شخص کی رائے پر عمل کرنے سے جو غلطیاں ہوتی ہیں۔ وہ نہ ہونے پائیں۔ یہ دسواں سال ہے کہ لوگ جمع ہوتے ہیں اور اپنی اپنی رائیں ظاہر کرتے ہیں۔ اور جو کچھ باتفاق آرا قرار پاتا ہے، وہ رزولیوشن کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کو دوسرے نقطوں میں مثلاً اس طور پر سمجھنا چاہئے، کہ کانفرنس ایک مجمع ہے، قومی ہیاریوں کی تشکیص، اور اس کے لئے دو تجویز کرنے والوں کا، اور رزولیوشن نسخہ ہے، جو باتفاق اطیانکھا جاتا ہے۔ مگر حضرات افسوس ہے کہ اس نیک کام پر کبھی بیدردی سے ہم پر طاعت کی جاتی ہے، کبھی ہماری کانفرنس کی ہسی اڑائی جاتی ہے، کوئی ہمیں بواہوس کہتا ہے کوئی ہماری کادروائیوں کو فضول اور لغو بتلاتا ہے۔ ہماری آہیں ہمیں بیودہ بکواس سمجھی جاتی ہیں۔ اور ہمارے کچھوں کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ اور عملی نتائج نہ ظاہر ہونے کا تو عموماً ہم پر اعتراض کیا جاتا ہے +

صاحبو! ہم خود جانتے ہیں، اور اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اب تک ہمارے کاموں کا کوئی نمایاں عملی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ اور ہماری کوششیں تقریر و تحریر کی حد سے یا نہیں نکلیں۔ مگر صاحبو! اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ ہم سنا دی کرنے، اور جوشن لانے، اور سمجھانے، اور تدریس بتانے کے سوائے قوم سے کام لینے کا کیا ذریعہ رکھتے ہیں۔ ہم فرمانروا نہیں کہ قوم کو تعمیل پر مجبور کریں۔ دولت ہمارے ہاتھ میں نہیں کہ اپنے خرچ سے درسگاہیں بنادیں، ہم مقلب القلوب نہیں کہ قوم کے دل بھیر دیں۔ ہم کو ایسا منترباد نہیں کہ ایک چٹھری ہلانے سے طلسم کا نیا کارخانہ کھڑا کر دیں۔ ہم خود دیکھتے ہیں کہ ہمارے ننحوں کے لکھنے سے قوم کی بیماری دُور نہیں ہوئی، اور جس مرض میں وہ گرفتار تھی اُس میں اب تک وہ مبتلا ہے۔ ہم نے قوم کو اُن کے بزرگوں کی شان و شوکت یاد دلائی اُن کی شان میں قصیدے پڑھے۔ اُن کی موجودہ حالت پر مرثیے سُنائے۔ کبھی دل خوش کن قصے سُنا کر اُنہیں جوشن دلایا۔ اور کبھی پُر درد داستانیں سُنا کر اُن کو رد لایا۔ غرض کہ جس طرح سے ہم سے بن پڑا، ہم نے اُن میں تحریک پیدا کرنی چاہی۔ مگر افسوس کہ عملی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ اور کانفرنس کے حلقے سے باہر نکل کر کسی نے اُس کا خیال نہ رکھا، ہم کو اس پر بالواسطہ بھی ہوئی۔ مگر کیا کیجئے، اس پر بھی اپنے کام سے باز نہیں آتے، اور باوجود بالواسطہ کے طبقوں کے بلانے، اور ننحوں کے لکھنے کا خیال نہیں چھوڑتے۔ محبت کی ایک آگ سینہ میں بھڑک رہی ہے کہ وہ کسی طرح نہیں بجھتی۔ اور قومی محبت کا درد دل میں سما گیا ہے کہ وہ کسی طرح نہیں جاتا، لاماتیں سنتے ہیں، طعنے سنتے ہیں، ناامیدیاں دیکھتے ہیں، مگر جو سودا سر میں سما گیا ہے وہ نہیں جاتا۔

چوں محبت شعلہ در غمِ من نہ شوقِ خاکستر شدن دامن نہ
پاک سوز و بھوس صبر و قرار سخت تراز موت باشد انتظار
فال بے تابی جو بسمل می نند دست درد امان قاتل می نند

لیکن یہ خیال کسی قدر تسلی بخش ہے کہ اگر ہماری دل خواہش آوازوں سے چند مسلمانوں نے بھی غار دیکھ لئے، جس میں وہ گرنے جاتے ہیں، تو ہماری محنت و وصل ہوئی۔ اور اپنی خدمتوں اور کوششوں کا ہم نے صلہ پایا، اور اس کہنے میں شاید مبالغہ نہ ہوگا، کہ گو کانفرنس کی کوششیں کیسی ہی ضعیف اور خفیف ہوں۔ مگر قوم کے دلوں میں کچھ تحریک ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ اسی کو ہم اس مجلس کی کوششوں کا نتیجہ، اور قومی زندگی کے نوک پہلا درجہ سمجھتے ہیں۔

حضرات! کانفرنس کے عملی نتائج ظاہر نہ ہونے پر اعتراض کرنے والوں کے علاوہ، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سرے سے کانفرنس کے قائم ہونے، اور مغربی تعلیم ہی کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہماری ساری تدریس مسلمانوں کے لئے نہ صرف غیر مفید ہیں بلکہ ضرر رساں ہیں

وہ کہتے ہیں ہم مسلمانوں کو صرف انگریزی پڑھانا چاہتے ہیں، تاکہ وہ سرکاری ملازمت کی قابل ہو جائیں گو وہ دین سے واقف ہوں یا بے خبر رہیں، اُن کے دین و مذہب قائم رکھنے کی ہمیں کچھ پڑا نہیں! ان اعتراض کرنے والوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں، کہ انگریزی تعلیم ہی کو مذہب کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس لئے کانفرنس کے استحکام اور عیسائیت کی شاعت اور اس مجلس کے مقاصد کی کامیابی کے لئے اس بات کی نہایت ضرورت ہے، کہ یہ غلط فہمیاں دور کی جائیں۔ اور تعلیم جیسی ہم جانتے ہیں اُس کی حقیقت ظاہر کر دی جائے، اور یہ بات بخوبی بتا دی جائے کہ ہم اندھوں کی طرح سے انگریزوں کی تقلید نہیں کرتے، بلکہ فی الحقیقت اپنے بزرگوں کے طریقے پر چلتے ہیں، اور اُن کے خیالات زندہ کرتے ہیں، تاکہ اُس معزز گروہ کو جو اپنے علم و تہذیب کی وجہ سے قوم کا پیشوا اور رہنما ہے معلوم ہو جائے، کہ ہمارے اور اُن کے مقاصد ایک ہیں۔ اور ہمارا اُن کا اختلاف صرف چند غلط فہمیاں پر مبنی ہے۔

صاحبو! ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم انگریزوں کی کورانہ تقلید کریں۔ اور اپنے بچوں کو صرف تعلیم دلائیں جو فقط دنیا کے لئے مفید ہو۔ اور جس سے وہ صرف گونٹ کی ملازمت کے لائق ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا مقصد اس سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔ ہم اس قسم کی تعلیم کو ہرگز تعلیم ہی نہیں کہتے ہمارے نزدیک تعلیم کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اُس سے صرف چند پیشوں کے کام کرنے کی لیاقت حاصل ہو، بلکہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ تمام قومیں جو خدا نے انسان میں رکھی ہیں وہ نپوایدیں۔ اور نہ صرف اُنہیں قوتوں کو نوادیاں جائے، جو ہماری جسمانی آسائش کے کام آئیں، بلکہ روحانی قوتوں کا کام میں لانا، اور دماغ کو غذا پہنچانا، تعلیم کا اصلی مقصد ہے۔ بلاشبہ اُس قسم کی تعلیم جس سے ہم معاش پیدا کرنے کے لائق ہوں ضروری ہے۔ اور ہماری دنیاوی لذت دور ہونے کے لئے اُس کا سیکھنا بھی لازم ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہم تعلیم بھی چاہتے ہیں کہ جس سے اُن کے دل و دماغ روشن ہوں اور علم کو علم کے لئے حاصل کریں۔ اور علاوہ جسمانی آسائش کے، جو فنا ہونے والی ہے، اُن چیزوں کو حاصل کریں، جو اُن کی روحانی راحت کے لئے، جو کہ ہمیشہ باقی رہنوالی ہے، کام آوے، اُن میں سچی سہمدی اور کمال انسانیت پیدا ہو، اُن کی زندگی کا مقصد زیادہ اعلیٰ، اور زیادہ پاک ہو، اور جس طرح ہمارے بزرگوں نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا، اور ہمارے لئے وہ اپنے دل و دماغ کا ترک چھوڑ گئے، اسی طرح ہم بھی علم کو علم کے لئے حاصل کریں، اور اپنے بزرگوں کے ترکہ میں کچھ بڑھا کر عقیدہ آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ جائیں، اس کے لئے ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے دینی علوم بھی سیکھیں، اور عقلی علوم کی بھی تحصیل کریں۔ اور وہ لوگ بڑی غلطی پر ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ عقلی علوم جس کا بڑا سرمایہ اُس وقت انگریزی زبان میں شریعت کے خلاف ہیں، ہمارے

بزرگوں نے ایسے علوم کو شریعت کے مخالف سمجھنے کے بجائے عین شریعت بتایا ہے۔ اور اُس کے
 سیکھنے کو نہ صرف مباح اور جائز، بلکہ واجب اور فرض قرار دیا ہے۔ اور غیر قوموں سے علوم سیکھنے میں
 ننگ و عار کرنے کے بدلے اُس کے حاصل کرنے میں جان و مال کو قربان کیا ہے۔ کیا خوب کہا ہے
 ہمارے یہاں کے ایک بڑے عالم نے کس شیع نے موجودات و مخلوقات کی معرفت اور اُس کا علم ہم
 پر واجب کر دیا ہے۔ اور بہت سی آیتوں میں ہم پر اُس کی تاکید فرمائی ہے۔ آیہ اَوَّلَ الَّذِي نُظِرْ فِيْ
 مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نَحْنُ صٰرِحٌ ہے، اس پر کہ ہم موجودات کی حقیقت دریافت کریں، او
 اُس کے، ملکوتِ سموات و ارض، پر غور کریں۔ یعنی جو کچھ کائناتِ عالم میں خدا نے پیدا کیا ہے اُس کا
 علم حاصل کریں۔ اور چونکہ یہ کام ایک انسان، یا ایک گروہ، یا ایک زمانہ کے آدمیوں کا نہیں ہے۔
 اس لئے ہم پر شہ عا و واجب ہے کہ ہم اُن متقدمین کی تحقیقاتوں سے مستفید ہوں جو ہم سے اول گذرے
 ہوں، اور اُن کتابوں کو دیکھیں جو اس میں تالیف ہوئی ہوں۔ اگرچہ وہ ہمارے مذہب و ملت پر بھی
 نہ ہوں۔ چنانچہ اس عالم کے الفاظ یہ ہیں، فَقَدْ تَبَيَّنَ مِنْ هٰذَا اَنَّ النَّظَرَ فِيْ كِتَابِ الْقُدْسِ
 وَاجِبٌ بِالْشَّرْعِ وَاَنَّ مَنْ تَعَيَّنَ النَّظَرَ فِيْهَا فَقَدْ سَدَّ النَّاسَ عَنِ الْبَابِ الَّذِي دَعَا الشَّرْعُ
 مِنْهُ النَّاسَ اِلَى مَعْرِفَةِ اللّٰهِ وَهُوَ بَابُ النَّظَرِ مُؤَيَّدٌ اِلَى مَعْرِفَتِهِ حَقُّ الْمَعْرِفَةِ وَذٰلِكَ
 خَاتِمَةُ الْبُعْدِ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰی ۔

اور جبکہ ہم مسلمانوں کا یہ دعوئے ہے کہ ہمارا دین الکل الادیان ہے، اور ہمارا رسول مبعوث ہوا ہے
 اِلَى الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ تو ضرور ہے کہ وہ مذہب کسی خاص گروہ، یا کسی خاص مکتب یا کسی خاص ملک
 کی حالت ہی کے مناسب ہو۔ بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کے طبائع اور حالات کے موافق، اور ہر زمانہ
 کے مناسب ہو۔ اور جو مکمل ظاہر ہے کہ زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے، نئے نئے علوم ایجاد ہوتے جاتے ہیں،
 نئی نئی تحقیقاتیں ہو رہی ہیں، دماغی قوتوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی، اور ہوگی، تو ضرور ہے کہ
 اسلام ہر ترقی یافتہ حالت کے موافق، اور ہر علم، اور ہر تحقیق کے مطابق ہو۔ اس لئے وہی مسلمان
 پیچھے اسلام کے دوست ہیں، اور اسلام کے حامی، جو اپنے دعوئے کو اپنے عمل سے ثابت کریں۔
 اور دنیا کی کسی زبان اور کسی علم کے سیکھنے سے پرہیز کریں، بلکہ اُن کے سیکھنے کو اپنا فرض، اور
 اپنے مذہب کی سچائی ثابت کرنے کے لئے ضروری سمجھیں، کیا اسلام صرف عوام اور جاہلوں کے
 لئے ہے؟ اور کیا وہ کسی خاص زبان یا کسی ایک قوم کے لئے محدود ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ وہ
 ہے كَافَّةً لِّلنَّاسِ، جیسا عوام اور جاہلوں کے لئے، ویسا ہی عالم اور فلسفیوں کے واسطے پس
 اگر ہم انگریزی سے ڈریں، اور مغربی علوم سیکھنے سے پرہیز کریں۔ تو حقیقت میں ہم اپنے مذہب کو جاہلوں
 اور عوام کا مذہب سمجھیں گے ۔

کیا وہ پاک رسول جس نے فرمایا کہ میں علم کا شہر ہوں، اور کیا وہ خدا کا بیگز جو علم و حکمت کی تعلیم اور اخلاق کی تکمیل کے لئے دنیا میں آیا، وہ صرف عوام اور جاہلوں کے لئے آیا تھا؟ اور کیا اُسکی دعوت صرف عرب کے وحشیوں اور حجاز کے شتر بانوں کے لئے محدود تھی؟ کیا وہ اس لئے آیا تھا کہ ایک گروہ جاہلوں اور بے علموں کا قایم کرے، اور علم و حکمت کی روشنی دنیا میں نہ پھیلنے دے؟ اور اپنے گروہ میں کسی کو عالم، حکیم، اور فلسفی کا خطاب نہ پانے دے؟ اگر کسی کو ایسا خیال ہو، تو یقین پکار کر کہتا ہوں، اور خدا کو اس پر شاہد کرتا ہوں۔ کہ اسلام اس سے بری ہے، بیشمار اس سے نیرار، خدا اس کی تکذیب کرتا ہے، لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَزَيَّجَهُمْ وَبَيَّنَّ لَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنَّ كَانُوا مِن قَبْلُ لَكٰفٍ جٰہِلِيْنَ مُّبِيْنٍ ۝

صاحبو! اسلام نے جاہل کو تقویت نہیں دی، بلکہ علم کو، اسلام نے حماقت کی تعریف نہیں کی، بلکہ عقل کی، اسلام نے جاہلوں کا گروہ تیار نہیں کیا، بلکہ عالموں اور فاضلوں اور حکیموں اور فلسفیوں کا، جنہوں نے خدا کی زمین کو حکمت و فلسفہ کی روشنی سے روشن کر دیا، اور جاہل کی تاریکی دنیا سے مٹا دی ۝

صاحبو! ہم اُس قوم کے آدمی ہیں جنہوں نے یونان کے علوم تندرہ کئے۔ اور ہم اُس سلف کے خلف ہیں جنہوں نے علم و حکمت کا یورپ کو سبق دیا، ہمارے ہی آیا و اجداد تھے، جو صدیوں تک فرنگستان کی استادی کرتے رہے، اور ہماری ہی وہ کتابیں تھیں جو عیسائی درگاہوں میں پانچ سو برس تک جاری رہیں، حکمت و فلسفہ سے روشنی پھیلانے کی عزت جو ہمارے بزرگوں نے پائی وہ صرف غیر قوم و غیر مذہب والوں کی زبان اور علوم سیکھنے سے، اگر وہ غیر قوم و غیر مذہب کی زبان اور علم سیکھنے کو برا سمجھتے، اور خود یونانیوں کی شاگردی اختیار نہ کرتے، تو یورپ کی استادی کا درجہ کیونکر انہیں نصیب ہوتا۔ یونان خدا کا گھر نہ تھا، جس کو علم نے بیت الحکمت جانا، ارسطو و قلاطون وغیرہ تھے جن کو ہم نے فلسفہ اور حکمت کا استاد مانا، مجسطی اور اقلیدس آسمان سے نازل نہ ہوئی تھیں، جن کو ہم نے دل کا تعویذ بنایا، وہ کن کے علوم تھے؟ اور کن سے ہم نے سیکھے تھے؟ جن کے جاننے او سیکھنے سے ہمارے بزرگ حکیم اور فلسفی ہوئے، اور انام اور علامہ ٹھہرے، آخر یہ سب علوم غیروں ہی سے ہم نے سیکھے تھے، اور یونان اور فارس سے ہی ہم کو پہنچے تھے، اب کہ اُن علوم نے یونانی جامہ اتار کر انگریزی لباس پہنا ہے، تو صرف لباس کی تبدیلی سے اُن میں خلل آیا؟ اور صرف زبان کے بدلنے سے اُن علوم کا سیکھنا کیوں حرام ہوا؟

اے میرے دوستو اور عزیزو! مجھے نہایت حیرت ہوتی ہے اور نہی آتی ہے جب کہ یہ

کہا جاتا ہے کہ مغربی علوم کی تعلیم عیسائیوں اور انگریزوں کی تقلید ہے، اور اسلام کے خلاف، اس لئے کہ دو تین صدیوں کے پہلے ہم علوم کے حامی اور مربی تھے، اور عیسائی اُس کے مخالف۔ تحقیق اور آزادی ہمارا حصہ تھا، اور تقلید اور ادا نام پرستی اُن کا ترکہ، یہ صرف اُن کا انقلاب ہے کہ ہمارے بزرگوں کا حصہ اُنہوں نے پایا، اور اُن کے اسلاف کا ترکہ ہم نے لیا،

پسیران وزیر ناقص عقل بگدا ئی برو ستارفتند
روستازادگان دشمنند بوزیر بے بادشہ رفتند

جن چیزوں پر آج یورپ کو ناز ہے، تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے بانی اور جاری کرنے والے ہم تھے۔ اور جن باتوں سے ہم جاہل اور ذلیل ہو رہے ہیں یہ عیسائیوں سے مخصوص تھیں۔ اگر ہم اپنے دانشمند بزرگوں کا طریقہ نہ چھوڑتے، تو آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی، افسوس تو یہی ہے کہ ہم اپنی اور یورپ کی تاریخی حالت سے بالکل بے خبر ہیں۔ اور اصول چھوڑ کر رسوم کے پابند ہو گئے ہیں، تحقیق کا اصول جس پر اسلام کا مدار ہے، وہ ہم نے چھوڑ دیا، خیال کی آزادی جو اسلام کا پہلا سبق تھا، وہ ہم سے جاتا رہا، علم و حکمت جو ہمارا گم شدہ مال سمجھا جاتا تھا، اُسے ہم چھوڑ بیٹھے۔ تعصب جس کے دد کر کے لئے اسلام دنیا میں آیا وہ ہمارے دلوں کا نقش ہو رہا ہے۔ چھوٹ اور پرہیز جس کا نام ہم نہ جانتے تھے، وہ ہندوؤں سے بڑھ کر ہم میں داخل ہے، کیا وہ مسلمان ہمارے ہی سے تعصبات رکھتے تھے جنہوں نے رگستان عرب سے نکل کر کسے اور قیصر کے ایوان کو ہلادیا؟ اور کیا ہماری طرح کا چھوٹ اور پرہیز اُن مجاہدین کا شعار تھا جو حجاز کی پہاڑیوں سے نکل کر آندلس اور روم تک پہنچ گئے تھے؟ کیا اسلام کے منادی کرنے والوں کو علم و حکمت کے نام سے لرزہ آتا تھا؟ کیا ہمارے آبا و اجداد اُتھ پائوں نہ ہلانے کو توکل سمجھتے، اور من و سلویٰ کے طالب رہتے تھے؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں! سچ تو یہ ہے کہ صرف غفلت اور کاہلی نے ہمارا یہ حال کر دیا ہے، کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم اُسی قوم کے آدمی ہیں، جن کی عزت و اقبال کے پیرے ایشیا اور یورپ کے میدانوں اور پہاڑوں پر اڑتے تھے، اور جن کے نام سے سلاطین روئے زمین کے کیچھے دکل جاتے تھے، سچ تو یہ ہے کہ نہ اب ہم کو اُن سے صورت میں مشابہت ہے، نہ سیرت میں مناسبت، کہاں ہے وہ چہروں کی سُرخ و سفیدی؟ کہاں ہے وہ بدنوں کی تنومندی اور پُھرتی؟ کہاں ہے وہ طبیعتوں کی آزادی؟ کہاں ہے وہ اسلام کا پوشش؟ کہاں ہے وہ قدیسی بے؟ کہاں ہے وہ ناشی شوکت؟ کہاں ہے وہ محمدی خلق؟ کہاں ہے وہ اسلامی درد؟ کہاں ہے وہ علوم کی محبت؟ کہاں ہے وہ تعلیم کا چرچا؟ ایک چیز بھی تو ان میں سے ہم میں سے باقی نہ رہی! ہماری حالتوں میں تغیر آگیا، اور ہماری تمام چیزیں بدل گئیں، وہ خون جو ابلاہیم کی رگوں کا ہم

میں تھا بدل گیا، وہ ہڈی جو اسماعیل کے خون سے بنی تھی بدل گئی، غرینہ چڑا بدل گیا، رنگ بدل گیا، صورت بدل گئی، سیرت بدل گئی، یہاں تک کہ سچ پوچھو تو اصلی مذہب بھی بدل گیا، تمام وہ جوش جو اٹھے تھے اُس ریتیلے جنگل سے جس نے فارس اور تمام سٹرال ایشیا کو سرسبز و شاداب کر دیا تھا، ہندوستان میں اگر گنگا اور جہتا میں ڈوب گئے ۛ

صاحبو! ایسی حالت میں جو اس وقت مسلمانوں کی ہے مغربی تعلیم سے باز رکھنا، اور زمانہ کی ضرورت اور حالت کے موافق ترقی کرنے سے روکنا، درحقیقت قوم کے ساتھ محبت نہیں ہے! بلکہ شخص کا جسے خدا نے سمجھ دی ہو یہ فرض ہے کہ وہ قوم کو اس بات کا یقین لانے میں کوشش کرے، کہ تمدنی اور ملکی ترقی کی توقع صرف مغربی خیالات اور مغربی علوم سے ہو سکتی ہے، اور انہیں خیالات کے پیدا کرنے، اور انہیں علوم کے سیکھنے سے بھر وہ اپنی گئی ہوئی عزت حاصل کر سکتے ہیں، اور اپنی ہمت اور الوا العزمی کو زمانہ کے مناسب، مفید کاموں میں ظاہر کرنے سے وہ ترقی کے میدان میں تجلیاب ہو سکتے ہیں، اور مغربی علوم کے ساتھ اپنے مذہبی علوم کی اشاعت، اور عربی تعلیم کی ترقی دینے سے وہی درجہ حاصل کر سکتے ہیں جو ان کے بزرگوں کو حاصل تھا ۛ

بنی نوع انسان میں صرف یورپ ہی نہیں ہے کہ تمام عمدہ صفتیں انہیں کیاں اور علوم و فنون انہیں بہتر ہوں، اور وطن کی محبت، قومی ہمدردی، اور اپنی عزت، اور شہرت، اور ثواب کا خیال انہیں کو ہو، ہمارے بزرگ بھی یہ چیزیں رکھتے تھے، اور اس گئی گذری حالت میں اب تک ہم بھی کچھ کچھ رکھتے ہیں، مذہب رکھتے ہیں، سب سے پاک اور سچا! ہدایت نامہ رکھتے ہیں، دین و دنیا میں اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کے درجہ پر پہنچانے والا! دل رکھتے ہیں! اسلامی جوش سے بھرا ہوا۔ ادا رکھتے ہیں ہر قسم کی قابلیت حاصل کرنے والی! طبیعتوں میں فیاضی۔ اور دماغوں میں الوا العزمی بھی کچھ کچھ باقی ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہماری کاففرنس کی تجویزوں پر عمل ہو تو کیا وجہ ہے کہ پھر ہم ترقی نہ کریں۔ اور کیا سبب ہے کہ ہماری ان کوششوں کا جلد یا دیر میں کوئی نتیجہ حاصل نہ ہو، مگر یہ ضرور ہے کہ کوشش سچے دل سے ہو، اور برابر جاری رہے۔ اور کسی قسم کی مخالفت، اور کسی طرح کی دشواری سے ہمت پست نہ ہونے پائے ۛ

اے حضرات! ہم جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری کوششوں میں کامیابی نہیں ہوتی، غلط ہے، بلکہ اصل یہ ہے کہ درحقیقت ہم کچھ کوشش ہی نہیں کرتے، جس کو ہم کوشش سمجھتے ہیں وہ فی الحقیقت بواہوسی ہے، اول تو کاہلی ہم کو کام ہی نہیں کرنے دیتی۔ اور اگر کرتے ہیں تو اس پر ثبات قدم نہیں رہتے، اگر کاہلی اور بواہوسی ہم سے جاتی رہے تو ہمارے کاموں کے نتیجے ضرور ظاہر ہوں، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جن کے دلوں میں کبھی کبھی اچھے کاموں کا جوش اٹھتا ہے

اور لوگوں کو بڑے بڑے کام کرتے دیکھ کر وہ بھی کچھ کرنا چاہتے ہیں، مگر کام کرنے سے پہلے اُس کی کامیابی کے متوقع ہوتے ہیں۔ اگر لوگوں نے اُن کی تعریف کی، اُن کے کام کو اچھا کہا، تو اُن کا شوق بڑھتا ہے۔ لیکن اگر اعتراضات کی پوچھا رہے ہوں گے، اور رسم و رواج کی مخالفت سے اُن پر طعنہ کئے جانے لگے، یا کسی اور قسم کی مشکلات پیش آئیں اور مزاحمتیں ہونے لگیں، تو اُن کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے، اُن کا دل سرد ہو جاتا ہے، ایسے لوگوں کو اپنے نفس پر اتنا بھی اعتماد نہیں ہوتا، کہ وہ کسی قسم کی مخالفت اور دشواری کی برداشت کریں۔ اور جس کام کو شروع کیا ہے اُس پر ثابت قدم رہیں۔

پھر بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ اپنے ارادوں میں ثابت قدم اور اپنی کوششوں میں مستقل نہیں رہتے اور یہی بیماری ہے، جو ہم مسلمانوں میں دبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے، اور جس کا نام کاہلی ہے، یہ کجست کاہلی ہم کو وہ کام بھی نہیں کرنے دیتی، جو ہم کر سکتے ہیں، کسی دانائے نوب کہا ہے کہ ”مہر متحرک کل جھپتی رہتی ہے جس پر قوت متحرک کام نہیں کرتی اس ساکن نقطہ پر سے گزر جانا نہایت مشکل ہوتا ہے۔“ یہی حال ہماری طبیعتوں کا ہے کہ ہمارے سب عضو اور کل تحریک دینے والے اسباب بیکار ہو جاتے ہیں، اور ہم کام کرنا شروع نہیں کرتے، یا کرتے ہیں تو اُس پر ثابت قدم نہیں رہتے۔ اگر ہم اس ایک نقطہ سکون سے گزر جائیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں، اور اس کاہلی پر بوالہوسی اور خیال کی بلند پروازی مزاجوں میں اس قدر ہے کہ جو کام ہم کر سکتے ہیں اُسے تو کرتے نہیں، بلکہ ہمیشہ کسی بڑی چیز کا خیال قائم کرتے، اور اپنے ذہن میں بڑا بلند نمونہ ٹھہرا لیتے ہیں، ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کو انتہائی خیال بنا رکھا ہے، اور زمین پر دو قدم چلنے کا ارادہ تک نہیں کرتے، حالانکہ اگر ہم اپنے آپ کو بکا رام بنانا چاہتے ہیں، تو سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ ہم سے ہو سکے اُسے کریں۔ بڑے کاموں کے انتظام میں بیٹھے نہ رہیں۔ اور بڑے کاموں کی ہوس میں چھوٹے کام کرنے سے بھی باز نہ رہیں، اس لئے کہ ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ بڑے بڑے کام کریں، بلکہ جو کچھ ہم سے بن پڑے اُسے کرنا چاہئے، تاکہ ہمارا جوش بیکار نہ جائے۔

اے صاحبو! ہماری زندگی میں کیسا کچھ انقلاب ہو جائے اگر اس بات کا مصمم ارادہ کر لیں کہ جو ہم سے بن پڑے اُسے ہر روز کریں چھوٹے چھوٹے کام ملکر بڑا کام ہو جاتا ہے، اور کچھ کچھ کرنے سے بشرطیکہ استقلال کے ساتھ اور ہمیشہ ضبط کے ساتھ ہوتا رہے، ہم بڑے کام کر سکتے ہیں۔ دیکھو جب ہم چلتے ہیں یا کسی پہاڑ پر چڑھنا چاہتے ہیں اور ایک قدم اٹھاتے ہیں دوسرا آپ سے آپ اٹھ جاتا ہے، اور آہستہ آہستہ چلنے سے ہم ایک روز اپنی جائے مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔

ہماری اس کافورنس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس نے کچھ عملی کام نہیں کیا، اور ہم بھی اُسے تسلیم کرتے ہیں، مگر اس کا سبب یہی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک مسرتینا چاہتا ہے، اور اُس کی

کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جو انہوں نے کیا۔ مگر چھوٹے چھوٹے کام جو معمولی پڑھا لکھا بھی کر سکتا ہے اُس کے کرنے پر توجہ نہیں کرتے، مثلاً اسی کانفرنس میں مسٹر میک صاحب کی تجویز پر یہ امر قرار پایا تھا، کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم کا حال، اور جو مسلمان لڑکے اسکول اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں اور جو نہیں پاتے اُن کی تعداد دریافت کی جائے، اسے لوگوں نے صرف پسند ہی نہیں کیا، بلکہ اُس کی نسبت کہا گیا کہ یہ وہ تجویز ہے جس نے مردہ کانفرنس کو زندہ کر دیا۔ اس کام کے لئے کمیٹیاں مقرر ہوئیں کار سپانڈنٹ تجویز کے لئے نقشوں کے نمونے بنائے گئے، بہت سے لوگوں نے اس کام کو اپنے ذمہ بھی لیا، مگر نتیجہ اُس کا بقول ہمارے معزز سیکرٹری کے ”بیچ نہ شد“ اور اس کا سبب یہی ہے، کہ بعض نے کاہلی سے، اور بعض نے اس خیال سے کہ یہ کام خفیف ہے، اُس کے کرنے کا ارادہ ہی نہ کیا۔ اور اس کاہلی اور بالعموم اسی کے ساتھ ایک اور بیماری ہم کو گھیرے ہوئے ہے، جس کا نام ہے ”خود غرضی“ کہ جس کام میں کوئی ذاتی منفعت نہ ہو، اور جس کام کے کرنے میں ہم کو شہرت اور عزت پیدا کرنے کی توقع نہ ہو۔ اُس کے کرنے کا خیال بھی ہمارے دل میں نہیں آتا، اور دوسروں کے لئے کام کرنے کی طرف حسبتہ اللہ، یا حسبۃ اللفقوم ہماری طبیعت ہی نہیں آتی، اور اسی وجہ سے ہم وہ کام بھی جس کو نہایت آسانی سے کر سکتے ہیں، اور جس کے کرنے میں ہمیں کچھ بھی تکلیف نہیں ہوتی، نہیں کرتے، ہماری زندگی ختم ہو جاتی ہے اور دوسروں کی طرف سے بیفکری اور خود غرضی کوئی قومی کام نہیں کرنے دیتے۔ در نہ بہت سے آدمی ہماری قوم میں ایسے موجود ہیں جن کو خدا نے سب طرح وسائل دئے ہیں اور ہر طرح کے موقعے اُن کو حاصل ہیں۔ کہ اگر وہ چاہیں تو ہر روز دوسروں کے لئے رحمت کا فرشتہ ہو سکتے ہیں۔ اور اس میں انہیں زیادہ رحمت نہیں ہو سکتی جتنی انسان کو مٹھی کھولنے میں ہوتی ہے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو ایک مستحکم قلعے میں بیفکری کے بند کر رکھا ہے، اور خود غرضی اور نفس پروری کا ایسا مضبوط پہرہ بیٹھا رکھا ہے کہ کوئی مدد کا طالب اُس کے اندر داخل نہ ہو سکے اور اُن سے مدد طلب کر سکے۔

پھر ان سب مصیبتوں سے بڑھ کر وقت کا ضائع کرنا، اور آج کے کام کو کل پر چھوڑنا ہے، حالانکہ انسان کی زبان میں کوئی لفظ گناہ، اور حماقت، اور عیاشی، اور برباد شدہ امیدوں، اور فرائض کے ترک کا ذمہ دار نہیں ہے، جیسا کہ یہ لفظ کل کا ہے۔ دن گزرتے چلے جاتے ہیں! عمر ختم ہو جاتی ہے! مگر ہماری کل کبھی ختم نہیں ہوتی۔

ہر شے گویم کہ فردا ترک ابیں سودا کنم
باز چوں فردا شود امر دوز را فدا کنم

پس اے میرے عزیزو اور دوستو! ہم جو اپنے کسی کام کا نتیجہ نہیں دیکھتے اُس کا سبب یہی ہے

کہ ہم کام کرتے ہیں، اور قانون قدرت کے خلاف ہم کو کامیابی نہیں ہوتی، بلکہ درحقیقت ہم کچھ کام ہی نہیں کرتے، اور نہ کچھ کوشش! بلکہ بغیر ہونے کے ہم بھل پانے کی ہوس رکھتے ہیں، اور نہ دیکھو کہ تمہاری ہی قوم میں ایسے آدمی بھی موجود ہیں جنہوں نے کوشش کی۔ اور کام کیا۔ اور اُس کے نتیجے دیکھے۔ تمہارے سامنے یہ بزرگ سید بٹھیا ہوا ہے جس نے اپنے نفس پر غمناک کیا۔ اور صدق دل سے کوشش کی۔ اُس نے اپنے کاموں کا نتیجہ پایا، اور ایک ایسی چیز کو جس کا ہونا سان و گمان میں نہ تھا، اور جو ہمارے قیاس اور گمان سے باہر تھا کر دکھایا۔ اُس نے ایک ایسا بیج بویا جس کی نسبت کسی کو توقع نہ تھی، کہ اُگے گا، مگر وہ اُگا، اور بڑھا، اور پھل لایا، جس کے پھل پھول اس وقت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور امید ہے کہ وہ روز بروز بڑھتا جائیگا اور اُس کے پھل پھول سارے ہندوستان میں جب تک مسلمان نام قائم ہے نظر آتے رہیں گے۔

یہ کافر نس بھی درحقیقت اُسی کی کوشش سے قائم ہوئی ہے، اور وہی اس کو چلا رہا ہے، اور اگر ہم زندہ ہیں تو انشاء اللہ غلے اُس کے بھی ایک دن عمدہ نتیجے دیکھینگے، اگر تم سے اور کوشش نہیں ہو سکتی تو اس کو ذرا سہارا دیتے رہو، اور اُس کی عمر کی درازی کی دعا کرتے رہو، اگر خدا تمہاری دعا قبول کرے۔ اور امید ہے کہ وہ قبول کرے گا اور چند سال اُس کا سایہ ہم پر قائم رہے تو یہ بڑھا سید تم کو دکھا دیگا کہ اُس کا یہ بیج بھی ضائع نہیں ہوا۔ اور وہ بھی بڑھا اور پھل پھول لایا۔

قدرِ سرِ سید شناسید لے خرد من ایں دم ذاتِ او شد در حقِ ما رحمت پروردگار
ناخنِ بدیر او عترتِ مشکِ کشاد شاہِ باز عتسل او ادا م را کردہ شکار
از طفیلِ دوستِ ایں جلوہ کہ می آید نظر لے خداوند انزال تاویرا و را زندہ دَا

نمبر ۲۰

۱۔ بی بی بیچ

یہ بی بی بیچ نواب صاحب بہادر نے ۲۷- دسمبر ۱۸۹۵ء کو کینٹینت میں مجلس ہو محمد بن کویشٹل کافر نس منعقدہ شاہجہان پور کے مولوی رضی الدین صاحب سب کی تنظیم و تفریب کی نسبت بطور ریا کس کے فرمائی :-

حضرات !

اگرچہ ہر موقع پر ہر ایک کی تقریر اور نظم پر ایسی پبلک انجمنوں میں داد دینے کا دستور نہیں ہے

لیکن بعض تقریریں اور نظمیں بے اختیار صدر انجمن کو محبوب رکرتی ہیں کہ قاعدہ عام کے برخلاف اُس پر چند الفاظ میں دیکھا کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت نے اپنا تخلص تو تسلیم رکھا ہے۔ مگر نظم ایسی پڑھی کہ دوسروں کو تسلیم کر دیا میں اگر صرف آپ کی نظم سننے کے لئے شاہ جہان پور آتا، تو میری ساری کوفت اور پورے اخراجات کا کفارہ تھا۔

نمبر ۲۱

۱۔ اسپچ

یہ اسپچ نواب صاحب بہادر نے ۲۸۔ دسمبر ۱۸۹۹ء کو بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے محمد علی ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ شاہ جہان پور کے بعد پڑھے جانے پر پورٹ تعلیمی مردم شماری کے اجلاس میں اسپچ پڑھ کر سنائی تھی (بطور ریمارکس کے) فرمائی :-

حضرات! جو رپورٹ مردم شماری کے مسٹر تھیوڈور بیک پرنسپل نے اس وقت پڑھی آپ سب صاحبان نے اُس کو سنا ہوگا۔ کل میں آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں کہ کانفرنس کے عملی نتائج کے ظاہر نہ ہونے کا اکثر لوگوں کو اعتراض ہے۔ لیکن کیا اس رپورٹ کے پیش ہونے کے بعد بھی آپ میں کوئی صاحب اُس اعتراض کو جائز خیال کر سکتی ہے۔ بیشک ہماری کانفرنس میں بعض تجاویز ایسی بھی پیش ہوئی تھیں۔ جن کا عملی نتیجہ اب تک ظاہر نہیں ہوا۔ لیکن فی الحقیقت بعض ایسی تجویزیں تھیں جن کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ مگر اُن کے ساتھ ہمارے کانفرنس کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک نے جو انگریز ہیں اور جن کی فطرت میں داخل ہے کہ جب تک کسی نتیجہ پر غور نہ کر لیا جاوے اپنی زبان سے کسی بات کو نہیں نکالتے ایسی تجویز پیش کی جس کے نتائج کی امید تھی۔ انہوں نے سب سے بہتر اور مفید طریقہ ہماری حالت دریافت کرنے کا یہ سمجھا کہ معلوم کریں کہ مسلمانوں کے خاندان کتنے ایسے ہیں۔ جو اپنی اولاد کو تعلیم دینے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اور اُن میں سے کتنے تعلیم پاتے ہیں اور کتنے نہیں پاتے، اور جو تعلیم نہیں پاتے، اُن کے تعلیم نہ پانے کی وجہ ہے، آیا وجہ بے استطاعتی کے تعلیم پانے سے محروم ہیں۔ یا غفلت و بے پروائی کی وجہ سے تعلیم کی طرف مائل نہیں ہیں۔ تیک صاحب کی کوششوں سے اکثر صاحبان نے بعض خاندانوں کے حالات تحقیق کر کے دریافت کئے۔ اُس کے سننے سے معلوم ہوگا کہ نہ صرف

افلاس مانع تعلیم ہے بلکہ غفلت، کاہلی، بے پروائی، پست بہتی اور خدا جانے کیا کیا۔ اگر ہم میں سے کوئی یہ کہے کہ ہماری انگریزی تعلیم کو مسلمان دنیوی تعلیم کو سمجھ کر یا خلافت مذہب جان کر تعلیم نہیں دینے تو کاش سچا اُس کے عربی و فارسی کی تعلیم ہوتی، عربی و فارسی کے مدرسے جاری ہوتے، مسجدوں اور خانقاہوں میں مسلمان بچے تعلیم پانے نظر آتے اور اگر دین کا سچا خیال مسلمانوں کے دل میں ہوتا۔ تو ہم کو خوشی ہوتی۔ اور ہم بھی سمجھتے کہ خیر دنیوی تعلیم نہ سہی دینی اور مذہبی تعلیم تو قائم ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ "ازیں سومانہ وزاں سوراندہ" نہ ہماری قوم میں مذہبی تعلیم جاری ہے، نہ دنیوی تعلیم کی طرف مائل ہیں افسوس کہ ہماری قوم فی زمانہ عالم دین سے بے بہرہ ہے اور انگریزی تعلیم کو حرام سمجھتی ہے، اور طرح طرح کے غدار اور حیلے پیش کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قوم کا جنازہ سامنے رکھا ہوا ہے اور غدارانہ کے لوگ نہی کر رہے ہیں۔ شرفا۔ امرا۔ علما۔ سب کی حالت عبرت انگیز ہے۔ ہزاروں گھر برباد ہو چکے ہیں۔ ہزاروں خاندان تباہ ہو چکے ہیں، اور افسوس ہے کہ اُن کے بچے بچو کوں مرتے ہیں۔ بعض ان میں سے سربراہ اور دہ بھی ہوئے اور نوکری کر کے روپیہ بھی پیدا کر لیا، تو اُن کے پیچھے خاندانی جوئیں اس قدر لگی ہوئی ہیں کہ وہ ایک انار و صدمہ بیاہ کا مصداق ہیں۔ میں خود نوکر رہ چکا ہوں اور بہت کچھ کا چکا ہوں لیکن باوجود اس کے کہ میری تنخواہ تین ہزار روپیہ تھی۔ جب کبھی میں حیدر آباد سے پنچوٹن ٹاؤن کو آتا تھا تو میں کھینچتا تھا کہ باہر مرد اور اندر رشتہ دار عورتیں ملنے کو آتی تھیں جن کو دیکھ کر افسوس آتا تھا اور روتا تھا کہ خدایا ان کی مصیبت دور کر یا ہمارا حال بھی انہیں کا سا کر دے۔ ہمارے قریبی رشتہ داروں میں بعض سیدائیاں ایسی تھیں کہ جن کے بدن پر ثابت کپڑا تک نہ تھا۔ باوجود اس کے تعلیم سے نفرت، علم سے بیگانگی، فقر و فاقہ میں مست اور اپنی تباہ حالت پر قانع ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ علم کا نام باقی نہیں رہا۔ اور اب تو ایسی افسوسناک حالت ہے کہ اگر اُن کو تعلیم کی فہمائش کی جاوے۔ تو ہزاروں غدر ہزاروں حیلے پیش کئے جاتے ہیں۔ ابھی بیک صاحب نے علم الامداد سے آپ کو بتلایا، کہ اسلام سے اب تک جب سے کہ کافر نس قائم ہوئی ہے مسلمانوں کی تعلیمی حالت میں کیا ترقی ہوئی ہے اور اب مسلمانوں کی تعلیم کی کیا صورت ہے؟

کسی نے ایک طریق سے پوچھا کہ تم کو خدا تعالیٰ سے کیا شکایت ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ مجھے ایک شکایت ہے وہ یہ کہ یا تو ہمیں چند صدی پیشتر پیدا کیا ہوتا یا چند صدی بعد۔ اگر چند صدی پہلے پیدا ہوتے، تو مسلمانوں کی سلطنت، حکومت کا تماشا دیکھتے، اور اگر بعد کو پیدا ہوتے، تو اونے درجہ کی ذاتوں میں شامل ہو جاتے۔ نہ کچھ اپنی قوم کی حالت کا خیال ہوتا، اور نہ اُن کی ذلت کا رونا ہوتا۔ اپنی آنکھوں سے اسلامی سلطنت جاتی دیکھی۔ اپنی آنکھ سے دیکھا کہ دہلی لکھنؤ میں، جو حکومت و ثروت موجود تھی وہ تباہ ہوئی۔ اب تک پرانی عمارات اور مقامات سے اسلامی سلطنت

کی ثروت شوکت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ تا جگجگ۔ قطب صاحب کو دیکھو۔ جہاں اب تک عزت ثروت کی نشانیاں موجود ہیں، جن کے روز بروز آثار ملتے جاتے ہیں۔ ذلت و رسوائی بڑھتی جاتی ہے۔ آج سنتے ہیں کہ شہنشاہ روم کی سرحد پر جہازوں کا بیڑا چلا گیا ہے۔ کل سنتے ہیں کہ طلال ملک میں سرداروں کی نا اتفاقی سے ابتری اور خرابی پھیل رہی ہے۔ غرض کہ جہاں جہاں مسلمان ہیں، جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادی یا علمداری ہے، سب جگہ باہمی عداوت اور تفرقہ اور خانہ جنگی ہے۔ مشکل سے آپ دیکھیں گے کہ کسی ایک بات پر دو مسلمان متفق ہوں لیکن اس نہ پڑھنے پر سب متفق ہیں۔ وہ چیزیں جو زمانہ حال کے لئے ضروری ہیں انہی پر اتفاق نہیں۔ روم شام جہاں جائے اسی کا رونا ہے۔ خدا نے آپ کو ایسی سلطنت کے سایہ میں پیدا کیا، جس سے زیادہ آپ کو اور کہیں امن نہیں ہے۔ آپ کابل میں جا کر پوچھئے کہ امیر کی حکومت کیسی ہے۔ ٹرکی میں جائے، اور سلطان کے ملک پر عبرت کی نظر ڈالئے، ایران کو دیکھئے اور تحقیق کیجئے کہ شاہ کی رعایا کو شاہ سے کیسی محبت ہے۔ غرض کہ کوئی حکومت، کوئی سلطنت، کوئی ملک، جہاں اقوام غیر کی علمداری ہو، یا خود ہماری قوم کی۔ اس اور انصاف اور آزادی میں انگریزی ملک اور انگریزی حکومت کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ باوجود اس کے ہماری قوم کی حالت ہے کہ ان کو ایسے مبارک اور بیخطر زمانہ میں، ایسی آزاد اور مہذب حکومت میں بھی تعلیم کی طرف کوئی ترغیب و تحریک نہیں ہوتی۔ بلکہ وہی غفلت اور کاہلی کا مرض دور کرنے کی فکر کی جاوے اور ان کے لئے یہ نتیجہ تویز کیا جاوے، تو اٹلے لڑنے کو موجود ہیں۔ بجز اس کے کہ خاندانی مسلمان اپنے ہاتھوں میں لمبے لمبے شجرے لئے ہوئے پھرتے ہیں۔ اور اپنے تئیں حسنی حسینی۔ فاروقی۔ اور صدیقی ظاہر کرتے ہیں اور کچھ نہیں۔ اگر ہی صورت ہے تو ترقی درکنار، ان کا باقی رہنا بھی نظر نہیں آتا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ مسلمان اکثر عالی خاندان ہیں، بلند نسب ہیں۔ ان کی رگوں میں عرب کا خون ہے، مگر افسردہ۔ ان کی طبیعتوں میں شرافت کا جوہر ہے، مگر رنگ آلودہ۔ اور جب تک غیرت و حمیت سے کام لیں، وہ خون جوش میں نہیں ل سکتا۔ نہ وہ جوہر چمک سکتا ہے۔ میرے ایک انگریز دوست نے مجھ سے ولایت میں کہا تھا کہ مسلمان قوم شیر ہے اور شیر مرا نہیں بلکہ سوتا ہے۔ جس وقت جگا یا جاوے گا اپنا کام کرے گا۔

میں اپنے دوست بیک صاحب کا نہایت شکر ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے درحقیقت نفس میں جان ڈال دی اور اس اختراع کو دور کر دیا کہ اب تک کافر نفس کوئی عملی نتیجہ نہیں دکھایا اور ہندسوں سے بتا کر آپ لوگوں کی آنکھیں کھول دیں کہ باوجود اس شور و شغب کے مسلمانوں نے کچھ ترقی نہیں کی۔ اب اے حضرات یا ترقی کی فکر کر دیا قوم پر مرنے سے پہلے فاتحہ پڑھ دو۔

نمبر ۲۲

اسپیج

یہ اسپیش نواب صاحب بہادر نے ۲۸۔ دسمبر ۱۸۹۵ء کو بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے
محمد انیسکویشنل کانفرنس اجلاس دہم مقام شاہجہان پور میں۔ مولوی نذیر احمد صاحب
کے لکچر کے اختتام پر فرمائی :-

حضرات !

جس طرح سر سید نے مولانا نذیر احمد کی نسبت فرمایا تھا کہ اُن کے لکچر کی تعریف کرنا بے دہی
ہے۔ اسی طرح آپ کے لکچر کی نسبت کچھ کہنا گستاخی ہے۔ مگر قطع نظر فصاحت و بلاغت کے
وہ نصیحتیں اور مفید اور کارآمد باتیں جو انہوں نے آئندہ قوم کی بہبودی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لئے
اس لکچر میں بیان فرمائی ہیں اس قابل ہیں کہ اُن پر عمل کیا جاوے۔ اُن کا یہی ایک گیت ہے اور
یہی ایک سودا اور خیال ہے جو ہمیشہ سے اُن کے دل میں ہے اور تادم واپس اُن کے دل میں
رہیگا۔ اس لکچر کو یہ نہ سمجھو کہ معمولی نظم تھی جو تھوڑی دیر دل خوش کرنے کے لئے سنائی گئی۔ بلکہ
اس کو حرز جان بناؤ۔ یہ اس قابل نہیں کہ اس کو روٹی کاغذ سمجھ کر پھینک دیا جاوے، بلکہ اس کو
دل پر نقش کرو۔ اگر خدا کی مہربانی ہے اور اُس کو کچھ کرنا ہے تو میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے جانے
کے بعد آپ اس کو دیکھتے رہیں گے اور اُس پر عمل کریں گے اور امید ہے کہ خدا ہماری اس دعا کو قبول کریگا ۛ

نمبر ۲۳

اسپیج

یہ اسپیش نواب صاحب بہادر نے ۲۸۔ دسمبر ۱۸۹۵ء کو بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کانفرنس کے رزلوشن نمبر ۴
(جسکی نقل ذیل میں درج ہے) تائید کرتے ہوئے فرمائی۔ مضمون رزلوشن حبیئل ہے :-

رزلوشن نمبر ۴

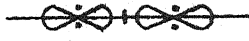
اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ بنظر اس امر کے کہ انگریزی تعلیم کی کتنی ہی اشاعت ہو جائے

تاہم سب بڑا حصہ مسلمانوں کا اس زبان سے لازمی طور پر آگاہ رہیگا اس لئے ہر ایک انگریزی
مسلمان کا جو کافی قابلیت رکھتا ہو یہ فرض اخلاقی و قوی ہے کہ کم سے کم ایک کتاب اپنے
مناق کے موافق انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرے یا ایسی کتاب تالیف کرے
کہ جس میں وہ مفید علمی مضامین ہوں جو انگریزی کتابوں سے مانوڈ کئے گئے ہوں اور
مسلمانوں میں یوہین علوم کی آگاہی پھیلانے کے لئے مفید ہوں *

حضرات !

یہ رزلویشن جو اس وقت سید محمود نے پیش کیا اور جس کی بابت عہدگی سے تائید
کی گئی، اُس کا فٹا، آپ سمجھ گئے ہونگے۔ رزلویشن کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی کتابوں کا ترجمہ اور
خلاصہ اس طور پر کیا جاوے جس سے وہ لوگ جو ان کتابوں سے بالکل ناواقف ہیں واقف ہوجائیں
ان کے اس رزلویشن سے بعض لوگ خیال کریں گے کہ انگریزی زبان کی اردو میں تقلید کرنا چاہتے، جو
بالکل ایک نئی بات ہے۔ لیکن یہ کسی کی تقلید نہیں ہے۔ مجھ کو اس رزلویشن نے دولت عباسیہ کا
زمانہ اور اُس زمانہ کے تاریخی واقعات یاد دلوائے (نعوذ باللہ) اس رزلویشن کا مقصد انگریزی
تقلید نہیں ہے۔ بلکہ اُس نے ہمارے اسلاف کا طریقہ یاد دلایا ہے، جو علم و ہنر پر دل و جان سے
فدا تھے۔ انہوں نے نہایت فیاضی اور نہایت دلیری سے غیر قوموں سے علم سیکھا، غیر ملکوں کی
زبانوں کو حاصل کیا، اور مختلف ملکوں اور مختلف قوموں کی کتابوں کو مطالعہ کیا اور بید رنج اپنی زبان میں
اُن کے ترجمے کر ڈالے۔ آپ لوگوں میں سے بہت کم ایسے ہونگے جو تاریخی واقعات سے واقف
ہونگے۔ لیکن جن کو معلوم ہے وہ جانتے ہونگے کہ مسلمانوں نے دوسری قوموں سے علوم حاصل کئے
اور جب معلوم ہوا کہ ایک انبار عظیم فلسفہ اور حکمت کا یونان اور فارس میں ہے تو بے محابا اُس کے
حاصل کرنے پر بھجے۔ اُن کی توجہ جیسی ملکوں کے فتح کرنے پر تھی اور دنیا کا بہت سا حصہ فتح کر کے
اپنے قبضہ میں لائے تھے۔ ارادہ کیا کہ علوم کو بھی فتح کر کے قبضہ میں لادیں۔ اور جس طرح زمین دوسروں
کے قبضہ سے نکال کر اپنے قبضہ میں لائے تھے، اسی طرح جو علم دوسری زبان میں تھا اور دوسری قوم
اُن پر قابض تھی اُس قوم سے لیکر اپنے قبضہ میں لے آئے۔ جس نے الماموں کو پڑھا ہے۔
اُس کو معلوم ہوگا کہ ماموں رشید نے سیم و زر کی یا جواہرات کی اتنی قدر نہیں کی جتنی کہ علم و فلسفہ
کی۔ اُس نے اتنا روپیہ ترجمہ کرنے پر صرف کیا کہ غالباً ملک کے فتح کرنے پر اُس نے صرف نہ کیا ہوگا۔
عزیزی سید محمود نے اس رزلویشن کو پیش کر کے عباسیوں کے کارنامے یاد دلوائے
اور میں اُمید کرتا ہوں کہ ہمارے نوجوان طالب علم جس کو ترغیب ملے گی ہے اپنے بھائیوں کو فائدہ پہنچائیں
اور عباسیوں کے علمی عہد کو زندہ کریں گے۔ میں اس بات کو دیکھتا ہوں کہ اس رزلویشن کے پاس کرنے

میں کسی کو غدر نہیں ہے اس لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ یہ رزولوشن بالاتفاق پاس ہوا۔



نمبر ۲۲

اسپیج

یہ اسپییج فرما صاحب بہادر نے بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے عہد ان آپریشنل کانفرنس منعقدہ شاہ جہان پور واقعہ ۲۹- دسمبر ۱۹۵۹ء کو رزولوشن نمبر ۱ جس کی نقل ذیل میں درج کی جاتی ہے تائید کرتے ہوئے فرمائی مضمون رزولوشن حسب ذیل ہے:-

رزولوشن نمبر ۶

اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ نظر زیادہ ہو جانے کا کانفرنس اور اس کے مستقبل کا استحکام اور عملی سے کام ہونے کے آئینہ سید محمد محمود بیرٹھرائٹ لاجو مقام علیگڑھ مستقل طور پر سکونت گزین ہیں اور مدرسہ العلوم علیگڑھ کے لائف آفیسری جنٹ سیکرٹری ہیں اس کانفرنس کے بھی جنٹ سیکرٹری قرار دئے جاویں کہ وہ بحیثیت سید احمد خاں بہادر سیکرٹری کانفرنس کے کام جنٹ سیکرٹری کا اسی طور پر انجام دیں جس طرح پردہ جنٹ سیکرٹری مدرسہ العلوم علیگڑھ کا کام انجام دے رہے ہیں اور ان کو اجازت دیکھا وے کہ بغیر تنہا انتظام کے ایک جدا گانہ دفتر کانفرنس کا مرتب کریں اور اس دفتر کی کارروائی کے لئے واسطے مشاہیر ملک دیگا بلکاران ضروری کے چھتر روپیہ ہوا رہی بخیر اس آمدنی کے جو کانفرنس کی کو ہے صرف کرنے کی اجازت ہو۔ اور واسطے خرید سامان دفتر و شیشہ وغیرہ کے اول سال کے لئے کمیشن تین سو روپیہ تک خرچ کرنے کی سید محمود کو اجازت دیکھا وے۔

حضرات!

مجھ کو تعجب ہوتا ہے کہ ایسی بات جو کئی سال پہلے ہوئی چاہئے تھی اس پر آج مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنی فصیح و بلیغ اور طولانی تقریر کی اور سیکرٹری اور پریسیڈنٹ کو ذلیل کیا، اور ان کو عصمتو معطل بتایا۔ اس کی وہی مثال ہے کہ ایک نادان آدمی کو جو دریا نشان دار اور زمین بھی تھا کئی شخصوں نے ملکر اپنا مرشد بنایا اور جگہ لیجا کر جا بٹھایا اور لگے اس کی خدمت و اطاعت کرنے یہاں تک کہ اس کی پررنگی اور خدار بھی کا شہرہ پادشاہ کے کان تک پہنچا اور اس کو شاہ صاحب کی قدمبوسی کی اشتیاق

پیدا ہوا۔ جب ان مریدوں کو معلوم ہوا، تو انہوں نے اپنے سادہ لوح پیر کو سمجھاتا شروع کیا، کہ جب بادشاہ آئیں تو خرداران کی تعظیم کے لئے کھڑے مت ہو جانا جیسی کچھ ہوگی ہم سب دیکھ لیٹے۔ صرف تم خاموش بیٹھے رہنا اور قل کہدینا۔ غرض کہ اُس کو سمجھا بجھا کر بادشاہ کی آمد کا انتظار کرنے لگے، جب بادشاہ سلامت تشریف لائے تو سطوت و جلال شاہی سے درویش کا بدن کانپنے لگا، بادشاہ نے کہا، اللہ اکبر شاہ صاحب تو بڑے بزرگ اور خدا رسیدہ ہیں۔ جب درویش کو کسی قدر افاقہ ہوا تو قل کہتا بھی بھول گئے، بجائے اُس کے بل بول اُٹھے، بادشاہ نے مریدوں سے دریافت کیا کہ شاہ صاحب کیا فرماتے ہیں، انہوں نے جواب دیا، کہ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں بل علی الدنیا یعنی پشیاب کو دنیا پر۔ ہمارے مولانا نے جو ہمارا پتلا بنکر یہاں بیٹھنا بیان فرمایا اُس پر ہم فخر ہے، کیونکہ اُس پتے کے بنانے والے اور چلانے والے موجود ہیں، پریسڈنٹ کو کیا پتلا کہا جاتا ہے۔ یہ مجلس ہی بجائے خود پتلا ہے، پہلے زمانہ میں جو اسلامی مجلسیں ہوتی تھیں، اُن میں کچھ نہ کچھ عملی کام بھی ضرور ہوتے تھے۔ اب بجائے اس کے صرف نقل ہے۔ اور نقل بھی انگریزی مجلسوں کی ہے، جن کی عملی قوت اور استعداد اور سرگرمی دنیا میں مشہور ہے۔ میں ایک اونٹنی سی بات آپ کو سناتا ہوں، کہ ولایت میں ایک ہوٹل کے سامنے جس میں میں ٹھہرا ہوا تھا ایک کینی باغ تھا۔ ایک روز تیسرے پہر کو گیا دیکھتا ہوں کہ ہزاروں آدمی باجے بجاتے، رنگین چھٹکے لٹکے جاتے ہیں۔ میں سمجھا کہ یا تو کھیلین کی سواری نکلی ہے یا کوئی اور شاہی تقریب ہے۔ لیکن جب میں نے وہاں کے منبر سے دریافت کیا تو اسے تعجب ہوا، اور کہا کہ کیا آپ نے اخبار نہیں پڑھا اور کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آج قلیوں کا جلسہ ہے۔ قلیوں اور مزدوروں کا ایک مسودہ قانون پارلیمنٹ میں پیش ہوا ہے، جس میں لکھا ہے کہ اتوار کے دن شراب خانے بند ہو جایا کریں۔ اس پر چالیس ہزار مزدور، اذراستی ہزار قلیوں نے مل کر چیل لاکھ روپیہ اس مسودہ قانون کی تردید کے لئے جمع کیا اور یہ تمام ہنگامہ اور جوش و خروش جو آپ دیکھتے ہیں، اس قانون مجوزہ کی مخالفت میں ہے۔ مجھو یہ سن کر نہایت افسوس ہوا، اور شرم آئی، کہ جہاں قلیوں کی حیالمت ہو، وہاں کے اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ افسوس کہ ہم قلیوں سے بھی گئے گورے ہوئے ہیں اور اگر کسی بات کا ارادہ بھی ہو تو ہم میں اتفاق نہیں ہے۔ بہر حال ہماری قوم میں انگریزوں کی تقلید کی جاتی ہے، مگر اُن کی ہستی استعداد، اُن کا اتفاق، اُن کا سا جوش ہم میں نام کو نہیں ہے۔ یہ کانفرنس جس کے دفتر سکریٹری میں اُٹھاف قائم کرنے کے لئے پچھتر روپیہ ماہوار کے اخراجات پر آج شدہ مد سے بحث ہوئی ہے اور اس کی منظوری حاصل کی جاتی ہے۔ اگر غور سے دیکھو تو نمیشنل کانگریس کے سامنے اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے بڑے شرم کی بات ہے کہ جو قوم کل تمہاری ماتحت اور محکوم تھی اور تمہاری مجلسوں میں فرش تک آتے

ہوئے اُس کے بدن پر لرزہ آتا تھا، وہ اس زور شور سے کارروائی کرے۔ نہایت غیرت اور سرم کا مقام ہے، انیشٹنل کانگرس کے دفتر سکرٹری میں اسی ہزار روپیہ کا خرچ ہے جو باہمی چندوں سے پورا ہوتا ہے مگر ہماری کانفرنس کا خرچ اس کے مقابل میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اگر اس زور و لبوشن کو مجموعی طور پر آپ نے منظور کر لیا تا ہم خرچ کی مقدار بالکل بے حقیقت ہے۔ پھر انیشٹنل کانگرس کی وسعت اور شہرت کی کیفیت یہ ہے کہ مہینوں پیشتر گاؤں گاؤں آدمی بھیجے جاتے ہیں۔ ہزاروں اشتہار طبع ہوتے ہیں، جایجا مجلسیں قائم ہوتی ہیں، جن میں برابر ترغیبیں دی جاتی ہیں اور کانگرس کے اغراض و مطالب پر پرجوش تقریریں کی جاتی ہیں۔ برعلافہ اس کے ہماری کانفرنس کے لئے نہ جایجا ابتدائی کیٹیاں ہوتی ہیں، نہ اس کے اغراض و مقاصد کو وسعت کے ساتھ لوگوں میں پھیلا یا جاتا ہے۔ نہ کثرت سے اشتہار چھپ کر شائع ہوتے ہیں، نہ اس کے لئے کوئی اسٹاف ہے جس کی عملی قوت پر قوم کو اطمینان ہو۔ ہم بیچارے جمع بھی ہوئے تو قوم کی طرف سے کسی کو کانفرنس کو مرتد کا خطاب ملا۔

حضرات! میں نہایت دل سواری سے کہتا ہوں کہ یہ تمام باتیں جو کہی جاتی ہیں، تیسام شور و غل جو کیا جاتا ہے، تمہاری بھلائی کے لئے ہے۔ اور بقول بزرگ سرسید کے جب تم ایک ڈھیر اور چار سے مسجد میں کام لیتے ہو تو خیر ہم محمد سی، کافر سی، مرتد سی، لیکن جب دل سے تمہاری خدمت کرتے ہیں، اور زبان سے تمہاری بھلائی کی بات نکالتے ہیں، تو اس خدمت کو قبول کرنے اور اس بھلائی کی بات ماننے میں تم کو ذرا عذر نہ ہونا چاہئے۔

حضرات! سچ تو یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی تقدیر سیدھی ہوتی تو ہر ایک شخص قومی بھلائی کے کام میں دل و جان سے شریک ہوتا، اور ایک کانفرنس نہیں بلکہ ہزاروں علمی و اخلاقی کانفرنسیں قائم ہوتیں اور ایک سرسید نہیں بلکہ ہزار سرسید قوم میں پیدا ہوتے۔ آپ اسی کانفرنس کو خیال کریں کہ تنہا سرسید کیا کر سکتے ہیں؟ ان کی حالت تو یہ ہے کہ ساری دنیا کے کام اپنے سر پر لے رکھے ہیں اور کوئی مدد کر نہ لانا نہیں ہے۔ سرسید سے لوگ کیسے ہی مخالف ہوں ان کو کتنا ہی ررا کیوں نہ سمجھتے ہوں لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کے دل میں قومی محبت کی آگ بھڑک رہی ہے۔

یکسینہ و صد ہزار شعلہ یکسینہ و صد ہزار باران

مگر اے حضرات! کیا اس محبت و ہمدردی کا جو ان کو قوم کے ساتھ ہے یہی صلہ ہے کہ ضعف و پیری کی حالت میں بھی آپ ان کو اپنی خدمت سے سبکدوش نہ کریں۔ یا ان کی محنت میں تخفیف گوارا نہ کریں۔ یہ زور و لبوشن جو پیش کیا گیا ہے اور جس پر باختم ہوا ہے اسی غرض سے ہے کہ سرسید کی محنت میں تخفیف ہو، اور ان کو اس بڑھاپے اور ضعف کی حالت میں آرام دیا جائے اور وہ صرف آئری طور پر کانفرنس کے سکرٹری رہیں اور سید محمد ان کی جگہ لائف آئری جیٹ سکرٹری مقرر ہوں

جن سے امید ہے کہ کافرنس کو عمدہ طور پر چلائیے، اور اسٹاف سے جوان کے ماتحت کام کرے گا
نہایت عمدگی سے کام لینگے *

نمبر ۲۵

ایچ

یہ مختصر ایچ نواب صاحب بہادر نے بحیثیت میر مجلس ہونے اجلاس دہم عثمانیہ کونسل کافرنس
منفقہ شاہ جہان پور ۲۹ - دسمبر ۱۹۰۸ء کو نسبت نظم فنی امجد علی صاحب اشہری کے
بطور رہبر کس کے فرمائی :-

حضرات !

ہمارے اشہری صاحب کو آپ جانتے ہونگے۔ نہایت لائق اور بے نظیر شاعر ہیں، اور ان کی
شاعری کا شہرہ دور دور ہے اور اکثر اخباروں میں ان کی نظمیں چھپتی رہتی ہیں رنگیں نشر رکھتے ہیں بھی
ان کو قدرت ہے اور مذاق انشانہایت صحیح ہے۔ بہت دنوں تک ہمارے گردہ کے بر خلاف رہے
اب الحمد للہ کہ ہماری برادری میں داخل ہوئے جس کے لئے میں کتنا ہوں کا تزییب علیکم الیوم
جو نظم و مثنیٰ انہوں نے سنائی اس کے لئے میں اپنی طرف سے اور کافرنس کی طرف سے ان کا شکریہ
ادا کرتا ہوں *

نمبر ۲۶

ایچ

یہ ایچ نواب صاحب بہادر نے ۲۹ - دسمبر ۱۹۰۸ء کو شاہ جہان پور میں بحیثیت میر مجلس ہونے اجلاس کافرنس کے
بابت رزلویشن نمبر ۱ جس کی نقل ذیل میں درج ہے) تائید کرتے ہوئے فرمائی *

رزلویشن نمبر ۱

یہ کافرنس مولوی حافظ ندیم احمد صاحب کا از طرف مسلمانان ل سے شکریہ ادا کرتی ہے کہ انہوں نے

اپنی قومی محبت اور حقیقی خواہش ترقی تعلیم مسلمانوں کے علاوہ ان عطیات کثیر التعداد کے جو سابق میں وقفہ وقفہ مدرسہ العلوم مسلمانان علی گڑھ کو دے چکے ہیں، انہوں نے فی الحال برطانیہ دریافت خاص موجودہ ضروریات مدرسہ العلوم مسلمانان کے کمشت ایک ہزار روپیہ کی رقم بطور چندہ کے مدرسہ العلوم علی گڑھ کو دیدی ہے۔

حضرات !

اس رزولوشن کی نسبت جو کچھ میرے عزیز سید محمود نے تقریر کی اُس کی نسبت یہ خیال ہوگا کہ انہوں نے ایک ہزار روپیہ دینے کی وجہ سے اپنے خیالات کو مختصر لفظوں میں ادا کیا۔ بلکہ اُس کی مثال کو ہتھ جھیل کی ہے کہ پانی برابر بڑھتا رہا اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ لیکن جب حد سے زیادہ گزر گیا تو ایک دم سے اپنے سیلاب میں جو کچھ اُس کے سامنے آیا۔ اُس کو بہلے گیا۔ اسی طرح اس موقع پر اُس احسانات کا شکریہ جو نہ احمد۔ محمود۔ حمدی پر، بلکہ انہوں نے قوم پر کئے تھے ادا کیا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں کہ مولانا کی جیب سے ایک ہزار کا چندہ ایسا تعجب انگیز نہ تھا جس کا اس طریقہ پر شکریہ ادا کیا جاتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب سے زیادہ مدرسہ العلوم میں نہ کسی چندہ دینے والے کی رقم ہے اور نہ کسی دوسرے طریقہ سے امداد دینے والے کی مدد ان سے زیادہ ہے۔ انہوں نے بارہ دو دو اور تین تین ہزار روپیہ مدرسہ کی امداد کے لئے اپنی جیب خاص سے دئے اور اپنے لکچروں کے ذریعہ سے ہزار روپیہ کا فائدہ مدرسہ کو پہنچا۔ آخر قوم کہاں تک ضبط کرتی، جب اُن کے احسانات حد سے زیادہ گزر گئے اور گوہنا جھیل کی طرح اُن کا سیلاب آ گیا۔ قوم کے دل جو اُن کی محبت اور تعظیم سے بھرے تھے یکایک پھوٹ پڑے، اور اُن کا شکریہ نہایت جوش و خروش سے ادا کیا گیا۔

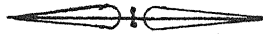
یہ بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ جو کچھ انہوں نے دیا وہ کس غرض سے، مولوی صاحب طالب شہر نہیں کیونکہ باوجود اس بیعت و عظمت و قابلیت کے کہ غالباً میرے نزدیک ان کا سالانہ ہندوستان میں دوسرا نہ ہوگا۔ اُن کی گوشہ نشینی کی یہ حالت ہے، کہ جب آپ حیدرآباد کی گورنٹ میں تھے سرسالا جنگ نے جو آپ کی نہایت عزت کرتے تھے۔ رئیس کے لئے آپ سے کتابوں کے تصنیف کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اُس زمانہ میں سرسالا جنگ کی خدمت میں سکرٹریٹ کا کام انجام دیتا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو آپ کی طرف سے مولوی صاحب کو ایک خط شکریہ کا لکھ دیا جائے فرمایا کہ اُن کی تصنیف اور اُن کے کام محتاج شکریہ کے نہیں ہیں۔ اُس کے بعد آپ کو حضور برتو کا اتالیق چوڑ کیا۔ مگر باوجود اس معزز عہدہ پر مقرر ہونے کے اگر کبھی سرسالا جنگ کے پاس جاتے تھے۔ تو کراہیت کے ساتھ اور اپنی اسی سادی وضع میں جاتے تھے جو ہمیشہ اُن کی عادت

میں داخل ہے ۛ

حضرات! اگر وہ ایک ہزار روپیہ اپنی شہرت کے واسطے دیتے تو ایسے نادان نہیں تھے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جہاں شیطان کی آنت سے زیادہ لمبی لمبی نہرتوں میں دٹل دٹل اور پچاس پچاس ہزار کے چندے اور نظام سے عالمی پایہ مدد کرنے والوں کے نام نادرچ ہیں وہاں ایک ہزار روپیہ کو کیا نسبت ہے۔ یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے پہلے کبھی چندہ نہیں دیا، اور اب اپنے نام و نمود کے لئے چندہ دیا ہے، کیونکہ خود انہوں نے تین تین ہزار کی رقمیں اس سے پہلے دی ہیں اور کیوں جس شخص کی تصانیف ایسی ہوں، جن کے ذریعہ سے اُس کی استاد ی کا ڈھنگ چار دانگ ہندوستان میں بک گیا اُسے اپنی شہرت کے لئے دوسرا طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ غرض کہ یہ چندہ نہ انہوں نے شہرت کی غرض سے دیا ہے نہ نام کی وجہ سے بلکہ اپنی قوم کا ادب اور بے نصیبی کا تصور کر کے دیا ہے، جو کہ ہماری شامت اعمال کا نتیجہ ہے اور حقیقت میں ہمارے اعمال و افعال ایسے خراب ہیں اور اس قابل ہیں کہ ہم بنی اسرائیل سے زیادہ خوار اور ذلیل ہوں کیونکہ بنی اسرائیل نے اگر کچھ قصور کئے تھے، تو اُن سے ہمارے گناہ بڑھے ہوئے ہیں۔ حال میں آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک تازہ بے نصیبی سے ہمارے کالج کو سامنا پڑا ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارے کالج کی زراعت میں ایک بڑا غنن ہو گیا ہے اور ہماری قوت خصوصاً سکریٹری پراس کا بڑا صدر ہوا ہے۔ مگر امید ہے کہ اُس کی تلافی ہو جاوے گی اور رقم ماری نہ جاوے گی۔ ہمارے مولانا جو ہمیشہ سے نازک اور تنگ وقت میں زبان سے قلم سے۔ روپیہ سے مدد دینے کے عادی ہیں ایسے نازک وقت کا خیال کر کے مقدمہ بکیش بنے اور اس رقم کی تلافی کی غرض سے ایک ہزار کا چندہ دیکر باقی لوگوں کے لئے ایک مثال قائم کر دی، تاکہ اور لوگوں کو خیال ہو کہ جس نیک کام کی انہوں نے پیش قدمی کی ہے اور لوگ بھی اُن کے پیچھے چلے آویں۔ اور اس نیک کام کی تقلید کریں۔ مولانا نے اس خیال سے کہ شہرت ہو بلکہ انہوں نے یہ امداد حسبہ اللہ اور حسبہ للقوم کی ہے، سید احمد، سید علی، سید محمود کیا آپ کا شکریہ ادا کر سکتے ہیں؟ جو خدا کے بندے اُس کے حبیب کی ہمت کی مدد کرتے ہیں، اور مدد بھی کن کی۔ اُن بچوں کی جن کے اوپر سایہ نہیں، اور جو ایسے غریب ہیں کہ نہ اپنی گذر کر سکتے ہیں نہ مدرسہ کی فیس دے سکتے ہیں، اور بہت سے ایسے بچے کہ شاید اسلام پر قائم بھی نہ رہ سکیں اور جن کو ہمارے ہاں سے اسکا رٹشپ اور وظیفہ دئے جاتے ہیں۔ اُن کے لئے ایک تجویز ہے کہ اگر ایسے عطیہ کیے پیش کرنے کے وقت ان پر پھول برسائیں تو زیبا ہے، مگر وہ پھول تھوڑی دیر میں مرجھا جاوینگے۔ ہمارے مولانا پر اُن تعلیم یافتہ کی نالہ دین کی پاک رو میں اور رحمت کے فرشتے ایسے پھول برسائے ہیں جو کبھی نہ کھلاوینگے اور اپنی خوشبو سے فردوس بریں تک کو معطر کھینگے ۛ

اسی طرح سے ان کے لئے دوسری تجویز ہے کہ ایڈریس پیش کئے جاویں، مگر میں ایسے کاغذ پر جس کو کٹرے کھا جاتے ہیں ایسے عطیہ دینے والوں کو ایڈریس دینا پسند نہیں کرتا لیکن جو سببہ قداد خدا کی خوشنودی اور اُس کے رسول کی اترکے لئے عطیہ دیتا ہے۔ رحمت کے فرشتے، اُس کو ایسے ایڈریس پیش کرتے ہیں جس پر خدا کی خوشنودی کی مہر لگی ہوئی ہے اور جو کبھی خراب ہونگے اور نہ خاک میں لینگے۔

۱۔ حضرات! جو کچھ میں نے کہا اُس کو آپ نے سنا ہو گا اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ سب صاحبِ دل سے متفق ہو کر اس عطیہ کی بابت مولوی صاحب کا شکرا داکرینگے۔
رزولیوشن نمبر ۷ نہایت جوش سے بالاتفاق پاس ہوا۔



نمبر ۲۷

اسپیج

یہ اسپییج بھی نواب صاحب بہادر نے ۲۶- دسمبر ۱۸۹۹ء کو اجلاسِ محمدان اسپیکیشن خلیہ کانفرنس منعقدہ شاہجہان پور میں بحیثیت میر مجلس ہونے کے منشی محمود حسن خاں صاحب کی تقریر کے جواب میں فرمائی۔

حضرات!

جناب محمود حسن خاں صاحب نے جو اس وقت آپ کے سامنے تشریف فرما ہیں، جو اُترا د فرمایا اُس کے شروع میں وہ فرماتے ہیں کہ ان تین روز کے لکچروں کا جو بزرگانِ دین یا بزرگانِ شیعہ نے دئے ہیں یہ اثر ہوا ہے کہ جوشِ اخوتِ اسلامی لوگوں میں پایا جاتا ہے، میں اس کے خلاف ہوں۔ یہ اس کا اثر نہیں ہے۔ بلکہ آپ سمجھ لیجئے کہ ہر مسلمان جو فطرت سے مسلمان پیدا ہوا۔ اسلام کا دودھ پیا۔ اسلام کی گود میں پرورش پائی۔ اور پیدا ہوتے ہی پاک آواز کا لہر کا لہر محمد رسول اللہ کی اُس کے کان میں ڈالی گئی اُس کا قدرت سے دل ہمیشہ صاف اور آمادہ رہتا ہے نیک اور اچھی بات قبول کرنے کے لئے۔ جس طرح ہم کلی کو دیکھتے ہیں کہ پھول ہونے کا مادہ اُس میں موجود ہے۔ اور وہ خود گلاب کا پھول بن جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے مسلمانوں کے دل میں فطرتی قابلیت موجود ہے۔ لیکن بعضوں کی فطرتی قابلیت پر خارجی خیالات اور بعض اسباب کا جو عارضی چیزیں ہیں پردہ پڑ جاتا ہے۔ ہم جو خادم ہیں ہمارا کام یہ ہے کہ اس پردہ کو اٹھا دیں اور اُن کے فطرتی جوہر کی اصلی

اور سچی خوبصورت تصویر دکھادیں *

مسلمانوں کی عادت میں زمانہ کی رفتار نے ہندؤں کے ساتھ رہنے سے یہ بات پیدا کر دی ہے کہ ان کو ایک خدمتگار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی اس خواہش اور ضرورت کے موافق خدا نے ان کے خدام بھی پیدا کئے *

حضرات! کیا مسلمان، مسلمان ہو کر تعلیم کی مخالفت کریں گے، جب کہ وہ جانتے ہیں کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خطوط بھیجنے کے لئے صحابیوں کو حکم دیا کہ اطراف عالم میں خطوط لکھ کر بھیجیں۔ وہ خطوط بتقریب دعوت عام تھے جو نہ ایک بان پر نہ ایک ملک پر محدود تھے بلکہ جہاں خدا کے بندے موجود تھے اسلامی دعوت کے خطوط بھیجے گئے۔ اگر یورپ والوں کو دعوت کی جاے اور ان سے یہ کہا جائے کہ تم پہلے عربی بولو، پھر ہم دعوت اسلام کریں گے، تو کیسی نادانی کی بات ہے۔ اسلام کیا طیر ہندؤں کا چوکا، جہاں کوئی گیا اور کھانا حرام۔ خدا کا کوئی خاص لباس نہیں، اس نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ کہ ایسا کوٹ ہو، ایسی پتلون ہو، اور مسلمان فلاں زبان میں گفتگو کریں۔ ہاں یہ مندر ہے کہ خدا نے عربی زبان کو اشرف اللسان بنایا ہے۔ اور اس کی کرامت کی وجہ یہ ہے کہ خدا کا محبوب اس زبان کو بولتا تھا۔ اس کی عزت و شرافت اسی بات سے پائی جاتی ہے کہ کم سے کم ہر ایک شخص عربی زبان میں کلمہ پڑھتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو یہ توقع کرنی کہ بغیر اس کے کہ اہل یورپ عربی زبان سیکھیں دعوت اسلام ان کو نہیں کی جاسکتی، محض خیال خام ہے۔ اس لئے اگر ہم مذہب اسلام کی دعوت یورپ کو کرنا چاہتے ہیں۔ تو دعوت کرنے سے پہلے انکس مشغول زبانوں میں کافی مہارت پیدا کرنی چاہئے *

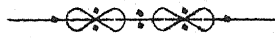
دوسری بات یہ ہے کہ پادریوں نے اپنے مدارس میں ایک سیکشن قائم کر دی ہے جس میں طالب علموں پر واجب کر دیا ہے کہ عربی پڑھیں اور ان کو وظیفہ دیتے ہیں۔ لیکن یہ کس لئے، اس لئے کہ مسلمانوں کی مذہبی کتابیں دیکھ کر انگریزی میں اپنے مذہب کے مطابق تردیدانہ مضامین لکھ سکیں۔ ان کے مذہب سے واقف ہوں اور اپنے مذہب کی تائید کریں۔ وائے بر حال مسلمانوں کے جن کی ایسی حالت ہے کہ باہم دو فریق لڑتے ہوں اور ایک شخص اگر کہے اپنے فریق سے کہ تجھ پر مصیبت آنے والی ہے۔ وہ بجائے اس کے کہ اس مصیبت سے خبردار ہو کر اس کا انتظام کرے اور اس شخص کا شرمندہ احسان ہو اپنے ہاتھ سے اس کی گردن اڑا دیتا ہے *

آپ خیال کیجئے کہ ہم لوگ قطع نظر دنیوی فوائد کے جو انگریزی تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس بات پر بھی غور نہیں کرتے کہ آج اسلام پر کیا کیا حملے ہو رہے ہیں اور دنیا کے ہادی کی نسبت مخالف فرقے کیا کھ رہے ہیں۔ ہر شخص اپنی حالت پر خوش ہے۔ اگر کسی کو کھانا مل گیا خواہ وہ بھیک ہی کے ذریعہ

کیوں نہ ہو، تو اُسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں۔ وہ مطلق اس بات کی پروا نہیں کرتے، اسلام اور بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جو حملے ہوئے ہیں اُن کے جواب دینے اور اُن کی تردید کرنے کے لئے اپنے بچوں کو انگریزی زبان کی تعلیم دیں۔ اور کوشش کریں کہ غیر ملکوں میں اسلام پھیل جائے۔ آپ ہم کو کافر اور محد سمجھتے ہیں اور خدا نہ کرے کہ ایسا ہو، اگر ہم خدا خواستہ اسلام کو چھوڑنا چاہیں تو نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمارے اختیار سے خارج ہے کہ ہم خدا کو اور اپنے داد کو بھول جاویں۔ مگر آپ لوگوں کی آنکھوں پر جو پردہ پڑا ہے اُس کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے فرقے اسلام کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں، اور عربی زبان پڑھ کر اور تہماری کتابوں کو دیکھ دیکھ کر کیا غضب ڈھارہے ہیں۔ جس کی وجہ سے روز بروز اسلام میں ضعف آتا جاتا ہے، اور اسلام کی حکومت اہت سے بے خبر۔ غافل۔ اور نادان لوگوں کے دل سے اٹھتی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ ہم پکار پکار کر کہتے ہیں۔ اے مسلمانوں، خدا کے لئے رسول کے لئے، خواب غفلت سے بیدار ہو۔ غیر قوموں کی باتیں سیکھو اور مذہب پر جو حملے ہو رہے ہیں، اُن کو دفع کرو اور فلاح و بہبودی اسلام کی تدبیر کرو، اور اپنی قوم کو تباہی کی زد سے بچاؤ۔ ہم بیشک قصور وار ہیں، کہ جو غفلت کا پردہ تمہاری آنکھوں پر ہے اُس کے اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں مگر ع

نست یا ران طریقت غیر ازین تقصیر یا

ہمارے لوں میں اسی طرح اسلام کی محبت ہے جس طرح تمہارے لوں میں ہے اور ہم بھی تمہاری طرح رسول اللہ کے نام پر اپنی جان قربان کرنے کو موجود ہیں۔ ہمارے ان بچوں اور عورتوں کا دل پراثر ہونے کا ذکر جو آپ نے اپنے مضمون کیا ہے اس سے ہم کو ہم کو کچھ امید ہوتی ہے کہ ٹیہان شاہجہان پورا اپنی قوم کی بہبودی کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھیں گے۔



نمبر ۲۸

اسپیج

یہ اسپج خواجہ صاحب بہادر نے ۲۹ دسمبر ۱۸۹۹ء کو شاہ جہان پور کے اجلاس کونفرس میں بحثیت میں مجلس ہونے کے منشی علامہ راشد خاں صاحب کے ایک سور و پیہ عطیہ پر جی انہوں نے علیحدہ کالج کو عطا فرمایا تھا بطور شکریہ کے فرمائی:-

حضرات! مولوی حافظ تدریاح صاحب نے فرمایا تھا کہ پرسیسٹنٹ کیا ہیں ایک گڑبایا ہیں۔ مگر کیا کیجیے

کوئی اس گڑیا کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اب مجھے کچھ ہونا پڑا *
درحقیقت جو کچھ منشی عطاء اللہ خاں صاحب نے تقریر کی وہ ایک قول تھا اور جو کچھ انہوں نے مندر
کیا وہ ایک فعل۔ اور ایسے ہی مسلمان ہونے چاہئیں جن کا قول فعل کے مطابق ہو۔ اور ایسے ہی بزرگوں
سے کچھ بیہودی کی امید ہو سکتی ہے *۔

مدرسۃ العلوم مسلمانوں کا قومی مدرسہ ہے اور بدقسمتی سے جو نقصان زرا مانت میں تغلب ہونے
سے اُس کو پہنچا ہے وہ بھی مسلمانوں کو پورا کرنا چاہئے۔ پس کوئی مسلمان ایسا نہیں ہوگا، جو مدرسۃ العلوم
کے ساتھ ہمدردی نہ رکھتا ہو۔ اور جو مالی صدرہ اُس کو پہنچا ہے اُس سے متاثر نہ ہوا ہو۔ سب سے
پہلی نظیر مولانا حافظ نذیر احمد صاحب نے قائم کی جن کے دل میں بے اختیار مدرسۃ العلوم کے ساتھ
ہمدردی کا جوش پیدا ہوا۔ اب ہم کو اپنی قوم کے اُن بزرگوں پر فخر کرنا چاہئے جو اس عمدہ نظیر کی پیروی
کرنا چاہتے ہیں اور جن کا دل اسلامی محبت اور قومی ہمدردی سے بھرا ہوا ہے۔ ہمارے مخدوم منشی
عطاء اللہ خاں صاحب انہیں بزرگوں میں سے ہیں جو اپنی قوم کے ساتھ اور اپنے قومی مدرسہ کے ساتھ
دلی محبت اور دلی ہمدردی رکھتے ہیں، جن کا دل اس قومی صدرہ سے پاش پاش ہو گیا۔ اور جنہوں
بے اختیار اپنی بساط اور حوصلہ کے موافق اپنی قوم کو مدد دینے پر کمر باندھی۔ اور یہ گوارا نہیں کسب کہ
مدرسۃ العلوم کو ایسا نازک وقت پیش آئے، وہ خاموش بیٹھے رہیں۔ میں اپنی طرف سے اور کانفرنس
کی طرف سے منشی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں *۔

نمبر ۲۹

اسپیج

یہ اسپیج بھی ۲۹۔ دسمبر ۱۹۹۰ء کو فواب صاحب بہادر نے اجلاس کانفرنس شاہجہان پور میں
میرٹھس ہونے کی حیثیت سے سر محمد محمود بیرٹراپٹ لاوجناب مولوی نذیر احمد صاحب کی
نظم اور لکچروں کی بابت فرمائی :-

حضرات !

اس وقت عزیزی محمود نے جو لکچر آپ کو مختصر طور پر سنا یا وہ درحقیقت اُن کے لکچر کے چند صفحے
ہیں جن کو آپ نے چپ چاپ سنا اور مزانہ آیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُن کا لکچر عالمانہ اور مختصراً ہے
جو دماغ کے لئے تصنیف کیا گیا ہے اور دماغ کی غذا ہے۔ جب وہ چھپ کر تیار ہوگا اور آپ کے

پاس پہنچکا تو امید ہے کہ آپ اُس کو غور سے پڑھیں گے۔ اور اُس کو سمجھ کر اول دل پر نقش کرینگے۔ پھر اُس پر عمل کرینگے اور اپنی قوم کی صلاح کی طرف متوجہ ہونگے۔ انہوں نے شاہجہان پور کی کانفرنس کے واسطے ایک محققانہ لکچر تیار کر کے چند صفحے اُس کے سنادئے جن میں انہوں نے علم الاعداد کی رُو سے قوم کی تعلیمی حالت کا نقشہ پورا پورا کھینچا اور آپ کے پیش نظر کر دیا ہے۔ اس لکچر کو دیکھ کر آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنی قوم کی بہبودی اور ترقی کی فکر کریں۔ اس وقت انہوں نے جس نظم پر اپنے لکچر کو ختم کیا ہے اس نظم کے پڑھنے کی مصنف سے درخواست کی جنہوں نے نہایت مہربانی سے اس نظم کو خود سنا دیا منظور کیا۔ اور آپ نے دیکھا کہ وہ نظم انہوں نے کس قدر عمدہ لہجہ اور پُر جوش آواز سے پڑھی جس کا اثر مجھ پر ہی نہیں ہوا بلکہ آپ کے دل پر بھی ہوا ہوگا۔

حضرات! عزیز سیّد محمود جو انگریزی ادب کے عالم متحر ہیں اور جو بہت سے ایسے علمی سے آگاہ ہیں جن سے یورپ میں بھی لوگ اکتف نہ ہونگے۔ اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ ان کی یا ان کے لکچر کی تعریف کی جائے۔ عزیز سیّد محمود کے لکچر کے بعد آج آپ نے مولانا حافظ ندیر احمد کی نظم انہی کی زبان سے سُنی ہے جو نہایت مؤثر اور پُر جوش تھی۔ کل آٹھ بجے صبح کو ان کا لکچر ایک نہایت عمدہ اور دینی مضمون پر ہوگا۔ وہ لکچر نہیں ہے بلکہ وعظ ہے، معاش اور معاد دونوں پر۔ مولانا لکچر جس قدر عمدہ اور فصیح و بلیغ ہوگا، اُس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ ان کے لکچر میں ایسی تفسیر کی قوت ہے کہ وہ خواہ مخواہ ہمارے دل کو اپنی طرف اس طرح کھینچ لیتا ہے جس طرح متناطیس لوہے کو۔ میں خود بھی لکچر دینے کے مرض میں مبتلا ہوں اور بہت جگہ اپنا نامہ اعمال بغل میں لے کر یہ کہتا ہوا پہنچتا ہوں ع

من نیز حاضرے شوم تصویر جانناں در بغل

لیکن جو خوبی آپ کے کلام میں ہے اور جو کشش آپ کے لکچر میں ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ حضرات! اس کی دلیل یہ ہے کہ بحیثیت پریسڈنٹ آپ کو معلوم ہے کہ جو حکم پریسڈنٹ کو اُس کو ماننا ضرور ہے۔ جناب مولانا ندیر احمد صاحب کا لکچر پروگرام میں کل ہونا قرار پایا ہے لیکن اس کو جانکریں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ اگر آپ کو اُس کے سُنانے سے منع کیا جائے تو کیا آپ لوگ مانینگے (آواز اُٹتی نہیں نہیں کبھی نہیں)۔

حضرات! چونکہ کانفرنس کل ہی ختم ہو جائیگی۔ اس لئے امید ہے کہ آپ سب صاحب آٹھ بجے صبح کے تشریف لے آئینگے۔ اور جو وقت آپ کا اس لکچر کے سُنانے میں صرف ہوگا اُس کو چارپانچ منٹ سے زیادہ نہ سمجھیں گے۔

نمبر ۳۰

ایچ

یہ ایچ نواب صاحب بہادر نے ۲۹ دسمبر ۱۸۹۵ء کو شاہجان پور کے اجلاس کا نقش
میں بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کے منشی تصدق حسین صاحب کی تقریر کے جواب میں (جو
انہوں نے مولانا نذیر احمد اور دیگر حضرات کی نظموں کے موثر ہونے کے نسبت فرمائی
تھی) کی :-

حضرات !

آپ نے فرمایا ہے کہ بعد سننے مولانا کی نظم کے میرے دل میں قومی ہمدردی کا جوش پیدا ہوا
اور اس کی وجہ سے انہوں نے تکمیل مسجد کے لئے ایک چندہ دیا۔ لیکن یہ توف آگیا ارشاد تھا، اگر ان
کے دل میں قومی محبت نہ ہوتی تو ایک لکچر کیا، ایک نظم کیا، اگر ایسے ایسے بہت سے لکچر اور بہت سی نظمیں
سنستے، تاہم ایسا نمونہ جیسا کہ انہوں نے اس وقت قائم کیا ہے کبھی قائم نہ کر سکتے۔ آپ نے فرمایا ہے
کہ اس چندے کے حصے کئے جاویں۔ اور ان کا ثواب خدا تعالیٰ ہم لوگوں کو دے، لیکن ابھی ہم زندہ
ہیں اس کو بعد مرنے کے منحصر رکھنے۔ خدا چندہ مسجد کے ثواب میں حصہ تقسیم نہ کرے گا۔ اگر آپ کسی اور کام میں چندہ
دیتے تو شاید اس کا ثواب ملنا بھی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کا چندہ مسجد میں لگیگا اور خدا کی عنایت سے
اس کا ثواب بھی آپ ہی کو ملیگا +

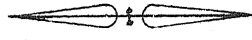
حضرات ! منشی تصدق حسین صاحب نے جن نظم کا انرا اپنے دل پر بیان کیا ہے وہ مولانا حافظ نذیر احمد
صاحب نے اس وقت تیار کی تھی، جب کہ ہمارا ڈیپوٹیشن مدرسہ علوم کے لئے چندہ جمع کرنے کو
پنجاب گیا تھا۔ اور اصل یہ ہے کہ ہمارے مولانا کی اسی نظم کا نتیجہ اور اثر تھا کہ ڈیپوٹیشن کامیابی کے
ساتھ واپس آیا۔ آج جس وقت مولانا اپنی نظم پڑھ رہے تھے اس وقت مجھے کچھ اشعار یاد آ گئے جو ہم پر
اور ہمارے حال پر صادق آتے ہیں :-

مفسرین آمدہ در کوئے تو شئی دلہ از جمال سوئے تو

ہاں یہ نقد ہے بدرویشان خود کہ ہمیشہ لطف و رحمت خوئے تو

یہ اشعار حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہیں لیکن چونکہ سرور پاک ہمیشہ اور ہر جگہ
موجود ہیں، اس لئے ہم یقین کرتے ہیں، کہ خدا کی رحمت ہم گدایان بے نوالے شامل حال ہوگی
سر سید کہتے ہیں :-

دست بکشاجانب زنبیل ما آفریں بردست بر بازوے تو
 اُسی اثر سے جو اسلامی حثیت نے آپ کے دلوں پر ڈالا، آپ نے دست ہمت پڑھایا اور اپنی قوم کی
 مدد کی۔ درحقیقت مدد کرنے والے بھی آپ ہیں، اور شکر گزار بھی آپ ہیں۔ کیونکہ آپ نے ایک جیب
 سے اور دوسری جیب میں ڈالا۔ یہاں شاکر بھی آپ ہیں اور مشکور بھی آپ ہیں۔ داعی بھی آپ ہیں
 مدعو بھی آپ ہیں *



نمبر ۳۱

اپنی سچ

یہ ایسیچ نواب صاحب بہادر نے ۲۹۔ دسمبر ۱۸۹۰ء کو شاہجہان پور میں بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے
 محفل مہکوشینل کانفرنس کے منشی فضل علی صاحب کی تحریری تقریر کی نسبت فرمائی۔

حضرات!

آپ نے اس مضمون کو اس عا پر ختم کیا ہے کہ خدا سرسید کی عردراز کرے تاکہ جو درخت انہوں
 نے لگایا، اس کو پھل پھول لاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوں مگر میں دیکھتا ہوں کہ وہ دعا قبول ہوئی۔
 کیونکہ یہ وہی پھل پھول ہیں، جن کے سرسید متلاشی ہیں، خواہ آپ ہوں یا ایسے دوسرے تعلیم یافتہ
 نوجوان ہوں جو اپنی قوم کے لئے عزت اور افتخار کا باعث ہوں۔ جو لکچر انہوں نے پڑھا، اُس کی منکر
 وہ شمال و جافریقہ کے ریگستان کی ہماری قوم سے دیکھتی ہے، یا داگنی۔ ریگستان میں کچھ نظر نہ آتا
 ہو، کسی پھل پھول کا نام و نشان نہ ہو، اور یکایک اُس میں سے ریت ہٹا کر چمن لگا ہوا دکھائی دے
 تو اُس مسافر کے دل سے جس نے منزلوں کا سفر آفتاب کی تمازت میں کیا ہو، کوئی پوچھے کہ اس چمن
 کو دیکھ کر اُس کے دل کو کیا خوشی ہوگی۔ ہماری قوم ریت کا مندر ہے اور جو ترقی کی جھلک در جلو
 اُس میں نظر آتی ہے۔ وہ بمنزلہ چمن کے ہے۔ جب بادِ سموم کے جھوکوں اور گرم ریت کے طوفان
 میں ہم اس چمن کو دیکھتے ہیں تو اُس کے کھل جانے کا خوف آتا ہے اور دعا کرتے ہیں کہ کوئی اُس کی
 شادابی کی غرض سے پانی دینے والا میسر ہو۔ چونکہ ہم لوگ اپنی سی کوشش کر کے تھک گئے۔
 اور ہمارا وقت آخر ہو گیا۔ اگر کچھ امید ہو سکتی ہے تو ایسے نوجوانوں سے جیسے کہ منشی فضل علی صاحب
 ہیں۔ پس یس امید کرتا ہوں کہ جو خیال انہوں نے اپنے لکچر میں ظاہر کیا ہے اُس کو وہ عملی طور پر
 بھی کر دکھائیں گے اور اگر ہماری قوم کے بہت سے نوجوانوں میں جو مدارس سے تعلیم یافتہ ہو کر نکلتے ہیں
 یہی جوش اور یہی حوصلہ پیدا ہو گیا تو بہت جلد ہماری قوم کی حالت سنبھل جائیگی، اور وہ باعزت

نمبر ۳۲

اسپیج

یہ اسپیش بھی نواب صاحب بہادر نے ۲۹ دسمبر ۱۸۹۰ء کو بحیثیت پریزیڈنٹ نے محمد انجمن کاشمیری کانفرنس کے اہل شاہ جہاں پور کے شکریہ میں فرمائی :-

حضرات !

اس وقت مئی محمد اعلیٰ صاحب نے جو شاہ جہاں پور کی تاریخ سنائی اُس کا احسان ہم لوگوں پر جو دور دراز کر کے یہاں جمع ہوئے ہیں اس قدر ہے کہ اُس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ اس تاریخ کے سننے سے معلوم ہوا کہ ہماری قوم میں ایسے لائق فائق تاریخ لکھنے والے موجود ہیں۔ جیسے کہ مولوی محمد اعلیٰ صاحب ہیں۔ انہوں نے جن اختصار اور خوبی اور تسلسل سے واقعات کو بیان کیا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسے خشک مضمون کو ایسا تازہ اور شاداب کر دیا، کہ حافیہ میں سے کوئی شخص نہیں کھرا یا۔ بلکہ معلوم ہوا کہ آپ کوئی نظم پڑھ رہے ہیں۔ سب نے اُس کو شوق سے سنا۔ ہم لوگ جانتے تھے کہ شاہ جہاں پور ایک شہر ہے، مگر یہ اچھی طرح نہیں جانتے تھے، کہ شاہ جہاں بگم کا آباد کیا ہوا ہے یا شاہ جہاں بادشاہ کا۔ شاہ جہاں پور کے افغان مسلمانوں میں اس قوم کے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی شجاعت اور دلیری سے اسلام کا سکہ بجایا۔ جنہوں نے ہندوستان میں سب سے اول اسلام کا ڈنکا بجایا اور انہی کے سبب سے اسلام ہندوستان میں آیا۔ اس تاریخ کے سننے سے معلوم ہوا، کہ شاہ جہاں پور ہندوستان میں افغانوں کا ایک خطہ ہے، جہاں ایسے شجاع و فادار موجود تھے، جنہوں نے گورنمنٹ کی وفاداری کے مقابلہ میں اپنے باپ کا خیال نہ کیا اور میں دیکھتا ہوں کہ افغانوں کی بہادر قوم میں اب تک وفاداری کا یہ جو ہر موجود ہے۔ مجھے امید ہے کہ بائیں شاہ جہاں پور کی اس نصیحت کو جو اُس نے مرتے وقت اپنے بیٹے کو کی تھی، شاہ جہاں پور کے افغان اپنے دل پر نقش کرینگے۔ اور چونکہ اب شجاعت کا وقت نہیں رہا، اور ان میں شجاعت کا جو ہر موجود ہے، اس لئے مجھ کو امید ہے کہ جہان شاہ جہاں پور اُس بزرگ کی نصیحت پر عمل کرینگے اور اگرچہ ہر شجاعت دکھانے کا وقت نہیں ہے، مگر وہ تعلیم پا کر جو ہر قابلیت دکھلاوینگے اور تلوار کی جگہ اب قلم سے اپنی دلیری اور بہادری کا اظہار کرینگے۔ اس تاریخ کے سننے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بہادر

افغان، علاوہ مردانگی اور دلیری کے وفادار اور ثنابت قدم بھی تھے۔ میں اب بھی اُسی وفاداری اور ثنابت قدمی کا اثر بزرگان شاہ جہاں پور میں دیکھتا ہوں۔ مجھے مولوی محمد ساجد صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ ہمارے بزرگ میزبان نے جن کے عالیشان گھر میں ہم آرام پارہے ہیں۔ جب سنا کہ یہاں کے بعض لوگ کانفرنس سے مخالفت کرتے ہیں۔ اور اس مخالفت کے اثر سے کانفرنس کے بعض منتظم بیدل ہوتے جاتے ہیں، تو اُنہوں نے بلا کر اُن کو کہا کہ تم مخالفت کی پروا نہ کرو۔ میں خراج دوں گا۔ اور تم مخالفوں کا چندہ واپس کر دو، شکستہ دل ہونے اور مایوس ہو جانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ علاوہ اس کے اُنہوں نے جب کہ مخالفت کی صدا اُن کے کان میں پڑی، علانیہ اعلان کیا کہ یہ لوگ مجھ پر لعنت کرتے ہیں اور اغوا کرتے ہیں کہ میں کانفرنس کا اجلاس اپنے مکان میں نہ ہونے دوں۔ اور کانفرنس کے میزبانوں کو اپنے مکان میں نہ ٹھیراؤں۔ لیکن جب تک مجھے میں دم باقی ہے میں اپنے اس ارادہ سے باز نہ آؤں گا۔ ہمارے خمدوم اور بزرگ میزبان اُس وقت بیار تھے اُنہوں نے کہا کہ میں اپنی اولاد کو وصیت کرتا ہوں کہ کانفرنس میرے گھر میں ہو +

شاہ جہاں پور کے بہادر افغانو! جب تم میں دلیری اور مردانگی وفاداری اور ثنابت قدمی کا یہ جوہر موجود ہے، تو مجھ کو یقین ہے کہ جس طرح تم نے اس سے پہلے شجاعت کا جوہر دکھایا ہے اور بذریعہ شہر ملکوں پر فتح حاصل کی ہے اسی طرح تم جہالت کے دشمن پر فتح حاصل کرو گے اور علم کے مولوں ناموری اور شہرت پیدا کرو گے +

نمبر ۳۳

اسپیج

یہ اسپج نواب صاحب نے ۲۷ دسمبر ۱۹۹۶ء کو محمد نواز کونسل کا اجلاس یا مذہم منقذہ میرٹھ میں

نواب عارف نواز صاحب کے پریزینٹیشن کے جانے کی نسبت فرمائی :-

حضرات! مجھے اس کانفرنس کی بہت سی خدمات انجام دینی پڑی ہیں۔ اور وہ خدمات کبھی رنج آمیز اور کبھی

سرت خیز ہوتی تھیں، مگر آج مجلس انتظامیہ کی طرف سے جو خدمت مجھے سپرد ہوئی ہے، وہ دونوں طرح کی ہے۔ رنج آمیز تو اس لئے کہ میں اعلان کرتا ہوں اور آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ اس مجلس نے اول ساری قوم کے معزز اور ہمدرد بزرگ جناب سحرار محمد حیات خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی کو پریسڈنٹ تجویز کیا تھا۔ اگرچہ اس وقت جناب مدوح نے نہایت عذر کیا تھا اور خود مجھے لکھا تھا کہ میں نہایت خوشی سے تمام کام انجام دوں گا اور کانفرنس میں بھی آؤں گا، لیکن جہاں تک ممکن ہو سکے اس بارگراں یعنی صدر انجمن کی خدمت سے مجھ کو معاف کیا جائے سید صاحب نے اپنی کڑی پسے اٹھ کر کہا کہ سحرار صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ مولوی محمد علی صدر انجمن کئے جائیں۔ لیکن آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ایسے شخص کا عذر جیسے کہ سحرار محمد حیات خاں بہادر ہیں، کون قبول کرتا۔ اور اس درخواست کو منظور کر کے اس بارگراں کو دوسرے کے سر پر ڈالا جاتا۔ اور کون شخص اُن سے بہتر اس جلسہ کے لئے منتخب ہو سکتا تھا، کیا بلحاظ تجربہ اور لیاقت کے، اور کیا بخیاں پوشش ہمدردی کے، اُن سے بہتر انتخاب شکل تھا۔ لیکن بعد اس کے ایک نہایت دردناک واقعہ پیش آیا، اور ایک ناگوار سانحہ گر اجوا آپ جانتے ہیں۔ جب اس دلخراش واقعہ کی اطلاع کمیٹی انتظامیہ میرٹھ کو ہوئی تو کمیٹی تنظیم نے غم خیال کیا کہ سحرار صاحب کا جو خیال اس بارگراں صدر انجمن سے سبکدوش ہونے کا ہے اب پورا کیا جائے، چنانچہ اُس نے ایسے اخیر وقت میں کہ نئے پریسڈنٹ کا تجویز کرنا مشکل تھا چارنا بھجو ایک سید امیر حسن خاں بہادر کو، دوسرا نواب محمد اسحق خاں بہادر وزیر عظم ریاست رامپور کو، تیسرا آئیزیل مہر علی عبداللہ دہسری ممبر مجلس لیڈو کونسل بمبئی کو، ان تینوں جگہ سے احکار ہووا، لیکن چوتھے شخص نواب عہد الملک نے جن کا بیارنامہ مولوی سید حسین بلگرامی ہے، اور جن کی منظوری کی نسبت بسبب فاصلہ دراز کے نہایت اندیشہ تھا کہ شاید وہ بھی تشریف نہ لادیں اور خواہش پوری نہ ہو، مگر انہوں نے باوجود عہدیم الفرصتی اور کثرت کار بار کے اس اجلاس کا پریسڈنٹ ہونا منظور کیا، اور سید صاحب کو تار دیا کہ وہ آنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن چونکہ نواب صاحب مدوح کے آنے کے لئے پیشگاہ حضور نظام سے اجازت ہونی ضروری تھی اس لئے جب تک نواب صاحب کا دوسرا تار آئے۔ وہ زمانہ عجیب کشمکش میں گزرا۔ خصوصاً سید کو نہایت فکر تھی۔ آخر بعد انتظار شدید کے دوسرا تار آیا کہ ہنرآنس حضور پر نور دام اقبال نے اُن کی رخصت کو منظور کر لیا ہے اور وہ آنے والے ہیں۔ چنانچہ یہ امر قرار پا گیا کہ اس سال کے لئے پریسڈنٹ نواب عہد الملک تجویز ہوئے۔ اس کی اطلاع جناب سردار محمد حیات خاں بہادر کو دی گئی، سردار صاحب نے نہایت خوشی سے اُن کے تقرر کو پسند کیا اور لکھا کہ اُن سے زیادہ لائق اور قومی کاموں کا بوجھ اٹھانے والا اور کانفرنس کا اعلا درجہ کا مدد معاون دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اب جو خدمت کمیٹی انتظامیہ کی طرف سے مجھ کو سپرد ہوئی ہے وہ سرت خیز اس لئے ہے میں اعلان کرتا ہوں کہ کمیٹی تنظیم کی طرف سے اس

کانفرنس کے صدر نمبر مقرر ہوئے۔ اور جو خوشی اور عزت اور فراس کیا رھویں اجلاس کانفرنس کو ان کی ذات سے حاصل ہوا ہے، وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اور جو لیاقت اور محنت اور فصاحت و بلاغت کا نمونہ وہ حاضرین اجلاس کے سامنے پیش کرینگے، وہ ہماری کانفرنس کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہوگا، اور وہ فصلی اور خیالات جو جناب ممدوح آپ پر ظاہر کرینگے، ان سے ہماری اس کانفرنس کے ممبران موجودہ اور آئندہ کو بلکہ تمام مسلمانوں اور ان کی آئندہ نسلوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اب میں کمیٹی انتظامیہ کی طرف سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوں۔ اور کانفرنس کو عزت بخشیں۔



نمبر ۳

اسپیچ

یہ مختصر اسپچی بھی نواب صاحب بہادر نے اجلاس میرٹھ ۱۸۹۶ء میں ۲۴ دسمبر کو سالانہ رپورٹ کانفرنس کی نسبت فرمائی :-

حضرات !

آپ کے معزز سرکٹری چاہتے ہیں کہ جو رپورٹ سالانہ کانفرنس کے پچھلے اجلاس کی انہوں نے تیار کی ہے، وہ اپنی زبان مبارک سے آپ کو سنائیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ ان کی صحت قابل اطمینان نہیں ہے، اور وہ اس قابل نہیں ہیں کہ آپ کے سامنے دیر تک کھڑے ہو کر اپنی رپورٹ پڑھ سکیں۔ اس لئے میں یقین کرتا ہوں، کہ آپ اس امر کی اجازت دیجئے، کہ کوئی دوسرا شخص اس رپورٹ کو پڑھ کر سنائے۔ جس کی آواز بلند ہو، اور دُور پہنچ سکے۔ اور وہ سید صاحب کے دوست مولوی وحید الدین صاحب سلیہ ہیں، جو آپ کو با آواز بلند یہ رپورٹ پڑھ کر سنائیے۔



اسپیج

یہ اسپیسج نواب صاحب بہادر نے ۲۶ دسمبر ۱۸۹۹ء کو اجلاس باز دوم عثمانیہ کونسل کانفرنس منعقدہ میٹھ میں نسبت پرورٹ سیکرٹری کے بطور ریبارکس کے فرمائی :-

میں حسب حکم جناب پریسیڈنٹ کے اپنے معزز اور محترم سیکرٹری کی رپورٹ پر ریبارک کرتا ہوں۔ اگرچہ میرے ضمیمہ سے دورہ کی کیفیت اور میرے خیالات آپ پر ظاہر ہو گئے ہیں مگر خاص سیکرٹری کی رپورٹ پر میں کچھ کہنا چاہتا ہوں شاید وہ شروع میں مخالفانہ معلوم ہو، مگر اصل مخالفانہ نہیں ہے۔ جس طرح کسی نسخہ میں کوئی حکیم گرم دوا لکھ دے۔ اور دوسرا حکیم اُس کے معتدل بنانے کے لئے سرد دوا ملائے تاکہ اُس کی حدت کو کم کرے۔ اسی طرح میں نے اس نسخہ میں گرم دواؤں کے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ہے۔ سر سید نے اس موقع پر کہا کہ حضرت کہیں معاملہ سرد نہ ہو جائے، فقہ و چیر (آپ لوگوں نے اس رپورٹ کو غور سے سنا، اور میں نے بھی اُس پر تامل کیا، مگر جو عجیب منطق اُس میں استعمال کی گئی ہے، اُس کو میں سمجھنا چاہتا ہوں۔ اس اعتراض کی تردید میں کہ کانفرنس کچھ نہیں کرتی، آپ نے عجیب منطق استعمال کی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ کانفرنس سب کچھ کرتی ہے، مگر ممبران کانفرنس کچھ نہیں کرتے۔ اگر کانفرنس ایک جدا مفہوم ہے اور ممبران کانفرنس جدا، تو کانفرنس اس الزام سے بری، اور ممبران کانفرنس اس الزام کے مستوجب نہیں نہیں جانتا کہ آپ نے کانفرنس اور ممبران کانفرنس میں جو فرقہ اور امتیاز پیدا کیا ہے، اُس کا کیا سبب ہے، غالباً کانفرنس سے مراد سیکرٹری کی ذات مبارک ہوگی (سر سید نے تبسم کیا) اگر اس لفظ سے سر سید احمد خاں کی ذات مراد ہے تو بلاشبہ میں اُن کو اس الزام سے بری کرتا ہوں۔ میرے خیال میں بھی یہی مراد یعنی شاید صحیح ہے اور چونکہ سر سید ہی کانفرنس کی روح رواں ہیں اس لئے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ کانفرنس نے سب کچھ کیا اور میری طرح اس الزام سے غالباً سب اُن کو بری کرینگے۔ کیونکہ جو عملی کارروائی انہوں نے خود کی ہے اور جس کارروائی کے نتائج نمایاں اور ظاہر ہیں اُس کے بعد کوئی اُن پر الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ عملی کارروائی نہیں کرتے۔ مگر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں اُن کی مراد یہ ہے کہ آپ نے جس قدر کیا وہ کم ہے۔ اس اعتراض کی تردید میں آپ دو نظریں پیش کرتے ہیں۔ یعنی اول ایک کونسل سینسر۔ دوم ایک کونسل ڈپارٹمنٹ اور فرماتے ہیں کہ ان عمدہ اور مفید تجویزوں کی امداد ممبران کانفرنس

اور قوم نے نہیں کی۔ حالانکہ قوم سے اس کے لئے بار بار درخواست کی گئی۔ نقشہ تجویز کر کے بھیجے گئے۔ اتنا س نامے بھیجے گئے، لیکن کسی نے توجہ نہیں کی۔ میں اس کے جواب میں عرض کرتا ہوں کہ قوم کی حالت یہ ہے کہ اُس کو ایک دفعہ کی تحریک کافی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں جو قوم کی ہے، اُس کی اصلاح کا کام آسان نہیں ہے۔ مصلح قوم کا یہ کام نہیں کہ ایک مرتبہ درخواست کرے، یا ایک مرتبہ اتنا س نامہ بھیجے، بلکہ اُس قوم کو جگانے اور اُگسانے کے لئے شب روز مصروف رہنا چاہئے میرا اعتراض یہ ہے کہ کافر شمسواے ان چار دنوں کے (۳۶۵) دنوں میں کچھ نہیں کرتی۔ آپ نے جو یہ فرمایا ہے، کہ ہم قوم کی رسی کرنے کو جمع ہوتے ہیں۔ اور مردہ قوم کی فاتحہ پڑھتے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ مگر نتیجہ بھی ساتھ ہو جاتا ہے۔ آپ چار دن قوم کو اکساتے ہیں، اور وہ بھی چار دن اپنا جوش اور ولولہ ظاہر کرتی ہے۔ اس کے بعد وہی مثل صادق آتی ہے کہ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات آئے آپ کا بار بار قوم کو مردہ کہنا باوجود اس کامیابی کے جو آپ کو ہوئی ہے، بجا نہیں ہے۔ آپ خیال کیجئے کہ باوجود آپ کے مذہبی خیالات کی مخالفت کے قوم نے آپ کو وہ مدد دی جو غالباً مذہبی پیشواؤں کو بھی نہ دی ہوگی۔ اور یہی قوم کی زندگی کا عملی ثبوت ہے۔ یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ آپ ایسے بدیہی امر سے انکار کرتے ہیں۔ آپ کیونکر اس بات سے انکار کر سکتے ہیں۔ کہ وہ عظیم الشان کارخانہ جو علی گڑھ میں قائم ہے اور جس کو دیکھ کر سیاح و گنگ ہو جاتے ہیں۔ اگر تمام ہندوستان میں پھر کر دیکھئے، تو کوئی عمارت، پارسیوں، ہندوؤں، مرہٹوں، اور بنگالیوں، کی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی حالانکہ یہ اقوام دولت مند اور آسودہ ہیں۔ دیگر اقوام کو جانے دیجئے۔ وہ کام جو گورنمنٹ کی کوشش سے ہوئے ہیں۔ اُن کی مقدار چندہ اور مدد کو مدرستہ العلوم کے چندہ اور مدد سے مقابلہ کیجئے، باوجود اس کے کہ فرمانروایان ملک اور دولتمندوں اور رئیسوں نے خطاب یا تمغہ پانے کی امید پر بیدریغ روپیہ دیا، اور حقیقت میں ایک تجارت کی، مگر جب آپ اُن کاموں پر خیال کریں گے، اور اُن کی مقدار چندہ کا مقابلہ ہمارے چندہ سے کریں گے، تو آپ کو حیرت ہوگی، کہ یہ عظیم الشان کارخانہ کیونکر قائم ہو گیا۔ اگر قوم نے مدد نہ دی، تو کیا یہ کارخانہ آپ کی دعا سے قائم ہے۔ حالانکہ آپ عالم کے منکر ہیں (محققہ اور چیز) یا کسی بزرگ کی نراست سے قائم ہوا ہے حالانکہ آپ کو اس سے بھی انکار ہے (محققہ) کیا یہ کارخانہ عظیم الشان کوئی وجود حقیقی رکھتا ہے؟ یا طلسم و جادو اور محض نظر بندی ہے۔ حالانکہ آپ نہ طلسم و جادو کے قائل ہیں نہ نظر بندی کے (محققہ) جس وقت یہ خیال کیا جائے کہ جو کام آپ نے قوم سے لیا، قوم کی عادت، قوم کی رسم و رواج، اور قوم کے مذاق سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتا تھا، بلکہ شدید تعصب، شدید جہالت اُس کی مانع اور مزاحم تھی تو آپ نے جو تصرف مسلمانوں کے دلوں پر کیا اور جو فیاضی اور سخاوت ہماری قوم کے اعلیٰ درجہ

کے ٹیبیوں اور سندھین جاگوں سے لے کر ایک اونے مزدور نے دکھائی، اور درستہ العلوم کو مدد پہنچائی، اُس پر خیال کرنے سے حیرت پر حیرت ہوتی ہے +

حضرات! کیا یہ خیال کر کے بھی آپ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ قوم زندہ نہ تھی، کیا اس کو معلوم کر کے بھی آپ نسل سرسید کے قوم کو مردہ کہہ سکتے ہیں۔ حاشا وکلا قوم مردہ نہ تھی اور نہ ہے، بلکہ قوم ایک جسم رکھتی ہے، جس میں جان ہے۔ اور ایک دل رکھتی ہے، جس میں سخاوت و ہمدردی کے خیالات ہیں اور ایک باغ رکھتی ہے جس میں نیک بد سمجھنے کی طاقت ہے کیا آپ بھی سرسید کے کہنے سے قوم کو مردہ کہہ سکتے ہیں، اور کیا سرسید قوم کو مردہ کہنے کے لئے کوئی دلیل لا سکتے ہیں +

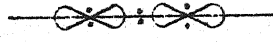
حضرات! جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا اور جن کا اعادہ ضرور نہیں ہے اس کا نفرنس کے عملی نتائج ظاہر ہونے میں شبہ نہیں مگر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں ان کو یہ سمجھنا کہ ہمارے مخالف ہیں اور وہ نرے حسد یا رشک یا حقارت سے اعتراض کرتے ہیں صحیح نہیں ہے۔ مخالفین کے اعتراضوں کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے، بلکہ منصفانہ طور پر قبول کرنا چاہئے۔ میں سرسید کی ذات کو ان اعتراضوں سے بری کرتا ہوں۔ ان کے سر پر جتنا بار ڈالا گیا ہے اور وہ جس قدر اُس بار کا تحمل کرتے ہیں، حقیقت میں نہایت حیرت انگیز ہے میں جیسا کہ پہلے کہ چکا ہوں، پچھتا ہوں کہ سال کے (۳۹۵) دن میں کچھ نہ کچھ کام کرنے سے ضرور بہت سا کام ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ صرف چار دن جلسہ کر لیا اور پھر نذر نلی۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اُس میں کامیاب ہو سکتے یا نہیں، مگر ایک مستقل اور دائمی کوشش کرنا لازم ہے۔ اگرچہ میں نے نہایت سچائی اور صفائی سے اس اعتراض کو کانفرنس پر قبول کیا اور خصوصاً میں اپنے آپ کو زیادہ گنہگار سمجھتا ہوں۔ مگر یہ کہ کانفرنس نے کوئی فائدہ قوم کو نہیں پہنچایا اور اُس کو قومی ناکامی ہوئی ایک لحظہ کے لئے بھی قبول نہیں کرتا۔ نہ میں ان پیچیدہ طبیعتوں سے اتفاق کرتا ہوں، جو ایسے بڑے کاموں کے نتائج کے لئے وقت کا انتظار نہیں کرتے اور نہیں دیکھنے کہ قوم کس درجہ اور کس حالت پر ہے، یہ سچ ہے کہ میں اس بات کی پیشین گوئی نہیں کر سکتا ہوں کہ پورے طور پر کامیابی ہوگی یا نہیں اور اس لئے جس منزل پر ہم پہنچے ہیں وہ بین الرجا و دالخوف ہے اور ایک تذبذب کی حالت ہے، مگر ہم اس وقت ایک تغیر اور انقلاب کی حالت میں ہیں۔ قوم اپنے ادباً و انکسبت کی حالت کو سمجھ چکی ہے اور قوم کے رفیقا مر اُس کی فلاح اور اصلاح کے لئے تیز رفتاری سے تڑپ رہے ہیں ان کو قومی ترقی کے لئے ایسی دادیوں میں رستہ نکالنا ہے، جن میں نہایت عمیق خندق ہیں اور سخت چٹانیں پڑی ہوئی ہیں ان کا ہموار کرنا آسان کام نہیں ہے۔ قوم کے مصلح ان کو صفا کر رہے ہیں۔ اگرچہ ناکافی مزدور ہیں، نہ کافی آلات ہیں۔ اور جو مزدور موجود ہیں ان کی خودیہ حالت ہے کہ کام کی طرف توجہ نہیں کرتے، مگر ہماری قوم کے رفقا مردوں کا سرگروہ جب کبھی مزدوروں کے

گروہ کو دیکھتا ہے خوش ہو جاتا ہے، یہ سچ ہے کہ جب وہ ان آلات میں جو ان چٹانوں کے توڑنے اور ان کو ہموار کرنے کے لئے درکار ہیں کسی قسم کا نقص پاتا ہے تو اس کو ضرور ایک افسردگی ہوتی ہے لیکن جب قوم کے مصلح نہایت استقلال و اور ثابت قدمی سے رستہ بنا رہے ہیں، گو نہایت تیزی سے نہیں اور ان کے کاموں کو کچھ مدد اور اعانت بھی پہنچتی جاتی ہے اور ہماری امید کچھ بڑھ جاتی ہے۔ تو ایسی حالت میں بجائے اس کے کہ ہمارا قومی پیشوا ہمارے دلوں کو ایک تازہ قوت پہنچائے اور ہمارے دلوں کو بڑھائے، جب ہم اس کی زبان سے لفظ ایوسی سنتے ہیں۔ تو ہماری انگلیں خود بخود دل میں رہ جاتی ہیں اس وقت ہم کو حیرت ہوتی ہے اور ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ اس خیال سے کہ جب ہمارا مصلح خود ایوسی ہے، تو وہ اے بر حال ہمارے ہم کو نہ مردہ قوم میں جان ڈال سکیں گے اصلاح کا کام آسان نہیں ہے، نہایت مشکل ہے، جن مصلحان قوم نے قوم کی فلاح کا بیڑا اٹھایا ہے ان کو طرح طرح کی مشکلات پیش آتی ہیں۔ جس کے لئے ہماری تاریخی روایتیں موجود ہیں، ہم اپنے بزرگوں کے طریقوں کو زندہ کر رہے ہیں، اور اس جو ہر کو جلادے رہے ہیں جو ہماری طبیعتوں میں موجود ہے۔ مگر رنگ آلود ہے، لیکن امتداد زمانہ نے یہ حال کر دیا ہے کہ ہم اپنی تاریخی روایتوں کو ایسا بھول گئے ہیں کہ بجائے اس کے کہ ان کاموں میں ہمارے ساتھ پیروی کریں یا ہمارا شکریہ ادا کریں، لوگ ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ اور ہمارے کاموں کو غیر کاموں کی تقلید سمجھ کر ہم کو کافور کا فرہماتے ہیں علاوہ اس کے ایک مشکل اور ہے کہ جو درجہ ہماری اصلاح کا ہے وہ ابتدائی ہے، اور ابتدائی درجہ کے لئے تغیر اور انقلاب ایک امر ضروری ہے۔ قوم اس انقلاب اور تغیر کو دیکھ کر حیران اور پریشانی پاتی ہے، اس کا یقین نہیں کرتی، اور نہیں مانتی، اور نہیں سمجھتی کہ اس وقت جو چیز ناگوار اور اذیت دہکھتی ہے وحشت دلانے والی ہے وہی آئندہ مفید ثابت ہوگی، اصلاح جب اپنے درجہ پر پہنچ جاتی ہے تو وہ بجائے وحشت اور ناگواری کے اطمینان اور تسلی دیتی ہے اور لوگ ان نتائج کو دیکھ کر مصلحوں کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ابتدائی حالت میں وہ انقلاب جس کی وجہ عام لوگوں کو نہیں معلوم ہوتی، ان کے دلوں میں پریشانی پیدا کرتا ہے، اور پریشانی اصلاح کو ترقی نہیں۔ اور ہم لوگوں کو جو کام کر رہے ہیں اس میں کافی مدد نہیں ملتی۔ ہم کو اپنی قوم سے کوئی عداوت نہیں ہے، ہم قوم کے دشمن نہیں ہیں، ہم کبھی نہیں چاہتے کہ لوگ ہم سے متنفر ہوں۔ لیکن مصلحان قوم بمنزلہ طیب اور فاجر کے ہیں طیب کیسا ہی مریض کو عزیز سمجھتا ہو اور اس سے ناراض نہ ہو۔ لیکن اس کی صحت اور ازالہ مرض کی خواہش مجبور کرتی ہے۔ کہ وہ نشتر لئے موجود ہے اور چاہتا ہے کہ ذیل کو کاٹ دے تاکہ مواد نکلیجائے ایسی حالت میں مریض کی وحشت اور پریشانی ڈاکٹر کو مریض کی نگاہ میں دشمن ثابت کرتی ہے۔ قوم کی حالت بھی بمنزلہ اس مریض کے ہے، ایک دن وہ آئینہ کا نفرت کی جگہ قوم مصلحان قوم سے محبت کر لے گی

جس کی کچھ علامت اب بھی موجود ہے کیونکہ پیشتر کی نسبت قوم کے مرض میں کچھ فائدہ ہو گیا ہے، اور اب وہ تندرست ہو چلی ہے اور کچھ لوگ اُس کی حالت کو دیکھ کر ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتے ہیں، اور امید ہے کہ قضاۃ علاج کا ہونا جاوے گا۔ ہماری جماعت بھی بڑھتی جاوے گی، اور قوم ہمارے ڈاکٹر کو عزت بخشتی جاوے گی ایک شکل قوم کی یہ ہے کہ وہ زمانہ کے رجحان اور رفتار سے ناواقف ہے، وہ نہیں سمجھتی کہ کن چیزوں کا حاصل کرنا ضرور ہے۔ زمانہ کی رفتار کیسی ہے، اور قومی زندگی اور قومی عزت قائم کرنے کے لئے کس کس چیز کی ضرورت ہے، اس وقت قومی زندگی اس بات پر منحصر ہے کہ ناطر معاشرت اختیار کیا جائے۔ آپ غور کریں کہ آج کل ہماری علمی حالت کیا ہے، ہمارا قدیم علم بیکار ہے، ہماری پڑائی تھکتا ہے، صحیح ثابت نہیں ہوئی۔ جو لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ اس وقت زمانہ کیا کر رہا ہے، وہ جانتے ہیں کہ سائنس جس کو مولوی نذیر احمد، مودی کہا کرتے ہیں۔ اُس نے ہمارے خیالات کی جڑوں میں سرنگیں لگا دی ہیں، ہمارے تمام پرانے خیالات کے حقائق اور دقائق کو ہوا میں اڑا دیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہم اعلیٰ تعلیم کی نصیحت نہ کریں، اور وہ تمام کوششیں جو غیر قومیں کر رہی اُن کی جانب قوم کو رجوع اور متوجہ نہ کریں۔ تو ہماری خواہش قومی زندگی کی ایک تنہا غلط ہوگی۔ یہ خیال کہ اعلیٰ تعلیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے پرانے عقیدے فاسد اور باطل ہو جائیں گے۔ یا ہمارا پرانا طرز معاشرت بگڑ جائے گا غلط ہے۔ اگر عقیدوں سے مراد اسلامی عقائد ہیں اور طرز معاشرت سے مراد معاشرت مراد ہے جو ہمارے مادی نے سکھائی ہے تو یہ خیال محض غلط ہے۔ اُن یہ سچ ہے کہ ہماری کوششوں سے ناپاک خیالات باطل ہو جائیں گے۔ مگر اعلیٰ تعلیم کی مدد سے اسلامی عقائد کو اور استحکام ہو جائے گا۔ اور جن قدر فطرت کے اسرار اور قدرت کے فاعلے منکشف ہونگے، اُسی قدر عقائد اسلام کا باطل ٹھیرانا ناممکن ہو جائے گا۔

ایحضرات! آخر کو میں اتنی بات پھر عرض کرتا ہوں اور اسی بحث پر پھر توجہ دلاتا ہوں کہ قوم کو مردہ کتنا سبب نہیں ہے جس کی میں ترمیم کرتا ہوں اور میں اس کے متعلق ایک دوسری مثال دیتا ہوں قوم کی حالت خزاں رسیدہ جامع کی سی ہے جس میں موسم بہار گزر گیا ہے خزاں آئی ہے پت جڑ ہوئے، پتی کچھ زرد ہیں کچھ سوکھ گئی ہیں کچھ گسے ہیں پانی جو مالتے ہے۔ اُس سے خشک ہونے والے درختوں کی رونق قائم رکھتی ناممکن ہے، لیکن وہ پانی رائیگاں نہیں جاتا کیونکہ جو درخت نہیں مرنے میں ایک طبعی قوت موجود ہے اُس کے پتے اگر رائیگاں تب بھی جب موسم بہار آئے گا اور خزاں گزر جائیگی تو اُس میں نئی کوپلیں نکلیں گی نئے پتے اور نئے پھول اور نئے پھل آجائیں گے۔ اور پھر باغ سرسبز و شاداب ہو جائے گا۔ قوم ایک سوکھا درخت ہے مگر وہ خزاں رسیدہ ہے۔ اور اس لئے بجائے یا لوس ہونے کے ہم کو امید کرنی چاہئے کہ خزاں کی حالت ایک دن کافور ہوگی اور ہم پھر موسم بہار دیکھیں گے اور پھر اسی طرح خوش ہونگے۔ اگر سچ بول چھوے تو سید صاحب کو بھی ناامیدی نہیں ہے بلکہ اُن کا یہ فرمانا کہ قوم مردہ ہے ایک قوی ترغیب ہے تاکہ ہم قومی کاموں پر زیادہ

توجہ کریں اور ایک زبردست تحریک ہے تاکہ ہم اس منزل پر تیزی سے قدم بڑھائیں ورنہ وہ شخص جس کی علی سرگرمی انظر الشمس ہو، اور جو تغیر اور انقلاب ہو رہا ہے وہ اس سے کما حقہ واقف ہو، اور جس کی امید بھی نہایت مستحکم ہو جو لحدین لاور کلا یزال ہے، اور جس کو ہر وقت قوم کی بہبودی اور ترقی اور اصلاح کا خیال ہو، اور جس کا دل ہر وقت قومی زندگی اور قومی عزت حاصل کرنے کی امید میں تھلا رہا ہو۔ بلکہ اصل رہا ہو اس کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ حقیقت میں دل سے سمجھتا ہے کہ قوم مردہ ہے اور اس میں زندہ ہونے کی قابلیت نہیں ہے، محض غلط ہے۔ اس کی زبان کہہ رہی ہے کہ قوم مردہ ہے مگر اس کا دل چلاتا ہے کہ خون گردش میں اور اعضا جنبش میں ہیں گو کہ وہ گردش سست ہو، اور وہ جنبش عام و گول کو محسوس نہ ہوتی ہو۔ اسی شہادت پر ہم یقین کرتے ہیں کہ ہماری قوم زندہ ہے اور اس میں کام کرنے کی قابلیت ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایک دم سے بجلی کے تار اس کے اعضا سے ملا دیں اور اس کے خون کو نیز گردش میں لائیں تاکہ وہ اٹھے اور اپنے ہاتھ پاؤں سے حرکت کرے اور دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ ترقی کے میدان میں دوڑنے لگے۔



نمبر ۳۶

اپنی سچ

یہ اپنی سچ نواب صاحب بہادر نے ۲۷ دسمبر ۱۹۶۶ء کو خط لکھ کر کیشنل کانفرنس منعقدہ میرٹھ میں رزولیشن نمبر ۱ کی نسبت فرمائی۔ رزولیشن کی نقل بھی دیکھیں گے لئے ذیل میں درج ہے:-

رزولیشن نمبر ۲

اس کانفرنس کی یہ راسے ہے کہ چونکہ سال حال وہ مبارک سال ہے جس میں ہماری عادل اور مہربان قیصر لاہند امپرس و کٹو یادام اقبال کا زمانہ سلطنت تمام گزشتہ شانہ انجکستان سے بڑھ گیا ہے مسلمانان ہندوستان کو لحاظ اس امن و آسائش و امنادی اور ہر قسم کی پیشاب رکتنوں کے جو ان کو اس عہد مصلحت میں مل رہی ہیں واسطے انھار اپنی سچی خوشی اور صادق مسرت کے جو ان کو اس مبارک وقت کے دیکھنے سے ہوئی ہے ایک دائمی یادگار اس مبارک سال کی قائم کرنی چاہئے۔

نیز اس کانفرنس کی یہ راسے ہے کہ اس مبارک یادگار قائم کرنے کے واسطے اسٹینڈنگ کمیٹی

کے چند ہونا چاہئے اور جو احباب سو روپیہ یا سو روپیہ سے زائد چندہ دیں اُن کے نزدیک سترہ
العلوم مسلمانان علیکدھ میں اسٹیوٹی ٹال میں کندہ کر کے نصب کرنے چاہئیں اور جو سرمایہ اس طرح
سے جمع ہو اُس کی آمدنی سالانہ سے اس مبارک سال کی ایسی یادگار قائم کی جاوے جس سے
مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کو نامزدہ پہنچے اور اس مبارک یادگار کے فیض سے مسلمانوں کے دلوں میں
یُسرت ناک یادگار ہمیشہ تازہ رہے یعنی اس روپیہ سے ایسے مسلمان طلباء کو وظائف اور بیڈل
طلائی دئے جاویں، جو یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانات میں عربی زبان کو بطور سیکنڈ لینگویج کے
لیکچر لفٹ سے کامیاب ہوں اور رٹسٹیان مدرسۃ العلوم علیکدھ سے ہستدعالی جاوے کہ
بعد جمع ہو جانے ایسے سرمایہ کے وظائف کے نام ایسے مقرر کریں اور بیڈل پر ایسا مضمون کندہ
کرائیں جس سے اس مبارک یادگار کے قائم کئے جانیکا مقصد پورا ہو +

جناب صدر انجمن و مہمان کانفرنس! گیارہ سال کی کارروائی میں جو ہماری کانفرنس نے کی ہے اس وقت
کارزولیشن، جس کو سردار محمد حیات خاں بہادر نے پیش کیا ہے نہایت ضروری اور متمم الباشان ہے
اور آج جس امر پر بحث ہو چکی ہے یعنی ہماری کانفرنس کو عملی کارروائی پر زور دینا چاہئے۔ اُس کے ثبات
کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسری تجویز نہیں ہو سکتی تھی۔ (چیرز)

جناب سردار صاحب آپ نے جو رزولیشن پیش کیا ہے اُس سے حقیقت آپ نے
ہر طبقہ کے مسلمانوں کی دلی خواہش کو ظاہر کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہر صوبہ کے مسلمان خواہ وہ اسلام
کی حقیقت سے واقف ہوں یا براے نام مسلمان ہوں، آپ کی اس مبارک تجویز سے دلی اتفاق کریں گے
جو شریک رزولیشن میں درج کی گئی ہیں اُن سے آپ کی رضامندی، عالی دماغی اور اسلامی ہمدردی
معلوم ہو سکتی ہے۔ میں نے جب اس رزولیشن کو دیکھا اور آپ نے مجھے اُس کی تائید کرنے کا حکم دیا
تو میں نے اُس کو فوراً منظور کر لیا، اور اس کی تائید کرنے کو اپنا قومی فرض سمجھا۔ اس رزولیشن سے
پہلا مقصد یہ ہے کہ ۲۰- جون ۱۹۴۷ء کو جو شخصت سالہ حکومت ہماری عادل فرمانروا حضرت مغلہ مظفر قیصر
کی پوری ہونے والی ہے اُس کی خوشی کے اظہار کرنے کے لئے ایک یادگار ہم مسلمانوں کو قائم کرنی چاہئے
کیونکہ حضور پرنور کے عہد عدالت مہد میں ہم نے اپنی کھوئی ہوئی عزت کو دوبارہ حاصل کرنے کا موقع پایا ہے اور
ہم کو ہر قسم کی بے ہودی اور ترقی کرنے کے وسائل حاصل ہوئے ہیں، اس لئے بحیثیت ایک فادار رعایا ہونے
کے ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس خوشی میں دل سے شریک ہوں، اور اُس کی یادگار قائم کرنے میں
بیدریغ کوشش کریں (چیرز)

دوسرا مقصد جس نے اس سرت کو دوبالا کر دیا ہے اس رزولیشن سے یہ ہے کہ اُس شخص سے
جو یادگار کے لئے جمع کیا جائے اُس طالب علم کو جس نے انگریزی زبان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہو، اور

عربی بطور سیکنڈ لیکچر کے اختیار کی ہو۔ تمغہ دیا جائے اور اس سے مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی مذہبی اور دینی زبان کی قدر قیمت سے واقف ہوں اور اس کو مستحکم کرنے اور ترقی دینے کا ذریعہ بہم پہنچائیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ جو ہر ردا ان قوم اس نال میں موجود ہیں، وہ نہ صرف اس رزلویشن سے زبانی طور پر اتفاق کریں گے، بلکہ اپنی اپنی حیثیت کے موافق اس یادگار میں چندہ دیکر اس رزلویشن کی عملی تائید کریں گے۔ اگرچہ کانفرنس کے اجلاس میں چندہ کی مخالفت ہے اور ہم نے اس کو ضروری سمجھ لیا ہے کہ کوئی رقم چندہ کی نہ مانگی جائے، لیکن یہ صورت مستثنیٰ ہے۔ ہمارے معزز پروپوزر نے اس یادگار کی خدمت میں ایک ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اور ۲۰۰۰۔ جون ۱۹۵۷ء کو یہ رقم سکریٹری کے پاس پہنچ جائیگی۔ چونکہ تحریر کے سے توثیق کا درجہ کمتر ہے اس لئے میں بھی تاریخ مذکور پر پانسو روپیہ کا چندہ پیش کر دنگا (چیز دیر تک)۔



نمبر ۳

۱۔ اسپیش

یہ اسپیش نواب صاحب بہادر نے ۲۸۔ دسمبر ۱۹۹۶ء کو لندن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں منعقدہ میٹھ میں رزلویشن نمبر ۳ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی۔ رزلویشن حسب ذیل ہے :-

رزلویشن نمبر ۳

اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ جس جس ضلع میں لوکل اسٹینڈنگ کمیٹیاں قائم ہوتی جاویں اُن سے درخواست کی جائے کہ اپنے ضلع سے دس روپیہ ہزاری کا چندہ جس طرح ہو سکے ایک مسلمان طالب علم کی اسکا لرشپ کے لئے جو کسی کالج کی کالج کلاسوں میں پڑھتا ہو یا پڑھنا چاہے اور زمین اور لائق اور قابل ملاحظہ معلوم ہو وصول کریں اور جس کالج میں وہ پڑھتا ہے پڑھائے اور لوکل اسٹینڈنگ کمیٹی اس بات پر غور کرتی رہے کہ وہ بہت جلد اور یکساںی اس تعلیم میں مصروف

ہے یا نہیں +

جناب صدر انجمن حاضرین!

یہ رزلویشن جو پیش کیا گیا ہے، حقیقت میں ایک مقدمہ اس اعتراض کے دفع کرنے کا ہے جو کانفرنس جس گیارہ سال سے ہوتا رہا ہے۔ اور جس کا ذکر معزز سکریٹری نے اپنی رپورٹ میں کیا تھا اور جس کی میں نے مخالفت کی تھی (چیز) کو بحیثیت سکریٹری ہونے کے اُن کا یہ فرمانا کسی حد تک صحیح ہو

کہ قوم نے کچھ نہیں کیا، مگر میں بلحاظ اُس تجربہ کے جو مجھ کو اس فتنہ کے دورہ میں ہوا اُس کو کسی قدر صحیح نہیں سمجھتا (چیزیں میں یہ بات یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ ہر ضلع میں میرا استقبال اور محاذاری نہایت شان و شوکت کے ساتھ کی گئی اور بالخصوص مراد آباد میں جس شان و شوکت سے میرے پہنچنے پر استقبال کیا گیا اُس کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس شہر میں لفٹنٹ گورنر آئے ہیں (چیز) اسی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں میں قومی کاموں کی قدر کرنے کا مادہ موجود ہے۔ اگر ضرورت ہے تو اس مادہ سے کام لینے کی اور اُس قابلیت کو اکسانے اور حرکت میں لانے کی جو اُن میں پہلے سے موجود ہے۔

رزولیوشن پیش شدہ کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے وہ نہایت واضح ہے اور اس کے عملدرآمد سے قوم کی اعلیٰ تعلیم کو نہایت نائدہ پہنچے گا۔ اور بہت سے شخص فٹوٹھے عرصہ میں ایسے پیدا ہو جائیں گے، جن سے وہ عہدے جو اس وقت گورنمنٹ میں خالی ہیں سمور کئے جاسکیں گے۔ اگر ہر ضلع میں ایک شخص بھی اس رزولیوشن کے مطابق کوشش کرے تو ادنیٰ سے ادنیٰ ضلع سے دس پچہ ماہواری چندہ کر سکتا ہے اور اس صورت میں (۳۶) ضلع ممالک شمال مغرب سے (۳۶) مفلس طالب علم تعلیم پاسکتے ہیں۔ اور اگر پنجاب اور آودھ کو جس کو میں نے چھوڑ دیا ہے شمار کیا جائے تو ایسی ہی تعداد دہاں بھی ہتیا ہو سکتی ہے۔ اور ہر سال ایک نہایت معقول تعداد کے طالب علم اعلیٰ تعلیم کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے ہمسایہ کا وہ لفظ کہ ”قوم مردہ ہو گئی ہے اور سڑ گئی ہے“ قوم کے پرچوں اور باہمت مسلمان جو ہر جگہ موجود ہیں، اس رزولیوشن کے عملدرآمد میں کوشش کر کے دور کر دیں گے (چیز) سال کے ۳۶ دن باقی ہیں آپ صاحب کوشش فرمائیں تاکہ یہ داغ قوم کے دامن سے دھویا جائے اور یہ الزام رفع ہو، کیونکہ اگر ایسے مفید کام کے لئے قوم دس روپیہ یا ہوا بھی بہم پہنچا نہیں سکے، تو حقیقت میں قوم مردہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ سڑ رہی ہے جس کو کوئی کھا بھی نہیں سکتا۔ قوم مری ہوئی ہے اور اُس کا جنازہ رکھا ہے، مسلمانوں میں نماز جنازہ فرض ہے۔ اگر خدا نیکی دے تو کم سے کم نماز جنازہ تو پڑھ دیں کیونکہ وہ دس روپیہ بھی اپنی قوم کے مردہ کو کفنانے اور دفنانے کے لئے نہیں دیکھتی اب چاہے تجیر ہو نہ تکفین بلکہ پارسیوں کے مردہ کی طرح گدھا جا دیں تو بھی ذرا پروا نہیں کریں گے۔

میں امید کرتا ہوں کہ اس مفید رزولیوشن کے پاس ہونے میں کسی کو اختلاف نہ ہوگا اور ب صاحب بالاتفاق منظور فرمائیں گے۔

اسپیج

یہ اسپیش فوایب صاحب بہادر نے ۲۸- دسمبر ۱۹۹۶ء کو محمد علی کونسل کانفرنس کے اجلاس میں منعقدہ ریٹھیں رزلوشن نمبر ۱ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی۔ رزلوشن حسب ذیل ہے :-

رزلوشن نمبر ۱

اس کانفرنس کی یہ سلسلہ ہے کہ جو سیکشنیں اسٹے علی کارروائی کانفرنس کے تجویز کی گئی ہیں اور اجلاس سے منظور ہو چکی ہیں ان کے مقاصد کے لئے اگر کچھ روپیہ کے خرچ کی ضرورت ہو تو سیکریٹری کانفرنس کو جائز ہوگا کہ منظوری سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے بشرطیکہ کانفرنس فنڈ میں جو سیکریٹری کے ہاتھ میں بعد اخراجات ضروری کے باقی رہے گنجائش ہو اس کو خرچ کرے۔

حضرات!

یہ ایک ضابطہ کار رزلوشن ہے جس کے منظور ہونے پر اس عملی کارروائی کا ہونا منحصر ہے جس کا طریقہ اس سال سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی نے تجویز کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سنٹرل کمیٹی نے کانفرنس کو چار سیکشنوں پر تقسیم کیا ہے اور وہ حسب ذیل ہیں :-

اول سیکشن تعلیمی مردم شماری مسلماناں۔

دوم سیکشن مدارس ماتحت۔

سوم سیکشن تعلیم نسواں۔

چہارم سیکشن معاملات عام۔

یہ ظاہر ہے کہ کوئی سیکشن اپنا کام جاری نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ اس کے پاس کوئی نقد سرمایہ نہ ہو جس کو وہ اپنی ضروریات میں آزادی سے صرف کر سکے۔ شاید کانفرنس کے فنڈ میں بعد ضروری اخراجات کے بہت کم گنجائش رہیگی کہ ایسے مفید کاموں میں روپیہ صرف کر سکے لیکن جس قدر مدد ملتی ممکن ہوگی اسی قدر ہر سیکشن کو عملی کارروائی کے جاری کرنے میں آسانی ہوگی۔ چونکہ یہ رزلوشن ضابطہ کا ہے اس لئے اس پر زیادہ گھسنے کی حاجت نہیں ہے۔ میں تحریک کرتا ہوں کہ وہ بلا کسی اختلاف اور رد و بدل کے مختصر سی تائید کے بعد پاس کیا جاوے۔

اسپیج

یہ اسپیش نواب صاحب بہادر نے ۲۸- دسمبر ۱۸۹۶ء کو محمد علی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس یازدہم منعقدہ میرٹھ میں رزلویشن نمبر ۱۲ کی تحریک کرتے ہوئے فرمائی۔ رزلویشن حسب ذیل ہے:-

رزلویشن نمبر ۱۲

اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ جو رزلویشن گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی نے واسطے اجازت مذہبی تعلیم کے بشرائط خاص طاری کیا ہے۔ اس کے لئے گورنمنٹ موصوف کا شکریہ ادا کیا جاوے۔

حضرات!

غالباً آپ میں سے بہت سے صاحبوں کو اخبارات کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ مذہبی تعلیم کا مسئلہ ایک عرصہ سے پیش تھا اور نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب نے اس میں بہت کچھ پریشانی اٹھائی۔ وہ ایک عرصہ تک مینی تال پر رہے۔ غرض کہ بعد بہت سی بحث مباحثہ کے وہ اس بات میں کامیاب ہوئے اور گورنمنٹ نے مذہبی تعلیم کا ہونا ایک خاص شرط سے ہر اسکول میں منظور فرمایا۔ جس سے ہماری قوم کے بچوں کو نہایت فائدہ پہنچ گیا۔ چونکہ گورنمنٹ اضلاع شمال و مغرب نے ہم مسلمانوں کے ساتھ ایسی مہربانی فرمائی جس کا شکریہ ادا کرنا ہم پر فرض ہے۔ اس لئے یہ رزلویشن پیش کیا اور امید ہے کہ سب صاحب اس کو منظور کریں گے۔

اسپیج

یہ اسپیش نواب صاحب بہادر نے ۲۸- دسمبر ۱۸۹۶ء کو اجلاس میرٹھ میں رزلویشن نمبر ۱۱ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی۔ رزلویشن حسب ذیل ہے:-

رزلویشن نمبر ۱۱

اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ اجلاس پنجم محمد علی ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۸۹۵ء بمقام آلہ آباد

جو رزولیوشن جسٹیل پاس ہوا تھا کہ کم عمر بچوں کی تعلیم کا کوئی دستور العمل تجویز ہو کر شہر تک پہنچا تاکہ بچوں کے ربی اُس پر غور کریں اور بچوں کی تعلیم کا یکساں اور عمدہ طریقہ اختیار کریں جو ان کی تائیدہ عمر میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ چونکہ اس رزولیوشن پر غور کیا گیا نہیں ہوا۔ لہذا ایک خاص کمیٹی اس رزولیوشن کی تعمیل کے واسطے منعقد کی جاوے۔

حضرات!

میرے دوست منشی سراج الدین نے جو تقریر رزولیوشن کی تائید میں کی، اُس سے نہ صرف بانی تائید ہوتی ہے بلکہ عملی تائید ہوتی ہے۔ کنڈرگارٹن کا طریقہ جو ابتدائی تعلیم کے لئے تمام یورپ میں جاری ہے ملک جرمن میں ایجاد ہوا تھا۔ اس طریقہ سے بچوں کو مضمون اور ہر علم اور ہر فن کی تعلیم تصویروں اور کھلونوں کے ذریعہ سے دی جاتی ہے۔ یہ طریقہ نہایت مفید ہے۔ اور اس سبب بہت جلد بچوں کی عام واقفیت اور معلومات میں ترقی ہوتی ہے۔ جو ایک کم عمر بچہ اس رزولیوشن کے مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے تیار کی جائیگی معلوم نہیں وہ کیا ہو اور کیسی ہو، مگر اس میں شک نہیں ہے کہ اس اسکیم میں ایسے علوم اور فنون کا داخل کرنا ہی ضروری ہے جن کو کنڈرگارٹن کے طریقہ سے سکھایا جاوے۔ میں بھی اس رزولیوشن کی دل سے تائید کرتا ہوں۔

نمبر ۱۴

ایسیج

یہ ایسیج نواب صاحب بہادر نے ۲۸۔ دسمبر ۱۸۹۵ء کو اجلاس میرٹھ میں نواب زادہ نصر اللہ خاں صاحب کے انگریزی لکچر کے فکر میں فرمائی :-

حضرات!

ہماری کاتھولکس کے جو ممبر انگریزی جانتے ہیں، انہوں نے بالخصوص نواب زادہ نصر اللہ خاں کے لکچر سے لطف اٹھایا ہوگا، مگر جو انگریزی تعلیم نہیں جانتے ان کو بھی نواب زادہ کے لب لہجہ سے یہی معلوم ہوا ہوگا کہ لکچر نہایت فصیح و بلیغ اور اعلیٰ درجہ کا تھا اور لکچر کی ڈیلیوری بھی نہایت عمدہ تھی۔ نواب زادہ ممدوح نے جو لکچر دیا اُس سے ہمارے طالب علموں پر نہایت عمدہ اثر ہوا ہوگا۔ اور وہ ضرور خیال کرتے ہوں گے کہ سرسید جس اعلیٰ تعلیم کی تائید کرتے ہیں اور بار بار اُس کا راگ گایا کرتے ہیں۔ نواب زادہ ممدوح اُسی اعلیٰ تعلیم کا نمونہ ہیں۔ ان کو نواب زادہ ممدوح کے لکچر سے سبق

لینا چاہئے کہ اعلیٰ تعلیم کس کو کتنے ہیں؟ اور انگلش زبان کی آریٹری اور فصاحت و بلاغت کیا چیز ہے؟

حضرات! ہمارے عزیز دوست نواب زادہ نصر اللہ خاں، محمد امین رونجی، کے عزیز ہیں۔ جنہوں نے ہمارے کالج کے لئے اول پانچ ہزار روپیہ دیا تھا جس کی آمدنی سے آج تک اسکالرشپ دیا جاتا ہے۔

میرے عزیز سید محمود نے جو نواب زادہ مدوح کی اعلیٰ درجہ کی انگریزی تقریر کیلئے ووٹ آف تھینکس پروپوز کیا ہے، میں اُس کی تائید کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تمام جلسہ اس کو منظور کرے گا۔

نمبر ۴۲

ایسیج

یہ ایسیج نواب صاحب بہادر نے ۲۶- دسمبر ۱۸۹۶ء کو اجلاس محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ میرٹھ میں اخبار ابرور، کی نسبت فرمائی۔

حضرات!

جس بات کی قوم کی ضرورت بلکہ اشد ضرورت ہے اور جس کے بدون گورنمنٹ تک کوئی اتجاہ نہیں پہنچ سکتی، وہ ایک انگریزی اخبار کی ضرورت ہے (چیز) اگرچہ اردو میں متحدہ اسلامی اخبارات ہیں جن میں بعض کی اشاعت بہت زیادہ ہو گئی اور ہوتی جاتی ہے اور ان میں سے میں بہت خوشی کے ساتھ پیسہ اخبار کا نام لیتا ہوں (چیز) مگر انگریزی اخبار کی ضرورت نہایت زیادہ ہے۔ اس واسطے کہ میں مسلمانوں کے چند انگریزی اخبار ہیں۔ لیکن صوبہ غرب و شمال اور پنجاب میں کوئی انگریزی اخبار نہ تھا زندہ دل پنجاب نے جس کو سرسید نے خوب سوچا اور سمجھا کہ زندہ دل کہا ہے، اس میں بھی سبقت کی اور پنجاب ابرور جاری کر دیا (چیز) اُس کے مالک اور سب اڈیٹر کو میں پیش کرتا ہوں۔ چنانچہ مالک اخبار پنجاب ابرور شیخ عبدالقادر صاحب سب اڈیٹر اجلاس کے سامنے پیش کئے گئے جس پر چیز کے نعرے بلند ہوئے۔

حضرات! اس اخبار کے مالک نے بلاذاتی غرض کے تیس ہزار روپیہ اس کام میں لگا دیا ہے مگر اے حضرات اخبار کے برابر جاری رہنے کے لئے اردو روپیہ کی ضرورت ہو اسلئے انگریزی خوان صحابہ

کو اس اخبار کی خریداری میں مدد دینی چاہئے۔ مدد مفت نہیں بلکہ اُس کے عوض میں سال بھر تک نیا
اُن کی خدمت گزاری کر لگیا (چیز) *

نمبر ۴۳

ایسیج

یہ ایسیج نواب صاحب بہادر نے ۲۹- دسمبر ۱۸۹۹ء کو منتظان کا نفرنس میرٹھ کے
شکرہ میں کی :-

حضرات !

مجھے کانفرنس کی طرف سے یہ خدمت سپرد ہوئی ہے کہ میں منتظان اجلاس کانفرنس کا
شکر یہ ادا کروں۔ میرٹھ میں اس مجلس کا قائم ہونا زیادہ تر ہمارے دوست سید محمد میر صاحب کی
کوششوں اور جانفشانیوں کا نتیجہ ہے اور جو بے انتہا اعانت اور امداد اُن کو شہر میرٹھ کے رؤسا
سے پہنچی اور جو ہمدردی اور جوش یہاں کے رئیسوں نے ظاہر فرمایا، وہ بھی نہایت حیرت
انگیز ہے *

پچھلے گیارہ برس میں کانفرنس مختلف مقامات پر ہوئی، لیکن یہ اجلاس بہ نسبت دیگر اجلاسوں
کے زیادہ خوش نصیب ہے۔ سب سے زیادہ دل خوش کن اور عزت بخشنے والی بات جو اُس کی پہلی
خوش نصیبی ہے، ایک ایسے عالم و فاضل پریسڈنٹ کا انتخاب ہے جیسے کہ ہمارے نواب عابد الملک
ہیں۔ (چیز) دوسری خوش نصیبی یہ ہے کہ اُس کا اجلاس میرٹھ میں اور میرٹھ کے مسلمانوں کی مہمان نوازی
کے درمیان ہوا (چیز) *

ہمارے سرسید اور نواب عماد الملک کا جس سچے جوش اور شان و شوکت کے ساتھ
پلیٹ فارم پر استقبال کیا گیا، اُس سے میرٹھ کے رئیسوں کی بے انتہا ہمدردی اور زندہ دلانہ نظر تہ
ہے (چیز) اس کے علاوہ منتظان اجلاس نے ممبران کانفرنس کی ممانداری اور اُن کے آرام
آسائش کے لئے جو لگاتار محنت اور تکلیف اٹھائی ہے اور مقام اجلاس کو منتظم اور مزین کرنے
میں جو مستعدی اور جانفشانی اور سرگرمی دکھائی ہے، اُس کا بیان الفاظ میں ہونا مشکل ہے۔ ہم
نے یہاں ہر شخص کو داعی اور مدعو پایا اور شاگرد لکھا (چیز) بہ حال کانفرنس اور کانفرنس کا ہر ممبر نام
منتظان اجلاس کا اور خصوصاً :-

نواب اسد اللہ خاں صاحب *
 خان بہادر حافظ عبد الکریم صاحب سی۔ ایس۔ آئی *
 شیخ بشیر الدین صاحب رئیس لال کرتی *
 قاضی محمد یوسف صاحب ایپیکٹر و لیس *
 منشی نظیر علی صاحب تحصیلدار میرٹھ *
 حافظ محمد حسین صاحب خاں صاحب آئری مجسٹریٹ *
 حافظ محمد اکبر صاحب *
 سعید قاسم علی صاحب آئری مجسٹریٹ *
 محمد عبداللہ خاں صاحب *
 منشی نادر علی صاحب وکیل *
 حکیم فخر الدین صاحب *
 حکیم رضی الدین صاحب *
 شیخ محمد ولایت علی صاحب وکیل *
 مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر نجم الاخبار آبادہ۔ کانہایت شکر ادا کرتا ہے، جنہوں نے شانہ روز نہایت
 محنت اور گر محوشی کے ساتھ کانفرنس کے ہر انتظام میں مدد دی اور اعانت فرمائی (چیر پر چیر)۔
 مجھ کو یقین ہے کہ کانفرنس کا ہر مجبرو اجلاس میں شریک تھا، آپ کی مہربانیوں، ہماں نوازیوں،
 فیاضیوں اور ہمدردیوں کا گہرا نقش دل پر بجا بیگا اور میرٹھ اور میرٹھ کے اجلاس کو کبھی نہیں بھولے گا۔

نمبر ۴۴

اسپیج

یہ اسپیسج نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں بہادر نے دیباچہ قائم کرنے یادگار سید
 احمد خاں بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی مرحوم مفتور کے جو انہوں نے
 بمقام لاہور ۲۵ جون ۱۹۵۸ء کو اس اجلاس میں کی جو سید میو بل فٹ کے ڈپٹی سیشن
 جیلر نے برصغور کو اٹھا۔

بعد ایک ترمیمی تقریر کے جو نواب محسن الملک نے مرحوم سید کی وفات کی

نسبت کی اور جس سے ایک عجیب حالت رنج اور غم کی حاضریں برطاری ہوئی، انہوں نے مجلس سے یہ خطاب کیا :-

بزرگانِ ملت !

جس شخص کی یادگار قائم کرنے کے لئے آج ہم جمع ہوئے ہیں، وہ مجلہ ان مخصوص اور ممتاز لوگوں کے تھا، جن کو خدا تعالیٰ کسی خاص کام کے لئے پیدا کیا کرتا ہے۔ ایسے شخص کا دل و دماغ تعلیم تربیت سے پرورش نہیں پاتا، بلکہ فطرۃً اُس میں وہ قوت ہوتی ہے جو مجاہدہ و ریاضت اور تعلیم و تربیت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ سرسید احمد خاں کو خدا نے ہم مسلمانوں میں ایک خاص قسم کی قومی ہمدردی اور قومی ریفارم اور صلاح کی قابلیت دی تھی۔ اور اسی کام کے لئے اُن کو پیدا کیا تھا۔ وہ علوم و شریعت کے لحاظ سے نہ عالم و فاضل تھے، اور نہ یورپین سائنس کے اعتبار سے پروفیسر یا ڈاکٹر۔ مگر وہ اس بات کا ثبوت تھے، کہ جس شخص کو فطرت سے دماغ صحیح اور ذہن سلیم اور کسی قسم کی خاص قوت عطا ہوئی ہو۔ دنیا کو اُس کے طبع و ادراک، خدا واد، اور خود و خیالات کس قدر فائدہ پہنچا سکتے ہیں ؟

اُن کی زندگی کے تفصیلی حالات بیان کرنا اُس شخص کا کام ہے جو اُن کی لائف لکھنے میں سرگرم ہے۔ اور مجھے اُمید ہے کہ وہ عنقریب ایک صحیح نقشہ اُن کی سچی زندگی کا آپ کے سامنے پیش کریگا۔ مگر اُن کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنے والا بھی یہ بات جانتا ہے، کہ شروع سے اُن کی طبیعت کا میلان تحقیق کی طرف تھا، اور قومی ترقی اور تنزل کے خیالات عنفوان شباب ہی سے اُن کے دل میں پیدا ہو گئے تھے۔ مگر اس قوت کا ٹھور اُس وقت سے شروع ہوا، جب کہ اُنہوں نے دہلی کے کنڈروں اور اپنی دار السلطنت کے شکستہ درو دیواروں کے آثار جمع کرنے کا ارادہ کیا، اور اٹاکر الصنادید لکھنی شروع کی۔ اُسی وقت سے وہ اس بات کی طرف متوجہ ہوئے کہ مسلمان کس طرح اعلیٰ علیین ترقی پر پہنچکر سفل السافلینِ نکت میں گر گئے، اور گر تے چلے جاتے ہیں۔ پھر تو اُنہوں نے اسی مضمون کو اپنی زیست کا شغل ٹھہرایا اور سوتے جاگتے، اُٹھتے، بیٹھتے، ہر وقت یہی خیال اُن کے پیش نظر رہنے لگا۔

شروع کے ہولناک زمانہ۔ نے اُن کی طبیعت میں ایک خاص قسم کا جو شش پیدا کیا، اور اس انقلابِ عظیم سے جو ہندوستان کے مسلمانوں پر واقع ہوا اُن کی طبیعت میں بھی ایک حیرت انگیز انقلاب شروع ہوا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ مسلمان تباہ و برباد ہو رہے ہیں، اور افلاس اور جہالت اور ناقابلِ تلافی کی مصیبت اُن کو محسوس و بے نشان کر رہی ہے اور بحیثیت قوم و مذہب کے وہ برٹش گورنمنٹ کے بدخواہ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ قومی مصیبت دیکھ کر اُن کی غیرت اور اسلامی حیرت جو شش میں آئی، اور اُسی زمانہ میں جب کہ فتنہ و فساد کے خانہ سوز شعلے چاروں طرف مشتعل ہو رہے تھے اُنہوں نے

اسباب غدر پر ایک رسالہ لکھا، اور ابھی غدر فرو نہ ہونے پایا تھا کہ اُس کو ہندوستان اور ولایت میں
مشتہر کر دیا، وہ غدر اور ہندوستان سے لیکر ولایت تک کے حکام کی براہ فرستگئی، اور مارشل لا کا
زور شور اُس پر ایسے رالہ لکھنا اور شہر کرنا ایک جان بازی کا کام تھا۔ مگر اُس خدا کے بندہ نے جب
قومی جوش میں اپنی جان کی کچھ پروا نہ کی، اور باوجودیکہ اُس وقت وہ نہ انگریزی جانتے تھے اور
نہ انگریزوں سے اختلاط رکھتے تھے، صرف اپنی سچائی اور انگریزوں کے انصاف کے بھروسہ پر ایسے
خطرناک رسالہ کے پیش کرنے میں کچھ بھی باک نہ کیا۔ اور چونکہ سچی نیت اور سچے دل سے حبۂ اللہ وہ
رسالہ لکھا تھا، اس کا اثر بھی پورا ہوا اور لارڈ کیننگ نے اس عالم کی منادی کر دی۔

۱۷۷۷ء کے غدر میں مرحوم نے جس قومی خیر خواہی کے ارگن کو کوکا، دم داپیس تک اُس کی آواز
منقطع نہ ہوئی، اور ایک سے ایک بڑھ کر غمزدگش اس سے نکلتا چلا آیا، جہاں جہاں وہ سرکاری
خدمات کے تعلق سے رہے، اُن کے آثار حمیدہ مدرسے اور سوسائٹیاں وغیرہ وہیں موجود
ہیں، اور ظاہر کرتے ہیں کہ ایک قومی خیر خواہ اور ایک قومی رفیقاہ نے اُن کی بنیاد ڈالی ہے۔ اگر اُن
وہ کام جو اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں کے ہیروئی کے لئے انہوں نے کئے ہیں بالاستیعاب بیان
کئے جائیں تو ایک بڑی بسوط کتاب بن جاوے۔ وازتعلیٰ و انعمہ اللہ لا تحصوہا۔ مگر سب میں
بڑا اور بہت بڑا احسان جو انہوں نے قوم پر کیا، ملک پر کیا، سرکار پر کیا، اُن پر کیا جواب موجود ہیں، اور
اُن پر کیا جواب کو پیدا ہونگے، وہ علیحدہ کچھ کالج کا جاری کرنا تھا۔ انہی کا فکر تھا صحیح و صائب کہ اُس
نے ایسے کالج کی ضرورت کو سمجھا، اور انہی کی ہمت تھی بلند وسیع، کہ اُس کے بنانے اور جاری کرنے
کا ارادہ کیا۔ اور انہی کا استقلال تھا متین و مستحکم، کہ جو سوچا تھا اور جس کا ارادہ کیا تھا، اُس کو
کر دکھایا۔

مگر افسوس ہے کہ جس طرح پر وہ اس کالج کو قائم کرنا چاہتے تھے وہ خیال اُن کا پورا نہ ہوا۔ وہ
چاہتے تھے کہ ایک ایسا کالج تیار ہو جو مسلمانوں میں یورپین سائنس اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا
فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان، اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں
مگر باعتبار مذاق اور رائے اور فہم کے انگریز ہوں۔ اور اس سے اُن کا مقصد تھا اپنی ایک علیحدہ خود مختار
مسلمانی یونیورسٹی قائم کرنا۔ اور یہی وہ آرزو تھی جس کی کوشش میں انہوں نے اپنی زندگی تمام کر دی۔
اور اس آرزو کا پورا کرنا ہم پر چھوڑ گئے۔

لے زندہ دلان پنجاب! سر سید جن کی یہ آرزو تھی کہ محمد بن یونیورسٹی بنائیں،
وہ تو دنیا سے چل بے، مگر تم زندہ ہو۔ اور زندہ دلی کا طغیاں تمہاری پیشانیوں پر اس مبارک ہاتھ کا دکھایا
موجود ہے۔ اگر حقیقت تم زندہ دل ہو، اور مجھے یقین ہے کہ تم ہو، تو آؤ، اور فضول ردنا چھوڑو،

مرثیے اور فوجی بند کرو، تعزیت کی مجلسوں پر فاتحہ پڑھو۔ بلکہ اپنی محبت کا عملی ثبوت دکھاؤ اور اپنے محبوب اور مقتدا کے ماتم کام کے پورا کرنے کی کوشش کرو۔

حضرات! جب کوئی بڑا شخص دنیا سے گزرتا ہے تو اُس کو امتحان کی نظر سے دیکھنے والے اپنی شکر گزاری اور ولد ادگی کے ثبوت میں کوئی نہ کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو اُن کے محبوب اور مقتدا کی شان کے لائق ہو۔ اُن کے لئے عالیشان مقبرے بنواتے ہیں، ہر عمری گنبد تعمیر کرتے ہیں، ان کے نام کے لنگر خانے جاری کرتے ہیں، سالانہ عرس کرتے ہیں، چڑھاوے بڑھاتے ہیں، اور اُن کے پسماندہ کے لئے بڑے بڑے خیرے مال و دولت کے جمع کرتے ہیں۔ تم جس کو چاہتے تھے اور جس کو اپنا مسلح اور بیٹھا سمجھتے تھے، وہ نہ زندگی میں اپنے لئے نذر دنیا کا طالب ہوا، نہ اپنی ذات کے واسطے جیتا یا مر جیتا۔ تم سے کسی چیز کا خواہاں ہوا، بلکہ خود اپنا مال تم پر قربان کیا، اور اپنی کمائی تمہارے کاموں میں لگائی یا تک کر نہ اپنے مرنے کے لئے ایک جھوٹا چھوٹا، اور نہ اپنے کفن کے واسطے ایک گڑبگڑا۔ جو کچھ تم سے لیا نہیں یہ خرچ کیا اور تمہارے ہی کاموں میں لگایا۔ مرنے کے بعد بھی اُس کی یتیم تازہ تھی کہ اُس کی یادگار میں مقبرہ بنایا جائے، یا اُس کی قبر پر لنگر جاری ہو، یا اُس کے نام کی کوئی خانقاہ بنائی جائے۔ بلکہ یہی آرزو تھی کہ مرنے کے بعد بھی جو کام تمہاری بھلائی کا اُس نے شروع کیا تھا وہ پورا ہو، اور قومی ترقی کے اسلی سائل یعنی تعلیم و تربیت کے سامان پورے پورے جمع کئے جائیں۔ یعنی محمدن کالج۔ محمدن یونیورسٹی کے درجہ پرنسپال یا جائے۔

زندہ دلان پنجاب! ہمارا بھی یہی مقصود ہے اور اسی غرض کے لئے ہم یہاں آئے ہیں، اور اسی کام کے لئے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے ہم نے اپیل کی ہے۔ ہم چند خاندان قوم نے رجن کو مرحوم کے ساتھ رادوت اور محبت تھی ایک مجلس جمع کی، اور اس بات کا ارادہ کیا۔ کہ اُن قومی خدمات کی شکر گزاری میں جو اُس شیدائی قوم نے چالیس برس تک کی ہیں، ایک ایسی یادگار قائم ہو جو اُس کی شان و خواہش کے موافق، اور زمانہ کی ضرورت کے مناسب، اور سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مفید ہو۔ اور ہماری سمجھ میں کوئی دوسری تجویز اس سے زیادہ بہتر معلوم نہ ہوئی کہ بدستہ العلوم علیگڑھ یونیورسٹی کے درجہ تک پرنسپال یا جائے۔

حضرات! چونکہ یہ بہت بڑا مشکل اور محنت طلب کام ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے، اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں سے جو مرحوم ادرائے کے کاموں کو امتحان کی نظر سے دیکھنے والے تھے، مدد لینے پر مستعد ہوئے ہیں، اور اس کام کو اپنی قوم کی بہبودی اور ترقی کے لئے ایک ضروری ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ ہم صاف صاف اس امر کو بتائیں کہ علیگڑھ کالج کو محمدن یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کا خیال کیونکر ہمارے دل میں آیا۔ پھر لوگوں کو بتادیں کہ یونیورسٹی کیا چیز ہے۔ اور ہماری اس

مجزرہ یونیورسٹی کو ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے کیا خصوصیت ہوگی۔ کس قسم کی تعلیم اُس میں دیجاو گی۔ اخلاقی اور مذہبی تعلیم کس طرح پراور کس درجہ تک ہوگی۔ عربی، فارسی کی تعلیم کا کیا انتظام ہوگا۔ غرض کہ یہ تمام باتیں صاف صاف قوم کو بتائی جاویں۔ پھر یہ بھی اُن کو بتایا جائے کہ جو روپیہ جمع ہوگا وہ کس کی حفاظت میں رہیگا۔ اور اُس کی حفاظت کا انتظام کس طرح کیا جاوےگا۔ اور کیونکر اور کس کے اختیار سے وہ روپیہ خرچ ہوگا۔ اور جب تک پورا روپیہ جمع نہ ہو سرمایہ جمع شدہ سے کیا کیا جاوےگا۔ یہ وہ سوالات ہیں جو بالطبع ہر ایک ایسے شخص کے دل میں گزرتے ہیں اور گزرینگے جو اس کام میں شریک ہونا چاہیگا، اس لئے ضرور ہے کہ یہ تمام باتیں صاف صاف ظاہر کی جاویں اور تمام مسلمانوں کو اپنے اپنے خیالات ظاہر کرنے اور مفید صلاح دینے کا موقع دیا جائے۔

حضرات! علی گڑھ کالج کو محمدن یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کا خیال کیونکر ہائے دل میں آیا۔ اس کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اس عظیم الشان کام کا خیال ہمارے ضعیف دماغوں سے پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ اُسی عالم دماغ کا خیال ہے جس نے ساری عمر تعلیم و تربیت کے ہول و فزع کے غور کرنے پر صرف کر دی تھی، اور یہ سارا نقشہ اُسی شدید اے قوم کا اُسی زمانہ کا کھینچا ہوا ہے، جب کہ اُس نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے، اور مغربی علوم و فنون کی طرف توجہ دلانے، کا ارادہ کیا تھا۔ وہ کام کارروائیاں جو شہادہ سے شہادہ تک مرحوم نے کیں، اُن سب میں عیشہ بی ام پیش نظر رہا، اور ہر ضروری موقع وہ اپنے اس ارادہ اور اس خیال کو ظاہر کرتے رہے۔

شہادہ کے اجلاس محمدن ایجوکیشنل کانفرنس میں سر سید مرحوم نے کالج کے تاریخانہ حالات پر ایک مفصل لکچر دیا تھا۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں کہ ”اول میرے خیالات یہ تھے کہ ذریعہ ترقیوں کے جو اردو زبان میں ہوں اپنی قوم کو اعلیٰ درجہ کے یورپین علوم و فنون سے بہرہ یاب کر سکتے ہوں، اور اُسی کی کوشش کی۔ مگر بالآخر مجھ کو یقین ہو گیا، کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت جس کی ضرورت قوم کو ہے، اور سوشل حالت کی ترقی اور حاکم و محکوم کا میل جول جو میرے اصولوں کا منشا ہے، بغیر انگریزی پڑھنے اور یورپین سائنس اور لٹریچر میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کے ناممکن ہے۔ میں ہر ایک بات سوچتا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ کیا کموں، مگر جب میں لندن گیا اور وہاں کے تعلیم و تربیت کے طریقوں سے واقفیت حاصل کی، تو وہیں یعنی لندن ہی میں میں نے اس مدرسہ کے قائم کرنے اور تعلیم کی تمام تجویزوں کو پورا کیا اور وہیں سید محمود نے اپنی واقفیت اور اپنے نہایت لائق دوستوں سے صلاح و گفتگو کرنے کے بعد وہ تمام طریقے تعلیم کے تجویز کئے جس پر اس وقت مدرسہ چل رہا ہے اور جس پر آئندہ چلیگا۔ سید محمود کا خیال تھا کہ کالج ایسا اعلیٰ درجہ کا قائم ہو جس میں تمام یورپین علوم و فنون مع اُن ایشیائی علوم کے جو ہمارے بزرگوں کے لئے مایہ نقر تھے اعلیٰ درجہ پر تعلیم ہو سکے۔ اور وہ کالج محمدن یونیورسٹی کے نام سے

موسوم ہوا، اور عربی فارسی لٹریچر جو مسلمانوں کا قومی تشہ ہے ہرگز نہ چھوڑا جائے۔
 لندن سے آنے کے بعد شہداء کے اخیر میں مرحوم نے ایک مجلس قائم کی جس کا نام تھا ”کمیٹی
 خواستگار مرقی تعلیم مسلمانان ہندوستان“ اُس کمیٹی کا مقصد اُن موانع اور اُن کے علاج کی تحقیق
 کرنا تھا۔ جن کے سبب مسلمان سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں نہایت کم پڑھتے ہیں اور جن کے
 سبب اُن میں مغربی علوم و فنون نے رواج نہیں پایا۔ اس کمیٹی نے اس مضمون پر رسالے لکھنے
 کا اشتہار دیا اور تین انعام مقرر کئے۔ اور ۳۲ ذی قعد اور معزز مسلمانوں نے رسالے لکھ کر کمیٹی میں
 بھیجے۔ اُن کے دیکھنے اور اُس پر غور کرنے کے لئے ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر ہوئی، جس کا اخیر اجلاس
 ۱۵ اپریل ۱۳۱۶ء کو ختم ہوا۔ اور آخر کمیٹی نے اُن موانع کے علاج کے طور پر ایک خاص کلچ
 مقرر کرنا تجویز کیا۔

اس رپورٹ میں سلیکٹ کمیٹی کی جو تقریر نسبت قائم کرنے مدرستہ العلوم کے سرسید مرحوم
 نے کی تھی اُس میں انہوں نے اپنے اصلی خیالات نسبت تسلیم مسلمانوں کے نہایت صراحت سے ظاہر
 کر دئے تھے اور اپنا مقصد کہ ایک محمدان یونیورسٹی بنائی جائے، نہایت خوبی اور مصفاۃ سے بیان کر دیا تھا
 چنانچہ اُس رپورٹ کے حصہ سوم کا دفعہ ۲۰ میں آپ کو ملتا ہوں اور وہ یہ ہے:-

”سید احمد خاں نے ممبروں سے یہ بات کہی کہ اس امر سے جس کی نسبت ہم رپورٹ تحریر کرتے
 ہیں یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم لوگ صرف وہی بات کہیں جو زمانہ حال کے مناسب ہو، اور جو اس وقت
 انجام بھی ہو سکے، بلکہ یہ مقصد ہے کہ قطع نظر حالات اور حیثیات موجودہ سے ہم کو وہ تجویز کرنی چاہئے، جو
 پوری پوری اور ٹھیک ٹھیک اعلیٰ درجہ پر مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو، تاکہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ ہم کو
 درحقیقت کیا کرنا ہے اور بالفعل ہم کس قدر کر سکتے ہیں۔“

”پھر انہوں نے ممبروں سے کہا کہ تجویز اور عمل، ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ تجویز ہمیشہ ہم کو
 پوری اور کامل کرنی چاہئے اور اُس تجویز پر عمل اُس قدر ہوتا کہ ہم وقتہ فوقتہ کر سکتے ہیں۔ فرض کر دو،
 کہ ہم کو ایک بہت بڑا عالیشان مکان بنانا ہے۔ جب ہم اُس کا نقشہ تجویز کریں گے، تو اُس تمام مکان
 کا کامل نقشہ تجویز کریں گے، اور جب اُس کی تعمیر شروع کریں گے تو اسی قدر کوئی تعمیر شروع کریں گے۔
 جس قدر کی تعمیر بالفعل ہم کو مقدور ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ وہ مکان عالیشان مطابق
 نقشہ مجوزہ کے تیار ہو جاوے گا۔ اور اگر ہم بلا پورا اور کامل نقشہ سوچے تعمیر شروع کر دیں گے تو ہم نے اُس
 مکان میں سے کچھ نہ بنایا ہوگا بلکہ اُس مکان کے بنانے کے لئے پھر کراؤں عمارت کا ڈھانا پڑے گا۔
 جو یہ نقشہ سوچے تعمیر کی تھی۔ میرا مقصد اس تقریر اور تمثیل سے یہ ہے کہ اس وقت طریقہ تعلیم مسلمانوں
 کا پورا اور کافی تجویز کیا جائے اور اس بات کا خیال نہ ہو کہ آیا اس وقت ہم اُس کو کر بھی سکتے ہیں

یا نہیں؟

”پھر انہوں نے کہا کہ اس وقت میں دو ایک باتیں اور عرض کرنی چاہتا ہوں کہ آپ صاحب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ تعلیم ہمیشہ کسی ایک خاص مقصد کے لئے نہیں ہوتی اور نہ کسی ایک گروہ کثیر کا ہمیشہ ایک ہی مقصد ہوتا ہے۔ بلکہ ایک گروہ کثیر میں سے مختلف جماعتوں کے مختلف مقاصد ہوتے ہیں۔ ہم جس طریقہ تعلیم کے قرار دینے کی فکر میں ہیں وہ ایک بہت بڑے گروہ سے علاقہ رکھتا ہے۔ اولیٰ فی مختلف جماعتوں کے مختلف مقاصد تسلیم سے ہیں۔ پس اس وقت ہم کو ایسا طریقہ تعلیم تجویز کرنا چاہئے جو مختلف جماعتوں کے مختلف مقاصد کے پورا کرنے کو کافی ہو۔“

پھر انہوں نے اس مطلب کو دوبارہ زیادہ تروصاحت سے بیان کیا اور یہ بات کہی، کہ مثلاً ہم مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو گورنمنٹ کے اعلیٰ اعلیٰ عہدوں کے حامل کرنے اور انتظام گورنمنٹ میں شامل ہو کر دیوبی عزت حاصل کرنے اور اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے کی آرزو رکھتی ہے ایک جماعت ایسی ہے کہ اُس کو گورنمنٹ کے عہدوں کے حامل کرنے کا کچھ خیال نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی قوت بازو سے بذریعہ تجارت یا اجراءے کارخانجات کے اپنی معاش پیدا کرنے کی خواہشمند ہے ایک جماعت ایسی ہے کہ وہ صرف اپنی جائیداد اور اپنے علاقہ جات کی درستی اور اپنی زندگی کے روزمرہ امور کو بخیر و شل اسلوبی انجام دینے کی آرزو رکھتی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ علوم فنون کو حاصل کرنا اور اُن میں واقفیت کامل حاصل کرنا پسند کرتی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ اُس کو تمام چیزوں سے چنداں تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ بلحاظ اپنی معاد کے علوم دین میں دستگاہ کامل حاصل کرنا اور اُن میں اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ اور ایک جماعت عوام الناس کی ہے جس کے لئے کسی قدر عام تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔ یا ایں ہمہ ہر ایک کو اپنی اولاد کی نسبت یہ خواہش ہے کہ اُس کے عقائد مذہبی بھی درست رہیں اور وہ اداسے فرائض مذہبی سے بھی غافل نہ ہو جائے۔ پس جبکہ ہم تمام مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ قرار دیتے ہیں تو ہم کو ایسی تجویز کرنی چاہئے، جس سے تمام مقاصد مذکورہ اور دیگر مقاصد اور نیز دیگر مقاصد جو تعلیم سے متعلق ہیں حاصل ہوں۔“

”انہوں نے یہ بھی کہا کہ جب آپ صاحب ان مقاصد پر غور فرمائیے جن میں سے اُس کو معظم کو میں نے ابھی بیان کیا تو آپ یقین کریں گے کہ کسی قوم کو یہ سب مقاصد جب تک کہ وہ خود ان مقاصد کے حاصل کرنے پر مستعد نہ ہو حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس ہم کو اپنی تمام مقاصد کے انجام کو صرف گورنمنٹ ہی پر منحصر رکھنا نہ چاہئے بلکہ یقین کرنا چاہئے کہ اُن تمام مقاصد کا گورنمنٹ سے حاصل ہونا غیر ممکن اور ناممکن بالذات کے ہے۔ پس اس وقت ہم کو دو قسم کی تجویزیں کرنی چاہئیں۔ ایک کامل اور پوری اونٹنے سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک کی جو ہمارے تمام مقاصد کو پورا کر سکیں اور جن میں

ہم کو گورنمنٹ سے اُس کی تعمیل کرانے کی کچھ خواہش نہ ہو بلکہ ہم کو خود اپنی سعی اور کوشش سے آپ اُس کا انجام کرنا مد نظر ہو۔

”دوسری تجویز ہم کو اس بات کی کرنی چاہئے کہ جب تک ہم اُس اول تجویز کو انجام دیں یا اُس کے انجام دینے کے لائق ہوں اُس وقت تک اُن اصول و قواعد سے جو گورنمنٹ نے تعلیم کے لئے مقرر کئے ہیں کیونکہ فائدہ اٹھائیں اور ہمارے متعدد مقاصدوں میں سے جو ان مقصد تعلیم و معیتہ گورنمنٹ سے حاصل ہو سکتا ہے اُس کو ہم کیونکر حاصل کریں۔“

شعبہ میں ہر کلسنسی لارڈ لٹن ولبرائے و گورنر جنرل کشور ہند کو جب کہ وہ مدرسہ کی بنیاد قائم کرنے کے واسطے علیگڑھ تشریف لائے تھے، سر سید مرحوم نے کیٹی کے نام سے ایک ایڈریس دیا تھا، اُس میں بھی اُنہوں نے اپنے اس خیال کو نہایت پاکیزہ اور عمدہ لفظوں میں اس طور پر ظاہر کیا۔ جب کہ ہم اُن شکلات پر نظر کرتے ہیں جو ہم کو اپنے کام میں پیش آئیں، اور اُس کا میانی کا بھی خیال کرتے ہیں جواب تک ہم کو حاصل ہوئی ہے، تو ہم کو اس باب میں شبہ نہیں ہوتا کہ گورنمنٹ انگریزی اور ہمارے خاص مہوطن دونوں اسی فیاضانہ طریقہ میں ہماری اس سے بھی زیادہ مدد کرتے ہیں جو جس کی بدولت ہمارے ارادوں کو وسعت حاصل ہوئی ہے۔ تاکہ جو بیج ہم آج بوتے ہیں اُس سے ایک ایسا زبردست درخت پیدا ہو جس کی شاخیں اس ملک کے بڑے درخت کی مانند پھرنی میں مضبوط جڑ پکڑ جائیں اور اُن سے نئے قوت دار پودے پیدا ہوں اور یہ کالج پھیلے گا ایک یونیورسٹی ہو جاوے جس کے طالب علم اس ملک کے ہر چار طرف آزادانہ تحقیقات اور فرارح حوصلہ، فنیہی، اور عمدہ اخلاق، کی بشارت دیتے پھریں گے۔

جواہر لیس ۱۱۔ دسمبر ۱۸۸۴ء کو آئرلینڈ سر جان اسٹریچی فٹنٹ گورنر ملک مغربی ویشالی و میر کوئٹل گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اُس میں بھی مرحوم نے اس کا اشارہ کیا اور یہ کہا تھا کہ جو ترقی اب تک ہمارے کالج نے کی ہے اُس سے ہم کو اس بات کی طمانیت ہوتی ہے کہ ہماری بڑی بڑی امیدیں کسی نہ کسی روز پوری ہو جائیں گی۔ ہم آئندہ زمانہ کو اطمینان کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ ہم کو یہ امید ہو سکتی ہے کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائیگا وہاں غنی استعدادی کے وہ بیج جو ہم بوریے ہیں اُنکے جاویدگی اور ہم اس امید سے اپنا دل خوش کر رہے ہیں کہ وہ زمانہ بہت دور نہ ہوگا جب کہ یہ کالج ہماری محنتوں اور جانفشانیوں کا ثمرہ ہے ایک بہت بڑا مرکز تعلیم کا ہو جائیگا اور ہمارے ہم نہ ہوں میں علم و دانش کی پھیلائی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوگا۔

۱۲۔ نومبر ۱۸۸۴ء کو جواہر لیس جناب عظمیٰ ایچکار اور ٹیل کالج ہرکلسنسی لارڈ لٹن و ولبرائے و گورنر جنرل آف انڈیا کو دیا گیا تھا۔ اس میں سر سید اپنی خواہش اور ارادہ خود مختار

یونیورسٹی بنانے کا ان لفظوں میں ظاہر کیا تھا کہ ”اس کالج کے بانیوں کو یہ امر مدنظر ہے کہ اپنی تجویز کو سوائے علیگڑھ کے اور مقامات تک وسعت دیں۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے مقاصد کے واسطے یہ کالج مسلمانوں کی خاص حاجتوں کو رفع کرتا رہیگا۔ مگر ابتدائی تعلیم کے کالج کے دوست اور معاون اپنے ہم مذہبوں کو جو ہندوستان کے مختلف مقامات میں رہتے ہیں اس بات پر مائل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس کالج کے اعلیٰ درجوں کے واسطے کم عمر طالب علموں کے طیار کرنے کے لئے مدرسے قائم کریں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ کسی دن جب کہ ہماری آمدنیاں زیادہ بڑھ جاوئیں گی اور ہماری تجویزیں مکمل ہو جاوئیں گی تو ہم حضور ملکہ معظمہ قیسرہ ہند دام سلطنت کے جلیل القدر نائب السلطنت ہند سے اس بات کی درخواست کر سکیں گے کہ قانونی طور پر ایک خود مختار یونیورسٹی کا رتبہ ہم کو عنایت فرمایا جائے“

۱۹ برس کے بعد جب کہ یہ الفاظ کہے گئے تھے ہزار ہر سرائی پیٹرک مکڈانل صاحب بہساور کے۔ سی۔ ایس۔ آئی لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی واوہ، مدرستہ العلوم علی گڑھ میں تشریف لائے، اور ۲۴ جنوری ۱۸۹۶ء کو جناب ممدوح کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا۔ اُس میں بھی بیکار کہ ”کالج کی عمارت کا بنیادی پتھر جب ہنر اسلنسی رائل آف لٹن مرحوم نے رکھا۔ اُس زمانہ میں کالج کا آغاز تھا اور ہم نے اُس موقع کو اس بات کے لئے نہایت مناسب خیال کیا تھا کہ حضور ملکہ معظمہ کے نائب السلطنت کے روبرو اُن خیالات اور مقاصد اور اغراض کو جو کالج کے بانیوں اور حامیوں کو اس ٹیٹیوشن کے قائم کرنے سے مدنظر تھے برسر عام ظاہر کریں“ اُنہیں الفاظ کا جواب بیان کئے گئے پھر اعادہ کیا اور اپنے اس ارادہ کو کہ اصلی مقصد ہمارا کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانا ہے صاف صاف ظاہر کیا۔ اور جناب ہنر اسلنسی پیٹرک مکڈانل صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر اُن کے اس مقصد کو بخوبی سمجھے اور اُسے پسند کیا۔

۱۸۹۶ء میں جب کہ مرحوم نے پنجاب کا سفر کیا تھا اُس ایڈریس کے جواب میں جو اُن کو مقام جالندھر ۲۰ اپریل ۱۸۹۶ء کو دیا گیا تھا۔ مرحوم نے اپنے اُسی دیرینہ خیال کو ان لفظوں میں ظاہر کیا۔ کہ ”مے دوستو جب کہ میں نے علوم انگریزی کی اس قدر تشریح کی ہے تو اُن سے میری مراد علوم جدیدہ ہے۔ انگریزی زبان صرف اُن علوم کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور تعلیم یافتہ ہونے کا درجہ اُس سے اور اوپر ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ ہمارے مسلمان اور ہندو بھائی جو انگریزی پڑھتے ہیں اس سے ناواقف نہ ہوں گے کہ جس بات کو میں سچ سمجھتا ہوں اُس کو بیان کروں۔ جو تعلیم کہ انگریزی میں ہم کو دیکھتی ہے وہ کافی نہیں ہے، وہ اس تعلیم سے بہت پیچھے ہے جو میں چاہتا ہوں۔ یونیورسٹی کی ڈگریاں ہم کو تعلیم یافتہ بنانے کے لئے کافی نہیں۔ یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور عثمان کی مثال ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں۔ اُس کے ماتھے کے ہونے ہیں جو کڑا اٹھرا علم کا وہ دیتی ہے

اُسی کو کھاکر پیٹ بھرتے ہیں اور اُسی پر فحاشت کرتے ہیں۔

”اے دوستو! ہماری پوری تعلیم اُس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔
یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہونگے اور بغیر یونیورسٹیوں
کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلا دینگے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور پچرل سائنس
بائیں ہاتھ میں، اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو ضمیر پر
بناتی ہے۔ اے دوستو! خود بھی اُنہیں میں ہوں۔ کیونکہ مجھ کو کبھی ایک یونیورسٹی نے ایل ایل بی کی
ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جب ہی شیکے جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔“

۱۹۱۹ء میں متعلق مسلمانوں کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے پنجاب ائیر ویر میں ایک چھٹی چھٹی تھی
اُس پر مرحوم نے ایک آئیکل لکھا، اور اُس میں پھر اپنے اس پرانے خیال کو ظاہر کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ
”میں بار بار بدلائل معقول و نیز بظاہر ضروریات زمانہ حال کے اس بات کو ظاہر کر چکے ہیں کہ جو اہل ترقی
اس وقت ہماری قوم کی خواہ بلحاظ تمدن یا بلحاظ متول کے ہے اُس کی کامل اصلاح بغیر اعلیٰ درجہ کی
تعلیم کے ہرگز ممکن نہیں ہے۔ اور ہمارا اصلی خیال اور ہماری خاص غرض محمدن اینگلو اور نیٹل کالج علیگڑھ
کے قائم کرنے سے اُسی کے وسائل کا متیا کرنا اور اپنی قوم کی متفقہ کوششوں سے کالج کو مکمل اسکفورڈ
یا کمبرج کی یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچانا تھا۔ جو کامیابی ہم کو اس وقت تک اپنے ہموطنوں اور اپنے
ہمدرد عکراں انگریزی قوم کی اعانت و توجہ سے حاصل ہوئی ہے، اگرچہ وہ ہماری ابتدائی امیدوں سے
بہت کچھ بڑھ کر ہے، مگر پوری کامیابی ہم کو اُسی وقت حاصل ہو سیکے گی جب کہ ہماری قوم کی امداد اور اُسی
کوشش سے ہمارے پاس اس قدر سرمایہ فراہم ہو جائے کہ ہم محمدن اینگلو اور نیٹل کالج علیگڑھ کو اُس
تجویز کے مطابق جو اس وقت سے جب کہ محمدن اینگلو اور نیٹل کالج کو قائم کرنے کا ہم کو خیال ہوا تھا۔
ہمارے ذہن نشین ہے، یونیورسٹی کے درجہ تک ترقی دے سکیں۔ اور ہم نہایت تمنا اور آرزو
کے ساتھ اس مبارک وقت کے آنے کی دعا مانگتے ہیں۔“

مرحوم کے انتقال سے تھوڑے ہی دن پیشتر سترھویں نومبر ۱۹۱۹ء میں جب کہ سلطنتی لارڈ لٹچمن
ویرسے و گورنر جنرل ہند علی گڑھ کالج کے ملاحظہ کے لئے تشریف لائے اُس وقت جو ایڈمیس جناب
ممدوح کو دیا گیا اُس میں بھی سرسید نے اپنا اصلی خیال ان لفظوں میں ظاہر کر دیا تھا۔ کالج نے اپنے
وجود کے بیس سال کے عرصہ میں تعداد طلباء میں، عمارات میں، اور شہرت میں اس قدر ترقی کی ہے کہ
ہم کو اُس کی توقع نہ تھی، مگر پھر بھی آخری مقصود ابھی بہت دُور ہے اور ہم کو توقع نہیں ہے کہ ہمارے
میں وہ حاصل ہو، اور وہ مقصد ہندوستان میں کمبرج و اسکفورڈ یونیورسٹیوں کے نمونے پر ہندوستان
کے مسلمانوں کے واسطے اسلامی یونیورسٹی قائم ہو جاتا ہے۔“

حضرات! انتخابات متذکرہ بالا سے ہمیں نے آپ کو بتا دیا کہ لندن یونیورسٹی کا قائم کرنا کوئی نئی تجویز نہیں ہے بلکہ ابتدائی اور اصلی تجویز مرحوم کی ہے اور اسی کے لئے وہ عمر بھر کوشش اور اُس کے قائم کرنے کے منتظر رہے۔

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یونیورسٹی کیا چیز ہے، صاحبو۔ یونیورسٹی عالموں کی اُس جماعت کو کہتے ہیں جو عظیم تربیت کا انتظام کرتی ہے اور اُس کے اصول قرار دیتی، اور اُس کے قاعدے بناتی، اور تعلیم حاصل کرنے والوں کو ڈگریاں عطا کرتی ہے۔ اور یہ جماعت جس کو یونیورسٹی کہتے ہیں۔ دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ صرف امتحان لے۔ اور دوسری وہ جو علاوہ اس کے تعلیم بھی دے اور تربیت کا انتظام بھی کرے۔ انگلستان میں دونوں قسم کی یونیورسٹیاں ہیں۔ خاص لندن میں ایک یونیورسٹی ہے جس کے ساتھ ایک کالج ہے اور ڈے اسکالرز اُس میں تعلیم کے لئے آتے ہیں۔ مگر اُس یونیورسٹی کو تربیت سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ اور اُس کے ساتھ کوئی بورڈنگ ہوس نہیں ہے۔ اور اس لئے باوجودیکہ اُس کے پروفیسر بھی کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے لیاقت میں کم نہیں ہوتے۔ مگر چونکہ سوسائٹی یعنی عمدہ صحبت کے فائدے اس یونیورسٹی کے طالب علموں کو نصیب نہیں ہوتے، اور سوائے پڑھادینے کے اخلاقی اور مذہبی تعلیم سے یونیورسٹی کو کچھ تعلق نہیں ہے۔ اس لئے لندن یونیورسٹی کی ڈگری پاسے ہوئے بمقابلہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے ڈگری یافتوں کے شراتے ہیں۔ اور اسی واسطے لندن یونیورسٹی بمقابلہ کیمبرج اور آکسفورڈ کے ایک غیر مفید چیز سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اہل چین جس سے انسان انسانیت سیکھے اور غنڈہمیں بنے اور اخلاقی حالت میں ترقی کرے اور قومی ہمدردی کے خیالات جو صرف سوسائٹی میں رہنے اور تربیت پانے سے حاصل ہوتے ہیں اُن میں پیدا ہوں یہ بات لندن یونیورسٹی کے ڈگری یافتوں کو نصیب نہیں ہوتی۔

دوسری قسم کی یونیورسٹی وہ ہے جو تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرے، اور امتحان بھی لے، ایسی یونیورسٹیاں انگلستان میں زیادہ معزز اور زیادہ مفید، اور زیادہ کامیاب ہیں اور اُن میں کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹی زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ اُن کو گورنمنٹ سے صرف چارٹر یعنی سند ڈگریوں کے دینے کی ملی ہے۔ مگر گورنمنٹ کو نہ اُن کے اندرونی انتظام تعلیم و تربیت سے کچھ تعلق ہے، نہ گورنمنٹ اُن کو ایک جہہ دیتی ہے۔ ہر یونیورسٹی کے متعلق بہت سے کالج ہیں اور اُن میں غریبوں کو دلہلکے ہزاروں طالب علم پڑھتے ہیں۔ مثلاً کیمبرج یونیورسٹی میں ۱۹ کالج ہیں اور اُن میں ۳۵ ہزار کے قریب طالب علم پڑھتے ہیں۔ اُس کی اتنی آمدنی ہے کہ جس سے تمام کالجوں اور یونیورسٹی کا سب خرچ چلتا، اور پروفیسرین اور عملوں کی تنخواہ دی جاتی ہے۔ اور طلباء کو وظیفے ملتے ہیں۔ جو کالج اس یونیورسٹی سے متعلق ہیں اُن کے انتظام کی صورت یہ ہے کہ ایک عمدہ دار جس کو کالج کا ماسٹر کہتے ہیں اور جس کو تقریباً ایک ہزار تنخواہ

ملتی ہے کالج کا تنظیم بلکہ حاکم ہوتا ہے۔ اس عہدہ دار کا کام پڑھانا نہیں ہے بلکہ مدرسہ کا انتظام اور اُس کی جائداد وغیرہ آمدنی کی نگرانی اُس کے متعلق ہے۔ اُن میں مختلف علوم و فنون کے متعدد پروفیسر اور اُستاد ہوتے ہیں، تعلیم دینا اور پڑھانا اُن کے ذمہ ہوتا ہے۔ کالج میں داخل ہونے کی وقت ہر طالب علم سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کس علم کو تحصیل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ہر طالب علم کو وہ کوئی علم اختیار کرے لیٹن اور گریک کی ایک مقررہ کتاب اور ان زبانوں کے قواعد اور حساب اور جبر مقابلہ اور تھیرافیدس میں ایک ابتدائی امتحان دینا پڑتا ہے، اور چاروں انجیلوں میں سے ایک اصلی زبان گریک کی انجیل اور ایک کتاب جس میں عیسائی مذہب کے دلائل بیان ہوں وہ بھی امتحان میں داخل ہیں۔ یعنی علمی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی شامل اور ضروری ہے۔ ہر طالب علم کالج کے احاطہ کے اندر رہنا بھی لازمی ہے۔ کالج کی یہ صورت ہے کہ ہر کالج کا ایک پھانک ہوتا ہے جس پر ایک دربان متعین رہتا ہے اور نو بجے شام کے پھانک بند ہو جاتا ہے اُس کے بعد کالج میں کوئی شخص نہیں آ سکتا۔ ہر طالب علم کے پاس دو کمرے ہوتے ہیں۔ اُن میں ایک بطور بیڈ روم کے ہوتا ہے جس میں لپنگ اور مٹنہ دھونے کی میز اور کپڑوں کی الماری وغیرہ ہوتی ہے، اور دوسرا سٹائٹ جم میں میز اور کتاؤں کی الماری اور کرسیاں اور ایک کچ ہوتی ہے اور یکڑھٹھنے لکھنے اور دستوں سے ہاتھ کے لئے ہوتا ہے صبح کا کھانا اور دوپہر کی چار وغیرہ طالب علم اپنے کمرے میں کھاتے بیٹھے ہیں۔ لیکن شام کا کھانا اہل میں کھانا ضرور ہے۔ پھر ہر کالج کے ساتھ ایک کتخانہ ہوتا ہے جس میں سے طالب علم کتابیں تلاش کر سکتے ہیں ہر سب سے ایک چٹو سا گڑھا تعلق ہے جس میں ب طالب علم جو عیسائی مذہب رکھتے ہیں صبح اور سام کی عبادت میں شریک ہوتے ہیں۔ طالب علموں کی قائم کی ہوئی چند سوسائٹیاں اور کلب بھی کالج میں ہوتے ہیں۔ ایک ضروری سوسائٹی اس لئے ہوتی ہے کہ جلسوں میں اسپرچ کرنے کی مہارت پیدا ہو۔ یہ سوسائٹی بالکل پارلیمنٹ کے نمونہ پر ہوتی ہے اور اس میں ہر ممبر گفتگو کرنے کا حق رکھتا ہے ایسی سوسائٹی میں اکثر وہ لوگ جو کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہونے کی تمنا رکھتے ہیں یا بیرسٹر ہونا چاہتے ہیں گفتگو کی مشق کرتے ہیں۔ اسی طرح جمائی شق کے لئے کلب ہوتے ہیں، جس میں طالب علم اپنی فرصت کے گھنٹوں میں کرکٹ کھیلتے اور کشتی کھیلتے ہیں۔

پھر ہر ایک کالج میں متحدہ فیلو ہوتے ہیں جن کا اوسط قریباً کالج ۱۵ ہوتا ہے۔ یہ سب فیلو ملکر کالج کا بندوبست کرتے ہیں، اُن کی ایک کونسل ہوتی ہے جس کا پریسیڈنٹ کالج کا ماسٹر ہوتا ہے۔ فیلوشپ کا وظیفہ تقریباً تین ہزار روپیہ سال کے ہوتا ہے اور کالج میں رہنے کے لئے اُن کو مکان ملتا ہے اُنہی میں سے بعض مدرسہ کی مختلف جماعتوں کو پڑھاتے ہیں مگر اُس کی تنخواہ اُن کو اگ ملتی ہے۔ اور وہ ڈیوٹی یعنی استاد کہلائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ نہایت عالم ہوتے ہیں اور بلا کسی خاص کام کے اُن کو سالانہ تنخواہ ملی جاتی ہے۔ مگر جب شادی کرتے ہیں تو بند ہو جاتی ہے اور وہ فیلو نہیں رہتے۔

اُن کو بلا کسی خاص کام کے تنخواہ دینے سے یہ غرض ہے کہ وہ علم کی ترقی کریں اور عمدہ کتابیں عام فائدہ کے لئے لکھیں، اور جو ان شخصوں کو فیلو ہو اور علم تحصیل کرنے کی ترغیب ہو +

صاحبو! یہی یونیورسٹیاں انگلستان کے نیشنل لائف کی سرپرستہ ہیں اور یہی وہ انسانی معدن ہیں، جہاں سے سیکڑوں بہیرے اور جواہر ایسے نکلے ہیں جن کی چمک دمک سے انگلستان آج منور ہے +

چونکہ میں یونیورسٹی کی حقیقت اور نوعیت آپ کو بتا چکا۔ اب میں یہ بتاتا ہوں کہ ہماری مجوزہ یونیورسٹی کو ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے کیا خصوصیت ہوگی۔ صاحبو۔ جتنی یونیورسٹیاں اُس وقت ہندوستان میں موجود ہیں وہ سب گورنمنٹ کی طرف سے قائم ہوئی ہیں اور گورنمنٹ ہی اُن کی منتظم ہے اور وہ صرف امتحان لینے والی جماعت ہے، نہ کہ تعلیم دینے والی اور تربیت کرنے والی، اور یہ یونیورسٹیاں لندن کی یونیورسٹی کے نمونہ پر ہیں، نہ کہ کیمبرج اور اسکفورڈ کی یونیورسٹیوں کے نمونہ پر +

حضرت! ان یونیورسٹیوں کے قائم ہونے سے اگرچہ تسلیم کو ترقی ہوئی اور مغربی علوم زیادہ پھیلے اور ایک بڑی جماعت ڈگری یافتہ طالب علموں کی ہندوستان میں پیدا ہو گئی اور بہت سے کالج بھی قائم ہوئے لیکن اس سے اعلیٰ درجہ کے ہندوستانیوں کی عموماً اور شریف خاندان مسلمانوں کی خصوصاً نہ حاجت پوری ہوئی اور نہ خواہش۔ اس سے صرف یہ ہوا کہ نوجوان لوگوں کی ایسی عجات پیدا ہو گئی جو بہت جلد اپنے تئیں بکتر میں بدنام اور مذہبی خیالات، اور قومی مراسم اور آبائی تہذیب، اور شائستگی کے چھوٹنے میں مشغول ہو گئی، اور چونکہ اُن کی تعلیم اُن کے قومی لٹریچر میں نہیں ہوئی اور وہ اس سے بے خبر رہے اس لئے انہوں نے اپنے قومی رواج اور مذہبی روایتوں اور خاندانی طریقوں سے نفرت کرنا سیکھا اور اُن کو وہ اوصاف حاصل نہ ہوئے جس سے ایک اہل یورپ اور اہل ایشیا میں تمیز ہوتی ہے۔ پس ایک قوم کا ذہن عقل پریشیت سے مشرقی علوم کے بحال اور قائم رکھنے میں مشغول رہتا تھا اب مغربی لٹریچر اور علوم کے حاصل کرنے کی کوشش میں ضائع ہونے لگا۔ قومی اور مذہبی علمیت تو ہر روز کم ہوتی گئی لیکن اُس کے عوض میں کوئی ایسی جماعت پیدا نہ ہوئی جو اُس سے بہتر ہو۔ جہاں تک کہ یونیورسٹی کے نتائج پر غور کیا جاتا ہے، اور کالجوں کی حالت دیکھی جاتی ہے، یہ بات صاف صاف معلوم ہوتی ہے کہ نہ تو یونیورسٹی کی تعلیم کے نتائج قومی تمدن اور قومی ترقی کے موافق ہیں، نہ کوئی سرکاری کالج ایسا ہے جس میں تعلیم اُن اصولوں پر ہوتی ہے۔ جن سے اعلیٰ درجہ کے مسلمانوں کی حاجت پوری ہو اور قومی ترقی کی توقع کی جائے۔ یہ استثنا چند شخصوں کے عواماً کالج کا سنیہ یافتہ طالب علم انگریزی زبان کو بطور اد کے ویسے ہی استعمال کرتا ہے جیسے ایک انگریزی

چاقو سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنے ملک میں کوئی منصب یا کوئی درجہ بہ اعتبار تعلیم کے نہیں رکھتا اور نہ اُس کے ہموطنوں پر اُس کا کچھ اثر ہوتا ہے۔ اُس کی بڑی تعریف اسی قدر ہے کہ اُس نے چند امتحان کامیابی دیدئے۔ لیکن یہ تعریف بحالت عدم موجودگی مذہبی اور تمدنی اور قومی اوصاف کے ملک کی نگاہ میں کچھ وقار نہیں رکھتی۔

اس میں ذرا بھی کلام نہیں ہے کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے جو صرف امتحان کے بورڈ کا کام کرتی ہیں جو تعلیم دیجاتی ہے، وہ ایسی ہے کہ جس سے مختہ استعداد کسی خاص علم کی حاصل نہیں ہوتی بلکہ نہایت خراب طور پر علوم مختلفہ نہایت خامی کے ساتھ حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہ قول کہ ہر شے کا کچھ کچھ اور کسی شے کی ہر ایک بات، نہایت عمدہ اصول عام تعلیم کے لئے ہے۔ لیکن ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ہر شے کا کچھ کچھ تو سکھلا دیتے ہیں لیکن کسی شے کی ہر ایک بات کو نہیں سکھلاتے اور اس کی سب سے کم ہر سال صد ہونو جان یونیورسٹی کا امتحان دیتے ہیں، لیکن اُن میں سے ایک بھی بڑا مصنف یا صاحب علم نہیں ہوتا۔ اور یہ بات تو ستمات میں سے ہے اور کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ دنیوی تعلیم کے ساتھ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے نہ دئے جانے اور سوائے کتنا ہی تعلیم کے تربیت کے وسائل مہیا نہ ہونے سے یونیورسٹی کی تعلیم کا اثر دل پر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور اُس سے اکثر ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن کی نسبت خود منتظمین تعلیم نے کہا ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم نے ملک میں صرف ایک کثیر تعداد ایسے نیم تعلیم یافتہ نوجوانوں کی پھیلا دی ہے جن کا علم بالائی ہے، جن کی خود بینی سید ہے، جو تقریریں بیان ہیں، لیکن اُن کو اُن الفاظ کے معنی جن کو وہ استعمال کرتے ہیں یا جن فقرات کو وہ دہراتے ہیں، اُن کا مطلب بھی ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہے۔ اور جو تعلیم سے سوائے معاش حاصل کرنے کے کوئی دوسرا فائدہ نہیں سمجھتے اور معاش کو بھی سوائے سرکاری ملازمت کے اور کسی جگہ تلاش نہیں کرتے۔

صاحبو! ۱۵۔ مئی ۱۹۰۷ء کے پانیر میں ایک آرٹیکل چھپا تھا جس کا عنوان تھا ”اضلاع شمال مغرب اودھ میں یونیورسٹی کی تعلیم“ اُس آرٹیکل کے لکھنے والے نے ایک مقام پر ہندوستان کے کالجوں کی تعلیم کی نسبت ناپسندیدگی ظاہر کی تھی اور تحریر کیا تھا کہ ”اُن میں بعض اصلی تعلیم دینے کے طوطے کی طرح باتیں یاد کروادینے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے“ اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ ”کالج ایسے ہونے چاہئیں جس میں تعلیم دینے والی جامعیتیں ہوں۔ اور جہاں طلبہ کی اخلاقی اور جسمانی تربیت کا لحاظ رکھا جائے۔ نہ صرف زبانی رٹا دینے والا کارخانہ ہو۔ جس کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ امتحان یونیورسٹی میں زیادہ فیصدی طالب علم پاس ہوں۔ اور کالج کی اس باب میں شہرت ہو کہ وہ بہت اچھا کارخانہ بنی۔ اے گھڑنے کا ہے“ اس آرٹیکل پر مرحوم نے اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ”ہم اس رائے

کو دل سے پسند کرتے ہیں، اگر یہ بات کہتے ہیں کہ اس کا ازام بنسبت کاجوں کے زیادہ تر یونیورسٹی پر ہے۔ یہ یونیورسٹی اپنے امتحانوں میں طالب علموں کی اپنی استعداد ان کی اخلاقی تعلیم و تربیت سے کچھ غرض نہیں رکھتی۔ صرف اپنے سوالات کے جوابوں سے غرض رکھتی ہے اور ہم نہیں جانتے کہ ممکن ان جوابوں کے نمبر دینے میں کہاں تک غور کرتے ہیں۔ پس اس صورت میں کالج بجز اس کے کہ اپنے طالب علموں کو طوطے کی طرح یاد کرا کے امتحان کے لئے طیارہ کریں، اور کیا کر سکتے ہیں۔ یونیورسٹی تمام ملک کی تعلیم پر پورا اقتدار رکھتی ہے اور وہی تعلیم کو اچھا یا بُرا کر سکتی ہے، کاجوں کو جو اُس کے ماتحت ہیں کچھ اختیار نہیں ہے یا بہت ہی کم اختیار ہے۔“

غرض کہ سر سید کبھی سرچوہ یونیورسٹیوں کو مفید نہیں سمجھے اور نہ ان یونیورسٹیوں کی تعلیم سے اُس قسم کے مسلمان تعلیم یافتہ پیدا ہونے کی اُن کو توقع تھی، جس قسم کی تعلیم یافتہ مسلمان وہ پیدا کرنا چاہتے تھے کیا آپ لوگوں کو یاد نہیں ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی کانفرنس میں اپنی اُس ایجینڈا میں جس کا نام ہے ”مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ“ کیا کہا تھا؟ انہوں نے کہا تھا کہ ”جس درجہ میں اپنی قوم کو لیجانا چاہتا ہوں وہ میرا مقصد صحیح ہو یا غلط، ممکن ہو یا ناممکن، اس طریقہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی قوم کو آسمان کی مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب میں رات کے وقت آسمان کو دیکھتا ہوں تو میں اُس کے اس حصہ کی چونیلانیلا سیاہ روڈراونا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پروا نہیں کرتا، مگر اُن ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اُس میں چمک رہے ہیں اور مشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جن کے سبب سے اس تمام سیاہ رو آسمان کو بھی عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے۔“

اے صاحبو! کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جو ہماری قوم میں ایسے ہی چمکتے ہوں جیسے آسمان پر تارے اپنی قوم کو مرکز اور دوسری قوم کی آنکھیں باعزت بنا سکتے ہو۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔“

صاحبو! سر سید کا یہ مقصود حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم مسلمان اپنی اغراض اور مقاصد کے مطابق تعلیم کے ساتھ تربیت کا انتظام نہ کریں اور نیشنل کیمبرج اور کسفورڈ یونیورسٹیوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام اپنے ماتھے میں نہ لیں اور اپنی خاص یونیورسٹی اُسی اصول کے مطابق قائم نہ کریں جو روم نے قائم کئے ہیں۔ گورنمنٹ سے یہ توقع کرنی غلطی ہے کہ وہ ہماری مذہبی اور اخلاقی تعلیم بھی اپنے ماتھے میں لے اور ہماری تربیت کا بھی انتظام کرے۔ اول تو گورنمنٹ ایسے ملک میں جہاں مختلف قسم کے مذہب اور مختلف قسم کی زبانیں جاری ہوں اور ایک فرقہ کے خیالات اور رواج کو دوسرے فرقہ سے تباہن کلی ہو ایسی یونیورسٹی قائم نہیں کر سکتی جو تعلیم و تربیت کی تمام حاجتوں کو ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے

موافق پورا کرے، اور گورنمنٹ اس قسم کے سامان میا کرنا بھی چاہے اور تعلیم و تربیت کام پورے طور پر اپنے ذمہ لے تو عموماً لوگوں کو بدگمانی پیدا ہو۔ اور وہ اس کو اپنے نئیں مذہب عیسوی میں شامل کرنے کے واسطے ایک فطرت آمیز تدبیر سے تعبیر کریں، اور یہی سبب ہے کہ گورنمنٹ نے مجبور ہو کر عقلی تعلیم اپنے ذمہ لی اور مذہبی اور اخلاقی تعلیم اور تربیت اُن کے والدین پر چھوڑ دی، اور اسی وجہ سے اب تک پیرکھل مسئلہ تعلیم و تربیت کا حل نہ ہوا، اور کبھی گورنمنٹ سے حل ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ تو ایک قومی مسئلہ ہے۔ جس کو ہر قوم اپنے اپنے خیالات اور خواہشات کے موافق حل کر سکتی ہے، اور چند اصول کی بنیاد کے ساتھ گورنمنٹ نہایت خوشی سے بلکہ شکر گذاری کے ساتھ ہر قوم کو مدد دے سکتی ہے۔

پس حضرات! ہماری مجوزہ یونیورسٹی کو ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں سے اسی امر میں خصوصیت ہوگی کہ ہم اپنے تمام ضروری مقاصد اور قومی اغراض کا خیال رکھیں گے اور اپنی خواہش اور اپنی مرضی مطابق تعلیم و تربیت کریں گے، بلحاظ تعلیم کے ہم موجودہ یونیورسٹیوں کی قیود و سلاسل سے آزاد ہو جاویں گے۔ اور ذنبوی اور انگریزی تعلیم کے ہم اپنی عربی اور مذہبی تعلیم بھی جاری کریں گے، اور تعلیم کے ساتھ اپنے بچوں کی تربیت کا بھی انتظام کریں گے۔ اور ہم اپنی قوم میں اسی قسم کے طالب علم پیدا کریں گے جیسے کہ میراج اور کسفورڈ کی یونیورسٹی میں ہوتے ہیں۔ ہماری مجوزہ یونیورسٹی صرف امتحانی بورڈ نہ ہوگی بلکہ تعلیم و تربیت کے لئے انجمن ہوگی، وہ خود اپنا نصاب تعلیمی تجویز کرے گی، اور خود امتحان لے گی اور ڈگریاں دیں گی۔ وہ طالب علموں کا مسکن ہوگی۔ جہاں طالب علم رہیں گے اور سوسائٹی کے فوائد حاصل کریں گے۔ ہمارے بچے اپنے مذہبی طریقہ پر مذہبی فرائض و مراسم کے ادا کرنے کے پابند اور اپنے غیر متعصب، روشن ضمیر، مذہبی عاملوں کی تعلیم و صحبت کے برکات سے مستفید ہوں گے۔ اور جو کوئی دینی اور مذہبی علوم میں کمال حاصل کرنا چاہیگا اس کو اپنی خواہش کے مطابق ایسے کمال حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اور علم کو ترقی دینے اور اسی میں مصروف رہنے کے لئے خاص خاص لائسنس اور شائق طالب علموں کو فیض دئے جاویں گے اور وہ یونیورسٹی کے فیوچر ہونگے۔ اُن کو اپنے لائق اور عالم پروفیسروں کی پاک صحبت نصیب ہوگی۔ اُن کے ساتھ ذات دن اُن کا میل جول رہے گا۔ اُن کی سوائی کی برکتوں سے اُن میں انسانیت اور تہذیب اور قومی ہمدردی پیدا ہوگی۔ تفصیلات کے بہتہ خیالات اُن کے دماغوں میں سامنے دیاویں گے۔ وہ انگریزوں کے ساتھ ارتباط و اتحاد رکھیں گے۔ مردانہ کھیل کھیلنے اور اس سے اُن کے دلوں میں ایک ناز کی اور کشتگی پیدا ہوگی وہ رات دن چہرین کھینچیں گے۔ وہ باتیں سنیں گے جس سے انگریزی گورنمنٹ کی برکتوں اور فائدوں کی قدر کریں گے، اور برٹش سلطنت کے قیام اور استحکام کو اپنی قوم کا قیام اور استحکام سمجھیں گے۔ غرض کہ اس یونیورسٹی سے وہ تمام دینی اور ذنبوی برکتوں کو حاصل کریں گے۔ اور اگر آپ مختصر فقرہ میں سمجھنا چاہتے ہیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ ہماری محمدی یونیورسٹی کو ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے وہ خصوصیت ہوگی جو ہمارے کالج کو ہندوستان کے دوسرے کالجوں

سے خصوصیت ہے۔ ہمارا موجودہ محمدن کالج علی گڑھ خود مجوزہ یونیورسٹی کی بنیاد اؤس کا نمونہ ہے۔ وہ ابھی ایک بچہ ہے جو نہایت خبر گیری اور قومی مدد سے نشوونما پا کر یونیورسٹی کے درجہ کو پہنچ جاوے گا۔

حضرات! خصوصیت ہماری یونیورسٹی کو ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے ہوگی، اُس کا ایک سرسری نقشہ میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ اب میں یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ کس قسم کی تعلیم اس میں دی جاوے گی اور مذہبی اور اخلاقی اور مشرقی یعنی عربی و فارسی وغیرہ کی تعلیم کا کیا انتظام ہوگا۔ حضرات! مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم اور غور طلب ہے، اور اس بات کا تحقق طور پر بتانا کہ کس قسم کی تعلیم مجوزہ یونیورسٹی میں دی جاوے گی، نہایت مشکل ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ہر مسلمان کو اپنی قطعی رائے ظاہر کرنے کا نہ صرف استحقاق حاصل ہے بلکہ میرے خیال میں فرض ہے۔ او قبل اس کے کہ وہ وقت آوے کہ ہمارا ارادہ عملاً ظاہر ہو اور یونیورسٹی قائم۔ ایک تفصیلی تجویز تعلیم کی پیش کرنی ناممکن ہے۔ خدا جب وہ وقت لاوے گا تو ایک بڑے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی جماعت کی صلاح سے تعلیم کا تصفیہ ہوگا۔ مگر یہ بات میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جب سرسید نے ابتدا میں یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو اُس وقت یعنی ۱۸۵۷ء میں آنریبل سید محمود صاحب نے ایک نہایت عمدہ اسکیم تعلیم کے متعلق لکھی تھی اور سرسید مرحوم نے اُسے کسی قدر اصلاح کے بعد کیٹی فرمیتہ البضاعت کی منظوری سے شائع کیا تھا۔ چنانچہ وہ تہذیب الاخلاق ۱۵۱-۱۵۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ اُس اسکیم کے دیکھنے سے آپ کو تفصیل معلوم ہو سکیگا کہ مجوزہ یونیورسٹی میں اُس وقت کس قسم کی تعلیم دینے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ اور تعلیم کے کتنے درجے مقرر کئے گئے تھے اور اُس کے لئے کیا انتظام سوچا گیا تھا۔ یہیں خلاصہ اُس کا آپ کے سامنے بیان کرنا ہوں :-

اُس میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ اس دارالعلوم کے دو ڈپارٹمنٹ ہونے چاہئیں۔ اول سکول ڈپارٹمنٹ۔ دوم کالج ڈپارٹمنٹ۔

کالج ڈپارٹمنٹ کی نسبت تجویز کیا گیا تھا کہ اُس کے دو درجے ہونگے۔ ایک اونے، دوسرا اعلیٰ۔ درجہ اونے کا مقصد علم کی عام شناخت میں تعلیم دینا ہوگا اور درجہ اعلیٰ کا مقصد کسی خاص علم میں جس کو لاہل علم پسند کرے نہایت کامل اور انتہائی تعلیم دینا ہوگا۔

کالج کے درجہ اونے کی پڑھائی چار برس ہوگی اور اُس میں عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، لیٹن، کرگٹ، بانوں میں سے دو زبانیں سکھائی جاوے گی۔ اور علوم میں ریاضی، علم الحکمت، علم نقل الہیات، علم مناظرہ بالہندسہ، علم آواز، علم مناظرہ طبعی، علم منطق، علم بیان، فلسفہ ذہنی و اخلاقی، اصول علم سیاست مدن، تاریخ عام قدیم و جدید۔ اور علوم طبیعیات یعنی نیچرل سائنس پڑھائے جائیں گے۔ کالج کے درجہ اونے کی دینیات کی شائع میں فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ علوم جو مذہب

اہل سنت جماعت میں اور مذہب جیسا ثنا عشریہ میں پڑھائے جاتے ہیں، پڑھائے جاویں گے۔
 کالج کے درجہ اعلیٰ میں درجہ اوئے کے امتحان یافتہ داخل ہونگے اور اُس میں دو برس تک پڑھائی
 ہوگی اور طالب علم کو اختیار ہوگا کہ مفصل ذیل زبانوں اور علوم میں سے کسی زبان اور کسی علم کو پسند کرے۔
 زبانوں میں سے عربی مع عبری و سریانی۔ انگریزی مع ایٹلیو سیکسن۔ سنسکرت مع ہندو فارسی۔ سنسکرت
 مع پراکرت و پالی۔ کوئی ایک قسم کی زبان پسند کرے جاسیگی۔

اور علوم منہج مع علم بیان و فلسفہ ذہنی و اخلاقی۔ علم انتظام سیاست مع فلسفہ متعلق سیاست
 و فن تاریخ۔ علوم ریاضی۔ علوم طبیعیات میں سے کوئی ایک علم۔
 دینیات میں فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ اعلیٰ درجہ کی سنی اور شیعہ ہر فرقہ کے مطابق علحدہ
 علحدہ ہوگی۔

جو لوگ اعلیٰ درجہ کے امتحان میں کامیاب ہونگے اُن میں سے جو کوئی فیلوشپ یعنی تعلیم رفا
 مدرستہ العلوم کی خواہش کرے گا، اُس کا پھر امتحان مضمونوں کے سمجھنے کے ذریعہ سے لیا جائیگا اور فیلوشپ
 کے لئے ۳۰ وظیفے مقرر ہونگے اور ہر وظیفہ چھ سو روپیہ سالانہ کا اور ہر فیلو کو حدود مدرستہ العلوم میں رہنا
 پڑیگا۔ منجملہ ان ۳۰ وظیفوں کے ۵ وظیفے دینیات کے لئے ہونگے۔

یہ ایک سرسری خلاصہ اور خاکہ اُس نقشہ کا ہے جو نیورسٹی قائم ہونے اور کالج کے پورے اور
 مکمل ہونے کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔

مگر جب مدرسہ قائم ہوا تو کالج میں دو ڈپارٹمنٹ کھولے گئے۔ اول انجمن ڈپارٹمنٹ جس میں
 تمام علوم انگریزی زبان میں پڑھائے جاتے اور عربی یا فارسی یا سنسکرت بطور سیکنڈ لینگویج کے پڑھائے
 جاتے۔ دوم اورینٹل ڈپارٹمنٹ جس میں علم ادب عربی یا فارسی زبان میں اور تاریخ جغرافیہ اور ریاضی
 وغیرہ علوم فنون اردو زبان میں پڑھائے جاتے، اور انگریزی بطور سیکنڈ لینگویج کے سکھائی جاتی۔
 گراؤینٹل ڈپارٹمنٹ کے کچھ ترقی نہیں کی اور آخر وہ توڑ دیا گیا۔

بعد وفات سر سید کے جب کہ اُن کی یادگار میں مدرستہ العلوم کو محمدان یونیورسٹی کے درجہ پر
 پہنچانے کی تجویز کی گئی تو ایک کمیٹی خاص سلسلہ تعلیم کے تجویز کرنے کے لئے مقرر کی گئی مگر ابھی وہ پورے
 طور پر قائم نہیں ہوئی، اور نہ سلسلہ تعلیم پورے طور پر قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ نہایت مشکل کام ہے اور
 نہایت لائق اور عالم لوگوں کی صلاح و مشورہ کا محتاج ہے۔ مگر یقیناً اُس میں دینی اور دنیوی دونوں
 قسم کی تعلیم ہوگی اور اُس کے ساتھ تربیت کا مکمل انتظام کیا جائیگا۔ اُس یونیورسٹی میں غالباً تین
 فیکلٹیز ہونگی (۱) مغربی علوم کے واسطے (۲) مشرقی علوم کے لئے (۳) سائنس کیلئے، اور ہر ایک فیکلٹی کے
 لئے ضروری پروفیسر رکھے جائیں گے۔

مغربی علوم کی تعلیم میں یہ چیزیں ہونگی :-

(۱) انگریزی لٹریچر (۲) زبان انگریزی (۳) فلسفہ (۴) ریاضی خاص (۵) ریاضی عام (۶) تاریخ
(۷) پولیٹیکل اکانمی (۸) پولیٹیکل سائنس (۹) قانون (۱۰) ماڈرن فرینچ اور جرمن زبانیں (۱۱) کلاسیکل
یونانی اور لیٹن زبانیں *

مشرقی فیکلٹی، میں یہ زبانیں پڑھائی جاوے گی :-

(۱) علم ادب عربی (۲) تاریخ (۳) فارسی (۴) سنسکرت (۵) دینیات مذہب اہل سنت و جماعت
و مذہب شیعہ اثنا عشریہ، جس میں فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ وہ علوم مذہبی پڑھائے جاوے گئے۔ اور وہ کتابیں
درس میں داخل ہونگی جن کو ہر فرقہ کے مستند علما اور دینداروں کی کمیٹی تجویز کریگی *
فیکلٹی آف سائنس، اس قدر غیر محدود ہے کہ اس وقت اور اس موقع پر اس کی تشریح کی
کی ضرورت نہیں *

یہ امر کہ مغربی اور مشرقی تعلیم علیحدہ علیحدہ رکھی جائے یا ملائی جائے ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس پر لوگوں
کی رائیں مختلف ہونگی۔ اور یہ بات کہ دینی اور دنیوی تعلیم کو یکسر ملائی جائے اور مسلمانوں کی تعلیم کا ایسا
نصاب کیونکر مقرر کیا جائے کہ جس سے ڈگری ہر دو لغزیز ہو جائے اور علمی لیاقت بھی اچھی پیدا نہ ہو نہایت
غور طلب ہے۔ اور جب تک کہ نہایت اعلیٰ درجہ کے لوگوں سے جو مشرقی اور مغربی علوم میں کامل یا
دونوں سے واقف ہوں اسے نہ لیجاوے، اور اس پر بڑی بحث نہ ہو، اس کا تصفیہ اس وقت نہیں
ہو سکتا مگر اس اصول کو یقینی اور لازمی سمجھ لینا چاہئے کہ دنیوی تعلیم کے ساتھ دینیات کی تعلیم ہر شخص پر
لازم ہوگی۔ اور مشرقی علوم کی تعلیم کی بھی ایک شاخ قائم کی جاوے گی *

تعلیم کے علاوہ تربیت بھی ایک نہایت ضروری چیز ہے جس کے بغیر تعلیم بیکار اور بے سود ہے
اور اس کے لئے بھی یہ امر تصفیہ طلب ہے۔ کہ کالج میں طالب علموں کا رہنا لازمی قرار دیا جائے یا نہیں
جو لوگ اس زمانہ کی مغربی تعلیم و تربیت کے اصول و فوائد سے واقف ہیں وہ بالعموم یہ رائے دینگے
کہ سکونت ہر طالب علم کی کالج کے احاطہ کے اندر لازمی قرار دی جائے۔ تاکہ محمد بن یونیورسٹی کے ڈگری پانٹ
کے معنی صرف یہ نہ ہوں کہ وہ دنیوی اور دینی علوم میں ایک خاص قابلیت رکھتا ہے۔ بلکہ اس سے یہ بھی
ظاہر ہو کہ وہ ایک قابل تربیت یافتہ قوم کا رکن ہے۔ بعض لوگ غالباً اس سکونت کے لازمی قرار دینے
جانے سے اختلاف کریں گے۔ اور اس لئے اس امر کا فیصلہ بھی بعد غور اور بحث کے ہو گا۔ میری ذاتی رائے
تو یہ ہے اور یہی رہیگی۔ کہ یہ امر لازمی قرار دیا جائے۔ اس لئے کہ تربیت صرف عمدہ بچوں اور اچھے
و عظموں سے نہیں ہو سکتی بلکہ اعلیٰ قسم کی تربیت اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ تمام اڑکے لائق پر و خیر
کی زیر نگرانی ایک جگہ رکھے جاویں، ان کے لئے ورزش کا سامان مہیا کیا جائے، اور ان کی فرصت کا

وقت علمی جلسوں اور اعلیٰ درجہ کی اخلاقی سوسائٹی میں صرف ہوا، طالب علموں اور پروفیسروں کے باہمی میل جول سے ایک خاص قسم کے عمدہ خیالات پیدا ہوتے ہیں، جن کا اثر عالمانہ لکچروں اور پُر زور تقریروں اور پائینہ و غنطوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ جو طالب علم علاحدہ ایک مکان میں رہتے ہیں، ان کی فرصت کا وقت یا تو شہر کی بڑی سوسائٹی اور بازار کی بھر میں صرف ہوتا ہے، جس کا اثر ان کے چال چلن پر بہت بُرا پڑتا ہے یا کُستی اور پُرسے رہنے میں بالکل ضائع ہوتا ہے جس سے آئندہ زندگی میں کسی کام کے کرنے کا جوشش ان میں باقی نہیں رہتا۔

حضرات! متعلق تعلیم و تربیت مجوزہ محمدان یونیورسٹی کے تین ضروری باتیں عرض کر چکا۔ اب میں عرض کرتا ہوں کہ جو روپیہ جمع ہوگا، وہ کس کی حفاظت میں رہیگا، اور کس کے اختیار سے خرچ ہوگا۔ اور جب تک پورا روپیہ نہ ہو سربا یہ جمع شدہ سے کیا کیا جائیگا۔

صاحبو! جو اجلاس میموریل فنڈ کمیٹی کے اب تک ہوئے ہیں، ان میں یہ امور قرار دئے گئے ہیں۔

اول۔ جو روپیہ جمع ہوگا وہ اگر گورنمنٹ منظور کرے تو صاحب کلکٹر علی گڑھ کی حفاظت میں علی گڑھ کے خزانہ میں رکھا جائیگا۔ ورنہ بینک آف بنگال میں امانت رہیگا۔ کسی ممبر یا سکریٹری یا پریسیڈنٹ میموریل فنڈ کمیٹی کے قبضہ میں یا کسی اور جگہ نہ رہیگا۔

دوم۔ ہر شخص کو جو روپیہ دے ضابطہ کی رسید دیجائیگی۔

سوم۔ جو روپیہ جمع کیا جائیگا وہ اسی چیز میں صرف ہوگا جس کے لئے وہ جمع کیا گیا ہے۔

چہارم۔ بد نصیبی سے جو روپیہ کالج کا نفعن ہو گیا ہے اور جو قرضہ بینک وغیرہ کالج کے ذمہ سرسید کے زمانہ تک کا ہے وہ میموریل فنڈ سے ادا کیا جائیگا۔

پنجم۔ کالج کے معمولی اخراجات میں سے کسی قسم کا خرچ میموریل فنڈ کے اصل سٹریکیٹل فنڈ سے نہ ہوگا۔

ششم۔ جو روپیہ بعد ادا کے قرضہ نفعن کے باقی رہیگا۔ وہ میموریل کپٹل فنڈ میں جمع ہوگا، اور اس سے گورنمنٹ پرائمری نوٹ یا ٹرسٹ ٹرسٹ منٹ خریدے جاویں گے۔ اور جو روپلیس شرط پرویا جاویگا کہ سود میں نہ لگایا جائے وہ روزیہا سے دوامی یا اراضی معافی دوامی یا حقوق زمینداری کی خرید میں لگایا جاویگا اور جب تک ایسی جائداد خریدی جاوے روپیہ امانت رہیگا۔ ہفتہم۔ جو مسلمان چندہ دینے کے وقت یہ شرط کر گیا کہ اُس کا خطیہ تعلیم مذہبی مشیہ یا سنی میں خرچ ہو تو وہ اُسی طرح خرچ ہوگا۔

ہشتم۔ واسطے تجویز اور منظور کرنے خرچ کے جو اس میموریل فنڈ یا اس کے منافع سے ہو۔

ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز مقرر ہوا ہے جس میں علاوہ میرے یہ لوگ شامل ہیں :-

نواب خاں الملک مولوی محمد شتاق حسین صاحب * حاجی محمد عیسیٰ صاحب *

صاحبزادہ آفتاب احمد صاحب * مرزا محمد حیات خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی *

مشیر الدولہ ممتاز الملک خلیفہ سید محمد حسین خاں بہادر * خان بہادر محمد رکنت علی خاں صاحب *

آزیز بیل سید محمود * ممتاز الدولہ نواب محمد فیاض علی خاں بہادر *

نواب علی دالملک لوی سید حسین صاحب بلگرامی * محمد منزل اللہ خاں صاحب *

مسٹر قیوڈو ربیک *

اور اس لوکل کمیٹی کا پریسیڈنٹ جس نے دو ہزار روپے سے زیادہ اس فنڈ کے لئے روپیہ جمع کیا ہو۔

اور بذریعہ خط کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شریک ہونا پسند کرے اور اس کے سکرٹری بالفعل

قیوڈو ربیک صاحب مقرر ہوئے ہیں *

شہم۔ کالج کے ٹرسٹیوں کو اس روپیہ سے کچھ تعلق یا اس پر کچھ اختیار نہ ہوگا، بلکہ میمبیل فنڈ

کے مقرر کردہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے اختیار میں ہوگا کہ پابندی ضوابط مقرر کردہ میمبریل فنڈ کمیٹی

کے وقت فوقتہ جس قدر مناسب اور ضروری خیال کریں اس فنڈ میں سے کالج کے ٹرسٹیوں کو

رقم مجوزہ حوالہ کریں *

دہم۔ بعد ازاں قرضہ بنک وغیرہ کے جو ذمہ کالج کے سرسید کے زمانہ کا ہے جب تک

دولاکھ روپیہ جمع نہ ہو جاوے تکے کیٹل فنڈ میں سے کسی کام میں کچھ خرچ نہ ہوگا۔ صرف اس کے منافع

کی آمدنی ضروری اخراجات کالج میں لگائی جاوے گی *

یازدہم۔ آمدنی اور خرچ کا ایک تفصیلی نقشہ ہر مہینہ بذریعہ اخبارات کے پبلک کی اطلاع کیلئے

شائع ہوا کرے گا اور ہر ششماہی پر ایک سرٹیفیکٹ بنک آف بنگال یا کلکٹری کے خزانہ کا جہاں اس فنڈ کا

روپیہ نقد یا پرامیٹری نوٹ وغیرہ کے ذریعہ سے جمع ہو عام کی اطلاع کے لئے چھاپ دیا جائے گا۔

جس میں یہ درج ہوگا کہ اس قدر روپیہ تیار کیا اس کے پرامیٹری نوٹ وغیرہ امانت میں جمع ہیں۔

اور اس پر اس امین کے خواہ وہ کلکٹر ضلع ہو یا بنک آف بنگال کا مینجر یا ضابطہ دستخط ہونگے۔ تاکہ

پبلک کو یقیناً معلوم ہو سکے۔ کہ فلاں فلاں خزانہ میں اس قدر روپیہ اس مد کا موجود ہے *

دوازدہم۔ جو رقم بذریعہ چیک کے خرچ کے لئے منگائی جائے اگر وہ ایک ہزار یا

ایک ہزار سے کم ہو۔ تو اس پر سکرٹری بورڈ آف ڈائریکٹرز کے دستخط کافی ہونگے۔ اور اگر اس سے

زیادہ ہو تو علاوہ سکرٹری کے اس کمیٹی کے پریسیڈنٹ اور وائس پریسیڈنٹ کے بھی دستخط چیک پر

لازمی ہونگے *

حضرات! متعلق مجوزہ یونیورسٹی کے جتنی ضروری باتیں تھیں وہ میں بیان کر چکا اور جو خدائیں کے لئے جمع ہوگا اُس کی حفاظت اور تحسین کے لئے جو قابل اطمینان انتظام کیا گیا ہے وہ بھی میں آپ کو سننا چکا۔ اب مجھے چند ضروری باتیں عرض کرنی باقی ہیں :-

اول یہ کہ محمدن کالج کیونکر یونیورسٹی بنایا جائیگا ؟

دوم یہ کہ گورنمنٹ سے یونیورسٹی کے چارٹر یعنی سند ملنے کی کیا امید ہے ؟

سوم یہ کہ دس لاکھ کی مجوزہ رقم کیونکر جمع ہو سیکگی ؟

چہارم یہ کہ صورتحال یہی اس کام میں مالی مدد دینے کے لئے کیوں مقدم سمجھا گیا ؟

حضرات! پہلے امر کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ محمدن یونیورسٹی کوئی علیحدہ چیز نہ ہوگی بلکہ جس طرح کہ اسکول سے کالج بن گیا۔ کالج ترقی پاتے پاتے یونیورسٹی بن جاوے گا۔ اور وہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم مغربی علوم کے ساتھ مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام کریں۔ دینیات کی تعلیم کو ترقی پاتے پاتے جو علوم کالج میں اب نہیں پڑھائے جاتے اُن کے پڑھائے جانے کا بندوبست کریں۔ طلبہ کے لئے زیادہ وظیفے مقرر کریں۔ اُن کی تعداد بڑھائیں بقدر ضرورت لائق پرفیسر جمع کریں۔ اور جب کالج میں طلبہ اور پروفیسروں کی تعداد اس قدر ہو جاوے جتنی کہ تین یا چار کالجوں میں ملکر ہوتی ہے۔ تب ہم اپنی مرضی کے مطابق نصاب تعلیم مقرر کرنے کی تجویز اور گورنمنٹ سے ڈگری دینے کے لئے چارٹر ملنے کی درخواست کریں ؟

صاحبو! یونیورسٹی کوئی بنی بنائی چیز نہیں ہے جو بازار میں بکتی ہو۔ کہ ہم اُسے جا کر خرید لائیں نہ ہمارے پاس ایک دم سے اتنا روپیہ ہو سکتا ہے کہ ہم اُس کی قیمت ادا کر سکیں۔ یونیورسٹی حقیقت صرف لائق پروفیسروں۔ فیلوز۔ اور طالب علموں کی بڑی تعداد کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ ایک دم حاصل ہو سکے۔ اُس کی تو یہی صورت ہے کہ جیسے جیسے ہماری آمدنی بڑھتی جے، اُسی نسبت سے کالج کو ترقی دیتے جائیں تاکہ رفتہ رفتہ جس طرح ایک پودا نشوونما پا کر درخت بن جاتا ہے۔ ہمارا کالج بھی ایک عالیشان اور بزرگ انسٹیٹیوشن ہو جائے اور اس طرح جس یونیورسٹی کی ہم کو خواہش ہے اُس کی سی وسعت حاصل کرے اور محمدن کالج کے بجائے محمدن یونیورسٹی ہو جائے ؟

رہا یہ امر کہ ہم گورنمنٹ سے یونیورسٹی کے چارٹر یعنی سند ملنے کی کیا امید ہے۔ اس کی نسبت بعض ناواقف لوگوں کا خیال ہے کہ سرسید مرحوم نے جو اول ارادہ یونیورسٹی قائم کرنے کا کیا تھا اُسے اس لئے ترک کر دیا کہ گورنمنٹ سے اُس کی منظوری حاصل کرنے میں مشکلات معلوم ہوئیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ ان کا ارادہ یونیورسٹی قائم کرنے کا اخیر وقت تک قائم رہا جیسا کہ میں

خود اُن کی تحریروں سے اوپر ثابت کر چکا ہوں، مگر وجہ نہ ہونے کا فی سلسلہ کے جو یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے ضرور تھا اُن کا ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ یونیورسٹی تو اُسی وقت قائم ہو سکتی تھی، جب کہ محمل کالج میں طالب علموں اور پروفیسروں کی تعداد تین یا چار کالجوں کے برابر ہوتی۔ یا اس ملک میں چند اور مسلمان کالج ایسے ہوتے جو یونیورسٹی میں شامل کئے جاسکتے۔ کمبریج میں ۱۴ کالج ہیں اور تین ہزار طالب علم اُن میں پڑھتے ہیں۔ تب اُس کے لئے ایک یونیورسٹی قائم ہے۔ ہمارے یہاں جب تک کم سے کم ایک کالج یا متعدد کالجوں میں ایک ہزار طالب علم بھی نہ ہوں کیونکہ یونیورسٹی قائم ہو سکتی تھی اور یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ یونیورسٹی قائم کرنا تعلیمی کوششوں کا آخری درجہ ہے۔

پہلا درجہ تعلیم کا اسکول کا قائم کرنا ہے۔ پھر کالج پھر یونیورسٹی کا، صدارت جمہوریت کی مشیت اُن کی مرضی کے موافق کہاں اتنا روپیہ ملا کہ وہ سب درجے ایک ہی مرتبہ قائم کر دیتے۔ جیسے جیسے یہ اُن کو ملتا گیا اُسی کے مطابق وہ تعلیمی درجے قائم کرتے گئے۔ یکم جون ۱۹۴۷ء میں اسکول کی جگہیں قائم کیں۔ یکم جنوری ۱۹۴۸ء سے ایف۔ اے، کی پڑھائی شروع کی۔ اور یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے بی۔ اے، کی اور ۱۹۵۰ء میں آخری درجہ ایم۔ اے کا قائم کیا۔ اگر اُن کو اُن کی خواہش کے مطابق کافی سرمایہ ملتا، تو وہ بالضرور یونیورسٹی کے قائم کرنے میں کامیاب ہوتے اور مجھے پورا یقین ہے کہ گورنمنٹ خوشی سے اُن کی درخواست منظور کرتی۔

اب جو ہم نے پھر جمہور کی یادگار میں اُن کی اُس خواہش کے پورا کرنے کا ارادہ کیا ہے اس میں بلاشبہ لوگوں کو یہ خیال ہو گا کہ گورنمنٹ ایسی اجازت نہیں دیگی۔ مگر صرف میرے خیال میں بلکہ اکثر اہل الرائے انگریزوں کے نزدیک گورنمنٹ کی نسبت ایسا خیال کرنا غلطی ہے۔ اور گو ہم کو اس بات کے کہنے کا استحقاق نہیں ہے مگر ہم بہت سی ایسی وجوہ رکھتے ہیں جس سے گورنمنٹ کی منظوری کی امید ہو سکتی ہے۔

اول یہ کہ۔ گورنمنٹ کی ہم کو عام پالیسی معلوم ہے کہ اُس نے اعلیٰ تعلیم کی ذمہ داری اپنا فرض سمجھ کر اپنے ذمہ نہیں لی ہے بلکہ بھجوی۔ اگر اعلیٰ تعلیم کا انتظام کوئی قوم اپنی خواہشوں اور حاجتوں اور گورنمنٹ کے اطمینان کے لائق کرے، تو ضرور مدبران سلطنت کبھی اعلیٰ تعلیم کو اپنے ذمہ نہ لیں۔

دوم یہ کہ۔ بہت سے مدبران سلطنت اور اکثر صاحب الرائے انگریزوں کی یہ خواہش ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہندوستان کے باشندوں کو خود کرنا چاہئے۔ پس اگر کوئی قوم اپنی تعلیم کا انتظام اپنے ذمہ نہیں لینا چاہے اور گورنمنٹ کو اُس پر پورا اطمینان ہو تو گورنمنٹ بجلاس کے کہ اس میں عامل ہو اُس میں مدد کرنے سے خوش ہوگی اور جو کام مجبوری سے اُس نے اپنے ذمہ لیا ہے یعنی

اعلیٰ تعلیم کا دینا اُس سے سبکدوش ہو کر اپنا اصلی فرض یعنی ادنیٰ تعلیم کا دینا اپنے ذمہ رکھ لیں۔ اور
 یہ خیال میرا اُن تحریروں اور تقریروں پر مبنی ہے جو اُن ممبرانِ سلطنت نے کی ہیں جن کے ہاتھ
 میں اس ملک کی حکومت کی ضمان ہے۔

ہر کسلسی لارڈ لٹن کو جب کہ وہ کالج کے فونڈیشن کی رسم ادا کرنے کے لئے عید گئے
 تشریف لائے تھے جو ایڈریس دیا گیا تھا اُس میں سر سید نے بائیان کالج کا یہ ارادہ صاف ظاہر کر دیا
 تھا کہ ”آئندہ یہ کالج یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچا جائیگا“ اور گورنمنٹ سے مدد ملنے کی امید بھی ان لفظوں
 میں ظاہر کی تھی ”ہم کو اس باب میں کچھ شبہ نہیں ہوتا کہ گورنمنٹ انگریزی اور ہمارے خاص ہ وطن
 دونوں ایسے فیاضانہ طریقہ میں ہماری اس سے بھی زیادہ مدد کرتے رہیں گے جس کی بدولت ہمارے
 ارادوں کو وسعت حاصل ہوئی ہے تاکہ جو بیج ہم آج بونے ہیں اُس سے ایک ایسا زبردست درخت
 پیدا ہو جس کی شاخیں اس ملک کے بڑے درخت کی مانند پھر زمین میں مضبوط جڑ پکڑ جائیں گی اور اُن سے
 نئے قوت دار پودے پیدا ہونگے۔ اور یہ کالج پھیل کر ایک یونیورسٹی ہو جائیگا“ اس کے جواب میں
 ہر کسلسی نے جو کچھ فرمایا وہ اس خواہش کے پورا ہونے کے لئے نہایت امید دلانے والا تھا۔
 پہلے لارڈ ممدوح نے یہ فرمایا کہ ”جس تقریب کے لئے ہم اس وقت جمع ہوئے ہیں وہ تقریب ہندوؤں
 کی حالت معاشرت کی اُس ترقی میں جو زمانہ حکومت انگریزی میں ہوئی ہے ایک نیا دور قائم کرتی ہے“
 اور پھر فرمایا کہ ”گورنمنٹ ہند کو کوئی بات اس سے زیادہ توجہ سے منظور نہیں ہے کہ اُس کی تمام رعایا اعلیٰ
 سے ایک ادا کرنے تک اُس کی حکومت کے سیدھے سادہ اصول کو کامل طور سے سمجھ لیں۔ مگر میرے نزدیک
 یہ فیصلہ اُس وقت تک پورا پورا حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ انگریزی طرز حکومت کے بڑے بڑے
 مسائل صرف ہندوستانی زبان ہی میں نہ ہو جاویں بلکہ ہندوستانیوں کے خیالات میں بھی پڑ جاویں
 یہ بات ظاہر ہے کہ ایسے کام کے لئے تربیت یافتہ ہندوستانیوں کا ایک گروہ دو چند انگریز عہدہ داروں
 یا بیس گنہ یورپین عالموں سے زیادہ لائق ہے اور میں سچ کہتا ہوں کہ جو لوگ اس کام میں کامیاب
 ہونگے وہ صرف گورنمنٹ ہی کے حق میں نہیں بلکہ اپنے تمام وطنوں کے حق میں ایک ایسی خدمت
 کرینگے کہ اُس کی جس قدر قدر کی جاوے تھوڑی ہے اور جبکہ میں دل سے اُس کامیابی پر جس سے
 آپ اُن مشکلات پر غالب ہوئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں تو میں صرف آپ ہی کو اس کامیابی پر
 مبارکباد نہیں دیتا، بلکہ ہندوستان کی تمام شاہنشاہی کو اس امید سے مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ
 آپ کی کامیابی اور جگہ بھی اسی قسم کے ارادوں کی تحریک کا نہ صرف عقلی تربیت کی اشاعت کے لئے
 بلکہ اُس چیز کے لئے جو اُس سے بھی زیادہ اہم یعنی عقلی تربیت کی قدر دانی کے لئے ذریعہ ہوگی۔“
 آنریبل ڈیپوٹنٹ سیکرٹری ایجوکیشن نے اپنی ۱۰ اگست ۱۸۸۵ء کی اسپیچ میں جو محفل

میں دی تھی یہ فرمایا کہ ”ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے آنے کو لوگ سیلف ہیلپ یعنی اپنے آپ کسی کام کرنے کی اس عمدہ نظیر کی نسبت ہمارے پسند کی ایک عام نشانی تصور کریں گے۔ اگر سیلف ہیلپ کی اس قسم کی چند مثالیں اور موجود ہوں تو ہندوستان میں ایک پوزیشن کمیشنوں کی کچھ ضرورت نہ ہوگی۔“

انڈین ایجوکیشن کمیشن جو ۱۸۸۳ء میں قائم ہوئی تھی اُس نے اپنی رائے اس کالج کی نسبت یہ ظاہر کی کہ ”علی گڑھ سوسائٹی نے بلاشبہ ایک ایسی نظیر قائم کی ہے کہ اگر اُس کی پیروی کسی بڑے درجہ تک کی جاوے تو وہ قومی تعلیم کے مسئلہ کو حل کر دیگی اور جن شخصوں نے ایسی سرگرمی اور جانفشانی کے ساتھ کوششیں کی ہیں اُن کی نسبت نہایت اعلیٰ درجہ کے ستائش آمیز الفاظ میں ذکر کرنا، یا اُس رفیق و مددگار کی قدر و منزلت کا حد مناسب سے زیادہ اندازہ کرنا مشکل ہے جو گورنمنٹ کو تعلیم ترقی کے باب میں مل گیا ہے۔“

ہزار سرائف ڈالٹ لٹل فٹنٹ گورنر مالک مغربی و شمالی پنجاب ایڈریس کے اس کالج کی نسبت یہ کہا تھا کہ ”اس نظیر کے قائم کرنے سے اس کالج کے بانیوں نے گورنمنٹ اور رعایا اور عوام ہندوستان کی تعلیم کے حق میں ایک عمدہ خدمت کی ہے کیونکہ وہ ہم کو ایک ایسے مسئلہ کے حل کرنے میں مدد دے رہے ہیں جو شاید ہی دنیا کے کسی حصہ میں خاطر خواہ طور پر حل ہوا ہے یعنی سلطنت اور اُس کی رعایا کی تربیت یافتہ قوموں کے باہمی اتفاق کے ذریعہ سے ایک ایسے طریقہ میں تعلیم کے سرانجام دینے کا مسئلہ جو لوگوں کی میلان طبع کے موافق ہو اور جس سے تعلیمی ضرورتیں رفع ہوں اور تعلیم رعایا کے اصلی خیالات کے موافق ہو جائے، جو مقصد کہ ہم سب کو مد نظر ہے وہ بالکل عیاں اور بغیر کسی شبہ کے ہے۔ یعنی ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمام فرقہ کے لوگوں کو اُن کی حیثیت اور لیاقت اور ضرورتوں اور جو موقع اُن کی تعلیم و تربیت سے نفع اُٹھانے کے واسطے حاصل ہو اُن کے موافق تعلیم دیا جاوے۔“

سر چارلس کرسٹھویت، نے ۱۸۹۳ء میں پنجاب ایڈریس کے محمدن کالج کی نسبت فرمایا تھا۔ کہ ”اُس سے بہتر کوئی کام نہ صرف ان ضلع اور ہندوستان کے دوسروں حصوں کے مسلمانوں اور نیز بہت سی اور قوموں کے واسطے جو اس برس ملک میں آباد ہیں بلکہ نیز اُس گورنمنٹ کے واسطے بھی نہیں کیا جاسکتا ہے جس کے ذمہ اُس کے انتظام کی ٹری ذمہ داری ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ایک انسٹیٹیوشن جو مثل اُس کے اُن لوگوں کی کوششوں سے قائم ہوا ہو، جن کے واسطے وہ مقصود ہو، گورنمنٹ یا کسی دوسری خارجی قوت کے کام کی نسبت غالباً زیادہ تر کامیاب ہوگا۔“

ہزار سرائف ڈالٹ لٹل فٹنٹ گورنر اس مالک نے جو جواب ٹرسٹیان کالج کے ایڈریس کا ۲۴ جنوری ۱۸۸۴ء کو دیا تھا اُس میں فرمایا تھا کہ ”میں صاف قی کے ساتھ یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ

میں اس انسٹیٹیوشن کو نہایت عزت کے لائق سمجھتا ہوں جس طرح پر کہ میں ایک شخص کو پسند کرتا ہوں اُسی طرح پر میں اُس انسٹیٹیوشن کو پسند کرتا ہوں جو اپنے آپ پر پھر دوسرے رکھتا ہو اور فخر پر غور پر آزاد ہو اور کچھ ساتھ گورنٹ کی فیاض مدد مہربانی کی وجہ سے پورے پورے کرتا میں ایک ایسے کالج کی قدر کرتا ہوں جیسا کہ یہ ہے جو اس حالت میں جب کہ وہ خاص اپنے عقیدہ کی تلقین کرتا ہے دوسرے شخصوں کے اعتقادات کی نسبت تھملا نہ برتاؤ کرتا ہے۔ آپ کے ایڈریس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کالج میں ”مذہبی تعلیم دنیوی تعلیم کے ساتھ دیجاتی ہے“ یہی وہ طریقہ تعلیم ہے کہ جب کبھی مجھ کو موقع ملا ہے تو میں نے اس لحاظ سے کہ وہ سچا طریقہ ہے ہمیشہ اُس کی نسبت سفارش کرنے کے لئے کوشش کی ہے۔ اخلاق کے بڑے بڑے اصول کسی خاص قوم یا فرقہ کا حصہ نہیں ہے مسلمانوں اور ہندوؤں اور نیرعیسائیوں کے کالج میں یہ اصول وہ تلقین کئے جاسکتے ہیں اور اس بات کے معلوم ہونے سے مجھ کو نہایت رضامندی حاصل ہوئی ہے کہ اس کالج کے ڈائریکٹر اس کا وعدہ کو تسلیم اور اس پر عمل کرتے ہیں کہ (مطابق اُن الفاظ کے جو اس امر کی نسبت ایڈریس میں بیان کئے گئے ہیں) دنیوی تعلیم بغیر مذہبی تعلیم و تربیت کے ایک بے سود و غیر مؤثر کام ہے۔

اس کے بعد ہزار نے صاف صاف لفظوں میں اس کالج کو ترقی پا کر آئندہ محمدان یونیورسٹی ہو جانے کی امید کی نسبت یہ الفاظ فرمائے:-

“Gentlemen, I shall not detain you longer, but before I conclude I must wish this College every success, I wish it all the success which was hoped for in the eloquent words addressed to Lord Lytton when he laid the foundation stone nearly twenty years ago. It is not too much to hope that this college will grow into the Mohammedan University of the future; that this place will become the Cordova of the East and that in these cloisters Mohammedan genius will discover, and under the British protection; work out that social, religious and political requireration, of which neither Stamboul nor Mecca afford a prospect.”

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ:-

اے صاحبو! میں تم کو زیادہ تر تحفہ نہیں دینا چاہتا ہوں بلکہ تم کو اس کے کہیں اپنی گفتگو ختم کروں، میرا اس کالج کے

حق میں طرح پر سیاہی کی عالمگنتا ہوں یعنی میں کو حق میں سے پھیلنے پر کامیابی کی عالمگنتا ہوں جس کی امید ان نصیح افہاظ میں ظاہر کی گئی تھی جو لارڈ ملٹن کی خدمت میں اُس وقت عرض کئے گئے تھے جب کہ انہوں نے قریب بیس برس پہلے اس کالج کی بنیاد کا پتھر رکھا تھا۔ اس بات کی اُمید کرنا ”کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ یہ کالج ترقی پا کر آئندہ مسلمانوں کی بڑی درس گاہ ہو جاوے گا اور یہ مقام مشرق کا قریب ہو جاوے گا اور ان جہروں میں مسلمان اپنی فہم و کدوت سے اُس سوشل اور پالیسی اور پولیٹیکل سرسٹری کی تدبیر سوچیں گے جس کی نہ استینول اور نہ مکہ میں توقع ہو سکتی ہے اور گورنمنٹ انگریزی کی حمایت میں اُس پر عمل کریں گے۔

میں نہیں سمجھتا کہ جو کچھ میں نے آپ کو سنایا اُس کے سننے کے بعد علی الخصوص جو صاف صاف امید ہزار سرسٹینی پلرک مکڈانل صاحب بہادر فٹنٹ گورنر جاک مغربی و شمالی نے دلائی ہے کسی اس بات کے خیال کرنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ اگر قوم اس کے لئے کافی سرمایہ جمع کر دے اور جن اہل کالج کالج قائم کیا گیا ہے وہی اہل نہایت استحکام کے ساتھ قائم رکھے جائیں اور جو اطمینان گورنمنٹ کو اس وقت کالج کی تعلیم اور بیاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کی رہت سازی اور وفاداری اور گورنمنٹ کی برکت سے مستفید ہونے کی قدر شناسی کی نسبت ہے بدستور قائم رہے گورنمنٹ یونیورسٹی کے چارٹرڈ میں تامل کریگی۔ اور سو اے اس کے کالج کے یونیورسٹی ہو جانے میں کوئی کمی بات ہم کو گورنمنٹ سے حاصل کرنی نہیں ہے۔

حضرات! میں سب باتوں کو بیان کر چکا اب مجھے صرف اس سوال کا جواب دینا ہے، کہ دس لاکھ روپے کی رقم کیونکر جمع ہو سکیگی؟

صاحبو! اس رقم کی تو کیا حقیقت ہے اس سے دو چند اور چار چند بھی قوم کی مدد سے آسانی جمع ہو سکتی ہے۔ البتہ قوم سے مدد لینے والے اور قوم سے مانگنے والے چاہئیں۔ مجھے قوم کی طرف سے کچھ مایوسی نہیں ہے نہ میرا یہ خیال ہے کہ قوم کا افلاس یا تعلیم کی طرف سے اُس کی بے توجہی اس رقم کے جمع کرنے کی مانع ہے۔ میرے نزدیک باوجود افلاس کے اور باوجود تعلیم سے بے توجہی کے اگر چند باہمت، مستقل مزاج، متدین، قومی خیر خواہ، مانگنے والے طیار ہوں، اور مانگنا شروع کریں، اور تعلیم کے فوائد اور ضرورتوں کو بیان کرتے رہیں، تو اس رقم کا جمع ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے قوم میں دینے والے اور مانگتی سمجھ رکھنے والے بہت ہیں۔ مگر افسوس کہ مانگنے والے اور سمجھنے والے بہت کم ہیں۔ قوم وہی قوم ہے جس نے ایک سرسید کو باوجود اُن کے مذہبی خیالات سے مخالفت رکھتے اور اُن کی آزاد ذرا سے کے ناپسند کرنے اور اُن کی صاف صاف گفتگو کو دل شکن سمجھنے کے دس بارہ لاکھ روپے دیدئے صرف اس لئے کہ وہ مانگنے والا برا مانگتا اور اپنی قومی خیر خواہی کو دیتا اور رہت سازی کو اپنے افعال سے اور اپنی رائے اور تجویزوں کی خوبی اُس کے نتائج سے ثابت کرتا رہا۔

چنانچہ اس مدد سے جو قوم نے سرسید کو دی یہ بات ثابت ہو گئی کہ دس لاکھ روپے کی رقم کچھ ایسی بڑی نہیں ہے، جس کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ اس کا جمع کرنا ایک مجنونانہ خیال ہے۔ اُس وقت بھی نہ صرف عام لوگوں نے بلکہ نہایت سمجھ دار اور بلند درجہ مصلحا اور ذی وجاہت اور دُوراندیش مسلمانوں نے بھی اُن کے ارادہ کے پورا ہونے پر ناامیدی ظاہر کی تھی اور اور مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے کی تجویز کو ایک نیالی تصویر سے زیادہ نہ سمجھا تھا چنانچہ پہلے ہی اجلاس میں جو ۱۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو سلسلہ تعلیم کی تجویز اور مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے کے متعلق بنا رس میں ہو ا تھا اور جس میں بہت سنی می جاہت اور عالم اور منتخب مسلمان جمع ہوئے تھے، جناب مولوی فرید الدین احمد صاحب نے جن کا علم اور جنگی وجاہت اور قابلیت اور تعلیمی معاملات سے کچھ سی مشہور ہے اور جو مجملہ اُن خاص خیر خواہان قوم کے ہیں جو مجوزہ سلسلہ تعلیم اور مجوزہ مدرسۃ العلوم کو مسلمانوں کی ترقی کے لئے ضروری اور مفید سمجھتے تھے یہ رائے لکھی تھی کہ ”میں اپنے لائق فائق، مسیح عصر، حکیم و ہر ارشد نصیر، عالی دماغ، سید احمد خاں صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ عمدہ عمر کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں کر سکتا، اُس سخت مرض ملک اور مزمین جمالت کا کہ جو کج کل جسم اسلامی کو لاحق ہو گیا ہے، اور جس نے اُن کے سارے دین و دنیا کے امور کو نہایت فتور اور نقصان میں ڈال رکھا ہے، جو علاج تجویز کیا ہے وہ محض ایک تصور خیالی ہے جو حالت موجودہ مسلمانوں سے اس بات کی توقع بھی نہیں ہو سکتی کہ وہ اس عمدہ علاج کے اجراء نافذ کو بہم پہنچا کر استعمال کریں۔ میں اس بات کو نہایت سچائی سے قبول کر ہوں کہ وہ نسخہ مجوزہ نہایت بے نظیر و لا جواب ہے اگر اُس کے استعمال کا امکان ہوتا تو وہ بالکل اُس مرض ملک کی بیخ و بنیاد کو توڑ ڈالتا اور جسم اسلامی کو اعلیٰ درجہ کی صحت و طاقت کو پہنچا دیتا اور یقین ہے کہ آئندہ نسلوں میں کوئی وقت ضرور آوے گا کہ اہل اسلام خوشی اُس نسخہ کو استعمال کر بیٹے اور خدا کرے کہ جلد وہ وقت آوے، میرے خیال میں اُس حکیم حاذق کو ضروری تھا کہ وہ دولت اور بہت اور توفیق موجودہ مسلمانوں پر لحاظ فرما کر مطابق اُس کے کوئی نسخہ تجویز کرتے کہ جس سے زیادتی اُس مرض کی توڑک جاتی اور کسی قدر آثار صحت نمایاں ہوتے اور اسی طرح وقتہ فوقتہ بلحاظ حالت موجودہ کے اُس نسخہ میں تبدیل عمل میں لاتے کہ یہی طریقہ بالکل قانون قدرت کے مطابق ہے۔ اگر حکیم مدد و ح نظر مہربانی پھر دوبارہ توجہ فرما کر کوئی ایسی تدبیر تجویز فرما دیں کہ جس کا خارج میں وجود ہونا گو بدقت ہو مگر ممکن ہو تو نہایت مناسب و بہتر ہے اور جب میری رائے یہ قائم ہوئی کہ فی الحال وہ تدبیرات محض خیالی ہیں اور کسی طرح وہ وجود پذیر نہ ہوں گی تو اُن تدابیر کی نسبت مفصل رائے لکھنا محض فضول اور بیفائدہ ہے“

اور جناب مولانا مولوی علی بخش خاں صاحب مرحوم نے بھی مجملہ اور باتوں کے سب سے اول یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ اس مدرسہ کے واسطے لاکھوں روپیہ چاہئے جس کی امید نہیں ہے۔ اُس کے جواب میں مرحوم

نے فرمایا تھا کہ اگر مسلمان منوجہ ہو گئے اور کوشش کریں گے تو جس قدر روپیہ دے کر اسے اس کا جمع ہو جائے مشکل نہیں ہے۔ علاوہ اس کے یہ مدرسہ کچھ ہمارے ہی زمانہ کے لوگوں کے لئے نہیں قائم ہوتا بلکہ تمام نسلوں کے لئے جو آئندہ آنے والی ہیں قائم ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی میں اس کام کو پورا نہ کر جاویں ہمارے بعد کوئی اور بندہ خدا کا کھڑا ہو جاوے گا جو پورا کرے گا اسی طرح کوشش چلی جاوے گی جب تک کہ یہ کام پورا ہو جائے۔ شاید بعض صاحبوں کو بیخیالات شیخ چلی کے خیالات معلوم ہوں لیکن اگر شائستہ ملکوں کے حالات پر خیال کرو تو بہت سی اس قسم کی مثالیں پاؤ گے اور دنیا میں بھی اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ رہی تاخیر۔ یہ ایک مضبوطی کی بات ہے جس کا علاج بجز اس کے کہ ہم سب مسلمان دل سے اس کام پر متوجہ ہوں اور ان لغوی بحثوں کو جن کو مدرسہ العلوم سے کچھ تعلق نہیں ہے چھوڑ دیں، اور کچھ چارہ نہیں ہے۔ حضرات! باوجود اس با یوسی اور تا امید کی کہ جو ایسے بلند ارادہ کی کامیابی کی نسبت تمام لوگوں کو تھپی! ایک سرسید کی مردانہ ہمت، اور بے نظیر استقلال، اور غیر قطع کوشش نے ان کا ارادہ کو اس حد تک پورا کر دیا جس حد تک پورا ہوتا کسی کے خیال میں نہ تھا۔ اگر سرسید کا ارادہ بلند، اور ہمت عالی، اور مزاج میں استقلال، نہ ہوتا۔ اور وہ ایک اعلیٰ خیال اور آرزو نہ رکھتے ہوتے تو جس درجہ تک مدرسہ العلوم پہنچا ہے ہرگز نہ پہنچ سکتا۔

حضرات! جب ایک شخص کی ہمت اور کوشش نے اس بات کو جسے لوگ محال سمجھتے تھے۔ ممکن کر دکھایا، اور جس چیز کو خیالی تصور کتے تھے اس کی مجسم صورت کھڑی کر دی، اس سے یہ خیال تو باطل ہو گیا کہ دس لاکھ روپے کی رقم کا قوم سے وصول ہونا مشکل ہے اور یونیورسٹی کا خیال محض خیالی تصور ہے جس کا وجود میں آنا ناممکن ہے۔ اُن یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب سرسید سا عالی دماغ، بلند حوصلہ، دوسرا کون ہے جو اس ارادہ کو پورا کر سکیگا۔ اس کا جواب بلاشبہ مشکل ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ سرسید جیسے عالی دماغ کے نہ ہونے سے اس کام کا پورا ہونا ناممکن ہو، مگر اُسے ناممکن سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اس لئے کہ جو وقت کسی چیز کی ایجاد اور پیدا کرنے کی نسبت ہوتی ہے وہ اُس کے قائم رکھنے اور ترقی دینے کے لئے پیش نہیں آتی۔ سرسید ایسا نمونہ قائم کر گئے ہیں جو ہماری ہدایت کے لئے کافی ہے، اور اُن تمام مشکلات کو اپنی خدا داد قوت سے دور کر گئے ہیں جو ایسے بڑے کام کرنے کی نسبت ابتدا پیش آیا کرتی ہیں۔ اب راستہ صاف ہے، منزل مقصود سامنے ہے، اس لئے ہم کو سرسید جیسے عالی دماغ کی اب چنداں ضرورت نہیں ہے۔ جیسے باہمت اور استقلال مزاج اور استقلال سے کوشش کرنے والوں کی۔ اس لئے گو یہ سچ ہے کہ ہم سب سرسید نہیں ہو سکتے اور نہ ہر شخص کو کتنی ہی اُس کی تربیت اور تعلیم ہو سرسید ہو سکتا ہے نہ ہمارا یہ خیال ہے۔ لیکن ہم سب اپنی طبیعت اور حالت اور قوت کے موافق وہ کام کر سکتے ہیں جو وہ اپنے لحاظ سے کرتے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم جو چاہیں ہو سکتے

ہیں لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہم اپنے آپ کو ایسا بنا سکتے ہیں جس قدر اپنی طاقت کے قوم کو وہ مدد پہنچا سکیں، جو انہوں نے اپنی طاقت کے موافق پہنچائی تھی۔ ہر آدمی کو یہ خیال پیش نظر رکھنا چاہئے، کہ جو بات ہمارے بنی نوع کے لئے ممکن ہے وہ ہمارے لئے بھی ممکن ہے۔ امید ہماری ہے۔ اور سچائی، کوشش، مخلصانہ دعا، اور خدا پر بھروسہ ہمارا کام ہے۔ اور اس بات کا یقین کہ اگر ہم لڑائی عمدہ طور پر لڑیں گے تو خود لڑنا بھی فتح کی عزت حاصل کرنا ہے۔ ہر محنت جو کسی اچھے کام کے لئے کیجاوے، ترقی کی ہر امید جو دل میں پیدا ہو، ہر بلند ارادہ، ہر فیاض خیال، اور ہر ایک لولہ انہیں نہیں۔ بلکہ ہر ایک اعلیٰ درجہ کی مایوسی، بھی دل کی اطمینان اور خوشی کی ایک ایسی شعلہ ہے جو اپنی روشنی تاریکی سے پر ڈالتی ہے۔

صاحبو! کامیابی سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جو کچھ ہم کر سکتے ہیں اُس کو عمدہ طور پر ایماندارانہ اور ثابت قدمی سے کریں۔ ہم کو صرف دل قوی رکھنا اور کام کئے جانا چاہئے۔ محنت، صبر، استقلال، ثبات قدم، اعتماد و خود اعتماد، علیٰ انفس وہ چیزیں ہیں جس سے ہم کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ دوڑ ممکن ہے کہ تا دیر ہو، اور راستہ دشوار گزار و پر خار۔ اور ہولناک بیابان بھی طے کرنا ہو لیکن جنگل کے گوشہ میں بھول بھی ہوں، اور اُن کے ملنے کی ہم امید رکھتے ہوں۔ پس سب سے اعلیٰ اور عمدہ کام جو ہم کو کرنا ہے وہ یہ ہے، کہ ہم اپنے فرض کو ادا کریں خواہ کوئی اس کو جانے یا نہ جانے، کوئی اُس کی عزت کرے یا نہ کرے۔ ہم کو کام کے مشکلات پر نظر نہ کرنا چاہئے، بلکہ جن چیزوں کو ہم کر سکتے ہیں، اور جو ہم کو کرنی چاہیے اُن کو کرنا اور پوری کوشش سے کرنا چاہئے۔ جو محنت باقاعدہ اور مسلسل اور صبر کے ساتھ ہوگی وہ ضرور کامیاب ہوگی۔

لے زندہ دلاں پنجاب! یہ میری بڑی غلطی اور سرسرا دانی ہوگی، اگر میں اس نیک کام میں جو تمہارے محبوب سرسید کی منتہائے آرزو تھا اور جو مسلمانوں کی بہبودی کے لئے ایک ضروری کام ہے، آپ لوگوں کو شوق اور رغبت دلانے کے لئے اپنی تقریر کو طویل دوں، اور آپ کے دلوں میں اس کا جوش اور ولولہ پیدا کروں۔ کیونکہ جوش آپ کے دلوں میں ہے، اور قومی بہبودی کا نمایاں ثبوت آپ دے رہے ہیں۔ قومی ترقی کے خیالات آپ کے سینہ میں موجزن ہیں۔ تعلیم و تربیت کے فوائد سے آپ واقف ہیں۔ مرحوم سرسید کے قرار دئے ہوئے اصول کے فوائد کا آپ کو اعتراف ہے۔ اُن سے محبت رکھنے اور مدد دینے میں سب سے اول درجہ آپ کا ہے۔ ایسی حالت میں آپ سے بزرگوں کے سامنے اُن کی اس حیرت انگیز آرزو کے پورا کرنے کے متعلق زیادہ کہنا گویا عاشق کو اپنے محبوب کی آرزو پورا کرنے کی ترغیب ڈالنا ہے۔ ہمارے مردہ اور پروردہ دلوں میں تو اب بعد وفات سرسید کے خیال یونیورسٹی قائم کرنے کا پیدا ہوا ہے۔ مگر آفریقہ میں ہے پنجاب کے زندہ دل مسلمانوں پر کہ انہوں نے سرسید

کی اس آرزو کے پورا کرنے میں اُن کی زندگی ہی میں استعدادی اور سرگرمی ظاہر کرنی شروع کر دی تھی۔
میں نے دس اکتوبر ۱۹۹۴ء کے علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ایک خط دیکھا ہے جو اسی صوبہ کے ایک
لائق مسلمان نے پنجاب ابرز ویز میں چھپایا تھا اور جس کا عنوان ہے ”مسلمانوں کی واسطے ایک یونیورسٹی“
مجھے معلوم ہوا کہ یہ اقدام اور فیصلیت اور یہ بزرگی بھی زندہ دلاں پنجاب ہی کے حصہ میں تھی۔
اُس خط کا مضمون ایسا پاکیزہ اور عبارت اُس کی ایسی عمدہ ہے کہ میں اُسی خط کے ضروری فقرات
سنانے پر قناعت کرتا ہوں:-

اُس خط کا کتاب لکھتا ہے کہ ”جس طرح پر ہندوستان کے ہر ایک حصہ میں مسلمانوں کی حالت
موجودہ خراب ہے، اسی طرح پنجاب میں بھی ہے۔ لیکن یہاں ان کی حالت بہ نسبت کسی دوسرے مقام کے
زیادہ تر ترقی پزیر ہے۔ ہم اُن کے درمیان ایسے بہت سے ذمہ دار اور بار عجب شخص شمار کر سکتے ہیں
جن کو اپنے ہم مذہبوں کی تباہ حالت کی نسبت نہایت فکر اور تشویش رہتی ہے اور جو ہر ایک کام کرنے کے
لئے جس سے اُن کی قوم کو فائدہ پہنچے آمادہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اُس پر
یقین کرتے ہیں کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کچھ بھی سنبھلیگی۔ یعنی یہ کہ اگر ہم کبھی دنیا میں ایک باعزت
قوم ہونگے اور اگر مسلمانوں کو کبھی زندگی کی ضروریات اور آسائشوں میں ایک اجنبی حصہ ملیگا تو وہ قوم کی عقل و
علیت کو ترقی دینے، اُس کے مذاق طبیعت اور عادات میں ایک مفید تبدیلی پیدا کرنے، اور اُس کی
ساتھ اُس کی مذہبی، عقلی، اخلاقی، اور جسمانی، حالت کی اصلاح کرنے سے خلاصہ کلام اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے
(بجائے اُس کے صحیح معنی کے) ملیگا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم ہی صرف وہ شے ہے جس کے ذریعہ سے
ہم اپنے درمیان زمانہ حال کے مطابق صفات انسانی کے اُن نمونوں کے دیکھنے کی توقع کر سکتے ہیں جسکی
وجہ سے کسی زمانہ میں تمام دنیا ہم پر فخر کرتی تھی اور وہی صرف ایسی شے ہے جس کے ذریعہ سے اس عمدہ
زمانہ کے اُن کی نسبت ہماری اُمیدیں پوری ہو سکتی ہیں جس کی توقع سب سے پہلے حکومت انگریزی کے
بھلائی پہنچانوالے اثر نے ہم کو دلائی تھی۔“

پنجاب کے مسلمان یہ بات جانتے ہیں کہ اس طریقہ میں قوم کو تعلیم دینا ایک بڑا کام ہے۔ کیونکہ
اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی ضرورت ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو ہے پس جب کہ ہماری قوم کی اعلیٰ درجہ
کی تعلیم ایک عظیم الشان کام ہے تو اُس کے واسطے ایک مدت دراز کی با ترتیب کوشش درکار ہے اور
اتفاق کوششوں سے شاید ہی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ پنجاب کے مسلمان اس بات کو سمجھتے ہیں اور
چونکہ وہ اُس کو سمجھتے ہیں اس لئے انہوں نے اس معاملہ میں اپنے تئیں سرسید احمد اور محمد علی گوشتیل
کا نقش کی عاقلانہ رہنمائی میں سنبھال کر دیا ہے۔ پس علیگڑھ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی اعلیٰ درجہ
کی تعلیم کے واسطے با ترتیب کوششوں کا مرکز اور علی گڑھ کالج میں مسلمانوں کی ترقی و تہذیب کا آئینہ

دارالقرار دیکھتے ہیں۔ مگر وہ یہ بات دیکھتے ہیں کہ یہ کالج جیسے کہ اُس کی حالت موجودہ ہے اس قسم کی تعلیم کے دینے کا جس کی ضرورت ہماری قوم کو ہے ایک ناکافی ذریعہ ہے اور بالفعل وہ انگلستان کے ایک پبلک اسکول سے کچھ زیادہ عمدہ نہیں ہے۔ گو اس امر میں کچھ کلام نہیں ہے کہ ہندوستان کے کسی دوسرے کالج کی نسبت مسلمانوں کے واسطے زیادہ تر عمدہ ہے۔ پس جو شخص زمانہ حال کے شرائط انگلیزوں کی نسبت زیادہ زائدی قسم کی تعلیم کے خواستگار ہیں وہ غالباً چھ کروڑ مسلمانوں کے واسطے صرف ایک پبلک اسکول کے قائم ہونے پر قانع نہیں رہ سکتے ہیں۔ اور وہ اُس پر قانع نہیں ہے پس کیا اُن شخصوں کو جو کچھ کر سکتے ہیں یہ بات لازم ہے کہ وہ اپنی قوم کو جدوجہد کو جو وہ اپنے وجود کے قائم رکھنے کے واسطے کر رہی ہے پیٹھے ہوئے دیکھا کریں؟ کیا برخلاف اس کے اُن کو صرف ایک بے ترتیب طریقہ میں نہیں بلکہ ایک ایسی تجویز کے موافق جس پر تجویز غور کر لیا گیا ہو، کارروائی شروع کرنے پر آمادہ نہیں ہونا چاہئے؟ کیا میرے ہوملن یعنی پنجاب کے مسلمانوں کو اس قسم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے وسائل کے ہمہ پہنچانے میں جس کی ہم کو نہایت ضرورت ہے، ہندوستان کے تمام مسلمانوں سے پیشقدمی نہیں کرنی چاہئے؟ کیا اُن کو علی گڑھ میں ایک محمدیونیورسٹی کے قائم کرانے کے واسطے سب سے پہلے کوشش نہیں کرنی چاہئے؟ یعنی ایک ایسی یونیورسٹی کے واسطے جو ایک قوم کی حالت کو از روئے سرسبز کرنے کے لئے ہو اور جو تمام ہندوستان میں مشرقی اور مغربی علوم کے اس قسم کے مرکزوں کے ایک سلسلہ کا سرچشمہ ہو؟

”جس حالت میں کہ یہاں پنجاب میں ہماری آنکھوں کے روبرو دوسری قوموں کے نہایت غریب اور ناچیز آدمی اپنی کوشش اور ثابت قدمی کے ذریعہ سے بڑے بڑے کام کر رہے ہیں تو ہماری قوم کے باوجود اور ذی اختیار شخص اپنی مستقل اور تھکنے والی کوششوں کے ذریعہ سے کیا نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر لاہور کے چند ممتاز اور وطن دوست مسلمان شرفا علی گڑھ کو کالج کو یورپ کے اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹی کے نمونہ پر یونیورسٹی کے درجہ تک ترقی دینے کی غرض سے روپیہ فراہم کرنے کے لئے ایک سوسائٹی قائم کریں اور اس مقصد کے واسطے بطور ڈیپوٹیشن کے پنجاب کے بڑے بڑے شہروں میں جا دیں اور یہیں یقین کرتا ہوں کہ اُن سب میں اُن کو ایسے شخص ملینگے جو اُن کو مدد دینے پر آمادہ ہونگے، تو اُن کو بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ اُنہوں نے ہماری آئندہ بہبودی کے واسطے کوئی اہلی کام کیا ہے اگر وہ ایسا کریں گے تو ہم امید کرتے ہیں کہ دوسرے صوبوں کے رشتہ منیر مسلمان بھی اُن کی پیروی کریں گے اور اس طرح پر تمام قوم کو متفق ہو کر کام کرنے سے آئندہ کی نسبت ہماری مسرت بخش امیدیں بہت جلد پوری ہو جائیں گی۔“

میرے پنجابی بھائیوں میں سے وہ شخص جو اپنے نفس پر اس قدر جفا کرنے والے ہیں کہ قوم کی

ہیودی کی خاطر اپنی ذاتی اولوالعزیزوں کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور جو اپنی دانشمندی سے اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ایک ایسا کام ہے جس میں ایک معقول فوجی پر تمام مخلصین یعنی قوم کے سپہ بھی خواہوں کی امداد و رکار ہے، اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ امر کہ یونیورسٹی مجوزہ پنجاب میں نہ ہوگی۔ کوئی حیلہ اس بات کی واسطے نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص تنہا اپنے ہر طرح پر اس کے واسطے کوشش کرے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ یونیورسٹی کسی طرح کوکل یعنی مختص المقام نہ ہوگی۔ محمد کلج کسی خاص صوبہ نے قائم نہیں کیا تھا اور نہ وہ کسی خاص صوبہ کے واسطے قائم کیا گیا ہے۔ اب بھی اس کے احاطہ کے اندر صرف ہی طالب علم نہیں ہیں جو اس ملک کے تمام اطراف دور دراز سے آئے ہیں۔ بلکہ پندرہ ایسے بھی طالب علم دیکھ سکتے ہیں جو برما سے آئے ہیں اور ایک ایران سے آیا ہے اور ایک عرب سے اور دو غریب افریقہ سے آنے والے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ بہت جلد تمام مسلمانوں کے لئے ایک یونیورسٹی ہو جائے اور جو امیدیں ہم کو قومی ہیودی کی ہیں جن کے واسطے ہماری عاجزانہ کوششیں صرف ناچیز ذریعہ ہیں پوری ہو جائیں۔

صاحبزادہ میمنوں جو میں نے اوپر قتل کیا۔ تمہارے ہی ایک ہونٹن کا ہے اور تمہارے خاص شور اور اخبار پنجاب آبرور میں چھپا ہے اس میں یونیورسٹی قائم کرنے کی باتوں کو کلج کے مستحکم کرنے اور ترقی دینے کے لئے جو کچھ لکھا ہے اس پر مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف اس بات کو کہ مدرسہ العلوم علیحدہ کوکل اغراض کے واسطے نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لئے ہے اور پنجاب کو اس سے خاص فائدہ پہنچا ہے علم الاعداد سے ثابت کرتا ہوں۔

نقشہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کل اسکا لرشپ اور وٹیفول میں سے پنجاب کے کتنے طالب علموں کو کس قدر اسکا لرشپ اور وٹائف دئے گئے۔

سال	کلاس	تعداد اسکا لرشپ اور وٹائف پانے والوں کی			تعداد رقم سالانہ اسکا لرشپ اور وٹائف میں دی گئی	
		اہل پنجاب	دیگر صوبجات	میزان	اہل پنجاب کو	دیگر صوبجات کو
۱۸۹۱-۹۲	فرسٹ ایئر	۸	۱۱	۱۹	۱۵	۱۵
	سیکنڈ ایئر	۵	۱۸	۲۳	۱۶	۱۶
	تھرڈ ایئر	۳	۱۰	۱۳	۱۶	۱۶
	فورٹھ ایئر	۳	۱۳	۱۶	۱۶	۱۶
	ایم اے کلاس	۱	۰	۳	۱۶	۱۶
	اسکول کلاس	۱	۹	۱۰	۱۶	۱۶
میزان		۲۲	۶۴	۸۶	۸۶	۸۶

سال	کلاس	تعداد اسکالرشپ وظائف پنیوالوں کی			تعداد رقم سالانہ جو کالرشپ اور وظائف میں دی گئی		
		اہل پنجاب	دیگر صوبہ جات	میزان	اہل پنجاب کو	دیگر صوبہ جات کو	میزان
۱۸۹۲-۹۳	فرسٹ ایر	۱۵	۲۰	۳۵	۱۱۳	۱۹	۱۳۲
	سیکنڈ ایر	۱۱	۱۵	۲۶	۱۱۹	۱۹	۱۳۸
	تھرڈ ایر	۵	۸	۱۳	۱۳۳	۱۶	۱۴۹
	فورٹھ ایر	۴	۱۳	۱۷	۱۶۹	۱۱	۱۸۰
	ایم ای کلاس	۱	۰	۱	۱	۰	۱
	اسکول کلاس	۱	۱۳	۱۴	۱	۱۹	۲۰
میزان		۳۷	۶۹	۱۰۶	۱۱۷	۵۹	۱۷۶
۱۸۹۳-۹۴	فرسٹ ایر	۱۹	۱۳	۳۲	۱۱۳	۱۵	۱۲۸
	سیکنڈ ایر	۱۶	۱۹	۳۵	۱۱۳	۱۶	۱۲۹
	تھرڈ ایر	۶	۱۷	۲۳	۱۱۳	۱۱	۱۲۴
	فورٹھ ایر	۸	۱۲	۲۰	۱۱۳	۱۱	۱۲۴
	ایم ای کلاس	۱	۱۲	۱۳	۱۱	۱۱	۲۲
	اسکول کلاس	۱	۱۲	۱۳	۱۱	۱۱	۲۲
میزان		۵۰	۷۳	۱۲۳	۱۱۷	۵۹	۱۷۶
۱۸۹۴-۹۵	فرسٹ ایر	۱۳	۲۷	۴۰	۱۱۳	۱۵	۱۲۸
	سیکنڈ ایر	۲۳	۱۴	۳۷	۱۱۳	۱۶	۱۲۹
	تھرڈ ایر	۱۶	۱۲	۲۸	۱۱۳	۱۱	۱۲۴
	فورٹھ ایر	۱۱	۱۷	۲۸	۱۱۳	۱۱	۱۲۴
	ایم ای کلاس	۱	۳	۴	۱	۱۱	۱۲
	اسکول کلاس	۲	۱۳	۱۵	۱	۱۱	۱۲
میزان		۶۶	۸۶	۱۵۲	۱۱۷	۵۹	۱۷۶
۱۸۹۵-۹۶	فرسٹ ایر	۱۰	۳۰	۴۰	۱۱۳	۱۵	۱۲۸
	سیکنڈ ایر	۲۴	۲۲	۴۶	۱۱۳	۱۶	۱۲۹
	تھرڈ ایر	۷	۷	۱۴	۱۱۳	۱۱	۱۲۴
	فورٹھ ایر	۱۷	۲۰	۳۷	۱۱۳	۱۱	۱۲۴
	ایم ای کلاس	۲	۰	۲	۱	۱۱	۱۲
	اسکول کلاس	۲	۷	۹	۱	۱۱	۱۲
میزان		۶۲	۸۶	۱۴۸	۱۱۷	۵۹	۱۷۶

سال	کلاس	تعداد اسکالرشپ اور ڈیٹیف پانیوالوں کی			رقم ایچکارشپ اور وظائف میں دی گئی		
		اہل پنجاب	دیگر ممالک	میزان	اہل پنجاب کو	دیگر ممالک کو	میزان
۹۴-۸۹ء	فرسٹ ایر	۹	۱۲	۲۱	۱۱	۱۱	۲۲
	سیکنڈ ایر	۷	۲۲	۲۹	۱۱	۱۱	۲۲
	تھرڈ ایر	۸	۷	۱۵	۱۱	۱۱	۲۲
	فورٹھ ایر	۸	۸	۱۶	۱۱	۱۱	۲۲
	ایم ای کلاس	۳	۰	۳	۱۱	۱۱	۲۲
	اسکول کلاس	۰	۷	۷	۱۱	۱۱	۲۲
میزان		۳۵	۵۶	۹۱	۱۱	۱۱	۲۲
میزان کل ۱۸۹۴ تا ۱۸۹۷ء		۲۷۲	۲۵۱	۵۲۳	۱۱	۱۱	۲۲

اس نقشہ کے دیکھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۷ء تک ۵۲۳ طالب علموں نے اسکالرشپ پائے جن میں سے ۲۷۲ طالب علم صرف آپ کے پنجاب کے ہیں جس کا اوسط فی صدی ۵۱ ہوتا ہے اور کل رقم جو اسکالرشپ میں دی گئی اس کی تعداد ۵۲۳ ہے جس میں ۱۱ لاکھ ۱۱ ہزار کے لڑکوں کو دی گئی جس کا اوسط فیصدی ۵۳ ہوتا ہے۔ یہ ہند سے خود بتاتے ہیں کہ جس قدر مدد پنجاب نے محمدن کالج کو دی اس سے بہت زیادہ معاوضہ کالج نے پنجاب کو دیا۔ یہ کیا اچھا سود ہے کہ جس کا نفع اصل سرمایہ سے بڑھ کر ہوا۔ اور یہ کیسا عمدہ فرض ہے جس کا دو گنا اور گنا وصول ہوا۔

علاوہ اس کے میں ایک اور نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ جس قدر گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ محمدن کالج سے ہوئے ان میں آپ کے ہونٹوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ وہ نقشہ یہ ہے :-

سال	گریجویٹ			انڈر گریجویٹ			لاکلاس		
	پنجابی	دیگر ممالک	میزان	پنجابی	دیگر ممالک	میزان	پنجابی	دیگر ممالک	میزان
۱۸۸۰	۰	۰	۰	۰	۵	۵	۰	۰	۰
۱۸۸۱	۰	۰	۰	۰	۵	۵	۰	۰	۰
۱۸۸۲	۰	۱	۱	۰	۷	۷	۰	۰	۰
۱۸۸۳	۰	۲	۲	۰	۶	۶	۰	۰	۰
۱۸۸۴	۰	۲	۲	۲	۳	۵	۰	۰	۰

گریجویٹ			انڈر گریجویٹ			لاکلاس			
پنجابی	دیگر ممالک	میزان	پنجابی	دیگر ممالک	میزان	پنجابی	دیگر ممالک	میزان	
۰	۳	۳	۰	۱۰	۱۰	۰	۰	۰	۱۸۸۵
۱	۰	۱	۱	۹	۱۰	۰	۰	۰	۱۸۸۶
+	۸	۸	۰	۱۰	۱۰	۰	۰	۰	۱۸۸۷
+	۲	۲	۰	۴	۴	۰	۰	۰	۱۸۸۸
+	۵	۵	۱	۱۲	۱۳	۰	۰	۰	۱۸۸۹
۱	۱	۲	۰	۹	۹	۰	۱	۱	۱۸۹۰
۱	۵	۶	۶	۱۳	۱۹	۳	۳	۳	۱۸۹۱
۳	۸	۱۱	۷	۹	۱۶	۴	۴	۴	۱۸۹۲
۳	۹	۱۲	۶	۱۴	۲۰	۷	۷	۷	۱۸۹۳
۶	۱۳	۱۹	۸	۱۲	۲۰	۴	۱	۳	۱۸۹۴
۹	۱۲	۲۱	۱۰	۱۴	۲۴	۳	۲	۱	۱۸۹۵
۹	۱۳	۲۲	۱۲	۱۴	۲۶	۵	۴	۱	۱۸۹۶
۴	۷	۱۱	۸	۱۱	۱۹	۷	۲	۵	۱۸۹۷
۸	۱۲	۲۰	۳	۱۰	۱۳	۰	۰	۰	۱۸۹۸
۴۵	۱۰۳	۱۴۸	۶۴	۱۷۷	۲۴۱	۱۰	۲۴	۳۴	میزان

اس سے معلوم ہوگا کہ منجملہ ۱۴۸ گریجویٹ کے ۴۵ اور منجملہ ۲۴۱ انڈر گریجویٹ کے ۶۴ پنجاب کے ہیں۔ یہ تعداد فی نقشہ ثابت کرتی ہے کہ محمدن کالج نے پنجاب میں ایک نہایت اچھی تعداد تعلیم یافتہ لوگوں کی پیدا کر دی ہے جن میں سے بعض ضرور آئندہ پنجاب کے لئے فروعی خدمات کا باعث ہونگے۔ اور آئندہ علم کی ترقی دینے اور روشن ضمیری پھیلانے میں قابل یادگار مدد دینگے۔

حضرات! اس موقع پر اس بات کا ذکر کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ نہ صرف پنجاب کو کالج نے فائدہ پہنچایا اور نہ ہندوستان کے کسی خاص صوبہ کو بلکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کو اُس سے فائدہ پہنچایا۔ اور نہ صرف مسلمانوں کو اُس نے تعلیم دی بلکہ ہندوؤں کے لئے بھی تعلیم کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا اور ہمارے ہوں ہندو بھائیوں نے بھی مدرسۃ العلوم سے کچھ کم فائدہ نہیں پایا۔ چنانچہ نقشہ ذیل سے اس کا ثبوت ہوتا ہے۔

محمدن کالج سے سب ذیل ہندو کامیاب ہوئے					سال
میزان	لاکلاس	انٹرنس	اندر گریجویٹ	گوجوایٹ	
۱	۰	۱	۰	۰	۱۸۷۷
۳	۰	۳	۰	۰	۱۸۷۸
۳	۰	۳	۰	۰	۱۸۷۹
۸	۰	۵	۳	۰	۱۸۸۰
۶	۰	۳	۳	۰	۱۸۸۱
۹	۰	۳	۵	۱	۱۸۸۲
۸	۰	۵	۳	۰	۱۸۸۳
۲	۰	۰	۱	۱	۱۸۸۴
۱۶	۰	۵	۶	۵	۱۸۸۵
۹	۰	۵	۲	۰	۱۸۸۶
۱۷	۰	۷	۶	۲	۱۸۸۷
۱۲	۰	۹	۳	۲	۱۸۸۸
۱۰	۰	۶	۲	۲	۱۸۸۹
۹	۱	۳	۲	۱	۱۸۹۰
۱۱	۲	۵	۲	۲	۱۸۹۱
۱۲	۲	۳	۲	۲	۱۸۹۲
۱۲	۵	۳	۳	۱	۱۸۹۳
۷	۰	۳	۳	۱	۱۸۹۴
۱۶	۱	۲	۸	۳	۱۸۹۵
۸	۲	۰	۲	۲	۱۸۹۶
۵	۰	۲	۱	۲	۱۸۹۷
۵	۰	۰	۲	۳	۱۸۹۸
۱۹۲	۱۵	۷۸	۶۷	۳۲	میزان

حضرات! یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ اس کالج سے کیا فائدہ حاصل ہوا؟ ہم کہتے ہیں کہ فی نفسہ تعلیم اور وہ بھی اعلیٰ اور اُس کے ساتھ تربیت اور وہ بھی اخلاقی ایک عمدہ کالج کا عمدہ نتیجہ اور یہ فائدہ ہے

۱	ایمپریل سروس	۱	ڈپٹی کلرک و اسٹنڈنٹ کمنشنر	۱۱	دیگر عہدہ ارشل سررشتہ وارو
۲	سول سروس	۲	جج	۲	ہیڈ کلرک وغیرہ
۳۱	بارسٹریٹ لا	۳۱	منصف	۷	لازم سررشتہ تعلیم
	ڈاکٹر (سول سرجن)	۱	تحصیلدار	۲۰	لازم کاشتکاری ہندوستانی
	طالب علم جو ڈاکٹری کے لئے		انٹیکسٹروپال پیکٹر پولیس	۲۹	دکلا
۴	انجمنان میں تعلیم پارہے ہیں	۴	نائب تحصیلدار	۱۷	لازم حکمہ خرچ
۵	لاہور میں تعلیم پارہے ہیں	۵	اسٹنڈنٹ پی ای او ایم ایجنٹ	۲	میزان
	طالب علم جو پولیس اسکول الہ آباد		دیگر محترم عہدہ ارشل اسٹنڈنٹ		الحفاظ کی ایکڑ ایکویرٹ او ایک سکریٹری
۵	میں تعلیم پارہے ہیں	۵	نیشنل حکمہ کن اسٹیشن ماسٹر وغیرہ	۱۰	ہوم ڈپارٹمنٹ حیدرآباد ہے

حضرات! جو مدد و صورتِ پنجاب نے کالج کی اب تک کی اور جو بے نظیر ہمدردی اُس نے مدرستہٴ علوم کے ساتھ ظاہر کی اور جو محبتِ زندہ دلاں پنجاب نے مرحوم کے ساتھ اُن کے جیسے جی اور وفات کے بعد دکھائی اور نیز جو غمناک کالج سے یہاں کے لوگوں کو بُھنچا، ان تمام خیالات نے ہم کو اس بات پر مائل کیا کہ جو اہل کار ہم قائم کرنا چاہتے ہیں اُس میں مدد لینے کو صورتِ پنجاب ہی کو مقدم سمجھیں۔ اگر آپ لوگ اپنی فیاضی اور روبرو اور معاملاتِ تعلیم سے دلچسپی اور مسرت کے ساتھ محبتِ ظاہر نہ کرتے اور ہم کو دعوت نہ دیتے، تو ہم کو ہرگز جرأت نہ ہوتی کہ اور مقامات کو چھوڑ کر اول ہم یہاں آئے اور دستِ گدائی سب سے پہلے آپ کے سامنے پھیلاتے۔

زندہ دلائل پنجاب! جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ میں کہ چکا۔ اب اگر میں اصل مقصود یعنی مرحوم کی یادگار قائم کرنے کے لئے جو آپ کے پیارے سر سید کا مدعا اہلی تھا اور آپ کی ترقی کے لئے ایک ضروری کام ہے اپنی تقریر کو طول دوں اور آپ کے دلوں میں جوش پیدا کرنے کے لئے دیر تک گفتگو کر دوں تو میری غلطی اور نادانی ہے۔ کیونکہ آپ اس کام کی ضرورت اور خوبی سے واقف ہیں۔ آپ اپنی قوم کی ترقی کیلئے

اُسے بمنزلہ شہر طرہ دہی کے سمجھتے ہیں۔ جوش آپ کے دلوں میں ہے۔ ہمدردی کا نمایاں ثبوت آپ دے رہے ہیں۔ قومی ترقی کے خیالات آپ کے سینوں میں موجزن ہیں۔ تعلیم و تربیت کی توجہیں آپ واقف ہیں۔ عملی کارروائیوں کی قابلیت آپ رکھتے ہیں۔ قومی حاجتوں کے پورا کرنے میں آپ سرگرم ہیں۔ محمدن کالج کے آپ بڑے حامی اور سرسید کی کوششوں کی آپ دل سے قدر کرنے والے ہیں۔ ایک زمانہ دراز تک اُن کی زندگی میں آپ اُن کے معین و مشیر رہے۔ اور بڑی بڑی مشکلات میں ہمیشہ آپ نے اُن کا ساتھ دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ آپ ہی سہارے پر جیتے تھے اور آخری زمانہ میں آپ ہی سہارے کی ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ آپ ہی اُن کے قوت بازو بلکہ عصا بے پیری تھے۔ آخری دم تک وہ آپ کے شکرا گذار اور آپ کے احسانات اور خدمتوں کے معترف رہے۔ گو اُن کی ظاہری آنکھیں بند ہو گئی ہیں، مگر یقین کرو کہ اب بھی اُن کی روحانی آنکھیں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں، اور نہایت انتظار سے اُس زندہ دل گروہ کو دیکھ رہی ہیں جو اُن کی زندگی میں اُن کی مرادیں پوری کرتا رہا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ایسی زندہ دل قوم مرنے کے بعد اپنے شہید اور مقتدا کو بھول جاوے گی اور اُس کی امیدیں پوری کرنے میں کوشش نہ کرے گی۔ جو صدر اُس شہید قوم کے مرنے کا تم کو ہوا ہے اور جو دلی رنج و غم تم نے اُن کی وفات پر ظاہر کیا ہے، اُس سے تمہارے دلوں کا درد ظاہر ہے اور تمہاری محبت نمایاں۔ اب اُس محبت کے عملی نتائج کے کھانے کا وقت ہو۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اب انسانیت اور قومی ہمدردی ظاہر کرنے کا موقع ہے۔ جو وقت مسلمانوں پر آیا ہے وہ ایسا نازک ہے کہ گویا مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ اب تمہارے اوپر منحصر ہے، اُس وقت میں جب کہ وہ قوتیں جو نہایت محنت سے جمع کی گئی تھیں پھر منتشر ہو رہی ہیں۔ اور بے خبر اور خود غرض گروہ جس کو ایک بردست ہاتھ نے ہمدردی اور اخوت کے پاک رشتہ میں جمع کر دیا تھا پھر ایک دوسرے سے جدا ہو رہا ہے۔ تم نے اگر ذرا بھی غفلت یا تاخیر کی، اور اپنی قوتوں کے قائم رکھنے پر دل سے مستعد نہ ہوئے، اور اس ناقص کام کے پورا کرنے میں جو وہ چھوڑ گئے ہیں غیر معمولی سرگرمی نہ دکھائی، اور یہی یادگار قائم کرنے میں جو فی نفسہ تمہارے ہی فرائد پر مبنی ہے مدد نہ کی۔ تو یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ اس کا دیا برا اثر قوم پر پڑے گا، جس کی پھر تلافی نہ ہو سکیگی اور آئندہ آنے والی نسل تم پر ملامت کرتی رہے گی۔

صاحبو! سرسید تو چل بیسے۔ اور وہ اپنی ایسی یادگار چھوڑ گئے ہیں جس کو زمانہ کا ہاتھ بھی مٹ نہیں سکتا۔ تم یہ نہ سمجھو کہ اگر تم نے یادگار قائم نہ کی تو اُن کی یاد دنیا کے دل سے جاتی رہے گی بلکہ یقین کرو کہ جیسا جیسا زمانہ گذرتا جائیگا اُن کی یاد اور تازہ ہوتی جائیگی۔ اُن تمہاری ناقہ روانی، احسان خراموشی، بیخبری، اور غفلت کی یادگار ہمیشہ کے لئے قائم رہے گی۔ اور زمانہ افسوس کے ساتھ کہیگا کہ دنیا میں ایسا کسی تاشکر گذار اور غافل قوم بھی ہے جو نہ اپنے محسن کے احسانوں کو یاد رکھتی ہے، نہ اپنے نفع و ضرر

کو پہچانتی ہے۔ اور نہ صرف یہی داغِ تمہاری پیشانی پر سمیٹہ کے لئے ریگا۔ بلکہ جو راہِ تمہاری ترقی کے لئے کھولی گئی ہے، وہ بند ہو جائیگی۔ پھر تم ادبار اور ذلت کی اسی تاریک اور عمیق غاریں گرنے لگو گے جس میں سے نکالنے کے لئے تمہارا پیارا سسر سید آخر دم تک کوشش کرتا رہا۔ کیا تم بھول گئے، اُس کے اُن درد بھرے ہوئے لفظوں کو جو قسمت کے فیصلہ میں اُس نے نہایت دلی درد سے کہے تھے اور جس کی دردناک آواز اس وقت تک ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ ”لے دو تو اگر تم اس تدبیر پر متفق نہیں ہو اور تنقہ کوشش اپنی قوم کی ترقی کے لئے کرنی نہیں چاہتے ہو تو تم کو اور ہم کو صبر کرنا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ“ ”آب از جوفتہ دیر از کمالِ جستہ باز نمی آید، مرو، گلو، اور سرو، اور ذلیل ہو۔ یہی خدا کی مرضی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون“ افسوس کہ اب ان درد بھرے لفظوں کا کہتے والا کوئی نہ رہا۔ اور ایسے کوسوں کا دینے والا جس پر ہزار وعائیں قرآن ہوں ہم سے جدا ہو گیا ہم سیکڑوں جھوٹے قصیدے، قومی تعریف کے سینکے، ہزاروں جھوٹے خوشامدی قوم کے پادینکے، مگر افسوس ہزار افسوس کہ پھر ایسا تلخ گو، شیریں مزاج، جس کی ہر و شتام پر دل خدا ہوتا تھا، اور جس کی گلابی دل کو زندہ کرتی تھی ہم کو نہ ملیگا۔ آہ آہ وہ ملامت کرنے والا سید کہاں گیا، اور وہ قوم کو برا بھلا کہنے والا کیا ہوا۔

حالی

قوم را بیمِ عتابِ چشمِ رحمت از کس نماند
آں لبِ نفیس ہر اداں چشمِ گریاں را چشت
پندایں شیریں بیاناں، در نے گیر و بدل
آں زبانِ تلخ گو۔ آں تیغِ عنایں را چشت
شد خراں، و از بہاراں نیت باراں را خبر
آں بہا بخشنان، بزمِ باراں را چشت
آئکہ می بارید و در۔ آں ابر نیساں را چشت
اسی قسمت کے فیصلہ میں آخری دردناک الفاظ اُس مرحوم نے یہ کہے تھے کہ ”افسوس یہ ہے کہ میری روح قوم کے لئے رویا کر گئی مگر کیا علاج ہے کہ، نتواں کہو باقتدیر پیکار،“ اور اپنے حسرت بھرے ہوئے دل سے مرنے کے بعد بھی قوم کے لئے بیچین دہنے پر کہا تھا کہ ”ایک بہت بڑے شاعر نے راحت کے مطلب کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔“

بقدر ہر سکوں راحت بود بگر تفاوت را

دو بدن رفتن استادین شستن خفتن مردون

مگر مجھے افسوس ہے کہ اگر قوم کی یہی حالت ہی تو بعد مردن بھی مجھے راحت نہ ہوگی۔

صاحبِ خدا نے اُسے تو راحت دی اور غم سے اُسے نجات بخشی۔ مگر ہم البتہ بیچین ہیں اور ہماری راحت کی کوئی صورت نہیں۔ ہم روتے ہیں اُس کا ماتم کرتے ہیں۔ مگر نہ رونے سے کچھ حاصل اور نہ ماتم سے کچھ فائدہ۔ یہ رونا تو ساری عمر کا ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم اُن کا ماتم چھوڑیں بلکہ قوم کا ماتم کریں اُن پر اتنا مشغول نہ رہیں

پڑھنا بند کریں اور اپنے اوپر اتنا لٹک پڑیں۔ وہ بظاہر مر گئے، مگر انہوں نے حقیقت جاودانی حیات پائی۔
اور ہم بظاہر زندہ ہیں لیکن ہماری حیات فی نفسہ موت سے بدتر ہے۔ اگر کچھ رمتے جان باقی ہے تو ہم کو
چاہئے کہ اُن پر صبر کریں اور اپنا علاج اور فکر کریں۔ حالی

دوستاں از مرگ بنو چارہ وز فرقت مفر چوں زناں تا چند بودں بہر سید نوگر
جا کے استقلال و وقت بہت و مردگی است کہیں بلائے ناگہاں را نیست جز بہت سپر
از صلاح کار خود اکتوں اگر غافل شدید این مصیبت راست صد چندین مصیبت براثر
خواجہ دار اسلے از بہر شا بگذاشتنت تا بود نسل شما از علم و دولت بہر و
کوہ مانگست تا این جوے شیر آوردہ است بوکہ آپ رفتہ در جوے شما آید سر
ترسم این حشر چہ گردنیرہ از سنگ علات مان و اں وقت است وقت اتفاق ہمدگر
عزم جزم آرید و بر خیزید و ہمدستان شوید دست بکشاںید و بربندید و امن بر کر
شکت ملیں ہست در ہندوستان تو حیدر گوی وہ کہ چندین خلق در ماند ز کار یک نفر
یادگار خواجہ بعد از خواجہ برپاداشتن شکر اورا نو بہتر زین نیست اسلوبے دگر

مزداد این بس۔ کہ در صلاح خود کوشید زود

کز شما غیر از شما۔ مطلوب او چنیے نبود

نمبر ۴

اسپیج

یہ اسپج نواب صاحب بہادر نے ۲۷ دسمبر ۱۹۱۴ء کو محمدان ایکویشنل کانفرنس منعقدہ لاہور

میں پریزینٹ صاحب کی تقریر کے بعد بطور شکریہ کہے فرمائی :-

حضرات!

جس جگہ کج میں تقریر کرنے کو کھڑا ہوا ہوں افسوس ہے کہ یہاں (اس موقع پر رقت کے باعث
جو فقرہ شروع ہوا تھا۔ وہ ختم نہ ہو سکا۔ اور کسی قدر تاثر کے بعد آپ نے اُسی لہجہ میں اپنی نہایت پُر سوز
اور مؤثر تقریر کو شروع کیا۔ حاضرین اس وقت ہمہ تن ٹیم بن گئے تھے) سر سید مرحوم کھڑے ہو کر آتے
تھے، مجھے صرف اُن کی ذات سے محبت نہ تھی بلکہ پچاس سالہ تجربہ نے اُن کی نسبت میرے دل پر
اس بات کو نقش کر دیا تھا کہ خدا تعالیٰ نے قوم کا درد، اسلام کی محبت، اور مسلمانوں کی یہی خواہی کو

مشکل و محکم کر کے اُس کا نام احمد رکھ دیا ہے خلوت و جلوت، انتہائی، یکجائی، دن، رات، صبح، شام، جب میں نے اُن کو دیکھا۔ مجھے اُن کی صداقت۔ اسلام کی محبت، قوم کی بہدروی ثابت ہوتی اور میری محبت اُن سے بڑھتی گئی۔ اُن کی سی سالہ بلکہ چل سالہ محنت و کوشش نے قومی ترقی و بہبودی کے متعلق اگرچہ بہت کچھ کر دکھایا مگر افسوس ہے کہ جیسی اُن کی تشارت تھی یا جتنی اُن کی ضرورت تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ سرسید مرحوم نوہ کرتا رہا، مرثیہ پڑھتا رہا، چینی چلایا، فریاد و زاری کی، جس پر قوم کچھ متوجہ ہوئی، اور اُس کی مدد کی، مگر تھوڑے لوگوں نے، ہم لوگ جو اُس کے قبیح، مقلد اور دوست کہلاتے تھے، ہم نے بھی اُس کے جینے جی کسی قدر اعانت کی، مگر جیسی کہ چاہتے تھے ویسی اعانت ہم لوگوں سے بھی نہ ہو سکی۔ اب وہ اتھ اٹھ گیا جو ہماری راہ نمائی کرتا تھا۔ جس کی قوت سے ہم قومی رفاه کے کاموں میں سرگرمی ظاہر کرتے اور جوش دکھاتے تھے۔ اُن کی تمنا جس سے قوم کی ترقی و بہبود تھی ناتمام رہ گئی۔ کوئی قوم کا لیڈر، کوئی مسلمانوں کا راہ نما، کوئی قوم کا درد خواہ اور اُس میں درد پیدا کرنے والا، بلکہ یہ کتنا چاہئے کہ کوئی قوم کو گامیاں دینے والا، نہ رہا۔

معزیر پریسڈنٹ نے اپنی افتتاحی تقریر میں ہم لوگوں کی نسبت جو منتظمین مرن رکن رکن کانفرنس سمجھے جاتے ہیں۔ اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے، مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو قومی درد اور قومی محبت سرسید میں تھی، اور وہ آگ جو اُن کے دل میں لگی ہوئی تھی، اور وہ دل جو درد سے بھرا ہوا تھا، ہم میں اُس کا نشان بھی نہیں۔ اُن میں یہ سب باتیں فطری تھیں، اور ہم میں مصنوعی۔ مگر میں اتکھ اور چیز ہے اور سرسید کا اور بات ہے۔ لکین التکلل فی العینین کا لکھل۔

حضرات! مجملہ اُن ندیروں کے جو قوم کی ترقی کے لئے مرحوم نے سوچی تھیں اس مجلس کا قائم کرنا ہے۔ اس کے مقاصد عللاً اور اُس کے فوائد بے انتہا ہیں۔ اگر مرحوم کی مرضی کے موافق اس مجلس کی تجویزوں پر عمل کیا جاتا، تو آج قوم کی حالت ہی دوسری نظر آتی۔ مگر افسوس ہے کہ سوائے عمدہ پھول اور فصیح بلیغ لکچروں کے کوئی عملی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ مرحوم سرسید اسی کا غم اور اسی کا رنج کرتے رہے اور یہی رنج اپنے ساتھ لے گئے۔ اب ہم کو اپنے اوپر رحم کرنا اور اُس غفلت اور بے توجہی کو چھوڑنا چاہیے جس نے ہماری یہ حالت کر رکھی ہے۔

حضرات! گذشتہ اجلاس ہائے کانفرنس میں پریسڈنٹ کی افتتاحی تقریر کے بعد سرسید مرحوم کانفرنس کے اجلاس باسابقہ کی رپورٹ سنایا کرتے تھے، میں بھی اس وقت رپورٹ سنانے کیلئے کھڑا ہوا ہوں، بروئے قوا اس وقت کانفرنس کے لائق آنریری سکریٹری جناب آنجنیل سید محمود صاحب بالبقا، ہیں۔ وہ شرکت کانفرنس کے بڑے شائق تھے، مگر ان دنوں چونکہ انہیں چند در چند کارے ضروری درمیش ہیں اور نیز جناب لٹنٹ گورنر صاحب بہادری صوبہ جات غرب شمال بھارت

علی گڑھ تشریف لانے والے ہیں اور ۲۔ جنوری کو ان کا اجلاس محمدن کالج کے اسٹیجنگ ہال میں ہو گا۔ اس لئے آنریبل مسٹر محمود صاحب تشریف نہ لاسکے، انہوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کی حسرت و تنہا کا آپ لوگوں سے اعلان کروں۔ اور ان کی طرف سے جام شکایت پر معافی مانگوں۔ میں تکمیل مضابطہ کے لئے رپورٹ اجلاس ماسبق پیش کئے دیتا ہوں یہ وہ رپورٹ ہے، جو سنٹرل اسٹینڈنگ کانفرنس کمیٹی علی گڑھ نے ان کے پاس بھیجی تھی، اس لئے کہ سلسلہ اء کے اجلاس منعقدہ میرٹھ میں حسب زریعہ نمبر کانفرنس کی کارروائی سکریٹری کے بدلے ایک سنٹرل اسٹینڈنگ کانفرنس کمیٹی کے پیرو ہوئی تھی۔ اس کمیٹی نے بموجب قاعدہ اپنی رپورٹ سکریٹری کے پاس بھیجی، اور وہ یہ رپورٹ ہے جو میں پیش کرتا ہوں اور اس کے چند فقرے پڑھے اور پھر غدر کیا کہ اس کے پڑھنے میں ایک گھنٹہ صرف ہو گا، جو بہت قیمتی ہے۔ علاوہ بریں اس رپورٹ میں بجز نئے نئے نوہ و فریاد زریعہ شکون و غیرہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ ہاں ایک بات اس میں قابل توجہ ہے کہ اجلاس میرٹھ (جس کی یہ رپورٹ ہے) میں جو زریعہ شکون اس مضمون کا پاس ہوا تھا کہ مسلمان بچے بوجہ عدم استطاعت و افلاس اعلیٰ تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ اس لئے یہ تجویز کی جائے کہ ہر شہر کے مسلمان اپنے صنلج سے کم از کم ایک وظیفہ ۵۰ روپیہ ماہوار کا دیکر ایک طالب علم کو کالج میں تعلیم دلائیں۔ اس کے متعلق میں آپ صاحبوں کو یہ قرعہ سنا تا ہوں کہ اب تک ۳۹ وظائف ۳۹۰ روپیہ ماہوار کے مقرر ہوئے ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں اب تک قومی ہمدردی، اسلامی اخوت، اور سرگرمی باقی ہے۔ سید صاحب قوم کو مرہ اور کانفرنس کو مجلس نوہ خوان کہتے تھے ان کی وفات کے بعد کس کو خیال تھا کہ کانفرنس کبھی منعقد ہوگی مگر بے زندہ دلاں پنجاب آفرین ہے تم پر سید نے تم کو بہت درست خطاب کیا ہے، تم خود زندہ دل ہو اور تم نے کانفرنس کو از سر نو زندہ کیا۔ ہم لوگ تمام مسلمانان ہند کی طرف سے تمہارے شکر گزار ہیں سید مغفور اس کانفرنس کے خلاق تھے، تو یہ بڑھا (آپ نے خان بہادر محمد برکت علی صاحب کی طرف اشارہ کیا) اس کا سہا ہے، سید اگر چہ مر گئے، مگر ان کے خیالات نہیں مرے ان کی صورت بظاہر ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہے، مگر حقیقت میں یہ سب نشان و شوکت انہی کی برکت اور فیضان کا نتیجہ ہے۔

کسے کہ خرم باد صباست میدان

کہ باوجود خزاں بوسے یا من باقی است

صاحبان! جناب سردار محمد حیات خاں صاحب بالقابہ، خان بہادر برکت علی خاں صاحب، مسٹر شاہ دین اور غشی محبوب عالم صاحب، ان لوگوں نے اپنی کوشش اور محنت سے کانفرنس کو اور اس کے ساتھ قومی محبت اور اخوت کے خیالات کو زندہ کیا اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ سید کی آگ کی

چنگاری ان کے دل میں پہنچ گئی۔ سر سید مغفور یاس پیرانہ سالی ۸۲ برس کے سن سال میں قومی گام بڑی متحدی اور چالاک سے انجام دیتے رہے۔ وہی جوش، وہی سرگرمی، اب خان بہادر محمد برکت علی خاں صاحب میں دیکھی جاتی ہے، جنہوں نے اس بڑھاپے اور بیماری کی حالت میں کانفرنس کے اجلاس کی تیاریاں اس جوش و خروش سے کیں جس کے سبب سے بارہواں اجلاس کانفرنس کا پچھلے اجلاسوں پر سبقت لگیا۔

حضرات! آرنیبل نواب فتح علی خاں بہادر کے پریسیڈنٹ ہونے پر کانفرنس کی طرف سے دلی شکر ہے، ہم آج کانفرنس کے اس جلسہ میں اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ایسے معزز اور فخر قوم نے جس کو نواب فتح علی خاں بہادر ہیں پریسیڈنٹی قبول فرما کر ہماری مجلس کو معزز اور ہم کو ممنون فرمایا۔ ایسے بزرگوں کی پریسیڈنٹی ہمیشہ ایسی مجلسوں کی عزت اور پبلک کے اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔ نواب صاحب اپنی خاندانی عزت اور اپنی ذاتی لیاقت و علمی کمالات کی وجہ سے ہماری قوم کے سربراہ درودہ اور نامور بزرگوں میں سے ہیں اور اس خاندان نے ہمیشہ قومی کاموں میں قابل قدر توجہ اور فیاضی ظاہر کی ہے اور آپ کے پاکیزہ خیالات نے آپ کو ہر دلعزیز بنا رکھا ہے۔ اور آپ منجملہ ان روشن خیال بزرگوں کے ہیں جو باوجود مذہب میں راسخ الاعتقاد ہونے کے مختلف فرقوں کے ساتھ ہمدردی اور دوستی کا بتاؤ کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں جو چیزیں ترقی کی مانع ہیں ان کے دور کرنے کے آرزو مند ہیں۔ اس لئے ایسے شخص کی پریسیڈنٹی پر ہم جس قدر فخر کریں وہ کم ہے، اور مجھے اس موقع پر ایک خاص جہ آپ کی پریسیڈنٹی سے خوش ہونے کی ہے کہ آپ دوسرے شخص شیعہ اثنا عشری مذہب کے ہیں کہ جو ہماری مجلس کی کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوئے ہیں، اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہماری مجلس قومی کاموں میں تعصبات سے پاک ہے، اور قومی کاموں میں بلا لحاظ عقائد اور مذہبی خیالات کے اُسی شخص کو منتخب کرتی ہے، جس سے قوم کو فائدہ پہنچنے کی امید ہو۔ مجھ سے زیادہ غالباً کوئی شخص اس بات کا خواہشمند نہ ہوگا کہ اس نخوس تفرقہ کا جو باہم شیعہ اوسینوں کے بعض متعصب اور تنگ دل مدعیان مذہب پیدا کرتے ہیں، نشان باقی نہ رہے۔ اور مسلمانوں کے دو معزز گروہ جن کا خدا اور قرآن اور مادی اور قبلہ ایک ہے، قومی کاموں میں مذہبی خیالات کو دخل نہ دیں، اور ایسی دردناک حالت میں جو مسلمانوں کی ہو رہی ہے ایک دوسرے کے معین و مددگار رہیں۔ اور دوستی اور محبت کا ایک دوسرے سے بتاؤ رکھیں۔ اور اغراض مشترکہ میں متفق ہو کر کام کریں۔ یہی وہ شے ہے جس سے ہماری مصیبت دور ہو سکتی ہے، اور اسی اتفاق سے ہم ترقی کر سکتے ہیں۔ درحقیقت وہ شخص قوم کا دشمن ہے جو ان دو معزز فرقوں میں مسلمانوں کے تفرقہ پیدا کرنے کا باعث ہو۔ اور مذہبی عقائد کو قومی کاموں میں خلل دے۔ اور ان خیالات کو جن کا تعلق انسان کے دل اور خدا سے باہم مل جل کر کام کرنا

مانع سمجھے *

چونکہ نواب فتح علی خاں بہادر کے پرسیڈنٹ ہونے نے اس بات کو نمایاں طور پر ثابت کر دیا کہ ہماری مجلس قومی کاموں میں کچھ غیر شیعہ اور سنی کا نہیں کرتی اور سب کو ایک نگاہ سے دیکھتی ہے اور ہرگز کو کو اپنا بھائی سمجھتی ہے اور اُس کے نزدیک تعصب اور مذہبی تفرقہ سے بدتر کوئی چیز نہیں ہے اس لئے مجھے آپ کے پرسیڈنٹ ہونے سے ایک خاص قسم کی خوشی ہے اور تہ دل سے پرسیڈنٹی کے قبول کرنے پر جناب ممدوح کا شکرا داکرتا ہوں *

نمبر ۲۶

ایسیج

یہ ایسیج نواب محسن الملک بہادر سکریٹری محمدان! کونیشنل کانفرنس نے ۲۸- دسمبر ۱۹۵۷ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دو از دہم منعقدہ لاہور میں رزلویشن نمبر ۱ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی۔ رزلویشن یہ ہے:-

رزلویشن نمبر ۱

اس کانفرنس کی رائے میں مجوزہ یونیورسٹی کی اسکیم میں ہر مسلمان طالب علم کے لئے قتل ازبں کردہ امتحان بی اے میں شامل ہو۔ دنیات کے ضروری اصولوں میں ایک امتحان جس کا سبب معیار آئندہ مقرر کیا جاوے گا پاس کرنا لازمی ہوگا *

جناب صدر انجمن حاضرین!

اس وقت جو رزلویشن پیش ہو رہا ہے، غالباً کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا کہ اُسے خاص قسم کی خوشی اُس سے حاصل نہ ہوئی ہو اور اس کانفرنس کے مفید ہونے میں اب کسی کو کلام کرنے کا موقع باقی رہا ہو۔ اس قسم کے رزلویشن نہایت عزت اور خوشی کی نظر سے قوم میں دیکھے جاتے ہیں اور اس قسم کے مسائل پر بحث کرنے سے بہت سے مفید نتیجے پیدا ہوتے ہیں اور ہماری کانفرنس اسی قسم کے رزلویشنوں کے پیش ہونے پر پسندیدہ اور قبول اور بکار آمد ہو سکتی ہے *

مجھے اس رزلویشن کے پیش ہونے سے جو خوشی ہوئی ہے اُس کے کئی سبب ہیں۔ سب سے اول یہ ہے کہ یہ رزلویشن اُس قوم کے آدمی نے پیش کیا ہے جو تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اس زمانہ

میں اعلیٰ درج پر پہنچی ہوئی ہے اور جو انسانی کمالات میں ایشیا کی رہبر و رہنما سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کا
پیش کرنے والا خود تعلیم یافتہ اُس یونیورسٹی کا ہے جس پر انگلستان کو ناز ہے اور جس کے نوں پر ہم
اپنی یونیورسٹی بنانا چاہتے ہیں *

دوسری وجہ خوشی کی یہ ہے، کہ جو رزولوشن پیش کیا گیا ہے۔ اور جس پر مجھے امید ہے
کہ بہت بڑی بحث ہوگی، وہ نہایت ضروری اور اہم اور مسلمانوں کے خیالات اور خواہشات
کے موافق ہے *

اس رزولوشن کا جو پیش کیا گیا ہے ایک مقصد تو یہ ہے کہ ہماری مجوزہ یونیورسٹی میں
دینیات کی تعلیم ہونی چاہئے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک طالب علم کا دینیات میں مثل اور علوم
کے امتحان لیا جائے اور کسی طالب علم کو ڈگری کے امتحان میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی جائے جب تک
کہ وہ دینیات کا امتحان پاس نہ کر لے *

پہلے مقصد کی نسبت کہ ہماری مجوزہ یونیورسٹی میں دینیات کی تعلیم ہو، میں آپ کی توجہ فرما
اسی بات پر نہیں چاہتا کہ آیا بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمانوں کو اپنی خاص یونیورسٹی میں دینیات
کی تعلیم لازمی ہے یا نہیں بلکہ میں آپ کو مجوزہ یونیورسٹی کے قائم کرنے کے ابتدائی خیالات کی یاد دلاتا ہوں
اور جن اصول پر مدرسۃ العلوم قائم ہوا اور جن پر ہماری مجوزہ یونیورسٹی قائم ہوگی، ان پر آپ کی توجہ
چاہتا ہوں *

سہ ماہ میں جب کہ کمیٹی خواہستگار ترقی تعلیم مسلمانان نے مسلمانوں کے منزل تعلیم کے اسباب
دریافت کرنے کا اشتہار دیا تھا اور انعامی رسالے پیش ہوئے تھے اُس وقت عموماً سب نے یہ رائے
دی تھی کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں چونکہ مذہبی تعلیم نہیں ہوتی اس لئے مسلمان کم داخل ہوتے
ہیں۔ اور جملہ ممبران کمیٹی نے اس پر اتفاق کیا تھا کہ مسلمانوں کے لڑکوں کو تعلیم مذہبی کا ہونا ضروری
ہے۔ اور چونکہ مذہبی تعلیم سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں ہو نہیں سکتی اس لئے مسلمانوں کو اس کا
اہتمام خود کرنا اور اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے خود علیحدہ مدرسہ قائم کرنا چاہئے۔ اور زیادہ تر اسی بنیاد
پر مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا بنانا تجویز ہوا اور مسلمانوں کو اسی بات کی ترغیب دے کر ان سے ہزاروں
لاکھوں روپیہ کا چندہ لیا گیا۔ اور مذہبی تعلیم ہی وہ چیز تھی جس کی امید اور شوق نے مسلمانوں کو مدرسۃ
العلوم کی طرف متوجہ کیا۔ اور مذہبی تعلیم ہی وہ شے ہے جس سے مدرسۃ العلوم اور اسکولوں اور کالجوں
کی نسبت مسلمانوں سے مخصوص اور محمدن کالج کے نام پانے کا مستحق سمجھا گیا۔ اور یہی وہ چیز ہے،
جس کا اظہار اور اعلان پبلک اور گورنمنٹ پر ہمیشہ خاکی اور سرکاری تحریروں اور تقریروں میں کیا گیا۔
ذرا آنکھ کھولو اور ان تحریروں اور تقریروں اور ایجنڈوں اور پیکچروں اور سپان ناموں اور ڈریسوں کو دیکھو جو

۱۸۷۷ء سے اب تک پیش ہوئے، اور جن سے سارا کارڈ بھرا ہوا ہے اور جس میں اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ بغیر مذہبی تعلیم کے مسلمانوں کی تعلیم نہ صرف ناقص ہے بلکہ وہ انگریزی تعلیم کے حاصل کرنے سے بھی معذور ہیں۔ *

۱۸۷۸ء میں جب سر ولیم سٹینٹن گورنر مائیک مغربی و شمالی مدرسہ دیکھتے کہ آئے اُس وقت انہوں نے مذہبی تعلیم کی ضرورت کی نسبت کہا کہ ”اکثر لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ بغیر مذہبی تعلیم کے تکمیل نہیں ہو سکتی۔ مگر ایسے ہیں جو اس کو تسلیم نہیں کرتے، سبب یہ ہے کہ لڑکے کی طبیعت نازک ہوتی ہے اُس کی مثال پودے کی ہے اگر پہلے لڑکھا ہو جائے تو پھر بڑا ہو کر سیدھا نہیں ہو سکتا، اگر سیدھا ہو جائے تو پھر کج نہیں ہو سکتا۔ اگر بچپن میں اخلاق درست ہو جائیں تو امید ہوتی ہے کہ جب بڑا ہو جائے تو نیک اور اچھے اخلاق کا ہو۔ ایام سلف میں کسی فلاسفر دم نہ ہی کہا ہے کہ اگر نصیحت چھوٹی عمر میں دی جاوے تو دل میں گہری جڑ پکڑ جاتی ہے۔ ان دونوں باتوں سے یہی نکلتا ہے کہ اگر بچپن کے اخلاق کی وہ باتیں جن سے دل سیدھا ہوتا ہے، نیکی دل میں آتی ہے، بتانی جاویں۔ شکار خالق کو حاضر و ناظر جانتا، عقیدے کے حالات، جزا و سزا کی تعلیم وغیرہ بچپن ہی میں نہ ہو تو بڑا ہو کر بے ایمان رہتا ہے۔ فور کی حالت میں، بدکاری میں، مبتلا رہتا ہے پھر وہ کجی جو بڑے درخت کی کجی کے مانند اُس میں ہے سیدھی نہیں ہوتی۔ *

ہرکلسنسی لارڈ لٹن ولیمس گورنر جنرل ہند نے جب کہ وہ ۱۸۷۸ء میں ہمارے مدرسے کے بنیادی پتھر رکھنے کے لئے تشریف لائے تھے مذہبی تعلیم کی نسبت اپنی رائے اس طرح پر ظاہر فرمائی تھی ”آپ نے اپنے ایڈریس میں یہ بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کی قوم اپنے مذہب کو نہ صرف ہنسی و ہول والی دلائل پر مبنی سمجھتی ہے۔ بلکہ اُس کو دنیاوی تعلقات میں سب سے عمدہ اور سب سے بڑھ کر رہنا خیال کرتی ہے۔ *

”اے صاحبو! میں اس قسم کے مذہبی یقین کو یہ سمجھتا ہوں کہ ایسا یقین تمام سچے مذہبی یقین کی سب سے عمدہ شکل ہے کیونکہ ہر ایک مذہب کا خواہ اُس کا کچھ ہی نام ہو اور اُس کی کیسی ہی شکل ہو سب سے زیادہ مانا ہوا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانی مشاغل کی دنیاوی زندگی کے مختلف فرائض میں رہنمائی کرے اور میں یقین کرتا ہوں کہ آپ اس بات کے اعتراف کرتے ہیں جو درادریغ نہ کر سیکے کہ مذہبِ اسلام میں کوئی ہول ایسا نہیں ہے جو اعطی ورجہ کی دماغی ترقی کا مانع خیال کیا جاسکتا ہو قوم مسلمانان نے علم و ہنر و سائنس کے میدان میں بڑی بڑی فتوحات حاصل کی ہیں۔ *

اسی مذہبی تعلیم کے لازمی ہونے کے متعلق اُس ایڈریس میں جو ہرکلسنسی لارڈ رپن کو دیا گیا تھا سر سید رحم نے بیان کیا تھا کہ ”ہمارے کلچ کی سلسلہ خواندگی میں مذہبی تعلیم دنیوی تعلیم کے

ساتھ شامل ہے۔ کالج کے منتظم طالب علموں کے ذاتی عادات اور پرائیویٹ لائف کی نگرانی کرتے ہیں اور عقلی امور اخلاقی تعلیم و تربیت کے ساتھ جسمانی ورزشوں کو ترقی دیکھتی ہے۔ اور یہ کالج قومی جوش کا نتیجہ ہے۔ اور اُس کا مقصد مسلمانوں کی قوم کی تعلیمی حاجتوں اور مذہبی خواہشوں کا رفع کرنا ہے۔ اس ایڈریس کے جواب میں لارڈ پرین نے فرمایا تھا کہ ”آپ نے بیان کیا ہے کہ اس کالج کے بانیوں کا ایک خاص مقصد مذہبی اور دنیوی تعلیم کا ساتھ ساتھ دینا ہے۔ اور میں اس مقصد کو دل سے پسند کرتا ہوں کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ تعلیم کے اُن دو شعبوں کے درمیان جو مذہبی اور دنیوی نام سے مشہور ہیں جو تفرق سمجھا گیا ہے وہ صرف ایک مصنوعی تفرق ہے۔ کامل تعلیم و تربیت صرف اُن دو شعبوں یعنی مذہبی اور دنیوی کے بخوبی خلط ملط ہونے سے بخوبی حاصل ہو سکتی ہے“

پھر اسی بات کو کہ مذہبی تعلیم اور مذہبی تربیت ہمارے کالج کی خصوصیات سے ہے نہایت فخر کے ساتھ اُس ایڈریس میں جو سر اکلینڈ کالون لفٹنٹ گورنر مملکت مغربی و شمالی کو دیا گیا تھا سرسید نے یہ لکھا تھا کہ ”مسلمانوں کی تعلیم کی اُن ضروریات پر بھی ہم نے بخوبی لحاظ کیا ہے، جو اور کسی کالج میں پوری نہیں ہو سکتی ہیں یعنی اُن کی مذہبی تعلیم کو بھی خواہ وہ سنی ہوں یا شیعہ ایک مناسب حد تک تعلیم کا لازمی جز و قرار دیا ہے، اور اس ذریعہ سے ہم کو اُن کے اخلاق کی درستگی کا بھی نہایت عمدہ موقع حاصل ہوا ہے۔ ہم مذہبی تعلیم میں نسبت فقہی مسائل کے زیادہ تر اخلاقی تعلیم کو عزیز رکھتے ہیں۔ ہم اُن کو مذہبی تعلیم میں سکھاتے ہیں کہ رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرنا، تمام مخلوق خدا کے ساتھ رحمت و شفقت سے پیش آنا، نرمی اور حیا اور حسن خلق کا اختیار کرنا، غضب اور غرور کو ترک کرنا، سب سے بڑا جزو ایمان کا ہے۔ پھر ہم اُن کو سکھاتے ہیں کہ خدا کے حقوق بندوں پر کیا ہیں۔ آپس میں ایک مسلمان کے حق دوسرے مسلمان پر کیا ہیں۔ ایک ہمسایہ کے حقوق دوسرے ہمسایہ پر گودہ کسی مذہب کا ہو، کیا ہیں۔ باپ کے حقوق اولاد پر۔ بڑے کے حقوق چھوٹے پر کیا ہیں۔ مختلف قوموں کے ساتھ ہم کو کس اخلاق سے زندگی بسر کرنی چاہئے۔ پھر ہم اُن کو سچائی کی خوبی سکھاتے ہیں اور اُن کو بتلاتے ہیں کہ دل کی سچائی کیا ہے، زبان کی سچائی کیا ہے، نیت اور ارادہ کی سچائی کیا ہے، وعدہ کی سچائی کیا ہے، اعمال کی سچائی کیا ہے، مذہبی تعلیم کے یہ رسالے آپ کے سامنے موجود ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمادینگے کہ یہ سب اسی قسم کے اخلاقی امور سے ملو ہیں“

اسی بات کا مجموعہ سرسید نے مارکولس آف ڈفرن و لیرے ڈگورنر جنرل ہند کے ایڈریس میں اعادة کیا تھا اور کہا تھا کہ ”جو تعلیم یہاں دیکھتی ہے وہ مذہبی اور پولیٹیکل تحمل کے نہایت وسیع ہول پر مبنی ہے۔ اور اس کالج کے قائم کرنے کا خاص مقصد یورپین سائنس اور انجمنش لٹریچر میں مسلمانوں کی تعلیم کے واسطے سولتوں کا متیا کرنا بذریعہ دفع کرنے اُن اعتراضات کے تھا جو مذہبی یا شیعہ انتہا

کی وجہ سے اُن کو انگریزی تعلیم سے باز رکھتے تھے۔ اسی ایڈریس میں اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ یہ کالج کیمبرج اور اکسفورڈ کی یونیورسٹیوں کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ اُسی ایڈریس میں مرحوم بیان کیا تھا کہ ”جو کالج اس قسم کے انگلستان میں ہیں اُن کی عمدہ نظیر کی پیروی کر کے مسلمان طالب علموں کو مسلم مذہبی علموں کی کتابوں میں مذہبی تعلیم دیکھائی جاتی ہے۔ اور پکے مذہب کے معلم اُن مضامین کے درس کے درس کے واسطے مقرر کئے گئے ہیں۔ سُنی اور شیعہ دونوں کو اُن کے مذہبی مسائل کے مطابق تعلیم دیکھائی جاتی ہے لیکن دونوں کے واسطے جو کتابیں منتخب کی گئی ہیں وہ اس قسم کی ہیں جن سے مذہبی مسائل کی تعلیم کے علاوہ اخلاق اور انسانیت کے اُن وسیع اصولوں کی تلقین ہوتی ہے، جو عام طور کے ہیں اور بنی نوع انسان کی سوشل زندگی کی بنیاد ہیں، اس قسم کی مذہبی تعلیم کو ترقی دینے کے لئے کالج کے قواعد کے بموجب مسلمان طالب علموں پر ہر روز نماز میں شریک ہونا، اور قرآن مجید کی تلاوت کرنا، لازمی قرار دیا گیا ہے۔ سُنی اور شیعہ ایک مسجد کی تعمیر کے واسطے جو کالج کی عمارت میں سے نہایت شاندار اور خوش نما ہوگی روپیہ دینے میں شریک ہوئے ہیں۔ اور اگرچہ یہ مکان ہنوز پورا نہیں ہوا ہے تاہم ہر طرح پر یہ توقع کرتے ہیں۔ کہ اہل اسلام بلیسٹن فیلڈ ضروری سرمایہ فراہم کرینگے“ اور لارڈ ڈفرن نے اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ ”ہمارا موجودہ سرکاری طریقہ تعلیم درست عادات اور اخلاقی تعلیم کے ذریعہ سے کافی طور پر محفوظ نہیں ہے۔ اس لئے مجھے کو اس بات کے دیکھنے سے رضامندی حاصل ہوتی ہے کہ آپ نے اس بات کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے کہ آپ کے طالب علموں کو مذہبی اور اخلاقی اور سوشل تعلیم و تربیت دیکھائے“ اور اسی بات کا بیان اُس ایڈریس میں کیا گیا تھا۔ چیشٹن ٹگلز اسٹریٹ صاحب بہادر جج مائیکورٹ کو دیا گیا تھا اُس کے الفاظ یہ ہیں کہ ”ایک ایسے انسٹیٹیوشن کی ضروریات کے مہیا کرنے کے لئے جس نے اپنی ابتدائی تجویز کے بموجباً صمد دور و دراز سے اس طرح پر طالب علموں کو اپنی جانب اُٹل کیا یہ امر ضروری تھا کہ وہ صرف ایک تعلیم دینے والی انسٹیٹیوشن ہی نہ قرار دیکھا دے، بلکہ انگلستان کے بڑے بڑے پبلک اسکولوں اور اکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کے نمونہ پر طالب علموں کی سکونت کا مسکن بھی قرار دیکھا دے جہاں کہ صرف عقلی تربیت کی ہی نہیں بلکہ اخلاقی اور مذہبی تربیت کی بھی درست اور نگرانی کی جاتی ہو، اور اُن لیرن کھیلوں کو ترغیب دینے سے جن کے لئے انگلستان مشہور و معروف ہے طالب علموں کی جسمانی ندرستی قائم رکھی جاتی ہو“

یہ چنانچہ انتخاب اُن ایڈریسوں کا ہے جو ہمارے کالج سے بڑے بڑے حکام کو دئے گئے اور جس میں مذہبی تعلیم کا ہمارے کالج کی تعلیم کا لازمی جزو ہونا بیان کیا گیا۔ اور اگر تیس تمام تحریروں اور تقریروں کا انتخاب کروں تو وہ ایک بڑی کتاب ہو جائے۔ مگر جو کچھ میں نے بیان کیا اُس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ مذہبی تعلیم ہمارے کالج کا اصلی اور ضروری حصہ ہے اور اگر وہ پورا نہ کیا جائے تو درحقیقت

ہمارا کالج محمد بن یونیورسٹی کے نام کا مستحق نہیں ہے۔ نہ ہم کو آئندہ یونیورسٹی کا نام محمد بن یونیورسٹی رکھنا چاہئے۔

پس اگر ہم کو مسلمان رہنا ہے اور انسان بھی بننا۔ اسلام کا قائم رکھنا بھی منظور ہے اور دنیا میں قی بھی کرنی، تو اس پاک مقولہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ الملک والدین تو امان اور اس غرض کے حاصل ہونے کے لئے ہم کو دنیاوی علوم کے ساتھ دینی علوم کا سیکھنا ضروری ہے۔ اور پختہ مسلمان اور انسان ہونے کے لئے ہم کو دونوں کا خیال رکھنا اور دونوں کے سامان متیا کرنے لازم ہیں۔ اگر ہم صرف تعلیم مذہبی پر قانع رہیں تو اپنی قوم اور اپنے مذہب کو دنیاوی حیثیت کے لحاظ سے کچھ فائدہ پہنچا نہیں سکتے۔ دین کی عزت کے لئے دنیاوی عزت ضروریات سے ہے۔ اگلے زمانہ پر نظر کرو جب ہمارے اقبال کا آفتاب نصف النہار پر چمکے گا تو ہمارے سطوت اور جلال اور عزت کو ان کا غلغلہ چار دانگ عالم میں پڑا ہوا تھا، اس کا اصلی سبب کیا تھا۔ دین کے ساتھ دنیاوی عزت ہمیں حاصل تھی اور دینی علوم کے ساتھ ہم دنیاوی اور عقلی علوم کے عالم تھے، اور دینی بزرگی کے ساتھ دنیاوی شجاعت اور دنیاوی ثروت ہمیں حاصل تھی جب دولت تھی دنیا ہماری جوتی کے نیچے تھی اور جب دنیاوی عزت ہم رکھتے تھے، دینی شان و شوکت کی شاعیں عالم ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔

اُس وقت جب کہ ہم دین و دنیا دونوں رکھتے تھے کتنی خانقاہیں آباد تھیں، کتنے مدرسے جاری تھے، کتنے عالم، کتنے مشائخ۔ کتنے بزرگ، کتنے ولی دکھائی دیتے تھے۔ ہندوستان کے اخیر زمانہ ہی پر نظر کرو اور دیکھو کہ اُس وقت بھی جب کہ کسی قدر دنیاوی عزت باقی تھی دینی عزت کا کیا حال تھا۔ دہلی میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز سے محدث، لکھنؤ میں بھرا العلوم ملا عبدالعلی سے عالم اور مولانا دلدار علی اور سید محمد حبیب مجتہد۔ ناسخ و آتش جیسے نامور شاعر، دیر و انیس جیسے فیضی مرثیہ گو، مسلمانوں کی عزت و شان بڑھانے والے موجود تھے اور پھر خیال کرو کہ وہ کیا ہوئے اور کہا گئے اور ان کے بعد ان کے جانشین کچھ کیوں پیدا نہ ہوئے۔ تلک امة قد خلت وہ گزب گئے اور دنیا کی دولت و عزت کے ساتھ وہ بھی چل بسے۔ جب دنیا کی دولت و عزت جاتی رہی۔ علم و مذہب جس پر ہمیں تار تھا اُس کی نشانیاں بھی مٹ گئیں۔ پس جس بات کا تجربہ ہو چکا، اور جو ہمارے اوپر گزر چکا اُس سے آئندہ کا سبق لینا چاہئے، اور وہ سبق یہ ہے کہ وہ علوم بھی سیکھو جس سے تم کو دنیا میں عزت و دولت و ثروت ملے اور سلطنت و حکومت میں حصہ پاؤ تاکہ تم کو اپنے دین اور اپنے مذہب کی عزت و شان بڑھانے کا ذریعہ اور موقع ملے اور پھر اپنی قوم میں ویسے ہی لوگ پیدا ہونے کی امید رکھو جن سے قوم کی عزت اور شان بڑھے اور اسی کے ساتھ تم اپنے مذہبی علوم کو بھی سیکھو اور اپنی مقدس زبان عربی کو بھی جس میں علم و تہذیب کا خزانہ ہے نہ بھولو۔

لیکن اگر ہم نے اپنے مذہبی علوم کو چھوڑ کر صرف انگریزی علوم پر قناعت کی اور اُسی کو اپنی ترقی کا سبب سمجھ لیا تو وہ بھی ہماری قوم کے درد کی دوا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر مسلمان تمام دنیا کے علوم پڑھ جائیں اور سارے جہان کی زبانیں سیکھ لیں۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے ہونا کیسا بیکین اور یون ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ مگر اپنے علوم اپنے دین و مذہب اپنے ادب اپنی تاریخ اپنے اخلاق سے ناواقف رہیں۔ تو اُن کے علم سے جہل، اُن کی حکمت سے نادانی، اُن کی تہذیب سے وحشت۔ سو درجہ ہزار درجہ لاکھ درجہ بہتر ہے *

ایسے عالم، ایسے حکیم، ایسے زبانداں، قوم کے لئے ایک مصیبت ہونگے نہ کہ رحمت۔ ایسی تعلیم، ایسی تربیت، قوم کی ذلت کا سبب ہوگی۔ نہ کہ عزت کا باعث۔ قوم ایسے انگریزی دان پر جو اپنے مذہب و اخلاق سے واقف نہ ہو، اُس جاہل کو ترجیح دیگی۔ جس میں مذہبی جوش اور مذہبی حرارت موجود ہو۔ اگر انصاف سے دیکھو تو یہ بات مانتی پڑیگی کہ جو شخص صرف انگریزی پڑھے اور نئے علوم سیکھے مگر اپنے دین و علم سے بے خبر رہے اُس سے اسلام کو ہرگز فائدہ نہ پہنچے گا۔ نہ مسلمانوں کی اُس سے عزت ہوگی پس ایسی تعلیم سے جس سے ہماری قوم میں قومیت کا اصلی عنصر باقی نہ رہے کیا حاصل۔ اور ایسی دولت و ثروت سے جس سے اسلام کو فائدہ نہ پہنچے کیا فائدہ۔ اُس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے

جب سیکھ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

غرض کہ مسلمانوں کی ترقی کی اصلی تدبیر یہی ہے کہ دنیاوی علوم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی جاری رکھی جائے۔ اسی خیال سے میں اس رزلوشن کو جس کا ایک مقصد یہ ہے کہ ہماری مجوزہ یورشی میں دینیات کی تعلیم ہونی چاہئے نہایت دل سے تائید کرتا ہوں *

رہا اُس کا دوسرا مقصد کہ ہر ایک طالب علم کا دینیات میں نثر اور علوم کے امتحان لیا جائے، اور کسی طالب علم کو ڈگری کے امتحان میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی جائے جب تک وہ دینیات کا امتحان پاس نہ کرے۔ اسے بھی میں ضروری سمجھتا ہوں *

آپ نے ابھی تھیہ ڈوریک صاحب کی تقریر سنی ہے۔ انہوں نے اس دوسری تجویز سے اپنی لغت ظاہر کی ہے۔ یقیناً اُس پر آپ کو تعجب ہوا ہوگا۔ مگر مجھے اُس پر کچھ حیرت نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ وہ امتحان کو عموماً معیار ریاضت کا نہیں سمجھتے اور عام سلسلہ تعلیم میں بھی سب سے مفید ہونے کے اُسے مفید خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۹۷ء کی اپنی تقریر میں جو سرچارلس کر اسٹورٹ صاحب لٹنٹ گورنر مالٹہ کی شمالی کے سامنے اسٹریچی ہال میں کی تھی کہا تھا کہ ”مجھ کو ہندوستان کے طریقہ تعلیم میں بیشکایت ہے کہ تعلیم کا تمام مقصد صرف ایک خیال پر یعنی امتحان کے پاس کر لینے پر محدود کر دیا گیا ہے۔ امتحان کا پاس کر لینا

خاص کوشش طالب علم کی ہے اور وہی محنت کرنے کے واسطے اُس کے لئے ایک ترغیب ہے اور جس وقت یہ ترغیب جاتی رہتی ہے تو اکثر اوقات اُس کو تحصیل علم کی خواہش بھی نہیں ہوتی *
میرے نزدیک یونیورسٹی کا ایک خاص مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ علم کے شوق کو صرف علم کی غرض سے ترغیب دے مگر امتحان کا خوف طالب علموں کی طبیعت میں ایسی ترغیب پیدا نہیں ہونے دیتا۔ یہ خیال مسٹر بیک نے مذہبی تعلیم کی نسبت بھی ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مذہبی تعلیم سے مخالف نہیں ہوں بلکہ یہ میری دلی آرزو ہے اور میں نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ مذہبی تعلیم دیکھا مگر بیان کی رائے ہے کہ دنیاویات کی تعلیم امتحانوں کے ذریعہ سے پورے طور پر طالب علموں کو دینا بالکل ناممکن ہے *

صاحبو! میں مسٹر بیک کی تقریر کی نسبت یہی اپنا خیال ظاہر کرتا ہوں، جو سرچارلس اسٹوٹ صاحب نے اُن کے اعتراض پر نسبت طریقہ امتحان کے ظاہر کیا تھا اور کہا تھا کہ ”میں نے بڑی خوشی کے ساتھ ایک کالج کے پرنسپل کو طریقہ امتحان کی مذمت کرتے ہوئے سنا اور میں اس بات کا خواہاں ہوں کہ مسٹر بیک کو امتحانات کے برخلاف اپنی کوشش میں کامیابی حاصل ہو۔ لیکن اے صاحبو! یہ امر ضرور ہے کہ علم کی کوئی جانچ مقرر ہو، اور یہ بات مناسب نہ ہوگی کہ ہر ایک لڑکے کو بغیر طلب کرنے ثبوت اس بات کے کہ اُس نے ایک کافی اور معقول تعلیم حاصل کی ہے، ڈگری کے حاصل کرنے کا اختیار دیدیا جائے،“ مذہبی تعلیم کی نسبت بھی مسٹر بیک کے اعتراض کا یہی جواب ہے کہ جو تعلیم مذہبی ہماری یونیورسٹی میں دیکھائے آخر اُس کی کوئی جانچ ہونی چاہئے اور وہ سوائے امتحان کے کیا ہو سکتی ہے یہ سچ ہے کہ مذہبی تعلیم لڑکوں کو مقدس اور پرہیزگار نہیں بنا سکتی۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ تعلیم ہی وہ شے ہے جس سے انسان کے خیالات کی اصلاح ہو سکتی ہے اور اگر تعلیم عمدہ اور پاکیزہ ہے تو بلاشبہ اُس کا اثر دلوں پر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ اور اس زمانہ پر کیا منحصر ہے اسکے زمانہ میں جب کہ ہمارے یہاں ہر قسم کی تعلیم کا چرچا تھا صرف تعلیم سے لوگ مقدس اور پاک اور پرہیزگار نہیں بن جاتے تھے۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ مذہبی تعلیم ہی کا یہ اثر تھا کہ تعلیم یافتہ گروہ میں سے امام تاجری اور امام غزالی سے مقدس عالم تیار ہوئے۔ اگر مذہبی تعلیم ہماری یونیورسٹی میں دینا ضروری ہو اور مثل دیگر علوم کے مذہبی علوم کا سکھانا بھی ہماری یونیورسٹی کی تعلیم کا ایک جزو قرار دیا جائے تو یہ ایک نئی ہی بات ہے کہ مثل دنیاوی علوم کے دینی علوم کی تعلیم کا کوئی ذریعہ نہ رکھا جائے اور مذہبی تعلیم امتحان کی قید سے آزاد کر دیکھ جائے۔ اس کا یہ اثر نہ ہوگا کہ مذہبی تعلیم پانے والے مقدس اور پاک ہو جائیں گے اور مذہب کی اصلی خوبیاں اُن کے دل میں نقش ہو جائیں گی۔ بلکہ اُس کا اثر یہ ہوگا کہ مذہبی تعلیم پر کچھ توجہ نہ کی جائیگی۔ نہ اُس کے سیکھنے کا زیادہ خیال رہے گا۔ یہ سچ ہے کہ امتحان کا خوف مذہبی باتوں کے سیکھنے کی فقط ترغیب

دیگا، اور صرف امتحان اصلی مذہبی خیالات کے دل میں جم جانے کا کافی معیار نہ ہوگا۔ مگر اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ اسی قسم کے تعلیم یافتہ گروہ میں سے جو ابتداءً امتحان کے خوف سے مذہبی علوم سیکھنے میں دل لگانے لگے، ایسے لوگ بھی پیدا ہونگے جن کے دلوں میں اصلی خوبیاں مذہب کی سما جائیں اور جن کے دل اپنے پاک مذہب کے پاک عقیدوں سے روشن ہوں۔ اور جن کے پاک علم کا اثر اُن کے اعمال اور فعل سے ظاہر ہو۔ نوجوانوں سے بغیر امتحان کے خوف کے مذہبی تعلیم پر توجہ کرنے کی امید رکھنی ایسی ہی ہے جیسے کہ عام تعلیم میں امتحان کی قید نکال دینے سے ہو سکتی ہے۔ روحانی اور اخلاقی چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ اُن کی کسی ظاہری پیمانہ سے جانچ و پرتال کی جاسکے۔ البتہ تعلیم وہ شے ہے کہ امتحان سے اُس کی جانچ و پرتال ہو سکتی ہے۔ اگر ہم مذہبی تعلیم میں امتحان کی قید نہ رکھیں تو ہم کو مذہبی تعلیم کے نتیجہ سے بھی بلبوس ہو جانا چاہئے۔ اور جو دلیلیں میک صاحب نے بیان کی ہیں اگر وہ مافی جائیں تو اس وقت بھی جو برائے نام طریقہ مذہبی تعلیم و تربیت کے ہمارے کالج میں جاری ہیں ہم کو نفلِ عبث سمجھ کر بند کر دینا چاہئے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ طالب علموں پر جبریہ نمازیں حاضر ہونے یا قرآن خوانی کے گھنٹوں میں حاضر ہو کر قرآن شریف پڑھنے سے اُن کے دلوں میں اصلی مادہ مذہبی جس کو ہم پیدا کرنا چاہتے ہیں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ دلیل درست ہے تو ہمارے کالج میں جو قواعد نمازیں حاضر ہونے، یا قرآن خوانی کے گھنٹوں میں قرآن شریف پڑھنے کے لئے مقرر ہیں اُن سب کو لغو اور بیہودہ سمجھ کر بند کر دینا چاہئے۔ اور اگر ایسا کیا جائے تو اُس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ اصلی مادہ مذہبی پیدا کرنے کے لئے ہم مقدس اور برگزیدہ علما کی صحبت میں اپنے لڑکوں کو رکھیں یا اُن کے مذہب کی طرف سے مطلقاً بے پروا ہو جائیں اور مذہب کی قیود سے اُن کو پوری آزادی دیں۔ پہلی صورت کالج اور یونیورسٹی میں کوئی نکر محال ہو سکتی ہے۔ ہم کہاں سے ایسے مقدس اور پاک علما اور بزرگوں کا گروہ جمع کر سکتے ہیں۔ جن کی صحبت ہمارے نوجوانوں کو محال ہو، اور جن کی صحبت کی برکت سے اُن میں بھی اصلی مادہ مذہبی پیدا ہو۔ بظاہر ہمارے نوجوان طالب علموں کو کالج کے احاطہ میں ایسی صحبت کا نصیب ہونا مشکل ہے۔ کرکٹ کھیلنے والوں، فٹ بال میں دوڑنے والوں، اور چیر ز دینے والوں، اور ہرے کے غل چمانے والوں، کی صحبت میں جو ہر وقت اُن کو نصیب ہوگی۔ مذہبی تقدس کا مادہ پیدا نہیں ہو سکتا اور جسمانی ورزشوں اور کھیل کود کے جلسوں سے مذہب کی اصلی خوبیاں اُن کے دل میں نہیں بیٹھ سکتیں +

ہاں اگر مذہبی خصوصیت باقی نہ رکھی جائے اور وہ چیزیں جو الہام و وحی سے سکھائی گئی ہیں اُن کا نامنا ضروری نہ سمجھا جائے۔ اور اُن اخلاق اور اعمال کا جن کی تعلیم خدا کی طرف سے اور خدا کو نام سے خدا کے پیغمبر نے کی ہے خیال چھوڑ دیا جائے اور صرف اُن باتوں کا جو عقل اور تجربہ سے انسانی اور

انسانی سوسائٹی کے لئے مفید معلوم ہوں سکھانا مذہبی تعلیم سمجھی جائے، تو میں قبول کروں گا کہ یہ مقصد اچھے لوگوں کی صحبت میں رہنے سے گو وہ عیسائی ہوں یا یہودی یا پارسی ہوں یا ہندو ماہل ہو سکتا ہے مگر اسے اسلامی تعلیم سمجھنا اور اسے مذہبی تعلیم کہنا ہرگز جائز نہ ہوگا۔

صاحبو! میرا یہ خیال ہے کہ اس زمانہ میں تعلیم کی ترقی اور علوم و فنون جدیدہ کی غیر محدود و نامتناہی اور مذہبی تعلیم کے نقص اور علماء اور مشائخ کی تنگ دلی اور تعصب اور جاہل مسلمانوں کے مذہبی افعال نے بعض نیک دل اور دانشمند لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ مذہبی تعلیم درحقیقت عقل اور فطرت کی تعلیم کے ساتھ ہم قدم چل نہیں سکتی، اور دونوں میں ایسا تناقض ہے کہ وہ دور نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ایسے لوگ مذہبی تعلیم میں انہیں چند ضروری باتوں پر قناعت کرنا مفید سمجھتے ہیں، جو تمام انسانوں میں یکساں مانی جاتی ہیں۔ اور جن کو بجائے مذہبی تعلیم کے اخلاقی تعلیم کہنا زیادہ موزوں ہے۔ ایسے لوگ صرف اسلام کے نامانے والوں میں سے ہی نہیں ہیں بلکہ بعض مسلمانوں کا بھی یہی خیال ہے۔ خود سید روحم کا یہ خیال تھا۔ اور وہ موجودہ مذہبی تعلیم کو مفید نہ سمجھتے تھے اور نہ اس کا جاری رہنا پسند کرتے تھے۔ نہ دل سے وہ مدرستہ العلوم میں اسے جاری کرنا چاہتے تھے اور یہ وہ بات ہے، جسے نہ انہوں نے چھپایا تھا نہ اپنے اس خیال کو پوشیدہ رکھا تھا بلکہ انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں اور تجویزوں میں صاف صاف اس بات کو ظاہر کر دیا تھا۔ مگر لوگوں کے اختلاف کرنے اور صرف قوم کے خیالات کے لحاظ سے انہوں نے مذہبی تعلیم مدرستہ العلوم میں مطابق موجودہ طریقہ کے جاری رکھنے کو منظور کر لیا تھا مگر بالطبع وہ اس سے متنفر تھے اور اسے غیر مفید سمجھتے تھے اور اسی کا سبب ہے کہ تعلیم مذہبی اور عربی کی شروع شروع میں مدرستہ العلوم میں جاری کی گئی تھی اور جس کے لئے علیحدہ درجے قائم کئے گئے تھے اور اس کے لئے خاص انتظام کیا گیا تھا روز بروز کم ہوتی گئی اور آخر سوائے نام کے کچھ جان اس میں باقی نہ رہی۔

۱۸۸۰ء میں جو رپورٹ سبلیکٹ کمیٹی نے خلیفہ صدر کیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کی لکھی گئی ہے اور جس میں مسلمانوں کے تنزل تعلیم اسباب سے بحث ہے اور جس پر مدرستہ العلوم کا قائم کرنا تجویز ہوا ہے اور جس میں وہ اصول قرار دیئے گئے ہیں جو مدرستہ العلوم کے چلانے کے لئے ضروری سمجھے گئے تھے، اسے اٹھا کر دیکھو اور اس میں اس بحث کو پڑھو، جہاں اس کا ذکر ہے کہ انگریزی کالجوں اور اسکولوں میں تعلیم پانے سے مذہبی عقائد میں خلل واقع ہوتا ہے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ روحم سید نے موجودہ مذہبی تعلیم کے غیر مفید ہونے کی نسبت اپنا خیال کس شد و مد کے ساتھ ظاہر کیا تھا انہوں نے کہا تھا کہ ”ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ تعلیم مذہبی اصول واقعی پرانی خرابی عقائد اسلامیہ کی ہوگی، البتہ تعلیم مذہبی جو بذریعہ تئیب درسیہ مذہبیہ کے دیجاتی ہے مطلقاً اس مرض کا علاج نہ ہوگی تمام کتب

مذہبیہ جو اس زمانہ تک موجود ہیں، ہزاروں غلطیوں سے معمور ہیں، کوئی ایک کتاب بھی ہمارے ہاتھ میں ایسی نہیں آتی جس میں کوئی نہ کوئی ایسی بڑی غلطی ہمارے سامنے نہ آتی ہو، جو اسلام کی سچی اور صحیح حقیقت کو وہمی اور خیالی امر کی طرف مائل نہ کر دیتی ہو۔

جن نمبروں نے کہ موجودہ مذہبی تعلیم کو اُس بدی کا علاج سمجھا ہے جس پر ہم بحث کر رہے ہیں غالباً انہوں نے یہ خیال کیا ہو گا کہ جس زمانہ میں فلسفہ یونانیہ مسلمانوں میں شائع ہوا، تو نہایت زور سے زندہ، دلاحد، دلاحد ہی، نے شیعہ پاپا لیکن اُس زمانہ کے عالموں اور پروفیسروں نے فلسفہ یونانیہ کے ساتھ عقائد مذہبی کی تعلیم کو شامل کر دیا جس سے اُس مرض کا علاج ہو گیا۔

”اگر یہی باعث اس راسے کا ہو تو ہماری راسے میں یہ تیاس مع الفارق ہے اُس زمانہ کے علما اور پروفیسروں نے بھی اُس زمانہ کی کتب درسیہ مذہبی کو اُس مرض کا کافی علاج نہیں سمجھا تھا ایں لئے انہوں نے ایسے قسم کی کتابیں ایجاد کیں، جو اُن کے اعتقاد مذہب کی تائید یا رہنمائی اور اصل فلسفہ حکماء یونانیہ کی تردید یا اپنے عقائد سے تطبیق کرتی تھیں، اس بحث کو جانے دو کہ وہ کتابیں اپنے مقصد پر کامیاب ہوئیں یا نہیں مگر اس بات پر غور کرو کہ اُس زمانہ میں جو فلسفہ اور حکمت جدیدہ رائج ہے جو مسلمان طالب علموں کے عقائد موجودہ مذہبی میں خلل ڈالنے کا سبب ہے اُس کے لئے کوئی ایسی مذہبی کتاب ہے جو اپنے عقائد کی تائید اور اُس فلسفہ و حکمت کے مسائل کی تردید یا تطبیق کرتی ہو۔ پس موجودہ کتب درسیہ مذہبی کو سلسلہ تعلیم میں داخل کرتے سے اُس مرض کا جس کا نہایت مزمن ہے اور جس نے ہماری عمومی کورنٹ رفتہ رفتہ قح تک پہنچا دیا ہے، علاج نہیں ہو سکتا۔“

”ہماری رائے اُن میروں کی راسے کے بالکل برخلاف ہے، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس قدر مسلمان طالب علم بالفعل انگریزی پڑھتے ہیں وہ اپنے مذہب (نہیں اپنے مذہب کی کتب مذہبیہ) کی غلطیوں سے واقف نہیں ہیں اور اس لئے کچھ زیادہ خلل اُن کے عقائد مذہبی میں بالفعل نہیں آتا۔ مگر جب اُس کی تعلیم بشمول کالجوں اور اسکولوں کی تعلیم کے جاری ہوگی تو وہ اُن غلطیوں پر بھی واقف ہونگے ممکن ہے کہ کوئی شخص اُس کی تصحیح پر متوجہ ہو، مگر زیادہ تر گمان اس بات کا ہے کہ زیادہ تر بدعتی اور لاندہ مذہبی پھیل گئی۔ پس ہماری رائے میں کتب موجودہ مذہبی کا درس میں داخل کرنا اس کا علاج نہیں ہے۔“

”ہماری راسے یہ ہے کہ کیا تو مطلق تعلیم مذہبی درس میں داخل نہ کی جائے صرف بانی چند مسئلہ توحید و رسالت اور طریقہ موم و صلوات سکھا دیئے پر اکتفا کیا جاوے جیسا کہ اس زمانہ میں عموماً اشراف خاندان کے لڑکوں پلکے دھنوں، جھلاہوں، ہلکے کے لڑکوں کو سکھائے جاتے ہیں۔ اور اگر داخل کیا جاوے تو کتب مذہبی اصلاح کر کر اور جو غلطیاں اُن میں مصنفوں کی راسے اور اجتہاد سے واقع ہوئی ہیں اور دراصل مذہب اسلام اُس سے پاک اور بری ہے اُن کو صحیح کر کے درس میں داخل کی جاوے تب البتہ

اس مرض کا جو ظاہر ہیں لا علاج معلوم ہوتا ہے علاج ہو گا؟

حضرات! یہ پتھی اصلی راے مرحوم سرسید کی جو میں نے انہیں کے لفظوں میں بیان کی، اور اسی کا سبب ہے کہ گوکیشی کے عام اختلاف سے مرحوم نے موجودہ مذہبی تعلیم کو جائز رکھا اور اسی کا سلسلہ مدرسہ العلوم میں جاری ہوا اور اُس کے انتظام کے لئے مذہبی کمیٹیوں شیعہ اور سنیوں کی قائم ہوئیں مگر وہ تعلیم آخری جاری نہ رہ سکی، اور سوائے اداسے رسم اور نام کے اُس کا کوئی اثر باقی نہ رہا؟

اب بھی بعض لوگ ایسے ہیں جن کا خیال ہے۔ وہ مذہبی تعلیم کی ضروریات کو اگرچہ تسلیم کرتے ہیں اور مجوزہ یونیورسٹی میں اس کا ہونا بھی تسلیم کرتے ہیں مگر چونکہ یہ امر ان کی اصلی رائے کے خلاف ہے اس لئے وہ دل خوش کن الفاظ میں اُس کو اس طرح پر بیان کرتے ہیں کہ بظاہر مذہبی تعلیم کا نام قائم ہے مگر وہ اثر جو ناقص مذہبی تعلیم سے اُن کے خیال میں پیدا ہو سکتا ہے وہ نہ پیدا ہونے پائے؟

صاحبو! یہ کہنا مشربیک کا کیونورسٹی کی تعلیم میں مذہبی تعلیم کو جو ایک نہایت مقدس اور پاک چیز ہے بطور ایک صغیر کے قائم کرنا، اُس کی ہتک کرنا ہے اور دینیات کی تعلیم امتحانوں کے ذریعہ سے جیسی کہ چاہئے طالب علموں کو دینا بالکل ناممکن ہے، گو بہت دل خوش کن اور پاکیزہ الفاظ میں مذہب کی خوبیوں کا ثبات کرنا ہے مگر حقیقت یہ اُس خیال کی تائید ہے جو سرسید کے دل میں تھا اور سرسید ہی کے خیال کا اثر ہلکے معزز دوست بیک صاحب پر پڑا ہے؟

اگرچہ میں بنات خود سرسید کی راے اور خیال میں کچھ صلیت اور صداقت دیکھتا ہوں اور میری ذاتی رائے میں بھی موجودہ مذہبی تعلیم کا عقلی تعلیم کے ساتھ چلنا آسان نہیں ہے اور اُن تعصبات اور غلط خیالات کا جو اس وقت مذہبی گروہ کے بعض لوگوں میں پایا جاتا ہے مروجہ تعلیم سے دور ہونا محال ہے اور اُس تناقص کا جو علمی اور مذہبی مسائل میں پایا جاتا ہے ہماری موجودہ کتابوں سے رفع ہونا مشکل ہے مگر بائیں میرے نزدیک بہت کچھ مواد ان چیزوں کی اصلاح کا خود ہماری مذہبی کتابوں میں موجود ہے اور یہ مشکل بہت کچھ ہمارے متقدمین کی تصنیفوں اور تالیفوں کی مدد سے دور ہو سکتی ہے اور بزرگان دین نے اس قسم کی اصلاح کے لئے راہ کھول دی ہے امیدیں دیکھتا ہوں۔ کہ یہ خیال خود اُس گروہ میں علما کے پیدا ہو گیا ہے، جو دین مذہب کے پیشوا بننے جاتے ہیں اور ندوۃ العلماء میں جو خیالات مقدس علما نے ظاہر کئے ہیں اُس سے اس نئے زمانہ کا آغاز معلوم ہوتا ہے اس لئے میرے نزدیک مذہبی تعلیم کی نسبت جو اندیشہ ہیں اُن کے قائم رہنے کا کچھ خوف نہیں ہے اور نہ عارضی نقصوں کی وجہ سے اصلی تعلیم میں دینیات کے متاثر کرنا مناسب ہے۔ علاوہ یہی ذاتی رائے کسی کی اس باب میں کچھ ہی ہو۔ مجوزہ یونیورسٹی مسلمانوں کی ضرورتوں اور خواہشوں کے مطابق بنائی جاتی ہے، اُس میں عام مسلمانوں کی عام رائے کا اور اُن کی

اہلی خواہش کا خیال مقدم ہے اور ہم پر نہایت ایمان داری اور سچائی کے ساتھ اُس پر عمل کرنا لازم ہے اور کسی تجویز کو اس طور پر ظاہر کرنا کہ جس سے قوم کو مغالطہ ہو ایک قسم کی بددیانتی ہے۔ اس لئے ہم کو صاف منہ کھانا اور بتانا چاہئے کہ نہ ہی تسلیم کس طریقہ پر ہماری یونیورسٹی میں ہوگی اور اُس کے جانچنے کا کیا معیار رکھا جائیگا۔ اور چونکہ ان دونوں باتوں کو مسٹر مارلسن نے نہایت ایمان داری اور نیک نیتی سے بیان کیا ہے، میں بھی اُن ہی کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں اور نہ ہی تعلیم کو جس حیثیت سے کہ علماء کے کلم اہل سنت اور مذہب امامیہ کے تجویز کریں اُس کے جاری کرنے کی یونیورسٹی میں راے دیتا ہوں اور موجودہ تعلیم میں اصلاح اور انتخاب کتب کو بھی اُنہیں کی راے پر چھوڑنا مناسب سمجھتا ہوں اور تعلیم مذہبی کی جانچ کے لئے اس امر کی نہایت زور سے تائید کرتا ہوں کہ ہر ایک طالب علم کا دینیات میں مثل اور علوم کے امتحان لیا جاوے اور کسی طالب علم کو ڈگری کے امتحان میں شامل ہونے کی اجازت نہ دیا جائے جب تک کہ وہ دینیات کا امتحان پاس نہ کر لے۔



نائب ایسیج

یہ ایسیج نواب صاحب بہادر نے ۲۷۔ دسمبر ۱۸۹۹ء کو اجلاس سینڈہم چٹان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں پریزیڈنٹ صاحب کی افتتاحی تقریر سے پہلے فرمائی :-

حضرات !

مرزا صاحب کی انگریزی ایسیج نے شہر خوشان کی حالت پیدا کر دی۔ میں تو اُن کی ایسیج نہیں سمجھتا مگر قیاس یہ چاہتا ہے کہ انہوں نے حسب دستور ممبروں کا خیر مقدم کیا ہو گا لہذا اسی بنیاد پر میں اُن ممبروں کی جانب سے جو بوجہ قومی ہمدردی و جوش اسلام کے نہایت دور و راز مقامات سے یہاں آئے ہیں مسلمانانِ کلکتہ کی جہاں نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

یہ تقریک کانفرنس کی جو چند سال سے مسلمانوں میں شائع ہوئی ہے، مسلمانوں کی بیماری کی نہایت سفید دوا ہے۔ ہم میں بیماری ہے علوم مغربی سے بیخبر اور تہذیب تعلیم مغربی سے معرا ہوتا۔ مسلمانوں کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہمارے مناسب حل ہے کہ ایسے امور میں شریک ہوں جو ہمارے درد کی دوا نہیں ہیں یعنی پولیٹیکل۔ اسی واسطے اُس عالی دماغ شخص نے جو بڑا رفاہ مراد و خلاصہ تھا جس کی زندگی کا بڑا حصہ خیر خواہی مسلمانوں میں صرف ہوا۔ جو بلحاظ قومی مرض کی تشخیص کرنے کے حقیقت ایک ڈاکٹر تھا۔

اُس نے ہمارے مرض کی تشخیص کی، ہماری جہالت مغربی علوم و فنون سے بے پروائی، اب ہمارا یہ کام ہے کہ ہم دوا پیئیں یا نہ پیئیں۔ اُس ڈاکٹر سر سید احمد خاں رحوم کی تجویز کو وہ دوا سے نفع اٹھاویں یا نہ اٹھاویں۔ لیکن حضرات! کوئی شخص دوا خوشی سے نہیں پیتا، کیونکہ وہ شیریں نہیں ہوتی، بلکہ تلخ ہوتی ہے۔ جس کا عذریہ بیمار ہو، جو اپنے عزیز کی صحت چاہتا ہو، وہ باوجود اپنے بیمار عزیز کے برا کہنے اور ناراض ہونے کے جس طرح ممکن ہوتا ہے، دوا پلاتا ہے۔ اسی طرح وہ چند آدمی جنہوں نے اپنے نزدیک، خدا کی نزدیک مسلمانوں کی بہتری کے لئے جو تہذیب ناسب معلوم ہوئی، وہ اختیار کی۔ ہم نے مسلمانوں کے قومی مرض دور کرنے اور اُن کو نفع پہنچانے کا ارادہ کیا ہے لیکن ہم اپنی اکیلی رائے کو قومی مرض کے علاج کرنے میں کام میں نہیں آتے، لہذا یہ کانفرنس مقرر کی۔ کانفرنس جلسہ ہے قابل ڈاکٹروں کا۔ کانفرنس مجموعہ ہے شخص مرض، تجویز اور اُس کی مقدار پر غور کرنے کا۔ یہاں ہر ایک دوا اور اُس کی مقدار پر بحث ہوتی ہے اور بحث اس آزادی و جوش کے ساتھ ہوتی ہے، کہ گویا دو دشمن آپس میں لڑ رہے ہیں (اس کے بعد استقبال کمیٹی کا شکریتہ تعلق یہ استقبال و مہماں نوازی ادا کر کے کہا کہ ہم تو یہاں دوا پینے و پلانے کے آئے تھے لیکن مرزا صاحب نے دوا کو چونکہ خوشگوار بنا دیا، لہذا میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں (بعد ازاں بٹرس ٹرنٹ کی تعریف بہت دیر تک کی اور کہا کہ موجودہ گورنمنٹ نہ صرف بلحاظ فوجی قوت کے، بلکہ بلحاظ دانشگری و امن کے مفید ہے اس گورنمنٹ کے دار الحکومت میں کانفرنس کا ہونا نہایت مفید ہے۔ یہاں پر ہم کو بمقابلہ دیگر مقامات کے عجیب و غریب سہولتیں حاصل ہوتا ہے۔ کانفرنس کی جائے ولادت سے دہلی صرف کوس پر ہے وہاں سلاطین اسلام کی ہیبت طاقت اور اُن کے بعد اُن کی حالت زوال کا عجیب اثر ہمارے دل پر تھا۔ وہاں کے درد دیوار اپنے بنانے والوں کی یاد دلاتے تھے۔ ہر ایک عمارت نے ایک عجیب حالت ہم پر پیدا کر دی تھی۔ ہماری قوم کے یادشاہوں کی بنائی ہوئی مساجد جہاں پہلے لاکھوں آدمی نماز پڑھتے تھے اب اُن میں بعض بالکل دیران پڑی ہیں۔ بعض اس قدر شکستہ حالت میں ہیں کہ عنقریب صفحہ ہستی سے اُن کا نام و نشان تک مٹ جاوے گا۔ بعض میں دو چار مسلمان نماز بھی پڑھ لیتے ہیں۔ دہلی میں جہاں پہاڑ نامور علماء درس فہیتہ تھے، جہاں دور و دراز مالک سے طالب علم کتاب علوم کی غرض سے آتے تھے اب اُن کے درد دیوار ایک عجیب نظارہ ہیں۔ غرض کہ دہلی کی ایسی حالت ہے کہ اگر ہم اُس کو دیکھ کر اپنی قوم کی درستی حالت سے مایوس ہو جاتے، تو کچھ تعجب نہ تھا۔ لیکن ہم نے بجائے مایوس ہونے کے اسباب تنزل پر غور کیا، اور اُن چیزوں نے ہمارے دل اور عقل کی رہبری کی۔ اب ہم اس نئے دار السلطنت ملک میں آئے ہیں۔ پہلے دار السلطنت نے ہم پر نوحہ پیدا کی، لیکن دوسرے نے درست کرنے کی۔ ہم یہاں آکر جو عجائبات دیکھتے ہیں، اُس سے ہم پر یہ اثر ہوتا ہے، کہ پرانی داستان سنسنی اور عورتوں کی روناٹا ماحصل ہے۔ اس حکومت میں جس قدر اس آزادی شائستگی اور ترقی علم ہے یہ بات مسلمانوں کی

سلطنت میں کسی خاندان میں نہ تھی۔ موجودہ حکومت میں ہم کل فوائد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسی گورنمنٹ کے زیر سایہ ہونے سے ہم کو خدا کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ گویا ہماری سلطنت جاتی رہی، لیکن خدا نے ہم کو ایسی حکومت کے ماتحت کیا ہے جو نصف مزاج اور آزادی پسند ہے۔ اس زمانہ میں پارسی کس قدر ترقی کر رہے ہیں گوسلاطین عجم کی اولاد ہیں۔ ان کی سلطنت کو گئے ہوئے عرصہ ہو چکا، لیکن اب تک اپنی قومی ترقی میں سرگرم ہیں۔ مسٹر ٹاٹلہ نے خود اپنی فیاضی سے اپنی یونیورسٹی بنائی ہے۔ ہماری سلطنت کو گئے ہوئے ابھی چند دن ہوئے دلی میں مقبرے، مدارس، و مساجد، کھنڈر ہو گئے۔ لیکن بیٹی میں ہم پارسیوں کے اپنے شفا خانے، تیمم خانہ محتاج خانے، اور کالج دیکھتے ہیں۔ اگر اسلام کی محبت و عظمت میرے دل میں مانع نہ ہوتی، تو میں آرزو کرتا کہ کاش میں کسی پارسی کے گھر پیدا ہوتا۔ کیونکہ ایسی تقدیر تو نہیں تھی کہ یورپین کے گھر پیدا ہوتا، لیکن ہم کسی کسی پارسی کے گھر تو ضرور پیدا ہوتا۔ پارسیوں نے زمانہ کی ضرورت دیکھ کر ہر قسم کے کمالات حاصل کئے ہیں۔ اگرچہ ان کے پیشوا اور علماء بھی ہمارے یہاں کے مٹو یوں سے کم نہ تھے۔ ابتداءً انہوں نے بھی ہر قسم کی مخالفت کی، ان کے یہاں کے مراسم بھی نہایت سخت تھے۔ اب تک بھی ان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو برادری سے خارج کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ لیکن تسلیم یافتہ پارسیوں نے زمانہ کی ضرورت کے موافق مراسم قدیم کو چھوڑنا شروع کیا۔ آج تو شادی و غمی کی تقریبوں پر قومی کاموں میں مدد دیکھ جاتی ہے۔ بہر حال اور مسلمانوں کی طرح بیوہ مراسم میں خدا کی دولت ضائع نہیں کی جاتی، بلکہ وہ خدا کی دی ہوئی دولت کو قوم کی سبودی کے کاموں میں صرف کرتے ہیں جیسا کہ بیٹی میں رہا، میں تو یہی سنتا رہا، کہ فلاں پارسی مرا، اس کی بیوہ یا والدہ نے اس قدر روپیہ فلاں قومی کام کے واسطے وقف کیا۔ میں تو حیات دیکھتا تھا اور اپنی قوم کی بڑھتی پرفسوس کرتا تھا۔

ہمارے دوست جمشید جی پارسی اس وقت جلسہ میں موجود ہیں، انہوں نے اکیلے اپنی قوم کے واسطے کس قدر فیاضی کی۔ لیکن ایک ہماری قوم ہے کہ دس لاکھ روپیہ کو سیلمان ملکر دینا بھی ایک بڑی بات خیال کرتے ہیں اور اس قدر سرمایہ کا تمام ہندوستان کے مسلمان مل کر جمع کرنا بھی ناممکن خیال کرتے ہیں، چنانچہ دو برس کی کوشش میں ایک لاکھ روپیہ بھی وصول نہیں ہو سکا کوئی قوم سلطنت کے جانے سے نہیں ہٹتی۔ بلکہ علوم و فنون اور شائستگی کے نہ ہونے سے مٹ جاتی ہے۔



نمبر ۴۸

ا ب ج

یہ ا ب ج نواب صاحب بہادر نے ۲۷- دسمبر ۱۹۹۱ء کو لندن یونیورسٹی کے انفرنس منعقدہ کلکتہ میں رزلوشن نمبر ۳ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی۔ رزلوشن یہ ہے:-

رزلوشن نمبر ۳

اس کانفرنس کی سلسلے میں جو تعلیم بنگال کے مدارس میں دی جاتی ہے وہ مسلمان نوجوانوں کی صحیح تربیت کے لئے کارآمد و مفید نہیں اور بنا برائیں اس کانفرنس کی رائے میں ان مدارس کے نصاب تعلیم میں ضروری تغیر و تبدل کرنے کے لئے گورنمنٹ سے درخواست کی جاوے۔

مسٹر پریسڈنٹ و حضرات !

میں رزلوشن نمبر ۳ کی تائید اسی شکل میں جیسا کہ وہ پیش کیا گیا ہے کرتا ہوں اور کسی ترمیم یا تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مجھے اسی قسم کے مدرسوں کے جو ہندوستان کے دیگر مقامات میں ہیں۔ مشاہدے اور تجربے سے ثابت ہو گیا ہے کہ ان کا نصاب تعلیم ایسا ناقافی اور ناقص ہے کہ اس کو بالکل ہلٹ دینا نہایت ضروری ہے۔ بلاشبہ ہم عوام الناس میں دین دین پکار کر ایک باطل جوش پیدا کر سکتے ہیں اور ضروری اور اہم تبدیلیوں کی مخالفت میں ان کو آمادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنا قوم کے نہایت ضروری فوائد اور مقاصد کے برخلاف ہے مجھے یقین ہے اور جس قدر میں اس پر زیادہ غور کرتا ہوں اسی قدر یقین واقع ہوتا جاتا ہے کہ صرف مسلمانوں کے مدارس ہی کی بلکہ تمام قوم کی حالت من حیث المجموع اصلاح کی محتاج ہے۔

نمبر ۴۹

ایسیج

یہ ایسیج نواب صاحب بہادر نے ۲۸۔ دسمبر ۱۸۹۹ء کو عثمانیہ کی کوشش کا ٹکڑا منقطعہ کلکتہ میں
رزولوشن نمبر ۱۳ کی تحریک کرتے ہوئے فرمائی۔ رزلوشن یہ ہے :-

رزولوشن نمبر ۱۳

اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ صوبجات ہمالک مغربی و شمالی و اودھ کی عام تعلیم اور ویسی اظہر بھر کی بہتری
کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان صوبجات کی عدالتوں میں اردو زبان فارسی زبان، رسم الخط
ہی میں برابر لکھی جاوے اور یہ عدالتوں میں اردو زبان کے یکساں کوئی دوسری زبان
جاری نہ ہونی چاہئے *

جناب پریسیڈنٹ و حاضرین !

تیس برس کا عرصہ ہوا کہ ہمارے ہ وطن ہندو بھائیوں نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ ضلع
شمال مغرب و اودھ کے سرکاری دفاتر میں بجائے فارسی حروف کے ناگری حروف جاری کئے جائیں
اور اردو موقوف ہو کہ ہندی زبان کو رواج دیا جائے۔ اس وقت صوبہ کے حاکموں نے اس خواہش
پر کچھ توجہ نہ فرمائی تھی اور ان کی درخواست منظور نہ ہوئی تھی۔ اب پھر انہوں نے پرانے خیال کو تازہ
کیا ہے اور گورنمنٹ ہمالک مغربی و شمالی کے حضور میں ایک ایڈریس پیش کیا ہے۔ اور انہوں نے
انہیں دلائل سے جو بہار اور ہمالک متوسط میں اس تبدیلی کے موید ہوئے، ضلع شمال مغرب و اودھ
میں تبدیلی زبان و تبدیلی حروف کو قابل تعمیل اور واجب التسلیم قرار دیا ہے۔ اور یہ مسلمان ہمالک مغربی
و شمالی و اودھ میں زیر غور ہے۔ اور بدقت ہے کہ ہم مسلمانوں کی طرف سے بھی اس عظیم تبدیلی کے
روکنے کی کوشش کی جائے، جس تبدیلی سے مسلمانوں کی حالت پر بہت بڑا اور بہت بُرا اثر پڑے گا۔
اور گو ہم لوگوں کو یقین ہے کہ گورنمنٹ اس ملک میں جو اردو کا منفع اور مرکز ہے ایسی تبدیلی کو خلاف
مصلحت سمجھے گی۔ مگر پھر بھی ہم کو اپنی طرف سے اس کے انسداد کی تدبیر کرنی اور اپنی آواز گورنمنٹ
کے کانوں تک پہنچانی ضرور ہے *

اس سلسلہ پر سترہ ایم میں بہت بڑی بحث ہوئی تھی اور اس زمانہ میں عموماً تمام ہمالک مغربی و شمالی
و اودھ کے معزز مسلمانوں نے ہر برپتی مرحوم سر سید احمد خاں کے اپنے ان نقصانات پر جو تبدیلی

سے ہونے والے ہیں بہت غور کیا تھا۔ افسوس ہے کہ ہم مسلمانوں کی اپنے قومی معاملات سے اس درجے بے خبری اور غفلت ہے کہ کوئی مصیبت جو قوم پر پیش آنے والی ہو، اُس کا خیال نہیں کرتے، اور بحر گھروں میں بیٹھ کر بے وسے کرنے کے دانشمندانہ تدابیر نہیں کرتے۔ اور جب تک کوئی رہنمائی نہ کرے، اور اُن کو خواب غفلت سے نہ جگا دے، وہ نہیں جاگتے۔ نہ کوئی علمی تدبیر اختیار کرتے ہیں اس لئے یس نے اس ضروری معاملہ پر آپ کو متوجہ کیا ہے۔ اور چونکہ صوبہ بہار میں اس تبدیلی کا نفع نقصان آپ کو معلوم ہو چکا ہے، اس لئے مجھے امید ہے کہ اس صوبہ کے مسلمانوں کی رائے اس معاملے میں نہ صرف خیالی ہوگی۔ بلکہ تجربہ اور نتیجہ پر مبنی ہوگی۔

ناگری حروف کے جاری ہونے سے مسلمان بہت نقصان اٹھائینگے۔ اُن کو عربی اور فارسی پڑھنا ضروری ہے، اور اردو اُن کی مادری زبان ہے، اور اس میں لکھنا پڑھنا اُن پر لازم ہے، اس لئے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو عربی اور فارسی اور اردو تین زبانیں پڑھنی ضرور ہیں، اور ہندوؤں کو صرف ایک ہی زبان یعنی اردو سیکھنی ہوتی ہے اور اس لئے اُن کو انگریزی سیکھنے کے لئے بہت وقت ملتا ہے اور بہت مسلمانوں کے وہ اُسے بہت جلد اور اچھی طرح سیکھ لیتے ہیں اور اسی سبب سے سرکاری ملازمت وہ تہایت آسانی سے حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جن دفتروں میں صرف انگریزی جانا کافی ہے وہ صرف انگریزی سیکھ لیتے ہیں اور اردو سیکھنے کی بھی اُن کو تکلیف گوارا نہیں کرنی پڑتی۔ بخلاف مسلمانوں کے خصوصاً جو اعلیٰ درجہ کے ہیں اُن کو چار نہیں ہے کہ عربی فارسی اور اردو بھی پڑھیں۔ تبدیلی خط سے مسلمانوں پر ناگری حروف کا سیکھنا بھی لازم آئیگا اور چونکہ اُس خط کے رواج سے سنسکرت کے الفاظ کا رواج بھی لازمی ہے اس لئے اُن کو نہ صرف نئے حروف سیکھنے ہونگے بلکہ ایک نئی زبان کا سیکھنا بھی لازم ہوگا۔ اور اس سے جو کچھ وقت اور دشواری پیدا ہوگی اُس کا انداز نہیں ہو سکتا۔ اور اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکریاں ملنا مشکل ہو جائیگی اور اس نئی زبان اور نئے حروف کے نہ سیکھنے سے اُن کی معاش کا دائرہ بہت تنگ ہو جائیگا۔

اس تبدیلی سے مسلمانوں کا نقصان تو ظاہر ہے لیکن موجودہ حالت کے بحال رکھنے میں ہمارے ہموطن ہندو بھائیوں کا کچھ نقصان نہیں ہے کیونکہ جو حالت اُن کی اب ہے وہی قائم رہیگی، اور اردو زبان کو جس طرح وہ اب سیکھتے ہیں اور جو گویا اُن کی بھی زبان ہو گئی ہے اور اسی خط سے وہ مانوس ہیں اُس میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

سرکاری دفتروں میں زبان اور خط کا بدلنا کوئی خفیف بات نہیں ہے اس کا بہت بڑا اثر تو ہوں بڑھتا ہے۔ یہی اور ہمارے اس کی کیفیت دیکھو کہ صرف تبدیلی خط اور تبدیلی زبان کی وجہ سے حوالے کے

مسلمانوں پر کچھ اثر پڑا۔ سرکاری دفاتروں میں خصوصاً عملوں میں کہیں اُن کا نشان نہیں ملتا۔ امیروں اور سوداگروں میں کوئی نوکری وہ نہیں پاسکتے، اور جو تباہی اور بربادی اُن کی ہوئی وہ مخلص بیان نہیں ہے یکساں جاسکتا ہے کہ یہ انہیں کا قصور ہے کہ کیوں انہوں نے وہ خط نہ سیکھا، اور اُس زبان میں مارت حاصل نہ کی، جو سرکار نے اُن صوبوں میں جاری کی تھی، مگر اُس کے ساتھ اُن مشکلات پر بھی نظر کرنی چاہئے جو مسلمانوں سے مخصوص ہیں۔ اور جس کی وجہ سے وہ نئے حروف کے سیکھنے سے معذور رہے ہیں۔ لیکن بیٹی اور مدراس کی حالت دوسری تھی وہاں ملکی زبان عموماً اردو نہ تھی نہ عموماً فارسی حروف کا رواج تھا، غلبہ اور کثرت اُن لوگوں کی تھی جو ملکی زبان جانتے تھے اور صرف سرکاری ملازمت کی ضرورت سے اردو سیکھتے تھے۔ مگر ممالک مغربی و شمالی اور اودھ کی یہ کیفیت نہیں ہے۔

دقیقت اس صوبہ کی زبان عام اردو ہے اور اس صوبہ کے ہندو فارسی حروف میں لکھتے پڑھنے کے ویسے ہی عادی ہیں، جیسے کہ خود مسلمان اس لئے یہاں کی ملکی زبان اردو ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہندی کوئی دوسری زبان ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ ۱۳۷۷ء میں مرحوم سر سید احمد خاں نے اپنی ایک تحریر میں اس بات کو بصراحت بتایا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ ہر کہیں ایک ہی یعنی اردو زبان بولتے ہیں۔ میرٹھ اور روہیلکھنڈ کے اکثر اضلاع میں ناخواندہ لوگ بھی ایک قسم کی اردو بولتے ہیں۔ آگرہ اور الہ آباد کے مغربی حصہ کی بول چال بچ بھاکا ہے۔ بنارس اور الہ آباد کے مشرقی حصہ میں پورب کی بولی بولی جاتی ہے اور بنڈیکھنڈ میں ایک تیسری قسم کی بول چال رائج ہے، مگر ان تینوں قسم کی بول چال میں گو وہ بالکل الگ الگ ہیں بہت سے الفاظ عام ہیں اور وہی الفاظ اردو کی بنیاد ہیں اور ہندی لفظوں کے نام سے مشہور ہیں۔

میں اس موقع پر اُن تمام دلائل اور وجوہات کو بیان کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں، جو سرکاری دفاتر میں اردو زبان اور فارسی خط کے قائم رکھنے کے متعلق ہیں۔ میں نے یہ رزولوشن اس لئے پیش کیا ہے کہ صوبہ بنگال اور بہار کے مسلمانوں کی رائے دریافت ہو کہ اُن کو صوبہ ہار میں تہذیبی زبان کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اور اس عرصہ میں وہ اس تبدیلی کا نفع و ضرر دیکھ چکے ہیں، اُن کی رائے کیا ہے، اور وہ اس رزولوشن کو تحقیقت ضروری سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اور میں اُمید کرتا ہوں کہ اس صوبہ کے مسلمان اس کی نسبت اپنی صاف اور اعلیٰ رائے ظاہر کریں گے۔

نمبر ۵ ایسیج

یہ ایسیج نواب صاحب بہادر نے ۲۸- دسمبر ۱۹۹۹ء کو تمام کلکتہ میں رزولوشن نمبر ۳ پیش کرنے ہوئے کی۔ رزولوشن حسب ذیل ہے:-

رزولوشن نمبر ۲۰

اس کونفرنس کی یہ رائے ہے کہ ہر ضلع میں لوکل سٹینڈنگ کمیٹیاں قائم کی جاویں اور ان سے درخواست کی جائے کہ اپنے ضلع سے دس روپیہ ماہواری کا چندہ ایک مسلمان طالب علم کی اسکالرشپ کے لئے جو کسی کالج کی کالج کلاسوں میں پڑھتا ہو یا پڑھنا چاہے اور ذہین اور لائق اور قابل امداد معلوم ہو، وصول کریں اور جس کالج میں وہ پڑھتا ہے یا پڑھے، لوکل سٹینڈنگ کمیٹی اس بات پر غور کرتی رہے کہ وہ محنت اور کامیابی سے اپنی تعلیم میں مصروف ہے یا نہیں +

حضرات !

میں نے اس تجویز کے متعلق اپنی رپورٹ میں جو اجلاس کے پہلے دن سُنائی کسی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ اس رزولوشن کو تمام حاضرین بلکہ تمام مسلمان پسند کریں گے اس لئے مجھے اس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی اب ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہوں گو خیال لوگوں کا غلط ہے کہ یہ وظیفہ صرف علی گڑھ کالج کے طالب علموں کو دیا جائے۔ بلکہ خود مرحوم سر سید احمد خاں بہادر نے اور نیز میں نے مختلف مواقع پر اس کو ظاہر کر دیا ہے کہ کسی کالج کے لئے ان وظائف کی تخصیص نہیں ہے۔ چنانچہ خود میں نے دو وظیفے پچھلے سال دئے تھے ایک علی گڑھ کالج کو دیا۔ دوسرا حمایت الاسلام لاہور۔ پچھلے سال ۳۷ وظیفوں کا وعدہ (ماغٹ ۱۲) سالانہ کے حساب سے کیا گیا۔ اور مجھے امید ہے کہ اس سال مسلمانان بنگال عموماً اور بزرگان کلکتہ خصوصاً اس ضروری کام میں فیاضی ظاہر فرمائیں گے اور غریب مسلمانوں کے لئے وظائف جمع کرنے میں کوشش کریں گے +

غبار ایچ

یہ ایچ جناب محسن الملک بہادر نے ۳۱۔ دسمبر ۱۸۹۹ء کو جٹان ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ

کلکتہ میں پریزیڈنٹ صاحب کی آخری تقریر کے بعد فرمائی :-

جناب صدر انجمن !

جس مہربانی اور عنایت سے آپ نے ہماری اس انجمن کی صدر انجمنی قبول فرمائی۔ اُس کا شکریہ ہم ادا نہیں کر سکتے۔ جب یہ خبر معلوم ہوئی کہ کانفرنس اس سال کلکتہ میں ہوگی سب نے یہی خیال کیا کہ اگر آپ نے اس کی صدر انجمنی قبول فرمائی تو اُس کو کامیابی ہوگی۔ مجھے شروع میں خیال ہوا تھا کہ آپ بوجہ کثرت کار اس صدر انجمنی کو قبول فرما سکتے ہیں یا نہیں؟ اور آپ کو ایک عربینہ ولایت بھیجا اور ہمیشہ جواب کا منتظر رہتا تھا۔ جب لغاتہ آیا تو کھو لینے میں دل دھڑکتا تھا، کہ ایسا نہ ہوا آپ انکار نکھیں مگر اُسے پڑھ کر مجھے نہایت خوشی ہوئی، اور اُسی وقت اپنے اکثر دوستوں کو یہ لکھا کہ نہ صرف اس خیال سے کہ وہ قوم کا سید ہے یا اعلیٰ عمدہ دار ہے یا عالم ہے، بلکہ خیال اُس جوش کے جو آپ کو قومی ہمدردی کا سچا آپ اور آپ کی تصنیفات نے تمام چھوٹی باتوں اور اُن اعتراضات کو جو چھ سو برس سے اسلام پر لگا جاتے تھے بالکل مٹا دیا۔ آپ ہمیشہ ہماری امداد کرتے ہیں۔ مجھے مدت سے آپ سے نیاز حاصل ہے۔ اور آپ کی ان باتوں سے میرا دل منسلک ہے۔ آپ کی عزت کرتا ہوں، مجھے آپ کی اسپیچوں سے نہایت اثر ہوا۔ ڈاکٹر کا یہ کام ہے کہ مریض کے مرض کو دیکھے اور بتلائے۔ مریض کا کام ہے کہ ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل کرے اور جو دوا اُس نے بتلائی ہو اُس کو پئے اور نفع اٹھائے۔ اگر بعض مضامین ایسے پیش ہوئے کہ بعض طبیعتوں کو پسند نہ آئے ہونگے۔ مگر جب وہ اُن کے نتیجہ کو دیکھیں گے تو سمجھیں گے، تعلیم نسواں کے متعلق جو ضرورت آپ نے ثابت کی اور جو نظائر آپ نے دیں غالباً اُن کو سن کر کوئی مسلمان اعتراض نہ کرے گا۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ عورتوں کی تعلیم ہمیشہ جاری رہے گی۔ کیا وہ گھر درست رہ سکتا ہے جس کی بی بی پڑھی لکھی نہ ہوگی۔ جب کہ جڑ درست نہ ہوگی تو ہرگز کامیابی کی شکل نہیں آپ کے قلم اور دماغ اور دل کی قوت قائم رہنے کی سب کو دعا کرنی چاہئے +

ایسیج

یہ ایسیج نواب محسن الملک بہادر نے ۱۸۔ اگست ۱۹۱۸ء کو سنٹرل اردو ڈیفنس کمیٹی میں پیش
کئے گئے اجلاس اول میں بحیثیت پریزیڈنٹ ہونے کے رزولوشن نمبر اول کی تحریک کرتے ہوئے
فرمائی۔ اور رزولوشن یہ ہے :-

رزولوشن نمبر اول

اس مجمع کی یہ ہرگز طے نہیں ہے کہ سرانٹونی کڈائل صاحب بہادر نے رزولوشن مورخہ ۱۸۔ اپریل
در بارہ نفاذ ناگری عہدہ کسی فریق کی طرف اری یا کسی نامتصفیہ کارروائی سے دانتہ اہل سلام کو
ضرر پہنچانے کی نیت سے پاس کیا ہے بلکہ صحابہ مدد و ح کے بیان سے ظاہر ہوگا۔ اُن کی رزولوشن
صرف کثرت االیان ممالک مغربی و شمالی و ادوہ کے فائدہ کی غرض پر مبنی ہے گو یہ جلسہ ہرگز کی را
سے متفق نہیں ہو سکتا *

برادران سن !

جو رزولوشن ابھی پاس ہوا ہے اُس کی تحریک کرتے وقت میں نے اُس عزت حاصل ہونے
پر جو اس معزز اور متمم باشند اور ریپرینٹیلیو جلسے کے صدر انجمن منتخب ہونے سے مجھے حاصل ہوئی
ہے، آپ کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا ہے۔ مگر میں بلا تصنع ظاہر کرتا ہوں کہ میں اس بڑی ذمہ داری
کے کام پر مقرر کئے جانے کے لائق نہ تھا۔ اس لئے کہ بہت سے ایسے بزرگ یہاں موجود ہیں جو بظاہر
قابلیت اور لیاقت مجھ سے زیادہ اس عہدے کے لئے موزوں ہیں انہیں نہیں ہرگز نہیں آباد جو
اس کے میں نے جو آپ کے حکم کی تعمیل کی اُس کا صرف یہ سبب ہے کہ میں اُس جماعت میں سے ہوں
جو علی گڑھ پارٹی کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے اور جس کی نسبت نہایت افسوسناک باتیں منسوب
کی جاتی ہیں۔ بحیثیت صدر انجمن کے مجھے موقع اُن خیالات اور غلط فہمیوں کی تردید کا ملے گا *

علاوہ بریں اس معاملے کی نسبت جس پر بحث کرنے کے لئے ہم جمع ہوئے ہیں اتنا کچھ کہنا گیا
اور اتنا کچھ لکھا گیا ہے اور ایسے حالات پیش آئے ہیں کہ جن کے لحاظ سے ضرور ہے کہ واقعات
اصلی بیان کئے جائیں اور غلط فہمیاں دور کی جائیں اور ہمارے اصلی خیالات اور ہماری کارروائی کے
اصلی حالات پبلک کو معلوم ہو جائیں۔ اگر مجھے شہر سے اس معاملہ سے تعلق نہ ہوتا اور مجھے اس کے

تمام حالات سے واقفیت نہ ہوتی، اور میں اپنے آپ کو اُن غلط فہمیوں کے دور کرنے کے قابل نہ پاتا۔ تو بحال ادب اس عہدے کے قبول کرنے سے عذر کرتا۔

حضرات! ہماری کارروائی کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے اور جو اعتراض مختلف پیرایوں میں ہم پر کئے گئے ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم اُس پالیسی سے منحرف ہو رہے ہیں جس کو نہایت سوچ سمجھ کر اور جسے مضبوطی کے ساتھ ہم نے اختیار کیا تھا اور جس پر مدت دراز سے ہم عمل کر رہے تھے۔

یہ اعتراض بالکل غلط ہے اور غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت ہم نے اُس پالیسی کو جس کے بانی سر سید احمد خاں مرحوم تھے، اور جس کے فوائد اُنہوں نے ہم پر ثابت کر دیئے تھے، کہ ہم پولیٹیکل ایجیٹیشن کے تلاطم میں نہ پھنسیں، نہیں چھوڑا۔ اور نہ ہم نے اُن لوگوں کی پالیسی اختیار کی ہے جو گورنمنٹ کے ہر فعل پر نکتہ چینی کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ہم نے کبھی نہیں کہا کہ اپنی حاجتوں کا گورنمنٹ کے رد و رد و عرض کرنا، اور اپنی خاص شکایات کا پیش کرنا، اُس پالیسی کے متناقض ہے، کیونکہ اس سے گریز نہیں ہے کہ اُن مسائل کو جن کا اثر ہماری قوم پر پڑتا ہے انجمنوں کے ذریعہ سے گورنمنٹ کے سامنے پیش کریں، اور اُس کے متعلق اپنی رائے، اور اپنی خواہش، ظاہر کریں۔ خاص خاص مواقع پر ایسا کرنا، اُس پالیسی کے خلاف نہیں ہے، جو ہمارے مرحوم لیڈر نے قائم کی تھی، اور جس کو ہم اپنی قوم کے لئے سب سے بہتر اور مفید سمجھتے ہیں۔ موجودہ معاملہ میں ہماری کارروائی، ہماری اس پالیسی کے برخلاف نہیں ہے، اور نہ یہ اُس پولیٹیکل ایجیٹیشن میں داخل ہے، جس سے ہم محترز ہیں۔ اس لئے کہ یہ خاص معاملہ سے متعلق ہے، اور خاص حالت کا متفقہ ہے اور ایک خاص تکلیف کا موقعا نہ اظہار ہے، جو ہمارے نزدیک گورنمنٹ رزلویشن مورخہ ۱۸-اپریل ۱۹۴۷ء سے ہماری زبان کے متعلق پیدا ہوئی ہے۔ ہماری اس کارروائی کو عام پولیٹیکل ایجیٹیشن کے بجائے اُس کارروائی میں شامل سمجھنا چاہئے، جو خاص خاص موقع پر خاص خاص فرقہ کے لوگ کسی خاص قاعدہ یا خاص قانون کے متعلق کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب پراونشل یا سپریم کونسل میں کوئی ایسا قانون پیش ہوتا ہے، جس سے کہ قوم کے کسی گروہ کی حالت پر اثر پڑتا ہے۔ تو عام دستور ہے کہ اُس مسئلہ کے متعلق گورنمنٹ کی خدمت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے اور جس ضرورت نقصان کے پہنچنے کا اُس سے اندیشہ ہو، وہ صاف صاف بیان کیا جاتا ہے مگر اس قسم کی شکایت کرتی یا اس طرح پر اپنی حالت اور درد کا ظاہر کرنا، پولیٹیکل ایجیٹیشن نہیں سمجھا جاتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہماری کارروائی جو ایک مسئلہ پر محدود ہے پولیٹیکل ایجیٹیشن سمجھی جائے۔

بظاہر اس تحریک کو پولیٹیکل ایجیٹیشن سے منسوب کرنے اور اُن کارروائیوں سے جو خاص

مسائل کے متعلق اسی طرح پرکی جاتی ہیں، جدا سمجھنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس تحریک کو بہت زیادہ وسعت ہو گئی ہے اور اس صوبہ کے تمام مسلمانوں میں اس کا چرچا ہو رہا ہے۔ اور ہر مقام پر مسلمان اس کے متعلق کارروائی کر رہے ہیں، اس لئے بہت سے لوگ اس بات کو سمجھ نہیں سکتے کہ یہ بھی بالکل اسی قسم کی تحریک ہے، جو قانونی یا انتظامی معاملات میں عموماً کی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بجائے ایک خاص فریق یا ایک گروہ کے ہماری ساری قوم اس میں شامل ہے اور بجائے کسی خاص مقام کے ملک کے ہر گوشہ سے اس کے متعلق افسوس اور رنج کی صدا آرہی ہے۔

صاحبو! جو لوگ ہماری اس تحریک کو اُس پالیسی کے خلاف سمجھتے ہیں، جو مرحوم سرسید نے اختیار کی تھی، وہ یاد دھوکا کھاتے ہیں یا اُن کی کارروائی سے ناواقف ہیں۔ میں اُن کو بتانا چاہتا ہوں، اور صاف صاف کہتا ہوں کہ ہم نے اس معاملہ میں اپنی زبان کے محفوظ رکھنے کے لئے وہی طریقہ اختیار کئے ہیں جو خود مرحوم سرسید نے اس معاملہ کے متعلق ۱۸۵۷ء میں اختیار کئے تھے، اور ہم لوگ اُس دائرہ سے جو انہوں نے چھینچا تھا ذرا بھی یا نہیں ہوئے ہیں آپ کے روبرو ایک چھپا ہوا پیفلٹ جو سرسید کے کاغذات سے ابھی مجھے ملا ہے پیش کرتا ہوں، اُس کے دیکھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اُس زمانہ میں حاکم مغربی دشمنی کے ہمارے معزز بھائی ہندوؤں نے سرکاری دفاتر اور اسکولوں میں دیوناگری حذف جاری کرنے کے لئے گورنمنٹ سے درخواست کرنے کا ارادہ کیا تھا، اور ایک عرضی ناگری جاری کرنے کی درخواست میں اپنی قوم میں دستخط ہونے کے لئے پھرائی تھی۔ جس وقت مرحوم سرسید کو اُن کے ارادہ سے اطلاع ہوئی، انہوں نے 4- دسمبر ۱۸۵۷ء کو الہ آباد میں ایک بڑا جلسہ کیا اور ایک نٹل کمیٹی قائم کی، جس کے وہ خود سیکریٹری ہوئے، اور اُس جلسہ کی یہ غرض قرار دی کہ وہ اردو زبان کے قائم رہنے کی حفاظت اور ناگری کے جاری ہونے کی تدبیر کرے اس کام کے لئے ہر ضلع میں کمیٹیاں قائم کی گئیں اور سنٹرل کمیٹی الہ آباد کی شاخیں قرار دی گئیں۔ اور خود مرحوم سرسید نے ایک نہایت پرزور مدلل سرکل جاری کیا جس میں انہوں نے اُن اعتراضات کو صاف صاف ظاہر کیا، جو دیوناگری جاری کرنے کے متعلق تھے، اور اُن نقصانات کی تشریح کی جو اُس کے جاری ہونے سے مسلمانوں کو پہنچنے والے تھے۔ یہ سرکل اُسی زمانہ کا چھپا ہوا اردو اور انگریزی میں اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اور میں اُسے مینچر رکھتا ہوں اور آپ لوگوں کو اُس کے دیکھنے کا موقع دیتا ہوں، اور اُس سے میری غرض یہ ہے کہ اس معاملہ کو کسی نقشب یا جہالت یا قومی جذبہ کی وجہ سے صرف ہم لوگوں نے اہم اور متم بالشان نہیں سمجھا بلکہ مرحوم سرسید نے جن کی دانشمندی اور پالیسی پر گورنمنٹ کو بھی اطمینان تھا وہ بھی اس کو نہایت اہم اور ضروری

سمجھتے تھے۔ پس جب کہ سرسید مرحوم نے صرف اس خیال سے کہ ہمارے ہندو بھائی گورنٹ میں دیوناگری حروف جاری کرنے کے لئے درخواست کرنے والے ہیں، مسلمانوں کی کمیٹی قائم کرنا مناسب سمجھا، تو ایسی حالت میں کہ لوکل گورنٹ نے بغیر دریافت کرنے ہمارے خیالات کے ایسا ایک حکم جاری کر دیا، جس سے ہماری مادری زبان کو ضرر عظیم پہنچنے کا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا اپنی زبان کی حفاظت کے لئے متفقہ تدابیر کرنا اور ان نقصانات سے جو ہماری قوم کو اس سے پہنچنے والے ہیں، آگاہ کرنا، کس قدر زیادہ ضروری تھا۔ اگر ہم ایسے وقت میں ایسا نہ کرتے، تو درحقیقت اس فرض کفایہ کے ترک کرنے کے گنہگار ہوتے، جو قوم کا ہم پر ہے +

حضرات! ایسی حالت میں جب کہ ہم گورنٹ کے رزلویشن کے متعلق بحث اور نکتہ چینی کر رہے ہیں، ہم پر لازم ہے کہ ہم ضرور کے ساتھ اس بات کی تردید کریں کہ گورنٹ نے کسی فریق کی طرف داری کے لئے، یا بیجا ارادہ سے اس حکم کو جاری کیا ہے۔ اور میں جب اس کی تردید کرتا ہوں، تو نہ صرف اپنے ذاتی خیالات بلکہ عام مسلمانوں کے اہل خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ بعض ناواقف مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ یہ احکام اس غرض سے نافذ کئے گئے ہیں کہ اس سے ایک قوم کو دوسری قوم کے مقابلہ میں نفع پہنچایا جائے، اور بعض نے ایسی تحریریں بھی شائع کی ہیں، جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حصول لغٹ گورنٹ ہمارے لئے اس میں اہل ہندو کی طرف داری کی ہے۔ مجھے ویسا ہی یقین ہے جیسا کہ آپ سب صاحبوں کو کہ یہ خیال ہمارے خیالات سے مطابقت نہیں ہے، بلکہ صرف ناواقفیت سے یا جذبہ کی حالت میں بعض کو ناظر لوگوں نے صرف اپنا ذاتی خیال ظاہر کیا ہے۔ اور ان کو خود اپنی غلطی اور ایسے خیالات کے نامناسب طور پر ظاہر کرنے پر اس وقت افسوس ہوگا، جب کہ مباحثے کی آگ فرد ہو جائیگی اور ان کا بیجا جوش سرد ہو جائیگا۔ میں اس بات کو خوب جانتا ہوں، اور اس کے ظاہر کرنے سے بہت خوش ہوں کہ ایسے غلط خیال کرنے والے مسلمان بہت ہی کم ہیں۔ سمجھدار مسلمانوں میں سے غالباً ایک بھی ایسا نہ ہوگا، جس کو یہ خیال ہو کہ اس حکم کے جاری کرنے میں ہزار کو ایک کو ضرر پہنچانا، اور دوسرے کی طرف داری منظور تھی۔ بلکہ ہم سب کو بورا یقین ہے کہ اس حکم کے جاری کرنے سے ہزار کی غرض صرف یہ تھی کہ باشندوں کے ایک گروہ کو سہولیت اور آسانی ہو۔ اور میرا یقین شروع ہی سے تھا اور اہل ہی سے میری یہ رائے تھی، جیسا کہ آپ لوگوں کو اس اسپیکر کے پڑھنے سے جو میں نے علیگڑھ کے جلسہ میں سنی تھی معلوم ہو جائیگا اور جس کے چند فقرے میں آپ کی اجازت سے آپ کو سناتا ہوں ہزار سرٹونی میکڈانل لغٹ گورنٹ ملک مغربی و شمالی نے جو اس رزلویشن کو جاری کیا ہے اس سے بجز اس کے جو اس

دزد لیوشن کی تمہید میں بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ ناگری حروف میں عرائض اور ہتھانوں کے لکھنے سے اُس بڑے حصہ آبادی کو اور سہولیت ہوگی، جو ہندی سے واقف ہے۔ کوئی دوسرا خیال نہ آتا کہ اس حکم کے جاری کرتے وقت نہ تھا، اس لئے جو اعتراض اور نکتہ چینی آپ اُس پر کریں اُس میں گورنمنٹ کی نیک نیتی اور نفعانہ خیال کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں اور گورنمنٹ کو کسی فریق کی محبت یا ایک کے حقوق کو دوسرے کے حقوق پر ترجیح دینے کے خیال سے پاک اور آزاد سمجھیں۔

حضرات! جو رائے کہ میری اس وقت تھی وہی اب بھی ہے اور میں خوش ہوں کہ جہاں تک مجھے اپنی قوم کے سربراہوں اور لیڈروں اور معزز اور مقتدر رئیسوں سے ملنے کا اتفاق ہوا سب کو میں نے اپنے متفق الرائے پایا، ماسوائے اُن محدود و بے چند اشخاص کے جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے اس سلسلہ پر کافی غور نہیں کیا، اور اس کے وجوہات اور نتائج کو پورے طور پر نہیں سمجھا۔ یہ اختلاف اُن کو نہ اندیشوں کی طرف سے ہے جو یہ نہیں سمجھے کہ جہاں کہیں سلطنت برطانیہ کا پرچم لہراتا ہے، وہاں بے تعصبی اور انصاف کے سوا دوسری ہوا نہیں چلتی۔ اور یہ کہ ہر آرزو سرانٹونی میکڈانل کی شان اس سے ارفع و اعلا ہے کہ اُن کی نسبت طرف داری اور نا انصافی کا خیال کیا جاوے۔ اور میں جیسا کہ علی گڑھ والی اسپیسچ میں کہ چکا ہوں، پھر کہتا ہوں کہ ”ہم تمام مسلمانوں کو اس بات کا یقین ہے کہ حکومت برطانیہ سے بڑھ کر کوئی ایسی حکومت نہیں ہے جو اپنی رعایا کی بہبودی اور فلاح اور ترقی کے خواہاں ہو۔ اور جسے سوائے رعایا کی بھلائی کے کوئی دوسری بات پیش نظر ہو۔“

ٹوئیس کے تجربہ نے ہم کو گورنمنٹ کے انصاف اور بے طرفانہ کارروائی پر یقین دلایا ہے۔ اور ہم صدق دل سے اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ کسی کارروائی میں گورنمنٹ کو نہ خود غرضی کا خیال ہوتا ہے نہ کسی خاص فریق کی حمایت اور طرف داری منظور ہوتی ہے مگر چونکہ وہ حکمران ہے ایک ایسے ملک پر جس میں مختلف اقوام، مختلف مذاہب، مختلف فرقے آباد، اور جن کی خواہشیں اور تمنائیں مختلف ہیں۔ اس لئے یہ بات قوت بشری سے خارج ہے کہ گورنمنٹ کے احکام سب ایسے ہوں جن سے کسی خاص فرقہ کو اپنے خیالات اور اپنے حالات کے لحاظ سے شکایت پیدا نہ ہو۔ اور سب مختلف فرقے اُن احکام کو اپنی خواہشوں کے مطابق پائیں۔

یہ رزلوشن بھی جو گورنمنٹ نے جاری کیا ہے ایسا ہی ہے کہ مسلمانوں کو اس کی شکایت اور ہم اُس میں اپنا نقصان دیکھتے ہیں اور ہم اُس پر اعتراض کرنے کو آمادہ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہر مسلمان تعلیم میں دوسری قوموں سے کم ہیں، مگر اور باتوں میں جن سے گورنمنٹ وقت پر ہم سے کام

لے سکتی ہے کم نہیں ہیں *

گو ہمارے ہاتھ میں قلم نہیں، اور ہمارے قلم میں زور نہیں، اور اسی وجہ سے ہم دفتر و
میں کم نظر آتے ہیں، مگر ہمارے ہاتھ میں تلوار پکڑنے کی قوت ابھی باقی ہے (چیز) اور ہمارے
دلوں میں ملکہ مضطر کی محبت ہے (چیز) اور اُن کی گورنمنٹ کی ریکٹوں پر ہم کو یقین ہے، اور
اسی گورنمنٹ کی بدولت ہم اپنی سلطنت کے جانے کے بعد اپنا وجود ہندوستان میں دیکھتے
ہیں۔ اور آزادی اور امن امان سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ پس گو قلم سے کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر
خدا نخواستہ جب مغرب سے ہم کسی کو اس گورنمنٹ کے مقابلے میں آتے دیکھیں گے تو اسی طرح
ملکہ مضطر کے تاج اور سلطنت پر اپنا خون بہائیں گے، جیسا اپنے ہم مذہب بادشاہوں کی بادشاہی
قائم رکھنے کے لئے بہاتے تھے (نہایت جوش کے ساتھ چیز) ہم اپنی قوت کو گورنمنٹ کے
دشمنوں پر کام میں لا دیں گے۔ ہم کبھی ایک لحظہ کے لئے بھی خیال نہیں کر سکتے کہ گورنمنٹ ہم کو بھلا
اور چھوڑ دے، اور ہماری اُن چیزوں کو جن پر ہماری زندگی ہے صدمہ پہنچنے دے۔ مجھے ہرگز
یقین نہیں ہے کہ گورنمنٹ ہماری زبان کو مرنے دیگی، بلکہ اُس کو زندہ رکھیں گی۔ اور وہ کبھی مرنے
نہ پائیں گی۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو کوشش اُس کے مرنے کی دوسری طرف سے ہو رہے، اگر وہ
برابر جاری رہی، تو آئندہ کبھی قوت ہماری زبان کو صدمہ پہنچا دے یہی خوف ہے جس کے لئے یہ شوش
ہو رہی ہیں، تاکہ ہم اپنی زبان کو زندہ رکھ سکیں۔ اور اگر خدا نخواستہ وہ وقت آوے کہ اُس کو
زندہ نہ رکھ سکیں تو اُس کا جنازہ تو دھوم سے نکالیں۔ ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

(اُردو کے اس آئندہ حشر کے اشارہ سے بہت سے سامعین آبدیدہ ہو گئے) مگر زوایوشن زبخت
پر اعتراض کرتے وقت ہمارے دل میں ایک لحظہ کے لئے بھی گورنمنٹ کی نیک نیتی میں شبہ کرنے
کا خیال نہیں گذرتا۔ اس لئے ہم کو اس بات کا بھی نہایت افسوس ہے کہ ہرگز کو چند نامہ نگاروں
کے خطوط کی بنا پر غلطی سے یہ خیال پیدا ہوا کہ تمام مسلمانوں کے خیالات اُن کی نسبت ایسے ہیں۔
جس کی وجہ سے انہوں نے ضروری سمجھا کہ اپنے آپ کو بنارس کے عام جلسے میں اس اہتمام سے
کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی بیجا رعایت کرتے ہیں پاک ثابت کریں۔ ہم اس بیان
کو ایسا غلط سمجھتے ہیں، جیسا کہ خود ہرگز۔ ہاں اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ لوگوں کو یہ خیال
ضرور ہے کہ سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کو اتنا حصہ اُن کے عہد حکومت میں نہیں ملا، جتنا اُن
کے مابقی لفظ گورنمنٹ کے زمانے میں ملا تھا۔ مگر یہ خیال اب پیدا نہیں ہوا، نہ اُس کو اس
معاہدہ اردو و انگری سے کچھ تعلق ہے۔ بلکہ ایسا خیال مسلمانوں میں ہرگز کے پاس ہندوؤں کے لئے

کے ڈپوٹیشن جانے سے بہت پیشتر ہو چکا تھا۔ ہزار کے عہد حکومت کے آغاز سے دو سال بعد اس صوبے میں بیکاریت پیدا ہو گئی تھی، اور اسی شکایت کے متعلق ۱۸۹۷ء میں علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ایک مضمون مسٹر تھیوڈور مارین موجودہ پرنسپل علی گڑھ کالج نے بعنوان ”محمد زاید گورنٹ سروس (مسلمان اور سرکاری ملازمت)“ لکھا تھا۔ اُس کے شروع میں وہ لکھتے ہیں کہ معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کو اس بات کا گمان ہو گیا ہے کہ گورنٹ شمال و مغربی اضلاع کی پالیسی میں سرائیکی مکڈ ائل کے غنائ حکومت لینے کے وقت سے اُن کے حق میں مضرت تبدیلی کی گئی ہے اور میرے پاس مسلمان دوستوں کی کئی چٹھیاں آئی ہیں، جن میں پالیسی کی تبدیلی کی شکایت کی گئی اور مجھ سے التجا کی گئی ہے کہ میں قوم کی طرف سے کچھ عرض کروں، ہزار نے اپنی بنارس کی اسپیش میں جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے مفصلہ ذیل قاعدہ سرکاری عہدوں کی تقسیم کا مقرر فرمایا ”برعایت عام قاعدہ کے کہ بلا قید قوم مذہب جلیل القدر عہدے لائق سے لائق شخصوں کو ملنے چاہئے۔ مسلمانان نصاباً بمقابلہ ہر پانچ ہندو عہدے داروں کے تین سے زیادہ کا استحقاق نہیں رکھتے، لیکن اس قسم کا قاعدہ ہمیشہ عام طور سے عمل میں نہیں آ سکتا اور بوجوہات مختلف میں نے مسلمانوں کے حقوق کو اُس سے زیادہ تسلیم کیا ہے، جس قدر اس اصول کے مطابق ملحوظ رہنے چاہئے تھے۔ ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ گورنٹ کی ملازمت کے انتخاب میں قابلیت کو معیار قرار دینا مصاحت اور انصاف پر مبنی ہے اور اس کا بھی افسوس کرتے ہیں کہ بلحاظ اعلیٰ تعلیم ہماری قوم ہندوؤں سے بہت پیچھے ہے، اور یونیورسٹی کی ڈگریوں کے پاس کرنے کے لحاظ سے مسلمانوں کی نسبت اہل ہندو سے ایک اور چار کی ہے۔

لیکن صرف کتابی امتحان پاس کر لینے کے علاوہ اور جوہ بھی ہیں جن پر غور کرنا بھی ضروری ہے اور جن کو گورنٹ سرکاری ملازمت کے عطا کرنے میں نظر انداز نہیں کر سکتی۔

یہ ضروری ہے اور سلطنت برطانیہ کی قدیم پالیسی بھی اسی کی متقاضی ہے کہ سرکاری ملازمت کے دینے میں دونوں فریقوں میں کم و بیش مساوات کا لحاظ رکھا جاوے۔ سرائیکینڈ کا لون اپنے زمانہ میں ہندو اور مسلمانوں میں مساوات کا لحاظ رکھتے تھے، باد جو دیکھ ہندو کی آبادی بہت زیادہ تھی۔ ہندوؤں نے اس کی شکایت کی، لیکن حضور ممدوح نے گورنٹ کی اس مساوات کی وجہ کو اپنی اسپیش جو انہوں نے اپنے عہد حکومت کی اختتام کے قریب دی تھی بصراحت بیان کر دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ”آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ ایک لوکل گورنٹ کو دیسراے کی خدمت میں ان شخصوں کے واسطے خطابات حاصل کرنے کی غرض سے جو اُس کی رائے میں اُن کے مستحق ہیں سفارش کرنے کا استحقاق حاصل ہے۔ نیز اُس کو ہر سال براہ راست چند ڈپٹی کلکٹروں اور

تحصیلداروں کے مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہے، پس صوبجات متحدہ میں پچھلے پانچ برس کے اندر اس اختیار کا عمل درآمد کس طرح پر کیا گیا ہے؟ اٹھائیس شخصوں کو اعزازی خطابات ملے ہیں جن میں ۱۴ مسلمان اور ۱۴ ہندو تھے۔ گورنمنٹ نے چھبیس ڈپٹی کلکٹر مقرر کئے ہیں جن میں ۱۶ ہندو اور ۱۰ مسلمان تھے، پندرہ شخص تحصیلدار مقرر کئے گئے ہیں جن میں سے ۹ مسلمان اور ۶ ہندو تھے۔ یعنی کل تینتیس متبادل چھتیس ہندوؤں کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ ان صوبجات میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ ہے اس لئے تعداد کے لحاظ سے ترجیح یا غرت دینی چاہئے لیکن اگر ہم کاشتکاروں کے گروہ کثیر کو نظر انداز کریں اور صرف ان قوموں کا لحاظ کریں، جن کا اس قسم کے معاملات میں پاس کیا جانا ہے تو یہ نامناسبیت فوراً دور ہو جاتی ہے۔ میں نے اس نکتہ چینی کا اس وجہ سے ذکر کیا ہے کہ وہ میری پبلک فرائض کی انجام دہی سے متعلق ہے۔

اب بالکل اس کے برعکس حالت ہے اور جو شکایت ہندوؤں کو سرکلینڈ کالون سے تھی اُس قسم کی شکایت مسلمانوں کو سرائٹونی مکڈائل سے ہے، مجھے پورا یقین ہے کہ مسلمانوں کو یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ سرکلینڈ کالون اپنی رعایا کی سرپرستی کرنے میں کسی خاص گروہ کی رعایت یا طرف داری کرتے تھے۔ پس اب جب کہ زمانہ فخر بدلنا، تو ہم کو کیا حق ہے اس بات کا کہ اپنے موجودہ فٹنٹ گورنر کی نسبت کوئی دوسرا خیال کریں اور ان کی کسی گروہ روائی کو طرف داری پر محمول کریں۔ یا اس ہم اس بات پر افسوس کرنے سے باز نہیں رہ سکتے، کہ ہر آئندہ اپنے سامنے میں اپنے متقدمین کے اُس ہول کی جس کو ہم نہایت صحیح اور ضروری سمجھتے ہیں پابندی نہ کی، یعنی یہ کہ سرکاری نوکری میں ہندو اور مسلمان عہدہ داروں کی تعداد میں تقصیف کرتے وقت کاشتکاروں کے گروہ کثیر کو جن کو ایسے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے خارج نہیں کیا فطرت انسانی کا تقاضا یہی ہے اور غالباً ایسی شکایات خواہ ایک جانب سے ہوں یا دوسری سے آئندہ فٹنٹ گورنروں کے عہد میں بھی ہمیشہ سننے میں آوے گی۔ اور وہ حکمران نہایت خوش قسمت ہوگا، جو اپنے عہد میں ایسا اعتدال اور میانہ روی قائم رکھ سکے، اور اس غیر متناہی مبالغہ میں دونوں فریقوں کو رضا مند رکھ سکے۔ بہر حال جس بات پر میں زیادہ زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ گروہ نہایت ہی قلیل اور کوتاہ نظر لوگوں کا ہے۔ جو حضور سرائٹونی مکڈائل کا دل سے شکر گدا اور ان کی حکومت کا تذکرہ نہ ہوگا تمام سمجھ دار مسلمان حضور ممدوح کو سچی محبت و عزت اور احسانندی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہم افسوس کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں کہ ہم کو حضور ممدوح کی وہ سرپرستی حاصل نہیں ہے، جس کی منتا ہم کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے ہم اس امر کو فراموش نہیں کر سکتے (اور اگر ہم کریں نہایت

احسان فراموشی اور ناشکر گذاری ہوگی، کہ ہمیں ہزار کی گورنمنٹ سے بیش بہا فوائد چھپے ہیں۔ یہیں اس وقت آپ کے سامنے اُن کی صرف ایک مہربانی کا ذکر کرونگا اور وہ یہ ہے کہ حضور سرانٹونی مکڈائل نے مدرستہ العلوم علیگڈھ کے معاملات میں بہت بڑی دلی ہمدردی اور کمال دلچسپی ظاہر فرمائی ہے۔

سر سید کے انتقال کے بعد کالج کی تاریخ میں نہایت نازک موقع پیش آیا اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا، کہ اُس وقت حضور مدعو ہی کی توجہ اور امداد کی برکت تھی کہ ہم اُس طوفانِ عظیم کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اگر حضور مدعو مسلمانوں کے ساتھ اور کوئی سلوک نہ بھی کرتے تو اُن کا یہی احسان جو انہوں نے ایک ایسوا سٹیٹوشن کو بے وقت تباہی سے بچانے میں مسلمانوں پر کیا، جس کی نسبت صاحب پرنسپل نے اپنی رپورٹ ۱۸۹۹ء و ۱۹۰۰ء میں لکھا ہے کہ ”وہ دن بدن فی الحقیقت شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی اُمید اور اُن کے لئے مایہ ناز ہوتا جاتا ہے“ اس قدر بڑا احسان ہے کہ وہ اس کے لئے تمام مسلمانوں اور اُن کی آئندہ نسلوں کے دلی شکر کے مستحق ہیں۔

حضرات! علیگڈھ میں جو جلسہ اس رزلوشن کی مخالفت میں گذشتہ مئی میں ہوا تھا۔ اُس کے صدر انجمنِ صلح علیگڈھ کے ایک معزز رئیس بنائے گئے تھے۔ پھر وہ مستغفی ہو گئے، اُن کے علمبردار ہو جانے کا بہت کچھ چرچا ہو رہا ہے۔ انہوں نے ہزار سے کہا کہ ”اُن کو واقعات غلط بتائے گئے تھے، اس لئے اُنہوں نے پریسیڈنٹ منظر کی تھی۔ مگر جب کہ اُن کو اصلی واقعات معلوم ہو گئے، اُنہوں نے استغفا دیدیا اور اپنا تعلق ہر قسم کا کیٹی سے الگ کر دیا“ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جو کارروائی مستغفی پریسیڈنٹ صاحب نے کی وہ لائقِ افسوس ہے۔ مگر میں اس معاملہ کی نسبت اپنی ذاتی رائے آپ صاحبوں کے سامنے بیان کرونگا اور نہ اُن وجوہات کی طرف اشارہ تک کرونگا، جو میرے نزدیک اصلی موجب اُن کی اس کارروائی کے ہیں۔ مگر ضرورت اور انصاف یہ چاہتا ہے کہ میں وہ تمام واقعات جو اُن کے اس تحریک میں شامل ہونے کے متعلق ہیں، آپ صاحبوں کے روبرو صاف صاف بیان کروں۔ اُن کے پریسیڈنٹ مقرر کرنے اور اُن کے مستغفی ہونے کے واقعات یہ ہیں کہ یکم مئی کو اس رزلوشن کے متعلق کارروائی کرنے کے لئے ایک مجلس میرے مکان پر منعقد ہوئی، اور میں نے خاص خاص لوگوں کو تحریری رفقے بھیج کر آنے کی درخواست کی۔ منجملہ اور لوگوں کے وہ رفقہ مستغفی پریسیڈنٹ کی خدمت میں بھی بھیجا گیا۔ اس رقعہ میں سُلک کے عیب و ثواب پر کوئی بحث نہیں کی گئی تھی۔ وہ اپنی خوشی سے اُس جلسہ میں تشریف لائے۔ اور براہ مہربانی اُنہوں نے اُس مجلس کا چیرمین ہونا قبول کیا۔ واقعات کا اُن کو

بھی اُسی قدر علم تھا، ہفتنا کہ دیگر حاضرین کو! کوئی کارروائی اس قسم کی نہیں ہوئی، جس سے اُن کو کسی معاملہ میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اُس مجلس میں صرف یہ فیصلہ ہوا۔ کہ اس ضروری اور اہم مسئلہ پر غور کرنے اور رزلوشن پاس کرنے کے لئے ۱۳۔ مئی کو کرسٹھیٹ ڈال علیگڈھ میں ایک جنرل میٹنگ کی جاوے، اور چھپے ہوئے رقعے دعوت کے جاری کئے گئے جن پر سجدہ دیگر لیڈروں کے اُن کے بھی دستخط تھے ۛ

مطابق اُس کے ۱۳۔ مئی کو جلسہ ہوا اور اُس کے بھی وہی صاحب صدر انجمن تجویز ہوئے۔ اُنہوں نے خوشی سے منظور کیا، اور بعض رزلوشنوں کی تحریک خود کی۔ یکم مئی سے ۱۳۔ مئی تک جو عرصہ گزرا اُس میں نہ وہ مجھ سے ملے نہ میں اُن سے ملا، اور میں نہیں سمجھتا کہ اُن کو کس شخص نے اور کیونکر واقعات کی نسبت اس قدر بڑا معاملہ دیا۔ ماسوائے اس کے جو تقریریں کہ اس بڑے جلسہ میں ہوئیں اُن میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس سے مستغنی پریسیڈنٹ صاحب کو اپنی رائے تبدیل کرنے کا موقع ملا ہو۔ تمام کارروائی سب کے سامنے ہوئی، اور اُس کی مفصل روئنا دچھاپ کر شائع کی گئی۔ اُسی دن ایک تار خدمت میں پرائیویٹ سکرٹری ہزار لفٹنٹ گورنر ہاؤس متعلق اس معاملہ کے بھیجا گیا اس تار کا جواب آنے پر ۱۴۔ مئی کو ایک ضروری اجلاس اسی کیٹی کا جواب لکھنے کی غرض سے منعقد ہوا۔ پریسیڈنٹ صاحب علیگڈھ میں موجود نہ تھے، اس لئے جلسہ میں شریک نہ ہو سکے مگر اصل تار مع مجوزہ جواب کے اُن کی خدمت میں روانہ کیا گیا اور درخواست کی گئی کہ وہ اس کو دیکھ کر اگر کوئی اصلاح و ترمیم مناسب سمجھیں تو کریں۔ ۱۴۔ مئی کو اُنہوں نے جو جواب بھیجا وہ یہ ہے:-

”جناب نواب صاحب مخدوم و مکرم نیاز مندان جناب محسن الملک بہادر دام عثمانکم! بعد سلام نیاز کے التماس ہے کہ والا نامہ مع خبر تار جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر، وزیر مسودہ جواب اُس کے کا پتہ چلا۔ عزت ہوئی۔ میں نے مسودہ جواب کو بہت غور سے دیکھا۔ میری رائے ناقص میں یہ جواب بہت اچھا اور مناسب ہے کسی قسم کی ترمیم وغیرہ کا محتاج نہیں ہے۔ چنانچہ ہر دو غڈ مذکورہ بالا اس نیاز نامہ کے ساتھ خدمت عالی میں واپس کرتا ہوں زیادہ والسلام فقط“

آپ کی نیاز مند (دستخط) محمد لطف علی خاں از طالب نگر، ۱۴۔ مئی ۱۹۱۹ء

اس کے بعد مینل دن گذر گئے، اور اس بڑے جلسہ کے لئے دعوت کے خطوط جاری کرنے کے لئے تجویز کی گئی، جس کا میں صدر انجمن ہوں اور یہ بھی قرار پایا کہ دعوت کریں والوں میں مستغنی پریسیڈنٹ کا نام بھی درج کیا جاوے۔ چنانچہ اُن سے بذریعہ خط مورخہ ۲۴۔ جون ۱۹۱۹ء درخواست کی گئی۔ اس کو بھی اُنہوں نے خوشی سے منظور کیا اور اجازت دی کہ اُن کا نام بھی

دعوت کرنے والوں میں لکھ دیا جائے۔ اُن کا وہ خط جس میں اُنہوں نے اجازت دی حسب ذیل ہے :-

”جناب نواب صاحب محترم و مکرم بندہ نواب محسن الملک صاحب بہادر دام عزائے شکر !
بحوالہ الانامہ رقمزدہ ۴۔ جون عرض کرتا ہوں کہ میرا نام اپنے اور نواب صاحب پچاسو کے
ساتھ درج نوٹس فرمادیتے تھے۔ مجھے خوشی منظور ہے۔ اطلاقاً مکلف ہوا۔ زیادہ نیاز
آپ کا نیاز مند دستخط محمد نطف علیجاں ۵۔ جون ۱۹۱۴ء“

جو خط و کتابت میں نے آپ کے رو برو پڑھی ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ مستغنی
پریسیڈنٹ صاحب کو یکم مئی سے ۵۔ جون تک اس تحریک کے ساتھ دلی ہمدردی تھی اور اس
عرصہ میں اس سلسلہ پر تمام اخبارات وغیرہ کے ذریعہ سے پوری بحث ہو چکی تھی اور ان کو اس
یاد دھوکے کو معلوم کرنے کا پورا موقع حاصل تھا جو اس تحریک کے لیڈروں نے اُن کو دیا تھا۔
۱۳۔ جون تک کوئی شک و شبہ اُن کو اس قسم کا پیدا نہ ہوا اور چالیس دن سے زیادہ عرصہ
وہ اس تحریک کے حامی اور سرگروہ رہے۔ جس کے بعد اُنہوں نے ذریعہ ایک خط کے جو میں آپ
کو سنانا ہوں اپنا استعفا بھیجا۔

”جناب نواب صاحب مخدوم مکرم بندہ نواب محسن الملک صاحب بہادر دام نواز شکر !
بعد سلام نیاز ایک کمیٹی علیگڈھ میں قائم ہوئی تھی بدینہ عرض کہ ناگری حروف کا عدالتہاے میں جاری
باعث نقصان ہے اور میں نے اُس کمیٹی کا عہدہ پریسیڈنٹی قبول کیا تھا اُس وقت میں میری وجہ
سے احکام گورنمنٹ کی بابت اور نتیجہ کارروائی کمیٹی مذکور کی بابت غلط فہمی عمل میں آئی تھی، مگر
بعد ملاحظہ وغور کامل میری یہ رائے ہے کہ احکام گورنمنٹ کے ذریعہ سے ہندوستانی یعنی اردو
زبان کو کوئی اہم نقصان نہیں پہنچتا ہے، چنانچہ میں عہدہ پریسیڈنٹی سے مستغنی ہوتا ہوں اور
یہ استعفا آپ کی خدمت میں بھیج کر اسید کرتا ہوں کہ یہ استعفا میرا منظور ہوگا، اور اب میرا نام اُس
جلسہ کے مدعو کرنے والوں میں تحریر نہ فرمایا جاوے، جو کہ عام جلسہ امور متذکرہ بالا کے متعلق لکھنؤ
میں ہونے والا ہے۔ زیادہ نیاز

آپ کا نیاز مند دستخط محمد نطف علیجاں مورخہ ۱۳۔ جون ۱۹۱۴ء
اے حضرات ! وہ کمیٹی جو یکم مئی کو میرے مکان پر ہوئی تھی، اُس وقت نواب قارا الملک صاحب
موجود تھے۔ آپ اُن سے دریافت کیجئے کہ ایک موقع پر میں نے حاضرین سے خطاب کر کے کہا
تھا کہ اس کارروائی میں جذبات دلی کو جوش میں نہ لانا چاہئے اور تقریر میں اعتدال ملحوظ رکھنا چاہئے
اُس وقت ہمارے مستغنی پریسیڈنٹ نے کیا کہا تھا (اس پر نواب قارا الملک صاحب در کھڑے ہوئے

اور فرمایا :-

”جناب نواب پریسڈنٹ صاحب بہادر اور دیگر معزز حضرات! مجھ کو علیگڑھ اور ڈوڈھنٹس کیٹی کے اُس ابتدائے جلسہ میں اتفاق سے شریک ہونے کی عزت حاصل تھی، جس میں پریسڈنٹ صاحب کو پریسڈنٹ بنایا گیا تھا، اور میں اپنے ذاتی مشاہدہ اور ذاتی علم سے کہہ سکتا ہوں، کہ مستفی پریسڈنٹ صاحب کو کسی قسم کا دھوکا یا مغالطہ جلسہ کی طرف سے نہیں دیا گیا تھا۔ ۱۸۔ اپریل ۱۹۴۷ء کا رزلٹ و لیوشن تمام و کمال اُس وقت جلسہ کے سامنے بہادر بلند پڑھا گیا تھا اور جو نقصانات کہ اُس سے آئندہ ہماری اردو زبان کو پہنچنے والے تھے اُس پر اچھی طرح نگہ رکھنی تھی، اور اُسی اثنا کے گفتگو میں جب کہ نواب حسن الملوک بہادر جلسہ کو نصیحت کر رہے تھے، کہ ہر ایک کارروائی آئندہ بہت احتیاط اور اعتدال سے کی جاوے، اور کسی قسم کے بیجا جوش کا اظہار نہ کیا جاوے، اور کوئی لفظ جو گورنمنٹ کی شان کے خلاف ہو زبان سے نہ نکالا جاوے تو انہیں جناب مستفی پریسڈنٹ صاحب نے یہ الفاظ زبان مبارک سے ارشاد فرمائے تھے کہ ”وہ حضرت جب جی جلیگا تو کہاں تک کوئی بات زبان سے نہ بھلیگی“

پریسڈنٹ نے پھر اپنی تقریر شروع کی اور کہا کہ :- ”جب ہر آنے اپنی بنارس کی تقریر میں اس امر کا تذکرہ فرمایا اور عام لوگوں کی توجہ اس معاملہ کی طرف مائل ہوئی۔ میں نے بھی اُس سے اُن کو ایک رجسٹری شدہ خط بھیجا، اور دریافت کیا کہ آپ کو کس نے دھوکا دیا اور کیا دھوکا دیا۔ اور ممبران علیگڑھ کیٹی نے بھی ایک خط لکھا مگر مستفی پریسڈنٹ صاحب نے کوئی جواب اب تک نہیں دیا۔“

اے صاحبو! میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ جو کچھ ہمارے مستفی پریسڈنٹ نے ہر آنے سے کہا، اُس کی ان خطوط سے کہاں تک تصدیق ہوتی ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ایسا کہتے ہیں اور جن کے کہنے پر ہر آنے کو یہ خیال ہو گیا ہے کہ وہ اب اس مسئلہ کو سمجھ گئے ہیں اُن کو صرف خیالی خوف اس کا باعث ہے اور جو لوگ اس کارروائی میں ہمارے شریک نہیں ہیں حقیقت وہ اپنے گھروں میں بیٹھے کروہ باتیں کہتے ہیں، جو ہم کبھی نہیں کہتے۔ مگر وہ معدود ہیں کیونکہ اُن کو گورنمنٹ کے اصول سے واقفیت نہیں۔ وہ برٹش عمدہ داروں کی آزادانہ اور منصفانہ طبیعت سے آگاہ نہیں۔ برٹش گورنمنٹ وہ گورنمنٹ ہے، کہ صداقت انصاف اور آزادی پر اُس کی بنیاد ہے، اور اس لئے ہم کو اپنا در در گورنمنٹ کے پاس ظاہر کرنے کے لئے کوئی مخالفت نہیں۔ یہ لوگ جن کو اس اصول سے واقفیت نہیں، وہ مارے ڈر کے حق بات کے کہنے سے ڈرتے ہیں اور حقیقت اُن کی غلطی سے گورنمنٹ کو دھوکا ہوتا ہے۔ مگر یہ بات کچھ نئی نہیں ہے،

بلکہ مرحوم سر سید احمد خاں بھی اس کا افسوس کرتے تھے اور اپنے ملک کو اس بیجا خوف کرنے اور سچ بات نہ کہنے پر ملامت کرتے تھے، جیسا کہ انہوں نے اپنی ایک اسپچ میں علیگڑھ کے پرنسپل سے خطاب کر کے کہا تھا: ”آپ مجھے معاف کیجئے، میں صاف صاف کہنا چاہتا ہوں ہندوستان کی رعایا کی یہ عادت ہو گئی ہے، کہ گھر میں بیٹھ کر گورنمنٹ کی ہزاروں شکایتیں کریں گے، انتظام حکام پر گھر میں ہزار عجیب لگاؤ لگائیں گے، جن میں سے بہت صحیح و درست بھی ہوں گے۔ مگر جیسا انگریزوں سے لینے، تو کیسے کہ ہم تو گورنمنٹ کے بڑے خیر خواہ ہیں، اور حکام کا انتظام حد تعریف سے بھی بہت عمدہ ہے، اور نہایت ہی خوب ہے۔ کوئی غفلت آدمی ایسی رعیت کو خیر خواہ نہیں سمجھ سکتا۔“

اے حضرات! میں نے استغفہ کی نسبت تمام واقعات آپ لوگوں کے سامنے پیش کر دیئے اور اُس پر آپ نہایت آسانی سے رائے قائم کر سکتے ہیں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا، کہ آپ سے بیان کروں کہ اس واقع سے کیا اخلاقی سبق حاصل ہوتا ہے۔ یا آپ سے انصاف چاہوں کہ آیا پریسیڈنٹ موصوف کا فیصلہ اُس قول کے مطابق ہے، جو انہوں نے ہزاروں سے کہا یا آپ سے ملتے ہیں، کہ آپ کے نزدیک ہزاروں کی رائے جو انہوں نے پریسیڈنٹ استغفہ کی وجہ استغفہ کے بیان کرنے کی بنیاد پر ان طریقوں کی نسبت ظاہر فرمائی ہے، جن سے یہ ایکٹیشن برائینجیٹ کیا گیا تھا کہاں تک حق بجانب ہے؟

صاحبو! جب کسی مسئلہ کی نسبت تمام قوم کے دل کو صدمہ پہنچے تو اُس کے متعلق ایکٹیشن کے پھیلانے اور برائینجیٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے وقت میں ہمارا فرض حقیقت میں یہ ہے کہ پبلک کی رائے کو اعتدال پر لائیں اور گورنمنٹ کے ارادوں اور مقاصد کی نسبت جھوٹے خیالات لوگوں کے دلوں سے دور کریں۔ باوجود اس کے کہ ایسے بڑے شخص جیسے کہ ہمارے مستغفہ پریسیڈنٹ ہیں، اس تحریک سے علیحدہ ہو گئے یا بڑے بڑے نواب اور رئیس خیالی خوف سے علیحدہ رہے، ہم کو یقین ہے کہ ہماری قومی زبان مرنے نہ پاویگی اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

حضرات! میں نے بہت سادہ وقت آپ کا اُن خارجی واقعات کے بیان کرنے میں لیا ہے اور اب میں مناسب نہیں سمجھتا کہ رزلویشن کے نفس مضمون پر عام نظر ڈالنے اور اُس کی تشریح کرنے سے آپ کا وقت زیادہ ضائع کروں، جو رزلویشن کے آج کے اجلاس میں پیش ہو گئے، اور اُن کی تائید میں جو تقریریں کی جاؤں گی، اُن میں میرے لائق دوست گورنمنٹ کے احکام کے ہر پہلو پر غور اور مباحثہ کریں گے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کل مسئلہ کی نسبت کہا ہے اور جو تعلق ہمیں اس ایکٹیشن سے ہے اُس کا تصفیہ گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہے، اہل یہ ہے کہ رزلویشن

مؤرخہ ۱۸- اپریل ۱۹۴۷ء کے اصل مفہوم کو کوئی نہیں سمجھا، اُس کے معانی ایسے مبہم ہیں کہ اُن پر قانون دانوں کے سبب حشہ ہو چکے۔ ایک کچھ مراد لیتا ہے، دوسرا اُس کی تردید کر کے دوسرے معنی قرار دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ان صوبجات کی دو بڑی جوڈیشل عدالتوں نے اُس کے معنوں پر بالکل متناقض فیصلہ کیا۔

جب یہ حال ہے تو اُس کی نسبت مسلمانوں پر فتنہ انگیز موشگافیاں اور بیجا تشریکیں کرنا ایک الزام کیونکر عائد ہو سکتا ہے؟

جو اہتمام کہ رزلویشن کے موجودہ الفاظ میں پایا جاتا ہے اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ رزلویشن کے معنوں کی نسبت جو فیصلہ الہ آباد ٹائی کورٹ اور جوڈیشل کشر اودھ نے کئے ہیں اُن میں بالکل متناقض ہے۔ ٹائی کورٹ نے لفظ ”درخواست“ کے اندر عرضی دعوے۔ استخاثے۔ بیانات وغیرہ سب شامل کر لئے ہیں۔ مگر آخر الذکر کی عدالت نے (جس سے قبل نفاذ رزلویشن شہر بھی لیا گیا تھا) یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس صلاح کا اطلاق استخاثوں اور تحریری بیانات پر نہیں ہو سکتا۔ اگر ناگری حروف کا استعمال درخواستیں وغیرہ لکھنے میں صرف اُنہیں لوگوں کے لئے اختیار ہے اور جائز سمجھا جاوے جو صرف اسی تحریر سے آگاہ ہیں اور جو استخاثے اور دیگر کاغذات سرکاری قانون پیشہ لوگوں کے توسل سے پیش ہوتے ہیں خارج رکھے جاویں۔ تو محض قرین مصلحت اور ایک خاص گروہ کی سہولت کا باعث ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید ہر آرڈر کی تقریر سے ہوتی ہے جو انہوں نے بنارس میں فرمائی، حضور ممدوح نے فرمایا کہ ”حکام کے رد و رد و زبانی شکایتوں اور اظہارات میں اگر کوئی حاکم کسی کو ہندی استعمال کرنے سے منع کر دے تو اُس کی نسبت کیا خیال ہوگا۔ پس اگر زبانی اظہارات میں ہندی کی ممانعت لغو ہے، تو تحریری بیانات میں اُس کی ممانعت کیونکر جائز ہو سکتی ہے؟“

صاحبو! اگر اس رزلویشن کے جاری کرنے سے گورنمنٹ کی اصل میں یہی غرض اور مراد ہے، جو کہیں نے ابھی بیان کی اور گورنمنٹ اس کی باضابطہ طور سے تشریح کر دے، تو چشم مارویشن اور دل ماشاد، ہمارا تمام اختلاف دور ہو جاوے اور کسی قسم کا اعتراض باقی نہ رہے ہم تعصب اور ناجائز توہمی طرف داری کی قیود کے پابند نہیں ہیں۔ جو خواہ مخواہ ایسے احکام سے اختلاف کریں جن کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ صرف ناگری لکھنا چاہتے ہیں وہ قانون دان لوگوں کے پاس جانے کے سچے اور تکلیفوں سے محفوظ رہیں اور خود اپنی درخواستیں لکھ کر اصالاً پیش کر سکیں۔

یہ نہایت معقول اور تابادی کے ایک خاص گروہ کی ضرورتوں کی پورا کرنے والی ہے لیکن اگر باوجود ان احکام کے اہل معاملہ قانون پیشہ لوگوں کی امداد اور مداخلت کی ضرورت باقی رہی اور

عرائض نویسوں اور وکلا کو بھی جن کے لئے اردو زبان اور حروف سے واقف ہونا لازمی ہے ناگری حروف میں لکھنے کی آزادی ہو تو اس رعایت کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور ایک دوسری طرز تحریر کی اجازت دینا محض بے سود ہو جاتا ہے۔ اس رزولیوشن کا اہام اور اس کے لفظوں پر مختلف معنوں کا اطلاق ہونا نہ صرف یہیں تک محدود ہے کہ آیا قانون پیشہ لوگوں کو ناگری حروف کے استعمال کا حق ہے یا نہیں۔ بلکہ آپ کو معلوم ہو گا کہ رزولیوشن ریرجٹ کی تہدید میں حصول فنٹ گورنر بہادر نے صاف طور پر فرما دیا تھا کہ وہ زبان کا سلسلہ جو حروف کے سلسلہ سے بالکل علیحدہ سلسلہ ہے چھیڑنا نہیں چاہتے اور حضور مدوح کا ارادہ ان صوبجات کی عدالتوں کی زبان بدلنے کا نہیں ہے لیکن جو ترمیم رزولیوشن مذکور کی دفعہ ۳۴ کے فقرہ ۳ میں حسب تجویز گورنمنٹ آف انڈیا ہوئی ہے اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہی سلسلہ زبان چھیڑا گیا ہے۔ حل حکم کے مطابق عملہ کے ملازموں کے لئے ناگری و فارسی حروف کا جاننا شرط ضروری قرار دیا گیا تھا، مگر مذکورہ بالاتریم کے موافق ہندی اور اردو زبانوں کا علم عملہ کے ملازموں کے لئے لازمی ہو گیا۔ یہ اہم تبدیلی جو رزولیوشن کے اس حصہ میں کر دی گئی ہے جس کا اثر عملی کارروائی پر پڑتا ہے اور جس کا مضمون اسی کے تہدید غلط سے بالکل متناقض ہے اس امر کا تین اور قاطع ثبوت ہے کہ اس رزولیوشن کی تحریر اور نفاذ کی تمام کارروائی بغیر کافی غور کے عمل میں آئی ہے ہم کو نہ صرف یہی حق حاصل ہے کہ اس ضرر رساں اثر کی نسبت جو اس رزولیوشن سے ہماری پیاری زبان پر پڑ لگا، گورنمنٹ کی خدمت میں اپنے خیالات ظاہر کریں، بلکہ اس کے جب تک موجودہ معنی قائم ہیں ہم ہر آرزو سے جائز طور پر یہ استدعا کرنے کے مستحق ہیں کہ وہ باضابطہ طور سے ایک جدید رزولیوشن نافذ کر کے صاف الفاظ میں تشریح کر دیں کہ رزولیوشن ۱۰۔ اپریل کا اصلی مفہوم اور مراد کیا ہے۔ ہماری زبان پر صدر پہنچنے کا اندیشہ ہو اور ہم چپکے بیٹھے رہیں اور مود بانہ طور سے معترض نہ ہوں اور اپنی زبان کی حفاظت کی تدبیر نہ کریں اور دل ہی دل میں کڑھتے رہیں، تو ہم گویا اس بات کے ثابت کرنے والے ہوئے کہ نہ ہم اپنے معزز اسلاف کے لائق خلف ہیں، نہ ہم اپنے تاریخی واقعات کے خیال رکھنے والے ہیں، نہ ہم اپنی قوم کے سچے دوست ہیں، نہ اپنے فرض کے ادا کرنے والے، نہ گورنمنٹ کے اصلی مہول کے سمجھنے والے ہیں۔ کیونکہ یہ کوئی خفیف معاملہ نہیں ہے اور گویا بفعل خفیف ہو، مگر آئندہ اس کی سنگین اور زیادہ اہم ہونیکا خوف ہے اور اس سے ہم کو بڑا ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

میں اس موقع پر سہ سید مرحوم کے ایک مبارک کو قتل کرنا کافی سمجھتا ہوں جو انہوں نے ۱۸۴۳ء کے ایک سرکریس شائع کیا تھا۔ ہمارے معزز لیڈر نے لکھا کہ "تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ناگری حروف اور ہندی زبان جاری ہونے سے بڑا نقصان ہو گا۔ درحقیقت جتنے نقصان مسلمانوں کو

ہونا ممکن ہے، وہ ہوگا کہ اس سے بڑھ کر بجز دین سے محروم کر دینے کے نقصان کے اور کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔

صاحبو! حائل کلام یہ ہے کہ اگر اس رزلوشن کے اصل معنی اُس حد تک محدود رہیں جس کا میں نے ابھی ذکر کیا، تو ہم کو اس سے کوئی اختلاف نہیں کیونکہ اس اردو زبان و حروف کی عدالتوں کی مستند زبان اور حروف ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا اصل مقصد اُس کا یہی ہوگا کہ خاص خاص صورتوں میں اُن غریب لوگوں کے لئے آسانی اور سہولیت ہو، جو صرف ناگری جانتے ہیں اور اپنے وکیل آپ ہوتے ہیں، اور مجھے یقین ہے کہ ہر آرزو کا بھی اصل منشا یہی ہے اور ہمارے اختلاف پر جو اس رزلوشن کی نسبت ہے، اسی خیال سے ہر آرزو کو نجب بلکہ بڑا تہف ہے کہ ہم ایسے علم پر جس سے ہماری زبان کو کچھ ضرر نہیں پہنچتا اور جس سے دوسرے مستفید اور متمتع ہو سکتے ہیں، مخالفت کرتے ہیں۔ اگر اس کی تشبیہ کر دیا جائے اور وہ ابہام جو پیدا ہو گیا ہے رفع کر دیا جائے تو اس بحث کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور کسی قسم کا اعتراض باقی نہیں رہتا۔

صاحبو! میں صرف آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ لوگوں کا اُس عنایت آمیز مدار کا دل سے مشکور ہوں۔ جو آپ نے میری نسبت ظاہر فرمائی۔ اور آپ سے متوجی ہوں کہ آپ اپنی دلی توجہ اُن حضرات کی طرف مبذول فرمائے جو ابھی آپ کو مخاطب کرنے والے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ اگر آپ اپنی کارروائی میں اُس سنجیدگی اور اعتدال اور تہذیب کو ملحوظ رکھیں گے جس کے لئے ہم ایسے خاص موقوفوں پر جب کسی پبلک سسٹم پر گورنمنٹ کی خدمت میں اپنی رائے اور خیالات ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیشہ کوشش کرتے رہے تو آپ کے اس جلسہ کی وقعت اور آپ کی باتوں کا اثر ہوگا۔ اور آپ کی غیر تعصبات اور مودیانہ کارروائی عزت کی نظر سے دیکھی جاوے گی۔



نمبر ۵۳

ایسیج

یہ ایسیج ذرا صاحب بنادر نے ۷۷- دسمبر ۱۹۰۷ء کو لندن کے ایک کونسل کا نفرنس کے اجلاس چارم منعقدہ رام پور میں کانفرنس کے صاحب کتاب کے متعلق اور غیر حیات لکھنے والا ہو کر چھپنے کی بات فرمائی۔

برادران! حاضرین!

یہ تو آپ کو پروگرام سے معلوم ہوا ہوگا کہ کانفرنس کا معمولی جلسہ دو بجے سے شروع ہو جبکہ

ہمارے حضور پرنور نواب صاحب بہادر والی رام پور رونق افروز ہونگے، لیکن قبل اس کے میں نے مناسب سمجھا کہ ایک غیر معمولی جلسہ کیا جاوے، اور چند ضروری باتیں جن کو زور و پشتوں سے کچھ تعلق نہیں ہے آپ کی خدمت میں عرض کی جاویں۔ منجملہ ان کے اول معاملہ رپورٹ کے ساتھ معمولی تنصیح کے نہ چھپنے کا ہے۔ کانفرنس کی آمدنی پبلک منی ہے۔ کانفرنس کے آمد و خرچ کے جانچنے اور دیکھنے کا ہر میرے کو اختیار حاصل ہے اور اُس کے خرچ پر اعتراض کرنے کا اُن سب کو استحقاق ہے۔

دو برس ہوئے کہ لاہور اور کلکتہ کے حساب بوجہ تنصیح شائع نہ ہونے کے معلوم نہ ہو سکے اس پر لوگوں کو خیال ہوا کہ کیوں تنصیح شائع نہیں ہوئے۔ تنصیح اگرچہ معمولی بات ہے، لیکن یہ امر یقینی ہے کہ ممبروں کو بوجہ نہ شائع ہونے تنصیحوں کے حساب آمد و خرچ کا حال نہ معلوم ہوا ہوگا، لیکن تنصیح شائع نہ ہونے کی یہ ہے کہ لاہور کی رپورٹ چونکہ بہت بڑی تھی اور تعداد ممبروں اور وزیٹروں کی زیادہ تھی، اور یونیورسٹی کی اسکیم بھی رپورٹ میں درج کی گئی تھی اس واسطے اُس کا خرچ چھپائی بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ یعنی بارہ سو روپیہ اُس کی چھپائی میں خرچ ہوئے تھے۔ چونکہ رپورٹ زیادہ تعداد میں چھپوائی گئی اور بوجہ یونیورسٹی کی اسکیم کے زیادہ لوگوں میں اُس کا تقسیم کرنا ضروری تھا۔ لہذا تنصیحوں کا چھپوانا ملتوی رکھا گیا۔ لیکن جب لوگوں کے خطوط میرے پاس آئے، اخباروں میں اعتراض ہوئے، تو خرچ کا خیال نہ کیا گیا اور لاہور کے اجلاس کا تنصیح شائع کر دیا گیا۔ جس کی چھپی ہوئی جلدیں میرے پاس اس وقت موجود ہیں۔ شام تک اور جلدیں آجا دیں گی۔ اُس میں تمام ممبروں کے نام اور میرٹھ کی کانفرنس کا حساب درج ہے۔ جو صاحب لاہور کی کانفرنس کے میرے یہاں موجود ہوں وہ میرے دفتر سے تنصیح لے لیں۔ تاکہ محضول ڈاک بچے اور لوگوں کو فوراً اطمینان ہو جائے۔

دوسرا معاملہ متعلق حساب لاہور اور کلکتہ کے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کانفرنس کی آمدنی خرچ ایک سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی سے جو علیگڑھ میں قائم ہے متعلق ہے اور دوسرے لوکل کمیٹی سے یعنی جہاں سالانہ کانفرنس کا اجلاس ہوتا ہے۔ لوکل کمیٹی کے متعلق جو خرچ ہے اُس کے حساب کی جانچ ہم نہیں کر سکتے وہ کمیٹی اپنی خود جو کچھ مناسب ہوتا ہے خرچ کرتی ہیں۔

لاہور کی لوکل کمیٹی کے خرچ کے متعلق میں اس وقت کچھ بیان کرتا چاہتا ہوں۔ زندہ دلاں پنجاب تو نہایت خوش ہونگے اور میں بھی فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہمارے خان بہادر برکت علی خاں اور اُن کے رفقا اور عوامانہ زندہ دلاں پنجاب کی بدولت لاہور کی لوکل کمیٹی کا حساب نہایت صاف اور عمدہ آیا ہے چنانچہ یہ حساب اس وقت میرے پاس موجود ہے نہ صرف حساب صاف ہے بلکہ خرچ اس قدر کم ہے کہ کل اخراجات کے بارہ سو چالیس روپیہ صرف ہوئے ہیں۔ لوکل کمیٹی لاہور کی معرفت جو آمدنی ہوئی ہے اُس میں سے بارہ سو چالیس روپیہ خرچ کے منہا کر کے تین ہزار روپے سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی علیگڑھ

کے پاس نقد بھیج دئے گئے۔ جو سامان قابل فروخت ہونے کے تھا اُسے فروخت کر کے قیمت بھیری نہ صرف یہ کیا، بلکہ جلسہ کی آرائش اور خیر مقدم کے لئے جو سُرُخ و سبز مختلف رنگ کے کپڑوں کی جھنڈیاں تیار کی گئی تھیں اور اُن کی قیمت اچھی نہ اُٹھتی، اُن سب جھنڈیوں کو بھی علیگڑھ بھیج دیا، اب جو جلسہ کلج میں ہوتا ہے، نو وہ جھنڈیاں لگائی جاتی ہے اور یہ جھنڈیاں اس بات کی یاد دلاتی ہیں کہ پنجاب کا حساب ایسا صاف اور عمدہ ہے کہ اس ۱۴ برس کے عرصہ میں کہیں کا حساب ایسا صاف نہ ہوا ہوگا۔ میرٹھ کا حساب سرسید کے زمانہ کانفرنس کا آخری حساب تھا، میرٹھ کا حساب اُن کی زندگی میں لوکل کمیٹی نے بھیجا اور نہ وہ مرتب ہوا۔ بعد اُن کی وفات کے میں نے کوشش کی خط پر خط بھیجے اور ادرب کچھ نتیجہ نکلا تو ایک خاص بلکار کو میرٹھ بھیجا۔ جب حساب تیار ہو کر آیا۔ چنانچہ جو حساب تیار ہو کر آیا ہے، وہ چھاپ دیا گیا۔ اس حساب کی نسبت میں صرف اسی قدر کہتا ہوں کہ اس کی ذمہ داری لوکل کمیٹی میرٹھ کے ذمہ ہے۔

سید صاحب کے انتقال کے بعد کانفرنس کے حسابات عسکری سکرٹری کو نہیں ملے مگر ۳۰-۳۱ مادی کا عرصہ ہوا کہ پچھلے کاغذات کانفرنس سکرٹری کو موصول ہوئے ہیں۔ اُن کاغذات کے دیکھنے اور پچھلو حسابات کو جانچنے سے صرف اس قدر پتہ چلا کہ دو ہزار نو سو اڑتیس روپے کانفرنس کلج کے نام لکھے ہیں پہلے یہ قاعدہ تھا کہ کانفرنس کا پس انداز روپیہ بوجہ کمی سرمایہ کے کلج کے کاموں میں صرف ہوتا تھا اور جب کانفرنس کو ضرورت ہوتی تو کلج کی آمدنی سے وہ روپیہ اُپس دیا جاتا۔ میں نے کلج کے نام کانفرنس کی یہ رقم دیکھ کر کلج کے برسر سے کیفیت باضابطہ طلب کی، چنانچہ برسر نے مجھے یہ لکھا کہ سید صاحب کی انتقال کے بعد جب کلج کی ذمگی قرضہ کا حساب لگایا گیا اس وقت کانفرنس کی یہ رقم بھی قرضہ میں شامل کر لی گئی تھی بعد ازاں سٹرک صاحب نے یہ طے کیا کہ چونکہ کوئی باضابطہ ثوب کلج کے کاغذ میں اس امر کا نہیں ملتا کہ یہ روپیہ کس مد کے واسطے دیا گیا اور کہاں خرچ ہوا اور نہ کلج کے کاغذات میں اس روپیہ کی آمد درج ہے لہذا یہ رقم قرضہ سے خارج کیجئے چنانچہ بوجہ تجویز سٹرک صاحب کے یہ رقم خارج کر دی گئی۔ ۱۸۔ دسمبر ۱۸۹۷ء کو جو جلسہ سنٹرل اسٹیڈنگ ٹیگ کمیٹی علیگڑھ کا ہوا میں نے اُس جلسہ میں اس معاملہ کو پیش کیا، چنانچہ جلسہ مذکور میں اس رقم کی نسبت بعد مباحثہ کے یہ طے پایا کہ یہ معاملہ سرسیدان کلج کے سامنے پیش کیا جائے۔ جو کچھ سٹرکی کلج کی اس رقم کے متعلق فیصلہ کریں گے، میں آئندہ اُس کی اطلاع آپ کو دوں گا۔

سید صاحب کی وفات کے بعد سے یعنی اپریل ۱۸۹۷ء سے کلکتہ کی کانفرنس کے بعد یعنی دسمبر ۱۸۹۷ء تک کلج جو آئری سکرٹری کی معرفت ہوا اُس کو اور جو لوکل کمیٹیوں لاہور اور کلکتہ کی معرفت ہوا اُس کے علیحدہ علیحدہ اردو اور انگریزی میں گوشوارے بنا کر پیش کر دئے اور ممبران موجودہ نے ہر ایک رقم کو قبول کیا۔

اور پاس کیا اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ کل خرچ اس فحاشی برس کے عرصے میں چار ہزار نو سو ۹۹ روپے سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی علیگڈھ کی معرفت ہوا ہے۔ چنانچہ تفصیل اُس کی ضمیمہ رپورٹ میں مندرج ہے۔

آمدنی کی کیفیت ہے کہ وہ دو طرح سے ہوتی ہے ایک وہ جو لوکل کمیٹیوں کی معرفت چند ممبری یا ڈونیشن وغیرہ کی بابت وصول ہوتی ہے۔ اُس آمدنی کی لوکل کمیٹیاں ذمہ دار ہیں اور جو تفصیل ناموں کی اور تعداد رقم وصول شدہ کی وہ کمیٹیاں بھیجتی ہیں وہ ضمیمہ میں درج کی جاتی ہے۔

دوسرے دفینس ممبری جو سکریٹری کے دفتر میں بھیجی جاتی ہے اُس کی ذمہ داری سکریٹری پر ہے اُس نے اُس کی طریقہ رکھا ہے کہ وہ روپیہ کتاب میں درج کر کے کلج کے برسر کے پاس بھیجا جاتا ہے اور باضابطہ رسید اُس کی لے لی جاتی ہے۔ اور جو روپیہ اخراجات کے لئے دفتر میں رکھ لیا جاتا ہے، اس کا علیحدہ رجسٹر رکھا گیا ہے، روپیہ بھیجنے والوں کے پاس رسید دینے سے سختی سے جاتی ہے میں تمام لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر کسی کو رسید نہ پہنچی ہو یا روپیہ کے پہنچنے میں کسی قسم کا شبہ ہو، تو مجھ سے دریافت کرنا چاہئے۔ جو انتظام میں نے کیا ہے وہ قابل اطمینان ہے۔ کیونکہ اُس میں کسی قسم کی غلطی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کل آمدنی کو معذرت استام دار تفصیل کے کس مکے لئے روپیہ آیا برسر کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ برسر اس کو اپنے رجسٹروں میں درج کرتا ہے۔

اور پروفیسر حکم دہی صاحب جو مشنیک صاحب کے مرنے پر کلج کے رجسٹر ارمقرر ہوئے ہیں وہ رجسٹروں کی نگرانی میری فرست سے مقابلہ کر کے ہر ایک مدی آمدنی کی کرتے ہیں۔ غرض کہ جو روپیہ آتا ہے وہ دو جگہ درج ہوتا ہے، ایک میرے دفتر میں اور دوسرے کلج کے دفتر میں چنانچہ جو انگریزی گوشوارے حساب کے میں نے سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی میں پیش کئے تھے اُن پر برسر اور رجسٹرار کی تصدیق اور دستخط بھی کرائے گئے تھے، اس کمیٹی میں نواب وقار الملک ہاؤس چیرمین تھے، انہوں نے مسٹر مارلیک اور مسٹر ٹینگ صاحب اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے تفصیل وار تمام گوشواروں کو جانچا اور تمام حساب کو پاس کر کے سکریٹری کے لئے ووٹ آف تھنکس پاس کیا۔

لوگوں کو اگرچہ کلج کے پچھلے نصاب کی وجہ سے چند دینے میں تاخیر ہو گیا ہے اور اب آنکھ بند کر کے روپیہ نہیں بھیجتے بلکہ چند دینے میں ہچکچاتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ عمدہ نشانی ہے قومی ترقی کی اور میں اس سے خوش ہوں کہ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ ہمارا روپیہ کہاں صرف ہوتا ہے اور وہ صرف جائز ہے یا نہیں اس کا نتیجہ ہوگا۔ جب حساب صاف ہوگا خرچ مناسب ہوگا۔ کافی نگرانی ہوگی اور کسی طرح روپے کے ضلک جانے کا اندیشہ باقی نہ رہے گا تو پھر دل کھول کر روپیہ دینگے۔

میں کہ چکا ہوں کہ کافر نس کا سرمایہ پبلک مینی ہے لہذا پبلک مینی کی حفاظت بھی پبلک پر فرض ہے، اور اگر پبلک اپنے روپے کی حفاظت نہ کرے، تو سمجھنا چاہئے کہ وہ غافل ہے، بڑا پروا ہے، اور کوئی امید اس کے سمجھنے کی نہیں ہے۔ ہاں اگر پبلک اپنے سرمایہ کی حفاظت کرے پبلک کے سرمایہ کو ہر شخص اپنا ذاتی سرمایہ سمجھے، اور اس کی حفاظت کا مثل اپنے سرمایہ کے خیال کرے، اور اس کے تلف و برباد ہونے کا مثل اپنے روپیہ کے برباد ہونے کے صدہ و ملال ہو، تو سمجھنا چاہئے کہ اب پبلک بیدار ہے، اور ضرور ترقی کرے گی۔ غرضیکہ پبلک مینی کی حفاظت کا خیال آئندہ ترقی کی عمدہ مثال ہے، کافر نس میں جو صاحب تشریف لاتے ہیں، ملازمان سرکاری کو یہ مانہ تعطیل کا ہوتا ہے، وہ اپنے وطن کو نہیں جاتے، عزیز و اقارب کی ملاقات کو چھوڑتے ہیں۔ جو سرکاری ملازم نہیں ہیں۔ وہ اپنے کاروبار کو چھوڑ کر آتے ہیں۔ ممکن تھا کہ وہ اس ہفتہ میں مل اور لوگوں کے اس ہفتہ میں اپنے دوسرے کاروبار کرتے، اور اپنے دوست و احباب سے ملتے لیکن سب کو چھوڑ کر یہ کافر نس میں آئے۔ بہت سے اُن کے عزیزوں نے خط بھیجے ہو گئے کہ اس ہفتہ میں اگر ہم سے مل جاؤ، لیکن اُنہوں نے نہ کسی عزیز کا پاس کیا، اور نہ دوست کا، لیکن انہیں قومی شوق اس قدر غالب آ گیا ہے کہ سب تعلقات کو خیر باد کہہ کر یہ قوم کی خاطر کافر نس میں آتے ہیں۔ اگر کہا جاتا ہے کہ مسلمان بالکل نکمے ہو گئے، مسلمان کچھ نہیں کرتے، مسلمان مر گئے، لیکن باریک دریاقت کرتا ہوں کہ اتنی صورتیں جو یہاں نظر آتی ہیں، کیا زندہ صورتیں نہیں ہیں؟ کیا یہ مرد قہر سے اٹھ کر آگئے ہیں؟ میں پکار کر کہتا ہوں کہ جن کو زندہ مسلمانوں کو دکھانا ہو، وہ یہاں آئیں اور ان زندہ دل کو دیکھیں۔ یہی ہیں زندہ مثالیں جن کے قومی شوق نے شخصی ضرورتوں کو مغلوب کر دیا ہے، یہی ہیں وہ پاک صورتیں جنہوں نے شخصی حاجتوں کو قومی حاجتوں کے مقابلہ میں پامال کر دیا ہے، تو ایسی حالتوں میں جب کہ وہ اپنی ضرورتوں کو مغلوب کر کے تکلیف سفر کو ادا کرتے ہیں۔ اور نہ صرف تکلیف اٹھاتے ہیں، بلکہ روپیہ بھی صرف کرتے ہیں۔ ہم بظاہر تو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے صرف ہر روپیہ بھری کی فیس کے دئے ہیں اور کچھ نہیں دیا، لیکن جو لوگ دور دراز کا سفر کر کے آتے ہیں، کس قدر روپیہ ہر شخص کا بقدر حیثیت کے بیل کے کرایہ میں صرف ہوتا ہے، اور کتنا ہسٹریا اور خرچ ہو جاتا ہے۔ یہ سب روپیہ وہ قوم کو دیتے ہیں، اور یہ سب ملائیں قوم کی بیداری کی ہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ قوم جو غفلت کی نیند سوتی تھی، اب بیدار ہو گئی ہے۔ آنکھیں کھل گئی ہیں، بعض نیم بیدار ہوئے ہیں اور اٹھنے کے لئے اٹھ اٹھائیں لے رہے ہیں، بعض اٹھ بیٹھے ہیں اور قوم کی ترقی کے لئے کوشش کر رہے ہیں، اس میں زندہ دلاں پنجاب سب سے زیادہ مستعد اور سرگرم ہیں اسی واسطے میں ہر سید کے زمانہ میں ہمیشہ اُن سے اس سلسلہ میں اختلاف کرتا رہا، جب کہ وہ درودل سے پنجاب

ہوتے، اور قوم کو مردہ کہتے ہیں۔ ہمیشہ اُن کے جواب میں یہ ہی کہتا رہا کہ نہیں مسلمان زندہ ہیں۔ اُن میں زندہ دلی موجود ہے، صرف غافل سو رہے ہیں، جب بیدار ہونگے تو اپنی زندہ دلی کا عملی ثبوت دینگے، خدا کے فضل سے بہت سے سوتے ہوئے بیدار ہو گئے ہیں اور اپنے دوسرے سوتے ہوئے بھائیوں کو جگا رہے ہیں *

حضرات! میں مسلمانوں کے بیدار ہو جانے کی نظیر میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ جب کانفرنس کی شرکت کے اطلاعی خطوط جاری کئے گئے، تو میرٹھ سے میرے پاس ایک معمولی اہلکار کا خط آیا اور نہایت جوش کے ساتھ لکھا کہ ہم آئندہ چندہ نہ دینگے، کیونکہ مذمیمہ شائع ہوتا ہے اور نہ اس بات کا حال معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ممبری کا چندہ جمع ہو یا نہیں اور وہ روپیہ کہاں خرچ ہوتا ہے کیونکہ لاہور کی کانفرنس کے ممبروں کی فرست اس وقت تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ کانفرنس کی بات قابل اعتبار کے نہیں رہی ہے *

اس پُر جوش خط کو دیکھ کر اگرچہ بوجہ بشریت مجھے غصہ آتا تو کچھ ناداجب تھا۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے مطلق بیخظنا گوارا نہیں ہوا، بلکہ میں اس خط کو دیکھ کر بہت خوش ہوا، اور میں نے اُس کو قومی ترقی کے لئے نہایت نیک فال سمجھا، اور اُس کے خط کے جواب میں میں نے اُن کو کھحا کہ آفرین ہے تم پر تم نے وہ کام کیا ہے، جو ہر ایک مسلمان کو اور بالخصوص ہر ایک کانفرنس کے ممبر کو کرنا چاہئے۔ اب میں تم کو لاہور کے ممبروں کا ضمیمہ بھیجتا ہوں اس میں دیکھ لو کہ تمہارے نام کے پانچ روپے چندہ کے درج ہیں۔ چنانچہ ضمیمہ پہنچنے پر انہوں نے فوراً صر روپیہ ممبری کے چندہ کے لئے بھیج دئے *

جو لوگ اپنا پیسٹ کاٹ کر چندہ کا روپیہ دیتے ہیں اور اپنی ضرورتوں پر قوم کی ضرورتوں کو مقدم سمجھتے ہیں، اُن کا یہ بھی فرض ہے کہ یہ دیکھیں کہ روپیہ جمع ہوا یا نہیں، اور نہ صرف دیکھنا چاہئے، بلکہ بڑا دیکھنا اس بات کا ہے کہ جو روپیہ خرچ ہوا، وہ واجب طور سے خرچ ہوا یا ناداجب طور سے اگر کسی ممبر کو کوئی خرچ ناداجب معلوم ہو تو یہ لازم ہے کہ بحیثیت ممبر کے مجھے اطلاع دے۔ میں جوہ بتاؤں گا۔ اگر میری تحریر سے بھی تشفی اور اطمینان نہ ہو، تو باضابطہ سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کو اطلاع دے، ممبران اسٹینڈنگ کمیٹی اُس پر کافی غور کریں گے، اور باضابطہ اُس کے متعلق تجویز کریں گے کہ روپیہ واجب خرچ ہوا یا ناداجب، آپ کا یہ بھی فرض ہے کہ کفایت شعاری سے روپیہ خرچ ہونے کی سائے میں *

اگرچہ حساب کے متعلق آپ کو میرے بیان سے تشفی ہو گئی ہوگی۔ تاہم میں نے اپنے دو پنجابی دوستوں کو حسابات مرتب شدہ دکھائے ہیں، انہوں نے بھی تمام حسابات کو اچھی طرح جانچا ہے، انہوں نے جو حالت حساب کی دیکھی ہے اُس کی نسبت آپ سے بیان کریں گے۔ اُن میں ایک سو لوی توڑ احمد صاحب ہیں۔ مولانا ذرا اسٹیج پر تشریف لائے، اور جو کچھ رائے آپ نے قائم کی ہے اُسے بیان کیجئے۔

مولوی نور احمد صاحب اسٹیج پرنٹریف نے گئے، اور بیان کیا کہ ”میں نے آج کانفرنس کے تمام حسابات آمد و خرچ کو بنور دیکھا، اور اپنے دوست مرزا سجاد حسین صاحب بی۔ اے پلیڈر کو ساتھ لیتا گیا کیونکہ انہوں نے حسابات کے متعلق اعتراض کیا تھا، اور میں اُن کو ٹھیک جواب دے سکا تھا۔ چنانچہ میں نے حسابات کو دیکھا تمام حساب درست اور صاف ہیں اور بہت صاف ہیں۔ سرسید کی وفات کے بعد کے حسابات نواب صاحب نے دکھائے۔ میں انگریزی نہیں جانتا۔ لہذا انگریزی میں جو حساب تیار ہوا تھا اُس کی نسبت کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ لیکن اردو کے حساب میں کوئی نقص نہیں ہے۔

حضرات! سرسید ہم کو مردہ کہتے تھے اور نواب صاحب زندہ بتاتے ہیں لیکن فی الواقع ہم زندوں اور مردوں کے درمیان ہیں کیونکہ جن لوکل کمیٹیوں کے حساب صاف آئے اُن کے متعلق سیکرٹری کے دفتر میں بھی حساب صاف موجود ہے اور جس لوکل کمیٹی کے حساب صاف نہ آئے اُن کا حساب صاف نہیں ہے اور اُس کے متعلق نہ اسٹیٹمنٹنگ کمیٹی کا قصور ہے اور نہ نواب صاحب کا، بلکہ قصور ہے خود ہمارا کہ ہم حساب صاف تیار کر کے سنٹرل اسٹیٹمنٹنگ کمیٹی کے پاس نہ بھیجیں۔ چنانچہ حساب کی طرف سے میرے دوست مرزا سجاد حسین صاحب کا بھی اطمینان ہو گیا۔

(جب مولوی نور احمد صاحب بیان کر چکے، تو آنریری سکرٹری نے پھر اپنی تقریر کو شروع کیا) حساب کے معاملہ کے علاوہ دوسرا امر رپورٹ کے بذیشان ہونے کا ہے۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہو گا کہ صاحب کے زمانہ میں رپورٹ کے دیر میں شائع ہونے پر میں ہمیشہ اعتراض کیا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ دیر میں رپورٹ شائع ہونے سے کانفرنس کے مقاصد کے ساتھ دلچسپی کم ہو جاتی ہے اگر فوراً رپورٹ شائع ہو تو دلچسپی میں ترقی ہو، اور رپورٹ کے دیر میں شائع ہونے سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی کم ہو لیکن سچ ہے کہ بڑے بول کا سر نہ بچا، خدا بڑا بول نہ بولا۔ سرسید کے زمانہ میں آگست تک رپورٹ شائع ہو جاتی تھی، لیکن میرے سیکرٹری ہونے کے زمانہ میں پہلی رپورٹ لاہور کے اجلاس کی ستمبر میں شائع ہوئی، جس کی وجہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں معاملات کالج میں پیچیدہ گیاں پڑی ہوئی تھیں اُن سے فرصت نہ ملی بیک صاحب کا انتقال ہوا اور چونکہ سرسید صاحب کے انتقال کے بعد جو اندیشہ کالج کی طرف سے ہو گیا تھا صرف بیک صاحب کی ہمت اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ کالج کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا۔ غرض کہ مجھے فرصت نہ ملی کہ رپورٹ کی تیاری کا انتظام کرتا، جب دھجکڑے طے ہوئے تو میں نے چاہا کہ رپورٹ مکمل تیار ہو، چونکہ لاہور کے اجلاس میں سب سے زیادہ ضروری مسئلہ محمدن یونیورسٹی کا پیش ہوا تھا اور اُس پر نہایت عالمانہ لیکچر ہوئے تھے، جو اسپیشل تعلق تعلیم و نبات دی گئی تھیں وہ دلی جو شہ سے تھیں اور فریقین نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنے دلائل کو پیش کیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ بنور کے متعلق تمام تحریروں اور کل اسپیشل مجسٹریٹ شائع کی جاویں چنانچہ میں نے سب صاحبوں کے پاس تاکید کی

بیچھے خوشامد کی، اور جس طرح بن پڑا بہت سی تحریریں منگائیں۔ گو مجھے افسوس ہے کہ میری نیتا اور میری خواہش کے موافق کل اسپیشیوں موصول نہ ہوئیں تاہم بہت سی مزدوری تحریریں اور بعض اسپیشیوں میں وہ سب رپورٹ میں درج کر دی گئیں۔ اس رپورٹ کے مکمل شائع ہونے کا میں اس وجہ سے خوشامند تھا کہ جب کبھی ہناری یونیورسٹی بنے، تو ان خیالات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ جو کچھ شائع ہو گیا ہے وہ آئندہ کارروائی کرنے کا ایک نہایت عمدہ ذخیرہ ہو گیا ہے۔ ان کا انصراف سامعین تک محدود نہ رہے بلکہ جس وقت یونیورسٹی بنیگی اس وقت یہ عالمانہ تحریریں نہایت مدد دینگی۔

کلکتہ کی رپورٹ جلد شائع ہونے کی نسبت سوائے اس کے کچھ نہیں کہ سکتا کہ کلکتہ کے ہلاس میں بہت سے عمدہ مسائل پر بحثیں ہوئیں۔ فصیح و بلیغ اسپیشیوں ہوئیں محققانہ لیکچر دئے گئے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ پوری کیفیت شائع ہو اور تمام اسپیشیوں اور تقریریں اس قابل تھیں کہ ان کا کچھ حصہ بھی شائع ہونے سے باقی نہ رہے۔ میں نے ہر چند کوشش کی، خطوط بھیجے، لیکن افسوس ہے کہ مجھے کامیابی نہ ہوئی چار پانچ بار تاکیدیں خط بھیجے گئے، لیکن بے سود۔ کسی مقرر نے ایک اسپیشی بھی نہ بھیجی، بد قسمتی سے ہمارے یہاں شارٹ ہریڈ لکھنے کا قاعدہ نہیں ہے۔ اسپیکر جو زبانی اسپیشی دیتے ہیں جلد ہی میں لپٹا کرتے چلے جاتے ہیں، تیز دست سے تیز دست بھی پوری اسپیشی نہیں لکھ سکتا۔ ہماری رپورٹ کے جلد اور بھلے شائع نہ ہونے کی، سوائے اس کے کوئی تدبیر نہیں ہے کہ اسپیکر خود اپنی اسپیشی لکھ کر بھیجیں لیکن ہوشیہ اس معاملہ پر عمروں کو متوجہ کیا گیا، وہ اسپیشی لکھ کر لا دیں ورنہ بعد میں بھیج دیا کریں۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ غرض کہ یہ وجہ تھے کہ کلکتہ کی رپورٹ جلد مرتب ہوئی، مولوی عبدالحکیم صاحب نے جو ضروری لیکچر مسلمانانہ منگال کی تعلیمی حالت پر بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ وہ انہوں نے بھیج دیا اس کا اور جسٹس سید امیر علی صاحب سی۔ آئی۔ اے کے عالمانہ ایڈریس کا اردو ترجمہ رپورٹ میں شائع کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ جو کچھ رپورٹ میں چھاپا گیا ہے وہ اس مہمانی کا نتیجہ ہے کہ شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے ایڈیٹر پنجاب آبرو رور نے جو کچھ حالات اپنے اخبار میں لکھے تھے ان کا ترجمہ کر کے رپورٹ میں درج کیا گیا۔ سوائے اس کے کوئی صورت رپورٹ کے تیار ہونے کی نہ تھی۔ جب اس قسم کی مجبوری پیش آئی تو ۱۸۔ دسمبر کے اجلاس سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی میں جس میں صاحبانہ آفتاب احمد خاں اور سٹار لین صاحب وغیرہ موجود تھے، میں نے اس معاملہ کو پیش کیا کہ کیا علاج ہو جو رپورٹ جلد اور مکمل شائع ہو اگر موجودہ صورت رہی تو ہمیشہ رپورٹ دیر سے نکلے گی اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس طرح کا نفرنس کی اعلیٰ اسپیشیوں پر بار ہوں اور جب رپورٹ سال بھر کے بعد نکلتی تو تقویم پارینہ سے زیادہ با وقعت نہیں ہو سکتی تاہم جوش ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تمام حالات گذشتہ پر غور کرنے کے بعد کمیٹی نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ محاصل لگ اس کے فائدہ وار قرار دئے جائیں، مگر یہ اس کے لئے منظور کئے جائیں۔

اب میں نہایت خوشی کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ سب صاحبان اپنی اسپیشل لکچر خود دیدیں تاکہ وہ ان کے منشاء کے موافق درج رپورٹ ہوں ورنہ کانفرنس کے رپورٹرز جوٹ لینگے، ان سب کو کھجا کر کے میں خود دیکھوں گا، اور اس کے بعد رپورٹ شائع کر دی جاوے گی اور اب مجھ کو امید ہے کہ مارچ میں رپورٹ مرتب ہو جاوے گی۔ غرض کہ یہ دو ضروری باتیں تھیں جو ضعیف نہ تھیں ان کی حقیقت واقعی میں نے بیان کر دی۔ امید ہے کہ سب صاحب اسے عذر گناہ بدتر از گناہ نہ سمجھیں گے۔

حضرات! آپ جس قدر صاحب تشریف لائے ہیں میں اعتراف کرتا ہوں کہ آپ سب صاحب دل سے قومی ترقی چاہتے ہیں، اور یہ کانفرنس جو چودہ برس سے جاری ہے، وہ ہی ذریعہ ہے قومی بھلائی اور قومی ترقی کا۔ کانفرنس کی اصلی غرض ہے قومی تعلیم، خواہ تعلیم شرقی علوم کی ہو یا مغربی علوم کی۔ بس قومی تعلیم کے متعلق ایک شخص کی رائے پر خواہ وہ کیسا ہی عقلمند کیوں نہ ہو عمل نہیں ہو سکتا۔ جو شخص جس قدر زیادہ تجربہ کار ہوگا، اس کی رائے سے زیادہ نفع قومی تعلیم کو پہنچے گا، جس شخص نے جس قدر زیادہ اس مسئلہ پر غور کیا ہوگا، اسی قدر وہ زیادہ صائب رائے دیگا۔ ہم سب کو اعتراف ہے کہ سید صاحب سے زیادہ کوئی دوسرا شخص عالی دماغ اور تجربہ کار نہیں ہے اگر ہم سب کی دماغی قوتیں جمع کی جائیں تو بھی سید صاحب کی دماغی قوت کے برابر نہیں ہو سکتیں، لیکن خود سید صاحب نے یہ تجویز کیا کہ قومی تعلیم کو صرف اکیلی میری رائے پر منحصر رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ لہذا انہوں نے یہ کانفرنس قائم کی، تاکہ مدراس، بنگال، اور پنجاب، کے سب مسلمان آویں، اور قومی تعلیم کے مسئلہ میں غور کریں۔ انہوں نے اس کانفرنس میں سب مسلمانوں سے کہا کہ اے مسلمان بھائیو! آؤ اور قومی تعلیم اور قومی ترقی کے مسئلہ میں مشورہ دو۔ اور جو کچھ بعد مشورے کے قرار پائے اس پر عمل کرو لیکن تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اب تو یہ جلسہ فاتحہ خوانی کا جلسہ ہو گیا ہے۔ آپ خیال کیجئے کہ اس تمام دوسری اور مصیبت اٹھانے کے بعد تجویز کیا ہوا ہے۔ صرف یہ ہوا کہ رزلویشن پر رزلویشن پاس ہوتے ہیں چنانچہ ۱۲ رزلویشن پاس ہو چکے، لیکن عملی کام کچھ نہیں ہوتا۔ ابتدائی سالوں میں تو مفید باتیں کانفرنس میں پیش ہوئی تھیں جس میں مختلف اضلاع کے مسلمانوں کی تعلیم، صنعت، تجارت، علم الاعداد سے دکھائی جاتی تھی، اور اس ضلع کی دوسری اقوام سے مقابلہ کیا جاتا تھا۔ اور یہ قرار پایا تھا کہ ہر ضلع کی رپورٹ دو سال کے بعد پیش ہو کرے، تاکہ پچھلی رپورٹ سے مقابلہ ہو سکے کہ کیا فرق بہ اعتبار ترقی یا منزل کے مسلمانوں کی حالت میں ہوا، چنانچہ ۳ سال تک رپورٹیں پیش نہیں اگر سلسلہ برابر جاری رہتا تو نہایت عمدہ ذخیرہ ہر پیشہ کے مسلمانوں کی حالت اور ان کی تعلیم کا معلوم ہوتا اور کانفرنس کو موقع ملتا کہ وہ مسلمانوں کی حالت علم الاعداد سے مسلمانوں کو دکھا دیتی، ان جہاں جیسی

ضرورت ہوتی اصلاح کی تدبیر کرتی لیکن جب سے فصاحت و بلاغت اور شعر و شاعری کا چرچا کانفرنس میں شروع ہوا، یہ قصیدہ اور کار آمد سلسلہ رپورٹیں پیش ہونے کا ترک ہو گیا۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ سوائے قصیدہ خوانی اور مرثیہ گوئی کے کچھ نہ ہوتا تھا، چنانچہ سرسید کے آخر زمانہ کے جلسوں میں یہ کیفیت ہوئی کہ کانفرنس مجلس مشاعرہ ہو گئی تھی، لوگ قصیدے اور نظمیں اس کثرت سے لکھ کر لاتے کہ پروگرام میں ان سب کے لئے وقت بکان مشکل ہو گیا تھا، جس کا نام پروگرام میں درج نہ ہوتا وہ ہی روٹھتا کہ وہ صاحب ہم کو بلاتے اور بلا کر ذلیل کرتے ہو، اگر وہی حالت قائم رہتی تو اس کانفرنس سے بدتر کوئی مجلس نہ ہوتی، کیونکہ قصیدوں اور غزلوں کی بھرمار تھی۔ کوئی کتنا کہ قریبہ و غناط کی یہ کیفیت تھی، مسلمانوں نے ایسی ترقی کی تھی، کوئی کہتا ہے کہ اے مسلمان اب ایسے ہیں۔ غرض کہ نظمیں اور قصیدے ہوتے یا لیکچر اور اسپچیں ہوتیں۔ یہ حالت دیکھ کر مسٹریک نے خیال کیا کہ اس طرح مختلف مسلمانوں کا جمع ہونا اور کسی کام کی بات کا نہ ہونا ٹھیک نہیں ہے، لہذا دوسرے کے اجلاس مناسب ہیں۔ ایک عام اجلاس اور دوسرا خاص اجلاس۔ عام اجلاس میں لیکچر ہوں، اسپچیں ہوں، یا ریلیشن پاس ہوں۔ اور خاص اجلاس میں عملی تجاویز پر غور ہو۔ عملی کام کرنے کو چند سیکشن مقرر کئے گئے۔ ایک اسکول سیکشن، دوسرے تعلیم نسواں کا سیکشن، اور تیسرا مسلمان بچوں کی مردم شماری کا، تاکہ جس شخص جس سیکشن سے دلچسپی ہو وہ اس میں شریک ہو۔ سینئر کام مسٹریک نے خود تجویز کیا، اور انہیں اس کام سے اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ مسلمانوں کی معرفت اور زیادہ تر اپنے طالب علموں کی معرفت ہر مقام کی مردم شماری کراتے۔ چنانچہ انہوں نے بہت سے ایسے شریف مسلمان بچوں کے والدین کے نام جمع کر لئے تھے جو بوجہ افلاس یا غفلت خواہ تعصب کے اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم نہیں دیتے وہ ان کے پاس خط بھیجتے، اور ان کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کرتے رہتے، اور سینئر کے سیکشن میں سال کی کارروائی کا نتیجہ پیش ہوتا، لیکن مسٹریک کے مرنے کے بعد یہ کام بھی بند ہو گیا، حالانکہ یہ نہایت مفید کام تھا۔ اس سے ہر مقام کے بچوں کی تعلیمی حالت سے واقفیت ہوتی تھی، اس ذریعہ سے موقع ملتا تھا کہ کانفرنس کے اجلاس خود جاکر تحریض ترغیب لادیں +

اے حضرات! یہ قومی کام ایک شخص کا کام نہیں ہے، بلکہ تمام قوم کے کرنے کا ہے، ہر شخص کو غور کرنا اور سوچنا چاہئے کہ کیا تدبیر اختیار کی جاوے تاکہ اس کانفرنس میں عملی کام ہوں۔ اس نام پر کے اجلاس میں قیصلہ کر دو کہ یا تو عملی کام ہوں ورنہ اس جلسہ کو بند کر دیا جاوے۔ چونکہ بوجہ رمضان شریف کے صرف ایک اجلاس پانچ گھنٹہ کا ہوا کرے گا۔ لہذا باقی وقت میں غور کرنا موقع کافی ملے گا۔ بعض اصحاب جب گھر سے آتے ہیں، تو قومی بھلائی کے خیال میں لیکر آتے ہیں۔ لیکن جب کانفرنس سے واپس جاتے ہیں تو جوں کے توں ان خیالات کو بھی واپس لیجاتے ہیں اور ان کو

کوئی موقعہ جلسہ میں اُن کے پیش کرنے کا نہیں ملتا۔ پس میں سب صاحبوں سے عرض کرتا ہوں، اور عام اطلاع دیتا ہوں، کہ جن حضرات کو کوئی صلاح دینی ہو، یا مشورہ کرنا ہو، وہ آج شام کو میرے کمرے پر تشریف لادیں، اور اپنے خیالات سے مطلع کریں، وہ وقت مخصوص ہوگا صرف اُن صاحبوں کے لئے جو کوئی رائے دینا یا تجویز پیش کرنا چاہیں گے، تاکہ عملی کام ہوں، یا تو رام پور کی کانفرنس کو آخری کانفرنس خیال کیا جائے ورنہ عملی کام ہوں +

حضرات! اب تو شرم آتی ہے کہ رزولوشن پاس ہوتے ہیں، لیکن جو عملی مقصد ہے وہ تو ہوتا ہے ۱۴ برس سے محنت اٹھا رہے ہیں، قوم کا رویہ صرف ہورٹا ہے، لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا اگر ایک ایک شہر میں ایک ایک آدمی بھی عملی کام کا خیال رکھے اور اسی دھن میں مصروف رہے تو وہ شخص اُس شہر میں خیر کا کام دیگا +

حضرات! میں آپ سے زیادہ اسٹینڈنگ کمیٹی کو لازم دیتا ہوں جو گیارہ مہینے سوئی ہوئے ایک مہینہ کام کرتی ہے۔ رام لیلہ میں گوم کرن چھ مہینے سوتا اور چھ مہینے جاگتا ہے، لیکن ہمارے ممبر تو گوم کرن سے بھی بڑھ گئے جو گیارہ مہینے سوتے ہیں۔ سب سے زیادہ ملزم میں خود ہوں ۱۰ مہینے تو غافل رہا، اور جب نومبر کا مہینہ آیا، تو اشتہاروں اور خطوط کی بھرمار شروع کر دی۔ لیکن اے حضرات میں کلج کا سکرٹری ہوں کلج کا کام میرے ذمہ، میموریل فنڈ کا کام میرے ذمہ، کانفرنس کا کام میرے ذمہ، ایسی حالت میں ایک شخص تمام کاموں کو کیونکر یہ خوش سلوٹی انجام دے سکتا ہے۔ کوئی مدد کا دینے والا نہیں ہاں مرزا عابد علی بیگ صاحب قومی کام سمجھ کر کلج کے کاموں میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن اب یہ انتظام کیا گیا ہے کہ برابر خط و کتابت جاری رہے تاکہ ترغیب تحریص کا سلسلہ برابر جاری رہے۔ آپ لوکل کمیٹیاں قائم کریں، لوگوں کو کانفرنس اور محمدن یونیورسٹی کے فوائد بتادیں۔ جو تجاویز سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے دفتر سے جاری ہوں۔ اُن کے موافق کام کریں، برابر خط و کتابت جاری رکھیں سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کا کام ہے لوکل کمیٹیوں سے خط و کتابت رکھنا اور لوکل کمیٹیوں کا فرض ہے اپنے مقام پر کام کو جاری رکھنا اور ہر ایک نتیجہ سے سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کو اطلاع دینا۔ جیسا اس طرح برابر کام جاری رہے تو نتیجہ نکل سکتا ہے۔ ورنہ اب تک تو اسٹینڈنگ کمیٹی اور ممبران کانفرنس دونوں قصور واریں، نہ اسٹینڈنگ کمیٹی نے ممبروں سے تحریک کی، اور نہ ممبروں نے عام مسلمانوں سے۔ گھڑی جی چلتی ہے اور کام دیتی ہے جب روزانہ کوئی کام ہے +

اے حضرات! جب محمدن یونیورسٹی کا نام لیا ہے، تو جس طرح جنے قائم کر کے چھوڑے، دس لاکھ سرمایہ تجویز ہوا، لیکن کیسے شرم کی بات ہے کہ تمام ہندوستان سے اس ڈھائی برس کے عرصہ میں صرف سوا لاکھ وصول ہوا ہے۔ اس سوا لاکھ میں ۲۵ ہزار ریاست رام پور کا ہے حالانکہ ۳ لاکھ سے

زیادہ کے وعدے ہوئے، لیکن وصول نہیں ہوتا۔ ہماری قوم میں عام دستور ہو گیا ہے کہ چندہ کے وعدہ کو یہ سمجھ رکھا ہے کہ چندہ کا وعدہ وہ ہے جو کبھی وفادہ ہو۔ خط پر خط بھیجے جاتے ہیں، تاکید ہوتی ہے، لیکن وعدہ وفا نہیں ہوتا۔ ایسے زبانی وعدوں کا نتیجہ، بجائے فائدہ کے باعث نقصان ہے کیونکہ ملک کا غنیمتیں روپیہ صرف ہوتا ہے کام زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اسکا رشپ کے لئے نو ہزار روپیہ کے وعدے ہوئے۔ اس میں ۳ ہزار محمدن کلچر علیگڑھ کے لئے اور پانچ سو انجمن حمایت اسلام لاہور کے کلچر کے لئے وصول ہوئے۔ دوسرے سال اتنا بھی نہ ہو سکا۔ ایک صاحب کو جب تقاضے کے خطوط بھیجے گئے تو انہوں نے جواب دیا، کہ بیشک میں نے اسکا رشپ کے چندہ کا وعدہ کیا ہے لیکن آپ فرض حسنہ دیکھ میری طرف سے جمع کر دیجئے میں صدر روپیہ ہوارا داکر تار ہو گیا۔

وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں چندہ دینے والوں کی تعداد کم ہے اور ہر ایک قومی کام کے لئے اسی محدود جماعت سے چندہ کی درخواست کی جاتی ہے۔ پس ضرور ہے کہ وصول چندہ کا طریقہ تبدیل کیا جائے تاکہ قوم کے ہر شخص سے تھوڑا بہت برابر وصول ہوتا رہے ورنہ اگر موجودہ طریقہ قائم رہا اور کوئی اور تجویز نہ سوچی گئی، تو نہ کانفرنس کو کوئی عملی کام کر سکتی ہے نہ اسکا رشپ کے لئے روپیہ جمع ہو سکتا ہے، نہ محمدن یونیورسٹی قائم ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک انجمن حمایت اسلام لاہور کا طریقہ نہایت عمدہ ہے، اس کے کام کرنے والے معمولی غریب آدمی ہیں، نہ ان کے ناموں کے ساتھ بلے جوڑے خطابوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، نہ ان کی کارروائیوں میں ظاہری ٹیم و ٹام و شان شوکت ہے، وہ غریبوں سے تھوڑا تھوڑا چندہ لیتے ہیں۔ ان کے یہاں کی جو روٹاؤں شائع ہوتی ہے وہ بھی اونے کا غنیمت ہوئی بر خلاف اس کے کانفرنس کی روٹاؤں اعلیٰ درجہ کے کانڈر نہایت عمدہ چھپوائی جاتی ہے، زیادہ صرف ہوتا ہے۔ خط و کتابت میں اعلیٰ درجہ کا کاغذ عمدہ لفافے کام میں لائے جاتے ہیں۔ خوش قسمتی تھی کہ کلچر قائم رہا، ورنہ جب سرسید کا انتقال ہوا ہے۔ تو ڈیڑھ لاکھ کا غنیمت ہو جانے کی وجہ سے بنک کا قرضہ ہو گیا تھا، جس کا سو و دینا پڑتا تھا، علاوہ انہیں تعمیر کے متعلق سماروں اور مزدوروں کا قرضہ چلا آتا تھا، اس پر مصیبت پیش آئی کہ باہمی جھگڑے شروع ہو گئے۔ ان جھگڑوں نے جلد ہی آگ میں تیل کا کام دیا، جس کی وجہ سے کلچر کی بے اعتباری ہو گئی کلچر کے طلبہ کی تعداد گھٹ کر ۲۲۷ رہ گئی۔ لیکن بعد سرسید مرحوم کے جس نے کلچر کو قائم رکھا وہ مسٹر یک تھا، حقیقت سرسید کے بعد سب سے زیادہ شکرگزارنی کے مستحق مسٹر یک ہیں ورنہ میں نے تو ۳ دن بعد سرسید کے مرنے کے کہہ دیا تھا کہ مجھ سے یہ حالت نہیں دیکھی جاتی، میں علیگڑھ سے جاتا ہوں۔ اس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد کے دماغ سے نکلا کہ سرسید کی یادگار میں محمدن یونیورسٹی قائم کی جائے، اور مسٹر یک نے اسے نشوونما دیا اور دونوں صلاح کر کے میرے پاس آئے

اور اس خیال کو مجھ سے ظاہر کر کے یہ کہا کہ تم اس کمیٹی کے صدر بنیں بنو۔ مجھے یہ تجویز سن کر تعجب ہوا کہ یہاں کالج قائم رہنے کے لئے پڑے ہیں، اور یہ محدث دیونیورسٹی بنانے کی تجویز کر رہے ہیں میں نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ کیسے شیعہ چلی کی سی باتیں کرتے ہو، کچھ جنون تو نہیں ہو گیا۔ سر سید کو زمانہ موافق آیا، انہوں نے اور ان کے دوستوں نے ۳۰ برس لگاتار کوشش کی اور سات لاکھ سے زیادہ نہ وصول کر سکے تم کو دس لاکھ ایسے نازک وقت میں کس طرح ملجائیگا

اس خیال است و محال است جنوں

میرے نزدیک یہ تجویز کسی طرح چلنے والی نہیں ہے اور مجھے ایک لاکھ روپیہ ملنے کی امید نہیں لہذا میں تو اس تجویز میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہوتا۔ ہر چند میں نے انکار کیا لیکن انہوں نے ایک باتا، اور یہی کہا کہ اگر تم انکار کرو گے، اور ہمارے ساتھ شریک ہو کر کام نہ کرو گے تو کالج کو جس نقصان پہنچے گا، خدا کے یہاں تم پر اس کا عذاب ہوگا، اور اس کا وبال تم پر پڑے گا۔ ایسے وقت میں کالج کی خدمت، تمہیں نہیں بلکہ قوم کی خدمت کرنا تم پر فرض ہے۔ غرض کہ میرا علیحدہ حصہ نہیں رہتا صرف شریک کے اصرار کی وجہ سے ہوا، انہیں کے اصرار سے میں نے میویریل فنڈ کا پریسیڈنٹ ہونا قبول کیا۔ سر سید کی یادگار میں اگر کوئی مال کالج میں بچتا، تو ہم لوگ خوش ہو جاتے، لیکن اس تجویز کا نتیجہ ہوا کہ سو لاکھ روپیہ وصول ہو گیا جس سے بنک کا سودی قرضہ ادا ہوا۔ متفرق قرضہ جو تعمیر کے متعلق تھا وہ دیا گیا۔ ڈینچر کار روپیہ واپس دیا، غرض کہ ۵ ہزار روپیہ ادا ہو کر اس وقت ۸۰ ہزار روپیہ موجود ہے جس کے پرائمری ٹوٹ خرید لئے گئے۔

کالج کے متعلق دو باتوں کی شکایت تھی ایک تو یہ کہ تمام کام یورپین اسٹاف کے ہاتھ میں چلا گئے خود سکریٹری وغیرہ کو کسی قسم کا اختیار نہیں ہے۔ لیکن ہمارے کالج کا یورپین اسٹاف ایسا عمدہ اور مسلمانوں کا ہمدرد ہے کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ مشٹرا بین صاحب کا حال آپ لوگ جانتے ہونگے اس نیک بخت شخص نے باوجودیکہ بوجہ علالت اپنی بیم صاحبہ کے کالج چھوڑ دینے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا، استعفا بھی ولایت سے بھیج دیا تھا، دوسری جگہ معقول ملازمت بھی مل گئی تھی، جہاں بہت زیادہ ترقی کی امید تھی، اور ہندوستان میں رہنے سے بوجہ بیماری بیم صاحبہ کے مالی نقصان ہوتا، لیکن جب ان کو مشٹریک کے انتقال کی خبر پہنچی، تو انہوں نے محض اس خیال سے کہ کوئی جدید پھل موجودہ مشکلات میں کالج کو نہ چلا سکیگا اپنے ارادہ کو ترک کیا اور کالج میں واپس آئے جس طرح سید صاحب کے مرنے پر کالج کو مشٹریک نے مصیبت سے بچایا، اسی طرح مشٹریک کے مرنے کے بعد مشٹرا بین نے کالج کی ترقی اور بہبودی کے لئے اپنے اوپر جبر کر کے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے جو کچھ آپ ان کو خواہ دیتے ہیں وہ تعلیم کی دیتے ہیں ان کا کام صرف یہ ہے کہ ۵-۶ لکھ کالج کا

کام کریں باقی اوقات میں گھر پر آرام۔ لیکن نہیں یہ ایک حصہ تعلیم کا کام کرتے ہیں، تو دودھ سے کالج کے دوسرے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ مجھ پر اصرار ہوتا ہے کہ دورہ کب کرو گے۔ ہر وقت اس بات کا خیال ہے، کہ روپیہ کیسے ملے محمد یونیورسٹی کس طرح بنے۔ ایک ایجنسی قائم کی ہے تاکہ کالج کے تعلیم یافتہوں کو نوکری ملے۔ اُس کے متعلق فرصت کے وقت میں براہِ خط و کتابت کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے لڑکے ان کی وجہ سے نوکری ہو گئے۔ جہاں جہاں ہمارے یہاں کے طالب علم نوکری ہو گئے ہیں، اپنی قابلیت کا ثبوت دیتے ہیں، یورپین حکام خوش رہے چنانچہ عبداللہ بی۔ اے جو ہمارے یہاں کالج کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا، اُس کے واسطے ایک دیسی ریاست سے پانسو روپیہ ماہوار تنخواہ کی نوکری بذریعہ گورنمنٹ میسنی کے آئی تھی۔ لیکن مسٹر ماریسن صاحب نے بوجہ ایک نیٹو اسٹیٹ ہونے کے منظور نہ کیا، اور مراد آباد کی چنگی کی سکریٹریٹ پر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا نوکری رکھا دیا۔ آفتاب احمد خاں ہمارے کالج کے پُرانے طالب علم کس دل و دماغ کے ہیں، جب ان لوگوں کو نوکری ملنے سے سبکدوشی ہوگی تو یہ اپنے آپ کو قوم کے واسطے وقف کرینگے۔ صداقت دیانت امانت، اقوامی ہمدردی کون ہی خوبی ہے جو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں میں موجود نہیں ہے، جبے اُن کو فرصت دیگا وہ قوم پر جان نثار کر دیگے۔ میرا ایک عزیز شوکت علی موجود ہے، جو اپنی قابلیت اور خوبیوں میں فریڈرک یورپین کالج کے طلبہ سے اُسی طرح محبت سے ملتے ہیں، جس طرح یورپین سے۔ اور طلبہ بھی کالج کی عزت قائم رکھنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ آرنلڈ صاحب کی خوبیاں اس وقت تک نقشِ دل ہیں اگرچہ بوجہ ہماری بے نصیبی کے وہ ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ لیکن اُن کا دل اس وقت تک ہم سے جدا نہیں ہوا۔ وہ لاہور میں بیٹھ کر علیگڑھ کالج کی ترقی کی کوشش اور فکریں رہتے ہیں۔

سید صاحب اُن کو مولوی آرنلڈ کہا کرتے تھے جن سے کہ اُن کی سیم صاحبہ طلبہ سے ایسی محبت کرتی تھیں کہ کوئی ماں اپنے بچوں سے کیا محبت کرے گی۔ جس وقت کالج کی مالی حالت اچھی ہونی تو پھر ہم اُن کو کالج میں دیکھینگے۔ مسٹر ٹینگ صاحب سے اگرچہ لوگ پورے طور سے واقف نہ ہو سکتے ہیں لیکن میں بحیثیت آئریبری سکریٹری کے یقین دلاتا ہوں کہ وہ ہر ایک کام میں مصروف رہتے ہیں اور کالج کے ہر ایک کام کرنے میں اُن کو پوری دلچسپی ہے۔ دو نئے یورپین پروفیسر مسٹر ماریسن لائے ہیں۔ اُن میں سے مسٹر برون کی نسبت مجھے امید ہے کہ دوسرے آرنلڈ ہو جائینگے۔

البتہ اسکول کی حالت کئی سال سے اچھی نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ بہت سے اُستاد بدل گئے ہیں۔ نا تجربہ کار ٹیچر مقرر کئے جاتے ہیں۔ ٹرننگ اسکول سے سیکھے ہوئے مسلمان ملتے نہیں لیکن مسٹر کارنا، چونکہ ایک بردست عالم ہیں، امید ہے کہ بہت جلد ہمارا اسکول بھی معمر ہو جائے، کالج کی حالت باعتبار نتائج امتحانات تمام یونیورسٹی میں سب کالجوں سے باعتبار فیصدی کے بہتر ہے۔

تھے کہ میور کالج اور کیننگ کالج جو اس صوبہ میں نہایت نامور کالج ہیں، جہاں کا بورڈ میں اسٹاف تیارے کالج سے زیادہ ہے، ان کالجوں سے بھی ہمارا کالج نتائج امتحان میں بڑھ گیا، جس کی شکر گزاری کا مستحق کالج کا اسٹاف ہے۔

خاص خاص لوگوں میں جن کی کوششیں اور سچی دل سوزی قابل شکر گزاری ہے وہ ہمارے کالج کے پڑنے طالب علم ہیں۔ جس میں مولوی طفیل احمد اور مولوی حبیب اللہ خاں بی۔ اے، خاص طور سے قابل ذکر کرنے کے ہیں، جن کی کوشش سے میموریل فنڈ میں بہت مدد ملی، اور ہم اس قابل ہوئے کہ کل قرضہ ادا ہوا۔ اگرچہ ماہ تک کسی قسم کی آمدنی نہ ہو، تو بھی ہم خواہیں دیکھتے ہیں۔ بورڈروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اب بورڈروں کے رہنے کو مکان باقی نہیں رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، کہ زمین اگلی رہی ہے یا اتنے لڑکے آسمان سے برستے ہیں، کہاں ۹۔ ماسٹر شہ اسماعیل ۲۲، بورڈر تھے یا اب ۲۱۴ ہو گئے، اسکول کے کمرہ میں جا کر دیکھئے چھوٹے چھوٹے بچے قرآن شریف پڑھتے دکھائی دینگے، حل میں ایک پانچ برس کا بچہ کلکتہ سے بورڈنگ ہوس میں آیا ہے۔ میں نے ہر چند انکار کیا لیکن اس کا باپ ماما اور زبردستی سے اُسے بورڈنگ ہوس میں رکھا آخر اُس بچے کو ماسٹر ولایت حسین صاحب نے خاص اپنے مکان میں کھا ہے اور اُن کی بی بی شالماں کے اُس سے محبت کرتی ہیں۔ اس وقت ۲۵ بورڈر دس سال سے کم عمر کے ہیں، ظور حسین ارڈیں کوئی مکان خالی نہیں رہا۔ نہ دوسرے بورڈنگ ہوس میں کوئی جگہ باقی ہے۔ طلبہ کی درخواستیں آتی ہیں اور بوجہ جگہ نہ ہونے کے انکار کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ علیگڑھ سے چلنے کے قبل، درخواستوں میں نام منظور کر چکا تھا۔ تجویز پر پیش ہے کہ جدید مکان بنوائے جاویں۔ چنانچہ مدد جاری ہے۔ پتی بارگ میں چھ جدید کمرے تیار ہو رہے ہیں۔ لیکن ان سے کیا ہوتا ہے ابھی زیادہ مکانات کی ضرورت موجود ہے۔

دوسرا اعتراض کالج پر یہ ہے کہ علیگڑھ کالج میں ماہیروں کے لڑکے پڑھتے ہیں غریبوں کے لڑکے وہاں تعلیم نہیں پاسکتے، یہ اعتراض عادت اور رسم کی پابندی پر مبنی ہے۔ ہمارے بزرگ غریبوں کی پرورش اور غریب طالب علموں کی مدد اُسی حالت میں سمجھتے ہیں اور سمجھینگے جب کہ مدد اُسی طرح پر کی جائے جیسی کہ جامع ازہر کے مدرسہ میں ہوتی ہے، آپ جانتے ہو گئے کہ مدرسہ جامع ازہر ایک بڑا مدرسہ ہے، جہاں بارہ ہزار طالب علم تعلیم پاتے ہیں، اُن میں سے چھ ہزار کو مدد دیکھتی ہے۔ لیکن کس طرح مدد دیکھتی ہے! جس طرح یہاں محظوظہ بھوکوں حیرات تقسیم ہوتی ہے۔ یہ بھی طریقہ وہاں ہے کہ شام کے وقت دو دو تک دورویہ قطار طالب علموں کی سڑک پر کھڑی ہوتی ہے ایک شخص سینی میں خشک دھیاں لئے ہوئے دو دو دھیاں ہر ایک طالب کو تقسیم کرتا ہے۔ ہمارے کالج

کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ لیکن آج اتنے مختلف ممالک کے مسلمانوں کو جو شاید عمر بھر نہ ملتے، کس نے ایک جگہ جمع کر کے باہم ملا دیا۔ متضاد مختلف خیالات کے آدمیوں کو جو باہم مسافر کرنے پر رضامند نہ تھے، اس اثر میں جس کو میں کہتا ہوں کہ اسلام کا دائرہ ہے، کس نے کھڑا کر دیا؟ بولو کس نے کھڑا کیا؟ (آواز آئی کانفرنس نے) جو غلط خیالات ایک دوسرے کی نسبت تھے، اور باہم برادری میں بھی ملنا نہیں چاہتے تھے، کس نے دور کر کے باہم شہر و شکر کر دیا؟ ”کانفرنس“ جو خیالات پستی اور قوم کی بربادی کے تھے، وہ کس نے دور کر دیے؟ یا کس سے کم دور کرنے کا ارادہ کیا، اور ان لوگوں کے دل میں جن کو قوم کا خیال ہے قومی ہیرو دی و ترقی کے لئے کوشش کرنے کی ایک امنگ پیدا کر دی؟ ”کانفرنس“ مانا کہ کانفرنس اور یہ سب باتیں جو یہاں ہوتی ہیں بیسویں صدی، اور تین دن کے بعد نہ کسی کو قوم کا خیال رہیگا، اور نہ قومی تعلیم اور قومی ترقی کا۔ لیکن اگر یہ کانفرنس نہ ہوتی، تو جو لوگ یہاں آئے ہیں وہ کیا کرتے، یقیناً اپنی خوشی اور تفریح کے جلسوں میں جاتے، بعض ایسی محفلوں میں شریک ہوتے، جہاں دہلی اور کھنؤ کے نامی گرامی مطرب مغنی بولے جاتے جہاں رقص سرود کے جلسے ہوتے۔ بعض کے ہاتھ میں جام و صراحی ہوتی۔ اسی مجلس نے جس کو بیسویں دہائی کا ہے، جس پر اعتراض کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے تقریبی جلسوں میں شریک ہونے سے بہت مسلمانوں کو روک دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کانفرنس نے کوئی بھی کام نہیں کیا اور کوئی بھی فائدہ آئندہ اُس سے نہ ہو تو بھی اُس نے جو کام کیا ہے یہ بھی کانفرنس کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ لیکن حقیقت یہ کامیابی نہیں ہے۔ جو اسپیکر اس پلیٹ فارم پر آتا ہے، وہ مائے قوم اور مائے قوم کرتا۔ اور جو پریسیڈنٹ اس اسٹیج پر نشست کرتا وہ قوم کو لعنت و ملامت کرتا ہے۔ اور اس سے ایک قومی اور اسلامی ہمدردی کا جوش پیدا کرتا ہے، ان تقریروں اور لیکچروں سے حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوتی ہے بہت سے غلط خیالات دور ہوتے ہیں، تعلیم و تربیت کی خوبیاں معلوم ہوتی ہیں۔ علم کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ جو فرائض ماں باپ پر پوچھنے کے ہیں اُس سے آگاہی ہوتی ہے غفلت اور کاہلی سے دل میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔ مذہب اسلام کی نسبت جو غلط خیالات ہیں دور ہوتے ہیں۔ چنانچہ راج میں نہ نہایت افسوس کے ساتھ اس کانفرنس کے معزز پریسیڈنٹ کے وہ الفاظ سُنئے کہ بعض یورپین خیال کرتے ہیں کہ اسلام مانع ترقی و تہذیب ہے اور اسلام صرف اُسی زمانہ کی قوم عرب کے لئے نفعاً۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ اسے یورپین جانتے ہی نہیں کہ اسلام فی الواقع کیا چیز ہے۔ وہ اپنے نزدیک یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کو اسلام کی وسیع تعلیم سے کما حقہ واقفیت ہے۔ لیکن فی الواقع وہ اسلام اور اُس کی پاک تعلیم سے بالکل ناواقف ہیں چنانچہ میں نے ایک انگریزی مورخ کی کتاب میں لکھا دیکھا ہے کہ ”نحضر ت کا بت کہ میں بنا یا گیا ہے اور مسلمان وائے جا کر اُس بت کو پوجتے ہیں“ جن کا مبلغ علم اسلام کی نسبت ایسا ہوا، وہ اسلام کی خوبوں سے کیونکر واقف ہو سکتے ہیں۔ اسلام عرب کے لئے اور قدیمی مانہ

عرب کے لئے ہی نہ تھا، بلکہ جیسا اسلام عرب کے لئے تھا، ویسا ہی عجم کے لئے، اسلام جیسا اُس زمانہ کے لئے تھا، ایسا ہی اُس زمانہ کے لئے بلکہ الی یوم القیامت رہیگا۔ اسلام ہی وہ چیز ہے جس نے آباؤ اجداد کی کورانہ پیروی سے نکال کر رستی حق پرستی اور ترقی کی راہ پر ڈال دیا۔ قرآن میں خدا کا بجایا ہی فرماتا ہے

یعلکم۔ یعلقون۔ یعلکم۔ یعنی شاید تم ان باتوں کو سمجھو (خلافت عقل ایک بات کی تعلیم اسلام نے نہیں دی۔ تم عقل رکھتے ہو۔ فائز عقل نہیں ہو۔ خدا کے فضل سے آنکھیں کھلتے ہو، اندھے نہیں ہو، گو غفلت کا پردہ آنکھوں پر پڑ گیا ہے، دوزبردست انگلیاں درکار ہیں تاکہ اس پردہ کو اٹھاویں، اُس کے بعد دیکھ لو۔ کان کھلتے ہو بہرے نہیں ہو۔ مگر دلی کانوں میں ٹھسی ہوئی ہے مگر آنکھوں کو حرکت دینے کی ضرورت ہے تاکہ کانوں کی ٹھنٹیاں نکال دیجاویں۔ غرض کہ وہ آگ جو ہمارے آباؤ اجداد نے سُنگائی تھی کو بجھ کر راکھ ہو گئی ہے، لیکن اسکی کچھ چکاریاں ابھی تک ہر ایک دل میں باقی ہیں مکن ہے کہ یہ چکاریاں پھر بجھ کر اٹھیں۔ جب تک تم کو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ یاد ہے اور کوئی مسلمان اس پاک کلمہ کو نہیں بھول سکتا، حتیٰ کہ جن کو تم نیچری کہتے ہو، وہ بھی نہیں بھول سکتے، اگرچہ وہ جھوٹا ہی چاہیں اور اس کلمہ طیبہ کو دل سے بھلا دینے کی کوشش بھی کریں، تو بھی نہ جھوٹ لینگے، کیونکہ پیدا ہوتے ہی اسلام کی آواز کان میں ڈالی گئی ہے، ممکن نہیں کہ اس آواز کو بھول سکیں۔ انہوں نے بچپن میں غرض اور میں رہ کر اسلام کا دودھ پیا، اسلام اُن کے رگ و ریشہ میں دوڑ گیا ہے، اگر وہ اس دودھ کو اپنے جسم سے گانا چاہیں تو نہیں نکال سکتے۔ اسلام جیسا تازہ تھا بنا رہیگا، اور خدا کا وعدہ پورا ہوگا۔ کافر نس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تو چند محدود اور لاندہ ہوں کا جلسہ ہے۔ اگرچہ حیرت و الحاد اسی کا نام ہے، اگر لاندہ ہی اسی کو کہتے ہیں کہ خدا کو ایک جانیں اور محمد رسول اللہ کو نبی برحق۔ تمام مسلمانوں کو بھائی، اور خدا کے بندوں اور اپنے بھائیوں کی حالت زار پر اٹھ اٹھ آسور و عیسائی اور اپنی قوم کو زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلنے پر آمادہ کریں، اور جو درجہ عقیدہ کمال، عظمت و جلال، اور علم و عمل انکے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا، اُس کے حاصل کرنے کی انہیں ترغیب دیں اور اُن کی موجودہ بہت حالت پر رات دن بیچیں ہو کر آنکھوں سے آنسو بہائیں۔ اگر کوئی ایسا شخص ملے ہے تو میں پکار کر کہتا ہوں کہ میں محمد اور تم سب متحد۔ اور خدا بھی ایسے خوش ہے۔ یا رسول اللہ وہ ہے جو خدا کا منکر ہو، محمد وہ ہے جو رسول کا منکر ہو، محمد وہ ہے جو دین سے خوف و اسلام سے خارج ہو، قرآنِ حدیث کے کسی عقیدہ کا منکر ہو، محمد وہ ہے جو مسلمانوں کی بھلائی نہ چاہے۔ مسلمانوں کو آپس میں لڑائے آپس میں بغض و حسد رکھے، اور دینداری کا حیلہ کرے۔ آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون محمد ہے؟ اور کون نبی مسلمان ہمارا تو یہی عقیدہ ہے اور یہی ایمان۔ ایمان کو جانے دو عقل خود بتاتی ہے کہ مسلمان تو مسلمان کوئی قوم بھی خواہ وہ ہندو ہو یا یہودی خواہ عیسائی ہو، بس مذہب کا پابند نہ ہو، صدقِ ثل سے اپنے مذہب پر ایمان نہ رکھتی ہو، اور ارکانِ مذہب کی پابند نہ ہو، دین کو دنیا پر مقدم نہ سمجھتی ہو، کبھی نیامیں کامیابی حاصل

نہیں کر سکتی، الدنیا مزعۃ الاخرۃ (دنیا دین کی کھیتی ہے) بڑے بڑے مدعیان دین ہم کو دنیا کا گستا
کننے ہیں۔ ہاں صاحب ہم دنیا کے گتے ہیں، لیکن ہمیں دین کے گتے تو دکھاؤ جو بغیر ہڈی کے زندہ
رہتے ہیں؟ اگر آپ مجھے اجازت دیں اور صاف کریں تو میں کہتا ہوں کہ اگر دنیا کے گتے کی چوٹی چوٹی
ہڈی نہ ہو، تو یہ دین کے خیر کیا کھا کر زندہ رہینگے۔ اگر دنیا اور اس کی دولت ملعون ہے، تو خدا نے
زکوٰۃ کیوں فرض کر دی، جب خدا ہم کو چالیس روپیہ جمع کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ تو زکوٰۃ کا کیوں
حکم دیتا ہے، نہ ہمارے پاس چالیس روپیہ ہونگے، نہ ہم پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ جب گو فرسٹ ہم کو تجارت
کرنے کی اجازت نہ دیگی، تو ٹیکس کہاں سے طلب کرگیں۔ اسلام جو کی بنا اور رہبانیت نہیں سکھلاتا۔
لامرہبانیت فی الاسلام۔ اسلام قانون قدرت کے موافق ہے، دنیا میں جو چیزیں پیدا کی گئی ہیں
اس لئے تاکہ خدا کی شان کو بچائیں، اس کی قدرتوں اور اس کی نعمتوں کو جانیں۔ خدا فرمانا ہے، کہ کون
شخص ہے جو میرے بندے کو میری نعمتوں سے روکتا ہے۔ اگرچہ اگلے زمانہ کے لوگ جو کی روٹی کھاتے
اور کپڑوں میں پیوند لگاتے، مگر کس حالت میں جب کہ دنیا کی سلطنت کرتے۔ سموروں کے خلعت دینے
اور لاکھوں روپیہ خیرات کرنے کا مقدور رکھتے۔ تھے، حقیقت وہی اصل تارک الدنیا ہوتے تھے۔
نفس کشی کرتے پیوند لگاتے لیکن شاہی لباس پہننے کا مقدور رکھتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حال میں
لکھا ہے کہ وہ اپنے کپڑوں میں پیوند لگاتے، اور ایک بڑا عیا کا چولہا بے تکلف جاکر سلگا دیتے۔ مگر وہ کون حضرت
عمر تھے؟ وہ عمر تھے جو عرب و عجم کے بادشاہ تھے، بادشاہ کیا وہ اپہر تھے۔ بادشاہی کی حالت میں لگا دی کرتے
وہ فقر تھا الفقہ خشی، فقیری اُن کا فقر تھا کہ سب کچھ پاس رکھتے، لیکن اپنے نفس پر ہتھمال نہ کرتے تھے۔
ایک دوسری حدیث ہے کہ فقیری کفر کی حد تک پہنچا دیتی ہے۔ یہ فقیری ہتم تارک الدنیا لوگوں کی ہے کیون
ہے جو دولت نہیں چاہتا۔ مگر بغیر محنت کے دولت، ہتھ آنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی اکیس کا نسخہ
بجائے کہ نہ پکھری جاتا پڑے، نہ نوکری کرنی پڑے، اتانے کو آگ پر رکھا اور سونا ہو گیا، کوئی وظیفہ نسخہ کا
بجائے، تاکہ بادشاہ اور دولتمند تابع ہو جائیں، اور جو ہم حکم دیں وہ حاضر کریں۔ کوئی عمل دست غیب کا معلوم
ہو جائے کہ پانچ اشرفیاں روزانہ صبح کو نیکہ کے نیچے بل جایا کریں۔ لیکن اکیس کا نسخہ کیا ہے؟ خود تمہارے
ہتھ کی قوت ہے، تسخیر کا عمل خود تمہارے اخلاق حسنہ اور تمہاری قابلیت ہے۔ دست غیب کیا ہے؟
تحصیل علوم و فنون۔ دولت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، تمہاری تعلیم اور علوم و فنون کا استعمال میں لانا اور محنت
کرنا۔ جو لوگ تارک الدنیا ہونے کے مدعی ہیں حقیقت میں وہ تارک الدنیا نہیں بلکہ متروک الدنیا ہیں۔ اگر آج
کوئی پانچ ہزار روپیہ لیکر خیرات کرنے کو کھڑا ہو تو میں نہیں سمجھتا کہ مدراس میں کوئی جگہ ایسی ہو جاں آپ کے
حق میں دے جائے خیر کرنے والے مولوی صاحبان اُن اریض نورانی کو لینے اور اپنی ردا میں رکھنے کے لئے
آمادہ نہ ہونگے، جصل اس تقریر کا یہ ہے کہ کافر اس کا یہی مقصد ہے کہ تو کو تعلیم و تربیت کی تحریض ترغیب

دیکھاوے، اور مسلمانوں کے ایسے مدرسے قائم ہوں، جہاں تعلیم و تربیت کے عمدہ سامان ہوں۔ تعلیم نہ صرف دنیاوی ہو، بلکہ دنیا کی تعلیم کے ساتھ دین کی اور اسلام کی تعلیم بھی ہو۔ یہ کدینا آسان ہے کہ مسلمان نہیں پڑھتے، یہ خیال لغو ہے کہ مسلمانوں کو علم کا شوق نہیں۔ لڑکے کس پڑھیں اور کیسے پڑھیں؟ کیا آپ نے اُن کی تعلیم و تربیت کے لئے کوئی بیت مقدس بنا کھڑا کر دیا ہے۔ اس وقت جو مدارس ہیں وہ سرکاری ہیں جہاں مذہبی اور اسلامی تربیت کا نہ کچھ انتظام موجود ہے اور نہ موجود ہو سکتا ہے۔ یا مشنری اسکول ہیں جہاں انجیل پڑھائی جاتی ہے۔ مسلمان اپنے مذہب کو عزیز رکھتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ مسجدوں سے اللہ اکبر کی آواز آ رہی ہے، اور مشنری اسکولوں میں گاڈ اور ڈاگ پڑھایا جاتا ہے، بتائے کہ ایسی حالت میں مسلمان بچے کیونکر ان مدارس میں تعلیم پائیں؟

گورنمنٹ کی بڑی مہربانی ہے کہ اُس نے رعایا کی تعلیم کے لئے ہر قسم کی آسانی کر دی ہے ہر مشنریوں کے بھی شکر گزار ہیں کہ اپنے ملک کا کوڑوں روپیہ صرف کر کے اس ملک میں اشاعتِ تعلیم کرتے ہیں۔ لیکن مشنریوں کو کیا غرض ہے کہ جو وہ آپ کے مذہب کی تعلیم کا بندوبست اپنے روپیہ سے کریں اُن کو اپنے مذہب کی محبت اور ترقی کی فکر ہونا چاہئے۔ ہم کو اُن سے اس امر کی شکایت کا کیا استحقاق ہے کہ انہوں نے ہماری مذہبی تعلیم کا کچھ انتظام نہیں کیا۔ گورنمنٹ کی رعایا میں مختلف مذہب اور مختلف قوم کے اشخاص ہیں، اُس کو ہر ایک قوم اور ہر ایک مذہب کا کیا خیال ہے کیا وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرے اور پارسیوں و ہندوؤں کی مذہبی تعلیم کا کچھ بندوبست نہ کرے؟ ۲۸ کروڑ باشندوں میں ہندو ۱۵ کروڑ مسلمانوں کے قرآن و حدیث پڑھانے کا بندوبست کرے، لیکن دیکھیں تعلیم کا کچھ انتظام نہ کرے، دیں جو مسلمانوں کو کوئی استحقاق نہیں ہے کہ جو کچھ انتظام گورنمنٹ نے اپنی مہربانی سے کیا ہے اُس سے زیادہ طلب کریں اور اگر طلب کریں، تو گورنمنٹ کیونکر اُن کی خواہشات کو پورا کر سکتی ہے اور اگر گورنمنٹ پورا کرے تو یقیناً بدنام ہو کہ ایک قوم کے ساتھ خاص عایت کی جاتی ہے؟

صاحبِ باتم بھی تپتے کٹے اور مضبوط ہو، ہاتھ رکھتے ہو، جیسے ہندو۔ آنکھیں رکھتے ہو، مثل عیسائیوں کے کان رکھتے ہو جیسے پارسی رکھتے ہیں۔ پس اگر تم ہاتھ پاؤں نہ ہلاؤ۔ آنکھوں کو خود ہی بند کر لو، کانوں میں دھٹی ٹھونس لو، اور سچس و حرکت مثل لاش کے پڑے رہو، تو کوئی تمہاری لاش کیوں اٹھانے لگا، البتہ دم بھجائے کے بعد قبرستان میں جا کر دفن کر دیا جائیگا۔ ایک مثل مشہور ہے کہ ایک آرام طلب آدمی ایک درخت کے نیچے لیٹا تھا مکھیاں منہ پر بھینک رہی تھیں ایک سوار اُدھر سے گزر رہا تھا آواز دی کہ منہ میرے حال پر رحم کرو اور میرے پاس آؤ، جب سوار گھوڑے سے اتر کر آیا، اور اُس کی حالت پر ترس کھا کر کہا کہ جو خدمت مجھ سے چاہتا ہے، میں تیری خدمت کرنے کو حاضر ہوں، تو اُس سے گڑا کر کہا کہ ذرا میرے منہ کی مکھیاں ہلاؤ۔ سوار نے جب دیکھا کہ نہ کوئی زخم ہے اور نہ گھاؤ، بلکہ محض کاہلی کی وجہ سے

اس نے اپنا یہ حال کر رکھا ہے تو تحلیلینِ شیعین اُتار کر تڑپا رانی شروع کیں ۔

پس لے حضرات ! جو کام کہ ہم خود کر سکتے ہیں اور بوجہ اپنی بے پروائی کے نہ کریں ، وہ مثل اُس آرام طلب کے سوال کی ہے کہ جس نے سوار سے اپنے منہ کی کھچیاں اُٹرانے کو کہا تھا۔ اپنی اولاد کی تعلیم اپنے مذہب کی حفاظت و حمایت خود ہمارے کرنے کے کام کے ہیں نہ دوسروں سے درخواست کرنے کے۔ بہر حال غرض اس کا نفرت سے یہ ہی ہے کہ مسلمان اپنی قوم کی دینی و دنیاوی تعلیم کا خود بند و بست کریں ۔ ہم پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم کو مذہبی تعلیم کا کچھ خیال نہیں ، ہم مذہبی تعلیم سے مسلمانوں کو علیحدہ کرنا چاہتے ہیں ۔ میں کہتا ہوں لعنت ہو اُس پر جو مذہبی تعلیم سے مسلمانوں کو علیحدہ رکھنے کی خواہش کرے ۔ ہم پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم اسلام کے خلاف ہجرت و دہریت پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں ، لعنت اللہ علیہم ۔ خدا اُس دن کو نہ رکھے جب ہماری یہ کوشش ہو ، لیکن ہاں اس میں شک نہیں کہ ہم مسلمانوں کی دینی و دنیاوی تعلیم ساتھ ساتھ ہونا چاہتے ہیں ، اور ہم بلند آواز سے کہتے ہیں ، خواہ تم اس کفر کے فتوے دو۔ یا لعنت کر دو لیکن اگر جب تک مسلمان انگریزی نہ پڑھیں گے ، رفتار زمانہ کے موافق نہ چلیں گے ، اور جو سیلاب آ رہا ہے اُسے نہ روکیں گے ، تو دنیا میں ذلیل ہوں گے۔ ابھی کیا ہوا ہے کھانے کو روٹی ، پینے کو کپڑا ملتا ہے ، آئینہ بیٹوں اور پوتوں کی یہ حالت ہو گی کہ با عیسائیوں کے قیم خانوں میں مسلمانوں کے بچے ہونگے ، ورنہ بھیک مانگتے ہونگے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان اپنی اصلی قوت حاصل کریں۔ تعلیم پائیں ع نیست یا رانِ طرقت غیر ازین تفصیر است

جب ہم لوگ مختلف صوبوں کے باشندے اکٹھے ہو کر کسی نئی جگہ کا نفرنس میں شریک ہونے جاتے ہیں تو ہر جگہ بغل ہوتا ہے کہ علی گڑھ پارٹی آتی ہے ، نیپری اور کرسٹمان آتے ہیں ، لوگوں کو دہریہ بنانوالے آتے ہیں۔ ہاں صاحبِ صلی گڑھ پارٹی آتی ہے ”وہ آئی وہ آئی“ ”ذرا صورت تو دیکھ لو“ ”صورت تو مسلمانوں کی سی ہے ، باقی بھی مسلمانوں جیسی کرتے ہیں“ ”اجی دھوکہ ہے ، نظر بند ہی ہے۔“ ”ہم تو صورت نہ دیکھیں گے“ حالانکہ ہم مسلمان ہیں ، اسلام پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہیں ، خدا کو ایک اور غیر اور اُس کی کتاب کو سچا سمجھتے ہیں ، لیکن قصور صرف اس قدر ہے کہ تمہارے درد سے تم کو آگاہ کر کے اُس کے علاج کرنے کی صلاح دیتے ہیں ، درو کی دوا بتاتے ہیں ، کون کتنا ہے کہ ہم سے غلطیاں نہیں ہوتیں ، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم سے غلطیاں ہوتی ہیں ، اور دنیا کی کوئی انجمن ، اور کوئی صحیح غلطیوں سے پاک نہیں ہوتی ، وہ تو صرف خدا کی انجمن ہے جو غلطیوں سے پاک صاف ہے ، پس یہ مجلس اسی غرض ہے تاکہ با ہم نیک بنتی کے ساتھ مشورہ کر کے ایک دوسرے کی غلطیوں کی اصلاح کی جاوے ، اور ہر ایک کو اس امر کا خیال ہو ، کہ جو عظمت و جلال پہلے مسلمانوں کا تھا وہ ہی اس زمانہ میں بھی کسی طرح حاصل ہو۔ ہم میں با ہم اختلاف رائے بھی ہوتا ہے ، لیکن کونسا اختلاف ۔ وہ اختلاف جس کی نسبت ارشاد ہے کہ اختلاف العلماء رحمہ

ہم مختلف مقامات پر اس لئے نہیں جاتے کہ علیحدہ کالج کے لئے روپیہ جمع کریں، بلکہ ہم جہاں جاتے ہیں سب سے اول مقام کی ضروریات پر توجہ کرتے ہیں، چنانچہ جب کلکتہ میں کانفرنس ہوئی، تو سب سے اول دہان کے حالات پر توجہ کی گئی اور کلکتہ کا مدرسہ عالیہ جو سٹیم میں گورنمنٹ نے دہان کی مسلمانوں کے فائدہ کے لئے قائم کر کے مسلمانوں کے ہاتھ میں اس کا انتظام سپرد کیا تھا۔ لیکن اس کی حالت روز خراب ہوتی جاتی تھی، تمام مسلمان نالاں تھے، کہ اس سے کچھ نفع نہیں۔ کانفرنس نے مدرسہ عالیہ کے حالات پر توجہ کی اور رزلویشن پاس کیا۔ حضور ذوالفقار علی خان کو رز صاحب بہادر یگانا لہجی اس اجلاس میں شریف لائے، انہوں نے کانفرنس کی اس کوشش پر مبارکباد دی۔ کانفرنس نے ایک سب کیٹی قائم کی، تاکہ مدرسہ عالیہ کے انتظام پر نچوڑ کر کے ایک رپورٹ تیار کرے، چنانچہ وہ رپورٹ گورنمنٹ کے سامنے پیش ہے۔ یہ فرمائے کہ کانفرنس نے اگر مسلمانوں کے مدرسہ عالیہ کی اصلاح کی تو وہ مستحق تفریف یا قابل تفریق۔ جب ہم مدراس آئے، تو سب سے پہلے ضرورت ہوئی کہ ہم مدرسہ عظیم کے حالات کی نسبت تحقیقات کریں، چنانچہ ہم نے خوشی سے سنا کہ نواب صاحب کہانگ نے خدا ان کو جنت نصیب کرے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ایک ہزار روپیہ بھار کے خرچ سے یہ مدرسہ قائم کیا تھا ان کے انتقال کے بعد اس مدرسہ کا انتظام گورنمنٹ کے تحت میں آگیا۔ لیکن اب اس کا انتظام اچھا نہیں ہے چنانچہ حیدر شریف صاحب نے جن کے دل میں قومی مدد ہے ایک رزلویشن جو دانشندانہ اور مفید ہے پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے اگر مشل کلکتہ کے یہاں بھی سب کیٹی قائم ہو جائے اور محققانہ طور سے رپورٹ مرتب کر کے گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کی جاوے، تو میں اپنے یقین اور دلی ایمان سے کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی خاص ضرورت کے مسلمانوں کی درخواست پر گورنمنٹ ضرور توجہ کرے گی، کیونکہ گورنمنٹ سے زیادہ کوئی اس امر کا خواہاں نہیں ہے کہ مسلمان ترقی کریں، گورنمنٹ ہر طرح مستعد ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم میں مدد دیا جائے۔ گورنمنٹ کا یہ پولیٹیکل اصول ہے کہ جو قوم ایک مائے میں بڑی طاقتور تھی اور جس میں اب تک شرافت کی بویا باقی ہے وہ نہ ہو۔ اسے صاحبو! وہ گورنمنٹ ایک ایسی قوم کو جس کے کارنامے دنیا کی تاریخ میں عورت کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں کس طرح نیست و نابود ہونے دیگی اور ٹوٹے پھوٹے قدیم کھنڈروں کو درست رکھتی ہے، قدیمی اور تاریخی چیزیں لاکھوں روپیہ صرف کر کے جمع کرتی، اور ان کو عجائب خانوں میں حفاظت سے رکھتی ہے کیونکہ شہنشاہ دیگی، جب کہ وہ قدیمی اینٹ پتھروں کے مکانات کو درست رکھتی ہے، تو خدا کے بنائے ہوئے انسانوں کے شہنشاہ کی وہ کیونکر مہوار ہو سکتی ہے۔ گورنمنٹ کی نسبت ایسا خیال کرنا کہ وہ مسلمانوں کی ترقی میں مدد دینا نہیں چاہتی نہایت خراب خیال اور بالکل بدگمانی ہے۔ گورنمنٹ مدد کرنے کو تیار ہے، لیکن اسی وقت جب کہ تم خود بھی اپنی مدد کرو جب کہ خدا انہیں لوگوں کی مدد کرنا ہے جو خود اپنی مدد آپ کرتے ہیں تو گورنمنٹ نے جو یہ اصول کیا ہے، تو وہ حق پر ہے۔ بہر حال یہ رزلویشن ہر طرح مفید اور کارآمد ہے

اور بجائے اس کے کہ شاعرانہ قصائد خوانی ہو، نصاحت و بلاغت کے دیباہ بے جا نہیں، ضرورت ہے کہ ایسی ہی مفید باتوں پر غور کیا جائے جن کو اس قسم کے معاملات سے واقفیت ہے انہیں لازم ہے کہ وہ رائے دیں تاکہ اصل مسئلہ پر غور کیا جائے اور بجائے اس کے کہ علیحدہ کلچر بناؤ یہ مناسب ہے۔ کہ اسی مدرسہ کی اصلاح کروادہ ترقی دیکر اسی کو محمدن کلچر سمجھو ۛ

نمبر ۵۸

اپنی سچ

یہ اپنی سچ نواب صاحب بہادر نے ۷۷- دسمبر ۱۹۱۴ء کو محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ مدراس میں سٹار مارین صاحب بہادر کی رائے کی تائید میں فرمائی :-

حضرات !

سٹار مارین صاحب نے جو رائے اس وقت دی ہے آپ کو شکر گزار ہونا چاہئے کہ باوجود یورپین اور عیسائی مذہب ہونے کے انہوں نے ہم کو کیسی نیک صلاح دی ہے، اُن کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ مسلمانوں کے نیچے مذہبی تعلیم پادیں اور فرائض مذہبی کے پابند ہوں، وہ علیگڑھ کالج میں سامانوں سے زیادہ مذہبی تعلیم کی نگرانی رکھتے ہیں۔ مذہبی تعلیم کے وقت اکثر خود کلاس میں جاتے، مذہبی تعلیم کے نتائج کا انتظام کرتے ہیں۔ سچی میں اکثر جا کر دیکھتے ہیں کہ کون کون طالب علم موجود نہیں ہے، لیکن اس خیال سے ہر ایک غیر مذہب کا شخص اس قدر توجہ دوسرے مذہب کی بابت نہیں کر سکتا۔ لہذا اُن کی یہ رائے ہے کہ مذہبی تعلیم اور ادائے فرائض کا انتظام کسی مقدس مولوی کے ہاتھ میں ہو۔ اگر علیگڑھ کالج میں ۹۴ مسلمان بورڈر ہیں گو وہاں وہ خود بہت کچھ انتظام آپ کرتے ہیں تاہم انہیں کی رائے سے ناظم امور و دنیاویات ایک مقدس عالم کو مقرر کیا گیا ہے اور یہی اُن کی رائے مدرسہ اعظم کی نسبت ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ آپ سب صاحب سٹار مارین صاحب کی اس نیک صلاح اور دلسوز مشورہ کی بابت اُن کا شکریہ ادا کرینگے اور اُن کی اس صلاح کو دل سے پسند فرماوینگے ۛ

اور نہ ہم۔ بہت سی باتیں اُن پرانے بزرگوں میں ایسی ہیں جو نئے تعلیم یافتوں میں نہیں ہیں، اور ضرورت ہے کہ یہ لوگ اُن کی عمدہ باتوں کو سیکھیں، اسی طرح نئے تعلیم یافتوں میں جو باتیں ہیں وہ سب کی سب ایسی نہیں ہیں کہ اُن کو رد کر دیا جاوے، انہیں۔ بلکہ ضرورت ہے کہ اس نئی تہذیب اور نئی تعلیم کے حامیوں کی باتوں کو غور اور توجہ کے ساتھ سنا جاوے، اور اس امر پر غما کہ کیا جاوے کہ کوئی باتیں قبول کرنے کی ہیں، اور کوئی نہیں، اچھی اور بُری باتوں کے فرق بتانے کو یہ مجلس قائم کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسی مجلس ہے جس کو ڈاکٹری قاعدہ کے بموجب علم کیمسٹری کہنا چاہئے۔ علم کیمسٹری وہ علم ہے جس سے ہر چیز کے اجزاء علیحدہ علیحدہ کئے جاتے ہیں اور یہ بتایا جاتا ہے کہ کس جزو کی کس قدر مقدار ہے اور کوئی حصہ مفید ہیں اور کوئی مفید نہیں۔ چنانچہ کانفرنس بھی مفید اور مضر اجزاء کو علیحدہ علیحدہ کر کے دکھاتی ہے یہاں پر ہندوستان اور مدراس، بلکہ تمام ملک کے ہمدرد قوم حضرات آئے ہوئے ہیں جن میں بعض کے دل میں خطرات ہونگے، بعض کے دل شبہات سے بھرے ہونگے، اور بعض صرف اس غرض سے آئے ہونگے تاکہ اُن کے شبہات کا تصفیہ کیا جاوے، اور اگر ایسے بڑے مجمع میں اُن کے خطرات اور شبہات کا تصفیہ نہ کیا جاوے گا تو اور کونسا موقع اُن کو رفع شبہات کا ملے گا؟

اے حضرات! اب نہ وہ وقت ہے اور نہ ہماری ایسی حالت کہ جو خیالات دل میں لے کر آئے ہیں وہ سینہ میں بند کر کے لے جاویں اور منطقی دلائل سے خارج از بحث گفتگو نہ کریں یا ضابطہ قاعدہ سے سے ایک ایچ قدم باہر نہ جانے دیں، ابھی کچھ عرصہ مکمل ہو گیا اور یہ ہی مناسب ہے کہ دلوں میں جو غبار اور دھواں بھرا ہوا ہے اُسے نکل جانے دو، اُس کے بعد بے دود کی روشنی ہوگی، ایسی روشنی جو بجلی کی روشنی کی طرح صاف و شفاف ہو کر ہماری اسی طرح رفتہ رفتہ اصلاح ہوگی۔

نمبر ۶۳

اپنی

اپنی قلاب صاحب بہادر نے ۲۹- دسمبر ۱۹۰۷ء کو محمد علی کچیشنل کانفرنس منعقدہ مدراس میں رد و لیوشن صلاح تمدن کے متعلق آخری اپنی فرامی ۱۱ اس رد و لیوشن کی نقل اور درج ہو چکا ہے۔

حضرات!

یقین ہے کہ آپ سب صاحبوں کو اس رد و لیوشن کے اجلاس میں پیش ہونے سے ضرور خوشی ہوئی ہوگی، کیونکہ مخالف اور موافق خواہ نئے خیال کے ہوں یا پرانے خیال کے، غرض کہ جو اس سال میں موجود ہیں وہ

اور بالخصوص جو صاحب اس پلیٹ فارم پر نشر لائے، اور جنہوں نے تقریر کی ہر ایک تقریر سے یہ تو معلوم ہوتا تھا کہ سب کو ایک خیال ہے، اسلام کی حمایت کا، اور دل میں درد ہے مسلمانوں کی بہتری کا، سینہ میں جوش ہے قوم کی فلاح کا۔ ہر شخص جو رائے دیتا ہے، وہ صرف اس خیال سے کہ کوئی پیچیدہ مسئلہ کے لئے مفید ہے اور کوئی مضر، میرے معزز دوست بلکہ عزیز خواجہ غلام تقی صاحب نے جو رزلوشن پیش کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ رزلوشن نہایت ضروری ہے مگر بہت پیچیدہ اور بہت مشکل ہے وہ اصل چاہتے ہیں اور اس سے کسی کو بھی خواہ وہ عالم ہو یا جاہل انکا نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کی اصلاح نہ ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی خود عمل کرے یا نہ کرے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ اصلاح قوم سے کسی کو اختلاف ہوتا لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے رزلوشن میں الفاظ ایسے استعمال کئے ہیں، کہ جن کی وجہ سے رزلوشن پیچیدہ ہو گیا ہے۔ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ کافر میں کوئی مذہبی بحث نہ ہوگی، لیکن ہم کی بات جب بحث چھیڑ لگی تو ضرور اس پر بحث ہوگی کہ کوئی بسم دنیاوی ہے اور کوئی مذہبی۔ اور یہ نتیجہ ہوگا کہ مذہبی اختلاف پیدا ہوگا۔ بعض رسوم کی نسبت تباہ کن کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اب اگر ان مصارف پر خیال کیا جاوے، جو محرم ٹیفل میلاد شریف یا زیروگوں اور پیروں کے عرس میں ہوتے ہیں، کوئی شیعہ یا سنی ان کی نسبت تباہ کن کا لفظ سننا گوارا نہ کرے گا، اب اگر یہ کہا جاوے کہ ان میں روپیہ زیادہ نہ صرف کرو، تو وہ یہ کہیں گے کہ یہ مذہبی بات ہے، جس قدر زیادہ صرف کیا جاوے، اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک مذہبی بحث کا سلسلہ شروع ہوگا، جو کافر میں نہ ہونا چاہئے۔ لیکن اسی کے ساتھ جو دلائل کہ محرک نے پیش کئے ہیں وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں، نہ اس قابل ہیں کہ ان پر کسی قسم کا غور نہ کیا جاوے۔

حضرات! زمانہ کی رفتار اس قدر تیز ہے جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ مرحوم سر سید کے خیالات کا سب سے زیادہ جاننے والا اور ماننے والا میں ہوں، مجھ سے زیادہ کوئی دوسرا شخص ان کا عقیدت منداور ان کی عزت کرنے والا نہ ہوگا، لیکن ان کی رائے مثل قرآن حدیث کے نہ تھی، وہ نبی نہ تھے، وہ معصوم نہ تھے، ان کی گفتگو وحی آسمانی نہ تھی جبکہ کوئی قول پیش کیا جاوے جو خلاف حدیث ہو۔ تو ہم باوجود ان کی عزت و عظمت و اقتدار کے تسلیم نہ کریں گے، اگرچہ یہ سچ ہے کہ سر سید نہایت عالی دماغ اور دور اندیش مدبر تھے، اور وہ شب و روز قومی ترقی کے خیالات میں مستغرق و منہمک رہتے تھے وہ جو رائے قائم کرتے بعد غور کا عمل کے، جو خیالات ظاہر کرتے اس کے ہر ایک پہلو پر گہری نظر ڈالتے اور اس وجہ کوئی دشمنہ شخص یا ایک سر سید کے خیالات سے اختلاف نہیں کر سکتا، لیکن زمانہ کی حالت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، مقتضائے زمانہ ہمیشہ دشمنوں کو اپنے واجب الاحترام بزرگوں کی رائے سے اختلاف کرنے یا جدید تجاویز پیش کرنے کو مجبور کرتا ہے۔ پس اے حضرات! اب وہ وقت آگیا ہے کہ اگر ہم

کانفرنس کے اغراض کی توسیع نہ کریں گے اور سوشل رفارم کو اس میں شامل نہ کیا جائیگا تو اس سے نقص ضرور پیدا ہونگے، اول یہ کہ نوجوان طبیعت کے بہت سے لوگ جنہوں نے نئی تعلیم پائی ہے، اور جن کے مزاجوں میں جو شش اصلاح اور آزادی سمائی ہوئی ہے وہ اس بات پر تیار اور آمادہ ہیں کہ اگر یہ رزولوشن نامنظور ہوگا، تو وہ دوسری مجلس قائم کریں گے۔ اور ہماری کانفرنس کو جو نفع ان کی شرکت سے پہنچا ہے، اس سے کانفرنس محروم رہیگی، دوسرے یہ کہ جو علیحدہ مجلس قائم کریں گے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ یقیناً یہ کہ جو نوجوان آزادی نا تجربہ کاری اور مذہبی امور سے کامل عدم واقفیت کے اعتدال سے گذر جائیں گے، اور ایسی تجاویز منظور کریں گے جو باعث قومی نقصان اور سبب رنج کا ہوگا۔ لیکن سوشل اصلاح کا مسئلہ اگر کانفرنس میں شامل کر لیا گیا تو ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ ہمارے شریک رہیں گے، اور ان کے خیالات کی باگ ہمارے ہاتھ میں رہیگی، ہم ان کو ایسی تجاویز کے پاس اور اختیار کرنے سے باز رکھیں گے جو شریعت کے خلاف قومی نقصان کا باعث ہوں گی۔ بلکہ ہم اعتدال کے ساتھ سوچ و سمجھ کر کارروائی کریں گے۔ لیکن اے حضرات! باوجود اس قدر اشد ضرورت کے، میں دیکھتا ہوں کہ اس رزولوشن کے منظور کرنے میں نہایت مشکلات کا سامنا ہوگا۔ ہم کو سب سے پہلے دو باتوں پر غور لازم ہے، اول یہ کہ جو دو ترمیمیں پیش کی گئی ہیں ان کو دیکھیں کہ کہاں تک وہ اختیار کرنے کے لائق ہیں۔ پہلی ترمیم یہ ہے کہ بعد اختتام اجلاس کانفرنس ایک خاص تمدن اصلاح کی تجویز کے لئے معین ہو، مگر جیسا کہ حیدر شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ ترمیم اس وقت ہوتی ہے، جب کہ کوئی رزولوشن مجلس کے مقاصد میں شامل ہو جاوے۔ لیکن رزولوشن چونکہ ایذا دہی رزولوشن ہے، اس لئے اس کی ترمیم اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی منظوری نہ ہو جائے مولوی بشیر الدین صاحب نے فرمایا ہے کہ جس طرح اس کانفرنس کے ساتھ تعلیم نواں وغیرہ کے علیحدہ علیحدہ سیکشن ہیں اسی طرح سوشل اصلاح کا سیکشن قائم کر دیا جاوے۔ لیکن اس وقت جو سیکشن قائم ہیں وہ حقیقت جزو ہیں کانفرنس کے اور جب تک کہ رزولوشن پاس نہ ہو جاوے سوشل رفارم کا علیحدہ سیکشن بھی قائم نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا ان دونوں ترمیموں کی نسبت میرے نزدیک بھی اس وقت رائے نہیں لی جاسکتی اب دوسرا معاملہ اصل رزولوشن کے پاس یا خارج کرنے کا ہے اس پر بغض نے یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ ان کے نزدیک اس کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ بعض نے بیان کیا ہے کہ عیسائی کا کام ہے اور صلاح تمدن میں ان کا شریک کرنا ضروری ہے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ بعض مقرریں جادہ اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں اور انہوں نے علماء کی نسبت نہایت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں جن کے حقیقت وہ کسی طرح مستحق نہیں ہیں۔ ان سے بات کہہ دینی تو آسان ہے لیکن علماء کی جو عزت و عظمت دل میں بیٹھی ہوئی ہے، وہ کسی طرح مسخ نہیں سکتی اور میٹھا سب بھی نہیں ہے کیونکہ وہ علم دین کے رہنما ہیں، اپنی زندگی دینی علم اشاعت میں صرف

کرتے ہیں وہ بانٹے اسلام کی ہدایت پہنچاتے ہیں، وہ ہمارے پیشوا اور ہمارے ہادی ہیں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے العلماء ورثة الانبیاء۔ لیکن علم سے وہ عالم مراد نہیں ہیں جو چند کتابیں پڑھ لیتے ہیں، اور بجائے اس کے کہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کو ترقی دیں آپس میں تفرقہ اور جھگڑا پیدا کرتے ہیں۔ تاہم آپ لوگ مانیں یا نہ مانیں، لیکن میں تو یہی کہتا ہوں کہ عوام کے لوں سے علما کی عزت و عظمت کا نشانہ صرف محال ہے، بلکہ نشانے کا ارادہ کرنا بھی غلطی ہے، کیونکہ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی بغیر رہنما کے، ہر ایک قوم کے لئے ایک ایسے گروہ کی ضرورت ہے جو مذہبی رہنما اور پیشوا ہو۔ لیکن کوئی رہنما نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ مذہب کے اعتبار سے تقدس قائم نہ کرے۔ جس وقت ندوۃ العلماء قائم ہوئی اس وقت تمام نئے تعلیم یافتوں کا خیال تھا کہ ندوہ کا وجود ہماری کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے خلاف ہے۔ میں نے اس غلط فہمی کے مٹانے کی غرض سے ۱۸۹۷ء کے اجلاس محمدان ایجوکیشنل کانفرنس میں مقام علیگڑھ ایک رزلویشن پیش کیا تھا کہ ندوہ کے مقاصد عین ہمارے مقاصد ہیں۔ اس رزلویشن کی ایڈیٹس سید محمود صاحب نے کی تھی، میں نے جو ایڈیٹ اس رزلویشن کے پیش کرنے کے وقت دی تھی اور جو اسے ندوۃ العلماء کی تائید میں ظاہر کی تھی اس کا بیان کرتا چونکہ کسی قدر طول ہو گا اور خارج از بحث بھی ہے لہذا میں اس موقع پر اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

جب ۱۱۔ نومبر کو رسلیمان مدرسۂ علوم کی طرف سے ہم اپنے دوست، سرائیکی میکڈانل صاحب بہادر کے پاس ایڈریس لیکر گئے تھے اور صاحب موصوف نے جو ایڈیٹ اس ایڈریس کے جواب میں ارشاد فرمائی تھی اس میں ایک فقرہ یہ بھی بیان کیا تھا کہ ”ندوہ سے بچتے رہنا“ اس فقرہ پر میں نے اپنے نام سے ایک مضمون علیگڑھ ٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۸۔ نومبر میں چھپوایا تھا اور ثابت کیا تھا کہ ہمارے لفٹنٹ گورنر صاحب کس غلطی میں مبتلا ہیں اس آرٹیکل میں میں نے اپنے ۱۸۹۷ء کے میکچر کے فقرات بھی درج کئے تھے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ عجیب لہجہ سے ڈرتے ہو تو کانفرنس کیوں قائم کی۔ میں اس بیان کا مخالف ہوں صاحبو! ڈرنا دو قسم کا ہے۔ ایک ڈرنا ہوتا ہے جو خوف ہے اختلاف رائے کا فقط کانفرنس قائم کرنا علماء سے مخالفت نہیں ہے، کیونکہ جب ہم سے وہ ملتے تو وہ دیکھتے کہ ہر علمائے سامنے کس قدر مودب طریقہ سے کھڑے ہوتے ہیں، علماء ہماری تقریریں سنتے کہ خلاف شریعت ہم کچھ نہیں بیان کرتے، جو کچھ کہتے ہیں وہ مسلمانوں کی بھلائی کی نیت سے، جب یہ حال دیکھتے تو کانفرنس کو مدعو کرنے والے علماء کی خدمت میں عرض کرتے کہ جناب قیدہ کانفرنس کی نسبت جو کچھ خبر ملی وہ غلط تھی یا نہیں اور اس طرح انخابام کا نقطہ نہی رفع ہو جاتی۔ لیکن ایک ڈرنا ہوتا ہے اُن باتوں کی وجہ سے ڈرنا جو حقیقت خلاف شریعت

ہیں اور جب کہ بہت سے مراسم کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی ہے تو علماء کا خوف حق بجانب ہو چکا
تو لے حضرات! جب کہ آپ دیکھتے ہیں کہ ندوۃ العلماء جس میں مختلف صوبوں کے علما جمع ہوئے
ہیں اور اصلاح و ترقی قوم اور مغربی علوم و فنون کی تحصیل کی کوشش کرتے ہیں، ایسے علماء اگر ہمارے ساتھ
ہوں گے، تو کہاں تک کامیابی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ہمارا خیال ہے اور میری رائے میں حقیقت ایسے
علماء کی شان میں گستاخی کرنا کسی کو منظور نہیں ہے اور بغیر علماء کی مدد کے اس کام میں کامیابی نہ ہوگی
لیکن صرف انہیں علماء کی امداد حاصل ہو سکتی ہے جو ندوۃ العلماء کے راکھن یا ان کے خیالات کے معاون
ہیں، لیکن جو علماء ریڈیکل خیال کے ہیں اور مذہبی رنگ ان پر زیادہ چڑھا ہوا ہے ان کے دلوں میں
ندوۃ العلماء کا کیا اثر ہوگا۔ کچھ نہیں بلکہ اس مقدس اور متبرک مجلس کی بھی سخت مخالفت کی گئی، نہ ہم کو
اس قسم کے ریڈیکل علماء سے کسی مدد کے ملنے کی امید ہے اور نہ ایسے علماء کی مخالفت کا ہمیں کچھ خوف
ہے۔ اب میں آپ سے یہ استدعا کرتا ہوں کہ آپ میں جو اصحاب نئے تعلیم یافتہ اور اس رزولوشن کے
پاس ہونے کے حامی ہیں، وہ دصورت اس کے نام منظور ہونے کے اعتدال سے کام کریں گے اور علیحدہ
مجلس قائم کرنے کا ارادہ نہ کریں گے۔ اور اگر رزولوشن پاس ہوا۔ تو جو بزرگ اس وقت رزولوشن کی
مخالفت کر رہے ہیں وہ مجارٹی کی عزت کریں گے اور ایسی تجاویز اختیار کریں گے تاکہ اصلاح تمدن بھی اس حد
تک ہو جاوے جس کی خود وہ بھی ضرورت سمجھتے ہیں، اور ان برائیوں کے دودھ کرنے کی کوشش کریں گے
جو ان کے اور نئے تعلیم یافتوں کے نزدیک یکساں تباہ کن اور خلاف شریعت ہیں۔ اب میں بحیثیت
ممبر ہونے کے رزولوشن کی تائید کرتا ہوں اور بحیثیت پریسڈنٹ ہونے کے دوٹ لیتا ہوں ۴



نمبر ۶۴

اسپیج

یہ اسپیسج نواب صاحب بارہ نے ۷۴- دسمبر ۱۹۰۵ء کو بحیثیت پریسڈنٹ ہونے محمدان کانفرنس میں
کے مولوی شبلی صاحب کے کچھ اسلام کے اختتام پر بطور رہبر اس کے فرامی :-

حضرات!

اس وقت جو مرض مسلمانوں میں پیدا ہو گیا ہے وہ دو قسم کا ہے ایک تو وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ
بحیثیت مسلمان ہونے کے کوئی مسلمان دنیاوی ترقی نہیں کر سکتا، ان کا مقولہ ہے کہ ”دنیا ہیچ است و
کار دنیا ہمہ ہیچ“ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ دنیا ہے، اگر نیری پڑھو و نہ نیا میں قی حاصل کر لو

اب جو مطلب یہ ہے کہ اسلام نے دین و دنیا میں کیا رشتہ رکھا ہے۔ اسلام نے بتایا ہے دین کیا چیز ہے اور دنیا کیا چیز ہے۔ اصلی دوا اسلام کے ڈاکٹر نے جو اس مرض کی بتائی ہے وہ مولوی شبلی صاحب نے بیان کر دی ہے اور کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں اب اس کے متعلق زیادہ بیان کروں، لیکن شیرینی حق زیادہ ملے لپکتی ہے اسلام کے فضائل حق قدر بھی بیان ہوں، عمدہ ہیں۔ لہذا میں اپنے لیکچر میں سے جو میں نے حیدرآباد میں، مسٹر انگز نڈر محمد ویب کے آنے پر دیا تھا اُس کا کچھ حصہ پڑھ کر سناتا ہوں۔ لیکچر اگرچہ پُرانا ہے، لیکن وہ اسلام پر ہے لہذا اسلام کے فضائل ہر وقت تازہ ہیں اور اُن کا بار بار بیان کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔



نمبر ۶۵

اسپیج

یہ اسپیشل نواب صاحب بہادر نے ۲۹- دسمبر ۱۹۰۸ء کو محمدن ایجوکیشنل کانفرنس مدراس میں چینیٹ ریزولوشن ہونے کے روزولیشن نمبر ۱۳ کی تائید میں فرمائی۔ ملاحظہ ناظرین کے لئے زرد لیون کی نقل بھی دیکھائی ہے۔

روزولیشن نمبر ۱۳

یہ ضرور ہے کہ بنیادی تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکوں کو مذہبی تعلیم بھی دی جاوے اور اس غنایت کے حصول کے لئے گورنمنٹ مدراس سے درخواست کی جاوے کہ مسلمانوں کو اجازت مرحمت ہو کہ وہ مذہبی تعلیم کے لئے سرکاری اور پریسیپل بورڈ کے مدارس میں اپنا انتظام کریں جیسے کہ ممالک مغربی و شمالی وچھانے اس سے قبل اجازت دی ہے۔

حضرات!

جو روزولیشن اس وقت پیش کیا گیا ہے وہ نہایت مفید اور از حد ضروری ہے اور جتنے مسلمان اس وقت یہاں موجود ہیں یقیناً وہ سب اس تجویز کے سننے سے بہت خوش ہونگے۔ لیکن قبل اس کے کہ روزولیشن پاس کیا جاوے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو تجربہ ہم کو پنجاب اور ممالک مغربی و شمالی میں ہوا ہے، پہلے اُس کو سن لیا جاوے، اُس کے بعد اس روزولیشن کے آئندہ نتائج پر غور ہو۔

حضرات! مسلمانوں کی حیات ہو گئی ہے کہ جب مذہب کا نام آئے تو اُن پر وجہ کی کیفیت طاری

ہو جاتی ہے، اور ہونی چاہئے جلسہ میں مذہبی گفتگو اور مذہبی ترقی اور بھلائی کی تبادیل بہت کچھ جوش
ظاہر کرتی ہیں، لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو وہ جوش باقی رہتا ہے، نہ وہ مذہبی حرارت اور نہ وہ
وجدانی کیفیت۔

اے حضرات! جہاں تک یہ تجویز کی گئی ہے۔ نہایت معقول اور عمدہ ہے۔ یہی درخواست
اول پنجاب میں کی گئی تھی اور پھر گورنمنٹ مالک مغربی و شمالی میں ہم نے اسی قسم کی درخواست بھی تھی کہ
گورنمنٹ مذہبی تعلیم کی سرکاری اسکولوں میں اجازت دے، اس کا انتظام مسلمان اپنے خرچ سے خود کر لیں
اپنی طرف سے مذہبی تعلیم کے لئے مولوی مقرر کریں گے۔ ہم سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں صرف گورنمنٹ
کی اجازت چاہتے ہیں۔ چونکہ گورنمنٹ نیک دل ہے، وغیرہ تعصب ہے اور ہر ایک فرقہ کی ترقی کے راستے
کھولنے والی ہے اور درخواست بھی معقول تھی لہذا بعد غور کمال کے اُس نے منظور کر لیا۔

جس وقت یہ رزلویشن اجلاس میں پیش ہوا تھا روم سرسید نے اسی وقت کھدیا تھا کہ مسلمان
کچھ نہ کریں گے، بلکہ اُس کے روکنے کی کوشش کریں گے اور اگر گورنمنٹ نے اجازت دی، تو رویہ کا انتظام
نہ کیا جاوے گا۔ بہر حال رزلویشن پاس ہوا اور پڑی کوشش کے بعد منظوری حاصل ہوئی۔ میرے دوست
نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کئی مہینے تک نبی تال تقیم رہے۔ ڈاکٹر کمر سرشتہ تعلیم
لے، نواب لفظٹ گورنر سے ملے، بہت خط و کتابت کی اور آخر کار اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے۔
لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ پنجاب اور مالک مغربی و شمالی میں جہاں مسلمان زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور
وہاں کے مسلمانوں کو تعلیم کا شوق بھی زیادہ ہے، وہاں اس کا کیا نتیجہ ہوا۔ صرف ایک قصبہ امر وہرہ کے
اسکول میں جہاں میرے دوست مولوی مشتاق حسین صاحب کا وطن ہے خود انہوں نے اپنے ذاتی
خرچ سے دس روپیہ ہوار کا ایک مولوی نوکر رکھا ہے۔ باقی کسی شہر میں کچھ بھی انتظام نہیں ہوا حتیٰ کہ کسی
نے توجہ کی۔ نہ چندہ وصول کرنے کی اور مولوی رکھنے کی کوشش۔ حالانکہ ہر ایک شہر میں دس دس روپیہ
ماہوار خرچ کا انتظام ہونا کچھ دشوار کام نہ تھا۔

اسی طرح میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانان مدراس گورنمنٹ سے منظوری حاصل کرنے کی کوشش میں
مصروف ہیں درخواست اس قدر معقول ہے کہ گورنمنٹ ضرور منظوری دیدیگی۔ لیکن جن جن صاحبوں نے اس
رزلویشن کو پیش کیا ہے اور جو صاحب اس بات کے خواہشمند ہیں اُن کو پہلے ایک فنڈ قائم کرنا چاہئے
جس جس شہر میں اس کا انتظام منظور ہو وہاں کم سے کم تین سال کے خرچ کا سرمایہ توجہ کر لیا جاوے۔
اُس کے بعد گورنمنٹ سے درخواست کریں۔ کیونکہ اس قسم کی درخواستیں جب گورنمنٹ میں پیش کجاتی
ہیں۔ اور گورنمنٹ اُن کو منظور کر لیتی ہے لیکن خود قوم اُس کا انتظام نہیں کر سکتی اس کا اثر آئندہ کے
لئے بہت برا پڑتا ہے اور کسی طرح عمدہ نتیجہ نہیں نکلتا، لہذا اقلندی اس میں ہے کہ ہم گورنمنٹ سے صرف

انہیں باتوں کی درخواست کریں جن کے کرنے کے لئے ہم آمادہ اور تیار ہوں۔ اور جب تک ہم کو دلی یقین نہ ہو کہ اس کا انتظام ہو سکیگا، اُس وقت تک گورنمنٹ سے درخواست کر کے گورنمنٹ کی نظروں میں یاد دہانگی نہ ہوں۔



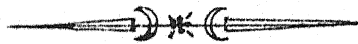
نمبر ۶۶

ایسیج

یہ ایسیج نواب محسن الملک بہادر نے ۳۰۔ دسمبر ۱۹۰۷ء کو مدراس میں سالانہ حساب کتاب متعلقہ کانفرنس پیش کرتے ہوئے بحیثیت انڈیری سیکرٹری کے فرمائی۔

مسٹر پریسیڈنٹ و معزز حضرات!

کانفرنس کا یہ قاعدہ ہے کہ دو چیزیں پیش کی جاتی ہیں ایک رپورٹ سیکرٹری اور دوسرے حسابات آمد و خرچ۔ آمد و خرچ کے حسابات میں تفصیل دکھائی جاتی ہے۔ رپورٹ کارروائی سال گذشتہ مرتب ہے، اور بعد اجازت صاحب پریسیڈنٹ طبع ہو کر تقسیم کی جاوے گی۔ باقی رہا حساب آمد و خرچ یہ حساب سنٹرل اسٹیٹنگ کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر بعد جانچ و پڑتال کے منظور ہو چکے ہیں اس کمیٹی کے اجلاس میں کلج کے پرنسپل مسٹر ماربن، پروفیسر ٹینگ، مولوی عبدالباقی صاحب ایم اے برسر کلج اور میر ولایت حسین صاحب اور دیگر ممبران موجود تھے، چنانچہ حساب جانچے گئے اور تصدیق کے دستخط تمام ممبران نے کر دیے اُس کے آمد و خرچ کا گوشوارہ میں بغرض منظوری آپ کے سامنے بھی پڑھاتا ہوں۔



نمبر ۶۷

ایسیج

یہ دوسری ایسیج ۳۰۔ دسمبر ۱۹۰۷ء کو حساب کتاب متعلقہ کانفرنس پڑھ چکنے کے بعد فرمائی۔

حضرات!

اس خیال سے کہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو۔ میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کانفرنس کا جو روپیہ ہے وہ خود کانفرنس کا سرمایہ ہے۔ یہ روپیہ سوائے کانفرنس کے کالوں کے کلج وغیرہ میں صرف نہیں کیا جاتا۔

پہلے فیہ عدہ تھا کثیر والے کانفرنس کو مدعو کرتے تو اس کے کل مصارف یا تو ایک شخص اپنی ذات سے اٹھاتا اور نہ خاص چندہ مقامی اصحاب سے اخراجات کے لئے کیا جاتا اور ممبری کی فیس کا روپیہ تیار ہی رہتا اور خط و کتابت میں تسبیح ہوتا، جو اور باقی رہتا وہ ممبران کانفرنس کی رائے سے غریب طلبہ کے وظائف میں دیا جاتا۔ لیکن ہر جگہ چونکہ نہ ایسے اصحاب ہیں جو اپنی ذات سے اس قدر کثیر صرف اٹھا سکیں، نین چار سال کے بعد یہ نتیجہ ہوا، کہ اجلاس کانفرنس کی دعوت کہیں سے نہ آئی۔ لہذا مرحوم سر سید کی رائے سے یہ تجویز قرار پائی کہ اگر کسی شہر کے مسلمان کل اخراجات نہ برداشت کر سکیں اور کانفرنس کے سرمایہ سے اعانت چاہیں، تو ان کو اعانت دیجائے، چنانچہ اس کے بعد کانفرنس کے اجلاس و طرح سے ہوئے ایک تو یہ کہ مقامی کمیٹی نے خاص چندہ کیا، ممبری کی فیس جمع کی اور مقامی اخراجات کے بعد جس قدر روپیہ پس انداز ہوا وہ اسٹینڈنگ کمیٹی کو دیدیا، دوسری یہ کہ صرف فیس ممبری سے مقامی اخراجات ہونے اور پس انداز روپیہ اسٹینڈنگ کمیٹی کو دیدیا گیا۔

میں مغرب ہوں کہ لوکل کمیٹی مدراس نے لکھا تھا کہ پس ماندہ روپیہ جو باقی رہیگا وہ نصف لوکل کمیٹی اور نصف اسٹینڈنگ کمیٹی کو دیا جائیگا۔

حضرات! یہاں کی کمیٹی اگر کسی شخص کو نوکر رکھ کر کام لینا چاہے اور جو زریعہ روشن پاس ہوئے ہیں ان کی تکمیل کے لئے کوشش کرے تو وہ حقیقت یہ کانفرنس کا کام ہے۔ اسی طرح اگر غلبہ گٹھ کی اسٹینڈنگ کمیٹی کانفرنس کے پاس شدہ زریعہ روشن کی تعمیل میں کوشش کرنے کو روپیہ صرف کرے تو یہ بھی کانفرنس ہی کا کام ہے۔ غرض کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ کانفرنس کی کارروائی بارسال بھرتک جاری کرے، یہ نہ ہو کہ جو زریعہ روشن پاس ہوتے ہیں وہ لاوارثی چھٹیوں کی طرح ڈیلٹیرانس میں پڑے رہتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ زریعہ روشن کی تعمیل کیونکر ہو اور سال بھرتک بارسال طرح کارروائی جاری رہے، ہمارے پاس سونے کی کان نہیں ہے جہاں سے کھود کر روپیہ نکال لیں، روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے ہماری کارروائیاں پوری نہیں ہوتیں۔ ہماری حالت بالکل کوم کرن کی سی ہے جو مہینے سوتا اور ۶ مہینے جاگتا تھا۔ نہیں بلکہ ہم ۳۶۵ دن میں پانچ دن کام کرتے ہیں اور ۳۶۰ دن سوتے ہیں تمام کانفرنس کے کاموں کا بارسکرٹری کے ذمہ ہے۔ میری یہ حالت ہے کہ میرے پاس بہت سے قومی کام ہیں۔ کالج اور سر سید میموریل فنڈ کا سارا کام مجھ ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ صرف صے ماہوار کا ایک ملازم ہے۔ پس جو کچھ مدد ملتی ہے اسی سے ملتی ہے۔ حالانکہ ضرورت یہ ہے کہ ایک لائق گریجویٹ جس کے دل میں قوم کا درد ہو و مستقل طور سے نوکر رکھا جائے تاکہ وہ ممالک مغربی، پنجاب، بنگال، اور مدراس، وغیرہ سب جگہ پھرے، اور کانفرنس کے لئے سب کو آمادہ کرے۔ مدراس ہی کو دیکھئے کہ یہاں کانفرنس کس طرح ہوئی۔ نہ ہیں امید ہی نہ آپ مہاجوں کو خیال تھا کہ مدراس میں بھی کانفرنس کا ہونا ممکن ہے

خطوط یا ہشتاروں سے ہرگز کام نہ چلتا، دو طالب علم یہاں بھیجے گئے جو معزز پارٹی سے ملے، اور جو گدائی کا لُج کی طرف سے تھی اُسے رفع کیا عبدالہادی بادشاہ صاحب، جن کو یں بادشاہ سلامت کہتا ہوں، مدد کو کھڑے ہو گئے، اور جید شریف و محمد ہاشم صاحب غیرہ نے کافی اعانت پر آمادگی و مستعدی ظاہر کی اور ہر قسم کے پرانے و نئے خیالات کے اصحاب آمادہ ہوئے، اور کانفرنس کا مدرسہ اس میں انعقاد ہوا۔ اگر کالج کے طلبہ آتے، تو کانفرنس کا مدرسہ اس میں ہونا معلوم۔ لیکن کالج کے طالب علم بارہ مہینے تک برابر دورہ نہیں کر سکتے، اور اگر باری باری سے طالب علموں کو بھیجا جاوے تاہم سفر و غیرہ میں کثیر خرچ ہو۔ اس سے نویت تجربہ ہو گیا کہ اگر کوئی لائق اور سمجھدار شخص برابر پھرتا رہے تو کامیابی ممکن ہے۔

اے حضرات! حقیقت میں مسلمانوں کی حالت نہایت خراب ہو گئی ہے، یہ قوم بستر مرگ پر پڑی ہوئی ہے، اگر مردہ نہیں ہو گئی تو حالت نزع میں ضرور ہے۔ دشمن سے دشمن، بے رحم سے بے رحم، سنگدل سے سنگدل، کے بھی آنسو کسی عزیز کو بستر مرگ پر دیکھ کر نکلتے ہیں۔ دل میں درد ہوتا ہے، ایسی حالت میں سچا اس کے کہ ہم مریض کو ملامت کریں، طعنہ دیں، اور مسلمانوں کو کست، کاہل، اور لاپرواہ کہا جائے تو بتیاد کہ قوم کو خواب غفلت سے جگانے والا، اور بیمار قوم کی دوا کرنے والا، کون ہے۔ اُن اب کچھ کچھ لوگوں کے آنسو نکلتے نکلے ہیں۔ علاج اور دوا کی فکر بھی ہونے لگی ہیں۔ اور اگر کوشش برابر جاری رہی تو کیا عجیبے کہ خدا صحت بھی دے اور ناتوان مریض پھر تندرست ہو جاوے۔

یہ حالت کچھ ہندوستان کے کچھ ہندوستان ہی کی نہیں ہے بلکہ آپ نے میرے دوست مولوی رفیع الدین صاحب کی تقریر کو سنا کر ترکی، ایران، مصر، اکیجیا وغیرہ میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں بگلیہ یہی حالت ہے۔

اے حضرات! اس کانفرنس میں ڈیڑھ سو روز و لیوشن اس وقت تک پاس ہو چکے ہیں۔ لیکن بجائے ان ڈیڑھ سو روز و لیوشنوں کے اور نیز بالعوض ان ۱۸ روز و لیوشنوں کے جو اس سال کانفرنس میں پاس ہوئے صرف ایک روز و لیوشن میشل فونڈ کا پاس ہوتا، اور سب لوگ اس کو حرز جاں بناتے اور ۳۶۵ دن کی کوشش کرنے کے بعد پھر سال جہاں کانفرنس ہوتی، وہاں جا کر یہ کھاتے کہ ہم اس قدر کوشش جمع کر کے لائے ہیں۔ کوئی صدر روپیہ لانا اور کوئی دور پیسہ نہ کہ ہر شخص اپنی سال بھر کی کوشش اور کارگزاری کو دکھاتا۔ تعلیم کے لئے کوشش تو بہت ہو رہی ہے۔ لیکن کوشش صرف بانی کارآمد نہیں بلکہ وہ نور پور سے ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں ۳۰۔ تم قسم کے آدمی ہیں۔ ایک تو مولوی صاحب جن کو اس کا خیال ہی نہیں کہ زمانہ نے کیا تبدیلی کی اور اُس کی رفتار کیا ہے۔ جب وہ واقف ہی نہیں تو وعظ و نصیحت کیونکر فرما سکتے ہیں۔ امار کی حالت بفضلہ تعالیٰ دوسری ہے، اُن کے خیالات اُن کے حالات اُن کی اُمیدیں اُن کی خوشیاں یہاں تک کہ قسم کی ہیں۔ اُنہیں نہ قوم کی خبر نہ قوم کا درد۔ اب ہاؤ فرقہ جو تدریجاً چکا،

اُس طبقہ کے سامنے سرسید نے بیکج ڈپے، اسپینچیس بیان کیں تمام کوششوں کا نتیجہ ہوا کہ وہ کچھ کچھ زمانہ کی قوت کو سمجھتے ہیں۔ لیکن اُن کی تعداد بہت کم ہے۔ اب مانغا کا فرق جس کی بہت زیادہ تعداد ہے، اُسے پیٹ نے مجبور کیا اور چونکہ تمام دروازے بند ہو کر ایک دروازہ ملازمت کھلا ہے، اگر اُس دروازہ سے نہ نکلیں تو کیا کریں۔ آگ لگی تو بھاگنے کو خواہ مخواہ مجبور ہونگے، نہ تعلیم کے خیال سے، نہ علم کے شوق سے علم حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ پیٹ کی مجبوری سے علم پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر گورنمنٹ کی طرف سے روز بروز سختی ہوتی جاتی ہے۔ فیس بڑھ رہی ہے۔ کتابوں کا خرچ زیادہ ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کے امدادی اسکول موجود نہیں ہیں۔ مشن اسکولوں میں مذہب جانے کا اندیشہ ہے اور بالکل بجا اندیشہ ہے، امرار کو جانے دیجئے، مشطیع لوگوں کو چھوڑ دیجئے، اس لئے کہ اُن کو ضرورت نہیں۔ غریب کے لئے جو فتوے جہالت کا ہو گیا ہے اُسے توڑئے، اور اگر وہ ٹوٹا جاسکتا ہے تو اُس کو صرف قومی امداد توڑ سکتی ہے کیونکہ اگر اپنے گھر سے باہر تعلیم لانا چاہیں تو کم سے کم صے روپیہ ہمارا خرچ ہے، خواہ وہ کلچر بیٹی میں ہو یا علیگڑھ و مدراس میں صے روپیہ کی نوکری تو مسلمانوں کو ملتی ہی نہیں پھر بچوں کے لئے صے روپیہ ہوا رکھاں سے آسکتا ہے۔ اب صرف ایک طریقہ باقی ہے، کہ بچوں کو وظائف دئے جاویں، جس کو طاقت ہو وہ کوشش کرے، اور ان بچوں کی امداد کے لئے سرمایہ جمع کیا جاوے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ سخاوت اور فیاضی کا خیال مسلمانوں کے دلوں سے ابھی تک نہیں گیا، صرف مانگنے کا سسٹم اور طلب کا ذریعہ نہیں ہے جو قیل و قال کی مجلس ہوتی ہے جس میں خود کتا ہوں کہ سراسر بے سود۔ جب تجربہ نے بتا دیا کہ موجودہ طریقہ سے نہ باقاعدہ وصول کرنے کی کوشش جاری رہ سکتی ہے اور نہ روپیہ جمع ہو سکتا ہے تو ضرورت ہے کہ سال بھر کے لئے دو آدمی نوکر رکھے جاویں جو بطور ایجنٹ کے کام کریں کیونکہ آئری طور سے یہ کام نہیں چل سکتا۔ پیڈ ایجنٹ و نفیہ کے لئے روپیہ جمع کریں، اعلیٰ تعلیم کے فوائد بیان کریں، بچوں کو کلچر سمجھنے کی ترغیب دلائیں۔ قومی ہمدردی کا لوگوں کے دلوں میں جوش پیدا کریں۔ اس کے لئے فنڈ کی ضرورت ہے، جو نہ علیگڑھ کلچر میں صرف کیا جاوے، نہ کسی دوسرے کلچر میں بلکہ وہ فنڈ صرف کیا جاوے، ایجنٹوں کی تنخواہ میں اور کانفرنس کے دوسرے ضروری کاموں میں۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔



نمبر ۶۸

اسپیج

یہ اسپییج ۳۰ دسمبر ۱۹۰۷ء کو فوای صاحب بہادر نے افتتاح اجلاس کانفرنس پراہل مدراس کے شکر یہ میں فرمائی :-

حضرات !

آپ نے جس مہربانی اور عنایت سے میری تاپتیز خدمات اور ڈیلیگیٹوں کے یہاں آنے کے متعلق اظہار کیا ہے، اور جو کچھ شکریہ اس کی بابت ادا کیا گیا ہے، حقیقت میں جو عزت آپ نے مجھ کو بخشی ہے، اور جس مہربانی اور عنایت سے آپ نے اس کام کو انجام دیا ہے، میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں +

ہم لوگ اور نیز جس قدر ڈیلیگیٹ یہاں آئے ہیں ۱۴ سال کے عرصہ میں اس قدر خوشی اور تسلی کسی جگہ سے لیکر نہیں گئے، جیسی یہاں سے لئے جاتے ہیں، جس خوبی، اور جس عظمت، اور جس شان، اور جس محبت سے یہاں کی ایگزیکٹیو کمیٹی نے ہمارا استقبال کیا، وہ صرف قابل تعریف اور لائق ذکر ہی نہیں ہے، بلکہ قابل فخر اور لائق نمونہ ہے، جس کا نقش ہر ایک دل پر جو علیگڑھ سے یا اپرٹنڈیا سے یہاں آیا ہے، ہو گیا۔ باوجود اس کمی تعلیم کے جو یہاں ہے، نتیجہ برعکس نظر آیا۔ رمضان کے دنوں میں محنت اور تکلیف اٹھا کر ان اسپچوں اور رزوشنوں کو ۱۰ بجے سے ۵ بجے تک سنا۔ اور راتوں کو آن کر زولیوشنوں پر غور کرنا لائق شکر گزار ہی ہے، جو صاف صاف آزادانہ طور سے مگر اعتدال و مہمردی سے باہم اختلاف ہوا، وہ صفائی قلب اور نیک نیتی سے کیا گیا۔ وہ وہی اختلاف ہے، جس کی نسبت کہا گیا ہے، کہ اختلاف العلماء جمعہ ایک نے ایک بات کو مضرب سمجھا اور دوسرے نے مفید خیال کیا ایک نے سچائی اور نیکی کے ساتھ اپنا خیال ظاہر کیا دوسرے نے مبر و تحمل کے ساتھ اسے سنا اور اعتدال و منت کے ساتھ اس کی تردید کی۔ غرض کہ یہ اجلاس محبت اور اتفاق کے ساتھ ختم ہوا۔ مجھے اُمید ہے کہ جو بیج بویا گیا ہے، شجرہ استقامت اور طاقت اس کی آبیاری کرے گا تاکہ وہ پودہ بڑھ کر تناور درخت ہو جس کے پھل پھول نکلیں اور اس کا سایہ ایسا ہو جیسے برگہ کے درخت کا، نہایت امید اور قوی امید ہے کہ یہاں کے بزرگ کوشش کر بیٹھیں، اور آپس کا اختلاف مٹ جاوے گا۔ اور آپ کا مدرسہ ایسا ہی درست ہو جاوے گا۔ جیسی کہ اُمید کجاتی ہے +

اگلے سال جہاں کہیں کانفرنس ہوگی مجھے اُمید ہے کہ آپ کسی صوبہ سے بیچھنے نہ رہیں گے اور مدراس سے

بہت بڑا جمع ڈیلیگیٹوں کا موجود ہو گا، وہاں پھر آپ سے ملاقات ہوگی، میں نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ شمالی ہندوستان کے ڈیلیگیٹوں کی طرف سے ہند بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں ہوں، جو مختلف اضلاع سے یہاں آئے ہیں۔ یہاں کے ہندو نے نہ صرف ہمارے ساتھ ہمدردی ظاہر کی، اور نہ صرف بڑے نام شریک ہوئے، بلکہ ہم کو انہوں نے نیک مشورہ دیا۔ راجہ صاحب ترچنپلی بھی تشریف لائے، جب کہ تمام ہندوستان کے مسلمان سنی کے یہاں کچھ اختلاف نہیں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس قدر خوش ہوں گے۔ مجھے ایک معزز ہندو اسپیکر کی تقریر پر رشک آتا ہے، اور جی چاہتا ہے کہ میں ان کا شاگرد بنوں جو ہمدردی بھری تقریر انہوں نے کیں وہ قابل شکر ہے کہ میں، یہاں کے ایک ہندو جنٹلمین نے صحت روپیہ ماہوار کا وظیفہ ایک غریب مسلمان کو اس شرط پر دینا منظور کیا کہ ہم مسلمان بھی پندرہ پندرہ روپیہ ماہوار کے وظیفے ہم غریب مسلمانوں کو دیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب بچے ہو گئے، اور اس طرح ایک ہندو جنٹلمین نے ایک نہیں بلکہ ۵ وظیفے صحت روپیہ ہوا کر دیئے۔ میں آنریبل جس بدم صاحب کی تکلیف کا اور جو دلچسپی انہوں نے کانفرنس کے کاموں میں لی اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کرنل فارم بی صاحب پریسیڈنٹ اسٹقہالی کمیٹی ہر ایک شکریہ کے مستحق ہیں۔ میرے پاس اسی وقت غلام احمد صاحب بنگلوری نے خط بھیجا ہے ان کا بھتیجا علی گڑھ کالج میں تعلیم پاتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ”میرے بڑے بھائی جناب محمد عابد حسین خاں صاحب کی دلی آرزو تھی کہ آپ چونکہ یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں لہذا آپ کی دعوت کی جائے۔ لیکن میں اس خیال کا ہمیشہ سے مخالف ہوں اور جانتا ہوں کہ آپ قومی کام کے لئے ہوٹل میں قیام فرمانا اور ریلوے اسٹیشن کے وٹنگ دم میں ٹھیکر کریم کی تکلیف گوارا کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں لہذا سب سے دعوت کے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ آپ کی دعوت میں صرف ہو وہ آپ کے پاس نقد بھیج دیا جائے تاکہ آپ کسی قومی کام میں لگا دیں“ چنانچہ اس خط کے ساتھ انہوں نے سو روپیہ کا نوٹ بھی بھیجا ہے۔ لیکن کھانا میں نے اپنے پاس سے نہیں کھایا بلکہ میں حاجی محمد عبدالباقی بادشاہ صاحب کا مہمان رہا اور مفت کھانا کھایا لہذا اس سو روپیہ کے بھی وہی مستحق ہیں چنانچہ صحتیشنل فنڈ میں اور صحت انڈرسٹل اسکول میں دیدئے جاویں۔ آخر میں جملہ ممبران ایگزیکٹیو کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بالخصوص اپنے نوجوان عزیز دانشور کا جنہوں نے نہایت شوق اور دلچسپی کے ساتھ ہر قسم کی محنت اٹھائی اور دعا کرتا ہوں کہ خدا ان کی عمر میں برکت دے اور وہ قوم کے ستون ہوں۔



اسپیج

یہ تحریر نقیر نواب صاحب بہادر نے مئی ۱۹۱۲ء میں یونیورسٹی کمیشن کے روبرو بطور شہادت کے فرمائی ہے۔

عموماً ملک گورنمنٹ کا شکر گزار ہے کہ اُس نے رعایا کی تعلیم کا دنیا اپنا ایک ضروری فرض خیال کیا اور اس ضروری فرض کے ادا کرنے کے لئے وقت و فوج توجہ اور کوشش کی۔ اور ہندوستان کے مختلف صوبوں میں متعدد یونیورسٹیاں قائم کیں۔ مگر جو ہول یونیورسٹی نے تعلیم کے قرار دئے اور جو قواعد طریقہ تعلیم کے لئے مقرر کئے، اُس کی نسبت عام رائے یہ ہے کہ وہ تشفی بخش نہیں ہیں۔ نہ یونیورسٹی کی تعلیم اُس سے ملک کی خصوصاً اُس اعلیٰ درجہ اور شریف خاندانوں کی ضرورتیں اور پبلک کی شکایتیں خواہشیں پوری ہوئیں۔ نہ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کو جن کے خاندان علم کی تحصیل اور علمی مذاق میں شہور نئے کالجوں میں جانے اور مغربی علوم حاصل کرنے کی طرف کچھ رغبت اور توجہ ہوئی۔ یونیورسٹیوں کی ڈگری حاصل کرنا زیادہ تر اُسی فرقہ پر محدود راجا جو ملازمت پیشہ تھا۔ اور اُس صرف ایک گردہ مخنتی کام کرنے والوں کا پیدا ہو گیا۔ کالج جو ہندوستان میں یونیورسٹیوں کے قاعد اور احکام کی پابندی پر مقرر ہوئے، اُن میں بجائے اس کے کہ ایسی تعلیم دی جائے کہ عقل و ذہن کو ترقی ہو، اخلاق و کردار درست ہو، دماغی اور جسمانی قوتوں کو نشو و نما ہو، طوطے کی طرح باتیں یاد کروادینے پر زور دیا جاتا ہے۔ اور بجائے قوت مدرکہ کے قوت حافظہ کی پرورش کی جاتی ہے۔ مگر اس قسم کی ناقص تعلیم الزام حقیقت میں یونیورسٹی پر ہے نہ کالجوں پر۔

مروجہ سرسید احمد خاں مرحوم کی یہ رائے جو کسی موقع پر انہوں نے ظاہر کی تھی یونیورسٹی کی تعلیم کی نسبت حقیقت میں صحیح ہے کہ ”یونیورسٹی اپنے امتحانوں میں طالب علموں کی اعلیٰ استعداد اور اُن کی اخلاقی تعلیم و تربیت سے کچھ غرض نہیں رکھتی۔ صرف اپنے سوالات کے جوابوں سے غرض رکھتی ہے۔ اور ہم نہیں جانتے کہ امتحان کمال جوابوں کے نمبر دینے میں کہاں تک غور کرتے ہیں۔ پس اس صورت میں کالج بجز اس کے کہ اپنے طالب علموں کو طوطے کی طرح یاد کر کے امتحان کے لئے تیار کریں اور کیا کر سکتے ہیں۔ یونیورسٹی تمام ملک کی تعلیم پر پورا اقتدار رکھتی ہے اور وہی تعلیم کو اچھا یا برا کر سکتی ہے۔ کالجوں کو جو اس کے ماتحت ہیں کچھ اختیار نہیں ہے یا بہت ہی کم اختیار ہے۔“ جن وجوہ سے ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی نسبت یہ عام خیال ہے، اُن میں سے بعض

اسباب یہ ہیں :-

مضامین کی کثرت

اول۔ مضامین کی کثرت۔ اگر تعلیم کا اصلی مقصد تو اسے عقلیہ کو ترقی دینا، اور دماغ میں ایسی قوت پیدا کرنا ہے جو کسی شخص کو زندگی کی کشمکش کے واسطے لائق بنادے اور علم کے کسی شعبہ میں پوری استعداد پیدا کر دے، تو مضامین کی کثرت اس مقصد کی مزاحمت ہے۔ ایک طالب علم کا دماغ ایسے مختلف مضامین سے بھر دینا جن کو وہ اس وقت بھول جاتا ہے، جبکہ امتحان کا خوف باقی نہیں رہتا۔ تعلیم کا اصلی مقصد وہ نہیں ہو سکتا۔ کثرت مضامین نے کریننگ کی عادت پیدا کر دی ہے جو دماغ پر بڑا اثر کرنے والی اور اصلی علمی مذاق پیدا کرنے کی مانع ہے۔ انٹر میڈیٹ کلاس کو لیجئے۔ اُس میں پانچ پانچ مضمون پڑھائے جاتے ہیں اور پانچوں میں امتحان دینا اور معینہ نمبر حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور مضامین ایک دوسرے سے ایسے مختلف ہیں کہ کسی ایک مضمون کی طرف پوری توجہ کرنا اور ان میں سے کسی خاص علم میں کافی استعداد حاصل کرنا ناممکن نہیں۔ دیکھی ایک مضمون میں پوری لیاقت پیدا کرنا دوسرے مضمون کی کمزوری کا معاوضہ ہو سکتا ہے۔ اور طالب علم مجبور ہے کہ تمام مضامین کو ایک ہی متوسط درجہ تک سیکھے اور اپنی داغی قوت کو علم کے اُس شعبہ میں صرف کرے جس میں وہ کمزور ہے۔ اور جس سے اُس کو طبعی مناسبت نہیں ہے، اس طریقہ تعلیم سے سیکڑوں داغ خراب ہو جاتے، اور اصلی علم کے حاصل کرنے سے باز رہتے ہیں۔ اگر بجائے پانچ کے تین مضامین انٹر میڈیٹ کے واسطے قرار دئے جاویں اور مضامین طالب علم کو اختیار کرنے چاہئیں اُن کی نسبت اُس کو کسی قدر پسند کرنے کا اختیار دیا جائے تو زیادہ مفید ہوگا۔ اور بعض مضامین زیادہ نر کمال کے ساتھ حاصل کئے جاسکیں گے۔

بی۔ اے، کے امتحان میں بھی تین مضامین زیادہ ہیں اُن کی تعداد بھی کم کر دینی اور بجائے تین کے دو مضمون مقرر کرنے زیادہ مفید ہونگے۔

دوم۔ امتحانات کی سختی اور بیقاعدگی۔ اس بات کی عام شکایت ہے کہ امتحان کا طریقہ ایسا واقع ہوا ہے کہ معلم اور طالب علم کی توجہ بجائے ترقی دینے قوت مطالعہ اور

امتحانات کی سختی

اور بے قاعدگی

پیدا کرنے اصلی استعداد کے امتحان میں معینہ نمبر پانے کی طرف مائل رہتی ہے۔ اور حافظہ اس قدر واقعات اور سوالات کے تیار جوابات سے بھر جاتا ہے جس قدر کہ وہ قبول کر سکتا ہے۔ نوٹوں کا زبانی یاد کرنا جس سے طالب علم سوالات کے جوابات دینے کے لائق ہو جائے، ضروری سمجھا جاتا ہے۔ امتحان سخت لیا جاتا ہے اور نسبت کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں کے زیادہ مشکل اور غیر مفید ہوتا ہے، اور اُس میں وہی پاس ہوتا ہے، جس نے کتابوں کے نوٹ زبانی خوب یاد کر لئے ہوں اور جن کے یاد کرنے سے بجز امتحان پاس کرنے کے اکثر بہت کم فائدہ ہوتا ہے۔

امتحان کی بیقاعدگی کی بھی شکایت ہے، اور اس کی تصدیق پاس شدہ طلباء کے اوسط فیصدی

کی اس عجیب کمی بیشی سے ظاہر ہوتی ہے جو مختلف سالوں کے نتیجہ امتحان دیکھنے سے معلوم ہوتی ہے۔ ہر ایک چیز میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ سالانہ اوسط فیصدی میں بہت بڑا تغیر نہیں ہوتا۔ یہاں کہ پیدائش اور موت کا پرنسپل بھی قریب قریب برابر رہتا ہے۔ تو اس وقت ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ یونیورسٹی کے امتحانات کے کامیاب طلباء کا اوسط کبھی بہت کم اور کبھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور جب یہ خیال کیا جائے کہ تعلیم پانے والے طالب علم اور تعلیم دینے والے کالج اور تعلیمی کورس میں کچھ غیر معمولی اختلاف نہیں ہوتا تب نتائج امتحان کے غیر معمولی اختلاف کا سوا اسے اس کے کہ طریقہ امتحان میں بیجا عددی ہے دوسرا کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا۔

کامیاب طلباء کی اوسط فیصدی میں کمی بیشی جو حسب ذیل ہے :-

سند	اوسط فیصدی	سند	اوسط فیصدی
۱۸۸۳	۵۰	۱۸۸۷	۶۶
۱۸۸۵	۳۴	۱۸۸۸	۴۴
۱۸۸۶	۳۰	۱۸۸۹	۲۴

الہ آباد یونیورسٹی کے کامیاب طلباء کا اوسط فیصدی چند سال کی بابت انٹرنس و ایف اے

اور ایل ایل بی کے مفصل ذیل ہے :-

سند	انٹرنس	ایف اے	ایل ایل بی
۱۸۸۹	۵۴	۴۵	۵۰
۱۸۹۰	۴۴	۵۵	۴۴
۱۸۹۱	۴۷	۴۳	۳۶
۱۸۹۲	۴۰	۳۱	۴۶
۱۸۹۳	۴۲	۵۲	۴۹
۱۸۹۵	۳۱	۳۳	۳۱
۱۸۹۶	۴۰	۳۹	۲۳
۱۸۹۷	۵۵	۴۱	۲۱
۱۸۹۸	۳۸	۲۷	۲۴
۱۸۹۹	۵۶	۴۸	۲۷
۱۹۰۰	۴۲	۲۸	۱۳
۱۹۰۱	۴۳	۳۷	-

ان اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انٹرنس کے امتحان میں کسی سال میں (۶۶) فیصدی طلباء کامیاب ہوئے اور کسی سال میں صرف (۲۴) فیصدی، ایف اے میں اگر کسی سال میں (۵۵) فیصدی پاس ہوئے تو دوسرے سال میں صرف (۲۴) فیصدی۔ ایل ایل بی کے امتحان کی بنیادگی اور بھی حیرت انگیز ہے۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں (۵۰) فیصدی پاس ہوئے تھے اور سنہ ۱۸۹۹ء میں کل (۱۳) فیصدی پاس ہوئے۔

صوبہ اودھ کی وکالت کے امتحان کا اوسط اور بھی افسوسناک ہے جو مفصل ذیل اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوگا۔

سنہ	اوسط فیصدی
۱۸۹۸	۷۲.۶۲
۱۸۹۹	۲۱.۰۳
۱۹۰۰	۳۶.۵۰
۱۹۰۱	۳۵.۳

ایک مضمون میں فیل ہونے پر مضامین امتحان کے متعلق یہ قاعدہ بھی نہایت سخت ہے کہ اگر کوئی طالب علم میں دوبارہ امتحان لینا۔ کسی ایک مضمون میں بھی فیل ہو جائے تو پھر دوبارہ کل مضامین میں اس کا امتحان لیا جاتا ہے۔ یہ قاعدہ اس قدر سخت اور ایسا معزز ہے کہ اس قاعدہ کے بنانے اور اب تک اس کے قائم رہنے پر نہایت تعجب ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے اس کے کہ ایک ہونہار طالب علم کی عمر کا ایک سال ضائع ہو اور جو اس نے پڑھا ہے اس کو پھر ایک سال تک اور پڑھنا رہتا ہے، کوئی خاص فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔

سیکنڈ لینگویج کی سوم۔ سیکنڈ لینگویج کی غیر مفید تعلیم۔ فارسی یا عربی کی تعلیم جس طرح غیر مفید تعلیم۔ یونیورسٹیوں میں ہوتی ہے وہ نہایت مہمل اور بے سود ہے۔ میں نے خود بہت سی بی۔ اے اور ایم اے، دیکھے ہیں جنہوں نے فارسی یا عربی میں ڈگری حاصل کی ہے مگر ان کو کچھ نہیں آتا۔ اس زبان میں گفتگو کرنے کی لیاقت ان میں پائی گئی، نہ تحریر کرنے کی قوت۔ امتحان کے لئے کچھ نظم و نشر زبانی یاد کر لی تھی، اور کتابی امتحان دیکر فارغ التحصیل ہو گئے تھے، مگر اس کے بعد وہ اسے بھی بھول گئے، اور اس پڑھنے کا کوئی فائدہ ان کو حاصل نہ ہوا۔ وہ خود اس قسم کی تعلیم کے شاکی اور اپنی عمر کے ضائع ہونے پر متاسف ہیں۔ زبان سیکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے خیالات بذریعہ تحریر یا تقریر کے اس زبان میں ادا کر سکے۔ اگر سیکنڈ لینگویج کی تعلیم اتنی بھی نہ ہو کہ اس کا سند یافتہ لکھنے اور بولنے کی لیاقت معمولی رکھتا ہو تو اس کے سیکھنے سے آخر کیا حاصل ہے اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ یونیورسٹی اور مدرس

اور طالب علم سب کے سب کامیابی صرف امتحان کے معینہ نمبر حاصل کرنے کو سمجھتے ہیں۔ اصلی استعداد حاصل ہونے کا مطلق خیال نہیں رکھتے۔ اور امتحان اس طریقہ سے لیا جاتا ہے جس سے اس بات کا دریافت کرنا منظور ہوتا ہے کہ کتاب اور اس کے نوٹ یاد ہیں یا نہیں۔ اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ جس زبان میں امتحان لیا جاتا ہے، وہ اس کو آتی بھی ہے یا نہیں۔ اور آئندہ مدرسہ چھوڑنے کے بعد اس کا کچھ فائدہ حاصل بھی ہو گا یا نہیں۔ سینکڑوں لینگوج کی تعلیم جو یونیورسٹی میں دیکھائی ہے نہایت حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ علاوہ کورس کے نقص اور تعلیم کے ناقص طریقہ کے عربی فارسی نہ کرنے کا بڑا سبب یہ ہے کہ استاد اچھے نہیں ہوتے۔ اور اکثر ان میں سے خود اس زبان کو بھی طرح نہیں جانتے، جن میں وہ تعلیم دیتے ہیں، اور بجائے اس کے کہ شاگردوں کو کتاب کا مطلب فارسی یا عربی میں بتائیں اور اسی زبان میں گفتگو کریں۔ اردو میں مطلب سمجھاتے ہیں اور اردو ہی میں استاد و شاگرد بات چیت کرتے ہیں۔

جہاں استاد خود لائق ہیں اور ان کو عربی فارسی کا خود مذاق ہے ان کی تعلیم کا اثر اچھا دیکھا گیا ہے۔ ان کا طرز تعلیم طریقہ بیان سمجھانے کا طور۔ اور خود ان کی صحبت علمی مذاق شاگردوں میں پیدا کر دیتی ہے شمس العلماء مولوی سید امجد علی صاحب اور پروفیسر آزاد و شخصوں کو میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے کام کے لئے نہایت موزوں پائے گئے۔ اور ان کے شاگردوں میں ان کی تعلیم کا اثر دیکھا گیا۔ خصوصاً پروفیسر آزاد کے شاگرد بعض ایسے ہیں جن کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس زبان کو جانتے ہیں جو انہوں نے سیکھی۔ ان میں ایسا مذاق پیدا ہو گیا کہ جو کچھ انہوں نے پڑھا تھا اس میں ترقی کی۔ اور ان کی لیاقت قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی، ان میں سے مولوی شیخ خلد نقاد، محمد قبال، حکیم امین الدین، اعجاز حسین، احمد حسین خاں، فضل حسین کا نام لے سکتا ہوں۔ اگر سینکڑوں لینگوج کی تعلیم اور طریقہ تعلیم اور انتخاب کتب اور انتخاب معلمین میں باہر کے لائق اور ماہر عالموں سے مدد لی جائے اور ایک کمیٹی خاص اس کے لئے مقرر ہو، تو میرے نزدیک اس سے موجودہ نقص کی بہت اصلاح ہو سکتی ہے۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ انجیل مولوی سید حسین صاحب بلگرامی شخص جن کی عربی و فارسی کی لیاقت ویسی ہی مسلم ہے، جیسی کہ انگریزی کی یونیورسٹیز کمیشن کا ممبر ہے بہت کچھ توقع سینکڑوں لینگوج کے مفید ہونے کی پہلک کو ہے۔

تعلیم پوزیٹ کے یونیورسٹی کی تعلیم کی نسبت یہ عام شکایت ہے کہ اس کے تعلیم یافتہ کبیرج اور اسکورڈ کی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتوں کی طرح نہیں ہوتے۔ اور اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ نہ تربیت کا کچھ انتظام ہے، نہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا بندوبست ہے۔ اور چونکہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایسے ملک میں جہاں مختلف قسم کے ایسے مذہب اور اتنے فرقے ہوں جن کے

خیالات اور عادات اور مراسم باہم متناسق اور متوازن ہوں۔ گورنٹ ایسا انتظام تربیت اور مذہبی تعلیم کا اپنے ذمہ نہیں لے سکتی، جو ہر طبقہ اور ہر فرقہ کی حاجتوں کو پورا کرے۔ اس لئے مشکل گورنٹ سے حل نہیں ہو سکتی۔ تربیت اور مذہبی تعلیم ایک قومی ضرورت ہے، جس کو ہر قوم اپنے خیالات اور اپنی خواہشات کے موافق پورا کر سکتی ہے۔ البتہ چند اصول کی پابندی کے ساتھ گورنٹ نہایت خوشی کے ساتھ ہر قوم کو مدد دیکھتی ہے۔ چنانچہ بعض فرقے ان ضرورتوں کے پورا کرنے کا خیال کر رہے ہیں۔ اور بعض مقامات پر خاص قومی کالج بھی بنائے گئے ہیں اور بنائے جا رہے ہیں۔ مگر کالج کا بنانا، اور تربیت کا پورا انتظام کرنا آسان کام نہیں ہے، اس کے لئے بہت کچھ بیاقت، ہمدردی، تجربہ، استقلال، اور دوراندیشی کی حاجت ہے، کالج مینٹرل جہاز کے ہے، اور وہی جہاز سلامتی سے کنارہ پر پہنچتا ہے جو عمدہ طور سے بنایا گیا ہو۔ جس کے بنانے والے ماہر اور شاق ہوں، اور جس کا نا خدا ہوشیار اور تجربہ کار ہو۔

کسی کالج کی تعلیم بغیر تربیت کے پوری نہیں ہو سکتی، مگر جن کو تجربہ ہے، اور جو تربیت کی مشکلات سے واقف ہیں، وہ خوب جانتے ہیں، کہ کالج بنالینا آسان ہے۔ مگر تربیت کا انتظام کرنا نہایت مشکل ہے۔ تربیت کے لئے ایسے بورڈنگ ہوس کی ضرورت ہے جو کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے اصول پر قائم کیا گیا ہو۔

بورڈنگ ہوس کی ضرورت
آج کل ہر ایک کی زبان پر بورڈنگ ہوس کا لفظ ہے، اور اس کے قائم کرنے کی صدا ہر طرف سے آرہی ہے۔ مگر غالباً بہت کم لوگ ہونگے جنہوں نے اس پر غور کیا ہو، کہ بورڈنگ ہوس کیا چیز ہے۔ اور جو فوائد اس کے قائم کرنے سے حاصل ہو چاہئیں وہ کیا ہیں اور کیوں حاصل ہو سکتے ہیں۔

اگر بورڈنگ ہوس سے یہ غرض ہے کہ بہت سے لڑکے ایک جگہ جمع کر دئے جاویں، اُن کے رہنے کے لئے حجرے بنا دئے جاویں، اُن کے کھانے پکانے کا بندوبست کر دیا جائے، اور کچھ تعلیم کوئی شخص یا کوئی کمیٹی اس کی نگرانی کے لئے مقرر کر دیا جائے۔ تو ایسے بورڈنگ ہوس کو سرائے اور مسافر خانہ کہنا موزوں ہوگا۔ تاکہ بورڈنگ ہوس۔ جو تجربہ ذاتی ۲۵ برس سے مجھے حاصل ہے، اس کے لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ بورڈنگ ہوس کا قائم کرنا نہ صرف مشکل، بلکہ بعض صورتوں میں پرخطر ہے۔ مختلف صوبوں کے متعدد بورڈنگ ہوس جو جدید خیال کی پیداوار ہیں، میں نے دیکھے ہیں اکثر بورڈنگ ہوس ایسے پائے جو نہایت بُرے موقع پر بنائے گئے ہیں۔ مکانات ایسے تنگ تاریک ہیں جن میں ہوا اور روشنی بھی اچھی طرح نہیں پہنچتی۔ بعض ایسے بھی دیکھے جن کی عمارت آہنی ہے دیکھنے میں خوشنما بھی ہیں، تو اعداد بھی جو کاغذ پر لکھے گئے ہیں، اچھے ہیں۔ مگر حالت اُن کی کیا ہے؟

نہ اُن کا انتظام اچھا ہے، نہ کسی قسم کی نگرانی ہے، نہ اُن کے سونے اور جاگنے اور فرائض نہ بھی ادا کرنے کا وقت معین ہے، نہ کوئی ایسا سامان ہے، جس کا عمدہ اثر اُن کے اخلاق اور کرکٹر پر پڑے نہ بورڈروں کو عمدہ صحبت لائق پروفیسر اور استادوں کی نصیب ہے، نہ کوئی اُن کا ایسا رہنما ہے، جس کو وہ اپنے لئے نمونہ سمجھیں۔ اور جس کا اثر اُن پر پڑے، یہاں تک کہ کوئی اس بات کا دیکھنے والا نہیں ہے کہ وہ بازاروں میں جانے اور صحبت میں بیٹھنے سے بچیں۔ اور وہ ترغیبات جو فطرتاً نوجوانی میں پیدا ہوتی ہیں، اُن کے روکنے تھامنے کا کوئی بندوبست ہو۔ میرے ہی دل پر ایسی حالت کے دیکھنے سے بُرا خیال پیدا نہیں ہوا، بلکہ بعض بورڈنگ ہوس کے اُن لڑکوں نے جو بطور بورڈر کے وہاں رہتے تھے، خود شراہیت کی، اور کہا کہ یہ بورڈنگ ہوس نہیں ہے بلکہ سڑے ہے، جو قواعد بنائے گئے ہیں وہ صرف کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں، کوئی اُن کی تعمیل کرانے والا نہیں۔ جو نمبر اور نگران اور منتظم مقرر ہیں وہ براے نام ہیں، مہینوں نہ ہم اُن کی صورت، نہ وہ ہماری شکل دیکھتے ہیں۔ ہم صرف اس ضرورت سے یہاں رہتے ہیں کہ یہ مکان مدرسہ کے قریب ہے اور ہم شہر میں آنے والے کی تکلیف سے محفوظ ہیں۔

بورڈنگ ہوس جس پر یہ لفظ صادق آسکے اور جس سے اُس کا اصلی مقصد حاصل ہو اُس میں اتنی باتوں کا ہونا ضرور ہے۔

۱۔ بورڈنگ ہوس کا انتظام ایسے لوگوں کے سپرد ہونا، جو اُس کے اصول اور قواعد سے واقف اور اُس کا تجربہ رکھتے ہوں۔

۲۔ اعلیٰ درجہ کا اور پورا اسٹاف ہونا۔
 ۳۔ بورڈنگ ہوس اور بورڈروں کے رہنے کے مکانات کی صفائی اور اُن کو صحت بخش حالت میں رکھنا۔

۴۔ حالت بیماری میں اُن کے معالجہ کی نگرانی کرنا۔
 ۵۔ کھانے کا عمدہ اور صحت بخش ہونا۔
 ۶۔ جسمانی صحت اور ورزشوں اور مردانہ کھیلوں کا انتظام۔
 ۷۔ مذہبی تعلیم اور روشن خیال علم کی صحبت۔
 ۸۔ ایسے کلب اور سوسائٹیوں کا ہونا جو تحریر اور تقریر کی قوت اور غور و خیال کے مادہ کو ترقی دیں۔

سب سے ضروری اور تصفیہ طلب یہ ہے، کہ بورڈنگ ہوس کا انتظام کس کے سپرد ہو اور کون اس کا ذمہ دار کیا جاوے۔ کلج جن کے ساتھ بورڈنگ ہوس۔ یا گورنمنٹ کلج ہونگے یا قومی کلج۔

جو کالج گورنمنٹ کے ہیں اُن کے بورڈنگ ہوس کا انتظام گورنمنٹ کر نہیں سکتی۔ کیونکہ ان تمام کاموں کا پورا کرنا، نہ گورنمنٹ سے ہو سکتا ہے، نہ گورنمنٹ اپنے ذمہ لے سکتی ہے، نہ گورنمنٹ کالجوں کے یورپین عمدہ داروں کے ذمہ بورڈنگ ہوس کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ بنگال کے بعض اسکولوں میں سرکار نے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور بذریعہ کمیٹی کے اُس کا انتظام کیا جاتا ہے۔ مگر وہ مقصد جو بورڈنگ ہوس ہے اُس سے حاصل نہیں ہوتا۔

باقی رہے قومی کالج۔ اُس کی دو صورتیں ہیں:-

ایک یہ کہ کالج ایسا ہو جس کے پرنسپل اور پروفیسر سب ہندوستانی ہوں، ایسی حالت میں ضرور ہوگا کہ بورڈنگ ہوس کا انتظام بھی اُنہیں کے ذمہ ہو۔ مگر میری رائے میں نہ ایسے کالج، نہ ایسے بورڈنگ ہوس ایسے لوگ پیدا کر سکتے ہیں جن میں وہ تمام صفات جمع ہوں جو اعلیٰ تعلیم اور عمدہ تربیت حاصل ہوتی ہیں مگرچہ میں دوسرے فرقوں کی نسبت ایسا نہ کر سکوں۔ مگر اپنی قوم مسلمانان کے لئے یقیناً یہ بات کر سکتا ہوں۔ کہ وہ کالج جس میں اعلیٰ درجہ کے شریف، انیک، مہذب، اور ہمدردی رکھنے والے کیمبرج اور اکسفورڈ کے تعلیم یافتہ پرنسپل اور پروفیسر نہ ہوں، ہرگز ایسا کالج نہیں ہو سکتا جو ہمارے اغراض کا پورا کرنے والا ہو، نہ اُس کا بورڈنگ ہوس گو اُس کی عمارت کیسی ہی اچھی ہو، اور اُس میں کثرت سے بورڈرز بھی رہتے ہوں، ایسا بورڈنگ ہوس نہیں ہو سکتا جسے جو بورڈنگ ہوس کہا جاسکے۔

بورڈنگ ہوس کا انتظام بغیر دوسرے ایسا کالج ہو جس کے اسٹاف میں لائق یورپین ہوں۔ اُس کی نسبت یورپینانہ کر کے نہیں ہو سکتا۔ یہ سوال ہے، کہ بورڈنگ ہوس کی نگرانی اور ذمہ داری کس کے ہاتھ میں ہونی چاہئے اکثر ایسے کالج کے لئے کوئی ہندوستانی کمیٹی ہوتی ہے، اور اُس کا انتظام ٹرسٹیوں کے ذمہ ہوتا ہے اگرچہ اُن میں اکثر عالم اور قابل اور منتظم ہوتے ہیں، مگر بہت کم اُن میں ایسے پائے جاتے ہیں جو بورڈنگ ہوس کے طریقوں اور اُس کے قواعد سے واقف ہوں۔ اور جن کو خود بورڈنگ ہوس میں رہنے کے فوائد اور اُس کے طریقے معلوم ہوں۔ اس لئے ضرور ہے کہ بورڈنگ ہوس کا انتظام اور اُس کی ذمہ داری یورپین پرنسپل اور اس کے اسٹاف پر بہ پابندی خاص قواعد کے چھوڑ دیا جائے۔ اس کی ضرورت علاوہ اس کے کہ ہندوستانیوں میں بہت کم اس قسم کے اسٹیٹیشن کا ذاتی تجربہ رکھنے والے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ تربیت کو تعلیم سے علیحدہ کرنا نامناسب بلکہ مضر ہوگا۔ بورڈنگ ہوس کے عام انتظام کی امید جیسی کہ ہم ایک یورپین پرنسپل سے کر سکتے ہیں جو کیمبرج یونیورسٹی میں خود رہا ہو، اُس کی امید کسی اپنے مولوی یا کسی اپنے ٹرسٹی سے نہیں کر سکتے، البتہ اس بات کا دیکھنا ضرور ہوگا کہ جس انگریز کے ہاتھ میں ہم اپنے بچوں کی تربیت سپرد کریں ہمارا ہمدرد ہو، ہمارے اغراض کو پیش نظر رکھے، ہم سے دوستاں اور ہمدردانہ بننا اور رکھنے والا ہو، اور ہمارے مقررہ قواعد کا پابند ہو۔ مگر صرف انگریزی اسٹاف پر بالکل چھوڑ دینا اور

اس کو تو سخت رکھ دینا بھی مناسب ہوگا۔ بلکہ اپنی نگرانی ہمیشہ قائم رکھتی اور اس بات کا دیکھنا کہ وہ اپنے یورپین افسر کے ساتھ ایک فرائض قوا اعد مقررہ کے مطابق انجام دیتے ہیں یا نہیں، ضروری ہے۔ سوال مسلمان عالم کا بھی ہوتا۔ اس کے ہم اپنی روحانی اور اخلاقی تربیت اور اپنی قومی تہذیب اور قومی خصال کے قائم رکھنے اور قومی فیلنگ پیدا کرنے کی توقع کسی غیر قوم کے آدمی سے گو وہ کیسا ہی اچھا ہو، نہیں رکھ سکتے۔ یہ کام ہماری ہی قوم کا آدمی کر سکتا ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ ہم ان باتوں کی نگرانی کے لئے بورڈنگ ہوس میں ایک ایسا لائق، روشنیگیر، اور غیر متعصب، مسلمان بھی انگریز پرنسپل کے ساتھ رکھیں جو اپنی اسلامی تہذیب و شائستگی کے ساتھ موجود زمانہ کی ضروریات سے بھی واقف ہو۔ جو انگریزوں کے ساتھ ملکر اچھی طرح کام کر سکے۔ اور جس کا روحانی اور اخلاقی مذاق ان کوں پراچھا پاڑے۔ تاکہ ہمارے لڑکے اپنے مذہب، اپنی شائستگی، اپنے اخلاق اسے بے بہرہ ہو کر رہے انگریز نہ بن جائیں۔ اور بچاے برکت کے ہمارے حق میں مصیبت نہ ہو جائیں۔

ایک اور وقت بورڈنگ ہوس کے قائم کرنے اور آئندہ اس کے انتظام میں یہ کہے ہوئے گاہکوں کے مالک محنت راہ اور قواعد کے تجویز کرنے والے ہندوستانی ہونگے، اور اس کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں دینا ہوگا۔ اس حالت میں اکثر ایسی مشکلات پیش آویں گی۔ جن کا حل کرنا کچھ آسان نہ ہوگا، یورپین سٹاف اور مسلمان ہندوستانیوں اور انگریزوں کے خیالات اور عادات اور مزاج ایسے مختلف متعلقوں کا ہم جھگڑا ہے۔ واقع ہوئے ہیں کہ دونوں کا مل جل کر کام کرنا مشکل ہے۔ بورڈنگ ہوس کے پیدل ہونے کا اندیشہ۔ کام کرنے والے انگریزوں کو اپنا ماتحت سمجھنے اور ان سے اپنے احکام کی تعمیل کرنا چاہیے۔ اور انگریز باطنی خود غرضی کی خواہش کرینگے۔ اور اکثر اپنے آقاؤں کے احکام اور قواعد کی پابندی دل سے نہ کریں گے۔ اور ان کی ایسی خواہشیں جو ان کے نزدیک نا واجب اور ناجائز ہوں کبھی پوری نہ کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ باہم ان کے جھگڑاے ہونگے۔ اور اس کا اثر انتظام پر پڑے گا۔ اس لئے ضرور ہے کہ دونوں گروہوں کے حدود و اختیارات صاف صاف مقرر کر دئے جائیں اور آقاؤں اور ملازم کے کاموں کی تشریح اور تصریح کر دی جاوے۔

مدرسۃ العلوم علیگڑھ میں مرحوم سر سید احمد خاں کے زمانہ میں کالج کے ٹریسٹیوں اور شاف کے باہم بھی کسی قدر وقت پیش آئی تھی۔ اس وقت کالج کے ایک معزز ٹریسٹی حاجی محمد اسماعیل خاں صاحب نے اس مشکل کے حل کرنے کے متعلق ایک نہایت عمدہ رائے لکھی تھی، جو ہمارے نزدیک بطور ایک ستور العمل کے ہے۔ اور علیگڑھ کالج میں اسی کے مطابق عمل ہو رہا ہے، حاجی صاحب لکھتے ہیں کہ:-

”اس کالج کا مقصد یہ ہے کہ مابین انگریزوں اور مسلمانوں کے صرف بانی ہی نہیں بلکہ عملی محبت پیدا کر لی جائے۔ نیز کالج کے تناگروں کو یورپین ڈھنگ پر کام کاج کرنے، صفائی سے رہنے، رہنمائی

سے زندگی بسر کرنے، اور سنگت مزاج ہونے کی تعلیم دی جائے۔ اور اس مقصد کے چل سونے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ انگریزوں کو بھی اپنے کام میں عملاً نہ صرف زبانی شریک کیا جائے۔ اور شاگردوں کے متعلق نہ صرف تعلیم بلکہ تربیت بھی انگریزوں کے حوالہ کی جائے۔ اور بورڈنگ میں انگریزوں کی مداخلت بہت کچھ بڑھا دی جائے۔ اور چونکہ ریسٹی اور کالج کے ملازمین دو جدا جدا گروہ ہیں، اور ان میں باہم وہی تعلق ہے جو آقا اور ملازم میں ہوتا ہے، اس تعلق کو کاٹنا اور خوش اسلوب بنانے کے واسطے لازم ہے کہ نہ صرف ملازموں کے حدود اختیار نظر رکھے جائیں، بلکہ آقا کے حدود اختیار بھی محدود ہونا چاہئیں۔ تاکہ ہر ایک گروہ اپنے فرائض منصبی کے انجام دینے میں آزاد ہو، اور اپنے آپ کو ذمہ دار اور جواب دہ اپنی خدمات کا سمجھ کر اس کے حسن انتظام میں مصروف رہے۔ جو افسوسناک تحریریں۔۔۔۔۔ کی طرف سے پرنسپل یا کالج اتھارٹی کے مخالف پرنسپل کی طرف سے۔۔۔۔۔ کے خلاف ہوئیں وہ حقیقت تجربہ بل خرابی انتظام کا جو اول تھا یعنی عدم تعین حدود و مابینات آقا و ملازم (ٹرسٹینڈ کالج اسٹاف) جس کا اب قطعاً انتظام ہو جانا چاہئے یعنی ٹرسٹیوں کے کام یا خدمات صرف یہ ہونا چاہئیں:-

۱۔ فراہم کرنا روپیہ کالج کے مقاصد کے واسطے +

۲۔ عمدہ طور سے نگرانی اور مناسب طور سے صرف کرنا اس روپیہ کا جو وصول ہو چکا ہے۔ یا آئندہ وصول ہو +

۳۔ نگرانی کرنا اس بات کی کہ اس کے ماتحت بورڈین ملازم اور دیسی ملازم اپنے فرائض منصبی کو پورے طور پر انجام دیتے ہیں یا نہیں۔ اس کے سوا اگر ٹرسٹی یہ چاہیں کہ داروغہ عمارت بھی جو بنیں پرنسپل بھی خود ہوں، پروفیسر اور پچھلے خود ہوں، یا بورڈنگ ہوس کے منبر اور گورنر بھی خود ہوں تو ان کا انجام یہ ہو گا کہ:-

اول۔ تو بوجہ عدم الفرصتی کے ان کو اتنا وقت نہیں ملیگا کہ وہ کالج کے متعلق کسی خدمت کو بھی انجام دیں گے +

دوم۔ بوجہ آقا ہونے کے اگر خود مختار انداز سے اپنے حدود اختیار سے باہر قدم کھینگیں، اور اس میں بجا نہ گروہ ملازم یا ان کے ہم ردیف ٹرسٹیوں کے مزاحمت ہوگی، تو کام کا خاتمہ ناگوار اور برا و کن باتوں پر ہو گا +

اگرچہ علیگڑھ کالج کا انتظام ایک نہایت لائق اور ہمدرد یورپین پرنسپل کے متعلق ہے، ایک تجربہ کار جفاکش، یورپین پروڈسٹ اس کا نگران ہے۔ ایک تجربہ کار محنتی پراکٹر اور چند پراکٹر بھی مقرر ہیں۔

اور بعض ٹرسٹی بھی اُس میں کام کرتے ہیں۔ مگر ابھی اُس کے پورا کرنے کے لئے بہت کچھ خرچ کرنے، ہسٹا بڑھانے، لائق سپرائز کر دینا کرنے، اُن کے رہنے کے لئے کالج کے احاطہ میں مکان بنانے، خلاقیت نگرانی کے لئے ایک روشنفکر عالم کے مقرر کرنے، اور دیگر ضروری کاموں کی تکمیل کی حاجت ہے۔ اور روزانہ اس قدر مشکلات پیش آتی ہیں، اتنے نقص دکھائی دیتے ہیں، اور اتنے جھگڑے ہوتے ہیں، جن کی اصلاح اور طے کرنے میں بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، اور بنسبت تعلیم کے اس کام میں پرنسپل اور پروفیسر اور پراکٹر کا وقت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ ان وقتوں اور مشکلات پر جو شبانہ روز میں علیگڑھ کے بورڈنگ ہوس میں دیکھتا ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر جگہ بغیر انگریزی اسٹاف اور بغیر کثیر اور بغیر منت ثباتہ کے کیونکر آسانی سے بورڈنگ ہوس قائم ہو سکتے ہیں۔

بورڈنگ ہوس کے اخراجات بالقرض ایسے بورڈنگ ہوس قائم بھی ہو سکیں۔ مگر اُن کے قائم کرنے سے پیشتر دیکھ لینا ضرور ہے، کہ اُس میں کافی تعداد بورڈر آویگئے بھی یا نہیں۔ عمدہ بورڈنگ ہوس میں رہنے کے لئے بہت خرچ درکار ہوتا ہے۔ اور ایسے کاموں میں بورڈروں کو روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جس کا براہ راست امتحان کے نتیجوں پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ میں مسلمان بورڈنگ ہوسوں کی نسبت کہہ سکتا ہوں کہ اُن میں ایسے بورڈروں کا کافی تعداد سے آتا جو اُس کے مصارف کے تحمل ہوں نہیں پہلے پہل اول تو مسلمان عموماً منہل ہیں خرچ کر نہیں سکتے۔ دوسرے تعلیم پر خرچ کرنا وہ بطیب خاطر گوارا نہیں کرتے خصوصاً ایسی باتوں پر جس کا اثر امتحان کی کامیابی کے سوا اور باتوں پر پڑتا ہو۔ قوم کا رجحان اور اُن کی انتہائی آزادی ہے، کہ امتحان میں اُن کے لڑکے پاس ہو جاویں۔ اُن کو اُن فوائد کی جو عمدہ بورڈنگ ہوس میں رہنے سے حاصل ہوتے ہیں نہ قدر ہے نہ اُس کا خیال۔ اُن کے نزدیک ہی کالج اچھا ہے جو امتحان میں لڑکے زیادہ پاس کرا دیا کرے۔

بورڈنگ ہوس میں کسی بورڈر کا خرچ غلے روپیہ یا سواری سے کم نہیں ہو سکتا۔ اور اکثر سٹے روپیہ یا سواری تک ہوتا ہے۔ یہ خرچ گو بھالیہ کیمبرج اور اسکفورڈ یونیورسٹی کے اخراجات کے بہت ہی کم ہے، مگر اس ملک میں بہت ہی زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ بظاہر اس خرچ پر بورڈنگ ہوس میں بورڈروں کا اس قدر جمع ہونا کہ بورڈنگ ہوس چل سکے، شکل معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر بورڈر جمع بھی ہو جاویں اور اُس خرچ کے تحمل بھی ہوں، تاہم اور بہت سے اخراجات کے لئے جو کالج بورڈروں کے لئے برداشت کرتا ہے بہت کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ پروفیسر اور پراکٹر اور سب پراکٹروں کی تنخواہ کے علاوہ مذہبی نگرانی کے لئے ایک عالم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے جو ٹین کھلایا جاتا ہے۔ جسمانی ورزشوں اور قواعد کے لئے خاص تنخواہ دار تجربہ کار آدمی رکھنا پڑتا ہے۔ جو لوگ بورڈنگ ہوس کا کام کرتے ہیں وہ جب تک کالج کے احاطہ میں نہ رہیں، اپنے فرائض منصبی اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے۔ اور وہ کالج میں

رہ نہیں سکتے، جب تک اُن کے رہنے کے لئے ایسے مکانات نہ ہوں، کہ در صورت متبادل ہونے کے وہ مع اپنے عیال کے آسائش سے رہ سکیں۔ ان تمام کاموں کے لئے کالج کو خرچ کثیر اٹھانا پڑتا ہے، جس کے لئے نہ کوئی فنڈ معین ہے، نہ جس کی آمدنی مستقل ہے، نہ جس کے لئے روپیہ بغیر خاص کوشش اور بغیر محنت مل سکتا ہے۔

بورڈنگ ہوس علیگڑھ کے اخراجات کے لئے بھی شکل سے روپیہ ملتا ہے اور قنجا چائے اُنٹنا اُس کو بھی نہیں ملتا۔ اور وہ بنسبت اُس رقم کے جو بورڈروں سے وصول ہوتی ہے۔ بورڈروں کے ایک حصہ پر زیادہ خرچ کرتا ہے، اس لئے کہ بورڈنگ ہوس دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک اسکول کلاس کے بورڈر، دوسرے کالج کلاس کے بورڈر، یہ بات خوشی سے ظاہر کی جاسکتی ہے کہ اسکول کلاس کے بورڈروں پر کالج کا کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ اور اُس کی شہرت اس قدر ہو گئی ہے اور اُس کے فائدے اس قدر ثابت ہو گئے ہیں کہ دور دراز مقامات سے سطح مسلمان اپنے لڑکوں کو یہاں بھیجتے ہیں اور نہایت خوشی سے اُس کا صرف گوارا کرتے ہیں۔ چنانچہ قریب (۳۰۰) اسکول بورڈر کے ایسے ہیں جو پورا چھ اپنا آپ اٹھاتے ہیں اور فی بورڈر صحت سے کم صرف نہیں ہوتا۔ مگر یہ افسوس سے بیان کیا جاتا ہے کہ کالج کلاس کے بورڈروں پر کالج کو خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اُس میں نصف سے زیادہ ایسے بورڈر ہیں کہ اگر اُن کی مدد نہ کی جاوے تو اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے۔ اُن سے اگرچہ پوری فیس لی جاتی ہے اور پورا خرچ کھانے کا اور مکان کا کرایہ بھی وصول کیا جاتا ہے۔ مگر اُن کو وظیفے دئے جاتے ہیں جن کی سالانہ مقدار سبب اور مہم ہو ا کرتی ہے۔ اور یہ وظیفے کسی قدر اُس فنڈ سے دئے جاتے ہیں، جو اسی کام کے لئے جمع ہے، اور زیادہ تر سالانہ چندہ سے دئے جاتے ہیں، جس کے لئے بہت کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اگر وظائف سے اُن کی مدد نہ کی جاوے تو کالج کلاس کے نصف سے زیادہ بورڈر چلے جاویں۔ اور شکل ہے کہ ہر سال چندہ سے اس قدر رقم وظائف دینے کے لئے وصول ہو جایا کرے۔

بورڈنگ ہوس میں جسمانی ورزشوں اور مردانہ کھیلوں کے لئے بھی عمدہ انتظام ورزشوں کا انتظام اور پوری نگرانی کی ضرورت ہے۔ تاکہ لڑکوں کی جسمانی صحت قائم رہے اور کھیل کی خوشی اور جوش میں اُس تھکان اور محنت کو برداشت کر سکیں۔ جو اس ماضی تکلیف کا بدلہ منتقل ہو، جو اُن کو پڑھنے میں اٹھانی پڑتی ہے۔ سوائے اس کے ان دلیرانہ کھیلوں کے ذریعہ سے اُن میں مفید خصائیں دیر ہی اور مردانگی کی پیدا ہوں اور ڈسپلین کی عادت ہو۔ اور اپنا کام آپ کرنا سیکھیں، اور بالآخر ایک عمدہ جفاکش سپاہی اور ہر کام کرنے کے لائق بن سکیں۔ اس کے لئے بھی ضرورت ہے کہ اس کی نگرانی کالج اسٹاف کے کسی بورڈرین کے سپرد ہو، اُس کے لئے کرکٹ کلب، فوٹ بال کلب

اور ریڈنگ اسکول قائم ہوں۔ اور اُن کا انتظام باقاعدہ ہو، تاکہ ان کھیلوں میں انفرادی تفریط نہ ہونے پائے اور اعتدال قائم رہے۔

بورڈنگ ہوس میں خاص کلیے خاص سوسائٹیوں کی بھی شدید ضرورت ہو۔ خاص سوسائٹیوں کی ضرورت تاکہ اُن کی عقلی زندگی پوری ہو، اُن کا دماغ وسیع، اور اُن کے اخلاق بلند ہوں، اور دنیا کی کشمکش کے معاملہ میں اُن کو مقابلہ کرنے کی قوت پیدا ہو۔ ایک ضروری سوسائٹی ڈسٹ کے لئے ہو، تاکہ جلسوں میں اسپیکر کرنے کی مہارت پیدا ہو۔ ایک سوسائٹی ایسی بھی جو اخلاقی اور علمی مضامین پر جو اہم مضمون نکھتے قابلیت پیدا کرے۔ اور ایک ایسی انجمن بھی ہو، جو قوم کے لئے کام کرنے، اور قومی فوائد کے لئے کوشش کرنے پر توجہ کرے۔ اس قسم کی (4) انجمنیں اور کلیہ مدرستہ العلوم علیگڑھ میں قائم ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اُن سے بہت بڑا فائدہ بورڈروں کو ہوا ہے۔ اور یورپین اسٹاف کی شرکت اور نگرانی سے یہ انجمنیں اچھی طرح چلتی ہیں۔

بورڈنگ ہوس میں مانیٹری سسٹم قائم کرنا بھی ضروری ہے تاکہ بورڈنگ ہوس کے کاموں کی نگرانی میں پراکٹر کو طلباء سے مدد ملے، اور مانیٹروں کو اس فریئر سے انتظام کرنے اور ڈسپن قائم کرنے کی قابلیت پیدا ہو۔ علیگڑھ کالج کے طالب علموں میں اسی مانیٹری سسٹم سے وہ قابلیتیں پیدا ہوئیں جس کے سبب سے وہ مشہور اور نامور ہوئے اور محنت کرنے اور مشکل کاموں کے انجام دینے اور اپنے فرائض کو اچھی طرح پورا کرنے کی لیاقت اور قومی جوش و دہش اور ہمدردی کا خیال پیدا ہوا۔ اکثر طالب علم اپنی ذاتی آسائش پر قوم کی خدمت کو مقدم خیال کرنے لگے۔ یہاں تک کہ تپیلوں میں بجائے گھوڑے جانے اور آرام کرنے کے وہ مختلف حصوں میں ٹکا کے جاتے ہیں اور اپنے کالج کے لئے روپیہ جمع کرتے ہیں۔ سال کو ششتر میں قریب دس ہزار روپیہ کے وہ چندہ وصول کر کے لائے اور اس طرح سے اپنی عمدہ تعلیم اور عمدہ تربیت کا ثبوت دیا۔

علیگڑھ کی تعلیم میں بوجہ پابندی یونیورسٹی کے قواعد کے جو نمایاں فرق اس کالج کے اور دوسرے کالج کے طلباء میں ہے وہ صرف نتیجہ بورڈنگ ہوس کے عمدہ انتظام اور عمدہ محبت اور پروفیسروں اور طلباء کے باہمی میل جول کا ہے۔ لیکن تاویح نہیں ہے، کہ میرج اور کسٹورڈیونیورسٹی کے برابر یہاں تربیت کا سب سامان جمع ہے یا جیسا کہ ہم چاہتے ہیں اُس کا انتظام مکمل ہے، مگر اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو کچھ مسلمان تربیت کا یہاں ہوتا کیا گیا ہے، اور جس طریقہ سے یہاں بورڈروں رکھے جاتے ہیں۔ آج ہندوستان میں بے مثل ہے۔ ہر ایک بورڈروں جو مدرستہ العلوم کی چار دیواری میں قدم رکھتا ہے اپنے تئیں نئی آب و ہوا، اور ایک نئی زندگی میں پاتا ہے، اور اپنی گرد و پیش کی تمام چیزوں میں زندہ دلی اور شگفتگی اور حرکت اور جوش دیکھتا ہے، اُس کے کانوں میں ہر طرف سے محبت، ہمدردی،

اور گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، کی آغوازیں آتی ہیں۔ اور وہ اپنے تمام جائز جذبات اور امنگوں کے لئے چاروں طرف آزادی کی راہیں کھلی پاتا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اب اُس نے ملک کے ہر حصہ میں اعتماد پیدا کر لیا ہے اور چاروں طرف سے قوم کے لڑکوں کا اکثریت سے جاری ہے۔ اس وقت (۱۹۷۱ء) بورڈ میں، جن میں سے (۷۴) لڑکے بارہ برس سے کم عمر کے ہیں جن کے ساتھ ذکوئی شہداء رہتا ہے نہ کوئی ملازم، والدین نے تنہا اُن کو چھوڑ دیا ہے وہ نہایت خوشی سے یہاں رہتے ہیں اور گھر سے زیادہ اُن کا یہاں دل لگتا ہے *

اگر ہمارے کالج میں بورڈروں کے رہنے کے لئے اور مکانات ہوتے اور اسٹاف کافی ہوتا۔ تو طالب علموں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہوتی۔ اور بورڈروں کی نگرانی اور تربیت میں بھی کمی پاتی جاتی ہے۔ یہ خیال کہ بورڈنگ ہوس کی نگرانی یونیورسٹی کے متعلق کر دیا جائے صحیح نہیں ہے۔ جو بورڈنگ ہوس ایسے ہونگے جیسا کہ علی گڑھ کا ہے اُس کے منتظم کبھی گوارا نہ کریں گے کہ گورنمنٹ یا یونیورسٹی کی دست اندازی یا کچھ بھی مداخلت اُن کے کاموں میں ہو۔ وہ اپنی آزادی میں خلل نہ آنے دینگے، اور وہ اپنے اس قومی کام میں کسی بیرونی ہدایت کی ضرورت نہ سمجھیں گے۔ نہ اُس سے فائدہ ہوگا۔ اور جو بورڈنگ ہوس صرف مسافر خانہ اور سرائے کے طور پر ہونگے اُس کا انتظام اگر یونیورسٹی یا گورنمنٹ اپنے ذمہ یا اپنی نگرانی میں لے لگی اُس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ ایسی ذمہ داری لینے سے گورنمنٹ کی نسبت بدگمانیاں پیدا ہوں گی، جو خرابیاں پیش آئیں گی اُن کا انتظام گورنمنٹ پر لگایا جاوے گا *

یہ خیال کہ کسی کالج میں تعلیم کی اجازت نہ دی جائے الا اُس شخص کو جو اپنے والدین یا اپنے دوست کے پاس رہتا ہو، یا سرکاری بنائے ہوئے بورڈنگ ہوس میں سکونت اختیار کرے صحیح نہیں ہے۔ اس سے بورڈنگ ہوس کے فوائد تو حاصل ہونگے، اور اُن کے اخلاق اور کریڈٹ درست نہ ہو سینگے، مگر خرچ بڑھاوے گا اور غریب طالب تعلیم پانے سے محروم ہو جائیں گے اور پبلک یہ بگانی پیدا ہوگی کہ گورنمنٹ نے اعلیٰ تعلیم دینے کے لئے یہ جیلہ تجویز کیا ہے *

اس سے حقیقت بہت نقصان ہوگا اور عام شورش پیدا ہوگی۔ میری رائے میں گورنمنٹ کو یا یونیورسٹی کو کسی بورڈنگ ہوس کا انتظام اپنے ذمہ لینا مناسب نہیں ہے۔ نہ ایسا فائدہ جاری کرنا مفید ہے۔ تربیت کا انتظام بالکل اسی فرقے کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہئے، جو اپنے بچوں کی تربیت کا انتظام کرنا چاہے۔ البتہ گورنمنٹ کو ترغیب دینا مناسب ہے تاکہ ہر فرقہ اپنی اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کے موافق بورڈنگ ہوس قائم کرے اور اُس کو مالی مدد دینا چاہئے تاکہ انتظام کے سامان مہیا کرنے میں آسانی ہو *

کالج صرف تعلیم کے لئے ہے، اور بورڈنگ ہوس تربیت کے واسطے۔ اور تربیت ناقص اور

ماتمام ہے، جب تک اخلاقی اور مذہبی تعلیم نہ ہو۔ اور اخلاق درست اور مذہب کا اثر ہو نہیں سکتا۔ جب تک کہ اُس کے اثر ڈالنے کا کافی سامان جتنا نہ ہو یعنی عمدہ صحبت نصیحت ہو۔ بلاشبہ نبوی کے ساتھ مذہبی تعلیم کا دیا جانا نہایت ضروری ہے اور نہ صرف ضروری ہے۔ درحقیقت ایک کا دوسرے سے جُدا کرنا گویا جسم اور جان کو علیحدہ کرنا ہے۔ مگر غور طلب یہ امر ہے کہ مذہبی تعلیم یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ کہاں اور کس طرح اور کس درجہ تک دیکھا جاسکتی ہے، اور اُس کا انتظام کون کر سکتا ہے۔ سرکاری مدرسوں میں گزشتہ ہندوؤں کی مختلف فرقوں کی مذہبی تعلیم پر نہ خود سوچ کر سکتی ہے نہ اُس کا انتظام اپنے ذمہ لے سکتی ہے۔ نہ ایسا کرنا اُس کو مناسب ہے۔ اس کے لئے سرکاری مدرسوں میں مذہبی تعلیم کے لئے اجازت دینا اور خاص وقت مقرر کرنا کافی ہے، جیسا کہ بذریعہ سرکار برصغیر ۱۳۱۳ھ ۱۹۰۱ء انگریزوں کو لڑا سکولوں میں ڈاکٹر کٹر شہرہ تعلیم جاناک مغربی و شمالی وادھ نے اجازت دی ہے۔ اور امدادی مدرسوں میں پوری آزادی ہے، اور ہر فرقہ اپنی خواہش اور مرضی کے موافق مذہبی تعلیم کا بندوبست کر سکتا ہے۔

مگر مذہبی تعلیم دو قسم کی ہے، ایک کمال، دوسری بقدر ضرورت۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم اول قسم کی ہو نہیں سکتی۔ اور نہ اُس وقت ہوتی تھی جب کہ خود مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیم کے لئے خاص اُن کے مدرسے تھے۔ اُس وقت دو قسم کی تعلیم جاری تھی۔ ایک معقول کی دوسری مقول کی۔ زیادہ تر تو توجہ معقول کی تعلیم پر تھی، جو سلسلہ نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں مذہبی کتابیں فقہ ضرورت پڑھائی جاتی تھیں۔ دوسری تعلیم کے خاص مدرسے تھے۔ بلکہ یہ کتنا چاہئے کہ صرف ایک ہی خاندان میں ایسی تعلیم ہوتی تھی جو دہلی میں شاہ عبدالعزیز صاحب کا تھا۔ اب یکم ندوہ العلماء نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اور اگر اُس کو کامیابی ہوئی تو وہ اعلیٰ درجہ کی مذہبی تعلیم کی خواہش کو پورا کر سکیگا۔

البتہ بقدر ضرورت جیسا کہ پہلے مسلمانوں میں ہوتا تھا، سرکاری اور امدادی مدرسوں میں مذہبی تعلیم کا دیا جانا ممکن بھی ہے۔ مگر تعلیم سے بڑھ کر یہ امر ضروری ہے کہ مدرسہ میں کوئی ایسا نیک اور غیر متعصب مذہبی عالم بھی ہو جو دہو، جو لڑکوں کے فرائض مذہبی ادا کرنے کا نگران رہے، اُن کو غلط نصیحت نہ کرے، تاکہ اُس کی صحبت کا اثر ایسا ہو کہ لڑکوں کے دل میں مذہبی نیکیاں اور مذہبی حیل بٹھ جائیں، اخلاق حسنہ کا بتاؤ اور مذہبی فرائض کی پابندی اُن کی زندگی کا ایک جزو ہو جائے۔ اور تنصیبات خیالات پیدا نہ ہونے پادیں، کتابوں کے انتخاب اور عالموں کے تقریریں اس بات کی نہایت اعلیٰ حد تک کجی، کہ وہ باتیں جو حقیقت مذہب کے اصلی تعلیم کے خلاف ہیں، اور جن سے مذہبی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں، لڑکوں کے دلوں میں نہ بیٹھنے پادیں۔ اور اُن کو ایسی تعلیم و تربیت دیکھا جس سے نیکی اور انسانیت کے پاکیزہ خیالات اُن کے دل میں پیدا ہوں۔ بنی نوع انسان کے

ساتھ ہمدردی اور محبت کی خوبیاں اُن کو معلوم ہوں۔ اُن کے دل کی سچائی اور باہمی محبت اور نیکی کی طرف مائل ہوں۔ کوئی ایسی کتاب نہ پڑھائی جائے، نہ اس قسم کی باتیں لڑکوں سے کی جائیں، جن سے اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہو، کہ دوسرے مذہب والوں سے نفرت کرنا، اُن کو بُرا جاننا، اُن سے مخافتہ برتاؤ کرنا، اور اُن کو حقیر سمجھنا، اچھا اور مذہب کے موافق ہے۔ اس قسم کی تعلیم یا ایسی صحبت جس سے اس طرح کے بُرے خیالات پیدا ہوں بجاے مفید ہونے کے مضر ہے، اور حقیقت مذہبی تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ مذہبی تعلیم کی بدنام کرنے والی ہے۔ اور ایسے ملک میں جہاں مختلف مذہب کے لوگ رہتے ہوں، اور جن کی ترقی اور آبادی اور امن و امان اس پر منحصر ہے کہ سب مل جل کر رہیں، بلا لحاظ مذہب کے، سب باہم اتفاق اور اتحاد رکھیں۔ باہم کردوستانہ اور ہمدردی برتاؤ کریں۔ مخالفت پیدا کرنے والی تعلیم نہایت خطرناک ہے۔

چونکہ ہر مذہب میں دو قسم کے خیالات رکھنے والے لوگ موجود ہیں اس لئے مذہبی تعلیم میں احتیاط ضرور ہے۔ میں اپنے مذہب اسلام ہی کی نسبت کہتا ہوں کہ اُس میں ایک فرقہ ایسا ہے جس کے مذہبی خیالات اسلام کی اصلی تعلیم پر مبنی اور تہذیب اور تمدن کی سے پاک ہیں۔ اس سے متعلمین کے دلوں میں یہ اثر اور یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ مذہب اسلام تمام اخلاق اور فضائل کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کے ساتھ بلا تخصیص مذہب کے شفقت اور مہربانی سے پیش آنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ تعصبات اور ادنام سے پاک ہے۔ وہ ہر قسم کی قوتوں کا جو خدا نے انسان میں دی ہیں، ترقی دینے والا ہے، اُس نے رائے اور عقل کو آزاد ہی بخشی ہے، اخلاق حسنہ کی تعلیم دی ہے اسی تعلیم سے انسان اپنی قوم کا معزز اور کارآمد بن سکتا، بنی نوع انسان کا سچا ہمدرد، اور اپنی گورنمنٹ کا سچا خیر خواہ ہوتا ہے۔ دوسرا وہ فرقہ ہے جس کے خیالات بالکل اس کے برخلاف ہیں۔ وہ دوسری قوموں کے ساتھ بیل بول رکھنا اسلام کے خلاف سمجھتا ہے، اور سوائے اپنے ہم خیال لوگوں کے اور سب کو گمراہ اور فتنہ پرداز جانتا ہے، غیر مذہب والوں کی امانت کو واجب، اُن کی توقیر کو حرام، اور اُن سے بے چل کر منع سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جو مسلمانوں میں بھی سوائے اپنے فرقہ کے سب کچھ کو گمراہ اور ناری سمجھتا ہے۔ دوسرے فرقے کے لوگوں کے پاس ٹھینا، اُن سے ملنا، اُن کے ساتھ کھانا کھانا یہاں تک کہ اُن کو سلام کرنا بھی بُرا جانتا ہے۔

ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ دونوں قسم کی تعلیم میں کس قدر فرق ہے۔ ایسی تعلیم مفید ہے اور دوسری کی کیسی مضر اور خطرناک۔ مگر شکر اور خوشی کا مقام ہے کہ اول قسم کے خیالات رکھنے والے عالم کثرت میں ہیں اور انہیں کا ملک میں رسوخ ہے اور وہی عظمت اور عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں چنانچہ مذہب العلماء جس میں قریباً تمام ہندوستان کے مشہور اور معزز عالم شریک ہیں پہلی قسم کے خیالات

رکھنے والوں میں سے ہے، اور اتحاد و اتفاق پیدا کرنا، اور جھگڑے اور قصصوں کا مٹانا، اس مجلس کا اصلی مقصد ہے، اور اسی جرم میں دوسری قسم کے متعصب اور نادان اور تنگ خیال مولویوں نے اُن پر کفر کا فتوے جاری کیا ہے۔

جو تفریق مذہبی تعلیم کی ہے مسلمانوں کی نسبت کی ہے، چنانچہ دوسرے مذہبوں کی بھی ہے عیسائی اور ہندو مذہب میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک ہر تمام نبی فوج انسان کے محبت کھتا ضروری سمجھتے ہیں، دوسرے کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو دوسرے مذہب والوں کو دلوں کا دکھانا، انکی تحقیر توہین کرنا، اُن کے مذہبی پیشواؤں کو بُرا کہنا۔ اُن کے مذہبی عقائد و مراسم کی نسبت دغا و فریب دینا، اُن کو حقیر سمجھنا۔ اُن سے تشدد رہنا، اور دوستی کی بجائے دشمنی پیدا کرنا سکھاتے ہیں۔ غرض کہ مذہبی تعلیم اگر اُس کی بنیاد نیک اور فراخ حوصلگی پر ہو جو اعلیٰ تعلیم ہر مذہب کی ہے، وہ نیک خیالات پیدا کرنے والی ہے۔ اور اگر تعصب اور تنگدلی پر مبنی ہو تو وہ بُرے خیالات اور بُرے اخلاق سکھاتا، اور انسان کو وحشی بنانے والی بھی ہے۔ غرض کہ وہ ایک ایسی غذا ہے، جس کے اجزاء میں نریاق اور زہر دونوں موجود ہیں، اور اُس کے استعمال کرنے والوں پر اُن کی زندگی اور موت منحصر ہے۔

علیگڑھ کالج میں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ کوئی ایسی تعلیم نہیں ہے جو اُس مذہبی تعلیم علیحدہ ہو جو مسلمان مدرسوں میں دی جاتی ہے۔ کتابوں اور پڑھانے والوں اور مذہبی نگارانی کرنے والوں کا انتخاب ایسا کیا گیا ہے کہ جو فوائد مذہبی تعلیم سے ہونے پانہیں وہ سب حاصل ہیں۔ یہاں کی مذہبی تعلیم تعصب سے پاک ہے۔ تفرقہ کو دور کرنے والی ہے۔ غیر مذہب والوں سے اتحاد اور دوستی رکھنے کی تعلیم دیتی ہے۔ گورنمنٹ کی اطاعت اور سچی خیر خواہی کو جزو اسلام بتاتی ہے، جیسا کہ مدرسۃ العلوم کے ٹریٹیوں کے اُس ایڈریس میں جو تراکھینڈ کا لون کو دیا تھا بیان کیا ہے۔

”ہم نے مذہبی تعلیم کو مسلمانوں کے لئے خواہ وہ سنی ہوں یا شیعہ ایک مناسب حد تک تعلیم لازمی جزو قرار دیا ہے اور اس ذریعہ سے ہم کو اُن کے اخلاق کی درستی کا بھی نہایت موقع حاصل ہوا ہے۔ ہم مذہبی تعلیم میں نسبت فقہی مسائل کے زیادہ تر اخلاقی تعلیم کو عزیز رکھتے ہیں۔ ہم اُن کو مذہبی تعلیم میں سمجھتے ہیں کہ رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرنا، تمام مخلوق خدا کے ساتھ رحمت و شفقت سے پیش آنا، ترقی اور حیا اور حسن خلق کا اختیار کرنا، غضب اور غرور کو ترک کرنا، سب سے بڑا جزو ایمان کا ہے۔ پھر ہم اُن کو سکھاتے ہیں کہ خدا کے حقوق بندوں پر کیا ہیں، آپس میں ایک مسلمان کے حقوق دوسرے مسلمان پر کیا ہیں، ایک ہمسایہ کے حقوق دوسرے ہمسایہ پر گو وہ کسی مذہب کا ہو کیا ہیں، مختلف قوموں کی ہم کو کس اخلاق سے زندگی بسر کرنی چاہئے۔ پھر ہم ان کو سچائی کی خوبی سکھاتے ہیں۔ اُن کو بتاتے ہیں کہ دل کی سچائی کیلئے زبان کی سچائی کیا ہے، نیت اور راہ کی سچائی کیا ہے، وعدہ کی سچائی کیا ہے،

اعمال کی سچائی کیا ہے، مذہبی تعلیم کے یہ سائل آپ کے سامنے موجود ہیں آپ ملاحظہ فرماؤینگے کہ سب اسی قسم کے اخلاقی امور سے مملو ہیں *

مذہبی تعلیم و تربیت کی نگرانی اور انتظام کے لئے سنی اور شیعہ دونوں کی علیحدہ علیحدہ کمیٹیاں ہیں۔ جن میں ایسے لوگ شریک ہیں جو لحاظ و بنداری اور پابندی احکام اسلام کے اپنے اپنے فرقہ میں محرز اور ممتاز ہیں۔ کتابوں کا تجزیہ کرنا اور تعلیم و تربیت کی نگرانی رکھنا ان کا کام ہے۔ دونوں فرقوں کی تعلیم کے لئے علیحدہ علیحدہ مشہور اور معزز خاندان کے عالم مقرر ہیں۔ صبح کو قرآن پڑھایا جاتا ہے اور ہر روز ایک ایک گھنٹہ مذہبی تعلیم اسکول اور کالج میں دی جاتی ہے۔ دنیاوی کی طرح دنیات کی تعلیم میں بھی امتحان لیا جاتا ہے۔ محض باہر سے بلائے جاتے ہیں۔ وہ باضابطہ رپورٹ امتحان کی پیش کرتے ہیں *

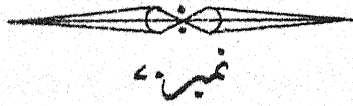
ایک عالم مشہور خاندان کا دین کے عہدہ پر مقرر ہے جس کے رہنے کے لئے مسجد کے متصل مکان بنادیا گیا ہے، وہ پانچوں وقت کی نماز سنیوں کو مسجد میں پڑھاتا ہے۔ جمعہ کو وعظ کرتا ہے مذہبی احکام اور اس کی خوبیاں سمجھاتا ہے شیعوں کے لئے بھی ایک علیحدہ عالم مقرر ہے جو ان کی مذہبی تعلیم مذہبی احکام کی پابندی کی نگرانی رکھتا ہے *

اگرچہ شیعہ اور سنیوں کا مذہبی اختلاف مشہور ہے۔ اور اس سے آئے دن جو جھگڑے اور قصے پیدا ہوا کرتے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ مگر علیگڑھ کی غیر متعصبانہ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ یہاں اس اختلاف کا کچھ اثر پایا نہیں جاتا۔ سنی اور شیعہ دونوں ایک جگہ رہتے، ایک جگہ کھیلتے، ایک جگہ پڑھتے، ایک جگہ کھانا کھاتے، اور ایک ہی مسجد میں اپنے اپنے طریق کے موافق خدا کی عبادت کرتے، اور نماز پڑھتے ہیں، یہ خوشنما منظر غائب دنیا کے کسی حصے میں نظر نہ آئیگا، اور یہاں کی تعلیم و تربیت نے جو اتفاق اور اتحاد مختلف فرقوں میں پیدا کر دیا ہے اس کی نظیر نہ ملے گی۔ یہاں کے تعلیم یافتہ ہندوؤں کے ساتھ بھی دوستی اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ ان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ مذہبی اختلاف باہمی اتحاد و اتفاق کا مانع نہیں ہے۔ اور چونکہ اس کالج کی بنیاد بے تعصبی اور فراخ حوصلگی پر ہے اس لئے تعصب اور قومی اختلاف کی خطرناک علامتوں میں سے کوئی ادنیٰ علامت بھی یہاں نظر نہیں آتی۔ یہ وہ تعلیم ہے جو درحقیقت اصلی مذہبی تعلیم کہلائے جانے کے مستحق ہے اور یہی وہ تعلیم ہے جو مفید ہے۔ مگر یہ فرقہ کتابوں کے پڑھانے سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ جیسا میں کہ چکا ہوں صرف عمدہ صحبت اور عمدہ نگرانی سے حاصل ہو سکتی ہے اور اس کا انتظام ہر فرقہ اپنے اپنے مذہب کے موافق خود کر سکتا ہے۔ گورنمنٹ اس میں کچھ دخل نہیں دیکتی *

لیکن یہ میرا نشانہ نہیں ہے کہ اگر اس طرح پر مذہبی تعلیم دینے سے تربیت کا انتظام نہ ہو، تو مذہبی

تعلیم نہ دیکھائے۔ بلکہ ضرور ہے کہ مذہبی کتابیں سرکاری اور امدادی مدرسوں میں ضرور پڑھائی جاوےں۔ گورنمنٹ اسکولوں میں سرکار ایسی تعلیم دینے کی اجازت دے، اُس کے لئے وقت مقرر کر دے، اس واسطے مناسب سہولتیں دے، اور امدادی اسکولوں میں خود اُس کے منظم اس کا انتظام کریں۔ غرض کہ مذہبی تعلیم کو تعلیم کا ایک ضروری جز قرار دینا ضروری اور لازمی سمجھا جاوے۔ بغیر مذہبی تعلیم کے دماغی تعلیم ناقص ہی نہیں سمجھی جاتی بلکہ بغیر مذہبی قومی زندگی ہی باقی نہیں رہتی۔

اب میں صرف ایک بات اور کہنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ موجودہ یونیورسٹیاں ہم مسلمانوں کی مختص الحالات حاجتوں کے پورا کرنے کیلئے کافی نہیں ہیں۔ نہ کسی قسم کی اصلاح سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ ہماری تمام حاجتوں کے لئے کبھی کافی ہوں اس مسئلہ پر (۳۰) برس سے غور ہو رہا ہے اور مرحوم سر سید احمد خاں اور اُن کے ہم خیال اس امر میں متفق الہاے ہیں کہ ہماری ضرورتیں اُسی وقت پوری ہوں گی جب کہ ہم تعلیم و تربیت میں گورنمنٹ کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں سے آزاد ہوں، اور اپنی ضرورت اور اپنی مرضی کے موافق اپنی قومی تعلیم کا خود انتظام کریں۔ میں کمیشن کے آگاہ کرنے کے لئے کہ مخدوم محمد نواز یونیورسٹی کی کیا ضرورت ہے، اُس کا کیا مقصد ہے، اُس میں کس قسم کی تعلیم دینے کی تجویز ہے، اور کس طرح وہ بنائی جا سکیگی۔ رپورٹ سلیکٹ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان منعقدہ ۱۹۰۷ء اور اکیس مجوزہ مسٹر سید محمود ۱۹۰۷ء اور چند ضروری کاغذات پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کب ہم اس قابل ہونگے کہ اپنی مجوزہ یونیورسٹی کی خواہش باضابطہ گورنمنٹ میں پیش کر سکیں۔ شاید سر سید جس طرح یہ تمنا اپنے ساتھ لے گئے ہم بھی اپنی آرزو اپنے ساتھ لے جاویں۔ مگر ہم اپنے اس خیال پر قائم ہیں کہ ہماری عقلی اور مذہبی تعلیم کی تکمیل اور قومی حاجتوں کے پورا کرنے کے لئے محمد نواز یونیورسٹی کا قائم کرنا ضروری ہے جس طرح سکول سے کالج بن گیا، امید ہے کہ ایک دن آویگا جب کہ یہی کالج جس میں یونیورسٹی کا تخم موجود ہے نشوونما پا کر یونیورسٹی ہو سکیگا۔



نہیں۔

اسپیج

یہ ایسی اسپیسج فرامیہ صاحب بہادر نے ۳۱۔ دسمبر ۱۹۰۷ء کو محمد نواز یونیورسٹی کا نقش منعقدہ دہلی میں رزولوشن نمبر ۶ کے چڑھنے کے بعد اس رزولوشن کی تائید میں فرمائی اور رزولوشن نمبر ۶

رزولوشن نمبر ۵

”اس کانفرنس کی رائے میں مسلمانوں نے گزشتہ دس سالوں میں جو ترقی مختلف علوم و بیوی میں کی ہے وہ کسی طرح قابل اطمینان اور تسلی دہ نہیں ہے۔ اس کی بڑی وجہ مسلمانوں کا افلاس اور اُن کی ناداری معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک قوم مسلمانانِ جان توڑ کر کم استطاعت طبقہ کی بذریعہ دظالمت مدد نہ کرے کوئی امید اُن کی آئندہ ترقی کی نہیں ہو سکتی“

حضرات !

یہ ضروری رزلوشن اس غرض سے پیش کیا گیا ہے کہ آپ اس بات کا اندازہ کریں کہ جب سے ہندوستان میں یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں، ہندوستانیوں نے اُن سے کیا فائدہ اٹھایا۔ اور ہماری قوم کا اُس میں کیا حصہ رہا؟

کانفرنس کے اجلاس ۱۹۴۷ء میں بمقام علیگڑھ آئینل جیس سید محمود صاحب اسی مضمون کے متعلق ایک نہایت عمدہ لیکچر دیا تھا اور اُس کے ساتھ تعلیمی نقشے اور ڈاٹے گرام بھی پیش کئے تھے۔ جن سے یہ بات معلوم ہوتی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی آبادی کی نسبت سے کس قدر تعلیم حاصل کرنا چاہئے تھی اور کتنی حاصل کی جو نتیجہ علم ۱۱ اعداد سے اُنہوں نے نکالا وہ مسلمانوں کے حق میں نہایت قابل افسوس تھا۔ اس بات کو (۱۹۴۷ء سے لیکر ۱۹۵۷ء تک) دس برس گزر گئے۔ لیکن اب ہمارے کالج کے پروفیسر عبدالقادر صاحب نے یہ کوشش کی ہے کہ اس دس برس مدت میں باوجود کانفرنس کے متواتر اجلاس ہونے کے اور باوجود اس امر کے کہ چاروں طرف سے غل و شور کیا گیا تھا نتیجہ نکلا۔ یہ تمام واقعات اور اُن کے نتائج ڈاٹے گرام کے ذریعہ سے آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان ڈاٹے گراموں کو خصوصاً مسٹر آرنلڈ اور دیگر اصحاب جو تعلیم کے حامی اور اُس سے دلچسپی رکھنے والے ہیں بغور ملاحظہ فرمائیں۔ میں اُن صاحبوں کی بھی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جن کا تعلق یونیورسٹی سے ہے۔ وہ اس بات کو دیکھیں اور غور کریں کہ باوجود اُن تمام کوششوں کے جو اب تک ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں اور باوصف کالج قائم کرنے کے نتیجہ کیا ہے۔ کوئی مفید یا قابل اطمینان ترقی تعلیم میں مسلمانوں نے اب تک نہیں کی۔ میں نے جس قدر کہا اس سے زیادہ بیان کرنا تھیں چاہتا ہوں پروفیسر عبدالقادر صاحب خود بیان کرینگے۔ اُنہوں نے فصاحت اور بلاغت کا دریا نہیں بہایا ہے بلکہ اُنہوں نے فیکریس سے، فیکلٹس سے، واقعات سے، علم الاعداد سے، ہمارے بگڑے ہوئے خیالوں کے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ آپ کو بتائینگے کہ تعلیم یافتہ قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کیا

نسبت ہے۔ اور وہ کیسی خراب حالت اور پستی کے درجہ میں ہیں۔ خصوصاً قانون میں اُن کی کمزوری کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ کیا یہ بات دلی رنج اور افسوس کے ساتھ نہ سنی جائیگی کہ بمقابلہ ہندو کے آٹھ تین فیصدی مسلمان تعلیم پاتے ہیں۔ یہ تو حالت ہے، لیکن ہم مسلمان رو تاروتے ہیں قسمت کا، اور شکایت کرتے ہیں گورنمنٹ کی کہ ہم کو اعلیٰ عہدے نہیں ملتے۔ منصفی اور صدر الصدرا کے عہدے ہمیں نہیں دئے جاتے۔ اب سے پچاس برس پہلے ایک مانہ تھا کہ جتنے مولوی یا حافظ ہوتے وہی منصف اور سب جج کئے جاتے۔ گویا یہ عہدے مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص تھے۔ کوئی دوسرا فریق ان کا شریک نہ تھا۔ چنانچہ اپنے بیان کے ثبوت میں اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی۔ ۱۸۵۷ء میں ایک صاحب منشی بھولانا تھ نامی انفاق سے منصف مقرر کئے گئے۔ جبکہ کہ میں کہ چکا ہوں کہ یہ عہدے مسلمانوں کے لئے مخصوص تھے اس لئے تمام رو بکاروں پر نام کے ساتھ مولوی، حافظ، خان بہادر، وغیرہ لکھنے کا دستور تھا چنانچہ ان کے نام کے ساتھ بھی رو میں سررشتہ دا قلم سے یہی اتالیقی انفاق ایک رو بکار پر لکھے گئے۔ ”رو بکار از دفتر خان بہادر مولوی منشی بھولانا تھ صاحب“ انہوں نے جب یہ دیکھا تو کہا کہ بہت تو نے مجھے مسلمان بنا دیا۔ اُس پر سررشتہ دار نے دست بستہ عرض کیا کہ اب تو حضور منصف ہو گئے ہیں، غرض اُس وقت کو یاد کر دیا اب اس زمانہ کو دیکھو کہ کیسا کیا حالت ہے۔ اُس وقت نئی نئی کمپنی کی عملداری ہندوستان میں آئی تھی۔ گورنمنٹ نے اعتدال کے ساتھ حکومت کرنا اصول حکمرانی اور ملک گیری خیال کیا۔ آہستہ آہستہ لیکن مضبوطی کے ساتھ ملک کے قانون اور تعلیم کو دیکھ کر حکومت کی، اور تدریج اصلاح کرنا ملکی بہبودی سمجھا۔ دیکھو اب ملک کیسا سرسبز و شاداب اور آباد ہو گیا۔ بہت لوگوں کو شکایت کرتے تھے کہ ہندوستان دیوالیہ ہو گیا، برباد ہو گیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ پہلے ہندوستان کی مالی حالت کیا تھی۔ دولت، حکومت، عزت، خاص فرقوں میں مخصوص تھی۔ لیکن انگریزی عملداری میں کیا ہوا۔ دولت سب پر تقسیم ہو گئی۔ ایک پرس اور ایک کاشتکار برابر کے دعوے دار ہیں۔ اس سے پہلے لاکھوں اور کروڑوں کاشتکاروں کی کوئی خبر لینے والا نہ تھا لیکن اب یہ حالت نہیں رہی۔ اب یہ کیفیت ہے اگر ادا وزیر تھے تو باپ سے پہ سالار لیکن کوئی نہیں پوچھتا اب جتنے حقوق ہیں وہ سب سادی ہیں۔ تلوار کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب تو قابلیت اور لیاقت کی پوچھ دیا نت اور انصاف نے غریبوں پر ظلم کرنے سے ہاتھوں کو روک دیا ہے۔ پس کوئی مصلحت اور کوسا موقع ہے کہ مسلمان قسمت کو روئیں یا گورنمنٹ کی شکایت کریں۔ اُن کو گورنمنٹ کی شکایت نہیں کرنا چاہئے بلکہ شکایت کرنی چاہئے اپنی۔ آفتاب جب چمکتا ہے تو ہر ایک چیز اپنی طاقت کے موافق اُس سے فیض حاصل کرتی ہے۔ وہ پھولوں کی کیاریوں میں، چمنوں میں، اور خاردار جھاڑیوں میں، کمیاں روشنی پہنچاتا ہے۔ یہی حال گورنمنٹ کا ہے۔ آج دلی میں بہت سے ایسے دل ہو گئے جنہیں اس کا روشنی کا سماں

دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہو گا کہ افسوس ہم مسلمان بھی ایسے تھے اور ویسے تھے۔ ہمارے یہاں بھی ایسے جشن ہوتے تھے اور ویسے ہوتے تھے۔ لیکن قسمت نے ہماری ہٹی خراب کر دی، دیکھو یہ تاج کس کا بنایا ہوا ہے، قلعہ کس کی عظمت اور شان کی گواہی دیتا ہے؟ ہمیں مسلمانوں کی لیکن کیا کریں تقدیر نے ہمارے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔

صاحبو! جس وقت یہ خیالات ہم میں سے خواہ کسی کے دل میں گزرتے ہوں، اسی وقت، غیبی فرشتہ یاد دیتا ہے۔ کہ بالکل غلط، سراسر جھوٹ، کسی نے تمہارے ساتھ برائی نہیں کی، اگر کی ہے تو خود تم نے اپنے ساتھ کی ہے۔ سٹے ہو تو اپنے ماتحتوں، بگڑے ہو تو اپنے اعمال اور افعال کی بدولت، خدا فرماتا ہے ”لیس للانسان الا ما سعی“ وہی ملتا ہے جو انسان کوشش کرتا ہے۔ جیتے رہو، یا رجاؤ اعمال کی سزا اور جزا سے، نہ یہاں بچاؤ ہو سکتا ہے نہ دوائیں۔ بجائے سہولتیں پیدا کرنے کے لکڑی پٹرنے پر کفر کے فتوے لگائے جائیں۔ غریب طلبہ کی امداد کرنی اُن کا وظیفہ دینا لکھا سمجھا جائے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانا، اُن کو کھانے پینے کے لائق بنانا، گداگری سے محفوظ رکھنا، عاقبت کی خرابی سمجھی جائے، کیا امید ہے کہ نچران اعمال سے چشم پوشی کر سکتا ہے، یا ایسے مجرموں کو معاف کر سکتا ہے؟ کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کوئی چھری مارے ضرور زخم آئیگا، خون ہیگا۔

صاحبو! خوب سمجھ لو، کہ جب تک مسلمان غفلت کرینگے، اور زمانہ کا ساتھ نہ دینگے، وہ اپنے اخلاق اور اپنے اعمال کو اپنے پاک مذہب کے موافق نہ بنائینگے، ہمدردی کی روح اُن کے جسم کی رگ میں نہ پھیلائیگی اُس وقت تک اُن کا آبرو سے دنیا میں رہنا، اور ایک زندہ قوم بن کر زندگی بسر کرنا، محالات سے ہے۔

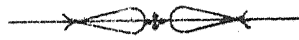
صاحبو! اس جلسہ کو دیکھ کر کسی قدر مجھ کو خوشی ہوتی ہے اور پھر سوچ۔ خوشی تو اس بات سے ہوتی ہے، جب کہ میں دیکھتا ہوں کہ بہت سے معزز جنٹلمین جن کی نہ یہ قومی مجلس ہے، نہ اُن کی اس کوئی ذاتی غرض ہے، نہ اُن کی تفریح کا وسیلہ ہے، اپنے اعلیٰ اعلیٰ درجہ کے سیر قماشوں کو چھوڑ کر، بہت سی ایسی دلچسپی اچھی آوازوں سے جدا ہو کر، جو ان کے خوش نش کرنے کو کافی ہیں سات سات آٹھ آٹھ میل سے چل کر اور تکلف اٹھا کر یہاں تشریف لائے ہیں۔ اگر دریافت کرو کہ کیوں آئے ہیں تو معلوم ہو گا کہ صرف پر جوش آوازیں سننے کے لئے، کس لئے آئے ہیں یہ جتلانے کے لئے، کہ دیکھو ہم اُس قوم کے آدمی ہیں جو تعلیم کو دنیا بھر کی نعمتوں سے ضروری اور مقدم خیال کرتی ہے۔ وہ تمہارے جلسوں میں شرکت کر کے ثبوت دیتے ہیں اس امر کا کہ ہم کو مسلمانوں کی قوم کے ساتھ خصوصیت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تم کوشش کرتے ہو اپنی قوم کے لئے کہ اُس میں تعلیم کی روشنی پھیلے اور گورنمنٹ کی وفاداری کا جوش تمہارے دلوں میں پایا جائے تو تمہارے اُس فعل سے ہم کو خوشی ہوتی اور خوشی

کے ساتھ تم پہنچو سہ ہوتا ہے۔ اور ہمارا آنا اس لئے ہے تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ ہم تمہارے ساتھی اور مددگار ہیں اور اپنی خوشیوں کو چھوڑ کر تمہارے شریک حال بننے کو تیار ہیں۔

یہ ہیں چند اسباب اور خیالات میری خوشی کے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر واکر صاحب اور لیڈی واکر اور دوسری محترم لڑکیاں کیوں آئیں ہیں؟ یہ سب آئے ہیں ہماری عزت افزائی کرنے کو، ہماری بھلائی چاہنے کو اور سب بڑھ کر ہماری ہمت بڑھانے کو۔

لیکن جب میں دوسرے پہلو پر غور کرتا ہوں تو یہ ساری خوشیاں کا فور ہو جاتی ہیں۔ اس وقت دیکھو تو کس قدر ہمارے مسلمان بھائی یہاں جمع ہیں اگر وہ اپنی دولت کا اتنا ہی حصہ ہمیں دیدیں۔ جتنا کہ وہ تقیروں، ستوں، بھگیوں پر طرف کرتے ہیں تو کیا یہ کوئی حیرت کی بات ہوگی کہ ہم پانچ سو غریب طالب علموں کی تعلیم کا انتظام کر سکیں گے۔ لیکن ایسا خیال کرنا ایک جنون اور مایہ نچو لیا کا شعبہ ہے۔ دنیا تو ایک طرف ایسی ہو ابھی انہیں نہیں لگتی۔ سچ ہے ”ان الله لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما یا نفسہم“۔

انگریزوں کو دولت عزت حکومت اس لئے دیکھی کہ وہ سمیٹی رکھتے ہیں اور ہم سے یوں چھن گئی کہ ہم ویسے نہیں ہیں۔



تمہیں ۷۱

۱۔ پیچ

یہ ایسیج بھی خواجہ صاحب بہادر نے ۳۱۔ دسمبر ۱۹ء کو رزلویشن مذکورہ بالا کے متعلق فرمائی:-

حضرات!

میں اس رزلویشن کی تائید کرتا ہوں۔ اس وقت تمام حاضرین نے واقعات اور علم الاعداء سے دیکھ لیا ہو گا کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت کیا ہے۔ کیا ہماری غفلت اور بے پروائی کے یہ نتیجے نہیں ہیں۔ مرحوم سر سید احمد خاں نے جس وقت کالج بنانے کا ارادہ کیا اسی وقت سے اور نیز کالج قائم ہونے کے بعد تو وہ بھی یادہ ہمارے علما اور پیشوایان دین کی طرف سے کفر کے فتوے جاری ہونے لگے، سر سید اور ان کی مددگار جماعت کو نیچری کا خطاب دیا گیا۔ ان کے لئے کتبہ اور مدینہ کفر کے فتوے جاری کر کر رہے گئے۔ اشتہاروں کے ذریعہ سے انگریزی پڑھنا کفر قرار دیا گیا اور

ساری دنیا میں ان فتوؤں کی اشاعت کی گئی چ

مگر میں آج اُس خیال کے لوگوں کو، اور خصوصاً اُن مولویوں کو مایارک بادیتا ہوں کہ گوسلمانوں نے تعلیم میں ابھی کم حصہ لیا ہے۔ تاہم جتنے مسلمانوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی وہ مسلمان اب تک مسلمان بن کر رہے کا فرقہ بنے۔ مگر اے حضرات! اگر آپ سچی بات پوچھتے ہیں تو مسلمان جیسی مسلمان رہ سکتے ہیں کہ اُن کے پاس دولت ہو، اپنے مائے میں مسلمانوں کے پاس ایک بادشاہت دنیوی تھی دوسری بادشاہت دینی۔ دنیاوی بادشاہت جب جاتی رہی، تو اُس کے ساتھ دینی بادشاہت بھی نہ رہی۔ ہندوستان میں بادشاہ نہ رہے تو ولی بھی نہ رہے۔ کہاں ہیں وہ علمائے عظام اور کہاں ہیں وہ مشائخ اور فقرائے عالی مقام جن کے سامنے دنیا جہان کے بڑے سب سے بڑے مقتدر لوگوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ اب جہاں دیکھو مدر سے دیران اور خاںقاہیں سو فی پڑی ہیں مسلمانوں کی تعلیم میں جو کمی رہی اُس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ گورنمنٹ کے کاروبار میں اُن کو حصہ نہ ملے۔ زمین دات خود اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ جب بازار میں کوئی چیز لینے جاتے ہو تو پہلے سے اچھے مال کے لینے کا خیال ہوتا ہے۔ اور وہی مال خریدتے ہو، جو اچھا نظر آتا ہے۔ اسی طرح قیاس کر لو کہ جب گورنمنٹ روپیہ خرچ کرتی ہے تو کیا اس لئے کہ برا مال خریدے، وہ ملازمت اور اپنے ملکی کاروبار میں نہیں لوگوں کو چاہتی ہے جو قابلیت رکھتے ہیں، لیاقت رکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ کس کے باپ دلت تھے کس کے دادا خان بہادر یا پردادا وزیر سلطنت تھے چ

صاحبو! ذرا سوچنے کی بات ہے کہ آخر کیوں مسلمانوں کی حالت ہو رہی ہے، میں جہاں تک غور کرتا ہوں میری سمجھ میں اس سے زیادہ بڑی کوئی وجہ نہیں آتی کہ کم استطاعت فرقہ کا تعلیم نہ پانا ان ساری مصیبتوں کا اصلی اور ٹھیک سبب ہے۔ جب یہ بات معلوم ہوئی تو اُس خرابی کے دور کرنے کی کوشش کی گئی، اور اسی محنت اور دوڑ دھوپ کا نتیجہ ہوا کہ آپ اگر ایک مختصر سا فرقہ کم استطاعت لوگوں کا تعلیم کی طرف مائل ہو ا ہے لیکن اُن کی مالی حالت روز بروز گھٹتی جاتی ہے۔ اور وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ کسی طرح پڑھ سکیں۔ کیونکہ تیس روپیہ ماہوار سے کم خرچ کرنے میں کوئی آدمی پور ڈانگ ہوس میں نہیں رہ سکتا۔ جب تیس روپیہ کی نوکری ملتی ہی نہیں پڑھائیں کیا خاک چ

پس اے حضرات! میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ اگر کسی کے چار، چھ لڑکے ہوں تو وہ کیسے بچوں کو پڑھائے، کیونکہ تعلیم کا خرچ اٹھائے، اور اپنا بھی سپٹ پالے، موجودہ حالات پر نظر کر کے ہم نے یہ کوشش کی کہ دوسروں پر اس کا اثر ڈالا جائے جو دینے کے لائق ہیں۔ اُن سے اس کا رشپ مانگے جائیں۔ اور اس طرح سے روپیہ جوڑ کر وظیفوں کے ذریعہ سے امداد کی جائے۔ چنانچہ ہماری کوشش میں تھوڑی بہت کامیابی ہوئی اور اے حضرات! اس خبر کو سن کر آپ کو خوش ہونا چاہئے کہ ہم آج آٹھ سو

روپیہ مہینہ غریب طالب علموں کی امداد کے لئے کلچ میں دیتے ہیں۔ اور کسی کو نہیں معلوم کہ یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ جو غریب لڑکے ولیفہ لیتے ہیں ان میں اور امیروں کے لڑکوں میں ذرہ برابر امتیاز نہیں ہوتا کھانے پینے میں، رہنے سہنے میں، کھیل کود میں، سب برابر ہیں۔

ہم سے بہت سے امیر اس امر کی خواہش کرتے ہیں کہ ہمارے لڑکوں کے لئے علیحدہ بندوبست کیا جائے۔ ماریں صاحب کے ساتھ رہیں۔ مگر ہم صاف کہہ دیتے ہیں کہ نہیں صاحب یہاں ایک لڑکا لڑکا اور ایک جلا ہے کا برابر کا بھائی ہو کر ایک درجہ اور ایک حیثیت سے رہیگا۔ عزت دولت نہیں ہوتی، بلکہ علم سے حاصل ہوتی ہے۔ عزت خان بہادر اور دولہ بن جانے سے نہیں حاصل ہوتی۔ بلکہ بی۔ اے ہونے اور مسالما بننے سے ملتی ہے۔ ہم اپنے طالب علموں میں یہی فیڈنگ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور سچی عزت کے اصلی اور حقیقی راستوں پر ان کو چلنا سکھاتے ہیں۔

حضرات! اب بتائے کہ اس کے لئے یہ آٹھ سو روپیہ مہینہ کہاں سے آتا ہے۔ خدا خوش اور سرسبز رکھے ہمارے حضور پر نور حضرت نظام کو اور ان کی سلطنت کو (چیرز) جن کی بدولت دو ہزار روپیہ ماہوار ہمارے کلچ کو ملتا ہے حضور پر نور کئے نزدیک تو دو ہزار روپیہ کی کوئی حقیقت نہیں مگر ہم جانتے ہیں کہ ہمارا کلچ انہیں دو ہزار کی بدولت کیسا چل رہا ہے۔ خوش نصیبی ہے مسلمانوں کی کہ ہمارے نئے فنانشل سکرٹری مسٹر واکر صاحب بہادر آج کے دن ہماری مجلس میں تشریف رکھتے ہیں۔ اگر وہ توجہ کے ساتھ تحریک کریں تو میں قومی امید کرتا ہوں کہ دو ہزار کے چار ہزار ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں اسی دلی میں وہ کشتہ زدہ چکے ہیں۔ ان کو دلی کی حالت خوب معلوم ہے کہ یہاں کئی قومی مجلس تھی انہوں نے دلی میں دیکھا ہو گا کہ کوئی قومی جلسہ ایسا موجود نہیں۔ جو کوئی ان سے ملنے آتا تھا اپنی ذاتی غرض کے لئے نوکری کی سفارش کو۔ ہم نہ ذاتی غرض رکھتے ہیں، نہ سفارش چاہتے ہیں۔ بلکہ ہم نفرت کرتے ہیں کہ کسی شخص کے لئے سفارش کریں، لیکن ہاں قوم کے لئے ضرور سفارش چاہتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ایک روز آپ کی مہربانی ضرور بکار آمد ہوگی۔

آج اگر ہمارے آقا حضور نظام ہمارے اس جلسہ میں رونق افروز ہوتے تو ہماری متناظر پوری حلقہ ہماری ہمت میں قوت ہوتی، خیر اگر آج ہم حضور کی تشریف آوری کی عزت حاصل کرنے سے محروم ہے تو ایک نہ ایک دن ضرور ایسا موقع آئیگا، اور ہماری آرزو پوری ہو کر رہیگی اور اس وقت تک ہماری محنت اور ہماری کوشش کبھی فرو نہ ہوگی۔

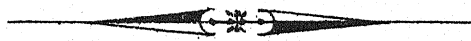
صاحبو! ہمارے کلچ میں ہر سال تین مہینے کی تعطیل کلاں دیجاتی ہے لڑکے جب اپنے گھروں پر جاتے ہیں تو ایک ایک دو دو روپیہ مانگ کر کلچ کے لئے چندہ وصول کرتے ہیں پچھلے دس سال میں لڑکوں نے تیرہ ہزار روپیہ وصول کیا لیکن آپ تعجب کریں گے کہ اس سال جو لڑکے بھیجے گئے تو

انہوں نے سترہ ہزار سے زیادہ قوم سے بھیک مانگ کر چندہ وصول کیا ۛ

حضرات! آپ سوچتے ہو گئے کہ یہ کونسی تحریک تھی۔ جس نے انہیں در بدر پھرنے پر آمادہ کیا۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اُن کو ہمت دلائی گئی، اُن میں جوش پیدا کیا گیا، اُن میں قومیت کی روح پھونکی گئی، وہ ایسے حلقے میں رہتے ہیں، جہاں سوائے ہمدردی، تقسیم اور قومی ترقی کے کوئی آواز اُن کے کان میں نہیں بڑتی۔ اب چال تپنچی ہے کہ تعطیل میں سمجھ دار لڑکے اپنے مکانوں پر نہیں جلتے ماں باپ پیار سے بلاتے ہیں، بھائی بند اصرار کرتے ہیں۔ لیکن وہ بجائے اس کے کہ وطن اور عزیزانِ وطن کو دیکھ کر خوش ہوں اور اپنے پیاروں سے ملیں، بھیک کے تھیلے گلوں میں ڈال کر چندہ جمع کرنے کو نکھاتے اور جا بجا پھرتے ہیں۔ خدا فرماتا ہے کہ ”جو شخص کو شش دل سے کرتا ہے میں اُس کی مدد کرتا ہوں“ اس لئے ہم انہیں کو ششوں سے امید کرتے کہ قوم ترقی کرے گی۔ اور ہم اپنے پاؤں کے سہارے کھڑے ہونگے ۛ

ابھی آپ اس دلی کی کانفرنس کو خیال کیجئے، ہم نے جس وقت یہاں کانفرنس منعقد کرنے کا ارادہ کیا۔ تو اکثر لوگوں نے کاروبار کے موقع پر کثیر اخراجات کے خیال سے ہماری رائے سے اتفاق نہ کیا۔ اور بعضوں نے مایوسی کے خیالات ظاہر کئے کہ کسی طرح خراج کے لائق روپیہ فراہم نہ ہو سکیگا۔ اور بہتوں نے ہماری رائے کو حماقت اور جنون سے تعبیر کیا۔ اور سارے اختلافات رائے کی وجہ وہی روپیہ کا نہ ملنا سمجھا گیا تھا۔ مگر جس کے دل میں آگ لگی ہوتی ہے، وہ چلا آتا ہے اور خدا، دروکی آواز سنکر مدد کرتا ہے۔ ہم نے سچے دل سے کوشش کی، اور خدا نے ہماری مدد کی۔ میں آپ لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ کسی سال تین چار ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں وصول ہوا تھا۔ لیکن اس مرتبہ بائیس ہزار روپیہ چندہ میری اور ڈیفینس میں جمع ہوا۔ آج مجلس کی شان اور ترتیب میں جو نیا جوش ہے وہ دربارِ اعظم اور شہنشاہِ معظم جشنِ تاجپوشی کی برکت کی وجہ سے ہے۔ ہم کو دعا کرنی چاہئے کہ اُن کی عمر دراز ہو، اُن کے ملک میں وسعت ہو، اور اُن کی مہربان حکومت کا سایہ ہم پر قائم رہے ۛ

آخر میں میں تحریک کرتا ہوں کہ اُس محبت اور عنایت کی وجہ سے جو تکلیف مسٹر اکو صاحب بہادر فنانشل سکریٹری حیدرآباد اور مسٹر انج صاحب ڈائریکٹر جنرل پبلک انٹرکشن نے ہماری مجلس میں اکرگوارہ فرمائی ہے اور جو دلچسپی اُن کو ہمارے قومی جلسہ سے ہے اُس کے شکریہ میں تین چیر زفٹے جائیں ۛ



نمبر ۲۰

اسپیج

یہ اسپیشیج ذاب صاحب بہادر نے ۳۱ دسمبر ۱۹۰۲ء کو رزلوشن نمبر ۶ کی تائید اور مولوی بشیر الدین صاحب کی اسپیشیج کے جواب میں فرمائی۔ رزلوشن سنڈیل ہے :-

رزلوشن نمبر ۶

(الف) خیال اس امر کے کہ اکثر رزلوشن جو کانفرنس سے منظور ہوتے ہیں ان پر عملدہ اند کا کافی طور پر نہیں ہوتا، اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ کل ایسے رزلوشن جن میں عملی کارروائی کرنے کی ضرورت ہو، کسی ایک سکشن کے سپرد کر دئے جائیں اور اس وقت جو مفصلہ ذیل سکشن میں یعنی

(۱) سکشن تعلیم نساں (۲) سکشن تعلیمی مردم شماری (۳) سکشن مدارس

ان میں یکسختہائے مفصلہ ذیل اور اضافہ کئے جائیں یعنی :-

سکشن سوشل ریفارم، لطیری سکشن، سکشن امور متفرقات

(ب) یکسختہائے مذکورہ بالا کے سکریٹریوں کا فرض ہوگا کہ جو امور ان کے سکشن سے متعلق ہیں

ان کی بابت سال بھر تک عملی کارروائی کرتے رہیں اور وقتاً فوقتاً ایسی کارروائی کو اخبارات میں

شائع کرتے رہیں۔ اور اخیر سال پانزوی سکریٹری کانفرنس کے پاس پورٹ بھی کریں

(ج) واسطے اخراجات سنہ ۱۹۰۳ء کے کانفرنس کی مد سے مبلغ ایکہزار روپیہ منظور کیا جائے تاکہ ہر سکشن کا

سکریٹری حسب ضرورت تنخواہ محروم نہ ہو اور غیرہ میں صرف کر سکے

(د) اہم مفصلہ ذیل سنہ ۱۹۰۳ء کے لئے سکریٹری مقرر کئے جائیں اور آئندہ ہر سال ہر ایک سکشن کے ممبرانہا

سکریٹری کثرت مد سے منتخب کیا کریں :-

(۱) شیخ محمد عبداللہ صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سکریٹری سکشن تعلیم نساں

(۲) مولوی محمد بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر سکریٹری سکشن تعلیمی مردم شماری

(۳) مولوی بہادر علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سکریٹری سکشن مدارس

(۴) خواجہ غلام ثقلین صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سکریٹری سکشن سوشل ریفارم

(۵) شمس العلماء مولوی شبلی صاحب سکریٹری لٹری سکشن

(۶) ذاب محسن الملک بہادر وزیر سکریٹری کانفرنس سکریٹری سکشن امور متفرقات

۱۷) پرسکشن کا سرکڑی ایک ماہ کے اندر اپنے سکشن کے متعلق ضروری قواعد تیار کرے اور بعد منظوری سنڈل اسٹیشننگ کمیٹی کے اُن پر عملدرآمد کرے۔

حضرات !

مولوی بشیر الدین صاحب نے جو تقریر اس وقت کی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اُنہوں نے جو کچھ کہا وہ بالکل سچ کہا۔ ہم کو اعتراف ہے کہ مہمانوں کو ہر قسم کی تکلیف ہوئی، اُن کی تکلیف سے ہم کو دلی رنج اور رنج کے ساتھ ندامت ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ جو مہمان یہاں تشریف لائے ہیں وہ سب تعلیم یافتہ اور سمجھ دار ہیں۔ جب وہ دربار کے ہجوم کو ملاحظہ فرما دیں گے اور اس بات سے وقت ہونگے کہ گورنمنٹ کو باوجود ہر قسم کے اقتدار کے کس قدر دشواریاں دربار کے انتظام میں پیش آئی ہیں۔ تو غالباً وہ خود فیصلہ کریں گے کہ جو تکلیف اُن کو ہوئی، وہ محض لاچارمی کی وجہ سے ہوئی۔ اور چونکہ وہ اس جلسہ میں ذاتی راحت اور آرام پانے کے لئے نہیں آئے، بلکہ وہ تشریف لائے قوم کو مصیبت سے بچانے کے لئے، وہ آئے اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنے کو، وہ اس تکلیف کو جو قوم کی وجہ سے اُن کو پہنچی رست پر ترجیح دیں گے۔

وہ یہاں کس کے مہمان ہیں؟ خود اپنے۔ اس جلسہ میں نہ کوئی کسی کا مہمان ہے اور نہ کوئی میزبان۔ بلکہ ہر شخص خود مہمان ہے، اور خود ہی میزبان ہے۔ تاہم میں قوم کی طرف سے، کانفرنس کی طرف سے، تمام بزرگوں سے اُس تکلیف کی جو اُن کو پہنچی دلی انوس اور ندامت کے ساتھ معافی چاہتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ کانفرنس سے اپنی دلچسپی اور ہم دردی کم نہ ہونے دیں گے، بلکہ کانفرنس کے کاموں سے دلچسپی لیں گے اور کوشش کریں گے کہ آئندہ کانفرنس یا وہ مفید اور کارآمد ہو، اور کسی قسم کی خرابی اور نقص کانفرنس کے کسی کام میں باقی نہ رہے۔

تمیس ۳۷

اسیچ

یہ اسیچ نواب صاحب بہادر نے ۲۷ جنوری ۱۹۳۷ء کو بمقام دہلی، اجلاس مجلہ کانفرنس میں مولانا نذیر احمد صاحب کے لیکچر اور مولوی محمد شبلی نعمانی و ملک اشرف مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب علی گڑھ نظموں کی نیت بطور شکریہ کے کی۔

حضرات ! اب آپ کی دلی خواہش ہوگی کہ مولوی شبلی صاحب نعمانی اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب کے

فصیح و بلیغ لکچر نہیں *

صاحبو! حقیقت میں ہماری کانفرنس کی اصلی غرض یہی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو اسلام کی حقیقت سے واقف کریں اُس کے نتائج اُن کو سنائیں موجودہ قوم کی پست حالت کی شبیہ اُن کو دکھلائیں۔ جو سفر کی رحمت اور تحفیت آپ نے اُٹھائی تھی، میں یقین کرتا ہوں کہ وہ آج مولانا کی نظم سن کر جاتی رہی ہوگی *

حضرات! واقعی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ اب یادگار زمانہ ہیں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ فیاض انہی کا فیض کبھی بند نہیں ہوتا۔ نہ یہ ہوتا ہے کہ کسی خاص قسم کی لیاقت کے آدمی وہ ایک نغمہ پیدا کر کے آئندہ کے لئے بند کر دے۔ مگر اس بات پر یقین کیجئے کہ آسمان صدیوں چلکھاتا ہے، تب ایک ایسا قابل شخص پیدا کیا جاتا ہے جس کے پیچھے ہزاروں لاکھوں کروڑوں آدمی چلتے ہیں *

ہم اسے مولانا حالی بھی انہیں لوگوں میں سے ہیں جن کا میں نے ذکر کیا۔ میں آپ صاحبوں سے دریا کرتا ہوں کہ جو اثر اس وقت پیدا ہوا اور جو سوز و گداز کی حالت آج ظاہر ہوئی، کیا اُس کا باعث تنظیم لفظ یہ ترتیب الفاظ ہے جو آپ نے سنے۔ نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کوئی نئے لفظ نہ تھے، کوئی نئی بات نہ تھی نیا ذکر نہ تھا۔ وہی لفظ تھے جو دن رات ہم بولتے ہیں۔ وہی باتیں تھیں۔ جن کا ذکر اکثر ہماری صحبتوں میں ہوتا ہے۔ پھر آخر کس چیز نے اتنا اثر آپ کے دلوں پر کیا۔ صاحبو! وہ ایک قلبی کیفیت تھی، اور سچی بات یہ ہے کہ سچائی اور دل پر اثر کر گئی۔ ”پنچازول می خیزد بر دل می ریزد“ میں یقین کرتا ہوں کہ آج جو محرم کی مجلس مولانا نے برپا کر دی اُس کا نتیجہ نہیں ہوگا کہ آج کا اثر کل تک نثار ہو جائے۔ بلکہ اس وقت کی حالت کو دیکھ کر یقین کے ساتھ میں اپنی کامیابی سمجھتا ہوں، کہ انہوں نے وہ تیر آپ کے دل پر لگا یا ہے جو بہت دنوں تک دل میں یادگار رہیگا۔ اور ایک عرصہ تک اُس کی تحفیت سے آپ بچیں رہیں گے۔ آپ نے کسی تھیٹر یا تماشے کی مجلس میں کبھی ایسے سوز و گداز دیکھے ہیں، جیسے یہاں دلوں پر گزرے اور انہیں نے دیکھے *

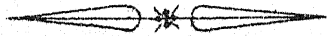
مولانا نے آپ کے دلوں پر نقش کر دیا، اور بتا دیا کہ قوم کس مرض میں مبتلا ہے اُس کے علما کی کیا حالت ہے اور امر کی کیا کیفیت۔ کوئی تھہری کا دل رکھتا ہوگا جس پر اثر نہ ہو۔ مجھے تو بھروسہ ہے کہ یہ اثر نہ صرف یہاں رہنے تک باقی رہیگا، بلکہ یہاں سے جانے کے بعد تک یاد رہیگا اور ایک مدت تک آپ اس کو نہ بھولیں گے *

ہر شخص سمجھتا ہے کہ میرے لئے ایک دن وہ آنے والا ہے جبکہ اپنے خدا کو اور اپنے رسول کو سُندہ دکھانا ہوگا۔ نماز روزہ اور عبادت کا سوال ہوگا۔ ممکن ہے کہ جو نافرمانیاں اُس کی عبادت کرنے میں ہم سے سرزد ہوئیں ہیں اُن کو وہ رحیم اور کریم اپنے فضل اور کرم سے بخش دے۔ لیکن جس وقت یہ پوچھا جائیگا

کہ تم نے غریبوں کی تعلیم کے لئے کیا کیا، یتیموں کی کس قدر خبر گیری کی، تو کیا جواب دو گے۔ حقوق عباد کون بخشے گا۔ ایک ایک یتیم بچہ اور ایک ایک جاہل جو رہ جائیگا، ہم لوگوں کا ہاتھ پکڑے گا اور کہیگا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پوچھئے کہ خدا نے جو ان کو دولت دی وہ کس کام میں لائے ہم ذلیل و خوار ہو ہم نے قلی گیری اور مزدوری کر کے زندگی بسر کی، لیکن انہوں نے ہماری خبر نہ لی ۛ

سیکڑوں ایسے لوگ ہیں جو تمنا کرتے ہیں کہ ہم کو ایڈریس ٹئے جائیں، پھر ہم پر پھول برسائے جائیں بڑے بڑے تنے ہمارے سینوں پر لٹکے جائیں۔ لیکن آپ خیال کرو اس بچہ کی حالت پر جس کے ماں باپ افلاس کی حالت میں مرے ہوں اور وہ بچہ ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہو کیا خیال کرتے ہو گے اس وقت اس کے ماں باپ اور کیا صدمہ گذرنا ہو گا ان پر۔ کبھی سوچتے ہو گے کہ کون اسے پرورش کرے گا کبھی حسرت اور یاس سے اپنے دل میں کہتے ہو گے کہ کون اسے تعلیم دلائیگا۔ نہیں معلوم کہ کسی کچھ مٹی خراب ہوگی۔ کاش ان لوگوں کو جو ایڈریس لینے تنے پٹنے پھول اپنے اوپر برسنے کے خواہشمند ہیں، خدا اتنی توفیق دے کہ وہ ان یتیم اور بے اس بچوں کی تعلیم کا انتظام کریں۔ ان کی پرورش اپنے ہاتھ میں لیں تو یقین جانئے کہ ان بچوں کے والدین کی روئیں وہ ایڈریس ان کو دینگے۔ جن پر زشتگانِ حرت کی مڑگی اور وہ پھول برسائے جائیگے جو ریاضِ جنت میں کھتے ہیں۔ بقابلہ اس کے کیا خاک ان ایڈریسوں کی خوشی ہو سکتی ہے جو تھوڑی دیر میں خاک ہو جاویں اور دیک ان کو چاٹ جائے، یادہ پھول جو تھوڑی دیر میں خشک ہو جائیں، اور وہ تنے جو مرنے کے بعد چھین جاتے ہیں۔ لیکن جو تنے ان روحوں سے ملنے ان پر خدا کی مہر ہوگی جو نہ کبھی گھسیں نہ کبھی مٹیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیں گے ۛ

مولانا حالی نے جو نظم لکھی اور اس سے جو اثر ہوا۔ وہ نہ ہزاروں زر و یوشنوں سے ہو سکتا ہے نہ سیکڑوں تقریروں سے۔ جو سوز و گداز اس نے پیدا کیا، اس کا تجربہ آپ نے خود کر لیا۔ یہی اصلی چیز ہے جو دل سے نکلی غمی اور نور اس نے دل میں اثر کیا۔ میں اس بات کا آپ کو اور انتظار دلاتا ہوں کہ ابھی اس کی تکمیل کے واسطے دو چیزیں اور باقی ہیں۔ مولانا شبلی صاحب جن کی عالمانہ قابلیت سے آپ خوب واقف ہیں اور جن کی تعریف میں خود نہیں کرتا چاہتا، وہ ایک لیکچر دینگے جس کا عنوان ہے ”اسلام اور تعصب“ دوسرا مولانا تھیر احمد صاحب بھی ایک لیکچر دینگے، جس کے سننے کے لئے اگر آدمی ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے تو بھی اس کو ملے گا کہ اس کی رحمت دور ہو جاوے گی اور محنت و دل ہو جاوے گی۔ میں ترغیب نہیں دینی چاہتا۔ اگر آپ کو سنا ہے تو کل ٹھیک ساٹھ دس بجے تقریر کے آئے کہ وہ ٹھیک وقت پر اجلاس شروع ہو جائیگا ۛ



نمبر ۷۴

اسپیج

یہ اسپیشل ڈیپارٹمنٹ صاحب بہادر نے ۳۰ جنوری ۱۹۰۳ء کو بمقام دہلی مٹن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں رزلویشن نمبر ۷ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی۔ رزلویشن جسٹیل ہے :-

رزلویشن نمبر ۷

”اس کانفرنس کو لازم ہے کہ سندھ تک اپنے دائرہ کو وسیع کر کے مسلمانان سندھ کے ساتھ شریک ہو وفاق کی تعلیمی حالت کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں جو آج کل نہایت خراب حالت میں ہے۔“

حضرات !

میرے عزیز دوست نے جو رزلویشن پیش کیا ہے وہ نہایت تائید اور بہت کچھ غور کے قابل ہے صاحبو! کانفرنس اس مجمع نمائے کاشیں رہا۔ بلکہ وہ مسلمانوں کو اپنی حالت سے خبردار کر رہا، اور ان کو خواب راحت سے جگاتا ہے۔ اور یہ دیکھتا ہوں کہ دن بدن مسلمانوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے اور اس سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اور عقرب ایک دن ایسا آئیو والا ہے کہ کانفرنس کے اصلی مقاصد بخوبی حاصل ہونگے اور ہندوستان کے مسلمان اس کی قدر کریں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سر سید مرحوم کی اصلی غرض اس کانفرنس کے قائم کرنے سے کیا تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم کے اصول اور طریقے مسلمانوں کے لئے اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ مختلف فرقوں کے حالات معلوم کر کے ان کی اصلاح کی کوشش نہ کی جائیگی۔ ہم کو کیا معلوم کہ مسلمانوں کے خیالات سندھ میں کیا ہیں اور سندھ والوں کو کیا معلوم کہ یہاں کے مسلمانوں کا کیا حال ہے۔ اب کانفرنس میں جو سندھ کے لوگ شریک ہوئے، تو ان کو ہماری کانفرنس کی حالت معلوم ہوئی، اسی لحاظ سے اس امر کی ضرورت ہے کہ یہاں کے لوگ اب سندھ کو جا دیں اس لئے کہ جیسا ہمارے معزز محرک نے بیان کیا ہے وہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے اور دولت مند بھی ہیں مگر تعلیم سے بالکل غافل ہیں۔ کانفرنس کو وہیں جانا چاہئے۔ جہاں مسلمانوں کو جگانے اور تعلیم کی ضرورت سے آگاہ کرنے کی حاجت ہو۔ پچھلے سالوں میں سر سید مرحوم کے زمانہ میں اکثر اجلاس کانفرنس کے خاص علیگڑھ میں ہوئے۔ اس لئے کہ کہیں سے کوئی دعوت نہ آتی تھی اور مرحوم بھی علیگڑھ میں کانفرنس کا ہونا زیادہ پسند کرتے تھے، مگر ہمیشہ سے یہیں اس کا بہت مخالف تھا اور میری رائے تھی کہ مختلف صوبوں میں ہم یہاں کرنے چاہئیں۔ میں نے مرحوم کو ایک مرتبہ بمبئی سے لکھا کہ گھر سے باہر نکلنا چاہئے، ایسے اجلاسوں سے جو گھر میں

بیٹھ کر لٹے جاویں۔ ہم کو کوئی ترقی کی اُمید نہیں کرنی چاہئے جس کے جواب میں سر سید نے مجھ کو لکھا، ”کہ تم ہی آؤ اور اس کام کو کرو، میں نے تو ایک برس کی رسم مقرر کر لی ہے، اور سال بھر پیچھے علیحدہ ہی میں فاتحہ خوانی کر لیتا ہوں، چنانچہ اُس وقت سے میں نے کانفرنس کو ترقی دینے کا کام اپنے ذمہ لیا اور جاہِ بجا دورہ کیا، مگر اُس وقت تک مسلمان اس کی ضرورت سے اتنے آگاہ نہ تھے، اب اُن کی دینِ بدن آنکھیں کھلتی جاتی ہیں، اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ اُن کی کیا حالت ہے نہ ویسی بے خبری، نہ انگریزی تعلیم کی ضرورت سے انکار ہے بلکہ خواہش اور پیٹ پالنے کی فکر۔ وہ اب جانتے ہیں کہ عورت اور رزق کے دروازے اُن پر چاروں طرف سے بند ہو رہے ہیں اور وہ زمانہ آگیا ہے کہ بغیر اپنی کوشش کے کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی اور یہ بھی سمجھ گئے ہیں کہ بغیر مغربی تعلیم کے جو اعلیٰ درجہ کی ہوا وہ کسی قسم کی عزت اور ترقی کی اُمید نہیں کھ سکتے۔“

حضرات کانفرنس ایک قومی آلہ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم پھیلانے کا ہے، اس آلہ سے جو آواز خود وہ کلکتہ سے مچے یا کسی اور جگہ سے مسلمانوں کو چاہئے کہ اُسے سنیں اور متفق ہو کر کام کریں۔ اس لئے جو تجویز میرے دوست نے پیش کی ہے۔ مجھے اُس سے اتفاق ہے اور میری دلی خواہش ہے کہ سندھ میں جا کر وہاں کے مسلمانوں کی مدد کی جائے، اس سال تو خوش نصیبی سے کانفرنس کی دعوت بٹٹی سے ہو چکی ہے۔ اگر آئندہ سال سندھ سے ہم کو دعوت دی جائیگی تو ہم نہایت خوشی سے لبیک کہتے کوتاہ رہیں۔“

نمبر ۷۵

ایسیج

یہ ایسیج ذیاب صاحب بہادر نے ۳۔ جنوری ۱۹۰۳ء کو اجلاس کانفرنس دہلی میں رزلوشن نمبر ۱ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی :-

رزلوشن نمبر ۱۰

بعض کامیابی تجویز قائم کرنے محمد بن یونیورسٹی کے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک صوبہ میں کمیٹیاں قائم کی جاویں جن کا نام پراونشل کمیٹی ہو اور جو مستقل طور پر اپنے اپنے صوبہ میں واسطے جمع کرنے چندہ کے کوشش کریں ہر ایک کمیٹی کا ایک پریسیڈنٹ اور ایک سکریٹری مقرر ہو

اور یہ پناوش کی ٹیلیاں سرسید احمد میوئل فنڈ کمیٹی کے ماتحت اور اُس کے مجوزہ قواعد کی پابند ہوں اور سرکٹری سرسید میوئل فنڈ کمیٹی کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ماہواری رپورٹ ان کمیٹیوں کی کارروائی کی اخبارات میں شائع کراتا رہے اور نیز سالانہ اجلاس کانفرنس میں سالانہ رپورٹ پیش کرے۔

جناب پریسڈنٹ صاحب حاضرین !

جو رزلٹیشن اس وقت پیش ہوا ہے، نہایت ضروری ہے، افسوس ہے کہ اب تک اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔

اس وقت ایک ایسے بزرگ جو فخر انگلستان میں ہماری خوش نصیبی سے یہاں تشریف لائے ہیں۔ اُن کے آنے سے ہماری کانفرنس کی عزت اور وقت تو اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب کوئی آرزو دل میں باقی نہیں رہی۔

صاحبو! یہ ایک خال نیک ہے ہماری آئندہ ترقی کے لئے، کیونکہ وہ بزرگان انگلستان جن کے ہاتھ میں ہندوستان کے قسمت کی باگ ہے ایسے وقت میں تشریف لائے ہیں۔ جب کہ ہم اپنی قومی تعلیم کا مسئلہ پیش کر رہے ہیں۔

محمل یونیورسٹی کا بنانا ایک امر نہایت ضروری ہے۔ اس واسطے کہ جو تعلیم گورنمنٹ نے ہندوستان میں پھیلائی ہے۔ وہ مسلمانوں کے واسطے کافی نہیں۔ مذہبی تعلیم کے علاوہ معاشرت تمدن وغیرہ کی جس قدر ہماری اپنی ضروریات ہیں وہ ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ صرف گورنمنٹ کی حمایت سے اور اپنی کوشش سے۔

صاحبو! محلدن یونیورسٹی کا خیال ایک خواب پریشاں نہیں ہے جس کو ہم نے دیکھا تھا، بلکہ یہ خواب اُس بزرگ شخص کا دیکھا ہوا ہے جو آج آرام و چین کی گہری نیند سو رہا ہے اور جسے اب ہم اس دنیا میں کبھی نہ اٹھا سکیں گے۔

کوئی بیج زمین پر جب ڈالا جائے اگر اُس کو پانی دیتے رہو تو بڑھتے بڑھتے ایک تناور درخت ہو سکتا ہے اور ہزاروں ذمی روح اُس پر پرورش پاتے ہیں، بعینہ یہی مثال ہماری یونیورسٹی کی ہے کہ اس کا بیج تو بوسیدہ نے، اب جب کہ یہ پھلے پھولے گا اور اس میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو تہذیب شائستگی، علمی قابلیت اور گورنمنٹ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے آپ اپنی مثال آپ ہوں گے تو اُس وقت گورنمنٹ انگریزی کی برکتوں اور آزادی کی بشارت دیتے پھریں گے۔

ایک اور بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ ”کسی محقق القوم یونیورسٹی کی ضرورت نہیں“ اس فقرہ سے اکثر لوگوں کو یہ خیال اور

شبہ پیدا ہوا ہے کہ جب کمیشن کی یہ سلسلے ہے تو محمد یونیورسٹی اب کیسے قائم ہوگی لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ جدید یونیورسٹی قائم ہونے کی بابت جو کچھ کہا گیا وہ صرف کمیشن کا خیال اور اسکی رائے ہے۔ گورنمنٹ نے ابھی تک اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ نہ کوئی آرڈر پاس کیا۔

آپ خوب سمجھ لیجئے کہ اگر یہ رائے مان بھی لی جائے تو بھی اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ادب آزادی کے ساتھ ہم اپنے حقوق کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلاتا چھوڑ دیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ گورنمنٹ کی سچی اور دلی خیر خواہی اسی میں ہوگی کہ جب ہم محمد یونیورسٹی کے لئے روپیہ جمع کر لینگے جس قیمت روپیہ فراہم ہو جائیگا۔ تو ہم ادب کے ساتھ اپنے حقوق کو ثابت کر دکھائینگے۔ اور کہیں گے کہ ہم گورنمنٹ کی سبلی میں غار نہیں ہیں۔ بلکہ اُس کے سینہ میں دل ہیں۔ اور بحیثیت انگلش گورنمنٹ کی وفادار رعایا ہونے کے اُس کے الطاف کے امیدوار۔

ساجو! جس اہول پر ہمارا کالج چل رہا ہے اور ثابت کر رہا ہے کہ ہم قوم اور گورنمنٹ دونوں کے سچے خیر خواہ ہیں۔ اس سے ہم کو امید اور یقین ہے کہ جو پہلا تھہ ہمارے مدد کو بڑھیکو وہ گورنمنٹ کا ہوگا۔ پس اے میرے دوستو! دوسو سال میں مت پڑو، اپنا کام کئے جاؤ۔ کمیٹیاں قائم کرو، شافین بھلا پھر دیکھو کہ کیسی کیسی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں۔ یہ تمہارے اور ہمارے خوش رو اور خوشخو ہر ٹینس پریسیڈنٹ صاحب اسی سال کے لئے ہمارے پریسیڈنٹ نہیں ہیں بلکہ ہمارے تمہارے جیتے جی کے ساتھی ہیں۔ ہر ٹینس جیسے اب بھی ہماری قوم میں بزرگ موجود ہیں جو شل آفتاب کے درخشاں ہیں۔“



نمبر ۷۶

۱۔ پیچ

یہ پیچ فاب صاحب بہادر نے ۲۸۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو (بوقت ۱۲ بجے دن) محمد یونس کافر منہ متقدہ مینی میں پریزیڈنٹ صاحب کے انتخاب کی نسبت فرمائی :-

حضرات!

اپنی زندگی کے نہایت عمدہ ایام میں سے آج کا دن بھی شمار کرتا ہوں۔ کیونکہ جو خدمت اس وقت میرے سپرد کی گئی ہے وہ نہایت معزز اور ایک دل خوش کن خدمت ہے، یعنی انتخاب کے پریسیڈنٹ کا۔

صاحبو! مدت دراز سے میرے دل میں "آرزو میں تھیں" پہلی خواہش تھی کہ کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہو، اور دوسری تھی کہ ایک مرتبہ کانفرنس کی کرسی صدارت پر میں اپنے معزز دوست اور قوم کے عالم و فاضل رکن آرتھر میل سٹورڈر الدین طیب جی کو، رونق افروز دیکھوں۔ مگر افسوس کہ ایک عرصہ تک ان کی کوئی آرزو پوری نہ ہوئی، لیکن صاحبو! جس قدر دیر، جتنی تعویذ، میری دلی خواہشوں کے برآئے میں ہوتی جاتی تھی، بجلے اس کے کہ مجھ کو مایوسی ہوتی، تا امیدیاں بڑھتی چلیں میرے دل کو ایک قسم کا اطمینان، طبیعت کو تسفی ہوتی جاتی تھی۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ یہ میری آرزو کوئی چھوٹی موٹی آرزو نہیں، بلکہ ایک بڑی زبردست آرزو ہے پوری ہونے کو ہوگی مگر دیر سے، اور جب پوری ہوگی تو بہت اچھی طرح اور خوش اسلوب طریقہ سے۔ اس لئے کہ دنیا میں صبی چھوٹی اور اونٹنے قسم کی چیزیں جلد پیدا ہوتی ہیں، قاعدہ کی بات ہے کہ وہ اسی طرح جلد ناپید بھی جاتی ہیں۔ نباتات کو دیکھو، طرح طرح کے گھاسوں کا، جڑی بوٹیوں کا خیال کرو، اگرچہ وہ جلد اگتی ہیں۔ اگتے ہی پھل پھول لاتی ہیں، مگر کتنے دن کے لئے ادھر اگیں، ادھر مرجھا گئیں۔ لیکن بڑے بڑے درختوں کا خیال نہیں۔ مائیکہ ان کا بیج دیر میں جمتا ہے، دنوں میں اگتا ہے، برسوں میں نشوونما پاتا ہے، مدتوں میں پھل لاتا ہے، لیکن اس کے بعد کیا ہوتا ہے، جیسے وہ دیر میں اگتے ہیں، نشوونما پاتے ہیں، پھل پھول لاتے ہیں، اسی طرح ان کے استحکام اور قوت میں ترقی ہوتی ہے۔ ان کے پھل لذیذ خوش ذائقہ ہوتے ہیں دل و دماغ کو تقویت بخشتے اور ذہن پر نہایت ہیں۔

صاحبو! دلی کی کانفرنس اگرچہ اعتبار اپنی شان و شوکت کے یادگار زمانہ ہوگی، لیکن سب سے زیادہ نفع یہ ہوا کہ اس اجلاس سے میرا جوش بہت بڑھ گیا، اور اس خیال کو کہ بمبئی میں کانفرنس منعقد کی جائے بہت ترقی ہو گئی، چونکہ کانفرنس کا اصلی کام قوم میں نئی روح پھونکنا ہے۔ اس لئے دلی کی کانفرنس میں شریک ہونے والے ممبروں نے دواں پر بہت سی بوسیدہ عمارتیں، شانائے سلف کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کی جگہ نئے جنمیں دیکھ کر دل سے آہ نکلتی تھی اور آنکھیں ڈھونڈتی تھیں کہ کہاں ہیں ہماری قوم کے وہ نامور بزرگ جنہوں نے ایسی مصیبت اور عالیشان عمارتیں بنائیں۔ کہ آج تک گو صدیاں گزر گئیں نہ بنائے والے رہے نہ بنوانے والے، زمانہ کے بڑے بڑے انقلاب آئے لیکن ان نشانیوں کو اب تک نہ مٹا سکے، کہاں ہیں ہمارے وہ آباؤ اجداد جن کی شان و شوکت دولت و شہرت کی سیقتل بلعہ گریں باقی ہیں، جس وقت یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ ہماری قوم کی شان و شوکت کہاں گئی، ہماری دولت کیوں ناپید ہو گئی، دل یہ جواب دیتا تھا کہ تقدیر کی خوبی اور قسمت کا کھٹا ہوا پورا ہوا۔

گفتہ چہ تو ان کرو کہ تقدیر نہیں بڑ

لیکن اے صاحبو! جس وقت ہم یہ خیال کرتے تھے، ساتھ کے ساتھ باق فغیب چکا تا تھا اور لوگ سنا تھا کہ نہیں نہیں ہرگز ایسا خیال مت کرو، نہ تقدیر کا کچھ قصور ہے اور نہ زمانہ کی بیوقوفائی کا، بلکہ یہ خود رہا بنا قصور ہے ۷

گفتا کہ خطا کردی و تدبیر نہ ایں بود

تو صاحبو! حالت دیکھ کر میں نے اپنے جی میں کہا کہ کب تک تقدیر کو روکے، کہاں تک حسرت کے آنسو بہاؤ گے، چھوڑ دو دلی کو، اور چلو بھٹی کو دہاں جا کر دیکھو کہ باوجود غیر سلطنت کی رعایا ہونے کے اور باوجود اس کے کہ جو اُمم و آزادی، اطمینان اور آسائش، دہاں کے مسلمانوں کو حاصل ہے، وہی تم کو گرفتار نے عطا کی ہے، لیکن یہاں تمہارے بزرگوں کی بنائی ہوئی عمارتیں بوسیدہ ہو کر گرتی جاتی ہیں اور ادھر بھٹی کے مسلمان جو مثل تمہارے رعایا ہیں، عالیشان عمارتیں بنا رہے ہیں، یہی مسلمان تم جیسے کسٹل نہیں، وہ تو نگرہی اور دولت مندی میں ہندوستان کی دوسری قوموں سے کم نہیں، دولت و ثروت کا نام جو شمالی ہند کے مسلمانوں میں منقود ہے، احمد قند کہ بھٹی کے مسلمانوں میں موجود ہے۔ بس اخیال نے مجھے آمادہ کیا کہ بھٹی چلوں اور پراٹھیا کے غریب مسلمانوں کو بھٹی کے دولت مند مسلمانوں کی حالت دکھا کر ان جیسا بننے کی ان کو ترغیب و تحریص دلاؤں، تاکہ بجائے حسرت کے ان میں بہت پیدا ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ میری یہ آرزو پوری ہوئی، جو لوگ یہاں آئے ہیں ان کے اہل خاندان اور اعزہ اگرچہ خستہ حال ہیں، لیکن اے اہل بھٹی وہ آپسے ملکر اور آپ کی حالت و ثروت کو دیکھ کر، غور کریں گے۔ کہ گو آپ کے پاس سلطنت نہیں ہے لیکن خدا کی مہربانی سے کروڑوں روپیہ کے مالک ہیں، آپ کے تنوں کو کچھ ان کے پڑ مردہ دلوں میں شگفتگی اور ان کی رنج کو تازگی پیدا ہوگی، اور جب وہ آپ کی دولت مندی کے اسباب پر غور کریں گے، تو قسمت کا شکوہ اور تقدیر کا رونا چھوڑ دیں گے، ان میں ایک جوش پیدا ہوگا اور صنعت و حرفت و تجارت کے لئے مردانہ وار کوشش کریں گے ۛ

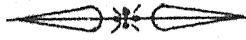
باوجودیکہ یہاں کے مسلمان دولت مند ہیں، فارغ البال ہیں، لیکن اے حضرات بھٹی آپ مجھے دعا فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ ایک چیز کی آپ میں بھی کمی ہے یعنی تعلیم و تمدن میں یہاں کے مسلمان بھی کمی جگہ کے مسلمانوں سے کچھ کم پیچھے نہیں ہیں ۛ

صاحبو! قومی تعلیم و ترقی اور تمدن کی صدا ابھی آپ کے کانوں تک بھی نہیں پہنچی، اگرچہ خوشی کے ساتھ نظر کرتا ہوں کہ آپ کو تعلیمی نفع پہنچانے کے لئے بحسن اسلام موجود ہے جو نہایت عمدہ قومی خدمت کر رہی ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ اب تک آپ نے اس سے کافی فائدہ نہیں اٹھایا۔ پس میری خواہش بھٹی میں اجلاس کا نفرین منعقد کرنے کی اس وجہ سے بھی تھی تاکہ آپ کو تعلیم کے فوائد بتائے جائیں اور آپ کے دلوں میں اعلیٰ تعلیم کے انساب کا شوق پیدا کیا جائے ۛ

بھئی کے مسلمانوں کے متعلق ایک غلط افواہ یہ شہور تھی کہ اُن کو قومی کاموں اور تعلیمی کوششوں سے نہ کسی قسم کی دلچسپی ہے اور نہ ہمدردی، لیکن آج کا عظیم اُتھان اور مقتدر جلسہ خود اس افواہ کی تکذیب کر رہا ہے جو مبارک سویتسلسل میں نظر آتی ہیں۔ آخر کیوں اور کس لئے انہوں نے یہاں آئے کی تکلیف گوارا کی ہے، صرف اپنے مسلمان بھائیوں کی مائے وادِ بلا سننے اور اُن کی اصلاح حالت اور فلاح و بہبود کی خاطر متوجہ ہونے کے لئے۔ پس کیسا مبارک ہے یہ جلسہ اور کس قدر مقدس ہے یہ کام جو ہم سب کو مد نظر ہے مجھے اُمید ہے کہ ہماری اور آپ کی متفقہ کوشش سے ہمارے غریب بھائیوں کی فلاح و بہبود ہوگی۔

دوسری آرزو جو میری دلی تھی، خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی پوری ہوئی یعنی میں اپنے معزز دوست آرنیل مسٹر بدرالدین طیب جی کے پریسیڈنٹ منتخب کئے جانے کی تحریک کرتا ہوں۔ کیونکہ ملحوظ و جا ظاہری کے وہ ہماری قوم کے شاہیر روزگار میں سے ہیں۔ اور اس زمانہ میں بہت کم لوگ مثلاً اُن کی قابلیت شہرت اور اقتدار رکھتے ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ تمام ہندوستان کے مسلمان خوشی کے ساتھ اس خبر کو سُنیں گے کہ مسٹر بدرالدین طیب جی ہماری کانفرنس میں شریک ہوئے، اور نہ صرف شریک بلکہ کانفرنس کی کرسی صدارت قبول فرمائی۔

حضرات! اس موقع پر خوشی کے ساتھ مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ نواب اودہ نصر اللہ خاں صاحب نے پرائیویٹ کانفرنس قائم کر کے ہمارے لئے پیش خیمہ کھڑا کر دیا ہے، اُن کی پرائیویٹ کانفرنس سے ہم کو اور ہماری کانفرنس سے اُن کو مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں بہت کچھ مدد ملنے کی اُمید ہے۔



نمبر ۷

اسپیچ

یہ اسپپیچ نواب صاحب بہادر نے ۲۸۔ دسمبر ۱۹۳۷ء کو محمدان لیگیشن کانفرنس کے اجلاس منعقد ہونے پر منعقدہ میٹنگ میں رزلویوشن نمبر ۳ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی۔ اور رزلویوشن حسب ذیل ہے۔

رزلویوشن نمبر ۳

(اس جلسہ کی یہ ہے کہ کانفرنس کو دوامی اور ہرگز نہ بنانے اور اس میں کل مسلمانوں کو دلچسپی پیدا

کرنے کے لئے قواعد و قوانین کانفرنس میں ترمیم لازمی ہے)۔

حضرات! جو رزلویوشن اس وقت آپ کے سامنے مسٹر جیدری نے بغرض منظوری پیش کیا ہے میں اس کی

تائید کرنے کو کھڑا ہوا ہوں، نہ صرف تائید کرتا ہوں بلکہ اس زولیوشن کا اصلی محرک و حقیقت میں ہوں جس وقت بمبئی میں اجلاس ہونا قرار پایا، میں نے اسی زمانہ میں آنریبل جسٹس بدرالدین طیب جی - تانہی کبیر الدین اور لوکل کمیٹی کے دوسرے سربراہ اور دہ ممبروں سے کہا کہ سوائے شمالی ہندوستان کے دوسری پریسیڈنسیوں کے لوگ ایسی دلچسپی نہیں رکھتے جو بحیثیت مسلمان ہونے کے انہیں کھنی چاہئے۔ آبا کانفرنس کے قواعد اور اس کے موجودہ کانٹریبیوشن میں کچھ نقص ہے، یا ان اطراف کے مسلمانوں کو تعلیمی معاملات سے خود دلچسپی نہیں ہے۔

اگر کانفرنس کے موجودہ قواعد نظر ثانی کے محتاج ہیں تو میں خوشی کے ساتھ آمادہ ہوں کہ ہر صورت سربراہ و رد تعلیم یافتہ اور سمجھدار مسلمان متفقہ طور سے ایسے قواعد تجویز کریں تاکہ ہر ایک پریسیڈنسی کے مسلمانوں کے لئے یہ کانفرنس یکساں مفید ثابت ہو۔ اور ہر جگہ کے مسلمان خواہ وہ کشمیر کے ہوں یا پنجاب کے، ممالک متحدہ کے ہوں یا بنگال کے، مدراس کے ہوں یا بمبئی کے، کانفرنس سے یکساں دلچسپی لیں۔ میں نے نہ صرف بمبئی کے منتقد مسلمانوں سے یہ درخواست کی، بلکہ اخبارات میں اس بحث کو چھیڑا چنانچہ میری اسی درخواست کے بموجب ریزولیوشن مسٹر حیدری نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

حضرات! اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سر سید احمد خاں نے جس وقت اس کانفرنس کی بنیاد قائم کی، ان کے زیر اثر اداؤں کے مشن سے اتفاق کرنے والے زیادہ تر شمالی ہندوستان کے مسلمان تھے اور وہی لوگ اس وقت تک اس کو چلا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کانفرنس کے چودہ اجلاس اپر انڈیا میں ہوئے ان میں سے دو لاہور اور دو دہلی میں، دس ممالک متحدہ میں۔ ممالک متحدہ میں جو اس اجلاس ہوئے، ان میں سے بھی چھ خاص علی گڑھ میں۔ اسی وجہ سے لوگوں نے سمجھ رکھا تھا کہ کانفرنس خاص علی گڑھ کی ہے۔ لیکن بنگال کانفرنس کی وہ حالت نہیں رہی، کانفرنس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے، کوئی پریسیڈنسی باقی نہیں رہی جہاں کانفرنس کا اجلاس نہ ہوا ہو اور لوگوں نے خاص دلچسپی نہ لی ہو۔ چندہ نہ دیا ہو۔ شریک نہ ہوے ہوں۔ چنانچہ کلکتہ اور مدراس کے مسلمانوں نے اس کانفرنس کے اجلاس سے فائدہ بھی اٹھایا۔

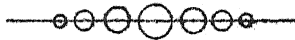
کلکتہ کے اجلاس میں ذاب گورنر بنگال اور مدراس کے اجلاس میں گورنر مدراس جلسہ میں ذوق افزہ ہوے۔ کلکتہ کے مدرسہ عالیہ اور مدراس کے مدرسہ اعظم کے متعلق نہایت دلچسپ مباحثے ہوئے۔ اور گورنمنٹ نے ان پر کافی نوٹس لیا۔ چنانچہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کی اصلاح منظور کی گئی، مدرسہ اعظم مدراس کے لئے گورنمنٹ نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی ایک کوٹھی عمدہ موقع پر خرید کر کے مدرسہ کو اس میں منتقل کیا۔

لیکن یہ حضرات! کلکتہ یا مدراس کے مسلمانوں نے جو کچھ دلچسپی کانفرنس سے لی، مجھے، سید ہے کہ وہاں کے مسلمان مجھے معاف فرمائیں کہ وہ دلچسپی ایک عارضی دلچسپی تھی۔ اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ جب تک

ہر ایک صوبہ کے مسلمان پر نہ سمجھینے کے کافر نس کے کانٹنی ٹیوشن بنانے، اُس کے انتظام میں دخل دینے کا مثل علیگڑھ پارٹی کے ہم کو بھی حق حاصل ہے، سوائے عارضی دلچسپی کے تحقیقی اور اصلی دلچسپی مختلف پریسڈنٹ مسلمانوں میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر ایک جگہ کے مسلمان خواہ وہ پنجاب کے رہنے والے ہوں یا بنگال کے، بمبئی کے ہوں یا برہما کے، سب ہمارے بھائی ہیں اور ہم کو ہر ایک صوبہ کی تعلیم اور اُن کی ترقی کا ویسا ہی خیال ہے جیسا ہمارے ہمسایہ کے رہنے والے مسلمانوں کا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ تعلیم نے آپس کے نفاتوں کو مٹانا شروع کر دیا ہے۔ اگر ہم ایک انچ اپنے بھائیوں کی طرف بڑھتے ہیں تو وہ گزروں ہماری جانب کھینچ آتے ہیں۔ لوگ علیگڑھ کالج کو مفید سمجھتے ہیں کافر نس کو بھی وہ اچھا جانتے ہیں۔ لیکن باہروالوں کو اکثر یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ جو کچھ کوشش کی جاتی ہے وہ صرف علیگڑھ کالج کو تقویت دینے کے لئے۔ حالانکہ جب تک یہ خیال باقی رہے گا کہ کافر نس اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر ہمارا یہ خیال ہو کہ ہماری تمام کوششیں صرف علیگڑھ کالج کے لئے محدود ہوں تو حقیقت یہ ہمارا خیال ایک خود غرضی کا خیال ہے۔

پس ہماری تمام تر کوششیں اس امر پر صرف ہونا چاہئے کہ علیگڑھ کالج ہمارا نہ بھجا بادے بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کا، محمدن ایکویشنل کافر نس صرف علیگڑھ کالج کی آرگنیشن منظور نہ ہو، بلکہ تمام اسلامی کالجوں اور اسکولوں سے اُسے کیساں تعلق ہو، ہم نہ امام ہیں اور نہ دوسرے مسلمانوں کو مقتدی بنانا چاہتے ہیں ہماری ہرگز یہ خواہش نہیں کہ تمام مسلمان علیگڑھ کی آواز کے مطیع ہوں، ہر شخص کو حق ہے کہ وہ قومی تعلیم اور قومی ترقی میں مثل سرسید کے کوشش کرے اگر کافر نس کا کانٹنی ٹیوشن ایسے مسلمانوں کے ماتھے سے ٹینگا، جو مختلف صوبوں کے سربراہان و محاب ہونگے اور جو قائم مقام ہونگے اُس صوبہ کے اہل اسلام کے، اُس وقت حقیقت کافر نس کے ہول ایسے مقرر ہونگے جن سے مسلمانوں کو کسی طرح نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ رہے گا۔ اگر یہ رد و کیوشن اس اجلاس میں پاس ہو گیا، تو میں سمجھوں گا کہ کافر نس مستحکم بنیاد پر قائم ہو گئی اور اُس کے بعد میں بمبئی کے اجلاس کو مبارک باد کا مستحق خیال کروں گا۔



نمبر ۷۸

اسپیج

یہ اسپیشل نوا صاحب بہادر نے ۲۸- دسمبر ۱۹۵۸ء کو مملکت انگریزیشنل کانفرنس منعقدہ بمبئی میں رزولوشن نمبر ۳ کے مقررین کے جواب میں فرمائی۔ (رزولوشن نمبر ۳ کی اصل عبارت اسپیشل بالا سے پہلے درج ہو چکی ہے) *

جناب والا!

جو اعتراض کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ میں نے بمبئی آن کرسٹنٹ نمبر ۱۲ پریسڈنٹ صاحب کو لکھا کہ آپ خود شریک اجلاس سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی ہوں اور لوکل کمیٹی کے ۳ ممبروں کو منتخب کریں، چنانچہ اس کے جواب میں پریسڈنٹ صاحب نے لکھا کہ میں بوجہ بیماری کے خود تو شریک نہیں ہو سکتا۔ البتہ ممبروں کو انتخاب کئے دیتا ہوں، چنانچہ مدوح نے ۳ ممبروں کو منتخب کر دیا اور دفعہ ۱۳ بوجہ وگئی اُن تینوں ممبروں کو کل کمیٹی کے میں نے اور شیخ عبداللہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ جی۔ ممبر سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی نے پروگرام جوڑہ لوکل کمیٹی کو جس میں رزولوشن زیر بحث بھی شامل تھا پاس کیا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اگر علیگڑھ والے یا ممبران سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی نہ آئیں تو کانفرنس کا پروگرام نہ بنے یا اجلاس کانفرنس نہ ہو اور رزولوشنوں پر مباحثہ نہ ہو سکے۔ اگر ممبران سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کو اس امر کا خیال ہے کہ بغیر اُن کی منظوری کے کوئی رزولوشن اجلاس میں پیش نہ ہو سکے تو اُن کو لازم تھا کہ جس طرح میں پندرہ تاریخ کو بمبئی پہنچ گیا وہ بھی وقت سے پہلے آجاتے، لیکن جب وہ مثل عام ممبروں کے اجلاس میں آئیں تو اُس کے ذمہ وار وہ خود ہیں۔ اب پروگرام میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور جو پروگرام تیار ہو چکا ہے وہ ہر طرح باقاعده ہے۔ *



ایسیج

یہ ایسیج نواب محسن الملک صاحب بہادر نے ۲۸- دسمبر ۱۹۳۰ء کو محمدن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ بمبئی میں رزلوشن نمبر ۵ کی تائید کرتے ہوئے فرمائی :-

رزلوشن نمبر ۵

(اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ مسلمان شریف خاندانوں کی رسم و رواج کے پورے لحاظ کے ساتھ زنانہ مدارس قائم کئے جائیں) *

حضرات !

غالباً تمام مجلس اس بات کی منتظر ہوگی کہ اس مسئلہ پر میں بھی کچھ گفتگو کروں !
(اجلاس سے آواز آئی کہ ہاں)

صاحبو ! جو رزلوشن اس وقت زیر بحث ہے پہلے اس کے الفاظ پر غور کرنا چاہئے۔ رزلوشن میں کوئی لفظ پردہ کی مخالفت کا نہیں ہے جب کہ رزلوشن میں کسی قسم کے پردہ کی مخالفت نہیں کی گئی۔ بلکہ صرف نامہ مدارس بپابندی رسم و رواج قائم کرنے کی ضرورت بیان کی گئی ہے تو غالباً کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ تعلیم نسواں ضروری نہیں ہے، لیکن اسپیشوں میں چونکہ پردہ کا ذکر آگیا، لہذا غلط فہمی پیدا ہوئی کہ کانفرنس پردہ کے مسئلہ کو چھیڑنا چاہتی ہے۔

حضرات ! جس مسئلہ کو ذرا بھی مذہب سے تعلق ہو وہ ہرگز کانفرنس میں پیش نہیں ہو سکتا۔ پچھلے سال ہنزہ ٹرسٹ آغا خاں نے جو ایڈریس دہلی کانفرنس میں دیا، انہوں نے مہربانی فرما کر قبل اجلاس مجھے بھی اس کی ایک کاپی دیکھنے کو بھیج دی تھی، اس میں پردہ کا ذکر دیکھ کر میں نے ان سے درخواست کی کہ اس حصہ کو ایڈریس نکال دیا جاوے۔ کیونکہ یہ مذہبی بحث ہے، اور مذہبی بحث کے چھیڑنے سے ہماری کانفرنس کو نقصان پہنچے گا، اور آپ کے ایڈریس اس حصہ کو عموماً مسلمان اعتراض کی نظر سے دیکھیں گے اور عجب نہیں کہ اجلاس میں بھی شورش اور برہمی پیدا ہو جائے۔ لیکن باوجود میرے اصرار کے انہوں نے اس کو ایڈریس نکالنے میں عذر کیا اور یہ لکھا کہ میرے نزدیک یہ مسئلہ مذہبی نہیں ہے جو کچھ میری رائے ہے وہ ذاتی ہے اور میں اس کو صحیح سمجھتا ہوں۔ اس لئے میں ایڈریس نہیں نکال سکتا۔ بہر حال یہ ان کی ذاتی رائے تھی، موجودہ پریسیڈنٹ صاحب کے ایڈریس کو مجھے قبل اجلاس دیکھنے کی عزت حاصل

نہیں ہوئی، ورنہ باصراریں اپنے معزز پریسیڈنٹ سے بھی درخواست کرتا، کہ وہ اس حصہ کو اپنے ایڈریس میں رکھ کر خلاف قانون کانفرنس کا رروائی نہ کریں، اور نہ مسلمانوں کو اس کے خلاف جوش پیدا کرنے اور کانفرنس کو بدنام کرنے کا موقع دیں، بہر حال انہوں نے بھی جو کچھ اس مسئلہ پر کہا یہ اُن کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ کانفرنس کے اجلاس میں بموجب عام قواعد مجالس کے کسی کو حق نہیں ہے کہ پریسیڈنٹ کے ایڈریس پیش ہوتے وقت اعتراض کرے اس لئے میں ایڈریس کے اس جملے پر اعتراض نہ کر سکا مگر مجھے افسوس ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ کلج والوں کی اور کانفرنس کی رائے ہے کہ پردہ اٹھا دیا جاوے میں کہتا ہوں کہ نہ کانفرنس کا یہ منشا ہے اور نہ کلج کا۔ کلج کے بانی مسز سید احمد خاں تو جاہل مجاہل اور کٹر سے کٹر مسلمان سے بھی اس معاملہ میں بڑھ کر تھے۔ جوں، کلکٹروں، کی بیویوں نے اُن کی بہو یعنی محمود بیگم سے ملنا چاہا، لیکن انہوں نے اس کو بھی جائز نہ رکھا۔ علی گڑھ پارٹی اور علی گڑھ کالج کے ۹ فیصدی طلبہ کی ریلے ہے کہ پردہ جیسا کہ موجودہ زمانہ میں ہے قائم رکھا جائے، پردہ کی نسبت میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پردہ ایک مذہبی امر ہے اور مذہب سے جیسا ثابت ہو وہ رکھا جائے لیکن کانفرنس کو اس بحث سے کسی وقت بھی کچھ سروکار نہ ہونا چاہئے، جب کہ یہ امر اچھی طرح سے طے ہو گیا کہ پردہ کی بحث کانفرنس سے خارج رہنی چاہئے، پس اس کو مد نظر رکھ کر اصل رزلویشن پر ووٹ لئے جاویں جس میں کسی قسم کے پردہ کا ذکر نہیں ہے۔ رزلویشن چونکہ صاف ہے لہذا مجھے امید ہے کہ کسی کو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔



نمبر ۸۰

۱۔ اسپچ

یہ اسپچ نواب صاحب باور نے ۲۹- دسمبر ۱۹۰۳ء کو محمدان ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ بمبئی میں ہرمانس نواب صاحب باورہ کی اسپچ کے جواب میں بطور شکریہ کے فرمائی۔

یورمانس!

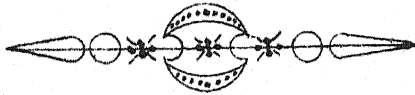
ہم سب مسلمان یورمانس کے نہایت شکرگزار ہیں کہ حضور نے اس نمائش کے افتتاح کرنے کی غرض سے یہاں تشریف لانے کی تکلیف گوارا فرمائی حقیقت میں یہ بہت بڑی مہربانی یورمانس کی ہے جو کہ تعلیمی نمائش جناب لانے اپنے دست مبارک سے کھولی۔ اس مفید کام کے لئے آپ سے بہتر ہم کو کوئی دوسرا شخص نہیں مل سکتا تھا۔ ہر شخص جو حضور سے واقف ہے وہ بلا سبائل یہ کہہ سکتا ہے کہ جو قومی ہمدردی

فیاضی اعلیٰ خیالات یورٹنس کی ذات میں ہیں اُن کے لحاظ سے تمام قوم کو یورٹنس کی ذات پفر ہے تعلیمی معاملات میں جو دلچسپی یورٹنس نے لی ہے اور رستہ العلوم مسلمانان علیکڈھ، جو تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا عظیم الشان قومی کالج ہے۔ اور جس کی سہ پرستی بغیر کسی قسم کی ہماری درخواست کے حضور سے پچاس روپیہ ہوار کے و امی عطیہ سے فرمائی ہے، اس مہربانی کو ہم کبھی نہ بھولینگے، جب ٹیوٹی ڈپوٹیشن جناب والا کی ریاست میں گیا، اور جو کامیابی اُس کو ہاں حاصل ہوئی، اور چھ ہزار روپیہ سے مدد ملی یہ تمام واقعات ایسے ہیں جو کسی شخص کی تعریف کے محتاج نہیں اور جن سے آپ کی روشن خیالی اور ایمانی مافی قومی توجہ کا ثبوت ملتا ہے۔

ان سب باتوں سے بڑھ کر خاص کانفرنس کی شرکت کے لئے باوجود کثرت اشغال، سفر کی زحمت اٹھا کر یورٹنس کا یہاں تشریف لانا اور اس قومی جلسہ کی کارروائی کو غور سے دیکھنا اور قریب قریب تمام اجلاسوں میں دلف آفر دہرنا، اور نہایت توجہ اور شوق سے تعلیمی مسائل اور تعلیمی مباحث کو سننا یہ باتیں جن کو دیکھ کر کسی قدر اندازہ اُس دلچسپی کا ہو سکتا ہے جو حضور کو قومی کاموں سے ہے اور جن کی وجہ سے آئندہ کے لئے نہایت دل خوش کن امیدیں ہمارے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

جناب والا! آج آپ نے تعلیمی نمائش کا دوا زہ نہیں کھولا بلکہ مسلمانوں کے لئے وہ جامعیت کھولا ہے جس کے کھولنے پر وہ ایسے مکانات کے اندر داخل ہوتے ہیں جہاں تعلیم کے نتیجے اور اُس کی وجہ سے جو روشنی دنیا میں پیدا ہوئی ہے اُس کے سامان نظر آتے ہیں اور جن کو دیکھ کر ایک من ایسا آئینہ لگا کہ وہ بھی نہ اپنی ذات کے لئے، بلکہ قوم کے لئے، اور نہ قوم کے لئے بلکہ تمام دنیا کے لئے اپنی مفید پیش ہما یجا دوں کی وجہ سے پھر ایسے مشہور اور عالم کو فائدہ پہنچانے والے ہونگے جیسے کہ کبھی ان کے بزرگ دنیا میں مشہور تھے اور دنیا کو فائدہ پہنچاتے تھے۔

غرض میں اپنی تقریر اس قدر اور بیان کر کے ختم کرنا ہوں کہ اس مبارک رسم کا آپ کے مبارک ہاتھوں سے ادا ہونا ہماری کانفرنس کی تاریخ میں ہمیشہ شکر گزاری اور دلی احسانندی کے ساتھ یاد رہے گا۔



نمبر ۸۱

اسپیج

یہ اسپیش فوج صاحب بہادر نے ۲۹ - دسمبر ۱۹۰۷ء کو محمد بن ابوبکر شمس کا نفرین منعقدہ بمبئی میں
جناب خان بہادر دارا شاہ وزیر ریاست جاوہر کی تقریر کے شکریہ میں فرمائی :-

حضرات!

غالباً آپ اتفاق کریں گے کہ جو تعلیم ہم کو خان بہادر دارا شاہ نے دکھائی ہے اور جس خوبی سے انہوں نے ہم کو طریقہ تعلیم بتایا اور جس محنت سے انہوں نے ہمارے بچوں کو تعلیم دی وہ اس کے لئے ہر طرح قابل شکر گزاری ہیں۔ خود ہماری قوم کا اگر کوئی شخص اس قدر محنت ہمارے بچوں کے ساتھ کرتا تو وہ بھی کچھ کم شکر گزاری کے قابل نہ ہوتا، لیکن جب کہ ایک غیر قوم غیر مذہب کے شخص نے محض انسانی ہمدردی کے خیال سے ہمارے بچوں کے ساتھ اس قدر محنت برداشت کی تو وہ ہر طرح سستی شکر گزاری ہے۔
حضرات! پارسیوں کی تعداد ۸۰ ہزار سے زیادہ نہیں ہے، لیکن دولت ثروت تجارت و تعلیم فیاضی اور ہمدردی جو کچھ ان میں ہے اسے دیکھتے اگر یہ کہا جائے کہ وہ ۸۰ لاکھ سے زیادہ ہیں تو کچھ حیرانہ ہوگا +

اس زمانہ میں جو ترقی انہوں نے کی ہے اس کی نظیر نہیں۔ مسلمان اگرچہ سلطنت جانے کی شکایت کرتے ہیں اور سلطنت کی عدم موجودگی کو اپنی بکثت کا باعث قرار دیتے ہیں لیکن حضرات سلطنت اصلی قوت نہیں ہے، بلکہ اصلی قوت ہے علم۔ جس کا ثبوت مسلمانوں اور پارسیوں کی حالت سے بخوبی ہوتا ہے۔ ہماری سلطنت کو گئے ابھی سو برس نہیں گزرے، لیکن ان کی سلطنت کو گئے بارہ سو برس سے زیادہ زمانہ ہو چکا۔ لیکن پارسیوں کے مقابلہ میں ہماری قوم جس کی تعداد چھ کروڑ سے زیادہ ہے کسی بات میں ہمسری اور برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ہماری قوم میں کوئی قطبہ جمشید جی بھائی کی نہیں مل سکتی۔ اٹانے جو فیاضی ظاہر کی مسلمانوں میں کون ہے جو اس کی نظیر دیکھے +

حضرات! سو برس پہلے پارسیوں کی قوم میں وہ سبطوتیں موجود تھیں جو ہماری قوم میں ہیں۔ لیکن ان کی قوم کی ترقی کا صرف ایک گڑھے یعنی انہوں نے اپنی کل قوت اور فیاضی صرف اپنی قوم کی نفع رسانی میں صرف کی +

یہ طریقہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کا تھا اور اسی کی ہم کو شش کر رہے ہیں کہ ہم مسلمانوں میں پھر اسی طریقہ کا رواج ہو۔ عبادت و حقیقت ہمارے بزرگوں کا ترک ہے جو ہم کو ملنا چاہئے، لیکن اپنے بزرگوں کا ترک جہل

کرنے کی توجہ نہ کی اور پارسیوں نے ہمارے بزرگوں کا ترکہ ہم سے لے لیا۔
 بیٹھی کانفرنس ہم کو بہت سے عمدہ سبق دئے ہیں نچلاؤں کے آج کے جلسے میں جو کچھ ہم نے

دیکھا وہ نہایت مفید ہے۔ ہم شکر ادا کریں لوکل کمیٹی، بیٹی اور بالخصوص آنرہبل جسٹس بدرالدین طیب جی اور
 قاضی کبیر الدین صاحب کے جنہوں نے مہربانی فرما کر ہم کو ایسی عمدہ تعلیم کے دیکھنے کا موقع دیا۔

حضرات! ان لڑکوں کی تعلیم کا جو طریقہ آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ طریقہ تعلیم ڈیڑھ سو برس پہلے کی یورپ
 میں ایجاد ہوا تھا جو نہایت مفید ثابت ہوا ہے لیکن ہمارے یہاں جو چیزیں پڑھائی جاتی ہیں، وہ
 جواںوں بلکہ بڑھوں کے پڑھنے کی ہیں مثلاً لڑکوں کو کریم پڑھائی جاتی ہے جب کہ ایک بچہ یہ نہیں جانتا کہ
 ہوس کیا چیز ہے تو اس کا اثر بچہ کے دل پر کیا پڑ سکتا ہے تعلیم و تربیت تجربہ اور شوق کی محتاج ہے۔

انگریزوں کی قوم جو آج تعلیم میں اس قدر ترقی کر گئی ہے کچھ زمانہ پہلے وہ بالکل وحشی تھی اس زمانہ
 کے مسلمان علم اور تمدن میں اعلیٰ درجہ کی ترقی پر تھے مسلمانوں نے پانچ سو برس تک عیسائیوں کو تسلیم ہی ہے
 آج جب کہ ہم اپنی قوم کو انگریزی تعلیم کی تحصیل اور مغربی علوم کے اکتساب کے لئے آمادہ کرتے ہیں تو ہماری
 قوم ہم کو الزام دیتی ہے کہ ہم مسلمانوں کو نیچری بناتے ہیں۔ جو الزام مسلمان ہم کو دیتے ہیں یہ نیا الزام ہے
 بلکہ دنیا میں جب کسی قوم میں علم کی روشنی پھیلائی جاتی ہے، تو ہر جگہ اسی قسم کا الزام دیا جاتا ہے انگریزوں
 سے دریافت کرو کہ ان کے یہاں کیا حال تھا۔ پیرس کی گلیوں اور سڑکوں پر جو غلاظت پڑی رہتی تھی اس کا
 حال دریافت کرو، پادریوں کا یہ حال تھا کہ مہینوں ہفتوں تک کبھی نہاتے نہ تھے اگر اتفاقاً کوئی تیسری جوتھے
 مہینے کوئی نہاتا تو اس کو مسلمان کہا جاتا جس وقت اٹلی کے باشندے مسلمانوں سے عربی زبان کے
 علوم کی تعلیم پا کر اپنے ملک کو واپس جاتے تو پادری کہتے کہ شیطان ہو گیا، کافر ہو گیا، مسلمان ہو گیا،
 اسی جرم میں بہت سے آدمیوں کو ملک سے جلا وطن کیا گیا کہ ان کے فاسد عقائد کا اثر عیسائیوں پر نہ پڑنے
 پاوے لیکن کیسا انقلاب مانا کہ آج جو مسلمان انگریزی پڑھتا ہے، اس کو کافر اور نیچری کہا جاتا ہے
 میری دعا ہے کہ خلا سب کو ایسا کافر اور ایسا نیچری اور کافر بنائے، جس کے معنی ہیں، روشن خیال مسلمان
 غیر متعصب مسلمان ہیں۔ میں خان بہادر داراشاہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اگر ہم مسلمان اپنے بزرگوں کی تعلیم
 بھول گئے اور یہ خدا ترس پارسی ہمارے بچوں کی تعلیم میں مصروف ہے۔ ورنہ آج ہماری توجہات ہے
 کہ اپنے بچوں کو زیور اور عمدہ لباس پہنانے کے لئے جس طرح بھی ممکن ہو اور جہاں سے بھی ہو سکے روپیہ
 صرف کرنے میں دریغ نہیں لیکن تعلیم میں خرچ کرنے کے لئے مفلسی کا عذر ہے۔

دنیا کے تمام مصارف میں سید رہنے روپیہ خرچ کرتے ہیں لیکن میانجی کی تنخواہ مقرر کرنے کے وقت
 انتظام اور کفایت شعاری کا پورا لحاظ کیا جاتا ہے اور دو روپیہ ہوا اسے زیادہ تنخواہ مقرر نہیں کی جاتی
 بیاہ میں ناچنے کے لئے طوائف کو ایک رات کے ڈیڑھ سو روپیہ دیدیں، لیکن قاضی جی کو پانچ روپیہ سے

زیادہ نہ دینگے *

غرضکہ کہاں تک قوم کی حالت کو بتایا جاوے لیکن اے حضرات اب عورتوں کی طرح رونے کا وقت نہیں ہے، بلکہ کام کرنے کا وقت ہے، قوم بیمار ہے، اس کے علاج کرنے کی ضرورت ہے، ہم لوگ جو علیگڑھ پارٹی کے نام سے شہور کئے جاتے ہیں اسی واسطے آئے ہیں کہ بیمار قوم کا علاج کریں۔ نسخہ لکھیں۔ لیکن نسخہ اگر لکھ دیا جاوے تو تعویذ کی طرح گلے میں لٹکانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ضرورت ہے دوا لانے کی، لیکن دوا کے لئے روپیہ کی حاجت ہے۔ اگر کسی نہ کسی طرح دوا کے اجزاء ہم پہنچائے تو یہ اور مصیبت ہے کہ بیمار ضدی ہے کہ جہاں دوا دلا نا چاہا اور اُس نے لات ماری اور جڑ بھلا کہنا شروع کیا۔ لیکن علیگڑھ کے ڈاکٹر پھوٹے کو چیر کر کے جہالت اور اودام فاسد کا جو مواد بھرا پڑا ہے اُس کو خارج کرینگے۔ پھوڑے کے چیرنے کے وقت بیمار ضرور چیخا چلائیگا لیکن جب مواد خارج ہو جاویگا۔ تو وہ زمانہ قریب آویگا کہ تم کو گے کہ علیگڑھ سے جو ڈاکٹر آئے ہیں اُن کو سلام کرنا چاہئے *

نمبر ۸۲

اسپیج

یہ اسپیشل نواب صاحب بہادر نے ۳۰ دسمبر ۱۹۰۳ء کو محمدن لیجیشنل کانفرنس منعقدہ بمبئی میں رزلویشن نمبر ۹ کی ترمیم کی تائید کرتے ہوئے فرمائی :-

رزلویشن نمبر ۹

اس کانفرنس کی رائے میں وہ وقت آگیا ہے جب کہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال مسلمان متحدہ کوشش ان رسوم کی استیصال میں کریں جو مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہیں اور جس سے وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے اخراجات کے تحمل نہیں ہو سکتے، خصوصاً شادی و غمی کے اخراجات کو مناسب طریقہ سے محدود کر دیا جائے اور کانفرنس کے ہر ممبر کو لازم ہوگا کہ اُس پر عمل درآمد کریں *

(۱) مسکرات کی جملہ اقسام سے پرہیز کرنا *

(۲) شادی و غمی پور و لباس وغیرہ جملہ اخراجات میں فضول خرچی نہ کرنا *

(۳) اولاد کا کلچ ایام نایاب فی میں یا اُن کی خلاف مرضی نہ کرنا *

(۴) اہمال خورد و سال کو قطعی زیور نہ پہنانا اور نہ شوق دلانا *

۵۱) ہندوستان میں بدگلوں کو خیرات نہ دینا +

۵۲) جدید طرز معاشرت کے اسراف کو روکنا +

۵۳) صیغہ اصلاح تمدن کے کسی ممبر کو سیکار نہ رہنا +

اور کسی ایک ریکارڈ شخص کو کام میں لگانا +

چنانچہ یہ کانفرنس تمام مسلمانوں سے عموماً اور ممبران کانفرنس سے خصوصاً امید رکھتی ہے کہ وہ

نہ کوڑہ بالا مقاصد پر عمل کریں گے +

حضرات!

مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ ۱۶ برس کانفرنس قائم ہے۔ لوگوں کا اعتراض تھا کہ زربلیون پاس کئے جاتے ہیں لیکن عملی کام نہیں ہوتا۔ البتہ سال گذشتہ سے صرف دو زربلیونوں پر باقاعدہ توجہ ہوئی ہے اور عملی کام شروع کیا گیا ہے +

ایک تو اظہارِ سیکیشن ہے جس کے سکریٹری ہمارے نامور عالم اور شہور عالم شیخ شمس العلام ملانا شبلی نعمانی ہیں، جن کے استقلال اور توجہ اور اعلیٰ قابلیت سے انجمن ترقی اردو نہایت محکم بنیاد پر قائم ہوئی ہے، اور جو اپنا کام نہایت عمدگی اور خوبی سے انجام دے رہے ہیں اور جس کے عمدہ نتائج حاصل ہونے کی پوری امید ہے +

دوسرے صیغہ اصلاح تمدن، جس کے سکریٹری میرے عزیز خواجہ غلام الثقلین صاحب ہیں انہوں نے جس سچائی، ہمدردی اور دلسوزی سے کام کیا ہے اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ میرے نزدیک کانفرنس پر فرض ہے کہ وہ ان دونوں صاحبوں کی خدمت کا نہ صرف شکریہ ادا کرے، بلکہ اُن کو اُن کے کاموں کے انجام دینے میں، جو انہوں نے اپنے ذمہ لیا ہے، مدد دے۔ اور جو تجویزیں ان کی طرف سے پیش ہوں اُن پر خاص توجہ کرے۔ کانفرنس منظور کرے یا نہ کرے لیکن یہ لوگ برابر اپنے کام میں مصروف رہیں گے، کیونکہ سرسید کا اثر جس شخص پر قائم ہے وہ کسی طرح اپنے ارادہ سے باز نہیں رہ سکتا۔ پس میں اس ترمیم کی تائید کرتا ہوں +



نمبر ۸۳

اسپیج

یہ اسپیش نو صاحب بہادر نے یکم جنوری ۱۹۰۷ء کو اجلاس محمدی ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ بمبئی میں حساب آمد و خرچ پڑھ کر سنائے کے بعد فرمائی :-

جناب پریسڈنٹ!

اگرچہ بموجب قاعدہ کانفرنس کے کانفرنس کی فیس ممبری اور ڈونیشن مقامی اخراجات کے بعد جو باقی بچتے ہیں وہ کانفرنس کے مصارف کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن اہل مدراس نے جب کانفرنس کو مدعو کیا، تو انہوں نے یہ لکھا کہ ہم نہایت مشکل سے روپیہ اپنے مقام پر جمع کرینگے۔ لہذا ہماری خواہش ہے کہ جس قدر چندہ ہم مدراس میں جمع کریں اُس میں مقامی اخراجات متعلق اجلاس منہا کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہے اُس میں سے نصف کانفرنس کے سالانہ مصارف کے واسطے لیا جاوے اور نصف انجمن مفید الاسلام مدراس کو دیا جاوے۔ میں نے اس خیال سے کہ جہاں کانفرنس کا اجلاس ہو وہاں کی مقامی تعلیم کو بھی نفع پہنچنا چاہئے، اہل مدراس کی درخواست کو منظور کر لیا۔ لیکن مدراس کے اجلاس کانفرنس میں بعض ممبروں نے اس تجویز پر اختلاف کیا۔ اُن کا اختلاف اس بنیاد پر تھا۔ کہ کانفرنس چونکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی ارگنیشن ہے لہذا ضرورت ہے کہ خود کانفرنس کی بنیاد مستحکم ہو اور اُس کے فنڈ میں کافی سرمایہ جمع رہے لیکن بعد طویل مباحثہ کے آخر کار یہ قرار پایا کہ جس قدر روپیہ لوکل کمیٹی مدراس کی معرفت جمع ہوا ہے اُس میں سے لوکل کمیٹی مدراس کے اخراجات منہا کرنے کے بعد جو باقی رہے اُس میں سے نصف انجمن مفید الاسلام مدراس کو دیا جاوے اور نصف سنٹرل سٹینڈنگ علیگڈھ کو۔ میں نے اسی تجویز کے موافق بمبئی لوکل کمیٹی سے بھی مثل مدراس کی لوکل کمیٹی کے باہم طے کیا ہے کہ لوکل کمیٹی بمبئی کی معرفت جس قدر روپیہ وصول ہو بعد مہتمائی اخراجات کے اُس میں سے نصف انجمن سلام بمبئی کو اور نصف سنٹرل کمیٹی علیگڈھ کو دیا جاوے مجھے اُمید ہے کہ آپ سب صاحب اس تجویز کو منظور فرماوینگے۔



نہیں ۴۴

اسپیج

یہ اسپیش نواب صاحب بہادر نے یکم جنوری ۱۹۰۲ء کو محمدان میگزینلٹل کے اجلاس سہفتدہم منعقدہ
بکینی میں بطور آخری اسپیش کے پریزڈنٹ کی تقریر کے جواب میں فرمائی :-

حاضرین !

ابھی پانچ دن کا ذکر ہے کہ جب ہم سب اس پنڈال میں اکٹھے ہوئے تھے، وہ تقریب تھی
جلسہ کے افتتاح کی اس وقت ہم دیکھنے تھے اور خوش ہوتے تھے کہ کس وقت شوق سے لوگ چلے آتے
ہیں طرح طرح کے سامان ہو رہے ہیں ۔

صاحبو ! کیسا مبارک تھا یہ مجمع، اور کیسا نفیس تھا یہ منظر جس میں سفید سے سفید زرد لیوشن پاس ہو
نصیب دہلیخ تقریریں ہوئیں۔ ہر شخص کا دل قوم کی محبت سے بھرا ہوا نظر آتا تھا، سینوں میں ایک جوش
تھا، اور دلوں میں ایک درد، جو گھروں سے کھینچ کر، ملکوں سے سمیٹ کر، ہزاروں کوس کی دوری پر یہاں
سب کو لے آیا تھا۔ اس کے بعد جو کارروائی ہوئی وہ جسمانی، روحانی، دماغی، عقلی، ترقی کے لئے
ہر ایک طرح سے دلخوش کن تھی۔ مگر اب ہمارے اجلاس کا یہ آخری دن ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری
کارروائی کا آخری گھنٹہ بھی تھوڑی دیر میں بجا چاہتا ہے ۔

صاحبو ! ایک وقت تو وہ تھا کہ جب یہ عمدہ مکان ایشیائی اور مغربی طرز کے فریخ سے طیار کیا
جاتا تھا، قسم قسم کی زیب و زینت کے سامان نظر آتے تھے، اس کا دلکش اور خوشنما منظر اپنی خوبی
اور نفاست کے لحاظ سے ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کر لینے کے لئے کافی تھا ۔

مگر کل صبح سے یہ سامان اٹھنا شروع ہو گا، نہ یہ دیکھ سکتے ہیں، نہ لوگوں کی چل بہل باقی
رہیگی، نہ روشنی سے جھاڑو فانوس جگمگاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ البتہ ایک سکوت اور سائے کا عالم باقی
رہ جائیگا۔ لیکن حضرات ! کیا آپ کے خیال میں اس ظاہری شان و شوکت کے دور ہو جانے سے ہمارا
اصلی مقصد بھی فوت ہو جائیگا ؟ مانا کہ یہ جھاڑو فانوس کی روشنی جاتی رہیگی جس کو ظاہری آنکھیں دیکھ
سکیں گی۔ تو کیا اس سے وہ نور اور اصلی روشنی، جو اس کا فرائض کے مقاصد سے پیدا ہوئی ہے، یعنی بچوں
کی تعلیم ان کی تربیت قومی ہمدردی کا خیال یہ بھی مفقود ہو جائیگی ؟ نہیں نہیں کمی نازل نہ ہو گی اس
لئے کہ یہ روشنی جو ہمارے دلوں میں پیدا ہوئی وہ نئے اور پرانے دونوں قسم کے لیمپوں سے لی گئی ہے
جیسے جدید تعلیم یافتوں نے لیمپ دئے، اسپیشیں کس طرح پر ہمارے پنڈال میں پرانے مولویوں نے

وعظ کیا، خطبے پڑھے، پروردہ پر بحث کی، قرآن کی آیتیں سنائیں گئیں، سنسکرت کے دوہے گائے گئے، اور ان سب باتوں نے لکڑا ایک طرح کی مشرقی اور مغربی کیفیت پیدا کر دی۔
صاحبو! جن جھاڑوں کی روشنی کو آپ نے دیکھا اگرچہ بظاہر دیکھنے میں خوشنما ہو لیکن حقیقت میں یہ روشنی فانی ہے، وہی لمبپ روشن زیادہ رہتے ہیں جن کا میں نے ذکر کیا اور انہیں کی روشنی ایسی ہے جس کو فانی نہیں کہہ سکتے۔

صاحبو! یہ کانفرنس ایک ایسا چراغ ہے جس نے قوم سے جہالت کی تاریکی کو مٹا کر تعلیم کی روشنی پھیلائی ہے۔ آپ جانتے ہیں چراغ کی روشنی کا کیا خاصہ ہوتا ہے؟ ایک چراغ سے سیکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں چراغ روشن ہو جاتے ہیں اور پھر اُس چراغ کی روشنی بدستور باقی رہتی ہے۔ اسی طرح یہ کانفرنس جس کی مثال میں نے چراغ سے دی، منزلہ ایک ایسے روشن چراغ کے ہے کہ جس سے نہ صرف اس صوبہ بمبئی کی روشنی بچھگی، بلکہ تمام ہندوستان منور ہو جائیگا۔
آپ کے دل اس روشنی سے ہمیشہ روشن رہیں گے اور ایک ایک آدمی سے صد آدمی کی روشنی کو حاصل کر سینگے۔

صاحبو! کسی کو روپیہ دینا بہت آسان ہے مگر روپیہ آنی جانی چیز ہے ہمیشہ کسی کے پاس نہیں رہتا، آیا اور ہاتھ سے نکلا لیکن ایسی روشنی ہر وقت پاس رہتی ہے۔
حضرات! قبل اس کے کہ میں اپنے معزز اور عالم پریسیڈنٹ صاحب اور لوکل کمیٹی کے قابل سکریٹری فاضی کبیر الدین صاحب کا دل سے شکرا ادا کروں، اپنا فرض خیال کرتا ہوں کہ جیسے ہمارے معزز پریسیڈنٹ صاحب نے اپنے خیالات نہایت صاف اور سچائی سے ظاہر فرمائے ہیں تو میں بھی جو اس کمیٹی فارم پر کھڑا ہوں محض شاعر ہی نہ ہوں بلکہ اسی طرح صفائی کے ساتھ اپنے خبیالات کا اظہار کر دوں۔

صاحبو! مدت سے یہ میری منتنا تھی کہ بمبئی میں کانفرنس کا اجلاس ہو، مختلف موقعوں پر پریسیڈنٹ صاحب سے اپنی خواہش کا میں نے اظہار کیا مگر جواب اپنی مرضی کے موافق نہ پایا، یہاں تک کہ پچھلے ستمبر کے مہینہ میں جب پھر وہیں بمبئی آیا، تو یہ ارادہ کر کے آیا "ما تن رسد بجا تا جاں ز تن برآید" اس مرتبہ چاہے کچھ بھی ہو بمبئی میں کانفرنس ہوگی اور ضرور ہوگی، کیونکہ میری کوشش اگر سچی ہے اور میں صرف قومی ہمدردی کی وجہ سے بمبئی میں کانفرنس ہونا چاہتا ہوں، تو ناممکن ہے کہ ہمارے پریسیڈنٹ صاحب جو مجھ سے عزت میں، دولت میں، علم میں، ہر طریقے سے زیادہ ہیں، میری تمنا کے ساتھ ہمدردی نہ فرمائیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور جب میں نے پریسیڈنٹ صاحب سے تمام مقاصد بیان کئے تو انہوں نے

اسلام کلب میں جہاں مجھ کو ڈر دیا گیا تھا مجھے حلیمہ میں اپنے خیالات ظاہر کر کے نہایت خوشی سے کانفرنس کا بمبئی میں منعقد ہونا منظور فرمایا۔

مگر حضرات! شوق میں آکر بمبئی میں کانفرنس کا ارادہ کرنے کو نوکر لیا، پریسڈنٹ صاحب بھی یعنی ہو گئے، لیکن اُس وقت سے میرے دل میں یہ دوسرا اور خیال پیدا ہوا کہ کانفرنس ہونے کو تو ہوگی، مگر کامیابی محال ہے، اور کچھ ہوئی بھی تو کسی شمار و قنطار میں نہیں، کیونکہ خیالات متفرق لاطعلی محض غلط فہمیاں بے انتہا موجود۔

صاحبو! مختلف خیال اور عقاید کے لوگ علیگڑھ میں ہی مخصوص تمام دنیائے جاتے ہیں، اس بمبئی سیکڑوں ہزاروں آدمی ایسے لیٹنگ جن میں اکثر لاندہب ہونگے سیکڑوں نیچری ہزاروں تارک التسلوۃ۔ لیکن ان واقعات اور حالات پر کوئی نظر نہیں کرتا، جہاں علیگڑھ پارٹی کا نام آیا تو بلا سوچے سمجھے اور بغیر حقیقت حال دریافت کئے کفر کے فتوؤں کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔ وہی مثل ہے

ہر بلائے کو آسمان آید گرچہ بزرگ سے قضا باشد

برزخ میں نرسیدہ ہے پیرد خانہ انوری کجبا باشد

غرض دوسرے دن جب میں اپنی تعریف اخباروں میں دیکھتا تھا تو بلا مبالغہ کوئی ایسا لفظ نہ ہوتا تھا۔ جو اسلام کے دائرہ سے مجھ کو خارج نہ کرتا ہو، اُس وقت میں اپنے دل میں سوچتا تھا کہ الہی میری شایعہ اعمال کی وجہ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ پریسڈنٹ جنہوں نے ہم کو دعوت دی ہے شہر سے، برادری سے بلکہ اسلام سے خارج کر دئے جائیں۔

صاحبو! جس کام کی ابتدا اس طریقہ سے ہو تو اس کا انجام کو پہنچنا میرے نزدیک بشری قوت سے ممکن نہیں تا وقتیکہ خدا کی بے انتہا اور زبردست طاقت مدد نہ کرے۔

اس ادھیڑوں میں کئی مہینے گزر گئے جوں جوں کانفرنس کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا دول دول خیال پیدا ہوتا تھا کہ دیکھئے اُس وقت کیا ہربو بنگ مچتی ہے۔

مگر حضرات! اب میں دیکھتا ہوں کہ کانفرنس کی تمام کارروائیاں جس خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ روزانہ انجام پائیں جیسے باقاعدہ ترتیب اور تہذیب کے ساتھ اجلاس ہوئے اور جن سے نہایت مفید نتائج ظاہر ہونے کی امید ہے، تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے اپنی غایت درجہ کی مہربانی اور بندہ نوازی سے عین وقت پر ہماری مدد کی، جو کچھ کہ میرے خیالات تھے وہ سب غلط نکلے یہ بالکل سچ ہے ”وہم اکر قوی ست ننگمباں قوی تراست“۔

صاحبو! اختلاف اور مخالفت دو متضاد چیزیں ہیں اختلاف رائے کسی مسئلہ کے واسطے اُس وقت تک جرت ہے جب تک کہ اُس حق نیک مبنی اور ہمدردی کے ساتھ بحث کی جائے، ممکن ہے جو شکوک اور شبہات

پیدا ہوں اُن کو رفع کرتا، اور اپنے دل کو تسلی دینا، مقصود ہو ۞
 اور مخالفت کے یہ معنی ہیں کہ دوسرے طریق سے اُس مطلب کو تو وغرضی کے ساتھ بحث و مباحثہ
 میں لاکر چیلنے اور بنے بنائے کام کو لگا جانے اور اُس میں خرابیاں ڈالنے کی کوشش کی جائے ۞
 مخالفت حقیقت میں ایک فعل شیطانی ہے اور اختلاف ایک فعل رحمانی ۞
 سو حضرت! نہ معلوم خدا نے کونسا فرشتہ رحمت بھیج دیا کہ جس کی وجہ سے ہم نے یہاں نہ کفر کے
 فتوے دیکھے نہ مخالفت کا اثر پایا ۞

بجائے اس کے دیکھا تو دیکھا کہ کبے سینوں میں ایک ہمدردی کا جوش موجزن ہے ۞
 صاحبو! محمد، سیدین، نبیری، دشمن اسلام، کے معزز خطاب بھلی سے ہم کو نہ ملے۔ ییلے پر
 عاشق ہونا اور جنوں بننا ذرا مشکل کام ہے ایک مانہ گذرا بہت سے پتھر کھائے، بہت سے زخم اٹھائے،
 تب یہ خطاب پلے ہیں۔ وہ کون مقام ہے جہاں کافر نس گئی اور ہم فوذا شد مسلمانوں کے دشمن قرار نہ دیے
 گئے، ایک مرتبہ میرٹھ میں جب کافر نس کا اجلاس ہونا قرار پایا، تو اجلاس سے تین مہینہ پیشتر میں نے
 شمالی ہند کے مختلف بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا، ہر جگہ جا کر اسپچیں دیں لیکچروں کے ذریعہ سے
 کافر نس کے مقاصد اور اغراض بیان کئے۔ منجملہ دیگر مقامات کے دہلی بھی گیا۔ جب وہاں کے مولویوں کو
 میرے آنے کی خبر ملی، تو گلیوں گلیوں مولویوں کے وعظ ہوتے تھے اور کوئی بڑے سے بڑا عقیدہ لایا
 نہ تھا، جو ہماری طرف منسوب نہ کیا جاتا ہو، جب میں ٹون ٹال میں جانے لگا کیا دیکھتا ہوں کہ دو نکر نکیر
 دروازہ پر کھڑے وعظ فرما رہے ہیں اور چلا چلا کر کہہ رہے ہیں، کہ دیکھو مسلمانو! جو اس مجمع میں شریک
 ہوگا، اسلام سے خارج ہوگا، اور جب اسلام ہی باقی نہ رہا تو تمہاری بیویوں کو بھی طلاق ہو جائیگی ۞
 یہ سُن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ نوجوان تو اس حکم کو سُن کر خوش ہو گئے کہ چلو چھٹی ہوئی دوسری
 اچھی سے اچھی بیوی پسند کے لائق تلاش کر لیتے (چیز) ۞

اس کے بعد جب میری سواری نکلی تو ایک مولوی نے باؤ از بلند نہایت صفائی اور مہیا کی کے ساتھ بیٹا
 کیا کہ ”مسلمانو! ذلہ بچنا، دیکھو وصال جا رہا ہے اپنے ایمان کو سنبھالے رہنا ۞
 اُس وقت تو میں چپکا نکلا چلا گیا، لیکن جب ٹال میں پہنچا اور تقریر کرنے لگا ہوا تو سب سے پہلے
 اپنے مہربانوں کا کفر کے فتووں کے صلہ میں شکریہ ادا کیا اور اُن سے کہا کہ کیا کفر کے فتوے پتنگ کے
 کاغذ سے بھی اڑا رہے ہو گئے، بھائیو! ہم کو جو چاہو سو کو لیکس خد کے لئے جھوٹ نہ بولو، سچ کہو، اتنا تو ہے
 ”مہدی“ اور کہتے ہو ”دجال“ (چیز) ۞

صاحبو! یہ دو فتوے تو میں نے آپ کو اُس مقام کا سنایا جو ہند کی مرکز سمجھا جاتا ہے اسی نہایت
 دوسرے مقام کی حالت پر قیاس کیجئے ایک ڈلی میں کیا ایسی مصیبتیں خدا جانے کہاں کہاں نہ گزر رہی ہیں

بہائی میں نہ تو اس قسم ان ہاتھوں نے کوئی ناگوار واقعہ دیکھا نہ انہوں نے کوئی بُری خبر سنی بلکہ جو مدد اور رحمت
یہاں ملی ہم اُس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے +

صاحبو! بہائی میں کانفرنس کا یہ ستر حواں اجلاس ہے، جب یہاں کانفرنس ہونی تجویز ہوئی تو
پریسیڈنٹ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ روپیہ ہم دینگے۔ لیکن مہانداری کے انتظام اور جو معزز بزرگ یہاں
تشریف لائینگے، اُن کو آرام پہنچانے کے ذمہ دار بنو، اُس وقت میں نے یہ خیال کر کے حامی بھری، کہ
بہائی جیسے دور دراز مقام پر ایسے کتنے آدمی آئینگے جن کے لئے کوئی بڑا اہتمام کرنے کی ضرورت پیش آئیگی۔
زیادہ سے زیادہ وہی دس بیس آدمی جن کو خاص قسم کی دلچسپی اور ہمدردی ہے اور اس لحاظ سے
نہ مہانداری کا زیادہ ہنگام ہو گا نہ قیام کے لئے عالیشان اور وسیع کوٹھیوں کی ضرورت ہوگی +

مگر حضرات! جس کثرت کے ساتھ لوگ جمع ہوئے اور ہندوستان کے ہر گوشہ سے جیسے معزز طبقے
کے سربراہ اور وہ جان آئے میرے تو خیال اور گمان میں بھی یہ بات نہ تھی +

حضرات! علم طب کا مسئلہ ہے کہ جب تک یہ چار خلطیں، خون، سودا، صفرا، بلغم، مناسب
اعتدال کے ساتھ باہم متفق رہتی ہیں تو صحت بھی ٹھیک اور درست رہتی ہے اور بے ان میں سے ایک
میں بھی کمی بیشی ہو تو فوراً سمجھ لو، کہ ندرستی پر زوال آنا شروع ہوا۔ لیکن اب تک، یہ مراد ہماری کانفرنس
میں مناسب مقدار کے ساتھ کبھی جمع نہ ہوا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہاں جمع ہوا اور جس کا یہی نتیجہ اپنے
یہ دیکھا کہ وہ لوگ جن کا وعظ اب موقوف تھا قرآن اور حدیث کی تعلیم پر، اور کیا وہ لوگ جن کے لیکچر اور سیمینار
منعصر تھیں فقط قومی تعلیم کے لئے، دونوں نے مل جل کر اتفاق کے ساتھ اس امر کی تسلیم کیا کہ مسلمانوں کو ضرورت
نہانہ کے موافق دین اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم کی ضرورت ہے اور اس کام میں کوشش کر کے اُس کو پورا
کرنا علیحدہ کالج کو جو مسلمانوں کا قومی درس گاہ ہے ترقی دینا نہ ہی اور انگریزی تعلیم کو قوم میں پھیلانا
ہمارا فرض ہے +

صاحبو! مسلمان کیسے ہی گئے گزرے ہوں، کیسے ہی جاہل ہوں، کیسے ہی غیرت اور حسرت
کو انہوں نے چھوڑ دیا ہو۔ لیکن ایک چیز نہ اُن سے چھوٹی ہے نہ چھوٹیگی۔ وہ کیا ہے؟ ”دیں“ جو کجخت
بے نیکی سے جج ادا نہیں کرتے، روزے نہیں رکھتے، نماز نہیں پڑھتے، وہ بھی اپنے آپ کو خدا کا گناہ
بندہ خیال کر کے متغفار پڑھتے ہیں، مسجدوں میں نہیں جاتے، لیکن جب اُن کو آباد دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے
اور غازیوں کو اپنے سرکا سرتاج سمجھتے ہیں +

صاحبو! دوسری قوموں کو جب ان کے یہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو دعاں کیا ہوتا ہے؟ کہیں
ٹبلے کھٹکتے ہیں، نالچ رنگ کے جلسے ہوتے ہیں، کسی مقام پر تشادیا توں کے نقائے بجاے جاتے ہیں،
لیکن ہمارے یہاں جو پہلا کام ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مولوی یا کوئی عزیز قریب ہی سہی بچہ کے پیدا ہونے

ہی اُس کے کان میں کَلَّا اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی آواز چُونک کر اذان دیتا ہے۔ اور یہ وہ نوبت ہے جس کی آواز کان سے اُڑ کر سیدھی دل میں بیٹھتی ہے کہ مرتے دم تک جدا نہیں ہوتی اور یہی وہ دائمی نقارے ہیں جو قیامت تک ہر مسلمان کے گھر میں اسی طرح سے بجتے رہیں گے۔

صاحبو! جس بچے نے دودھ پیا ہو اپنی مسلمان ماں کا، جس بچے کی رگوں میں خون بہ رہا ہو اسلام کا، اگر وہ کبھی تھپے بھی تو بھی تو اسلام کے دائرے سے جدا نہیں ہو سکتا۔

حضرت! یہی وجہ ہے کہ جہاں دین اور مذہب کا نام آیا اور مسلمان نے مارنے کو تیار ہو گئے۔ وہ انگریزی مدرسوں میں محض اسی لئے نہیں گئے، کہ ہمارے دین میں خرابی آ جائیگی، اور محض اسی وجہ سے پستی کا کوئی درجہ ایسا باقی نہیں رہا جس کو انہوں نے طے نہ کر لیا ہو، حکومت کے ساتھ دولت، دولت کے ساتھ غیرت، شرم، حیا، غرض ساری خوبیاں ایک ایک ہو کر رخصت ہو گئیں دنیا کی قوموں کے مقابلہ میں ذلیل و خوار زندگی بسر کرنا گوارہ کیا، زمانہ کا ساتھ نہ دیا، ضرورت کا لحاظ نہ کیا، دنیاوی شہمت اور شوکت لٹا کر حفاظت کی تو صرف دین اور مذہب کی، اور جب تک اُن کے دماغوں میں یہ بات سمائی رہی کہ مغربی عالم کا حامل کرنا کفر ہے، انگریزی تہ پڑھنا بھی نہ چڑھی۔ مگر اب جب کہ اُن کو اطمینان ہو گیا کہ مغربی علوم ہوں یا کسی اور جگہ کے، مذہب اسلام پر اس کا کوئی برا اثر نہیں پڑ سکتا، اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے، جو ہر زمانہ کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ قدیم فلسفہ ہو یا جدید، سائنس کی زبردست قوت ہو یا اس سے کوئی بڑھ کر، اسلام بحیثیت اسلام جب مقابل کیا جائیگا۔ تو اُس کی صداقت کے ثبوت ملتے چلے جائیں گے، تب اُنہوں نے انگریزی کا پڑھنا شروع کر دیا، وہ اوہام باطلہ کے بھوت جو قوم کے چاروں طرف شل کر رہے ہوں گے چھپے ہوئے تھے، اب اُن کا پتہ نشان نہیں۔ تجربے اور مشاہدے نے مخالف اور مذمت چہن لوں کو بہت کچھ کھڑو بنادیا ہے اور جو چنگاریاں اب بھی کہیں کہیں بی پائی جاتی ہیں اور کبھی کبھی چمک اُٹھتی ہیں عقربہ زمانہ آتا چاہتا ہے کہ راکھ ہو کر رہ جائیگی۔

صاحبو! اس قسم کی قومی مجلسوں کا ہونا جس میں آج ہم اور آپ شریک ہیں خود اس امر کا ثبوت ہے کہ قوم میں آگے بڑھنے کی ایک تحریک پیدا ہو گئی ہے، اُس کو اپنے منزل کا احساس ہو گیا ہے طے در دور مگر قوموں کو ترقی کی دوڑ میں بڑھنے ہوئے دیکھ کر اگر اُن سے بازی لے جائیگا نہیں تاہم برابر ہو جانے، اور برباد شدہ عزت کی واپسی کا خیال، خیال کے ساتھ شوق اور شوق کے ساتھ آمادگی کا اظہار ہے۔

اب مجھے سمسید کے مذہب اور اُس سب سے علیحدہ کالج کی طرف سے جو بیگانیاں پیدا ہوئیں اس بحث کے متعلق کچھ بڑی سچی گفتگو کرنا باقی ہے۔

صاحبو! جس زمانہ میں وہ مذہب پر، زور شور سے آرٹیکل لکھ رہے تھے، جس زمانہ میں اُن کی تشوہ و تہلیل کی تصنیف جاری تھی جس کے سبب مسلمانوں کی دنیا میں ایک ہل چل مچی ہوئی تھی، کیا عالم اور کیا جاہل

سارے کے سارے مسلمان اُن پر ملامت کرتے، اور اُن کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے، کوئی نفرت انگیز فقرہ ایسا نہ تھا جو اُن پر نہ کسا جاتا ہو، اور کوئی خفیف سے خفیف پھبتی ایسی نہ تھی جو اُن پر نہ اُڑائی جاتی ہو، غرض ساری دنیا ایک طرف تھی اور وہ بندہ خدا ایک طرف ۛ

صاحبو! یہ تمام واقعات میرے سامنے کے اور میری آنکھوں کے دیکھے ہوئے ہیں اور میں سکتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ مسر سید کا جاننے والا، اُن کی عزت کا کرنے والا، اُن کی خوبیوں کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں ۛ

لیکن پھر بھی سید ام بیک اُن کے اخیر دم تک میرے اور مرحوم کے درمیان نہ ہی بحث و مکر قائم رہی چنانچہ اُن کی زندگی کے آخری دور میں بھی ایک مضامین کا سلسلہ عرصہ دراز تک بطور خط و کتابت کے جاری رہا اور اب وہ کتاب کی شکل میں شائع ہو گیا ہے اور آپ صاحبوں میں سے اکثر نے جو اس وقت یہاں موجود ہیں غالباً ملاحظہ بھی کیا ہو گا ۛ

میں نے اس بحث کے کسی مقام پر ایک مرتبہ یہاں تک لکھ دیا کہ ”سید صاحب آپ نے تو ہمارے خدا کو اصل شانِ خدا کی پر قانم نہیں رکھا بلکہ داروں کا خدا بنا دیا ۛ

یہ سچ ہے کہ ہمارے سید عقائد سے وہ اختلاف رکھتے تھے اور اس اختلاف کو انہوں نے شد و مد کے ساتھ ظاہر بھی کر دیا جس کی وجہ سے تمام مسلمان اور اکثر علماء اُن کے اسلام پر قائم رہنے میں شبہ تھا۔ اور بعض نے یہاں تک کفر کے فتوے بھی دیدئے۔ اور اُن کو کیا کہوں خود مجھ کو بہت سے مسائل میں اُن سے اختلاف کرنا پڑا، بحث و مباحثہ رہے۔ لیکن باوجود ان تمام حالات کے دیکھتے ہوئے، میرا دل اُن کے سچے اور پکے مسلمان ہونے پر ہمیشہ گواہی دیتا تھا اور دیتا ہے۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو بھی میں اُن کے پاس موجود تھا۔ اُس وقت اگر وہ کچھ پڑھتے تھے تو درود اور کلمہ ۛ

صاحبو! شاید کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو کہ ایک مدت گزری جب کایہ افتہ ہے مسر سید نے اول مرتبہ عقائد اسلام کی نسبت ایک مضمون چھاپا اور اُس کو دیکھ کر جس شخص نے پہلے خط کے ذریعہ سے اُن پر کفر کا فتوے دیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کون تھا؟

صاحبو! وہ بھی بندہ تھا جو اس وقت آپ کے سامنے کھڑا تقریر کر رہا ہے۔ جب یہ کفر کا فتوے اُن کے پاس پہنچا، تو فوراً اُنہوں نے مجھ کو جواب دیا۔ غرض یہ ایک بڑی داستان ہے جس کے بیان کرنے کے لئے نہ مہلت ہے نہ موقع۔ البتہ اس قدر کہنا چاہتا ہوں۔ کہ جیسے جیسے اُن کے خیالات معلوم کرتے کا زیادہ موقع مل گیا۔ خواہ یا المشافہات چیت کرنے یا خط کتابت کے ذریعہ سے، ویسی ہی ویسی میرے دل پر اُن کی خوبیوں اور اُن کے اسلام کا اثر ہوتا گیا اور آج تک باقی ہے ۛ

صاحبو! ایک بڑی خوبی تو اُس شخص میں یہ تھی کہ کوئی تفسیر لکھی عقاید اپنے ایسے ظاہر کئے جس سے کہ

ملک بھر کو ان سے کد اور کاوش ہو گئی، مدتوں بحث مباحثہ کی گرم بازاری رہی، لیکن کبھی کسی وقت میں اپنی تصنیف و تالیف کو کالج کی چپار دیواری کے اندر نہ آنے دیا اور اس امر کی تلاش رہی کہ کسی طالب علم کی نظر سے کوئی اپنی کتاب نہ گزرنے پائے۔

مذہبی تعلیم کے لئے دینیات کی کمیٹی طحہ بنائی۔ اور اُس کی رائے اور تجویز سے دینیات کی تعلیم جاری رہی اور اب تک ہے۔

بابھی اتحاد و اتفاق کی نسبت ان کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں میں شیعہ ہیں یا سنی، مقلد ہیں یا غیر مقلد وغیرہ وغیرہ ان تمام فرقوں کی متحدہ کوشش کسی مفید سے مفید غرض کے پورا کرنے میں شامل نہ ہوگی اُس وقت تک ان کی ترقی محالات سے ہے۔ ان کی ہمیشہ سے یہ رائے تھی کہ عقاید کے اختلاف کی وجہ ہر فرقہ کو اختیار ہے کہ وہ اپنے فرائض کو جدا جدا طریقہ سے ادا کرے۔ لیکن اصولاً بحیثیت ایک اسلام کھنے کے اور ایک قوم ہونے کے ان کو ہمیشہ ایک دوسرے کا معاون اور مددگار رہنا چاہئے، اور اس بات کے واسطے کسی تمیز اور فرقہ کی ضرورت نہیں، صرف مسلمان ہونا کافی ہے۔

وہ کہا کرتے تھے کہ ایک دوسرے کے عمدہ مقاصد میں شریک ہو کر کام کرنے سے یہ مت سمجھ کر کسی خاص فرقہ یا گروہ کی ترقی ہے، بلکہ کل مسلمانوں کی اور اسلام کی ترقی خیال کرو۔ ان کا قول تھا کہ آپس کے ایسے بحث مباحثے سے بچو، جو کسی کے مذہبی عقاید کو صدمہ اور بے چہرے کیونکہ یہ معاملہ خدا کے ساتھ ہے اور وہی اس کا محاسب۔ ہم دنیا میں اتفاق کے ساتھ رہتے اور ایک غرض و احد یعنی اسلام کو ترقی دینے کے لئے آئے ہیں نہ کہ جنگ و جدل کرنے اور جماعت میں تنزل پیدا کرنے کے لئے۔

صاحبو! جب انہوں نے کالج میں مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو ایک مسجد بنوانی تجویز کی، جب اس امر کی اطلاع ان کے دوست خلیفہ سید محمد حسین صاحب پرایم ٹیشر ٹیپالہ کو ملی تو ممدوح نے اعتراض کیا اور شیعہ، سنی دو طابعلوں کے واسطے دو مسجدیں بنانے کی رائے دی، جس کا انہوں نے یہ جواب دیا کہ میں جس فرقہ کو ملنا چاہتا ہوں تم اُسی کے قائم رکھنے کی صلاح دیتے ہو، جب کہ مسلمان ایک خدا کے مانتے والے، ایک پیغمبر سے ہدایت پانے والے، اور ایک کعبہ رکھنے والے ہیں۔ تو کوئی و نہیں کہ ان کی عبادت گاہیں فرقہ بندی کے لحاظ سے جدا جدا قائم کی جائیں۔ اس سے ہمیں بحث نہیں کوئی ہاتھ باندھ کر نماز پڑھے یا کوئی کھول کر، کوئی بالآخر آمین کہے یا بالآخر نفی، جس کا جو طریقہ ہو وہ اُس کے برتنے کے لئے آزاد ہے۔

اور نہ اس اختلاف کی وجہ سے ہم کسی مسلمان کو دائرہ اسلام سے کوئی جہیز خیال کرتے ہیں چنانچہ وہی ایک مسجد جس کا ارادہ کیا تھا بنائی اور جس میں شیعہ طالب علم ہوں یا سنی، مقلد ہوں یا غیر مقلد، اپنی اپنے طریقوں کے ساتھ اپنے اپنے اماموں کے پیچھے نمازیں پڑھتے اور ایک خدا کو سجدے کر سکتے ہیں۔ جیسے

سنی طلباء کی مذہبی تعلیم اور اُن کے اخلاق اور تربیت پر عمدہ اثر ڈالنے کے لئے علیحدہ استاد مقرر ہیں، ویسے ہی شیعہوں کے چال چلن کی نگرانی اور اُن کی مذہبی تعلیم جاری رکھنے کے لئے اُن کے ہم مذہب عالم موجود ہیں *

صاحبو! ایسی مسجد ہندوستان بھر میں سوائے علیگڑھ کے آپ کہیں دیکھیں گے کہ جن میں ہر مہتر اور عقیدے کا مسلمان بلا کسی مزاحمت اور روک ٹوک کے آزادی اور اطمینان کے ساتھ اپنے ارکان مذہبی کو ادا کرتا ہو، وہاں کسی ایسی تقریر کرنے کی کوئی شخص جرأت نہیں کر سکتا، جو کسی کی دال زاری کا موجب ہو *

صاحبو! سرسید کی مذہبی بحث علی گڑھ کلج کے لئے بہت سی بدگمانیوں کا منبب بن گئی اور یہی ایک وجہ تھی جس کے پردہ میں اُن کی زندگی میں کیا معنی آج تک بھی مخالفت کے گیت گائے جاتے ہیں، اور کلج کی بہتر سے بہتر خوبی کو ایسی خوفناک صورت میں دکھایا جاتا ہے، جس کے سبب مذاقہ لوگوں کی طبیعت پر بڑا اثر پیدا ہوتا ہے۔ اور مجھے اس امر کو افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ ابھی ہماری قوم میں ایسے لوگوں کی کمی ہے کہ ایک واقعہ سننے کے بعد اُس کی تحقیقات کریں، اسباب کا پتہ چلائیں اور پھر صحیح رائے قائم کر کے اصلاح کی طرف مائل ہوں۔ بجائے اس کے یہاں یہ ہوتا ہے کہ اکثر تو محض سنی سنی باتوں پر جن کی بنیاد محض غلط افواہوں پر منحصر ہوتی ہے ناقص رائے قائم کر لیتے ہیں، اس کے علاوہ سب بڑی شکل جو پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی سمجھانے اور اُس غلط فہمی کے رفع کرنے کی کوشش بھی کرے تو سمجھتے نہیں، اور اپنی رائے سے ہٹنا اور اُس کو واپس لینا گوارا نہیں کرتے *

صاحبو! اس تقریر کا یہ مقصد نہیں کہ علیگڑھ کلج دنیا کے تمام اوصاف کا مرکز ہے، اُس میں کوئی عیب اور کوئی بُرائی نہیں۔ ابیادہ دعوائے توہین نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ اتنا بڑا عظیم الشان سٹیٹوشن جس کی نظیر اس وقت ہندوستان میں موجود نہیں۔ ممکن ہے کہ اُس کے انتظام میں بعض صہلاحوں کی ضرورت ہو *

ممکن ہے کہ بعض حقیقی بُرائیاں ایسی موجود ہوں، جن پر ہماری نگاہ نہ لگئی ہو یا ہم اُس نقص کو نقص ہی نہ خیال کرتے ہوں، تو ایسی حالت میں جب کہ وہ ایک عمومی درس گاہ ہے ہر سمجھ دار اور نیک نیت مسلمان کا فرض ہے کہ ان برائیوں کی نسبت گفتگو کرے، جو خرابیاں ہوں ہر آدمی کے ساتھ ظاہر کر کے اُن کے دور کرنے کی کوشش کرنے پر متوجہ ہو، اور میں کہتا ہوں کہ ایسے نیک دل لوگوں کے ہم ساتھی ہیں اور وہ مل کر اُنھیں اوچل کر کوشش کریں *

صاحبو! جب تک یہ روح ہم میں نہ پیدا ہوگی آپ خوب سمجھ لیجئے ہماری مثال اُس بیجان جسم کی

ہوگی، کہ جس کی روح کو بدن سے جدا ہوئے تو عرصہ گزر گیا لیکن مصالحوں کے زور سے اُس کی شکل بہنوڑ قائم رہے اور شاید کچھ دن تک اور باقی رہے۔

حضرات! میں سمجھتا ہوں کہ اس کا نفرنس کے یہاں بیٹھی میں ہونے سے بہت سی بدگیاں رفع ہو گئیں ہوں گی، اکثر خیالات باطلہ مٹ گئے ہوں گے، اور بجائے اس کے کہ ہم رہزن خیال کئے جاتے تھے اب تو آپ بھی اپنے جی میں کہتے ہوں گے کہ ”رہزن نہیں یہ تو رہنما ہیں“۔

صاحبو! پردہ جاے یا رہے اس بحث کی نسبت بوڑھوں سے لیکر جوانوں تک کے خیالات آپ نے سنے اور سب کو یہی کہتا پایا ہو گا کہ پردہ قائم رہے پردہ۔ یہ جو ظفر علی خاں حیدر آباد سے آئے ہیں اور جن کی رائے اس مسئلہ کے متعلق ابھی آپ کو معلوم ہوئی، بی۔ اے، پاس ہیں لال ٹوپی سر پہنے ڈاڑھی منڈانے سے تو البتہ دھوکا ہوتا ہے کہ شاید علیگڑھ کالج کے پڑھے ہوں لیکن باعتبار خیالات کے یمن بوجہ یا خوجوں میں سے ایک شخص معلوم ہوتا ہے۔

صاحبو! یہ سب کچھ سنی مجھے خوشی تو اس امر کی ہے جب کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ کیسے کچھ بُرے خیالات پھیلے ہوئے تھے اور وہ دفعتاً کس طرح دُور ہوتے چلے گئے، اور اب وہ زمانہ آیا کہ ہم متفقہ طریقے سے اپنے مقاصد کی تکمیل میں کوشش کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

صاحبو! جس کثرت کے ساتھ کانفرنس میں لوگ آئے ہیں مجھ کو ان سب کے آنے پر بھی تعجب ہے۔

آپ کو معلوم نہیں یہ مولانا حالی اور مولانا تذیر احمد صاحب جن کو آپ اس پنڈال میں دیکھتے ہیں جب مدراس کانفرنس ہوئی تو خود میں نے ان سے چلنے کے لئے بے حد اصرار کیا، مدراس والوں کو جدا کرنا تھی، ان بیچاروں نے تار پرتا نہ بھیجے، بُرا مانا، مگر کسی طرح راضی نہ ہوئے اور نہ چلنا تھا نہ چلے، نہیں معلوم کہ ہمارے معزز پریسیڈنٹ صاحب اور قاضی کبیر الدین صاحب نے کیا جادو کر دیا کہ ایک دم سے کیا بوڑھے اور کیا جوان گھروں سے اُٹھ کر چل کھڑے ہوئے۔

صاحبو! یہ تذیر احمد وہ شخص ہیں کہ سرسید تک ان کے کانفرنس میں آنے کی تمنا کیا کرتے تھے اور سال بھر پہلے سے بلاوے بھیجتے تھے، نے کو یہ آپ سے آتے نہیں لیکن جس طرح آتے تھے یا آتے ہیں، اُس کی حقیقت کوئی ہمارے دل سے پوچھے، اور اس پر بھی بس نہیں بلکہ نہ بھٹ بھٹ بھی ایسے کہ جب کبھی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو لگی لپٹی رکھتے نہیں، بات آئے پیچھے سرسید کو کہنے سنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔

صاحبو! مولانا کی مسلک علمی قلت ان کی سحر بانی، ان کی طلاق لسانی، بیان کا انداز، ذرا بھی مبالغہ کی بات نہیں، ہمارے لئے مایہ ناز ہے، اور یہ چند صورتیں اس سچا میں غنیمت ہیں، کل جس وقت مولانا لیکچر

دے رہے تھے، اور جو سماں آپ نے دیکھا، غالباً آپ اس کو نہ بھولینگے، آپ پر جو اثر ہوا ہو اس پر ہمیں بحث نہیں ہے۔ مگر جو اثر پردہ نشین بی بیوں پر ہوا ہے اس کے معلوم ہونے سے ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ میرے حقیقی بھائی کی دو بیٹیاں بھی وہاں گئی تھیں اور پردہ میں سے تمام لیکچر اور اسپچس دے غٹسٹن ہی تھیں۔ مجھ سے انہوں نے کہا کہ ہم بڑی خوش نصیب ہیں کہ ہم کو مولوی نذیر احمد صاحب کے وعظ سننے کا موقع ملا۔ جس سے ہم کو آج معلوم ہوا کہ اسلام کیا چیز ہے اور مسلمان کیسے ہوتے ہیں اور قومی ہمدردی اور قومی کام کیا چیز ہے۔ کاش ایسی باتیں سال میں ایک دفعہ بھی ہم لوگوں کے کان میں پڑ جایا کریں۔ تو ہم بھی اپنے مذہب کو، اپنے فرائض کو، سمجھنے لگیں۔ ہم تو اب تک جانتے تھے اور کیوں ایسے جلسوں میں شرکت نہ کیں ہوں، اور ایسی مفید باتوں کے سننے کا ہم کو موقع نہیں دیا جاتا۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کافرئش کی کارروائی دیکھنے اور سننے کے لئے جو ہر نظام پردہ نشین بی بیوں کے جائے کا کیا گیا تھا وہ کیسا مفید اور عمدہ تھا۔ خدا کرے ہمیشہ ایسا ہی ہوا کرے۔

صاحبو! نہ کافرئش ہوتی، نہ لوگ آتے، اور نہ ہماری مسلمان بیویاں اور معصوم بچیاں نیچر ہوتیں۔

نمی گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من
بہار از یارو گل از یار و باغ از یار و یار از من

بہر حال میں مبارک باد دیتا ہوں پریسڈنٹ صاحب کو کہ جس محبت جس خوشی کے ساتھ آپ نے ہم کو بلایا اور اپنے اخلاق کریمانہ کا بزناؤ کیا۔ ہر شخص کا دل اس شکر گزاری سے بھرا ہوا ہے اور نہ صرف شکر گزاری بلکہ دعائیں دیتے جاتے ہیں۔

جناب پریسڈنٹ صاحب میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ جو اصحاب باہر سے تشریف لائیں وہ سب آپ کے، آپ کی لوکل کمیٹی کے سکریٹری، اور آپ کے کل اہل بیٹی کے، شکر گزار اور حسند جاتے ہیں، علاوہ انہیں سب بڑی خوشی کا موقع یہ ہے کہ جو غلط فہمیاں آپ کے ایڈریس سے پیدا ہوئیں تھیں بفضلہ وہ بھی اچھی طرح رفع ہو گئیں، آپ نے اپنے ایڈریس میں تین باتیں بیان فرمائی ہیں، پہلی بات کانگریس سے علاقہ رکھتی ہے اور جس کی نسبت آپ کا خیال ہے کہ وہ ملکی بہبودی کے واسطے ایک بڑی خوبی کا مجموعہ ہے، کانگریس کی نسبت جو خیالات آپ نے ظاہر فرمائے چونکہ وہ آپ کی ذاتی رائے ہے اس لئے مجھ کو اس مسئلہ کے متعلق کسی مزید بیان کی حاجت نہیں۔

البتہ ہندو مسلمانوں کے باہمی اتفاق اور اتحاد کے بارے میں مجھ سے اور سرسید سے ہمیشہ

گفتگو ہو اکی اور نہایت توجہ اور غور کے بعد اُن کی اور نیز میری یہ رائے رہی ہے کہ ”بدبخت ہیں وہ مسلمان جو ہندوؤں سے اختلاف کریں اور بد نصیب ہیں وہ ہندو جو مسلمانوں سے نفاق رکھیں“

جناب والا! یہ دونوں قویں نہیں ہیں ہمارے جسم انسان کی آنکھیں ہیں اور میں تو یہاں تک کتا ہوں کہ اتفاقی کے لئے نہ فقط ہندو اور مسلمانوں کی ضرورت ہے، بلکہ ہندو مسلمان اور عیسائی، یہ تینوں ملکر جب تک ہندوستان کی بہتری کی مناسب تجویزیں مساوی کوشش کے ساتھ مل کر نہ سوچیں گے، ہندوستان جنت نشان نہ سمجھا جائیگا بلکہ ایک دوزخ کا نمونہ رہیگا۔

دوسری بات پردہ کی بحث سے متعلق ہے اور مجھ کو اس بحث سے کچھ زیادہ سروکار نہیں کیونکہ کافر نسک اس کا تعلق نہیں۔

چار کتابیں مصر سے آئی ہوئی میرے پاس موجود ہیں ہر ایک کا مصنف جدا جدا ہے اور ان چاروں کتابوں کے تمام اوراق اس بحث سے بھرے پڑے ہیں۔ جس سے جتنا ہو سکا پردہ درمی کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں کھا، ایک نے تو یہاں تک لکھ مارا کہ اگر اسلام میں پردہ کا جو وہ ہے بھی تو بھی اس کو مت مانو، کیونکہ یہ تہذیب کے خلاف ہے۔

رہی پردہ کے بارے میں سرسید کی رائے اور اُن کا خیال، سو میں نے تو اُن کی یہ حال دیکھا کہ مدت العمر کبھی اس بات کے بھی روادار نہیں ہوئے، کہ اُن کی بہو محمود بیگم کی بڑے سے بڑے جیل نقد انگیز کی مسم صاحبہ سے بھی مل سکیں، خواہ وہ اُن کے دوستوں کی خاتونیں ہوں یا سید محمود کی۔

یہی ایک بات نہیں بلکہ اُن کا مقصد تو اس سلسلے میں یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ تعلیم نواں بھی اُسی دائرہ کے اندر اندر رکھنا چاہتے تھے جیسا کہ اگلے پرانے شرفا کے خاندانوں کا دستور تھا، وہ اس جدید طریقہ کی تعلیم کو جس کا چرچا ہو رہا ہے قوم کے حق میں نہایت مضر خیال کرتے تھے غرض خدا کا شکر ہے کہ پردہ کی نسبت جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی وہ بھی جاتی رہی۔

اب تیسری بات محمد بن یونیورسٹی کا خیال ہے، جناب بن! میں نے کبھی ایک منٹ یا ایک سیکنڈ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کیا کہ محمد بن یونیورسٹی کے متعلق جو رائے ظاہر فرمائی ہے وہ کسی مخالفت کے سبب ہے اور ایسا سمجھنے کے لئے کوئی وجہ میرے پاس نہ تھی، کیونکہ میں جانتا تھا سب سے پہلے میں نے ہی اس خیال کو آپ پر ظاہر کیا، اس کی نسبت رائے دریافت کی، اعانت چاہی۔ جیسے میرا عریضہ آپ کی خدمت میں پہنچا، تو سب سے پہلے آپ ہی نے اس حکیم کو پسند فرمایا، انہایت بیش قیمت تحریری رائے سے ہم کو مفید اور نیک مشورہ دینے کی کوشش کی، نہ یہ سب کچھ کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دو ہزار روپیہ کے عطیہ سے بھی ہماری مدد کر کے ہمارے حوصلوں کو بڑھایا۔

اب ہا یہ امر کسی کام کے شروع ہونے سے پہلے اس کی مشکلات پر نظر دوڑانا، انتہائی غلظ

بتانا واقعی یہ ایک دانشمند سمجھ دار اور نیک نیت باخبر شخص کا فرض ہے۔ بس اگر کوئی شخص ایسے عمدہ مشورے کو مخالفت کا نتیجہ قرار دے۔ تو حقیقت میں ایسی رائے رکھنے والا قوم کا دوست نہیں ہے۔ اور قوم کا دوست کیا معنی وہ خود اپنا دوست نہیں ہے، جو رائے آپ نے ہم کو دی اس میں شبہ نہیں کہ وہ طبیعت کی صفائی اور دلی ہمدردی کے ساتھ دی گئی ہے۔

حقیقت میں ایک ڈاکٹر کا یہ کام ہے کہ وہ مریض کو دیکھے، تشخیص مرض کر کے دوا بتائے اور کہے جب تک یہ دوا استعمال نہ کر و گئے فائدہ نہ ہوگا۔

جن مشکلات پر غور کرنے کی آپ نے ہدایت کی وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ نظر انداز کر دی جائیں، چالیس برس کی لگاتار کوششیں ہمارے سامنے ہیں، لیکن اب تک کیا نتیجہ ہوا، یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے دس لاکھ سے کیا ہوتا ہے اس کے واسطے تو بقول ہرمانس آغا خاں کے ایک کروڑ روپیہ چاہئے، اس سال کوشش کی گئی کہ اگر مسلمان زیادہ دینے کی استطاعت نہیں رکھتے تو کم سے کم ایک روپیہ تو دے سکتے ہیں، اون روپیہ فنڈ جاری کیا گیا، نہایت سرگرمی اور محنت کے ساتھ کام شروع ہوا۔ سال بھر تک متواتر وصول یا بی کی کوشش کی گئی، کوئی مقام، کوئی جگہ مانگنے سے نہ چھوڑی، مگر صابو! سال بھر کی کوشش اور محنت کے بعد اگو دیکھو تو کیا جمع ہوا۔ سولہ ہزار اور ان سولہ ہزار پر جو خرچ ہوا اگر اس کو منہا کیا جائے تو اتنے بھی باقی نہیں رہتے۔ غرض ضرورت کا وہ عالم آباد کی کا یہ حال۔ صابو! یونیورسٹی کوئی اسپتال نہیں ہے کہ بازار سے خریدا لائیں اور کسی محنت پر کھڑا کر دیں۔

یونیورسٹی نام ہے، کالج کے مجموعوں کا جب تک ہارے سکول نہ ہونگے کالج کہاں سے آئینگے، جب کالج نہ ہونگے یونیورسٹی کہاں سے خود بخود پیدا ہو جائیگی۔

صابو! اور رقاصوں کو جانے دو، اسی بکلی پریسیڈنسی کا حال سنئے، جس وقت میں پونا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ پرائمری تعلیم میں ایک ہزار چار سو سکھڑی میں سے کچھ طور طلبا شامل ہیں لیکن ان میں بھی مسلمانوں کا عدم وجود برابر ہے، جس کی سب سے بڑی وجہ مرہٹی وغیرہ زبانوں کی پابندی ہے اور اس لحاظ سے جب تک مدارس میں اردو نہ جاری کی جائیگی، مسلمان طلبا شامل نہیں ہو سکتے اور جب شریک نہ ہونگے ترقی کا ہونا معلوم۔

اُسی زمانہ میں مجھ کو ڈاکٹر کرافٹ پبلک انسٹرکشن سے ملنے کا اتفاق ہوا، میں نے مسلمانوں کی اس تعداد کی کمی کو ان کو دکھلایا اور اپنی سلسلے کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہ دیا کہ آپ کے یہاں سب قوموں کا حصہ ہے لیکن نہیں ہے تو مسلمانوں کا۔

مگر صابو! اس قسم کی کسی عاقل سے یا خود گورنمنٹ سے التجا کرنا ایک بیکارسی بات ہے۔

جس کا تجربہ سوائے شرمندگی اور افسوس کے اور کچھ نہیں مل سکتا +

صاحبو! جب ہم اس قسم کے سوال کریں گے تو وہی جواب ملیگا جو فقیروں کو دیا جاتا ہے آپ کو معلوم ہے، جان بچانے کے لئے گورنمنٹ کیا کرتی ہے، دیکھئے جب قحط پڑتا ہے تو اس وقت گورنمنٹ کی طرف پورے ہوس قائم کئے جاتے ہیں، جہاں ان کی حالت کی مناسبت سے غذا کا ایسا بندوبست کیا جاتا ہے کہ وہ فاقہ کی مصیبت سے صرف مرنے نہ پائیں۔ کیا وہاں کوئی مسٹرڈ مسلمان جاسا اور درخواست کرے کہ کیا اس کچھڑی اور دال بھات کے، ہم کو پلاؤ دو، تو آپ خیال کر سکتے ہیں کہ اس کو بلجائیں گے؟

حضرات! پلاؤ تو ایک طرف لاتوں اور کٹوں سے اس کی جان بھی بچ جائے تو غنیمت ہے +

ملک میں مختلف قومیں آباد ہیں، گورنمنٹ سب پر یکساں حکومت کرتی ہے اور سب کے حقوق اس کی نظر میں مساوی ہیں۔ اگر وہ کسی منبرہ اپنی مہربانی سے ہماری گذشتہ عظمت کا خیال کر کے اور جمہوریتا بھی کی حالت پر رحم فرما کر ہمارے ساتھ کوئی خاص رعایت کرے تو یہ اس کی مہربانی، ورنہ ہم کو کوئی حق نہیں کہ بار بار اس سے سوال کریں اور جب سوال پورا نہ کیا جائے تو شکایت کرتے پھریں +

صاحبو! ہمارا فرض ہے کہ ہم آپ اپنی مدد کریں اور جو کام کیا جائے وہ پائے بل اور بوتے پر تم خیرات کرتے ہو، اپنا روپیہ خرچ کرتے ہو۔ لیکن کن لوگوں پر جو خیر سستی ہیں، اصلاحِ تمدن کا کام نہ ہوا لئے موجود ہے، فقیروں کو مت دو۔ میرے نزدیک ان مسلمانوں سے زیادہ کوئی فقیر نہیں جن کے پاس علم کی دولت نہیں +

حضرات! کیا مسلمانوں کے لئے تعلیم کی ضرورت نہیں کیا قوم بنگالیوں اور سقوں کے درجے بھی گئی گذری ہو گئی، کاش جس قدر کہ آپ ان لوگوں کو دیدیتے ہیں اتنا ہی روپیہ قوم کے بچوں کی تعلیم پر صرف کیا جائے تو کیا ہمارا بیڑا پار نہیں ہو سکتا؟

صاحبو! ہم کو نہ گورنمنٹ کے سامنے گذرگئی کا ڈھکھیلانے کی ضرورت ہے نہ کسی اور کے، ہاں اگر ضرورت ہے تو بیشک قوم کے سامنے، اور نہ اس کی ہم کو کچھ شرم ہے، مسلمان اگر ذرا بھی تعلیم و تربیت کے اعلا اصول کی طرف متوجہ ہوں تو ابھی کچھ ایسا وقت گیا ہے اور نہ بات بگڑ چکی ہے، تھوڑی سی کوشش میں ساری شکلیں آسان ہوتی نظر آتی ہیں +

صاحبو! ہمارے محترم پریسیڈنٹ صاحب نے ایک بات ایسی فرمائی ہے جنابِ ندر سے لکھنے کے قابل ہے انہوں نے ایک موقع پر کہا ہے کہ تم آتے ہو اور ہم سے مانگتے ہو، لیکن اس کی کیا وجہ کہ ہم کو مدد نہ دو، جب کہ تمام مسلمان ایک جسم ہیں اور قاعدہ کی بات ہے کہ جب جسم کے کسی حصہ میں کچھ

خلش پہنچینی ہوتی ہے تو اُس وجہ سے سارے جسم میں درد ہوتا ہے جیسا کہ مشہور شاعر کا قول ہے

بنی آدم عضلے یکدیگر اند کہ در آفرینش یک جوہر اند
چو عضوے بد آرد و روزگار دگر عضو را نماند قسار

پھر کیا سبب ہے کہ ہمارے درد کا تم کو احساس نہیں؟

صاحبو! جو شکایت کی گئی اگر ایسا ہو تو نہایت معقول اور حق بجانب ہے

لیکن قبل اس کے کہ میں اور کچھ بیان کروں اس کے متعلق ایک حکایت کہنی چاہتا ہوں:-
عرفی، اکبر، کے زمانہ میں ایک شاعر گذرا ہے اُس نے اپنے وقت کی بید رویاں اور لوگوں کے
اپنے ساتھ بُرے سلوک دیکھ کر اس رباعی کو ترمیم کیا اور کہا کہ شاید صدی کے وقت میں ایسا ہی ہوتا ہو
جیسا کہ اُس نے بیان کیا ہے۔ لیکن اب تو بجائے ”بنی آدم عضلے یکدیگر اند“ کہنے کے مناسب
کہ یوں کہیں ”بنی آدم اعداے یکدیگر اند“

تو حضرات! اس اقعہ کو سن کر میں بھی یہ کہتا ہوں کہ ممکن ہے اور بہت زیادہ ممکن کہ خود غرضوں
نے کسی نہ کسی زمانہ میں ”اعداے یکدیگر اند“ کی مثال کو جائز رکھا ہو، لیکن میں بدلائل آپ کو بتاتا ہوں کہ
ہم جہاں کہیں گئے دشمن بن کر نہیں گئے بلکہ ایک سچے اور وفادار دوست کی حیثیت سے گئے ہیں۔
اپنی ضرورتوں سے مقدم مقامی ضرورتوں کو سمجھا ہے۔ اپنی ناپذیر خدمات پہلے دے کے لئے اور بعد میں
اپنے لئے پیش کی ہیں، جس وقت ہم لاہور گئے سب سے پہلے ہماری کوشش یہ تھی کہ جو کچھ فائدہ پہنچو
وہ سب جمعیۃ السلام کو پہنچے، کلکتہ گئے اور جو فوائد کانفرنس کی وجہ سے کلکتہ والوں کو حاصل ہوئے اُن کا حال
خان بہادر مرزا شیاعت علی بیگ صاحب سے جو اس وقت یہاں تشریف رکھتے ہیں دریافت کیجئے

مدرسہ میں جب کانفرنس گئی تو محض کانفرنس کی درخواست پر جو اعانت ہمدردی کے ساتھ
ہر کیسٹیلی ڈیپٹل کی گورنمنٹ نے دے دی تھی، اس کے مدرسہ اعظم کے ساتھ فرمائی، اُس کے آج تک ہم مشکور
ہیں اور رہیں گے۔ اس کے علاوہ اسکالرشپ جاری کر اسے، عبدالہادی بادشاہ صاحب سے میں نے
یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر وہ اٹھیں۔ تو ایک مہینہ تک پھرنے کے لئے میں تمہارے ساتھ ہوں، جس قدر
امکانی کوشش اسکالرشپ فراہم کرنے چنیدہ وصول کرنے میں ہو سکیگی کرونگا۔ اُن علیگڈھ کالج میں اور
دوسرے سکولوں یا کالجوں میں جو فرق ہو سکتا ہے وہ وہی ہو سکتا ہے جو ایک لوکل اسکول یا کالج کے
مقابلہ میں کسی جنرل کالج کو، اور اس اعتبار سے وہ بے شبہ ہندوستان کے مسلمانوں کا سنٹرل کالج
ہے

صاحبو! میں سمجھتا ہوں کہ کس طرح سے علیگڈھ کالج صورتہ کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے علیگڈھ کالج ایک
ایسا سنٹرل کالج ہے جو نہ صرف ممالک متحدہ کے لئے ہے بلکہ تمام ہندوستان کے لئے ہے

اس وقت ہمارے یہاں سات سو چھ طلبہ کالج اور اسکول میں تعلیم پاتے ہیں جن میں دو سو بیس ملک متحدہ کے رہنے والے ہیں باقی چار سو چھ یا سی پنجاب - بہار - ممالک متوسطہ - بنگال - بھٹی - حیدر آباد - سندھ وغیرہ دوسرے صوبوں اور دور دراز مقامات سے آئے ہوئے ہیں ۔

صاحبو! جو اعدادائیں نے آپ کے سامنے پیش کئے ان سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ ہم کسی خاص لوکل کالج کی کوشش اور مدد کے لئے نہیں آئے۔ بلکہ یہ ہماری کوشش ہندوستان کے مسلمانوں کے واسطے ہے ۔

صاحبو! اکثر یہ بھی اعتراض ہوا کرتا ہے کہ علیگڑھ کالج غریب طالب علموں کی مدد نہیں کرتا وہ تو امیروں کے واسطے ہے اور اس وجہ سے غریبوں کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا ۔ لیکن میں ایسے اعتراض کرنے والوں کو سناتا ہوں اور آپ حضرات تعجب فرمائیں گے باوجود اس کے کہ ہماری قوم کی کیا حالت ہے، اس کو تعلیم سے کس درجہ دلچسپی ہے، کن کن شکلوں اور محنتوں سے ہم کو چندہ ملتا ہے، مگر پھر بھی ہم دس ہزار روپیہ سال ایسے نادار بچوں کی تعلیم پر بند روپو اسکا رشپ صرف کرتے ہیں، جو کسی طرح سے وہ سوائے علیگڑھ کے اپنی تعلیم کو جاری نہیں رکھ سکتے اس پر بھی ہمارے پاس سب سی درختائیں امداد کے لئے آتی رہتی ہیں لیکن ہم کو انوس کے ساتھ واپس کرنی پڑتی ہیں کیونکہ ہمارے پاس اس سے زیادہ خرچ کرنے کو روپیہ نہیں ۔

صاحبو! جب سے ہمارے یہاں کالج کلاسیں قائم ہوئیں اس وقت سے اب تک تین ہوتاوان گریجویٹ کالج سے نکلے ہیں، اب مقابلہ کیجئے صوبہ بھٹی اور مدراس سے کہ جہاں سینتالیس اور چھالیس برس کی مدت دراز میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد پچاس اور چھ یا سی کے درمیان ہے۔ پس اسے حضرات ان تمام واقعات پر نظر کر کے جو مختصر طریقے سے میں نے بیان کئے، کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ محمدن کالج، علیگڑھ کا کالج ہے یا صوبہ متحدہ کا، اور ہم وہاں کے مسلمانوں کی بھلائی چاہتے ہیں یا ہر رنگ اور ہر مقام کے مسلمانوں کی اصلاح اور فائدہ ہم کو منظور ہے ۔

صاحبو! اگر ایسا خیال نہیں تو پھر کیوں نہیں کہا جاتا وہ بھٹی کے مسلمانوں کا کالج، مدراس کے مسلمانوں کا کالج، بنگال کے مسلمانوں کا کالج، پنجاب کے مسلمانوں کا کالج ہے ۔

جسے شبہ وہ بھٹی کے مسلمانوں کا کالج ہے اور نہ محض بھٹی کے مسلمانوں کا بلکہ ان تمام مقامات کے مسلمان کا جو ہندوستان کے ہر گوشہ میں آباد ہیں ۔

سارے ہندوستان کے مسلمان اس پر یکساں حق رکھتے ہیں اور ان کو اختیار ہے کہ آج اگر چاہیں مجھ کو سکرٹری کے عہدے سے جدا کر کے دوسرا مقرر کر دیں ۔

صاحبو! اگر میرے اس بیان پر بھی آپ کو اطمینان نہیں ہوتا تو میں اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ

کہ ہم قولاً اور فعلاً انجمن سلام کی مدد کرنے کو تیار ہیں *

صاحبو! کل جس وقت قاضی کبیر الدین صاحب کی یادگار میں چندہ ہو رہا تھا اس وقت میں چپ تھا لیکن اب میں اعلان کرتا ہوں کہ دس روپیہ ماہوار کا ایک سکا لرشپ جس کا کیٹل ہزار روپیہ ہوتا ہے انجمن کے ایسے طالب علم کو علیگڑھ کالج دیا کریگا۔ جو یہاں سے جا کر وہ کسی کالج کلاس میں داخل ہو۔
نوٹ (اس اعلان پر پنجاب پریسیڈنٹ یہ درخواست کی گئی کہ طالب علم کے مخصوص علیگڑھ جانے کی شرط کو اٹھا دیا جائے اور محض انجمن کے نام سے لکھا جائے جس کے جواب میں مخترم اور دو اہم تنظیم پسند کرنے کا کہہ نہیں اپنی سی کوشش کرو گے)۔

اور جہاں تک ممکن ہو گا پریسیڈنٹ صاحب کی خواہش پورا کرنے میں سعی کروں گا۔
جناب والا! اب ایک بات حمدان یونیورسٹی کی نسبت کہنی اور باقی تھی آپ نے اس تجویز کے متعلق فرمایا ہے کہ اس سے زیادہ مفید اور اس سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں *

اس مشکل مسئلہ کی نسبت ہم نے کہاں تک کامیابی حاصل کر لی اس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ پانچ برس کے عرصہ میں پانچ لاکھ تتر ہزار روپیہ ہم نے جمع کیا، جو مشکلات کے خیال میں تھیں ان کے دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ بجائے مایوسی پیدا کرنے کے امید دلانے والا ہے اور اس طرح کوششیں قائم رہیں تو آپ دیکھیں گے کہ کیسی کچھ کامیابی ہوتی ہے *

صاحبو! کسی کام کی مشکلات پر نظر کرنا، ان کو سوچنا سمجھنا یہ تو ایک دانشمندی اور تجربہ کی بات ہے لیکن اس کو دشوار سمجھ کر چھوڑ بیٹھنا یہ ایک پست ہمتی کی دلیل ہے۔ زبردست سے زبردست قوت کبھی ایسے خیال والوں کو سرسبز اور کامیاب نہیں بنا سکتی۔ ہمیشہ بڑے اکیلے پڑا نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہئے، اور پھر تدریج کام شروع کیا جائے اس طرح سے کہ پہلے ایک مختصر کوٹھان بنائیں جب وہ بن کر تیار ہو جائے تو متفرق کرے اور مل بنائیں اور پھر رفتہ رفتہ منزل منزل عمارت کو بلند کرتے چلے جائیں جو قدم آہستگی کے ساتھ منزل پر ڈالے جلتے ہیں وہ بغیر کسی تکان کے یقیناً منزل مقصود پر پہنچتے ہیں *

صاحبو! کوئی قوم اسکول میں ٹل اور انٹرنس کی تعلیم پانے سے قوم نہیں بن سکتی اگر قوم نیکی تو بنی۔ ایم۔ اے کے درجہ تک تعلیم پانے اور اعلیٰ درجہ کی تربیت حاصل کرنے سے نہ یہ کہ ریل کے بورڈ پر نمبر لٹانے والوں سے کسی قوم کو امتیاز کا درجہ نصیب ہو سکتا ہے یا آج تک کہیں ہوا ہے *

صاحبو! جیسا کہ میں بار بار چکا ہوں کوشش اور ہمت شرط ہے اور عالیشان الو العزم امداد کی ضرورت، مانا کہ ہم اپنے زندگی میں اپنے مقصد پر نہ بھی کامیاب ہوں تاہم ہم کو خدا سے ناامیدی نہیں ہے

اگر ہم اپنی آنکھوں سے پونیورسٹی کو نہ دیکھ سکے اور کوشش کرتے کرتے مر گئے تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہمارے یہ بچے جو تعلیم پا چکے یا پار سے ہیں یہ بھی اپنے مقصد پر کامیاب نہ ہونگے، ہونگے اور ضرور ہونگے۔ اور جو ارادہ ہم نے کیا ہے ہم نہ ہوں۔ نہ سہی، لیکن اُس کو پورا کر کے رہینگے۔
صاحبو! جس قدر کہ میں نے بیان کیا اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، بجز اس کے کہ اب ہم اپنے عالی جناب پریسیڈنٹ صاحب اور دیگر حضرات کی مہربانیوں کا صدق دل سے شکریہ ادا کریں۔

صاحبو! بلحاظ اُس حیثیت اور بلحاظ اُن پاکیزہ خیالات کے جو مدنی موصوف کئے ہیں میں ہم ہمیشہ اس پر کھینکے کہ وہ کانفرنس کی اس طرح سرپرستی فرماتے رہینگے، جیسے کہ انہوں نے کی ہے اور اپنے آپ کو اُس رکن اعظم تصور فرمائینگے۔
صاحبو! ایک موقع پر پریسیڈنٹ صاحب نے رزلویشن کی عدم تعمیل پر افسوس کے ساتھ کہا ہے کہ بہت سے مفید رزلویشن اب تک بیکار پڑے ہیں اس کی نسبت میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔

مسٹر حیدری کانفرنس کا کانسٹیبلشن تبدیل کرنے کی غرض سے رزلویشن پیش کرنے والے تھے، میں نے قاضی کبیر الدین صاحب سے کہا کہ ابھی اس کا موقع نہیں اس رزلویشن کے پیش کرنے سے لوگ خیال کریں گے کہ بیسی و الے ہمارے مقاصد میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں اس واسطے ضرورت ہے کہ پہلے چند عالی دماغ مسلمان شامل ہو کر اس مسئلہ کے متعلق ایک صحیح رائے قائم کر لیں، اُس وقت یہ پیش کیا جاوے تو زیادہ مناسب ہے، قاضی صاحب نے اُن سے ذکر کیا اور انہوں نے محض اس خیال سے کہ مبادا کسی قسم کا اختلاف ہو، اپنی سچی رائے کے اظہار کو بھی چھوڑ دیا اُن کا یہ احسان نہایت شکر گذاری کے قابل ہے اور میں اس اقد کے بعد جناب پریسیڈنٹ صاحب سے عرض کرتا ہوں کہ جس کے اوپر آپ نے افسوس کیا ہے، اب وہ دن آگئے اور آپ دیکھینگے کہ کس طرح ہر رزلویشن کی تعمیل کی جاتی ہے۔

صاحبو! ہمارے راستے میں بہت سے دریا مثل زردا، گنگا، وغیرہ کے حائل تھے۔ لیکن اب تو سب پر پل بندھ گئے اور ادھر سے ادھر جانے کے لئے راستہ کھل گیا۔
یہ نتیجہ ہے قاضی کبیر الدین صاحب کی کوششوں کا، اُن کے جوش کا، ہمدردی کا، قاضی صاحب نے اپنے دل میں کہتے ہوئے کہ اب کبھی ایسی تکلیف اور محنت نہ اٹھاؤنگا لیکن شاید اُن کو خبر نہیں کہ وہ ہم سے اب چھوٹا بھی چاہینگے تو نہ چھوٹ سکیں گے، کیونکہ اب تک تو تھے وہ کبیر الدین، لیکن اس کانفرنس نے اُن کو اکبر الدین بنا دیا۔

صاحبو! ایک شکر یہ مجھے کو ادا کرنا ہے، احمد دیوبند صاحب کا جنہوں نے محفل میلاد سے کانفرنس کا آغاز کیا اور ایسی محبت کی چار سب کو پلائی جس کا مزہ کبھی مل سے نہ پائیگا۔

اس طرح گل محمد صاحب کے جلد و غلا کا لطف ہمیشہ یاد آ کر یگانہ خدا کرے کہ ایسے پھول جیسے گل محمد ہیں ہر روز اس چمن میں کھلیں اور اپنی مہک سے قوم کے دماغوں کو تازہ کرتے رہیں۔

غرض اے حضرات! آپ کی کن کن مہربانیوں کو یاد کریں، عالی جناب ہر ٹائمنس آغا خاں با نقابین کے احسانات سے ہم سب کو بخش نہیں ہو سکتے۔ ان کی عالیشان پارٹی کا تصور کریں یا رات کی اُس شاندار پارٹی کا ساں بیٹھیں، جس کو یہ آنکھیں عمر بھر یاد رکھیں گی، وہ مکان کی زینت، روشنی کی کیفیت، چمن کی آرائشگی، باجوں کی دلکش اور سرسبز آوازیں، ایک کا مشرق سے، تودوسرے کا مغرب سے، تیسرے کا شمال سے، توچوتھے کا جنوب سے، غرض چاروں طرف سے لوگوں کا آنا، آپس میں ملنا جُلنا، محبت کی باتیں کرنا، طرح طرح کی مٹھائیاں، ہر قسم کے میوے، اور نفیس غذائیں کھانا، یہ تمام باتیں تمام عمر کے لئے ایک ایسا اچھا سہانا وقت تھا، جس کے دوبارہ آنے کی بہت کم امید ہے، اور بلا مبالغہ جو سامان اور تحفقات کئے گئے، وہ پریسٹیج صاحب کی شان ان کے درجے اور ان کے منصب لائق تھے، کوٹھی کیا تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک جنت کا ٹکڑا آسمان سے اُتر آیا ہے۔

جناب عالی! ایک شادی تو آپ کے بیٹے کی اور ایک شادی آپ کی قوم کے بیٹوں کی، خدائے نو شادیاں آپ کو مبارک کرے۔

صاحبو! اس موقع پر حاجی قاسم صاحب اور حاجی صدیق صاحب کے بھی کچھ کم ہم مشکو نہیں جاتے جنہوں نے اپنی سافرنو آرمی کے سبب سے محنت میں ہم کو مظہر بادشاہ اور صدیق باغ جیسے عالیشان محل رہنے کے لئے دئے۔

صاحبو! اس بمبئی میں کرایہ پر ایسے مکان لئے جاتے تو فی کس سٹس پیس روزانہ پر بھی تو نہ ملتا لیکن شہاباش ہے ان کی ہمت پر کہ ہمارے آرام کے مقابلہ میں اپنے سیکڑوں روپیہ کی آمدنی کا انہوں نے خیال نہ کیا، لوگ تو ان سے بہت خوش ہونگے، لیکن میری رے میں غلطی ہوئی ان کو کم سے کم دس س روپیہ کے کرایہ پر مکان دینا چاہئے تھا اور جو کرایہ آتا وہ تحفہ کی صورت میں یہ کانفرنس کو دیتے۔

صاحبو! اب انجیر میں مجھ کو ایک شکریہ اپنے عزیز خاص نواب ادہ نصر اللہ خاں صاحب کا اودا کرنا رہ گیا ہے، حضرات! ان کی ہمدردی اور روشن خیالی سے آپ یہ نہ سمجھیں؟ کہ آج ہی یہ نو گرفتار بلا ہیں، بلکہ مدت گزرتی ہے جب سے کہ یہ ہمارے نام کے ہوئے ہیں۔ جو درد قوم کا ان کے دل میں ہے خدا کرے وہ سب کے دل میں ہو اور جو کوششیں تعلیم کی بھلائی کی یہ کر رہے ہیں خدا کرے کہ سب اس سوئے میں مبتلا ہوں۔

صاحبو! نوابانہ صاحب کے شکریہ کے بعد آپ یہ سمجھیں کہ میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں سب سے بڑا اور ضروری شکریہ تو رہ گیا وہ کس کا انجمن اسلام کے بچوں کا۔ جو تکلیف ان بچوں نے اٹھائی اور جو راحت ان کی وجہ سے ہم کو ملی سچی بات تو یہ ہے کہ کسی ایک سے بھی تو وہ خدمت بن نہ پڑتی جو انہوں نے کی، جو کم ان کو کرنے پڑے وہ انہیں کا کام تھا، دن کو دن نہ جانا، رات کو رات نہ سمجھے۔ مگر صاحبو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ جو کچھ کیا وہ انہوں نے ہی کیا اور ہم نے ان کی خدمت کا کوئی صلہ انہیں دیا ہے۔

حضرات! ہم نے ان کو ایسا سبق دیا ہے جس کی وجہ سے اگر آج یہ خادم نظر آتے ہیں تو کل کے دن ہی خدوم قوم سمجھے جائیں گے، ہمارا آپ کیا ہے جو کچھ کام بڑا بھلا کرنا تھا کر لیا کوئی دن جاتے ہیں، کہ داعی اجل کو لبیک کہنے والے ہیں کچل چلاؤ کا وقت آگیا ہے، اب جو کچھ کریں گے یا نہ کریں گے تو یہی سچا قوم کی نظریں اور ساری امیدیں انہیں سے وابستہ ہیں۔

صاحبو! آپ کو معلوم ہے کہ جب خزاں کے دن آتے ہیں تب کہیں ہریائی نظر نہیں آتی، جہاں ذرا ہوا کا جھوکا آیا اور زرد پتے جھڑنے لگے، سو ہماری مثال انہیں جیسے زرد پتوں کی سی ہے خواہ وہ آب کوثر سے سیسپس یا شہد سے ہمارے تھا فوٹے بھریں ہم تو گریں گے اور ضرور گر کر رہیں گے، لیکن جہاں آپ نے پتے جھڑتے دیکھے ہونگے وہاں یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جیسے جیسے پتے جھڑتے جاتے ہیں ویسے ہی ویسے نئی کونپلیں بھی پھوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، صاحبو! وہ کونپلیں بھی تو ہمارے بچے ہیں، جس وقت یہ تعلیم پا کر سرسبز ہونگے تو ایک دلی آپ دیکھیں گے کہ پھر کیسے پھولتا اور پھلتے ہیں، غرض تمام طالب علموں کی خدمتوں کا اور بالخصوص طالب علمی کی محنت کا جو کہ برے نام طالب علم ہے، لیکن ہے حقیقت میں ہمارا مطلوب، شکریہ ادا کرتا ہوں، نہ اپنی طرف سے بلکہ تمام ممبران کانفرنس کی طرف سے۔

صاحبو! اب وہ وقت آیا کہ یہ نظم کی داستان اب ختم ہونا چاہتی ہے۔

نہایاں آمدایں دفتر حکایت ہم چنیاں باقی

مگر اے صاحبو! آپ یہ خیال نہ کریں کہ جو آگ ہمارے سینوں میں شعل ہے وہ کچھ جائیگی، جانے کو اس وقت جاتے ہیں، لیکن ہم نے آپ کو چھوڑا انہیں آئینے، پھر ستائیں گے اور زندگی باقی ہے تو ایسے ہی جلسہ پھر ہوگا۔



الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرة المحمدیہ

یعنی وہ دھچپ کتاب جس میں مرحوم سر سید احمد خاں صاحب علیہ الرحمۃ نے تاریخ عرب اور پاک اسلام کی نبی تاریخ کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے اور سیاسی مورخوں کے بیجا اعتراضات کے جواب جو پاک مذہب اسلام اور بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور قرآن کریم پر کئے گئے تھے، ایسے تسلی بخش اور سچے دندان شکن جیسے ہیں جو قابل دید ہیں۔ درحقیقت اس مرحوم و مغفور نے اس کتاب کی تصنیف سے مذہب پاک اسلام کی وہ خدمت کی ہے جو ہر طرح قابل تعریف و تحسین ہے اور ممکن نہیں کہ اس دشمنی کے ساتھ کوئی اور صاحب ایسی بے بہا کتاب تصنیف کئے اور لطف یہ کہ نہایت اعلیٰ درجہ کی صاف بیان اردو میں جو مسلمان کہ سچے دل سے قوم اسلام کے ہمدرد اور ترقی خواہ اور اسلام کے حالات و اقلیت شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ اس بے بہا کتاب کا ضرور مطالعہ کریں نئی روشنی کے تعلیم یافتہ مسلمان جو عربی زبان کی عدم واقفیت ہونے کے علاوہ انگریزی غرضی غرضت اور غلط فہمی سے ماہر ہیں اس کتاب میں نہایت مدلل اور مفید تر کشیں دیکھیں گے۔ اگرچہ اس میں ۱۲۶ نہایت بچہ پشیمان ہیں مگر ہم مختصر طور پر غلطیوں سے مضامین کی فہرست یہ یہ ناظرین کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ایک بیباچارہ بارہ خطبے شامل ہیں۔

دیکھا کہ میں پیش ہیں، مذہب کیا چیز ہے، سچے مذہب کے پرکھنے کا سچا اصول کیسا ہے اسلام صحیح طور پر کن احکام کا مجموعہ ہے۔ ان کتابوں پر بحث جو عیسائی اور مسلمانوں نے نہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات پر لکھی ہیں۔

دلیل مگر یہ کہ کتاب کی تالیف آف محمد کا ذکر جس کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

خطبہ اول عرب کا جزائیہ، عرب قبائل اور مسلمانین پر تحقیقات، بحث، انظمام اس کی تحقیق، حضرت ابراہیم و حضرت سلیمان کے حالات پر تحقیقات، بحث، حضرت ماجدہ کی حریت پر بحث، خطبہ دوم عرب جاہلیت کی رسوم عادات، بت پرستی، جبر و سحر و جادو، کعبہ کا ذکر، حج زمانہ جاہلیت میں، رسوم ازدواج، خطبہ سوم عرب جاہلیت کے ادیان پر بحث، نہایت سلیس ہے، اسلام کی مناسبت، کج السامی، فریسیہ خطبہ چہارم اسلام انسان کے لئے رحمت اور تمام انبیاء کے مذاہب کی پشت پناہی ہے، اسلام تمدن کو موافق ہے، کثرت ازدواج، طلاق اور غلامی پر تحقیقات، بحثیں، بیویوں اور عیسائیوں کے مذاہب اسلام سے کیا فائدہ پہنچا، خطبہ پنجم مسلمانوں کی مذہبی کتابوں پر تحقیقات، بحث، خطبہ ششم مذہبی روایتوں کے معتز اور غیر معتز فرق پر بحث، خطبہ ہفتم قرآن مجید کی جمع و ترتیب، نزول پر بحثیں، خطبہ ششم خانہ کعبہ کی مفصل تاریخ، خطبہ ثامن حضرت کے نسب نامہ پر تحقیقات، بحث، شجرہ نسب حضرت من شجرہ نسب مصنف کتاب۔

خطبہ ہم شارح نسبت حضرت کے جو تورات اور انجیل میں ہیں، خطبہ یازدہم روایات شق صدر اور معراج کی تحقیق، خطبہ دوازدہم جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بارہ برس تک کے حالات۔

اس کتاب کے شروع میں مرحوم سر سید کی نگین عکس تصویر بھی نہایت خوشخط اور اعلیٰ درجہ کا غنڈہ

طبع کی گئی ہے قیمت مجلد پہلا بلحاظ دہلے رو

مکمل مجسمہ لکچرز و اسپیشل سیریز سید احمد خاں صاحب ہمارے درمجموعہ و معذور

مصنف مرحوم علیہ الرحمۃ کا مبارک نام ہی اس مجموعہ کی خوبوں اور اوصاف کے واسطے کافی شہادت ہے اور اس کی توصیف اور تعریف میں کچھ بھی کہنا سراسر بے ادبی اور اس کی کشتار ہے۔ سید مرحوم علیہ الرحمۃ کے مبارک نام اور اس کے مشن (دعا) سے شاید ہی کوئی تعلیم یافتہ مسلمان ایسا ہو جو واقف نہ ہو۔ جو بے بہا کارنامے اس مرحوم معذور نے اسلامی سبک کی ترقی تعلیم اور ہر قسم کی بہبودی کی خاطر اپنی گرانہا پرورد زندگی میں کئے وہی اس قبل ہیں کہ فی زمانہ یا آئندہ ہر ایک قسم کے قومی کاموں کی تہیہ اس کے مبارک نام سے تیز کا وقتاً شروع ہو۔ چنانچہ مجموعہ مرحوم معذور کا ذکر خیر کسی نہ کسی طرح سے اس قسم کے قومی جلسوں میں نا شروع ہو گیا ہے۔

اس کتاب مکمل مجسمہ لکچرز و اسپیشل سیریز میں اس سید مرحوم کی تمام عرق ریزی شریعت سے لیکر اختتام تک بھری پڑی ہے جیسا کہ انہوں نے مختلف طریقہ سے مسلمانوں کی حالت گناہ کو روک دیا اور یہ صلاح کرنے کی خاطر کوشش کی۔ ویسے ہی یہ لکچرز بھی منقذ فیل اور دماغ کے طرح طرح کے تھوڑے تھوڑے مصلحتوں سے جو شخص اس مرحوم تہیہ کی الالاعز می بہتقلال۔ صبر تحمل بردباری۔ انکساری اور عالیٰ وصلگی۔ تیز گاہے گاہے یوسیوں کا جو وقتہ فوقتہ منہ دکھاتی رہی ہیں انہا نہ کرنا چاہیے۔ قوم اور قومی ہمدردی اور ملک کی بہتری اسلام کی حمایت۔ سچے انوی صاف بیانی۔ اعلیٰ درجہ کی زبان اردو کی تقریر و تحریر۔ تہذیب و اخلاق کا بیشل نمونہ بننے کے لئے اپنی زندگی میں اس سے اچھا سبق سیکھنا چاہیے اس کے واسطے اس مجموعہ لکچرز و اسپیشل سیریز سے بڑھ کر کوئی نامحشوق اور بہرکامل نہیں ہو سکتا۔ لقمان کی حکمت ارسطو کا فلسفہ اور شکسپیر کی فصاحت اس کے آگے معمولی قرار دیا جاسکتی ہیں۔

یہ بے ہاد خیرہ زمانہ حال کی دینی اور دنیوی بہتری کے لئے ہی عزیز تر نہ ہو گا بلکہ جوں جوں ضروریات آنے والی نسلوں کو پیش آئیں گی۔ خود بخود یہ مجموعہ عزیز تر ہو گا۔ ملکی و قومی لائبریریوں کی زینت بنے ہو گا علم سبک جلسوں میں اس کے نہایت شوق سے تذکرے ہو کر سینگے۔ بڑے بڑے لکچرار اس مجموعہ سے مدد لینگے۔

اردو لٹریچر کے سیکھنے والے اس سے سند لیا کریں گے۔ غرض کہ یہ فیض مجموعہ بننے پر ہی ختم ہے۔ اس کے شروع میں مرحوم سید کی نگین کسی تصویر ہے اور عہدہ سے لیکر عہدہ تک مکمل لکچرز اس میں نہایت محنت سے جمع کر دئے ہیں اور وہ لکچرز بھی اس میں ہیں جن کا اکثر سید مرحوم کے دوستوں نے آج تک نام نہ نہ سنا ہو گا۔

صفحات ۶۰۰ نہایت اعلیٰ درجہ کا کاغذ۔ عمدہ چھپائی۔ خوشخط لکھائی۔ نیز اس سے پہلے جس قدر مجموعے لکچرز لوگوں نے چھاپے ہیں وہ بالکل نامکمل ہیں۔

قیمت مجلد
قیمت بلاجلد

تہذیب الاخلاق جلد اول

یعنی عالمگیر نواب نوح محسن الدولہ محسن الملک کو نویں مرتبہ علی گڑھ میں داخل کیا گیا اور چونکہ نصف کتاب آیات تینا وغیرہ کے کل مضامین پر تہذیب الاخلاق کے تحت ہفت سالہ امتداد کے تحت شائع ہوا ہے یہی مضامین ہیں جنہوں نے مسلمانوں میں اپنی صداقت سے ایک غیر معمولی ترقی کا جوش بھیلایا اور یہی مضامین ہیں جن کی تلاش ایک مدت سے غیر خواہان قوم و ملک کو فتنی، مگر افسوس کہ ان کی تشریح نہ آئی۔ اب ہم نے نہایت کوشش سے ہر پہنچا کر شائع کر دئے ہیں بہت عمدہ دھڑکی کا غفر بھیجی ہوئی کتاب ہے اور اس میں عام نہایت دلچسپ مضامین ہیں۔ اگر کوئی شخص اسلام سے واقفیت حاصل کرنی چاہے یا اردو انشا پر داری اور علومات کا ذخیرہ جمع کرنا چاہے تو اس پر بہتر روزگار کیا یا مسکو دیکھ لیتے۔ عا

تہذیب الاخلاق جلد دوم

عالمیاجاب انہیں ڈاکٹر سید احمد صاحب بہادر بالقابہ کے گزشتہ ہفت سالہ تہذیبی اخلاق کے مضامین جن کی قوم کو از حد ضرورت تھا ان کے لئے ۱۲۰۰ صفحات تک چھپ کر تیار ہو گئے ہیں۔ اس میں سید کے وہ مضامین ہیں جن کے پڑھنے سے ایک سمجھ سکی روشنی پیدا ہوتی ہے۔
غلام میں مضامین ایک کم ہوں، اخلاقی اور تمدنی مضامین کا خزانہ ہیں۔ اسلامی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ایک کو رس، مضامین کی
کے لئے اہم ترین کتاب، یہ وہی مضمین ہیں جن کی مقبولیت سے سید کو کامیابی ہوئی، یہ وہی سچے اور بے لوث مضامین ہیں،
جنہوں نے سید کا دل، بالاکا، مسلمانوں کو خوب محبت سے جگایا، اسلام اور اسلامی بھرتی کی اساتذہ اب ان مضامین کے پڑھنے سے
آپ کو معلوم ہو گا کہ مصلح خدام میں سید کو کس قدر رکاوٹیں اور پیچیدگیاں پیش آئی ہیں فیصلہ حالات کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہو جائیں گے
عوام اور اہل اسلام کو قصداً اس کتاب کے مطالعہ کی کہاں تک ضرورت ہے یہ امر کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا۔ ایک نکتہ
۶۳۲ صفحہ پر نہایت خوبصورت اور عمدہ چھپ کر تیار ہے۔ قیمت

تہذیب الاخلاق جلد سوم

یعنی عالجیاب نواب اعظم کراچی کے مولوی علی صاحب مبارک مرحوم کے چند مضامین مہندرجنڈیب الاخلاق گذشتہ ہفتہ لٹریچر ایسوسی ایشن
خاکت ۱۹۳۷ء میں کیا ہیں۔ ان صاحب رحمہم کی بیانت اور تحریر کو ہم نہیں جانتا تاہم ہندوستان کے بڑے بڑے
لفظوں کا داناں گئے۔ آپ صرف عربی و انگریزی کے ہی حاضر تھے بلکہ جرمن، ایمیلن، عبرانی اور سنسکرت سے بھی کافی واقف تھے۔ آپ نے اپنے
عام مضامین پر سب جگہ نظر کر دیا ہے کہ سماج دان میں ایسے شخص ہی موجود ہیں جو ترجمان کے اشخاص کو اسلام سے واقف کر سکتے ہیں اور نہ
اتفاق ہی کر سکتے ہیں بلکہ سیدھے سنتے رہ سکتے ہیں اور مضامین میں اکثر محکمہ مسقف مرحوم نے علمی اور انگریز حروف میں حاشے شمعیں ہیں جن
جنسہم نے چھاپ ڈائے ہیں۔ نہایت عمد کتاب چھپ گئی ہے اور قبول عام ہوئی ہے۔ قیمت " " " " " " " "

محمد

تہذیب الاخلاق چہارم

اس مجموعہ میں جناب لوی مشتاق حسین صاحب اقتصادیات، جناب لڈنا خواجہ لطافت حسین صاحب جالی، جناب سید مجتوب صاحب، جناب سید اعجاز علی صاحب لکھنؤ اور لکھنؤ مولوی
ذکاء اللہ صاحب، جناب فاطمہ طحطاطیہ صاحبہ کے تمام مضامین، ان کی تعریف صرف اسی قدر کافی ہے کہ تمام اہل ملک ہندوستان اور بالخصوص اہل ہندوستان کے ہر فرد کو
ادمان کی کیفیت سے کوئی خبر نہ ہو۔ تمام اہل ملک ان لوگوں کے زہد اور قدردار و عزت و فضیلت سے بخوبی واقف ہیں۔ مضامین کیا ہے، ایک جگہ
جادو سے خود لوگوں کو کئی خبر نہ ہو۔ تمام اہل ملک ان لوگوں کے زہد اور قدردار و عزت و فضیلت سے بخوبی واقف ہیں۔ مضامین کیا ہے، ایک جگہ
عدہ کا نقد پر کتاب چھپ چکی ہے۔ قیمت

النظر في بعض مسائل الامام الهمام ابو حامد امام محمد بن النضر الى رحمته الله عليه

اس میں کئی مسئلے شامل ہیں جن میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض مضامین پر مختلف بحث کی گئی ہے جو ان کی کتاب "المصنوع علی خیر الخلق" میں بتلایا، الاعتقاد فی الاعتقاد، التفرقة بین الاسلام والذمة یوسف کے لئے لکھے ہیں۔ پہلے رسائل میں فدا کی ذات پر بحث ہے، دوسرے رسائل میں صاحب کی واردات قلبی کا بیان ہے، تیسرے رسائل میں فلاسفہ کے اقدام اور ان کے علوم پر بحث کی گئی ہے، چوتھے رسائل میں روح کی حقیقت پر بحث ہے، پانچویں رسائل میں لوح و قلم کے متون کا بیان ہے، چھٹے رسائل میں مراط الدین کے مضمون پر بحث ہے، ساتویں رسائل میں اسلام کے مضمون پر بحث ہے، آٹھویں رسائل میں صاحب کے رسائل التفرقة بین الاسلام والذمة پر دیوید ہے۔ جس میں ان پر بحث کی گئی ہے کہ کن باتوں سے محقق پر تحقیق ہے اور کن باتوں سے نہیں۔ حقیقت

قضاة الامم من سائر حجة الاسلام

یعنی مکانِ تنہا امام محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ کے جو ان کی وفات کے بعد امام صاحب کے چھوٹے بھائی امام احمد الغزالی نے جمع کئے اور چلی کر سیدہ راحمہ نے نہایت کوشش سے ترتیب دیا اور محدث کے ساتھ مرتب کیا اور بعض مقامات پر نہایت خوب صورت بھی کی ہے۔ قیمت ۔۔۔

الحسن الجان علی ما فی القرآن

اس کتاب میں لفظ حسن اور حسن کی بحث کی گئی ہے کہ آیا قرآن شریف میں یہ لفظ استعمال نہیں ہے ان کے کیا معنی ملے جانے چاہئیں اس میں منہوں کے متعلق قرآن شریف کی تمام آیات جمع کر کے اور اہل بیت لفظوں کے معنی کو جمع کر کے اور اہل بیت صرفت کے معنی سے نہایت مدلل بحث کے بعد اصل حالات لکھے ہیں۔ قیمت ۵۰

تحریر فی اصول التفسیر

اس کتاب میں بنیاد نواب حسن علی صاحب دہلوی سید ہمدانی علی صاحب دہلوی سید احمد خاں صاحب نے کی خط و کتابت اہل بیت تفسیر قرآن تفسیر احمد خاں ہے نواب صاحب کو جس حکایت پر جو ہے یا انہوں نے جائز نہیں سمجھا اعتراض کیے ہیں سید نے بھی تسلی کے لئے جواب لکھے ہیں۔ انہوں نے پھر جواب در جواب لکھا ہے۔ جو صلیک عجیب و غریب سلسلہ بحث ہے اس کے ساتھ سید نے متن تفسیر لکھ دی ہے جس شخص نے سید کی تفسیر پر سختی ہے اس کا فرض ہے کہ اس کا ہر دوسرا لکھ کرے تا کہ تفسیر جن ہولوں پر ہے معلوم ہو جائے۔ قیمت ۵۰

ترقیم فی قصۃ اصحاب الکھف والرقیم

اس رسالہ میں اصحاب کھف کے قصہ پر جو قرآن مجید میں ہے نہایت مشافہ اور سنجیدگی سے تحقیق و بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۵۰

الدعاء والاستجابة

اس رسالہ میں دعا اور اس کے مقبول ہونے کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور قرآن شریف سے تمام دعائیں یکجا جمع کر دی گئی ہیں اور نہایت تحقیق و بحث ہے۔ از سرسید۔ قیمت ۲۰

اسباب بغاوت ہند

مختصر مشاعر کے متعلق سرسید احمد خاں صاحب کی پہلی تصنیف۔ قیمت ۶۰

لیکچر اسلام

سرسید احمد خاں صاحب کا لکچر عقاید اسلام کی نسبت۔ قیمت ۱۰۰

چار گلزار حالی

مصحفہ خراج حالی، ایک مجموعہ خراج حالی صاحب کی چار تصنیفات کہ ہے۔ نشاط امید، تعصیب انصاف، کلثم الحق، ترکیب بند، تعلیم مسلمان۔ نظم و رد۔ قیمت ۳۰

مناجات بیوہ

ہندوستان کی محبوبہ بیواؤں کی آہ و فغاں، بیوہ کے دل کی سچی باتیں، پڑھنے جاؤ اور روتے جاؤ۔ نظم کیلئے تیر و شتر ہیں۔ پُر درد دل اور عاشق قوم کے دل سے نکلتے ہوئے شعر ہیں۔ تحفہ ہندوستانی اردو زنانہ محاورات میں۔ قیمت ۲۰

شکوہ ہند

ہندوستان میں اہل اسلام کے رونق افروز ہونے کی حالت اور ان کی موجودہ حیثیت کا ہر تہ امتیاز الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ نظم و رد۔ قیمت ۲۰

ثنوی حب وطن

ثنوی برکھارت

بارش کے معنوں پر نیرنگی اور چھبے سا دل کی اور صفائی سے خیالات کا ہر کٹے گئے ہیں۔ قیمت ۱۰

المشاعر

خادم قوم، فضل الدین لکھنؤی تاجر کتب، ملک اخبار، شامی، بزار، کاکھو